تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

دارالاشاعت

تفسیر مظہری

جلد ہشتم

سورۃ الحج سے سورۃ الشعراء تک

پارہ ۱۷ رکوع ۸ تا پارہ ۱۹ رکوع ۱۵ تک

تالیف
حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات
مولانا سید عبد الدائم الجلالی
رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر
دار الاشاعت
اردو بازار کراچی ۱ ——— فون ۲۱۳۷۶۸

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
طباعت : ۱۹۹۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات در ۶ جلد

فہرست مضامین تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

تمت

سترھواں پارہ شروع

سورۃ الحج

اس سورۃ کی ۷۸ آیات ہیں، زیادہ آیت مکی ہیں بعض مدنی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اے لوگو اپنے رب (کے عذاب) سے ڈرتے رہو یعنی اس کی فرماں برداری اور اطاعت کرو۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ① بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی ہولناک چیز ہے۔ قیامت کا زلزلہ یعنی قیامت میں یا قیامت کے لئے ساری چیزوں کا ہل جانا جھنجھوڑا جانا۔

اوپر کی آیت میں عذاب سے ڈرنے کا حکم دیا گیا تھا اس آیت میں اس کی علت بیان کردی مطلب یہ کہ قیامت کے بھونچال کا تصور کرو۔ اس کی ہولناکیوں پر غور کرو اور سمجھ لو کہ اس سے محفوظ رکھنے والا سوائے تقویٰ اور اللہ کی فرماں برداری کے اور کوئی نہیں اسلئے تقویٰ اختیار کرو اور اللہ کے احکام پر چلو۔

علقمہ اور شعبی کے نزدیک یہ زلزلہ قیامت سے پہلے آئے گا اور قیامت کی خصوصی نشانی ہوگا۔ جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ مغرب سے آفتاب کے طلوع کرنے سے پہلے یہ زلزلہ آئے گا۔ ابن عربی اور قرطبی نے اسی قول کو پسند کیا ہے کیونکہ آئندہ آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا

جس روز تم اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی عورت (زلزلہ کی دہشت کی وجہ سے) اس بچے سے غافل ہو جائے گی جس کو دودھ پلا رہی ہوگی اور ہر حمل والی عورت اپنا حمل ساقط کردے گی۔

مرضعۃ وہ عورت جو دودھ پلا رہی ہو، مرضع وہ جو دودھ پلاتی ہو خواہ اس وقت نہ پلا رہی ہو۔ دودھ پلانے کی صفت اس کے اندر موجود ہو۔ جیسے حائض اور حائل ہر حیض والی اور حمل والی عورت خواہ اس وقت اس کو حیض نہ آرہا ہو اور حمل نہ ہو۔ (اور حائضہ و حاملہ وہ عورت جس کو حیض آرہا ہو اور حمل موجود ہو) یعنی زلزلہ کی دہشت کی وجہ سے ہر وہ عورت جو بچہ کو دودھ پلا رہی ہوگی اپنے بچے کو دودھ پلانا چھوڑ دے گی۔

حسن نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا کہ مرضعۃ اپنے شیر خوار بچے کے دودھ چھڑانے سے غافل ہو جائے گی اور

حاملہ کو ناقص اسقاط ہو جائے گا۔

وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲ اور (اے مخاطب)
تجھ کو لوگ نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی سخت چیز۔

اس آیت کی تفسیر میں حسن نے کہا خوف کی وجہ سے تم کو لوگ سکر کی حالت میں نظر آئیں گے وہ شراب کا نشہ نہ ہوگا بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا جس کی وجہ سے لوگوں کی یہ حالت ہوگی۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ ترون بصیغۂ جمع اور تری بصیغہ واحد اس لئے ذکر کیا کہ ساعت یعنی قیامت کو دیکھنے والے تو سب ہی ہوں گے سب ہی قیامت کو دیکھیں گے اور سکر کی حالت میں ہر شخص دوسرے کو دیکھے گا (اپنی حالت سکر اس کو دکھائی نہ دے گی) عذاب کا ہول، ہوش پراگندہ کر دے گا، اوسان خطا ہو جائیں گے۔ جو لوگ زلزلۂ قیامت کو علامات قیامت میں سے کہتے ہیں اور قیامت سے قبل اس کا وقوع مانتے ہیں وہ اپنے قول کے ثبوت کے لئے ان آیات کو پیش کرتے ہیں ان آیات میں ہر مرضعہ کا اپنے شیر خوار بچے سے غافل ہو جانا اور حاملہ کا حمل ساقط ہو جانا اور ہر شخص کا نشہ کی حالت میں دکھائی دینا بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ زلزلہ کا واقعہ قیامت کے وقوع سے پہلے ہوگا مردوں کے جی اٹھنے کے بعد تو نہ کوئی دودھ پلانے والی ہوگی نہ دودھ پینے والا بچہ نہ کوئی حاملہ نہ اس کا حمل حضرت مفسر نے اس استدلال کی تردید میں فرمایا کہ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا میں خطاب عام قرار دیا جائے یا خاص اس وقت میں موجود لوگوں کے لئے بہر حال تقویٰ کی علت زلزلۂ ساعت کی ہولناکی اور شدت کو قرار دینا صحیح نہ ہوگا کیونکہ زلزلہ کی دہشت تو انہیں لوگوں پر ہوگی جو زلزلہ کے وقت موجود ہوں، انہیں کو ڈرانا اور اللہ کی فرماں برداری کا حکم دینا صحیح ہوگا۔ جو لوگ زلزلہ سے پہلے گزر گئے خواہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں خطاب کے وقت موجود تھے یا آئندہ پیدا ہونے والے تھے کوئی فریق بھی زلزلہ سے دہشت زدہ نہیں ہو سکتا جب زلزلۂ ساعت کو دیکھا ہی نہیں تو اس کی ہولناکی سے دہشت زدہ ہو کر تقویٰ اختیار کرنے کا مفہوم ہی کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زلزلۂ ساعت نفخۂ بعث اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کے بعد ہوگا علیمی نے بھی اسی تفسیر کو پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ آیت میں مرضعہ کا بچہ کی طرف سے غافل ہونا اور حاملہ کا حمل ساقط ہو جانا بطور مجاز صرف تمثیلی شکل میں کہا گیا ہے حقیقی معنی مراد نہیں زلزلہ کی ہولناکی اور دہشت کی بطور تشبیہ تصویر کشی کی گئی ہے یہ مطلب نہیں کہ واقع میں زلزلہ کے وقت ایسا ہوگا بھی۔ اسی طرح دوسری آیت ہے يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ظاہر ہے کہ قیامت کا دن کسی بچے کو بوڑھا نہیں کر دے گا بلکہ یکدم غمناک شدت آگیں دن کے وقوع کی تمثیلی تعبیر ہے۔ اس تفسیر کی تائید حدیث مبارک سے بھی ہوتی ہے امام احمد اور ترمذی نے حضرت عمران بن حصین کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کی سند کو صحیح بھی کہا ہے حضرت عمران نے فرمایا ہم رسول اللہ کے ساتھ تھے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا...... عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ تک نازل ہوئی حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دن کون سا ہوگا صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی جانے۔ فرمایا یہ دن وہ ہوگا جس میں اللہ حضرت آدم سے فرمائے گا (اپنی نسل میں سے) دوزخ کا حصہ بھیجو۔ الحدیث

بغوی نے لکھا ہے حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ یہ دونوں آیتیں غزوۂ بنی مصطلق کے دوران رات کے وقت نازل ہوئیں حضور نے ندا کرا کے سب کو بلوایا اور یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں آیات کو سن کر لوگ اتنا روئے کہ اس رات سے زیادہ رونے والے کبھی نہیں دیکھے گئے صبح ہوئی تو لوگوں نے گھوڑوں سے زینیں نہیں اتاریں نہ ڈیرے لگائے نہ ہانڈیاں پکائیں کچھ لوگ روتے رہے کچھ غمگین پریشان سوچ میں بیٹھے رہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کون سا دن ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور رسول ہی جانتے فرمایا یہ وہ دن ہوگا جب اللہ آدمؑ سے فرمائے گا اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ بھیجو حضرت آدم عرض کریں گے کیا سب میں سے۔ کتنا کتنا۔ اللہ فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے دوزخ کی طرف اور ایک جنت کی طرف۔ اس بات کی ضرب صحابہ پر بہت سخت پڑی وہ رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ پھر کون نجات

پائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم خوش ہو جاؤ اور سیدھی چال رکھو تمہارے ساتھ دو مخلوقیں اور بھی ہوں گی جو ہر قوم سے زائد ہوں گی یعنی یاجوج و ماجوج پھر فرمایا مجھے امید ہے کہ تم کل اہل جنت کا ایک تہائی حصہ ہو گے یہ سن کر لوگوں نے اللہ اکبر کہا، اور اللہ کی حمد کی، حضور ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ تم کل اہل جنت میں آدھے ہو گے، صحابہ نے یہ (بشارت) سن کر اللہ اکبر کہا اور اللہ کا شکر ادا کیا پھر حضور ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ تم کل اہل جنت میں آدھے ہو گے۔ صحابہ نے یہ (بشارت) سن کر اللہ اکبر کہا اور اللہ کا شکر ادا کیا پھر حضور ﷺ نے فرمایا مجھے تو (اب) یہ امید ہے کہ تمہاری تعداد اہل جنت کی دو تہائی ہو گی اہل جنت کی بیس قطاریں ہوں گی جن میں اسی میری امت کی ہوں گی اور کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد اتنی (کم) ہو گی جیسے اونٹ کے پہلو پر تل یا گھوڑے کے پاؤں پر دوسرے رنگ کی لکیر (یا دھبہ) بلکہ جیسے سفید بیل کی پشت پر ایک سیاہ بال یا سیاہ بیل کی پشت پر ایک سفید بال پھر فرمایا میری امت کے ستر ہزار آدمی بلا حساب جنت میں جائیں گے حضرت عمرؓ نے (بطور تعجب) کہا ستر ہزار فرمایا ہاں اور ہر ایک کے ساتھ ستر (ستر) ہزار یہ سن کر عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ دعا فرمائیے کہ) اللہ مجھے ان میں سے کر دے فرمایا تم ان میں سے ہو اس کے بعد ایک انصاری کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا (یا رسول اللہ ﷺ) اللہ سے دعا فرمائیے کہ اللہ مجھے بھی ان میں شامل کر دے، فرمایا عکاشہ تم سے سبقت لے گئے۔

جو لوگ زلزلۂ ساعت کو نفخۂ اول سے پہلے مانتے ہیں ان کی طرف سے اس حدیث کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ جس روز حضرت آدم کو حکم ہو گا کہ اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ نکالو، اسی روز زلزلہ بھی آئے گا۔ یہی حدیث کا مفہوم ہے یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اس حکم اور وقوع زلزلہ کا وقت ایک ہی ہو گا تو اسی کے ساتھ دوسرے ہولناک واقعات کا بھی ذکر فرما دیا جو اس روز نمودار ہوں گے ان واقعات میں ایک دہشت ناک بات اولاد آدم میں سے دوزخ کا حصہ نکالنا بھی ہو گا جس کا حضور نے ذکر کر دیا۔

حضرت مفسرؒ نے فرمایا یہ جواب کمزور ہے کیونکہ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت ان الفاظ کے ساتھ لائی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ فرمائے گا۔ آدم! حضرت آدم جواب دیں گے حاضر، حاضر اور ساری خیر تیرے ہاتھوں میں ہے اللہ فرمائے گا دوزخ میں بھیجا جانے والا حصہ نکالو آدم عرض کریں گے دوزخ کا کتنا حصہ ہے اللہ فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے، اس وقت بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حاملہ عورت اسقاط حمل کر دے گی، تم لوگوں کو متوالا دیکھو گے حالانکہ وہ (شراب کے) نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہو گا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ ہزار میں سے ایک ہم میں سے کون ہو گا، فرمایا تم میں سے (ایک دوزخی) ہو گا اور یاجوج و ماجوج میں سے ہزار پھر فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں امید رکھتا ہوں کہ تم جنت والوں کا چہارم حصہ ہو گے ہم نے یہ سن کر تکبیر کہی، حضور ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت کا ایک تہائی حصہ ہو گے ہم نے یہ سن کر تکبیر کہی فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ تم لوگ اہل جنت کے آدھے ہو گے۔ ہم نے اللہ اکبر کہا فرمایا تم لوگ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت (دوزخ کے اندر) اتنے ہو گے جیسے ایک کالا بال سفید بیل کی کھال پر یا جیسے ایک سفید بال کالے بیل کی کھال پر۔

یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ بچہ کا بوڑھا ہو جانا، حاملہ کا حمل گر جانا اور دوزخ کا حصہ نکالنے کا حکم ایک ہی وقت میں ہو گا بلکہ مردوں کا قبروں سے اٹھایا جانا زلزلہ سے پہلے ہو گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ (کی ذات صفات اور احکام) میں بغیر علم کے جھگڑا کرتے ہیں۔

یہ آیت نضر بن حارث کے متعلق نازل ہوئی نضر بڑا جھگڑالو تھا کہتا تھا ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں قرآن گزشتہ لوگوں کی لکھی ہوئی (داستان) ہے یہ شخص حشر جسمانی کا منکر تھا اور کہتا تھا جو چیز خاک ہو گئی اس کو زندہ کرنا ناممکن ہے۔ رواہ ابن ابی حاتم عن ابی مالک۔

وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ﴿۳﴾ اور جھگڑا کرنے میں یا عام احوال زندگی میں) ہر شیطان شریر کی پیروی کرتا

ہے۔ شیطان کا لفظ انسان اور جن دونوں کو شامل ہے۔ مرید خیر سے خالی شر میں ڈوبا ہوا مرد کا معنی ہے خالی ہونا۔ امرد بے داڑھی مونچھ کا لڑکا جو چہرے کے بالوں سے خالی ہوتا ہے۔ مرید اور مارد دونوں ہم معنی ہیں۔ قاموس میں ہے مرد (باب نصر و کرم) مرودا (مصدر) مرید مارد متمرد (صفات کے صیغے) اقدام کیا یا سرکش ہو گیا۔ مردہ اس کو کاٹ دیا۔ مرد علی الشئی اس چیز کا مشتاق ہو گیا۔

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ۞

اللہ نے شیطان کے متعلق یہ لکھ دیا ہے یعنی فیصلہ کر دیا ہے کہ جو شخص اس کے پیچھے چلے گا شیطان ضرور اس کو راہ سے بھٹکا دے گا اور عذاب دوزخ کی راہ اس کو دکھا دے گا (یا عذاب دوزخ تک اس کو پہنچا دے گا) یعنی شیطان کی سرشت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے چلنے والے کو سیدھے راستے سے بہکا دیتا ہے اور ایسی راہ چلنے پر آمادہ کرتا ہے جو عذاب دوزخ تک لے جاتی ہے۔

زجاج نے کہا انہ کی ضمیر شیطان کی طرف راجع ہے اور تولی کا معنی دوستی کی محبت کی یا تسلط اور غلبہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہے اور شیطان کی یہ فطرت ہے کہ جس شخص سے وہ محبت اور دوستی کرتا ہے یا جس شخص پر تسلط جماتا ہے اس کو بھٹکا دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ اے لوگو! اگر تم کو (حشر جسمانی اور دوبارہ) جی اٹھنے (کے امکان) میں کوئی شک ہے۔

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ

تو (غور کرو کہ) ہم نے تم کو خاک سے بنایا پھر ایک بوند سے پھر خون کے جمے ہوئے لوتھڑے سے پھر مکمل اور نامکمل بوٹی سے یعنی اگر دوبارہ جی اٹھنے کے امکان میں تم کو شک ہے تو اپنی ابتدائی تخلیق پر غور کرو تمہارا شک دور ہو جائے گا۔

خلقنکم ہم نے تمہاری جنس کو یعنی آدمی کو پیدا کیا۔ لفظ کم اس بچے کو بھی شامل ہے جو گر جاتا ہے، ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ آدمی بننے کی اس میں بھی صلاحیت ہوتی ہے من تراب یعنی تمہارے باپ آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا یا یہ مطلب ہے کہ تم کو مادہ منویہ سے پیدا کیا اور مادہ منویہ تمہاری کھائی ہوئی غذاؤں میں سے پیدا ہوتا ہے اور غذائیں مٹی سے پیدا ہوتی ہیں من نطفۃ نطفہ سے مراد ہے منی یہ لفظ نطف سے مشتق ہے۔ علقۃ خون کا جما ہوا لوتھڑا۔ مضغۃ گوشت کا ٹکڑا۔ اصل میں مضغہ کسی چیز کے اتنے حصے کو کہتے ہیں جو چبایا جاتا ہے۔

مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ کی تشریح میں حضرت ابن عباس نے فرمایا مکمل بناوٹ والا اور ناتمام ساخت والا مجاہد نے کہا مصورہ اور غیر مصورہ (یعنی جس کی صورت بنا دی گئی یا وہ جس کی صورت ابھی نہیں بنائی گئی) بعض علماء نے کہا مخلقہ سے وہ بچہ مراد ہے جو اپنی پوری مدت حمل گزار کر اپنے وقت پر پیدا ہوتا ہے اور غیر مخلقہ سے مراد ہے وہ بچہ جو وقت سے پہلے ساقط ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا مخلقہ وہ بچہ جو ٹھیک درست حالت میں پیدا ہو نہ اس کے اعضاء میں کوئی کمی ہو نہ عیب اور غیر مخلقہ وہ بچہ جو ناقص الخلقۃ یا عیب دار ہو گویا بچہ جب بوٹی ہونے کی حالت میں ہوتا ہے اسی وقت اس کی سرشت میں تفاوت ہوتا ہے کوئی کامل الخلقۃ چکنا بے عیب ہوتا ہے اور کوئی اس کے خلاف ہوتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں کی بناوٹ صورتوں نقشوں قد کی لمبائی اور پستی اور جسمانی اعضاء کی تکمیل یا کمی کے لحاظ سے باہم تفاوت ہے اس تفسیر پر غیر مخلقہ سے مراد وہ بچہ نہ ہو گا جو وقت سے پہلے گر جاتا ہے اور نہ اس توجیہ کی ضرورت ہو گی کہ ساقط ہو جانے والے بچے میں بھی آدمی بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لئے لفظ کم اس کو بھی شامل ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ غیر مخلقہ سے مراد ہے قبل از وقت گرنے والا بچہ اس لئے مؤخر الذکر قول غلط ہے اور مذکورہ بالا اقوال صحیح ہیں۔

بغوی نے بروایت علقمہ حضرت ابن مسعود کا بیان نقل کیا ہے کہ رحم کے اندر جب نطفہ کا ٹھہراؤ ہو جاتا ہے تو ایک

فرشتہ اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ مخلقہ ہے یا غیر مخلقہ اگر اللہ فرماتا ہے غیر مخلقہ تو رحم اس کو خون کی شکل میں (باہر) پھینک دیتا ہے اور وہ نسمہ (جان دار) نہیں بن سکتا اور اگر اللہ مخلقہ فرماتا ہے تو فرشتہ عرض کرتا ہے نر یا مادہ بدبخت یا سعید اس کی مدت زندگی کتنی ہے۔ اس کا عمل کیسا ہے اس کا رزق کیا ہے۔ حکم ہوتا ہے جا لوح محفوظ کو جا کر دیکھ تجھے سب کچھ اس میں مل جائے گا، فرشتہ جاتا ہے اور لوح محفوظ میں سب کچھ لکھا پاتا ہے اور اس کی نقل کر لیتا ہے اور وہ نقل اس کے پاس رہتی ہے۔

لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ تاکہ ہم تمہارے سامنے واضح کر دیں۔ اس تدریج سے تم پر اپنی قدرت و حکمت کے کمال کو ظاہر کر دیں اور تم وجود حشر پر اس سے استدلال کر سکو اور سمجھ جاؤ کہ جو چیز ابتدائی تخلیق میں تغیر کی قابل ہے اور اولین خلقت جس اللہ نے اس کی کی ہے وہ دوبارہ بھی تغیر کو قبول کر سکتی ہے اور خدا اس کو دوبارہ بھی زندہ کر کے اٹھا سکتا ہے۔

بعض علماء نے لِنُبَيِّنَ لَكُمْ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ہم تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیں کہ تم کیا کرو اور کیا نہ کرو اور تم اپنی عبدیت میں کن چیزوں کے ضرورت مند ہو یعنی احکام تکلیفہ کا مامور بنانے کے لئے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے۔

وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى اور رحم کے اندر ہم جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک معین مدت تک (یعنی وضع حمل کے وقت تک) ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ یعنی ہم ہی رحموں کے اندر جتنی مدت ٹھہرانا اور رکھنا چاہتے ہیں اس مدت تک جو اللہ کے نزدیک مقرر اور معلوم ہے ٹھہرائے رکھتے ہیں اس مدت کے اندر رحم بچہ کو باہر نہیں پھینکتے اور نہ اسقاط حمل ہوتا ہے۔

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ پھر ہم تم کو باہر لاتے ہیں یعنی ماں کے پیٹ سے باہر لاتے ہیں۔

طِفْلًا ایسی حالت میں کہ تم چھوٹے بچے ہوتے ہو۔

ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ پھر (ہم تمہاری پرورش کرتے رہتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری قوت کو پہنچ جاؤ۔

اشد شدت کی جمع ہے جیسے انعم نعمۃ کی یعنی تم اپنی عقلی اور جسمانی طاقت کے اس کمال کو پہنچ جاؤ جو اللہ کی طرف سے تمہارے لئے مقرر کر دیا گیا ہے علماء نے کہا ہے کہ ذہنی و جسمانی طاقتوں کا کمال ۳۰ برس اور ۴۰ برس کی عمر کے درمیان پورا حاصل ہو جاتا ہے۔

وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ اور تم میں سے کچھ لوگ (تو بھرپور طاقت پر پہنچ کر یا اس سے پہلے ہی) وفات پا جاتے ہیں۔

وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ اور کچھ لوگوں کو بالکل ناکارہ عمر تک پھیر دیا جاتا ہے یعنی انتہائی پیری اور سن خرافت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جان چکنے کے بعد پھر نادان ہو جاتا ہے۔ لکیلا میں لام عاقبت کا ہے (عاقبت بمعنی نتیجہ) یعنی جس طرح ابتداء طفولیت میں فہم کی کمی اور دانش کی کمزوری کی وجہ سے کچھ نہیں جانتا تھا انتہائی بوڑھا ہونے کے بعد بچپن کی ہیئت پر ہو جائے اور زندگی میں جو کچھ جانتا تھا اسکو بھول جائے۔ عکرمہ نے کہا جو شخص قرآن پڑھتا ہے اس کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ امکان حشر کی یہ دوسری دلیل ہے مختلف حدود عمر میں انسان کے احوال بدلتے رہتے ہیں اور متضاد امور کا اس پر ورود ہوتا رہتا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے تو جو ذات ان تبدیلات و تغیرات پر قادر ہے وہ ان جیسی تبدیلات دوبارہ بھی کر سکتی ہے (یعنی انسان کی پوری زندگی موت و حیات اور فناء و پیدائش کی کشمکش کا نام ہے ہر آن احوال کا تغیر اور زندگی کے بعد موت کا ورود اور موت کے پیچھے زندگی کا ظہور ہے۔ جہالت کے بعد علم اور علم کے بعد جہالت آتی ہے جسمانی اور ذہنی قوتوں کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے مبدء آفرینش اور منتہاء حیات کے درمیان تغیرات، تبدیلات اور ترقیات و تنزلات کا ایک جہان ہے جو اللہ کی قدرت کے زیر اثر رواں دواں ہے پس بعث بعد الموت بھی اگر ظہور پذیر ہو جائے تو

امکان سے باہر نہیں اور قدرت الہیہ اس سے عاجز نہیں۔ مترجم)

وَ تَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝ اور تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک پڑی ہے پھر جب اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی اور پھولتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے۔

ھَامِدَۃً مردہ خشک ھمدت النار آگ راکھ ہوگئی۔ اھتزت سبزہ کی روئیدگی کے سبب ملنے لگی (لہلہانے لگی) ربت بڑھ گئی، ابھر آئی پھول گئی۔ مبرد نے کہا زمین کی طرف لہلہانے اور ابھرنے کی نسبت بطور مجاز کی گئی ہے مضاف محذوف ہے (یعنی مجاز بالحذف ہے۔ مترجم) مراد ہے سبزہ کا لہلہانا اور ابھرنا۔ من کل زوج میں من زائد ہے اور زوج کا معنی ہے ہر صنف ہر قسم بھیج خوبصورت۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے بھجۃ خوشی۔ بہج (باب کرم) سے (صیغہ صفت) بہج اور مبہاج (آتا ہے) اور بہج (باب سمع) خوش ہوا (اس سے صیغہ صفت) بہیج اور بہج (آتا ہے) اور بہج (باب فتح سے نیز ابہج (باب افعال سے) خوش کیا۔ ابتہاج (افتعال) خوشی۔ انزلنا اور اہتزت اور ربت اور انبتت سب افعال استعمال کئے اور (بجائے جملہ اسمیہ کے) اس جگہ جملہ فعلیہ ذکر کرنا یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ وقتاً فوقتاً پیہم ایسا ہوتا رہتا ہے ثبوت حشر کی یہ تیسری دلیل اللہ نے بیان فرمائی ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَأَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ اللہ ہی ہستی میں کامل ہے اور وہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ذلک سے اشارہ مذکورہ بالا تفصیل کی طرف ہے یعنی انسان کی تخلیقی نیرنگیاں اور تضاد احوال اور مردہ ہونے کے بعد زمین کا زندہ ہونا اور سبز ہوکر لہلہانا اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے بذات خود متحقق ہے واجب الوجود ہے اسی کی وجہ سے دوسری تمام چیزوں کا وجود ہے اگر وہ نہ ہوتا تو کسی ممکن کا پردہ عدم سے نکل کر سطح وجود پر آنا ممکن نہ ہوتا۔ اور وہ ہی بے جان نطفہ اور مردہ زمین کو زندگی عطا فرماتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے کیونکہ اس کی قدرت بذات خود ہے اور اس کی قدرت کی ہر چیز سے نسبت برابر ہے۔ اس لئے کوئی چیز بھی اس کی قدرت سے باہر نہیں اور مشاہدہ دلالت کر رہا ہے کہ وہ بعض مردوں کو زندہ کرتا ہے اور یہ اس کی قدرت سے خارج نہیں ہوسکتا، وہ ہر مردہ کو زندہ کرسکتا ہے خواہ وہ بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈی ہو جائے۔

وَّأَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ اور یقیناً (دنیا کے ختم ہونے کی) ساعت ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ گونا گوں تغیرات کا ظہور اختتام دنیا کا پیش خیمہ ہے۔

وَّأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ اور یہ بات قطعی ہے کہ اللہ قبروں والوں (یعنی مردوں) کو زندہ کر کے اٹھائے گا کیونکہ اس نے اس کا وعدہ فرمالیا ہے اور وعدۂ خداوندی کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔

اول الذکر تینوں جملے علت فاعلہ کو ظاہر کر رہے ہیں یعنی انسان کی تخلیقی نیرنگیاں اور متضاد احوال میں نو بنو تبدیلیاں اور مردہ زمین کو زندہ کرنا علت فاعلہ کی حیثیت میں ہے اور آخر کے دونوں جملے نتیجہ دلیل یا علت غائیہ کی طرح ہیں انسان وغیرہ کی تخلیق بیکار نہیں ہے آدمی کی تخلیق کا مقصد اللہ کی معرفت وعبادت ہے معرفت پر عبادت مرتب ہوتی ہے اور عبادت پر جزا وسزا کی بنا ہے اگر قانون جزا وسزا نہ ہو تو مومن ومنکر اور فرماں بردار و مجرم مساوی ہوجائیں گے اور عدل کا تصور ختم ہوجائے گا۔ اللہ نے فرمایا ہے کیا ہم اہل اطاعت کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہارا یہ کیسا فیصلہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم (بدیہی) کے اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں علم سے مراد ہے علم بدیہی

اور ہدیٰ سے مراد ہے علم استدلالی و نظری جو معرفت الٰہیہ تک پہنچانے والا ہو اور کتاب روشن سے مراد کسی آدمی پر اللہ کی اتاری ہوئی کتاب جو حق کی مظہر ہو انسانی علم کے یہی تین ذرائع ہیں (علم ضروری یعنی علم بدیہی جو نظر و فکر اور سوچ بچار کا محتاج نہیں ہے محض حسی ہے، دوسرا علم نظری و استدلالی جو غور و فکر اور ترتیب معلومات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تیسرا نقلی علم جو اللہ کی نازل کردہ کتاب سے حاصل کیا گیا ہو۔ مترجم)

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ تکبر کرتے ہوئے تاکہ اللہ کی راہ (یعنی دین حق) سے (لوگوں کو) بے راہ کر دیں۔

عطف پہلو۔ جانب عطفین دونوں پہلو، دایاں بایاں۔ روگردانی اور اعراض کے وقت جس حصہ بدن کو آدمی موڑ لیتا اور گھما لیتا ہے اس کو عطف کہتے ہیں۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد ہے گردن نیوڑانا۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب اس کو حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو غرور اور تکبر سے وہ گردن نیوڑاتا اور رخ پھیر لیتا ہے کذا قال ابن عطیۃ و ابن زید و ابن جریج۔

لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ اس کے لئے دنیا میں رسوائی (ذلت) ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلانے والی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ خزی سے مراد ہے قتل و قید چنانچہ (اس پیشین گوئی کے مواقف) نضر بن حارث اور قصبہ بن ابی معیط قتل کئے گئے اور ستر دوسرے کافر جنگ بدر میں مارے گئے اور ستر قید ہوئے۔ جلال الدین محلی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول ابو جہل کے متعلق ہوا ابو جہل غزوہ بدر میں مارا گیا۔ حریق بمعنی محرق جلانے والا۔ مراد آگ۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (اس سے کہا جائے گا) یہ تیرے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

یعنی قیامت کے دن جب ان کو عذاب دیا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کہ تم نے جو کفر و گناہ کیا تھا یہ تمہارے اسی کرتوت کی سزا ہے اور اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے یعنی انصاف کرنے والا ہے اور عدل کا تقاضا ہے کہ کفر و گناہ کی سزا دی جائے ظالم نہ ہونے سے بطور کنایہ مراد ہے عادل ہونا جیسے آیت لا یحب اللّٰہ الجھر میں عدم محبت سے مراد ہے نفرت اور ناپسندیدگی۔

بخاری، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ بعض لوگ مدینہ میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے اسلام کے بعد اگر اس کی بیوی کے لڑکا ہوتا اور گھوڑیوں کے بچے پیدا ہوتے تو کہتا یہ مذہب اچھا ہے اور عورت کے لڑکا نہ ہوتا اور گھوڑیوں کے بچے نہ پیدا ہوتے تو کہتا یہ دین برا ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کنارہ پر کھڑا ہو۔

اہل تفسیر نے لکھا ہے حرف کا معنی ہے کنارہ مراد ہے شک۔ شک کرنے والا منافق دونوں گروہوں کے کنارے پر ہوتا ہے مومنوں کے گروہ کے بھی کنارے پر اور کافروں کے گروہ کے بھی کنارے پر کبھی ادھر مڑ جاتا ہے کبھی ادھر گویا منافق فوج کے آخری کنارے پر ہوتا ہے اگر فتح محسوس کرتا ہے تو ٹھہرا رہتا ہے اگر شکست محسوس کرتا ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

ابن ابی حاتم اور بغوی نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ان بدوی دیہاتیوں کے متعلق ہوا جو صحرا کو چھوڑ کر مدینے میں آکر مسلمان ہو جاتے اور وہیں رہ پڑتے تھے، اگر قیام مدینہ کے زمانے میں ان کی صحت درست رہتی بیویوں کے لڑکے پیدا ہوتے اور گھوڑیوں کے خوبصورت بچھیرے ہوتے تو کہتے یہ اچھا مذہب ہے اور اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا اور اگر اسکے خلاف ہوتا یعنی ان کی صحت بگڑ جاتی عورتوں کے لڑکیاں پیدا ہوتیں اور گھوڑیاں حاملہ نہ ہوتیں اور مال کم ہو جاتا تو کہتے جب سے ہم اس مذہب میں داخل ہوئے ہیں ہم کو کوئی بھلائی حاصل نہیں ہوئی یہ کہہ کر اسلام سے مرتد ہو جاتے اور ایمان سے منہ موڑ لیتے۔ آیت مذکورہ

میں علی حرف کا یہی مطلب ہے اور ذیل کی آیت میں اسی کی تشریح فرمائی ہے۔

فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ اب اگر اس کو کوئی دنیوی نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پالیا اور اگر اس پر کوئی آزمائشی مصیبت آگئی تو منہ اٹھا کر کفر کی طرف چل دیا دنیا اور آخرت دونوں کھو بیٹھا یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

یعنی اگر اس کو کوئی بھلائی (دنیوی منفعت) پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی عبادت اور اسلام پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اس کو کچھ دکھ پہنچ جاتا ہے اور کوئی تکلیف اور سختی آجاتی ہے تو وہ دین سے پھر کر کفر کی جانب ایڑیوں کے بل پلٹ پڑتا ہے۔

ابن مردویہ نے بوساطت عطیہ حضرت ابو سعید کی روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی مسلمان ہو گیا اسلام لانے کے بعد اس کی آنکھیں جاتی رہیں اور مال و اولاد کا بھی نقصان ہو گیا اس نے اسلام سے براشگون لیا اور خیال کیا کہ یہ ساری مصیبت مجھ پر مسلمان ہونے کی وجہ سے آئی ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا (میری بیعت) مجھے واپس کر دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسلام واپس نہیں کیا جاتا۔ کہنے لگا میں نے تو اپنے اس مذہب میں کوئی بھلائی نہیں پائی میری نظر جاتی رہی اور مال بھی جاتا رہا اور بچہ بھی مر گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے یہودی اسلام لوگوں کا میل صاف کرتا ہے جیسے آگ سے لوہے سونے اور چاندی کا میل صاف ہوتا ہے۔

خَسِرَ الدُّنْيَا الخ یعنی دنیوی مصائب کی وجہ سے دین سے مرتد ہونے والے کی دنیا بھی تباہ ہو گئی مال اور اولاد کا نقصان ہو گیا اور جو امیدیں اس نے باندھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور آخرت میں خسران نصیب ہوا کہ سارے اعمال برباد گئے اور ہمیشہ دوزخ میں جلنا پڑے گا یہ ایسا کھلا ہوا خسران ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی گھاٹا نہیں۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑫

وہ اللہ کے سوا ایسے کی عبادت کرتا ہے جو نہ اس کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ یہ ہی پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

یعنی وہ ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے کہ اگر اس کی پوجا نہ کرے تو وہ چیز اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتی اور اس کو پوجے تو وہ فائدہ نہیں دے سکتی۔ ایسی چیز کی پوجا ایک بھٹکاوا ہے حق سے دور۔ فعلال کا اس جگہ معنی بھٹکنا حق کا راستہ نہ ملنا، راہ مستقیم سے دور ہو جانا ہے ضل فی التیہ وہ بیابان میں بھٹک گیا سیدھے راستے سے دور ہو گیا۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ وہ عبادت کرتا ہے ایسے کی جس (کی عبادت) کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب الوقوع ہے۔ یعنی کافر جس کی پوجا کرتا ہے اس کی عبادت کا ضرر اس موہومی فائدے سے زیادہ قریب ہوتا ہے جس کی تمنا کافر کے دل میں ہوتی ہے۔ نفع سے مراد ہے امید سفارش اور بارگاہ الٰہی تک پہنچنے کا وسیلہ بنانا۔ عرب کا محاورہ ہے کہ جو چیز بالکل موجود نہ ہو اس کے متعلق بعد کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں چیز بعد ہے یعنی معدوم ہے اللہ نے فرمایا ہے ذلک رجع بعید یہ لوٹنا بعید ہے یعنی ہو نہیں سکتا چونکہ بتوں سے فائدہ حاصل ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے ضرہ اقرب من نفعہٖ فرمایا مطلب یہ ہے کہ بت پرستی کا ضرر ضرور ہو گا۔

لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬ ایسا کارساز بھی بہت برا اور ایسا رفیق بھی بہت برا۔

مولیٰ بمعنی مددگار، بعض نے کہا اس جگہ بمعنی معبود ہے۔ عشیر ساتھی، رفیق مرادبت، شوہر کو عشیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت کا ساتھی اور رفیق معاشرت ہوتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ دوسرا یدعو پہلے یدعو کی تاکید ہے اور لفظی تکرار ہے اور لمن سے دوسرا کلام شروع ہوتا ہے یہ محذوف قسم کا جواب ہے اور من موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مبتداء ہے اور لَبِئْسَ الْمَوْلٰى الخ خبر ہے بعض کے نزدیک لمن کا لام یدعو سے متعلق ہے اور یدعو کا معنی ہے وہ گمان رکھتا ہے اس کا زعم ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۱۴﴾ بلاشبہ اللہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے بہشت کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی بیشک اللہ جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے۔

یعنی اللہ مومن کو جزا اور مشرک کو سزا دینا چاہتا ہے اور کوئی اس کے فیصلہ کو روک نہیں سکتا اور اس کی منشاء کو رد نہیں کر سکتا۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ جو شخص یہ خیال یا گمان کرتا ہو کہ اللہ اس (نبی محمد ﷺ) کی مدد دنیا و آخرت میں ہرگز نہیں کرے گا۔ اس کلام میں کسی قدر اختصار ہے پورا کلام اس طرح تھا، اللہ دنیا و آخرت میں اپنے رسول کی مدد ضرور کرے گا۔ اب جو شخص رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھنے کی وجہ سے یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ اپنے رسول کی نصرت نہ دنیا میں کرے گا نہ آخرت میں۔

فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴿۱۵﴾

تو اس کو چاہئے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے پھر اس کے ذریعے سے آسمان تک پہنچ کر اس وحی کا سلسلہ ہی کاٹ دے پھر غور کرے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس کی ناگواری کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کر سکتی ہے۔

لیقطع یعنی اس کو چاہئے کہ خود اپنا گلا گھونٹ لے۔ قطع اس نے اپنا گلا گھونٹ لیا۔ محتنق وہ شخص جس نے اپنی سانس کے آمد و رفت کے راستے کاٹ دیئے ہوں، بند کر دیئے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ خود اپنے غصہ میں دانت پیستا ہے اور غضب آلود آدمی جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ کر گزرے یہاں تک کہ مر جائے۔ حاسد سے کہا جاتا ہے اگر تو اس پر راضی نہیں تو اپنا گلا گھونٹ کر خود مر جا۔ آیت میں امر تعجیز کے لئے ہے ابن زید نے کہا آیت میں السماء سے مراد آسمان دنیا ہے مطلب یہ ہے کہ جو شخص خیال کرتا ہو کہ اللہ اپنے نبی کی مدد نہیں کرے گا اس کو چاہئے کہ اس سلسلہ کو جڑ سے ہی کاٹ دے اور رسی تان کر آسمان دنیا تک پہنچ جائے اور وہاں سے آنے والی خداوندی نصرت کو روک دے یا یہ مطلب ہے کہ آسمان دنیا تک پہنچ کر وہاں سے وحی کا آنا بند کر دے۔

بغوی نے لکھا ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی اسد اور بنی غطفان کے حق میں ہوا، ان دونوں قبیلوں کا یہودیوں سے باہم امداد کا معاہدہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا ہمارے لئے مسلمان ہونا ممکن نہیں کیونکہ ہم کو اندیشہ ہے کہ اللہ محمد کی مدد نہیں کرے گا اور مسلمان ہونے کے بعد ہمارا یہودیوں سے معاہدہ ٹوٹ چکا ہو گا وہ ہم کو غلہ دیں گے نہ ٹھہرنے کو جگہ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد نے کہا نصر کا معنی ہے رزق عرب کہتے ہیں من نصرنی نصرہ اللہ جو مجھے دے گا اللہ اس کو دے گا (یا جو مجھے دے اللہ اس کو دے) ابو عبیدہ نے کہا عربی میں ارض منصورہ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر بارش ہو گئی ہو اس صورت میں ینصرہ کی مفعولی ضمیر من کی طرف راجع ہو گی مطلب یہ ہو گا کہ جو شخص اللہ پر بدگمانی رکھتا اور خیال کرتا ہو کہ مسلمان ہونے کے بعد اللہ اس کو رزق نہیں دے گا وہ اپنے گھر کی چھت میں رسی باندھ کر اپنے گلے میں پھندا ڈال کر مر جائے یا یہ مطلب ہو گا کہ ایک رسی تان کہ اس کے ذریعہ سے قطع مسافت کر کے آسمان دنیا تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنا رزق لے آئے۔

فلینظر یعنی اپنا گلا گھونٹنے یا قطع مسافت کرنے یا رسی تاننے کا ارادہ کرنے کے بعد اپنے دل میں سوچے۔

ھل یذھبن کیدہ کہ اس کی یہ تدبیر اور یہ عمل اس کے غصے کی آگ کو فرو کرتا ہے یا اللہ کی اس مدد کو جو اللہ کے رسول کو حاصل ہے اور جو اس (حاسد) کو غضبناک بنا رہی ہے دفع کر سکتا ہے۔ حاسد کے عمل کو کید (تدبیر) فرمایا کیونکہ حاسد کا فری کوشش کا آخری تصور بس یہی ہو سکتا ہے۔ سوال انکاری ہے اور مَنْ كَانَ يَظُنُّ الخ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ کی تاکید ہے یعنی جس طرح حاسد کا غصہ اور غضب اللہ کی اس نصرت کو نہیں روک سکتا جو خدا کی طرف سے اللہ کے رسول اور مومنوں کو حاصل ہے اسی طرح اس ملعون کا حسد اللہ کے کسی حکم اور ارادے کو نہیں دفع کر سکتا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾ اور ہم نے اس (قرآن) کو اسی طرح اتارا ہے جس میں کھلی کھلی دلیلیں (حق کی) ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے حق کی ہدایت کرتا ہے۔

کذلک یعنی جس طرح ہم نے وہ آیات نازل کیں جن سے امکان حشر توحید صداقت رسول اور نصرت رسول کے وعدے کی سچائی ثابت ہو رہی ہے اسی طرح ہم نے ایسی آیات نازل کی ہیں جن کے اندر رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کا واضح بیان ہے۔

لفظ آیات بینات سے ایک شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کی کچھ آیات محکمات ہیں جن کی مراد کھلی ہوئی ہے اور کچھ متشابہات ہیں جن کی مراد واضح نہیں اور اس جگہ تمام آیات کو بینات (واضحات) کہا گیا یہ بیان کا تضاد ہے لیکن بینات کی جو تفسیر ہم نے کی ہے اس سے یہ شبہ زائل ہو جاتا ہے کیونکہ متشابہات کی مراد اگرچہ مخفی ہوتی ہے مگر ان کا معجز ہونا اور صداقت رسول پر دلالت کرنا تو واضح ہوتا ہے۔

وان اللہ یھدی اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو بصورت آیات بینات نازل کیا اور یہ بھی نازل کیا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے۔ (اس صورت میں اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ کا اَنْزَلْنٰهُ پر عطف ہوگا اور مفعول ہونے کی وجہ سے جملہ محل نصب میں ہوگا) دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے یہ قرآن مصالح عباد کے لئے نازل کیا اور اس لئے نازل کیا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ جس کو چاہے ہدایت کردے یا ہدایت پر قائم رکھے (اس صورت میں اس جملہ کا عطف محذوف لفظ پر ہوگا اور حرف جر محذوف ہوگا اور جملہ محل جر میں ہوگا)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اور یہودی اور صابی اور عیسائی اور مجوسی اور مشرکین، اللہ قیامت کے دن ان سب کے درمیان فیصلہ کردے گا۔

الذین اشرکوا سے مراد ہیں بت پرست یفصل بینھم یعنی حق پرست کو باطل پرست سے الگ کردے گا حق پرست کی حق پرستی اور باطل پرست کی باطل پرستی ظاہر کردے گا) یا یہ مراد ہے کہ اللہ ہر ایک کو اس کے مناسب بدلہ دے گا کسی فریق کو جنت میں اور کسی کو دوزخ میں بھجوادے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ بلاشبہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ شہید واقف ہے۔ احوال کا نگراں ہے ممکن نہیں کہ اطاعت گزاروں کو نافرمانوں کی طرح یا اہل حق کو باطل پرستوں کی مثل کردے کیونکہ سب کے ظاہری اور باطنی احوال کا اس کو کامل علم ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ کیا آپ نہیں جانتے کہ جو (ملائکہ) آسمانوں میں ہیں اور جو مومن جن وانس) زمین میں ہیں وہ (سب) اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے بھی من کا استعمال اہل عقل کے لئے ہوتا ہے اس لئے مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد ہیں صرف ملائکہ اور من فی الارض سے مراد ہیں جن وانس۔ اور جن وانس میں سے بھی صرف اہل ایمان مراد ہیں لفظ من اگرچہ عام ہے کافر و مومن دونوں کو شامل ہے لیکن آئندہ آیت وکثیر حق علیہ العذاب سے کافروں کو سجدہ کرنے والے جن وانس سے الگ کر لیا گیا اس لئے اس جگہ مَنْ فِي الْاَرْضِ سے صرف مومن جن وانس مراد ہیں۔

لفظ من کا استعمال کبھی بطور عموم بھی ہوتا ہے (اہل عقل اور بے عقل دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وغیرہ کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور عطف میں مغایرت (معطوف علیہ سے معطوف کی مغایرت) ہونی

عطف کا حقیقی استعمال ہے اس لئے من سے مراد صرف اہل عقل ہیں۔
بیضاوی نے لکھا ہے کہ من کا لفظ اہل عقل اور بے عقل دونوں کو شامل ہے یا بے عقل پر اہل عقل کو غالب قرار دے کر لفظ من استعمال کیا۔ اکثر اہل تحقیق کا قول ہے کہ غیر ناطق کے لئے من کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر ناطق اور غیر ناطق دونوں مراد ہوں تو من کا استعمال ہو جاتا ہے۔ اب اگر لفظ من کے اندر اہل عقل اور بے عقل دونوں کو داخل قرار دیا جائے تو والشمس وغیرہ کا اس پر عطف ایسا ہی ہے جیسے اہمیت کے پیش نظر خاص کا عطف عام پر ہوتا ہے خصوصیت کے ساتھ چاند و سورج وغیرہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ ان کو شہرت حاصل تھی اور سجدہ کرنا ان کی شان سے بعید تھا۔ آیت میں محدثین اور علماء سلف کے نزدیک سجدہ سے مراد ہے طاعت اختیاری کیونکہ جمادات اگرچہ بے جان ہیں لیکن کسی قدر حیات (شعوری) کا حصہ ان کو بھی حاصل ہے اور وہ بھی اپنے اختیار و ارادہ سے اللہ کی طاعت میں سرگرم ہیں اللہ نے آسمان و زمین کے متعلق) فرمایا قالتا اتینا طائعین پتھروں کے متعلق فرمایا وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ایک اور آیت میں آیا ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو پکارتا ہے اے فلاں کیا تیرے اوپر کوئی ایسا شخص گزرا جو اللہ کا ذکر کر رہا ہو۔ رواہ الطبرانی من حدیث ابن مسعودؓ بغوی نے لکھا ہے یہ قول اچھا ہے اور اہل سنت کے قول کے موافق ہے۔

وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ اور بہت سے لوگ بھی اور بہت ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو گیا ہے، دوسرا کثیر پہلے کثیر کی تاکید ہے یا کثرت میں مبالغہ ظاہر کرنے کے لئے لفظ کثیر دوبارہ ذکر کیا ہے۔ اس کثیر سے مراد ہیں کافر، یہ سجدہ کرنے والوں کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔
بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ مَنْ فِي الْاَرْضِ میں من عموم کے لئے ہے اور بمعنی ما ہے اور سجود سے مراد اطاعت تسخیری ہے یعنی تمام ممکنات قدرت کے مسخر ہیں حکم خداوندی سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کی ذات مدبر قدیر کی عظمت پر دلالت کر رہی ہے اور كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ مبتدا ہے اس کی خبر محذوف ہے یعنی بہت لوگوں کے لئے۔ اللہ کے نزدیک ثواب ثابت ہے، یا یوں کہا جائے کہ کثیر من الناس فعل محذوف کا فاعل ہے۔ یعنی بہت سے لوگ اللہ ہی کو سجدہ اطاعت کرتے ہیں، زمین پر پیشانی رکھتے ہیں، دونوں صورتوں میں کثیر من الناس مستقل جملہ ہو گا اور کثیر حق علیہ العذاب دوسرا جملہ ہو گا۔
بعض علماء فقہ کے نزدیک عموم مشترک جائز ہے یعنی ایک لفظ جس کے دو معنی ہوں ایک ہی وقت میں اس لفظ کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں پھر ایک معنی کے اعتبار سے اس کی نسبت ایک امر کی طرف کی جاتی ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے دوسرے امر کی طرف۔ مثلاً اسی مقام میں کثیر من الناس کا عطف کلام سابق پر ہے اور سجود کے دو معنی ہیں۔ (۱) زمین پیشانی رکھنا (۲) فطری طور پر فرماں بردار اور عاجز ہونا حکم سے سرتابی نہ کرنا۔ اس جگہ سجود کے دونوں معنی مراد ہیں کثیر من الناس کی طرف جب سجدے کی نسبت کی گئی تو سجدے سے مراد ہے زمین پر پیشانی رکھنا اور دوسرے ممکنات کی طرف جب سجدے کی اسناد کی گئی تو سجدے سے مراد ہے فطری فرماں برداری اور مسخر حکم ہونا۔ اس کے بعد کثیر حق علیہ العذاب مستقل علیحدہ جملہ ہے یعنی بہت سے لوگ جنہوں نے سجود و اطاعت سے انکار کیا وہ عذاب کے مستحق ہو گئے اور عذاب ان پر ثابت ہو گیا۔

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اور جس کو خدا ذلیل کر دے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں یعنی اللہ جس کو بد بختی کی ذلت دے اس کو خوش بختی کی کوئی عزت نہیں دے سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۞ۧ ﴿۱۸﴾ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ یعنی ذلت دے یا عزت دے جو کچھ کرے وہ مختار ہے۔ سعادت اور شقاوت دینا اس کی مشیت کے ساتھ مخصوص ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ ز یہ دونوں (مذکورۂ بالا) دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے رب کے (دین کے) بارے میں اختلاف کیا۔

ھذان یعنی یہ دو فریق ہیں ایک فریق مومنوں کا دوسرا فریق مذکورۂ بالا پانچوں اقسام کے غیر مسلموں کا ان کا باہم جھگڑا ہے اس بات میں کہ اللہ کا دین کون سا ہے یا اللہ کی ذات و صفات اور احکام کے سلسلہ میں ان کا اختلاف ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آیت هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْ فِیْ رَبِّهِمْ کا نزول حضرت حمزہؓ، حضرت عبیدہؓ، حضرت علیؓ اور عتبہ شیبہ اور ولید بن عتبہ کے متعلق ہوا۔ اول تینوں حضرات مومن تھے اور مؤخر الذکر تینوں اشخاص کافر۔ اس شان نزول کی بنا پر فریق عام مومنوں کا نہ ہوگا اور نہ فریق دوئم اقسام مندرجہ آیت کا فروں کا بلکہ شان نزول خاص ہے۔ (مترجم)

بخاری اور حاکم نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا یہ آیت ہمارے متعلق اور بدر کے دن کافروں سے ہمارے مقابلے کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ حاکم نے دوسری سند سے حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو جنگ بدر کے دن باہم مقابل تھے (ایک طرف علیؓ، حمزہؓ، عبیدہؓ، تھے (دوسری طرف) شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ تھے۔

بغوی نے قیس بن عباد کی وساطت سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قیامت کے دن (کافروں سے) جھگڑا کرنے کے لئے سب سے پہلے میں ہی رحمت (الٰہی) کے سامنے دوزانو بیٹھوں گا۔

قیس نے کہا انہی لوگوں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی جن لوگوں نے بدر کے دن باہم مقابلہ کیا تھا۔ علی حمزہ، عبیدہ، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ انہی کے سلسلہ میں اس آیت کا نزول ہوا۔

محمد بن اسحاق کا بیان ہے بدر کے دن (میدان میں) عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نکل کر آئے اور صف تک پہنچ کر انہوں نے اپنے حریفوں کو میدان میں نکل کر آنے کی دعوت دی ان کے مقابلہ میں عبداللہ بن رواحہ اور تین انصاری جوان عوف، معاذ اور معوذ نکل کر سامنے آئے مؤخر الذکر تینوں جوان حارث کے بیٹے تھے اور ان کی ماں کا نام عفراء تھا۔ فریق اول نے پوچھا تم کون لوگ ہو فریق دوئم نے کہا ہم انصاری ہیں اور نسب میں تمہارے ہمسر اور شرفاء ہیں، فریق اول کے منادی نے پکارا محمد ہمارے مقابلے کے لئے ہمارے ہمسروں کو بھیجو جو ہماری قوم میں سے ہوں۔ (یعنی قریشی ہوں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عبیدہ بن حارث اٹھو حمزہ بن عبد المطلب اٹھو، علی بن ابی طالب اٹھو (یعنی تم تینوں میدان میں جاؤ) حسب الحکم تینوں حضرات نکل کر میدان میں پہنچے۔ فریق اول نے پوچھا تم کون لوگ ہو، فریق دوئم نے اپنے نام بتائے۔ فریق اول نے کہا ہاں تم ہمسر اور شرفاء ہو۔ عبیدہ سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھے انہوں نے عتبہ کو للکارا اور حمزہؓ شیبہ کے مقابلہ پر نکلے اور علی ولید بن عتبہ کے مقابلہ میں پہنچے، حمزہ نے تو دم ہی نہیں لینے دیا۔ فوراً ہی شیبہ کو قتل کر دیا اور علی نے ولید کا کام تمام کر دیا۔ البتہ عبیدہ اور عتبہ کے درمیان چوٹیں رہیں دونوں جمے رہے یہ دیکھ کر حمزہؓ اور علیؓ اپنی تلواریں لے کر عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور قتل کر دیا اور عبیدہ کو اٹھا کر اپنے ساتھیوں کے پاس لے آئے حضرت عبیدہ کی ٹانگ کٹ گئی تھی اور ٹانگ کی مینگ بہہ رہی تھی جب یہ حضرات حضرت عبیدہ کو لے کر خدمت گرامی میں پہنچے تو عبیدہ نے کہا کیا میں شہید نہیں ہوں گا، حضور ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، عبیدہ نے کہا اگر ابو طالب زندہ ہوتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کے ان شعروں کا میں ہی زیادہ مستحق ہوں۔

ابو طالب نے کہا تھا۔

كذبتم وبيت الله يبزى محمد ولما لطاعن دونه ونناصل

ونسلمه حتى نصرع حوله ونذهل عن ابناءنا والحلائل

کعبہ کی قسم تم جھوٹے ہو کہ محمد کی طرف جب تک ہم پورے طور پر نیزہ بازی اور تیر اندازی نہ کرلیں گے محمد کو تم

مغلوب کر سکو گے ہم اس وقت تک ان کو (تمہارے) سپرد نہیں کر سکتے جب تک اپنے اہل وعیال کی طرف سے بے پرواہ ہو کر ان کے گرد ہماری لاشیں نہ پڑی ہوں۔

ابن جریر نے بروایت عوفی حضرت ابن عباس کا قول اور ابن المنذر و ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے اور اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی اہل کتاب نے کہا تھا ہم تمہارے مقابلے میں اللہ سے زیادہ قرب رکھتے ہیں ہماری کتاب تمہاری کتاب سے اور ہمارا نبی تمہارے نبی سے مقدم ہے مسلمانوں نے کہا ہم قرب الٰہی کے زیادہ مستحق ہیں ہم اپنے نبی محمد ﷺ پر اور تمہارے نبی پر اور اللہ کی نازل کی ہوئی ہر کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور تم ہمارے نبی کو بھی پہچانتے ہو اور ہماری کتاب کو بھی اور محض حسد کی وجہ سے انکار کرتے ہو۔ فریقین کا اللہ کے معاملہ میں یہی جھگڑا تھا۔ مجاہد اور عطا بن رباح نے کہا ھذان خصمن سے تمام مسلمان مراد ہیں (یہ دو فریق ہیں)۔

بعض علماء نے کہا کہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا الخ میں چھ مذاہب کا تذکرہ کیا گیا ہے ایک مذہب والوں کو جنتی اور پانچ مذاہب والوں کو دوزخی قرار دیا گیا ہے یہی دو فریق ہیں ایک مومنوں کا اور دوسرا باقی پانچ مذاہب والوں کا (ایمان و اسلام ایک دین ہے اور) کفر (کسی قسم کا ہو) ایک ملت ہے۔

مؤخر الذکر دونوں تفسیری قولوں میں عموم الفاظ کا لحاظ کیا گیا ہے شان نزول کی خصوصیت کا اعتبار نہیں کیا گیا اور (تفسیری لحاظ سے) یہ بات ہے بھی صحیح عموم الفاظ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ خصوصیت قصہ کے اندر حکم کو محصور نہیں کیا جاتا۔

عکرمہ نے کہا باہم جھگڑا کرنے والی دو چیزیں جنت اور دوزخ ہیں شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت اور دوزخ کا باہم جھگڑا ہوا دوزخ نے کہا (میں اعلیٰ ہوں) مجھے تکبر کرنے والوں اور مغروروں کے لئے پسند کیا گیا ہے، جنت نے کہا میری کیا حالت ہے میرے اندر تو سوائے کمزوروں، گرے پڑے لوگوں اور مسکینوں کے اور کوئی بھی داخل نہیں ہوگا۔ اللہ نے جنت سے فرمایا تو میری رحمت ہے میں اپنے جس بندے پر چاہوں گا تیرے ذریعہ سے رحم کروں گا (یعنی میرے رحم کی مجسم شکل تو ہے میں جس پر رحم کرنا چاہوں گا اس کو اپنی رحمت یعنی جنت عطا کردوں گا) اور دوزخ سے فرمایا تو میرا عذاب ہے تیرے ذریعہ میں جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا تم دونوں میں سے ہر ایک کو ضرور بھرا جائے گا دوزخ تو اس وقت تک نہ بھرے گی جب اللہ اس میں اپنا قدم نہ رکھ دے گا۔ جب اللہ اس کے اندر اپنا قدم رکھ دے گا تو دوزخ بھر جائے گی اور کہے گی بس بس اور (اس کے اجزاء) باہم سمٹ جائیں گے۔ اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرے گا (کہ دوزخ کو بھرنے کے لئے بے قصور لوگوں کو بھی اس میں ڈال دے) اور جنت (کو بھرنے) کے لئے اللہ دوسری مخلوق پیدا کردے گا۔

فَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَھُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ سو جو لوگ کافر تھے ان (کے پہننے) کے لئے (قیامت کے دن) آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے یعنی کافروں کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے آگ کے کپڑے باندازہ جثہ و درجہ دیئے جائیں گے اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ جس فیصلہ کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے وہ یہی فیصلہ ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا پگھلائے ہوئے تانبے کے کپڑے ہوں گے کوئی دھات بھی ایسی نہیں کہ تپانے کے بعد اس سے زیادہ گرم ہو چونکہ لباس کی طرح پگھلا ہوا تانبا کافروں کے جسم کو محیط ہوگا اس لئے اس کو لباس قرار دیا۔

بعض علماء نے کہا دوزخیوں کو آتش پارے (بطور لباس) پہنائے جائیں گے امام احمد نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت جویریہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا قیامت کے دن اللہ اس کو آگ کا لباس پہنائے گا۔ بزار ابن ابی حاتم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے آگ کا جوڑا (پورا لباس) ابلیس کو پہنایا جائے گا وہ اس کو اپنی دونوں بھوؤں پر رکھے گا پھر اس کو گھسیٹتا جائے گا اور ابلیس کے

پیچھے اس کی ذریات آگ کا لباس کھینچتی چلے گی ابلیس بھی ہلاکت کو پکارے گا اور اس کی ذریات بھی آخر دوزخ پر جا کر یہ سب کھڑے ہوں گے اس وقت ان سے کہا جائے گا ایک ہلاکت کو نہ پکار و بلکہ کثیر ہلاکتوں کو پکارو۔

ابو نعیم نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ دوزخیوں کو لباس پہنایا جائے گا (لیکن اس لباس سے تو) ان کا ننگا رہنا اچھا ہوگا اور ان کو زندگی دی جائے گی (لیکن اس زندگی سے تو) موت ان کے لئے بہتر ہوگی۔ حضرت ابومالک اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نوحہ کرنے والی نے اگر اپنے مرنے سے پہلے توبہ نہ کرلی ہوگی تو قیامت کے دن اس کا حشر اس حالت میں ہوگا کہ قطران (صنوبر وغیرہ کا روغنی سیال) کا کرتہ اور جرب (تلوار کا زنگ) کی قمیص اس کے بدن پر ہوگی۔ ابن ماجہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ نوحہ کرنے والی اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کرے گی تو (قیامت کے دن) اس کے کپڑے قطران کے ہوں گے اور کرتہ آگ کے شعلوں کا تراشا یعنی بدن کے مطابق بنایا) جائے گا۔

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ﴿١٩﴾ ان کے سروں کے اوپر انتہائی گرم پانی ڈالا جائے گا۔ حمیم انتہائی گرم پانی۔

يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ﴿٢٠﴾ جس کی وجہ سے جو کچھ ان کے پیٹوں کے اندر (چربی انتڑیاں، جگر تلی وغیرہ) ہوگا پگھل جائے گا اور کھالیں بھی (پگھل جائیں گی) مراد یہ ہے کہ گرم پانی کی حرارت دوزخیوں کے بیرونی بدن پر بھی اثرانداز ہوگی اور اندرونی اعضاواحشاء پر بھی۔

ترمذی نے ایک حدیث۔ حسن حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گرم پانی ان کے سروں کے اوپر سے ڈالا جائے گا اور یہ کر پیٹ کے اندر داخل ہو کر دونوں قدموں کے درمیان سے نکل جائے گا۔ صہر کا یہی معنی ہے پھر بار بار ایسا ہی کیا جائے گا۔

وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ﴿٢١﴾ اور ان کو (کوٹنے) کے لئے (مخصوص طور پر) لوہے کے گرز ہوں گے۔ مقامع مقمعة کی جمع ہے مقمعة حقیقت میں اس آلہ کو کہتے جس کی سخت ضرب کی وجہ سے کسی چیز کو روکا جائے۔ لیث نے کہا مقمعة گرز کو کہتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے یہ لفظ قمعت راسہ کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ قمعت میں نے سخت ضرب رسید کی۔

حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا، دوزخیوں کو گرزوں سے مارا جائے گا اور گرز کی ضرب مستقل طور پر ہر ہر عضو پر پڑے گی۔ اور (ہر ضرب پر) وہ موت کو پکاریں گے۔

ابویعلی، ابن ابی حاتم، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوہے کا وہ گرز زمین پر رکھ دیا جائے اور سارے جن وانس اس کو اٹھانا چاہیں تو اٹھا نہ سکیں اور اگر اس کی ایک ضرب پہاڑ پر پڑ جائے تو پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائے (یہ گرز دوزخی پر پڑے گا) پھر دوزخی ویسا ہی ہو جائے گا جیسا تھا اور بار بار ایسا ہی ہوتا رہے گا)

كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وہ جب بھی دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب بھی وہ نکلنا چاہیں گے (نکلنے کے قریب ہوں گے) فوراً اندر ہی کو لوٹا دیئے جائیں گے اس تاویل کی ضرورت اس لئے پڑی کہ دوبارہ لوٹایا جانا اسی وقت ہوتا ہے جب باہر نکل آئیں (اور اہل جہنم کا آگ سے باہر نکلنا ممکن نہیں یہ نص قطعی ہے اس لئے اعادہ کو ارادے پر مرتب کیا اور قرب خروج کی قید کا اضافہ کیا گیا)

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ اس آیت کی تشریح میں فضیل بن عیاض نے فرمایا واللہ ان کو دوزخ سے نکلنے کی امید بھی نہیں ہوگی، کیونکہ ان کے پاؤں مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے بلکہ آگ کی لپیٹ (اپنے جوش کی وجہ سے) ان کو اٹھا کر اوپر لے جائے گی اور (وہاں سے فرشتوں کے) گرز پھر ان کو لوٹا دیں گے۔

میں کہتا ہوں شاید آگ سے باہر نکل جانے کا ارادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آگ کی لپیٹ جب ان کو اٹھا کر اوپر لے جائے گی تو ان کو خیال پیدا ہو جائے گا کہ آگ سے باہر جا پڑیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکے گا بلکہ گرز ان کو پھر نیچے لوٹا دیں گے، بیہقی نے ابو صالح کا قول نقل کیا ہے کہ جب دوزخ میں کسی کافر آدمی کو پھینکا جائے گا تو گڑھے کی تہ تک پہنچے بغیر وہ کہیں نہیں رکے گا پھر جہنم کی آگ کا جوش اس کو اٹھا کر جہنم کے بالاترین کنارے تک لے جائے گا اس وقت اس کی ہڈیوں پر گوشت کی بوٹی نہ ہو گی (سب کو آگ کھا چکی ہو گی صرف پنجر باقی ہو گا) پھر ملائکہ اس کو گرزوں سے ماریں گے اور وہ لڑھکتا ہوا تلی تک پہنچ جائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ بغوی نے بھی یہی تفسیر کی ہے اس میں اتنا زائد ہے کہ دوزخ کے فرشتے اسکو لوہے کے گرزوں سے ماریں گے اور وہ ستر سال تک لڑھکتا چلا جائے گا۔

وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٢٢﴾ اور جلنے کا مزہ چکھو۔

الحریق آتش سوزاں، بہت زیادہ سوختہ بنا دینے والی آگ، حریق (صفت مشبہ) بروزن فعیل یعنی فاعل (یعنی بمعنی محرق) جیسے الیم بمعنی مولم اور وجیع بمعنی موجع، زجاج نے کہا یہاں تک ایک فریق کا ذکر تھا دوسرے فریق کا تذکرہ اگلی آیات میں آرہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اللہ یقیناً ان کو جنتوں میں داخل فرمائے گا۔ جن کے (درختوں اور کوٹھیوں کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، اس آیت میں اسلوب بیان بدل دیا اور مؤمنوں کی قابل ستائش حالت کی قدردانی اور برتری کو ظاہر کرنے کے لئے جنت کے داخلے کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا اور لفظ ان ذکر کر کے کلام میں زور پیدا کر دیا۔

يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا جنت کے اندر ان کو سونے کے کنگن اور موتیوں کا زیور پہنایا جائے گا۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ اہل تفسیر کا قول ہے کہ ہر جنتی کے ہاتھ میں تین کنگن پہنائے جائیں گے۔ ایک سونے کا دوسرا چاندی کا تیسرا موتیوں کا۔

ترمذی اور حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت جَنّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَّلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ۔ تلاوت فرمائی پھر فرمایا ان (کے سروں) پر تاج ہوں گے جن کے ادنیٰ موتی کی چمک سے مشرق سے مغرب تک جگمگا جائے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں اور بیہقی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ادنیٰ جنتی کے زیور کا تمام دنیا والوں کے زیور سے موازنہ کیا جائے تو ادنیٰ جنتی کو جس زیور سے اللہ آراستہ کرے گا وہ ساری دنیا والوں کے زیور سے اعلیٰ ہو گا۔

ابو الشیخ نے العظمۃ میں کعب بن احبار کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کا ایک فرشتہ اپنے روز پیدائش سے اہل جنت کے لئے زیور ڈھالنے میں مشغول ہے اور روز قیامت تک مشغول رہے گا اور اگر اہل جنت کا کوئی ایک زیور بھی برآمد ہو جائے تو سورج کی روشنی کو ماند کر دے گا۔

شیخین نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا زیور (اس کے ہاتھ اور پاؤں میں) اس حد تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے۔

الزہد میں عمران بن خالد کی وساطت سے ایک تابعی کی روایت آئی ہے کہ صحابہ کرام نے فرمایا کہ باوجود قدرت رکھنے کے جس نے سونا پہننا چھوڑ اللہ خطیرہ القدس میں اس کو سونا پہنائے گا اور جس نے باوجود قدرت رکھنے کے شراب ترک کی اللہ اس کو خطیرہ القدس کی شراب پلائے گا۔ نسائی اور حاکم نے حضرت عقبہ بن عامر کی راویت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ (سونے کا) زیور اور ریشم پہننے والوں کو ممانعت فرماتے تھے اور فرماتے تھے اگر تم جنت کا زیور اور جنت کا ریشم پسند کرتے ہو تو دنیا میں اس کو

۲ ع ۱۲ ۹

نہ پہنو۔ حضرت عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس (مرد) نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں (جنت کا) ریشم نہیں پہنے گا۔

وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿۲۳﴾ اور جنت کے اندر ان کا لباس ریشمی ہوگا۔ بزاز۔ ابو یعلی اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر کی وساطت سے حضرت مرثد بن عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس سے سندس (باریک ریشمی لباس) پیدا ہوتا ہے اسی کے اہل جنت کے کپڑے ہوں گے۔ نسائی طیالسی، بزار اور بیہقی نے کھری سند کے ساتھ حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے (یعنی درخت سے) پھٹ کر نکلیں گے یعنی اہل جنت کے کپڑے درخت کے پھل کے پھٹنے سے نکل آئیں گے۔

ابن مبارک نے بیان کیا کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا مومن کا مکان ایک کھوکھلا موتی ہوگا جس کے اندر ستر کمرے ہوں گے اور موتی کے وسط میں ایک درخت ہوگا جس کے اندر کپڑے اگیں گے۔ مومن جا کر اپنی انگلی سے ستر جوڑے کپڑوں کے لے لے گا اور ہر جوڑے میں زمرد کی اور موتیوں کی اور مونگے کی لڑیاں پروئی ہوئی ہوں گی۔

فصل : شیخین (بخاری و مسلم) نے بیان کیا کہ حضرت حذیفہ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے تم لوگ نہ ریشم پہنو نہ دیبا نہ سونے چاندی کے برتنوں میں پیو، نہ ان کے پیالوں رکابیوں میں کھاؤ، یہ چیزیں ان (کافروں) کے لئے دنیا میں ہیں اور تم لوگوں کے لئے آخرت میں ہوں گی)

شیخین نے حضرت عمر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس (مرد) نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہیں پہنے گا (یعنی ریشمی لباس سے محروم رہے گا) ایسی ہی حدیث حضرت انسؓ اور حضرت زبیرؓ کی روایت سے بھی آئی ہے۔ نسائی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مرد نے دنیا میں ریشم پہنا آخرت میں وہ ریشم کا لباس نہیں پہنے گا۔ جس نے دنیا میں شراب پی آخرت میں وہ شراب (طہور) نہیں پئے گا اور جس نے سونے چاندی کے برتنوں میں (کچھ) پیا آخرت میں وہ سونے چاندی کے برتنوں میں نہیں پئے گا۔ (محروم رہے گا)۔

طیالسی نے صحیح سند سے اور نسائی نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا اور اگر جنت میں پہنچ بھی گیا تب بھی اس کو ریشمی لباس نہیں ملے گا۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے ہر ایک کو طوبیٰ کے پاس لے جایا جائے گا۔ طوبیٰ کے شگوفے اس کے لئے کھل جائیں گے (اور شگوفوں کے اندر سے لباس برآمد ہوگا) جو کوئی جس طرح کا لباس لینا چاہے گا لے لے گا۔ خواہ سفید کا خواستگار ہو یا سرخ کا یا سبز کا یا زرد کا یا سیاہ کا (یہ لباس خوبصورتی میں) گل لالہ کی طرح ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ نرم اور حسین۔

حضرت کعبؓ کا بیان ہے اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا دنیا میں پہن لیا جائے تو جو کوئی اس کو دیکھے گا بیہوش ہو جائے گا۔ صابونی نے المأتین میں بیان کیا ہے کہ جنتی آدمی جب حلۂ بہشتی پہنے گا تو فوراً ایک ساعت میں اس کے ستر رنگ بدل جائیں گے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو کر وہاں کی نعمتوں سے راحت اندوز ہوگا تو نہ اس کا لباس کبھی پرانا (فرسودہ) ہوگا نہ شباب فنا ہوگا۔

وَهُدُوٓا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوٓا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴿۲۴﴾ اور (جنت میں یہ نعمتیں اس لئے ملیں گی کہ دنیا میں) ان کو کلمہ طیب (پر ایمان کی) ہدایت ہوگئی تھی اور اس (خدا) کے راستہ پر چلنے کی توفیق مل گئی تھی جو مستحق حمد ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا طیب قول سے مراد ہے لا الہ الا اللہ واللہ اکبر و الحمد للہ کی شہادت۔ جس کی

ہدایت ان کو دنیا میں مل گئی تھی۔ سدی نے کہا پاکیزہ قول سے مراد ہے قرآن مجید، بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں ماضی بمعنی مستقبل ہے یعنی جنت کے اندر ان کو پاکیزہ کلام کی ہدایت ملے گی مطلب یہ کہ وہ جنت میں پہنچ کر الحمدللہ الذی صدقنا وعدہ الخ پڑھیں گے۔

صراط الحمید سے مراد ہے اللہ کا راستہ یعنی اسلام اور حمید سے مراد اللہ کی ذات ہے جو فی نفسہ مستحق ستائش ہے یا صراط الحمید سے راہ جنت مراد ہے یعنی آخرت میں ان کو جنت کے راستہ پر چلنے کی توفیق دی جائے گی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ﰳ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور (مسلمانوں کو) اللہ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے تمام آدمیوں کے لئے مقرر کر دیا ہے کہ اس میں سب برابر ہیں اس میں رہنے والا بھی اور باہر سے آنے والا بھی۔ یعنی لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔

یصدون مضارع کا صیغہ ہے لیکن اس سے مراد نہ حال ہے نہ استقبال بلکہ استمرار مراد ہے اسی لئے اس کا عطف ماضی پر کیا گیا ہے عرب بولتے ہیں فلان یعطی ویمنع فلاں شخص دیتا ہے اور منع کرتا ہے یعنی اس کی یہ عادت ہی ہے وہ ایسا کرتا ہی رہتا ہے۔

المسجد الحرام کا عطف سبیل اللہ پر ہے یا لفظ اللہ پر (یعنی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور مسجد حرام کے راستہ سے)

مسجد حرام سے امام شافعی کے نزدیک صرف مسجد (کعبہ) مراد ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک سارا حرم جیسے دوسری آیت میں آیا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الخ بعض (قوی) روایات میں آیا ہے کہ معراج کا واقعہ حضرت ام ہانی کے مکان سے ہوا (جو حرم کے اندر تھا کعبہ کے اندر نہیں تھا) پس جس طرح آیت سبحان الذی میں مسجد حرام سے مراد حرم ہے، اسی طرح والمسجد الحرام میں بھی حرم ہی مراد ہے۔ اگلی آیت الذی جعلناہ الخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد حرام سے مراد حرم ہے کیونکہ اس آیت میں مقیم اور مسافر کو برابر کا حق دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگرچہ اس آیت میں مسجد حرام سے مراد مسجد ہی ہے لیکن آیت اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا میں مسجد حرام سے عام حدود حرم ہی مراد ہیں کیونکہ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حدود حرم کے اندر داخل ہونے سے غیر مسلموں کو روکا جائے۔ عاکف سے مراد ہے مقیم اور بادی سے مراد ہے مسافر۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے بدو۔ بداوۃ اور بادیتہ کا مفہوم شہریت کے برعکس ہے (یعنی دیہاتیت یا جنگلیت یا خانہ بدوشی) آیت کا مطلب یہ ہے کہ حرم کے اندر ٹھہرنے اور اترنے میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ جو شخص بھی حرم کے اندر کسی جگہ پہلے ٹھہر جائے اس کو پیچھے آنے والا نکال نہیں سکتا۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، قتادہ اور ابن زید کا یہی قول ہے، ان بزرگوں نے کہا کہ مقیم ہو یا مسافر حرم کے اندر مکانوں اور فرودگاہوں پر سب کا حق برابر ہے۔ عبدالرحمٰن بن سابط کا بیان ہے کہ حاجی جب مکہ میں آتے تھے تو مکہ کے باشندوں کو بھی اپنے مکانوں پر ترجیحی حقوق باقی نہیں رہتے تھے۔ حضرت عمر موسم حج میں لوگوں کو اپنے گھروں کے دروازے بند رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ بغوی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔

میں کہتا ہوں حضرت عمر کا یہ قول عبدالرحمٰن بن عبد حمید نے بوساطت نافع حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے۔

ازالتہ الخفاء کی ایک روایت ہے کہ مروہ کے قریب ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا امیر المومنین میرے لئے کچھ جگہ کاٹ دیجئے (یعنی کوئی خاص جگہ مقرر فرما دیجئے) حضرت عمرؓ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس کو پیچھے چھوڑ کر (آگے بڑھ گئے اور) فرمایا یہ تو اللہ کا حرم ہے اس میں مقیم و مسافر سب کا حق برابر ہے۔ عبدالرزاق نے بروایت معمر از منصور مجاہد کا قول نقل کیا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مکہ والو اپنے گھروں کے دروازے بند نہ رکھو تاکہ باہر سے آنے والے جہاں چاہیں اتر سکیں۔ عبدالرزاق نے ابن جریج کی روایت سے بیان کیا کہ عطا حرم کے اندر گھوڑوں کے داخلے سے منع کرتے تھے۔ اور مجھے

یہ بھی روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمر نے مکہ کے گھروں کو۔ در بند کرنے کی ممانعت فرمادی تھی۔ تا کہ حاجی گھروں کے صحنوں میں اتر سکیں سب سے پہلے سہیل بن عمرو نے اپنے گھر کا دروازہ قائم کیا اور حضرت عمر سے اپنے اس فعل کی معذرت کی۔

لیکن بیہقی کی یہ روایت صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے مکہ میں چار ہزار درہم سے ایک مکان جیل خانہ بنانے کے لئے خریدا تھا۔ اور ابن الزبیر کی یہ روایت بھی صحیح ہے کہ آپ نے حضرت سودہ کا حجرہ خرید اتھا۔ اور یہ بھی روایت آئی ہے کہ حضرت حکیم بن حزام نے دار الندوہ فروخت کر دیا تھا۔ اور یہ بھی صحیح بات ہے کہ توسیع مسجد کے لئے حضرت عمرؓ نے کچھ مکان انکے مالکوں سے خریدے تھے اور حضرت عثمان کے سلسلہ میں بھی ایسی ہی روایت آئی ہے اس وقت رباط میں بکثرت صحابی موجود تھے اور کسی نے اس سے انکار نہیں کیا یہ تمام روایات بتا رہی ہیں کہ حرم کے اندر بلکہ مکہ کے اندر مکانوں کی خرید و فروخت جائز ہے۔

میں کہتا ہوں یہ سب خرید و فروخت عمارت کی تھی عمارتیں مختلف مالکوں کی تھیں یہ زمین کی خرید و فروخت نہ تھی اور ممانعت زمین کی فروخت و خرید کی تھی۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور قوی ترین روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول آیا ہے کہ مکہ کی زمین کی فروخت اور مکہ کے مکانوں کو کرایہ پر اٹھانا جائز ہے کیونکہ حرم کی زمین آزاد ہے کسی کی ملک نہیں ہے اللہ نے فرمایا ہے ثم محلها الى البيت العتيق اللہ نے اس آیت میں بیت کو عتیق (آزاد) فرمایا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ بیت عتیق سے مراد پورا حرم ہے کیونکہ صرف حدود حرم کے اندر ہی قربانی جائز ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو کعبہ کے قریب ہو۔ یہ تاویل خود ساختہ اور نا قابل قبول ہے۔

امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے لیکن انکے اس مسلک کی بناء ایک اور نظریہ پر ہے امام مالک کے نزدیک مکہ کی فتح زبردستی اور جبری ہوئی تھی اور جس بستی کو جبراً فتح کیا گیا ہو وہ ساری بستی وقف ہو جاتی ہے اس کی زمین کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔

امام شافعیؒ کے نزدیک مکہ کے مکانوں کا بیچنا اور کرایہ پر اٹھانا جائز ہے کیونکہ وہ مکانداروں کی ملک ہیں (وقف نہیں ہیں) حسن، طاؤس، عمرو بن دینار اور علماء کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے اور آیت میں امام شافعیؒ کے نزدیک مسجد (کعبہ) مراد ہے۔ تفسیری مطلب یہ ہے کہ ہم نے کعبہ کو تمام لوگوں کی نمازوں اور عبادتوں کے لئے قبلہ بنا دیا ہے کعبہ کی تعظیم اس کے اندر نماز کی فضیلت اور اس کے طواف کرنے کا حکم سب کے لئے ایک ہے، مقیم ہو یا کوئی صحرائی مسافر سب اس میں برابر ہیں، مکہ کو آباد کرنے کی اصل غرض ہی وہاں نماز کا قیام تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے قول کو نقل کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔

میں کہتا ہوں (اگر مسجد حرام سے صرف کعبہ مراد ہو تو) مقیم و مسافر کے لئے صرف کعبہ کے معاملہ میں مساوات ثابت ہو گی۔ باوجودیکہ اس خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں، تمام مساجد کا یہی حکم ہے ہر مسجد کی ہر شخص پر تعظیم واجب ہے۔ ہر مسجد کے اندر ثواب کا جو درجہ مقرر ہے وہ سب کے لئے یکساں ہے سفر و حضر سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول بھی شافعیؒ کے قول کے موافق ہے میں کہتا ہوں ایسا تو نہیں ہے بلکہ مجاہد کا قول تو روایت میں وہی آیا ہے جو امام ابو حنیفہ کا ہے طحاوی نے ابراہیم بن مہاجر کے طریق سے بیان کیا ہے کہ مجاہد نے فرمایا مکہ (ہر ایک کے لئے) مباح ہے نہ اس کی زمینوں کی فروخت درست ہے نہ کرایہ پر دینا۔

عبد الرزاق نے بطریق ابراہیم بن مہاجر بروایت مجاہد حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ مکہ کے گھروں کو نہ بیچنا جائز ہے نہ کرایہ پر دینا۔ اس قول کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام محمد نے کتاب الآثار میں بیان کی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے براویت عبد اللہ بن زیاد بحوالہ صحیح بیان کیا کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ نے مکہ کو حرم بنا دیا ہے اس کی زمینوں کو بیچنا اور ان کی قیمت کھانا حرام ہے۔ ابن جوزی نے اپنی سند کے ساتھ التحقیق میں امام ابو حنیفہؒ کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا جس کے الفاظ اس طرح ہیں، مکہ حرام ہے اس کی زمینیں حرام ہیں اس کے گھروں کا کرایہ حرام ہے۔

دار قطنی نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا اس حدیث کو مرفوع قرار دینا وہم ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ ابو حنیفہؒ کی طرف وہم کی نسبت کرنا نفی پر دلالت کر رہی ہے اور دار قطنی کا قول نفی پر شہادت ہے اور شہادت علی النفی قابل قبول نہیں۔ امام ابو حنیفہ ثقہ ہیں اور ثقہ کا کسی حدیث کو مرفوعاً ذکر کرنا قابل قبول ہے امام محمد نے اسی سند سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مکہ کے مکانوں کا کچھ بھی کرایہ کھایا اس نے آگ کھائی۔ دار قطنی نے اپنی سند سے اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر کی روایت سے بحوالہ حضرت ابن عمر بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مکہ مباح ہے (ہر ایک کا حق اس کی زمین اور مکان پر برابر ہے) اس کی زمینیں نہ بیچی جائیں اور نہ اس کے مکان کرایہ پر دیئے جائیں۔

میں کہتا ہوں اسماعیل بن ابراہیم کو یحییٰ اور نسائی نے اور اسماعیل کے باپ ابراہیم کو بخاری نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابو حاتم نے ابراہیم کو منکر الحدیث کہا ہے ابن المدینی اور نسائی نے کہا یہ قوی نہیں ہے۔ لیکن سفیان (بن عیینہ) اور احمد اور یحییٰ بن معین اور ابن مہدی نے اس کو لاباس بہ کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ ابو بکر بیہقی نے کہا صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ ابن جوزی نے اپنی سند سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مکہ حرام ہے اللہ نے اس کو حرمت والا بنایا ہے اس کی زمینوں کو بیچنا حلال نہیں اور نہ اس کے مکانوں کو کرایہ پر اٹھانا جائز ہے۔ یہ روایت مرسل ہے (صحابی کا اس میں ذکر نہیں) اور ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔

جو لوگ مکہ کے مکانوں کو مکان والوں کی ملک کہتے ہیں ان کی دلیل حسب ذیل ہے

(۱) اللہ نے فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ اور رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا تھا جو ابو سفیان کے مکان میں چلا گیا وہ مامون ہے آیت اور حدیث دونوں میں مکان کی اضافت مکان والوں کی طرف کی گئی جو ملکیت پر دلالت کرتی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر مکانوں کے مالک مہاجرین نہ ہوتے تو ان کو مظلوم نہ قرار دیا جاتا (کیونکہ جن مکانوں سے ان کو نکالا گیا ان کے مالک وہ تھے ہی نہیں تو پھر ان پر ظلم ہی کیا ہوا)

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ سکونت یا تعمیر کی وجہ سے اضافت کی گئی یہ ضروری نہیں کہ اضافت مفید تملیک ہی ہو، مسجد النبوی ﷺ اور مسجد فلاں کا معنی یہی ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یا فلاں شخص کی بنائی ہوئی مسجد (مسجد کسی کی ملک نہیں ہوتی اور یہ ضروری نہیں کہ مملوکہ مکانوں سے نکالا جانا ہی ان پر ظلم ہو (مقبوضہ اور معمورہ مکان سے کسی کو نکال دینا بھی ظلم ہے) دیکھو مسجد حرام میں عبادت کرنے کا مہاجرین کو بھی برابر حق تھا اور یہ حق ان سے چھین لیا گیا اور کعبہ میں ذکر خدا کرنے سے ان کو روک دیا گیا۔ یہ بڑا ظلم تھا۔

(۲) حضرت اسامہ بن زید کا بیان ہے کہ حج کے موقع پر میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کل آپ کہاں اتریں گے فرمایا کیا عقیل نے کوئی اترنے کی جگہ (ہمارے لئے) چھوڑ دی ہے پھر فرمایا انشاء اللہ ہم کل کو خیف بنی کنانہ میں اتریں گے۔ پھر فرمایا کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور نہ مسلمان کافر کا۔ متفق علیہ۔

ابن جوزی نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے حضرت اسامہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! کیا حضور مکہ میں اپنے مکان میں اتریں گے فرمایا کیا عقیل نے (ہمارے لئے) کوئی زمین یا مکان چھوڑا ہے۔ زہری نے کہا عقیل اور طالب ابو طالب کے وارث ہوئے اور جعفر و علی چونکہ مسلمان ہوگئے تھے اس لئے ابو طالب کے وارث نہیں ہوئے۔ مراد یہ ہے کہ ابو طالب کے مرنے تک عقیل اور طالب کافر رہے (اس لئے وارث ہوئے)

کہا جاتا ہے کہ جس مکان کی طرف رسول اللہ ﷺ کے کلام میں اشارہ ہے وہ اصل میں ہاشم بن عبد مناف کا مکان تھا۔ ہاشم کے بعد ان کے بیٹے عبد المطلب کا ہوا جب عبد المطلب زیادہ بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے وہ مکان اپنے بیٹوں کو تقسیم کر دیا اور

عبداللہ بن عبدالمطلب کا حصہ رسول اللہ ﷺ کو ملا اسی میں رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ہوئی جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کرلی تو عقیل و طالب نے پورے مکان پر قبضہ کرلیا کیونکہ اس وقت تک یہ دونوں مسلمان نہیں ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ اپنا حصہ چھوڑ کر چلے گئے تھے، طالب بدر میں مارے گئے اس لئے عقیل نے پورا مکان اس کے بعد فروخت کردیا۔

فاکہانی کی روایت میں آیا ہے کہ عقیل نے مکان فروخت نہیں کیا تھا اور عقیل کی اولاد اس پر قابض رہی یہاں تک کہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف نے ایک لاکھ دینار میں اس کو خرید لیا۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ عقیل نے اگر کافر ہونے کی حالت میں مکان کو فروخت کردیا تھا تو اس سے مکہ کے مکانوں کی بیع کا اسلامی جواز ثابت نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک حدیث کا مطلب اس طرح ہوسکتا ہے کہ مکان کو فروخت کرنے سے پہلے عقیل کا اس پر تصرف تھا اور فروخت کرنے کے بعد خریدار نے اس کو اپنے کام میں لے لیا۔ بہرحال وہ مکان خالی نہ تھا جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو خالی نہ پایا تو فرمایا عقیل نے کیا ہمارے ٹھہرنے کے لئے کوئی مکان (خالی) رہنے دیا ہے۔ اس مطلب پر راوی کا یہ کہنا کہ عقیل ابوطالب کے وارث ہوئے صرف ایک خیال ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان کہ کافر مومن کا وارث نہیں ہوتا اور نہ مومن کافر کا۔ شاید اس کا تعلق کسی اور واقعہ سے ہے (عقیل کے واقعہ سے اس کا تعلق نہیں ہے) راوی نے دونوں حدیثوں کو یہ خیال کرکے ملا دیا کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان کافر و مومن کے درمیان عدم توارث کا ہے اسی بناء پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ عقیل نے کیا ہمارے اترنے کے لئے کوئی مکان چھوڑا ہے۔ اس صورت میں دونوں حدیثوں کا تعلق الگ الگ واقعات سے ہوگا اور اس حدیث سے مکہ کے مکانوں کا کسی کی ملک ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس حدیث سے مکہ کے مکانوں کی بیع کا جواز مستنبط ہوتا ہے تب بھی حرمت مکہ کی حدیثیں صراحتاً اور عبارۃً عدم جواز پر دلالت کررہی ہیں اور یہ حدیث جواز بیع کی طرف صرف اشارہ کررہی ہے اور ظاہر ہے کہ صراحت و عبارت کا درجہ اشارہ سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

اگر ہم دونوں حدیثوں کو ہم مرتبہ بھی مان لیں اور کسی کو قوی نہ کہیں اور دونوں میں تعارض تسلیم کرلیں تب بھی تحریم و تحلیل کے تعارض کے وقت حرمت کو حلت پر ترجیح دی جائے گی (کیونکہ حرمت و حلت میں تعارض ہو تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے یہ عام ضابطہ ہے) اسی لئے امام ابوحنیفہ نے مکہ کی زمینوں اور مکانوں کی بیع کو مکروہ تحریمی کہا ہے (حرام نہیں کہا) مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ اگر عبداللہ کا میراثی حصہ رسول اللہ کا تھا تو لامحالہ عقیل نے (آپ کی ہجرت کے بعد) اس پر جابرانہ قبضہ کیا ہوگا اور امام ابوحنیفہ قائل ہیں کہ اگر کافر مسلمان کے مال کا بالجبر مالک ہوجائے تو وہ مال مسلمان کی ملک نہیں رہتا (شافعی اس کے قائل نہیں ہیں) اور جب عقیل زبردستی رسول اللہ ﷺ کے میراث حصہ پر قابض ہوگئے تو پھر اس بیان میں رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا کوئی معنی نہیں کہ کافر مومن کا وارث نہیں ہوتا اور نہ مومن کافر کا۔ اگر وہ پورا مکان ابوطالب کا تھا تو رسول اللہ ﷺ کا اس میں حصہ ہونا ناقابل تصور ہے۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ ابوطالب مسلمان ہوگئے تھے تب بھی رسول اللہ ﷺ ابوطالب کے وارث نہیں ہوسکتے (دادا کے مال کا پوتا وارث نہیں ہوتا جبکہ اس کے بیٹے موجود ہوں) بہرحال رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث کہ کیا عقیل نے ہمارے اترنے کے لئے کوئی مکان چھوڑا ہے تاویل طلب ہے اور جو تاویل ہم نے بیان کی اس سے بہتر تاویل ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر بالفرض علی اور جعفر کو ابوطالب کا وارث نہ ہونا مان بھی لیا جائے تب بھی عاریۃً اور عارضی طور پر آپ علی یا جعفر یا عقیل کے حصہ میں اتر سکتے تھے۔

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾ اور جو شخص اس میں یعنی حرم میں کسی خلاف دین کام کا قصد ظلم (یعنی شرک و کفر) کے ساتھ کرے گا تو ہم اس کو دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ فیہ کی ضمیر مسجد حرام کی طرف راجع ہے خواہ اس سے کعبہ مراد ہو یا عام حرم الحاد مفعول ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور ب زائد ہے جیسے تنبت بالدھن میں ب زائد ہے (کیونکہ انبات خود متعدی ہے) عمش شاعر کا قول ہے

ضمنت برزق عیالنا ارماحنا اس میں بھی ب زائد ہے بظلم کا تعلق یرد سے ہے۔
بخاری نے صحیح میں حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مستحق نفرت تین آدمی ہیں۔ (۱) حرم میں بے دینی کرنے والا۔ (۲) اسلام (کے دور) میں جاہلیت کا طریقہ چاہنے والا (۳) کسی کا ناحق خون بہانے کا طلب گار۔
زرین نے اپنی کتاب میں اور بیہقی نے المدخل میں اور ترمذی وحاکم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ (طرح کے لوگ) ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی ہے اور اللہ نے بھی اور ہر مقبول الدعا پیغمبر نے بھی۔ (۱) اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے والا۔ (۲) تقدیر الٰہی کا انکار کرنے والا۔ (۳) زبردستی حاکم بن جانے والا کہ جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اس کو عزت دیدے اور جس کو خدا نے عزت دی ہے اس کو ذلیل کردے۔ (۴) اللہ کے حرم کو حلال بنانے والا۔ (۵) میری عترت (اولاد و نسل کے قتل وغارت وتذلیل) کے تعلق سے جو اللہ نے حرام کردیا ہے اس کو حلال قرار دینے والا۔ (۶) میرے طریقے کو ترک کرنے والا۔
حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت سے بھی مرفوعاً یہ حدیث بیان کی ہے۔
مذکورہ بالا دونوں حدیثیں بتارہی ہیں کہ مسجد حرام سے مراد حرم ہے کیونکہ حرم کو حلال سمجھنا اور وہاں بے دینی کرنا مطلقاً حرام ہے خواہ مسجد کعبہ کے اندر ہو یا باہر۔
الحاد لغت میں کجی ایک جانب کو جھکاؤ اور سیدھے راستے سے کٹ جانے کو کہتے ہیں مجاہد اور قتادہ کے نزدیک اس جگہ شرک اور غیر اللہ کی پرستش مراد ہے بعض علماء نے کہا کہ تمام ممنوعات کا ارتکاب مراد ہے خواہ قولی ہو یا فعلی یہاں تک کہ خادم کو گالی دینا بھی اس میں داخل ہے۔ عطاء نے کہا بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا اور حرم کے اندر خلاف حرمت حرم کوئی کام کرنا (مثلاً شکار کرنا یا حرم کے درخت کو کاٹنا) مراد ہے۔
حضرت ابن عباس نے فرمایا حرم میں الحاد یہ ہے کہ جو شخص تم کو قتل نہ کر رہا ہو تم اس کو قتل کردو اور جو شخص تم پر ظلم نہ کر رہا ہو تم اس پر ظلم کرو۔ ضحاک کا قول بھی یہی ہے۔
مجاہد نے کہا مکہ کے اندر گناہ کا درجہ بھی (باہر کے گناہ کے مقابلے میں) چند گنا ہو جاتا ہے جیسے حرم کے اندر نیکیوں کا درجہ چند گناہ ہوتا ہے۔
حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا وہ (یعنی صحابہ) کہتے تھے کہ اگر کسی شخص نے گناہ کا صرف ارادہ کیا اور ارتکاب نہیں کیا تو اس کے اعمالنامے میں گناہ نہیں لکھا جائے گا لیکن اگر کسی شخص کو مکہ میں قتل کرنے کا ارادہ کسی نے کیا اور جس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ عدن میں ہے یا کسی اور شہر میں ہے تو ایسا ارادہ کرنے والے کو اللہ عذاب الیم کا مزہ چکھائے گا (گویا مکہ کے اندر گناہ کا ارادہ بھی گناہ کے حکم میں ہے اور مستوجب سزا ہے) سدی نے کہا اللہ اس کو عذاب الیم کا مزہ چکھائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کرلے (تو ارادہ گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا)
حضرت عبداللہ بن عمرو کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ آپ کے دو خیمے تھے ایک حل میں لگا ہوا تھا دوسرا حرم کے اندر جب گھر والوں کو آپ کچھ سخت سست کہنا چاہتے تھے تو حل والے خیمہ میں جا کر کہتے تھے لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا ہم اپنی گفتگو میں کہا کرتے تھے کہ حرم کے اندر کلا واللہ اور بلیٰ واللہ کہنا بھی الحاد (بے دینی) ہے۔
وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ　اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لئے بیت اللہ کی جگہ معین کردی۔
یہ ترجمہ زجاج کے قول کے موافق کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا لابراہیم میں لام زائد ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہوگا اور جب ہم نے ابراہیم کو کعبہ کے مقام پر ٹھہرایا، اتارا۔
قاموس میں ہے بواہ منزلا اور فی المنزل کسی جگہ اس کو اتارا۔ المباۃ منزل۔ (فرودگاہ مکان، مقام) واقعہ

(تاریخی) یہ ہوا کہ حضرت نوح کے طوفان کے زمانے میں کعبہ کو آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تھا، پھر جب اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو تعمیر کعبہ کا حکم دیا تو حضرت ابراہیمؑ حیران ہوئے اور آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ کعبہ کا مقام کہاں ہے اور کہاں بناؤں بحکم خدا ایک تند آندھی آئی جس کی وجہ سے کعبہ کے خطوط اساسی پر پڑی ہوئی ریت اور مٹی ہٹ گئی اور آپ کو کعبہ کی بنیادیں معلوم ہو گئیں۔ کذا قال البغوی۔

بیہقی نے دلائل میں اور ابن ابی حاتم نے سدی کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ نے ایک ہوا بھیجی تھی جس کو ریح خجوج کہتے ہیں، اس ریح خجوج کے دو بازو (اڑنے والے) اور ایک سر تھا اور سانپ جیسی شکل تھی اس ہوا نے کعبہ کے گرداگرد زمین کو الٹ دیا اور کعبہ کی اساس اول بر آمد ہو گئی۔

بغوی نے کلبی کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے مسافت کعبہ کے بقدر ایک ہوا بھیجی، جو کعبہ کے مقام پر آکر کھڑی ہو گئی، اس کے اندر ایک سر تھا جو کہہ رہا تھا ابراہیم میری مقدار کے برابر عمارت بناؤ۔ حضرت ابراہیم نے اسی مقدار کے بموجب تعمیر کی۔

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾

کہ ساجھی نہ بنانا میرا کسی چیز کو اور پاک کر دینا میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور قیام کرنے والوں کے لئے اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

بوانا کے اندر قول کا معنی ہے یعنی ہم نے حکم دیا کہ میری عبادت میں کسی بت وغیرہ کو ساجھی نہ بنانا۔ بیتی میں اضافت بیت کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے (ورنہ اللہ کا کوئی گھر نہیں وہ ہر مکان سے پاک ہے) وہ تجلیات خداوندی کی خصوصی فرودگاہ ہے۔

مجدد الف ثانی نے فرمایا کعبہ اگرچہ ایک جسمانی چیز ہے لیکن ایسی حقیقت کے مشابہ ہے جو بے کیف ہے کیونکہ کعبہ کی دیواریں، چھت انتہائی گہرائی تک زمین اور انتہائی چوٹی تک آسمان کوئی بھی قبلہ نہیں ہے اگر اس مٹی چھت اور دیواروں کو ہٹا کر کہیں اور لے جائیں تب بھی قبلہ وہی رہے گا جو اب ہے جہاں دیواروں اور پتھروں کو منتقل کر کے پہنچایا جائے گا وہ جگہ قبلہ نہیں بن جائے گا۔ حقیقت میں قبلہ ایک بے کیف اور بے جسم چیز ہے جہاں انوار الٰہیہ کا نزول ہوتا ہے اور تجلیات کا پر تو پڑتا ہے۔

اَلْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ سے مراد ہیں نمازی، یہ تینوں نماز کے اجزاء ہیں اور چونکہ ہر جز کے لئے طہارت مقام ضروری ہے اسلئے ہر جز کا مستقلاً ذکر کر دیا اور بغیر سجدے کے رکوع شرعاً عبادت میں شمار نہیں کیا جاتا اس لئے الرکع السجود کے درمیان حرف عطف نہیں ذکر کیا۔ شیعہ کہتے ہیں کہ نماز کے اندر صرف پیشانی رکھنے کی جگہ کا پاک ہونا کافی ہے۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔

بغوی نے لکھا ہے ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا کہ حضرت ابراہیم کو جب اعلان حج کا حکم دیا گیا تو آپ نے عرض کیا میری آواز کیسے پہنچے گی۔ اللہ نے فرمایا تمہارا کام اعلان کرنا اور پکارنا ہے اور پہنچانا میرا ذمہ ہے۔ حضرت ابراہیم مقام ابراہیم پر کھڑے ہوئے فوراً وہ مقام اٹھ کر بلند ترین پہاڑ کے برابر ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دونوں انگلیاں دونوں کانوں میں رکھ کر چہرے کو دائیں بائیں اور مشرق کی طرف گھماتے ہوئے کہا لوگو! تمہارے رب نے ایک مکان بنایا ہے اور تم پر اس کا حج کرنا فرض کر دیا ہے، اپنے رب کی دعوت کو قبول کرو (قیامت تک جو حج کرنے والے ہیں) سب نے باپوں کی پشت اور ماؤں کے پیٹوں کے اندر سے لبیک اللہم لبیک کہا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا سب سے پہلے لبیک کہنے والے اہل یمن تھے، اسی لئے یمنی لوگ سب سے زیادہ حج کرتے ہیں۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کوہ بوقبیس پر چڑھ کر ندا دی تھی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت میں الناس سے مراد اہل قبلہ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے حسن کا خیال ہے کہ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ علیحدہ کلام ہے (حضرت ابراہیم اس میں مخاطب نہیں ہیں بلکہ) اس میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ حجۃ الوداع میں لوگوں کو حج کے لئے بلائیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خطبہ دیا اور فرمایا، لوگوں تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے حج کرو۔ رواہ مسلم۔ احمد اور نسائی اور دارمی نے یہ حدیث حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کی ہے۔

یَاْتُوْكَ رِجَالًا (نداکرو گے تو) لوگ پیدل چل کر حج کو آئیں گے۔ یہ آئندہ واقعہ کا بیان ہے اس سے ان لوگوں پر حج کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی جن کو سواری میسر نہیں ہے۔ داؤد ظاہری وغیرہ اپنے قول پر اس سے استدلال نہیں کرسکتے داؤد ظاہری اور مالکیوں کے نزدیک اس شخص پر بھی حج فرض ہے جس کو سواری نہ مل سکے۔ سورۃ آل عمران کی آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کی تفسیر کے ذیل میں سواری اور زادراہ کی تفصیل ہم نے کر دی ہے۔

مسئلہ: جو شخص پیدل چل سکتا ہو اس کے لئے امام ابو حنیفہ کے نزدیک پیدل چل کر حج کرنا افضل ہے کیونکہ پیدل چل کر آنے کا ذکر سوار ہو کر آنے سے پہلے کیا پھر پیدل چل کر آنے میں جسمانی دکھ بھی زیادہ اٹھانا پڑتا ہے اور خضوع و عجز کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ اگر کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی منت مانی ہو تو رسول اللہ ﷺ نے پیدل حج کرنا اس پر واجب قرار دیا ہے اور اگر پیدل حج نہ کر سکے تو قربانی کو واجب قرار دیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیدل حج (اصل) طاعت ہے اور طاعت کا ادنیٰ درجہ استحباب و فضیلت ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ حج کے لئے سوار ہو کر آنا افضل ہے کیونکہ پیدل آنے میں بہت سی عبادتوں میں خلل پیدا ہو جائے گا اور اسلام میں رہبانیت کا جواز نہیں)

وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ اور ہر مشاق سفر اونٹنی پر سوار ہو کر ضامر دبلا لاغر جو کثرت سفر کی وجہ سے دبلا ہو گیا ہو مراد مشاق سفر۔

ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ حاجی سوار نہیں ہوتے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اور زادراہ ساتھ لینے کا حکم دے دیا اور سوار ہو کر آنے اور سفر حج میں تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔

يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝۲۷ جو دور دراز راستوں سے پہنچیں گی۔

ضامر کا لفظ اگرچہ مذکر ہے لیکن معنی کے لحاظ سے مؤنث ہے لفظ کل کی اس کی طرف اضافت کی گئی ہے اس لئے یاتین، بصیغۂ مؤنث ذکر کیا۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں۔

منافع دنیوی اور دینی فوائد جو حج سے مخصوص طور پر ان کو حاصل ہوتے ہیں۔ امام محمد باقر بن علی زین العابدین بن امام حسین نے اور سعید بن مسیب نے فرمایا منافع سے اس جگہ مراد ہے عفو و مغفرت۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور (دوران حج میں) نہ فحش کلمہ زبان سے نکالا نہ گناہ کیا وہ ایسا (بے گناہ ہو کر) لوٹے گا جیسا پیدا ہونے کے وقت تھا۔ متفق علیہ۔ سعید بن جبیر کے نزدیک منافع سے مراد تجارت ہے، زید کی روایت میں ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے حضرت ابن عباس نے منافع کا ترجمہ لفظ اسواق (بازار) سے کیا تھا مجاہد نے کہا تجارت بھی مراد ہے اور وہ تمام دنیوی و اخروی امور مراد ہیں جن کو اللہ پسند فرماتا ہے۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ

اور مقررہ دنوں میں یعنی قربانی کے ایام میں (قربانی کے) چوپایوں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیں۔

اللہ کا نام یاد کرنے سے بطور کنایہ جانور کی قربانی کرنا ہے بصورت ذبح ہو یا بصورت نحر کیونکہ اللہ کا نام ذبح کے وقت لئے

بغیر کوئی ذبیحہ حلال نہیں ہوتا۔ اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔

ایام معلومت سے اکثر مفسرین کے نزدیک ذی الحجہ کے دس دن مراد ہیں معلومات کہنے سے ان دنوں کی گنتی جاننے کی ترغیب دینا مقصود ہے، کیونکہ اس عشرے کے خاتمہ پر حج کا وقت آتا ہے عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ ایام معلومات سے مراد ہے عرفہ کا قربانی کا دن اور ایام تشریق مقاتل نے ایام معلومات کو صرف ایام تشریق کہا ہے ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول آیا ہے کہ ان ایام سے مراد ہے قربانی کا دن اور تین روز اس کے بعد کے بہیمۃ الانعام یعنی قربانی کے جانور جو کعبہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں خواہ قربانی واجب ہو یا مستحب۔ آیت میں کوئی قید نہیں۔ تقرب حاصل کرنے کی اس میں ترغیب ہے اور اس امر پر تنبیہ ہے کہ یاد الٰہی کا تقاضا پورا کیا جائے۔

امام شافعیؒ نے اسی آیت کی روشنی میں کہا ہے کہ سواء دم الاحصار (اگر حاجی کو احرام باندھنے کے بعد راستہ میں کوئی دشمن روک دے اور کعبہ تک نہ پہنچنے دے تو جہاں اس کو روکا گیا ہو اسی جگہ احرام کھول دینا اور ارادۂ حج ملتوی کر دینا اور قربانی کر دینا چاہئے یہ دم الاحصار کہلاتا ہے) حاجی ہر قربانی صرف انہی ایام میں کرے گا یوم النحر اور تین روز اس کے بعد۔

ہم کہتے ہیں ایام معلومات کی قید اتفاقی ہے (عام قربانی مقررہ ایام میں ہی ہوتی ہے) ضروری اور احترازی نہیں ہے اور ہم مفہوم مخالف کے قائل نہیں ہیں (کہ جو قربانی ایام معلومات میں نہ ہو وہ ناجائز قرار دیں) اور آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے (حضرت علی حضرت ابن عباس کے اقوال الگ الگ ہیں) ہم کہتے ہیں ہدی نافلہ، نذر اور کفارہ کی قربانی کے لئے شرط نہیں کہ یوم النحر اور اسکے بعد تین دن میں ہی کی جائے کیونکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ حدیبیہ کے سال ماہ ذیقعدہ میں رسول اللہ ﷺ ستر اونٹ قربانی کے لئے لے کر چلے تھے اور عمرہ کے ارادے سے چلے تھے یوم النحر تک مکہ میں قیام کا ارادہ بھی نہ تھا اور حضور ﷺ نے ان اونٹوں کی قربانی کی، حضور ﷺ کا یہ عمل صراحتاً بتا رہا ہے کہ ھدی نافلہ کی قربانی ذیقعدہ میں بھی جائز ہے اور جب یوم النحر کے سوا دوسرے ایام میں نافلہ قربانی کا جواز حضور ﷺ کے عمل سے ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ ایسی قربانی طاعت ہے (جو موجب ثواب ہے) اور ہر طاعت نافلہ نذر کی وجہ سے واجب ہو جاتی ہے، پس نذر والی قربانی ایام النحر کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے اسی طرح شکار کرنے کی سزا بلکہ ہر جنایت کے کفارہ میں جو قربانی کی جائے وہ یوم النحر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ ہر جرم کا کفارہ ایک طرح کی عبادت ہے پھر اللہ نے شکار کی سزا میں جس قربانی کا حکم دیا ہے اس کے متعلق هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ فرمایا، یوم النحر کی قید نہیں لگائی اور کتاب اللہ اگر مطلق ہو تو اس کو اپنی طرف سے مقید نہیں کیا جاتا مطلق کو مقید بنانا تو اطلاق کا نسخ ہے (تخصیص یا بیان نہیں ہے) ہاں دم قران و تمتع یوم النحر کے ساتھ مخصوص ہے (کسی اور دن نہیں ہو سکتا) بلکہ دم احصار بھی امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف یوم النحر کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام ابو یوسفؒ و محمدؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں دونوں مسئلوں کی تحقیق سورۂ بقرۃ کی آیات وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ سے فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ تک تفسیر کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

فَكُلُوا مِنْهَا سو اس میں سے کھاؤ۔ یہ امر باتفاق علماء استحبابی ہے وجوب کے لئے نہیں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک یہ امر اباحت کے لئے ہے (یعنی اپنی قربانی کا گوشت کھانا جائز ہے مستحب یا واجب نہیں ہے) وہ کہتے ہیں اللہ کی طرف سے یہ اجازت اس خیال کو زائل کرنے کے لئے دی گئی جس میں اہل جاہلیت مبتلا تھے اور اپنی قربانیوں کا گوشت کھانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔

مسئلہ: علماء کا اتفاق ہے کہ ہدی نافلہ (نفل قربانی) کا گوشت قربانی پیش کرنے والے کو کھانا جائز ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کی طویل حدیث جو حجۃ الوداع کے بیان میں ہے اس کی شاہد ہے اس روایت میں ہے کہ حضرت علی یمن سے کچھ اونٹ قربانی کے لئے لے کر آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے سو اونٹ بھیج دیئے تھے، حضور نے تریسٹھ اونٹ ذبح کئے پھر حسب الحکم باقی

اونٹ حضرت علیؓ نے ذبح کئے۔ ذبح کرنے میں حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو شریک کرلیا پھر حضور ﷺ نے حکم دیا کہ ہر اونٹ کے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے کر ہانڈی میں ڈال کر پکایا جائے حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھر حضور ﷺ نے اور حضرت علیؓ نے وہ گوشت کھایا اور شوربہ پیا۔ رواہ مسلم۔

اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ اپنی (نافلہ) قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے ورنہ ہر اونٹ کے گوشت کا پارہ لینے کا حکم نہ دیا جاتا۔ ایک ہی اونٹ کے گوشت کو لے لینا کافی تھا۔

مسئلہ: شکار کے جرم کے عوض جو قربانی کی جائے اس کے گوشت کو قربانی کرنے والے کے لئے کھانا باتفاق علماء جائز نہیں۔ شکار کے عوض قربانی شکار کا بدلہ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ اس آیت میں مثل صوری مراد ہے یا (مثل معنوی یعنی) اس کی قیمت، یہ تفصیل سورۂ مائدہ میں کردی گئی ہے۔ شکار کا گوشت شکاری کے لئے جائز نہیں اس لئے شکار کے عوض جو قربانی کی جائے اس کا گوشت بھی قربانی کرنے والے کے لئے جائز نہیں۔ اصل حرام ہے عوض بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہودیوں پر اللہ کی مار ہو اللہ نے ان کے لئے چربیاں حرام کردی تھیں۔ انہوں نے چربیاں پگھلا کر فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی (یہ حیلہ کیا) متفق علیہ من حدیث جابر۔

اسی طرح امام مالک کے علاوہ جمہور آئمہ کے نزدیک نذر کی قربانی کا گوشت نذر ماننے والے کے لئے جائز نہیں۔

دوران حج میں مختلف جرائم کے ارتکاب سے جو قربانی واجب ہو جاتی ہے اس کا گوشت بھی قربانی دینے والے کے لئے باتفاق ائمہ ناجائز ہے۔ حج کو فاسد کردینے کی وجہ سے جو قربانی واجب ہوتی ہے اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اسحاق کا مسلک ہے اور ایک روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول آیا ہے کہ نذر کی قربانی اور شکار کے جرم کے عوض واجب شدہ قربانی کا گوشت تو قربانی والے کے لئے جائز نہیں ان کے علاوہ ہر قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے۔ بخاری نے تعلیق کے ساتھ حضرت ابن عمر کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ نذر کی قربانی اور تمام قصوروں کی پاداش میں جو قربانیاں دی جاتی ہیں صاحب قربانی کے لئے ان کا گوشت اس لئے ناجائز ہے کہ شکار کی پاداش میں قربانی کا گوشت شکار کرنے والے کے لئے ناجائز ہے اور تمام قصوروں کے سلسلہ میں جو قربانیاں دی جاتی ہیں وہ بھی جرائم کا کفارہ ہی ہیں اس لئے ان کا حکم بھی شکار کے کفارہ کی طرح ہونا چاہئے۔ جس طرح ہر کفارہ کی قربانی پوری کی پوری مستحق کو دینا ضروری ہے اسی طرح ہر جنایت کی پاداش میں جو قربانی کی جائے اس کے تمام اجزاء مستحق کو دینا ضروری ہیں۔

لیکن نذر کی قربانی تو کسی جرم کی پاداش میں نہیں ہوتی اس لئے اسکو شکار کے عوض واجب شدہ قربانی پر قیاس کرنا صحیح ہے۔ البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ نذر کی قربانی بھی پوری کی پوری مستحق کے پاس پہنچنا ضروری ہے (اس لئے اس کا کوئی ٹکڑا بھی نذر کرنے والا نہیں کھا سکتا)

مسئلہ: عام قربانی کا گوشت باتفاق ائمہ قربانی کرنے والا بھی کھا سکتا ہے امام ابو حنیفہ کی دلیل ظاہر ہے کہ قربانی عبادت وطاعت ہے رسول اللہ ﷺ نے قربانیوں کے متعلق فرمایا تھا کہ کھاؤ اور کھلاؤ اور بچا کر اندوختہ بنا کر بھی رکھ سکتے ہو۔ یہ روایت صحیح ہے حضرت سلمہ بن اکوع کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے۔ امام شافعی اور دوسرے علماء بھی جواز کے قائل ہیں کیونکہ ان حضرات کے نزدیک قربانی مسنون مستحب ہے اور نافلہ قربانی کا گوشت بہر حال حلال ہے۔

مسئلہ: تمتع اور قران کے متعلق اختلاف ہے امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک اس کو کھانا جائز ہے کیونکہ یہ بھی ذبیحہ عبادت ہے اور حضرت جابر کی روایت ہم نقل کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اونٹ کے گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر کھایا تھا اور اس کا شوربہ پیا تھا اور حضرت علی کو بھی اس میں شریک کیا تھا۔

ابن جوزی نے سنن میں عبدالرحمن بن ابی حاتم کی روایت بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ تمتع کی قربانی کا جتنا گوشت کھالیں سو کھالیں اور کھانے سے جو بچ رہے اس کو خیرات کردیں اس روایت سے بھی

ذبیحۂ تمتع کو کھانے کا جواز صراحتاً ثابت ہو رہا ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک تمتع اور قران کا ذبیحہ قربانی کرنے والے کے لئے ناجائز ہے بلکہ کسی واجب قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کے لئے جائز نہیں خواہ نذر کی قربانی ہو یا کسی اور وجہ سے واجب ہوئی ہو امام شافعی نے اپنے مسلک کے ثبوت میں تین حدیثیں پیش کی ہیں ایک وہ جو حضرت ناجیہ خزاعی نے غزوۂ حدیبیہ کے موقع کی بیان کی ہے دوسری حضرت ابن عباس کی روایت کردہ حدیث تیسری حضرت ذویب بن طلحہ کی حدیث ہم نے سورۃ بقرہ کی آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ کی تفسیر کے ذیل میں یہ تینوں احادیث اور ان کے جواب نقل کر دیئے ہیں۔ ظاہر آیت سے قربانی کے گوشت کو کھانے کا جواز معلوم ہوتا ہے، خواہ قربانی واجب ہو جیسے تمتع اور قران کی قربانی یا نفل ہو کیونکہ الفاظ میں کوئی قید نہیں اجماع کی وجہ سے نذر کی قربانی کو اس عموم جواز سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ نذر قربانی کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ حج سے غیر متعلق ہے آیت حج کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں شکار کرنے کی سزا میں جو قربانی واجب ہوتی ہے بلکہ ہر وہ قربانی جس کا وجوب بطور کفارہ ہوتا ہے اس کا تعلق ضرور حج سے ہے لیکن اس آیت میں وہ مراد نہیں ہے مسلمان کے حال کا تقاضا ہے کہ حج میں خلاف شرع کوئی جرم ہی نہ کرے اپنے حج کو پاک رکھے اس لئے کسی جنایت کے کفارے کی قربانی کا اس آیت سے تعلق ہی نہیں ہے۔

وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ اور بدحال محتاج کو کھلاؤ۔ البائس بؤس والابوئس سخت محتاجی۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ پھر وہ اپنے میل کچیل کو دور کریں یعنی سر منڈوائیں، لبیں کتریں، ناخن کاٹیں، زیر ناف اور بغلوں کی صفائی کریں مطلب یہ کہ طواف زیارت سے پہلے احرام کھول کر یہ سب کام کر سکتے ہیں اور سر منڈوانے کے بعد سوائے عورتوں کی قربت کے مذکورۂ بالا ممنوعات حلال ہو جاتے ہیں، عورتوں سے قربت کی حلت طواف کے بعد ہوتی ہے کذا قال المفسرون۔

قضاء کا لغوی معنی ہے ادا کرنا اور کوئی کام کر دینا قضی دینہ اس نے اپنا قرض چکا دیا۔ واذا قضیتم مناسککم اور جب تم اپنے مناسک ادا کر چکو۔ قضٰھن سبع سموت کر دیا ان کو سات آسمان۔ کسی کام کو کر چکنے کے بعد اس سے فراغت ہو ہی جاتی ہے، اس لئے قضاء کے بعد فارغ ہو جانا لازم ہے۔ اللہ نے فرمایا اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ دونوں مدتوں میں جو مدت پوری کر چکوں، میل کچیل دور کرنے کے، بعد بھی فراغت ہو جاتی ہے اس لئے لیقضوا فرمایا قضاء تفث تمام مناسک حج (کی ادائیگی) ہے۔ مجاہد نے کہا تفث سے مراد ہیں مناسک حج، لبیں کترنا، زیر ناف اور بغلوں کو صاف کرنا، ناخن تراشنا، بعض اہل علم نے کہا تفث رمی جمار (کنکریاں مارنا) ہے ان اقوال پر مطلب یہ ہوگا کہ جب تم یہ افعال کر چکو زجاج نے کہا تفث کا لفظ ہم کو قرآن سے ہی معلوم ہوا یعنی یہ لفظ کلام عرب میں زیادہ مستعمل نہیں ہے۔ قرآن کی اس آیت سے پہلے ہم کو معلوم نہ تھا۔

لفظ ثم سے معلوم ہوتا ہے کہ حلق اور طواف قربانی کے بعد کیا جائے۔ یہ دلیل ہے امام ابو حنیفہ کے قول کے صحیح ہونے کی کہ رمی جمار اور صاحب قران کی قربانی اور حلق راس میں ترتیب واجب ہے سعید بن جبیر قتادہ، حسن اور نخعی کا بھی یہی قول ہے، اس لئے اگر کوئی شخص، ترتیب کو قصداً چھوڑ دے یا غلطی سے بہر حال اس پر (اس جرم کے عوض) قربانی واجب ہو جائے گی۔ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ مناسک کی ترتیب میں جو شخص تقدیم و تاخیر کرے اس کو قربانی کرنی چاہئے۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ نے موقوفاً بیان کی ہے اور ایسے موقع پر حدیث موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے کیونکہ کسی جرم کا کفارہ ایسے طور پر ادا کرنا جو ازروئے عقل جرم سے مشابہت نہ رکھتا ہو (یعنی قضاء بمثل غیر معقول) رائے سے معلوم نہیں ہوتا۔ (یقیناً حضرت ابن عباس نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا سنا ہوگا)

ایک شبہ

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جس کو ابو حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے اور ابن المدینی و نسائی کے نزدیک یہ شخص قوی نہیں ہے ابن عدی کا قول ہے کہ اس شخص کی حدیث کو ضعفاء میں شمار کیا جائے۔

شبہ کا ازالہ

ابراہیم بن مہاجر جلیل القدر تابعی تھا، مسلم نے اس کا متابع ذکر کیا ہے سفیان (ابن عینیہ) احمد اور ترمذی نے اس کو لاباس بہ (اس میں کوئی خرابی نہیں) کے زمرہ میں شامل کیا ہے پھر یہ حدیث صرف اسی راوی کی روایت پر منحصر نہیں ہے طحاوی نے دوسری سند سے بھی جس میں ابراہیم شامل نہیں ہے۔ یہ حدیث نقل کی ہے۔ طحاوی۔ نے لکھا ہے حدثنا وہیب عن ایوب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس۔ اس کے بعد حدیث مذکور نقل کی ہے۔

امام احمد کے نزدیک صرف قصداً ترتیب کو ترک کرنے سے قربانی واجب ہے بھول کر ناواقفیت کی وجہ سے ترتیب کے خلاف ہو گیا تو قربانی واجب نہیں۔ امام احمد کا یہ قول اثرم نے بھی نقل کیا ہے بخاری کے کلام سے، بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک بھی فتویٰ کے لئے یہی قول پسندیدہ ہے۔ امام شافعیؒ اور بہت سے علماء سلف کے نزدیک، ترتیب سنت ہے واجب نہیں ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک قربانی اور رمی جمار سے حلق الراس کو مقدم کرنا جائز ہی نہیں ہے امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اسی طرح کا ایک روایت میں آیا ہے امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت ابن عباس کی روایت پیش کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے قربانی اور رمی جمار اور حلق راس کی تقدیم و تاخیر کے متعلق دریافت کیا گیا تو حضور ﷺ نے (سب کے جواب میں) فرمایا کوئی ہرج نہیں ہے۔ متفق علیہ۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ منیٰ میں قربانی کے دن حضور ﷺ سے سوال کئے جارہے تھے۔ (جن کے جواب میں) حضور ﷺ فرمارہے تھے کوئی ہرج نہیں۔ ایک شخص نے سوال کیا میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوا دیا فرمایا (اب) قربانی کر لے کوئی ہرج نہیں۔ بخاری کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے رمی سے پہلے زیارت کر لی (یعنی طواف زیارت کر لیا) فرمایا کوئی ہرج نہیں، اس نے عرض کیا میں نے رمی سے پہلے قربانی کر لی فرمایا کوئی ہرج نہیں۔

طبرانی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں نے رمی سے پہلے کعبہ کا طواف کر لیا فرمایا (اب) رمی کر لے کوئی ہرج نہیں۔

حضرت علیؓ کی حدیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ قربانی سے پہلے طواف کر لینے کا مسئلہ اس نے دریافت کیا تھا۔ رواہ احمد۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں اگر ترتیب واجب ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس کو ترتیب کے ساتھ دوبارہ مناسک ادا کرنے کا حکم دیتے، کیونکہ قربانی کا دن تھا، اداء مناسک کا وقت موجود تھا، یا (ترک واجب کے کفارہ میں) قربانی کرنے کا حکم دیدیتے۔ لیکن ایسا کوئی حکم دینا کسی روایت میں نہیں آیا۔ مسلمانوں کا عظیم اجتماع تھا اور ہر شخص مناسک حج سے واقف ہونے کا آرزو مند اور حریص بھی تھا، پس جب کسی روایت میں اعادہ مناسک یا جدید قربانی کرنے کا حکم منقول نہیں اور کسی نے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہی نہ تھا اور ترتیب واجب ہی نہیں تھی واجب ہوتی تو بر محل واجب حکم کی تعلیم ضروری تھی اور جب ترتیب واجب نہ قرار پائی تو اگر کسی نے اس کو قصداً ترک کر دیا تو اس پر قربانی کا وجوب بھی نہیں ہو سکتا۔ امام ابو حنیفہ۔ نے فرمایا مذکورہ بالا قصہ کے ایک راوی حضرت ابن عباس ہیں اور (اس روایت کے خلاف) حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی مروی ہے کہ جس۔ نے مناسک میں کچھ تقدیم و تاخیر کی اس کو (بطور کفارہ) قربانی کرنا چاہئے اور اگر راوی کا اپنا قول اس کی روایت کے خلاف ہو تو وہ روایت مجروح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ روایت کے خلاف اس کا قول بتاتا ہے کہ روایتی حدیث کے خلاف اس راوی کو کوئی دوسری حدیث ملی ہے جو اول حدیث کو منسوخ کرنے والی ہے (اسی بنا پر تو اول حدیث کے خلاف راوی کا قول پیدا ہوا) لیکن یہ دلیل امام شافعی کے مسلک کو غلط ثابت نہیں کرتی کیونکہ امام شافعی کے نزدیک اگر کسی راوی کا قول اس کی روایت

کے خلاف ہو تو روایت مجروح نہیں ہوتی، بلکہ امام صاحب کے اصول پر بھی یہ دلیل منطبق نہیں ہوتی کیونکہ راوی کا قول اگر اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس وقت روایت کو مجروح کرتا ہے جب اس قول کو مرفوع حدیث کے حکم میں قرار دے دیا گیا ہو۔ موقوف کو اگر مرفوع کا حکم دیدیا جائے تو گویا وہ قول اول حدیث کا ناسخ ہو جائے گا اور یہاں ایسا نہیں ہے۔ قول ابن عباس روایت ابن عباس کا ناسخ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں جہاں تک ممکن ہو احادیث کا تعارض دور کرنا ضروری ہے، ایک پر عمل کرنا اور دوسری کو بالکل ترک کر دینا مناسب نہیں اس لئے میرے نزدیک حضرت ابن عباس کے قول کو جو حدیث مرفوع کے حکم میں ہے اور حدیث حسن کے درجہ تک پہنچ چکا ہے ارادی ترک ترتیب پر محمول کیا جائے یعنی ابن عباس کے قول کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ جس نے قصداً مناسک کی ترتیب توڑ دی اور تقدیم و تاخیر کردی تو اس پر قربانی واجب ہے اور امام شافعیؒ نے جو حدیث نقل کی ہے اس کو نسیان یا ناواقفیت پر محمول کیا جائے یعنی اس حدیث سے یہ سمجھا جائے کہ بھول کر یا ناواقفیت کی وجہ سے کسی نے مناسک میں تقدیم و تاخیر کرلی ہو تو کوئی ہرج نہیں، اس پر قربانی واجب نہیں، جیسے امام ابو حنیفہ کے نزدیک فوت شدہ نمازوں کو ترتیب وار ادا کرنا واجب ہے لیکن اگر بھول گیا تو ترتیب فوائت کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے یا جس طرح روزے میں کھانا یا پینا ترک کرنا ضروری ہے لیکن بھول کر کھالیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا یا جیسے تکبیرات تشریق واجب ہیں لیکن نسیان کی صورت میں ساقط ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: سر منڈوانا، احرام کے واجبات میں سے ہے۔ حج کا رکن نہیں ہے۔ امام ابو یوسف امام احمد اور بعض مالکیہ کے نزدیک واجب نہیں ہے ایک امر مباح ہے۔ ایک کمزور روایت میں امام شافعیؒ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے، ہماری دلیل یہی آیت ہے۔ اس میں تفث دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تفث سے مراد سر منڈوانا ہے اور امر (حقیقتاً) وجوب کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا سر منڈوانا واجب ہو گیا یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب حلق راس کا رکن حج ہونا امر وجوبی قطعی سے ثابت ہے تو پھر حلق فرض کیا جائے، واجب کیوں قرار دیا گیا (واجب کا ثبوت تو دلیل ظنی سے ہوتا ہے) یہ شبہ غلط ہے کیونکہ آیت اگرچہ قطعی ہے ناقابل شک لیکن تفسیری مطلب قطعی نہیں ہے ظنی ہے۔ موجب یقین نہیں ہے اس لئے حلق راس کا رکن حج ہونا وجوب کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ شافعیؒ نے حلق راس کو رکن حج اس وجہ سے بھی قرار دیا ہے کہ حلق راس سے احرام کا حکم ختم ہو جاتا ہے اور احرام رکن حج ہے پس جس چیز سے احرام ختم ہو گیا اس کا بھی رکن حج ہونا ضروری ہے جیسے لفظ سلام شافعی کے نزدیک رکن صلوٰۃ ہے کیونکہ نماز کا رکن لفظ سلام کی وجہ سے جاتا رہتا ہے، نماز ختم ہو جاتی ہے اس لئے لفظ سلام بھی رکن صلوٰۃ قرار پایا۔

ہمارے نزدیک احرام حج کی شرط (خارجی) ہو یا رکن (داخلی) کسی صورت میں بھی اس عمل کا جس سے احرام جاتا رہتا ہے نہ رکن ہونا ضروری ہے نہ شرط ہونا۔ اور ہمارے نزدیک لفظ سلام بھی نماز کا رکن نہیں ہے اس کے علاوہ احرام کو سلام پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سلام کو تحریمہ صلوٰۃ کی انتہا قرار دیا ہے، فرمایا ہے (تحریم صلوٰۃ تکبیر ہے اور تحلیل صلوٰۃ سلام ہے (یعنی تکبیر سے نماز شروع ہو جاتی ہے نماز میں داخلہ ہو جاتا ہے اور لفظ سلام سے نماز کھل جاتی ہے۔ بندش صلوٰۃ ختم ہو جاتی ہے۔) پس اگر لفظ سلام کے بغیر کوئی ایسا فعل (یا قول) کیا جو نماز کے خلاف ہے تو اس سے نماز کا تحریمہ ختم ہو جائے گا۔ خواہ تحریمہ کو نماز کا رکن کہا جائے یا شرط۔ بہر حال تحریمہ جاتا رہے گا۔ لیکن احرام حج کی یہ حالت نہیں ہے، امور ممنوعہ کرنے سے احرام حج باطل نہیں ہو جاتا، دیکھو عرفات میں قیام سے پہلے اگر کسی نے جماع کر لیا تو حج جاتا رہے گا۔ آئندہ حج کی قضا واجب ہو گی ایسا نہیں کہ احرام باطل ہو جائے اور حج قائم رہے اور آخر تک حج کو پورا کرنا لازم ہو۔

مسئلہ: حلق راس کا ابتدائی وقت کون سا ہے اور انتہائی کون سا۔ قربانی کے دن فجر صادق سے اکثر کے علماء کے نزدیک اور آدھی رات کے بعد سے بعض علماء کے نزدیک حلق راس کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت عروہ بن مفرس کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ہمارے ساتھ یہ نماز یعنی فجر کی نماز مزدلفہ میں پڑھی اور اس سے پہلے رات

گویا دن کو عرفات میں بھی وہ قیام کر چکا۔ اس کا حج پورا ہو گیا اور اس نے اپنا تفث دور کر دیا (یعنی سر منڈوا دیا) رواہ اصحاب السنن، الاربعتیہ۔ حاکم نے کہا یہ روایت تمام اہل حدیث کی شرائط کے مطابق ہے لیکن بخاری و مسلم نے اس کو نہیں بیان کیا یہ روایت اصول شیخین کے خلاف ہے۔ عروہ بن مفرس سے صرف شعبی نے روایت کی ہے ہم نے ابن مفرس کے بجائے عروہ بن زبیر پایا ہے اور عروہ بن زبیر سے حدیث مروی ہے۔

امام شافعیؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد، بلکہ اکثر علماء کے نزدیک سر منڈانے کے وقت کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ ہاں اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ حلق کے لئے کیا داخل حرم ہونا شرط ہے یعنی سر منڈانے کا مقام حرم ہی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام زفر حرم کو حلق کا مقام ضروری نہیں قرار دیتے۔ کوئی شرط نہیں کہ حرم کے اندر ہی سر منڈایا جائے، امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا سر منڈانے کے دو پہلو ہیں ایک رخ تو یہ ہے کہ حلق راس احرام کھول دینے کا ذریعہ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ مناسک حج میں داخل ہے حج کے ارکان واجبہ میں سے ایک رکن ہے اول لحاظ سے تو اس کی خصوصیت کسی مقام اور جگہ سے نہیں ہے اور دوسرے اعتبار سے اس کے لئے دن بھی مقرر ہے، یعنی قربانی کا دن اور مقام کی بھی تعین ہے یعنی حرم یہ ایک عبادت ہے جس کے اندر قیاس کو دخل نہیں، اس لئے اس کی عبادتی خصوصیات وہی ہوں گی جو شارع کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں، یعنی زمان (یوم النحر) اور مکان (حرم) اول لحاظ سے اس میں رائے اور قیاس کو دخل ہے کیونکہ محلل (احرام کھولنے کا ذریعہ) وہی ہوگا جو مقررہ وقت و مقام کے علاوہ اگر کیا جائے تو جنایت اور جرم قرار پائے (جس کی تلافی کفارہ سے کی جانی چاہئے) اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر وقت مقررہ کے بعد حلق کیا یا حرم سے باہر کیا تو احرام سے بیشک آزاد ہو جائے گا۔ مگر غیر شرعی طریقے سے کرنے کی وجہ سے اس کی عبادتی حیثیت فوت ہو جائے گی اور (بطور کفارہ) قربانی کرنی ہو گی۔

امام ابو یوسف نے حدیث کے اس فقرہ سے استدلال کیا ہے کہ جب ایک شخص نے قربانی سے پہلے سر منڈا دیا (اب) قربانی کر لے کوئی ہرج نہیں۔

ہم کہتے ہیں قربانی کا دن تو موجود ہی تھا حلق راس کا وقت باقی تھا۔ ظہر کے بعد کا وقت تھا۔ ناواقفیت یا نسیان کی وجہ سے ترتیب قائم نہیں رہی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا کوئی ہرج نہیں (اب) ذبح کر لے۔

اب رہی یہ بات کہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ نے حلق کرا دیا تھا اس کے متعلق امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کی حیثیت عبادتی نہیں تھی بلکہ قطعی واپسی کی ایک نشانی تھی (کہ اب واپس جانا ہی ہے) اسی لئے امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس شخص پر حلق واجب نہیں جس کو راستے میں کسی مجبوری کی وجہ سے رک جانا پڑا ہو اور حج کرنا ممکن نہ ہوا ہو۔

میرے نزدیک اس کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ جو شخص جبر جابر کی وجہ سے راستہ میں ہی روک دیا گیا ہو وہ معذور ہے دوسرے کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا دیکھو باجماع علماء ایسے ممنوع الحج شخص کے لئے تو وقت سے پہلے سر منڈا دینا جائز ہے دوسرے کے لئے تو اس کا جواز نہیں ہے یہی صورت غیر مقام کی بھی ہے ممنوع الحج معذور ہے جہاں پائے حلق کرا دے، دوسروں کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نے جو حلق کے لئے حرم کی شرط لگائی ہے اس کا ثبوت آیت ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ سے ملتا ہے اس کی تفسیر عنقریب آئے گی، دوسری آیت ہے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ اس آیت میں سر منڈوانے اور بال کتروانے کو دخول مسجد کے خواص میں سے قرار دیا ہے۔

سلف کا ہمیشہ سے طریقہ بھی یہی رہا ہے کہ حرم کے اندر حلق کراتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا اور حضور کے بعد سب صحابہ اور تابعین وغیرہم کا یہی طریقہ رہا کہ حج کی صورت میں منیٰ میں اور عمرہ کی صورت میں مروہ کے قریب حلق کراتے رہے اور منا و مروہ دونوں حرم کے اندر ہیں۔

مسئلہ: حلق یا قصر کی واجب مقدار کتنی ہے یہ مسئلہ آئمہ کے اندر مختلف فیہا ہے۔

امام ابو حنیفہ ایک چوتھائی سر کا منڈوانا یا بال کتروانا کافی سمجھتے ہیں۔
امام شافعی کے نزدیک ایک بال یا تین بالوں کا منڈوانا یا کتروانا کافی ہے۔
امام مالک اور امام احمد پورا سر منڈوانا یا پورے سر کے بال کتروانا ضروری قرار دیتے ہیں۔
امام شافعی نے فرمایا، قضاء تفث (یعنی حلق وغیرہ) از روئے آیت واجب ہے اور باتفاق علماء کامل طور پر قضاء تفث ضروری نہیں کیونکہ قصر کی اجازت ہے اور قصر سے مکمل طور پر میل کچیل (تفث) کا ازالہ نہیں ہوتا، کسی قدر ہو جاتا ہے اور کسی قدر ازالہ تفث (کی کوئی حد نہیں یہ) ایک یا تین بالوں کے منڈوانے یا کتروانے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے، امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں ایک یا تین بالوں کے منڈوانے یا کٹوانے کو کوئی عرب سر منڈوانا یا کتروانا نہیں کہتا نہ اس کو قضاء تفث کہتے ہیں شرعاً کم سے کم اس کی کوئی حد مقرر ہونی چاہئے اور چوتھائی سر کو کل سر کا قائم مقام وضو کے اندر مانا گیا ہے چوتھائی سر کا مسح کل سر کے مسح کی جگہ کافی قرار دیا گیا ہے اور باقی اعضاء کو کامل طور پر دھونا ضروری قرار دیا ہے سورۂ مائدہ کے اندر آیت وضو کی تفسیر کے ذیل میں اسکی تحقیق کر دی گئی ہے اس لئے یہاں بھی ایک چوتھائی سر منڈوانا یا کتروانا کافی ہے۔ امام مالک اور امام احمد نے وضو کے اندر چوتھائی سر کے مسح کو کافی نہیں قرار دیا اس لئے یہاں بھی ان کے نزدیک پورا سر منڈوانا یا کتروانا واجب ہے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد تمام صحابہ کا یہی عمل رہا کہ پورا سر منڈواتے تھے یا سب بال کترواتے تھے۔
مسئلہ: باتفاق علماء حلق قصر سے افضل ہے حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی اے اللہ سر منڈانے والوں پر رحم فرما، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اور بال کتروانے والوں پر (بھی) حضور نے پھر فرمایا اے اللہ سر منڈانے والوں پر رحم فرما صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اور کتروانے والوں پر (بھی) حضور نے تیسری بار دعا کی اے اللہ سر منڈانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اور کتروانے والوں پر (بھی اس وقت) حضور ﷺ نے فرمایا اور کتروانے والوں پر (بھی)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے چوتھی مرتبہ میں فرمایا تھا اور کتروانے والوں پر بھی۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔ صحیحین میں دونوں حدیثیں مذکور ہیں۔
وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ اور ان کو چاہئے کہ اپنی مانی ہوئی نذریں پوری کریں، بعض اہل تفسیر نے کہا کہ نذر پوری کرنے سے مراد ہے تمام واجبات کو ادا کرنا خواہ نذر مانی ہو یا نہ مانی ہو (یعنی اللہ کی طرف سے کوئی بات واجب ہو یا بندہ نے خود اپنے اوپر واجب کر لی ہو کہ میں یہ کام ضرور کروں گا) جمہور کے نزدیک ایفاء نذر سے ان امور کی ادائیگی مراد ہے جو اللہ کی طرف سے واجب نہیں ہوئی ہو بندہ نے خود اپنے ذمہ واجب کر لی ہو، نذر دو طرح کی ہوتی ہے (۱) منجز (غیر مشروط) مثلاً کوئی یہ عہد باندھ لے کہ میں اللہ کے لئے دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ (۲) مشروط یا معلق مثلاً اگر میرا یہ کام ہو جائے گا تو میں ایک روزہ رکھوں گا۔ شرط دو طرح کی ہوتی ہے (۱) پسندیدہ (۲) ناپسندیدہ۔ اگر اللہ نے میرے بیمار کو شفا دیدی تو میں چار روزے رکھوں گا۔ یہ پسندیدہ شرط ہے۔ اس کو نذر تردد کہتے ہیں اگر میں نے زید سے بات کی تو ایک ماہ کے روزے رکھنا مجھ پر لازم ہیں۔ یہ ناپسندیدہ شرط ہے ایسی نذر کو نذر لجاج کہتے ہیں۔

نذر نام ہے ایسی بات کو اپنے اوپر واجب کر لینے کا جو اللہ کی طرف سے واجب نہ کی گئی ہو (یعنی ایجاب مالم یجب شرعا) تو اگر کسی نے ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لیا جو پہلے سے شرعاً واجب ہے تو یہ نذر نہ ہوگی بلکہ محض خبری جملہ ہوگا جیسے اگر کسی نے کہا اگر اللہ میرے بیمار کو شفا دیدے گا تو رمضان بھر روزے رکھوں گا یا ظہر کی نماز پڑھوں گا۔ ظاہر ہے کہ رمضان کے روزے اور ظہر کی نماز پہلے ہی اللہ کی طرف سے لازم ہے ایسے کلام کو نذر نہیں کہیں گے اور نہ نذر کا حکم اس پر مرتب ہوگا اور اس صورت میں اگر کسی نے واجب شرعی کے اوصاف یا مقدار میں کچھ تغیر کیا ہوگا تو وہ تغیر وصفی یا تبدیل مقداری ناقابل اعتبار ہوگی۔ مثلاً اگر کسی نے کہا میرے بیمار کو اللہ شفا عطا فرما دے گا تو میں اپنے مال کی زکوٰۃ پانچ فیصد کے حساب سے دوں گا، یا فرض ظہر

کی چھ رکعت پڑھوں گا یا ہر نماز کو تازہ وضو سے پڑھا کروں گا یا ہر نماز جماعت سے پڑھا کروں گا، ان تمام صورتوں میں فرائض شرعیہ اصلی شرعی صورت و مقدار کے ساتھ قائم رہیں گے الفاظ نذر کا اعتبار نہ ہوگا نہ وصف بدلے گا نہ مقدار میں بیشی ہوگی زکوۃ کی فرضیت ڈھائی فیصد ہی رہے گی اور ظہر کے فرض چار ہی رہیں گے اور نماز بغیر تازہ وضو کے جائز ہوگی اور جماعت کا جو درجہ پہلے تھا وہی الفاظ نذر کے بعد بھی رہے گا کیونکہ اللہ نے ظہر کی نماز کے چار فرض مقرر کئے ہیں اور ہر نماز باوضو ہو (خواہ تازہ وضو نہ ہو) اور بغیر جماعت کے منفرد کی نماز کو کافی قرار دیا ہے اب اگر بغیر قیود کے ان احکام کی شرعی ادائیگی کو کافی نہ مانا جائے گا تو اللہ کے حکم کو منسوخ کر دینا لازم آئے گا اور اصلی شرعی صورت میں کافی سمجھا جائے گا تو اس تبدیل و تغیر کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ایسی نذر مشروط کے بعد اگر نذر کی وفا نہ کی گئی ہو کسی اور طرح سے اس کی ادائیگی ہونی چاہئے یعنی کفارہ ادا کرنا چاہئے اور چونکہ یہ چیزیں مستقل نہیں ہیں اس لئے ان کا کفارہ بادائے مثل معقول ہو نہیں سکتا اور بادائے مثل غیر معقول (مثلاً قربانی کرنا) ہو تو مثل غیر معقول کی تعیین شریعت کی طرف سے ہونی چاہئے اور شرعاً ایسی صورت میں مثل غیر معقول کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ یہی معنی ہیں علماء کے اس قول کے کہ وجوب ایفاء نذر کی شرط یہ ہے کہ وہ طاعت مقصودہ ہو اور بجائے خود اس کی حیثیت مستقل ہو۔

اگر کسی نے پیدل حج کرنیکی نذر مانی اور سوار ہو کر گیا تو (بطور کفارہ) قربانی کرنا مشروع ہے شریعت میں بطور کفارہ قربانی کرنا متعارف ہے۔

بیان مذکورہ بالا پر ایک اشکال بہر حال قائم رہتا ہے جو لاینحل ہے کہ پانچ فیصد زکوۃ ادا کرنے کی نذر ماننے کی صورت میں ڈھائی فیصد ادا کرنے سے نذر باقی نہیں رہتی جب کہ اللہ کی واجب کردہ زکوۃ کا نسخ پانچ فیصد ادا کرنے سے لازم نہیں آتا بلکہ قدر زائد کا الگ وجوب ہو جاتا ہے ڈھائی فیصد حسب قانون شرع اور ڈھائی فیصد بطور ایفاء نذر۔ واللہ اعلم۔

جو امر شرعاً اللہ کی طرف سے واجب نہیں ہے (اور نذر کی وجہ سے اپنے اوپر واجب کیا گیا ہے) اس کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ امر طاعت ہو (۲) وہ امر گناہ ہو۔ (۳) وہ امر مباح ہو۔ نہ اس میں طاعت کا معنی ہو نہ معصیت کا۔ اول الذکر کا ایفاء باتفاق علماء واجب ہے اور اسی آیت کو دلیل میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت سے ایفاء نذر کا جو حکم مستفاد ہو رہا ہے وہ فرض قطعی ہے یا واجب ظنی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک مسلمہ ضابطہ ہے کہ عام مخصوص البعض ظنی ہوتا ہے (یعنی مفید ظن ہوتا ہے فرض نہیں ہوتا اور) یہ آیت عام ہے ہر طرح کی نذر کے ایفاء کا حکم دیا گیا ہے لیکن نذر معصیت کا ایفاء باتفاق علماء جائز نہیں (معلوم ہوا کہ یہ آیت مخصوص البعض ہے) اور آیت مخصوص البعض ظنی ہو جاتی ہے (لہذا ایفاء نذر ازروئے آیت واجب ہے فرض نہیں ہے) بعض علماء نے کہا کہ امام ابو حنیفہ کے مسلمہ کی بنا پر بھی ایفاء نذر کا مفہوم قطعی ہے کیونکہ آیت اگرچہ مخصوص البعض ہے جو مفید وجوب ہے لیکن اس مخصوص البعض حکم کے فرض ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ انعقاد اجماع کی وجہ سے جو حکم ایفاء نذر (ازروئے آیت واجب) تھا قطعی اور فرض ہو گیا۔ نذر طاعت اگر منجز ہو اور اس کو پورا کرنا استطاعت میں ہو تو اس کو پورا کرنا فرض ہے۔ ایفاء نذر کو ترک کر کے کفارہ ادا کرنا بالاتفاق ناجائز ہے۔ بعض کے نزدیک ترک ایفا کی صورت میں کفارہ قسم ادا کیا جا سکتا ہے اور اگر نذر مشروط ہو اور شرط موجود ہو جائے تو امام مالکؒ امام ابو حنیفہؒ اور اکثر علماء کے نزدیک اس کا حکم بھی نذر منجز کی طرح ہے گویا نذر مشروط کا معنی یہ ہو جائے گا کہ وجود شرط کے وقت میں اللہ کے لئے ایسا کام کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ اپنی وفات سے سات روز پہلے امام ابو حنیفہؒ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا اور فرمایا تھا نذر مشروط کی صورت میں صاحب نذر کو اختیار ہے ایفاء نذر کرے یا کفارہ قسم کے برابر کفارہ ادا کرے۔ امام محمد کا بھی یہی مسلک ہے۔

اگر کسی نے نذر مانی کہ میرے بھائی کو اللہ شفاء دے دے گا تو شکرانے میں ایک حج کروں گا۔ یا ایک سال کے روزے

رکھوں گا تو اس کو اختیار ہے حج کرے یا کفارہ ادا کرے اور روزوں کی نذر کی صورت میں اگر نادار ہے (کفارہ مالی ادا نہیں کر سکتا) تو وہ سال بھر کے روزے رکھے یا صرف تین روزے رکھ لے (کیونکہ نادار کے لئے قسم کا کفارہ تین روزے ہیں)

اول قول امام ابو حنیفہ کا ظاہر مذہب ہے (جو امام محمد کی چھ کتابوں میں سے کسی کتاب میں منقول ہے) اور دوسرا قول جس میں کفارہ قسم کے برابر کفارہ ادا کرنے کا اختیار دیا گیا ہے نواد میں آیا ہے (امام محمد کی چھ کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں منقول ہے) اول قول کی وجہ تو یہی آیت ہے اور اس کی تائید مختلف احادیث سے بھی ہوتی ہے اور نوادر والے قول کا اثبات مسلم کی حدیث سے ہوتا ہے جس کے راوی حضرت عقبہ بن عامر ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ کفارہ ادا کرنے سے نذر ساقط ہو جاتی ہے اس حدیث کا دوسری احادیث سے تعارض ہو رہا ہے دونوں میں توافق پیدا کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ بعینہ نذر کو پورا کرنا (اور کفارہ نہ ہونا) نذر منجز کے لئے لازم ہے اور کفارہ کا تعلق نذر معلق (مشروط) سے ہے۔ دونوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ نذر مشروط فی الحال تو نذر ہوتی نہیں جب تک شرط کا تحقق نہ ہو نذر معدوم رہے گی قسم کی بھی یہی صورت ہوتی ہے جب تک قسم نہ توڑے کفارہ واجب نہیں ہوتا قسم توڑنے کے بغیر قسم کے کفارہ کا حکم معدوم ہوتا ہے اور نذر منجز کا وجود فی الحال ہوتا ہے اس لئے اس کو پورا کرنا (اور کفارہ سے اس کا ساقط نہ ہونا) تو لازم ہی ہو جاتا ہے۔

صاحب ہدایہ اور دوسرے اکابر حنفیہ کے نزدیک (وفاء نذر اور کفارہ کا) اختیار نذر لجاج میں ہوگا کیونکہ نذر لجاج کرنے والا حقیقت میں وجود شرط کا خواستگار ہی نہیں ہوتا اس لئے وجوب نذر کا اس کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ انسان نہیں چاہتا کہ ہمیشہ اس پر عبادتیں واجب رہیں اگرچہ وہ عبادتیں موجب ثواب ہی ہوں اس کو ڈر رہتا ہے کہ کہیں ترک عبادت کسی وقت ہو جائے جو اس کو مستحق عذاب بنادے اسی وجہ سے صحیح روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ نذر بھلائی (کامیابی شفا۔ واپسی مسافر وغیرہ) کی موجب نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ کسی دشوار عبادت کی نذر مانی ہو جیسے حج یا سال بھر کے روزے۔

رہا نذر۔ تردد کا حکم تو اس کا حکم نذر منجز کی طرح ہے جس بات کی نذر مانی ہے اسی کو کرنا ہوگا (کفارہ ادا کرنے سے یہ نذر پوری نہیں ہوتی) کیونکہ جب وجود شرط کا ارادہ کر لیا تو لا محالہ وجود نذر کا خواستگار ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ نذر منجز اور نذر تردد کو بعینہ پورا کرنا ضروری ہے اور نذر لجاج میں اصل نذر کو پورا کرے یا کفارہ ادا کرے دونوں کا اختیار ہے۔ امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے صاحب ہدایہ نے یہ ساری تفصیل بیان کی ہے امام شافعی کا بھی ظاہر ترین قول یہی ہے لیکن شافعی کے دو قول اور بھی بعض روایات میں آئے ہیں، ایک یہ کہ نذر لجاج میں کفارہ ہی دینا لازم ہے دوسری روایت یہ کہ بعینہ ایفاء نذر لازم ہے (کفارہ سے نذر نہیں ساقط ہوگی۔)

مسئلہ: امام ابو حنیفہ کے نزدیک نذر سے کسی منذورات کا وجوب اس وقت ہوگا جب منذور اس جنس کی چیز ہو جو اللہ نے واجب کی ہے (مثلاً حج کی نذر نماز پڑھنے کی نذر راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی نذر کی، بعینہ یا بکفارہ ادائیگی واجب ہوگی کیونکہ اللہ نے حج نماز اور صدقات کو واجب کیا ہے لیکن مریض کی عیادت جنازہ کے ساتھ چلنا اور اسی طرح کی دوسری باتیں ایسی ہیں جن کی ہم جنس کوئی چیز اللہ نے واجب نہیں کی لہٰذا نذر سے ان باتوں کا وجوب نہیں ہوتا۔) منہاج میں امام شافعی کا مسلک اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی طاعت کا نذر سے وجوب ہو جاتا ہے خواہ وہ طاعت ان طاعتوں کی ہم جنس نہ ہو جو اللہ نے واجب کی ہیں جیسے مریض کی عیادت، تشییع جنازہ اور سلام (ابتدائی)

امام ابو حنیفہ کے قول پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ نذر اعتکاف کی صورت میں باتفاق علماء اعتکاف کرنا واجب ہو جاتا ہے حالانکہ جو واجبات الٰہیہ ہیں ان میں سے کسی کا اعتکاف نہیں ہے اگر کہا جائے کہ روزہ اعتکاف کی ضروری شرط ہے (اور روزۂ رمضان اللہ کی طرف سے واجب کر دیا گیا ہے اور رمضان کا روزہ اعتکاف کے روزے کا ہم جنس ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ

اعتکاف کرنے کے لئے روزہ کی شرط ناقابل تسلیم ہے (روزہ کے بغیر اعتکاف ہو سکتا ہے اور اگر اعتکاف کے لئے روزے کی شرط مان بھی لی جائے تب بھی اتنا لازم آئے گا کہ اعتکاف کی شرط کا ہم جنس فرائض الہٰیہ میں موجود ہے اعتکاف کا ہم جنس تو موجود نہیں ہے اس پر بھی اگر ایفاء نذر کو واجب قرار دیا جائے گا تو پھر عبادت مقصود ہو یا نہ ہو بہر حال نذر کی وجہ سے اس کا واجب ہونا ضروری ہو جائے گا کیونکہ ہر قربت (عبادت) اسلام واخلاص کے ساتھ مشروط ہے (کوئی عبادت بغیر اسلام کے نہیں ہوتی۔ خواہ مقصود ہو۔ جیسے اسلام یا غیر مقصودہ جیسے نماز کے لئے وضو) اور اسلام واخلاص اللہ کی طرف سے واجب کردہ فرائض ہیں اور اگر اعتکاف بالنذر کے وجوب کو صوم بالنذر کے وجوب کے تابع قرار دیا جائے گا اور یوں کہا جائے گا کہ نذر سے اعتکاف کا وجوب اس وقت ہوگا جب اس کے ساتھ نفلی روزہ بھی ہو) تو رمضان میں اعتکاف کرنے کی نذر کی ایفاء واجب ہی نہ ہوگا (کیونکہ رمضان میں روزے رکھنے کی اگر نذر مانی تو صوم نذر کا وجوب نہیں ہوتا۔ رمضان کے روزے تو اللہ کی طرف سے واجب کردہ ہی ہیں واجب خداوندی پر واجب بالنذر وارد نہیں ہوتا)

مسئلہ: اگر نذر طاعت کو پورا نہ کر سکا ہو (مثلاً کسی مریض کے تندرست ہو جانے پر ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ تاریخ کے روزے رکھنے کی نذر مانی ہو اور روزے نہ رکھ سکا ہو) تو باتفاق جمہور قضاء نذر واجب ہے (دوسرے ایام میں روزے رکھ لے) لیکن اسی کے ساتھ کیا قسم کا کفارہ بھی واجب ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے سفیان ثوری وجوب کفارہ اور قضاء نذر دونوں کے قائل ہیں امام ابو حنیفہ نے فرمایا، اگر قسم کی نیت نہ کی اور نذر کا صیغہ زبان سے ادا کیا خواہ نذر کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو، بہر حال قضا نذر واجب ہے کفارۂ قسم واجب نہیں ہے اور اگر صرف قسم کی نیت کی اور نذر کی نفی کی تو کفارہ واجب ہے، قضاء نذر واجب نہیں اور اگر قسم کی نیت کی اور نذر کی نہ نیت کی نہ نفی نذر کی۔ نذر کے متعلق کوئی خیال ہی دل میں نہیں آیا یا نذر کی بھی نیت کی تو قضاء نذر اور کفارۂ قسم دونوں واجب ہیں۔

امام ابو یوسف نے فرمایا اگر قسم کی نیت کی اور نذر کی نیت نہیں کی تو اس صورت میں صرف کفارۂ قسم واجب ہے قضا واجب نہیں کیونکہ صیغۂ نذر کا مجازی معنی اس نے مراد لیا ہے اور قسم کی نیت کی ہے اور اگر نذر کی نیت کی قسم کی نیت نہیں کی، تو قضا واجب ہے کفارہ واجب نہیں حقیقی معنی متعین ہے اور اگر دونوں کی نیت کی تب بھی قضا ہی لازم ہوگی کفارہ نہ ہوگا کیونکہ حقیقت کو مجاز پر ترجیح ہے اور حقیقت و مجاز دونوں کا بیک وقت اجتماع ہو نہیں سکتا۔

سفیان ثوری نے اپنے قول کے ثبوت کے لئے فرمایا کہ نذر کا صیغہ محتاج نیت نہیں اگر نذر کے صیغہ کو بول کر نذر کی نیت نہ بھی کی ہو تب بھی نذر کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ نذر انشاء ہے اور انشاء کا صیغہ استعمال کرنے کے بعد حقیقی معنی کی نفی نہیں ہو سکتی نذر کی حالت ایسی ہی ہے جیسے نکاح طلاق رجعت اور غلام کی آزادی۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے تین چیزیں جن کی سنجیدگی بھی واقعیت ہے اور مزاحیہ کہہ دینا بھی واقعیت (پر محمول کیا جاتا) ہے نکاح، طلاق، رجعت (مزاحیہ ایجاب وقبول، مزاحیہ طلاق اور مزاحیہ رجعت واقع ہو جاتی ہے اس میں مزاح کا عذر قابل قبول نہیں) اخرجہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ من حدیث ابی ہریرہ۔ مصنف میں عبدالرزاق نے حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے مذاق میں طلاق دی اس کی طلاق نافذ ہے اور جس نے مذاق میں باندی غلام کو آزاد کر دیا اس کی آزادی نافذ ہے۔ ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہیں جن کا کھیل نہیں ہے (یعنی بطور دل لگی بھی ایسا کیا جائے تو حقیقت کا وقوع ہو جاتا ہے) جس نے کھیل کے طور پر اگر ان میں سے کوئی بات کہہ دی تو پڑ جائے گی۔ طلاق غلام کی آزادی اور نکاح۔

عبدالرزاق نے موقوفاً حضرت عمر و حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ تین چیزیں ہیں جن میں کوئی کھیل نہیں۔ نکاح اور طلاق اور باندی غلام کی آزادی۔ ایک روایت میں چار چیزوں کا لفظ آیا ہے اور چوتھا لفظ نذر کا ہے۔

اور نذر کا مقتضی قسم ہے (یعنی نذر اپنی معنویت کے لحاظ سے قسم ہی ہے) کیونکہ جو چیز (شرعاً) واجب نہیں اس کو اپنے

اوپر واجب بنالینے کا معنی ہی یہ ہے کہ جو چیز (شرعاً) حرام نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور غیر حرام کو حرام بنالینا قسم ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ...... قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَکُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِکُمْ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ نذر کا قسم ہونا بھی نیت کا محتاج نہیں ہے (خود نذر کے اندر قسم کا معنی موجود ہے) اور نیت نہ ہو تب بھی قسم کی نفی نہیں ہوتی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے اپنے والدین یا اولاد کو خرید لیا پس خریدتے ہی وہ آزاد ہو جائیں گے۔ خواہ آزاد کرنے کی نیت نہ کی ہو یا آزاد نہ کرنے کی نیت کی ہو (دونوں صورتوں میں کچھ فرق نہیں پڑتا)

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ غیر حرام کو حرام بنالینا ہر جگہ قسم نہیں ہے دیکھو طلاق کے بعد بیوی، آزاد کرنے کے بعد باندی اور فروخت کر دینے کے بعد فروخت کردہ چیز حرام ہو جاتی ہے (جو پہلے حرام نہ تھی ان افعال سے اس کو حرام بنالیا جاتا ہے) حالانکہ یہ تحریم قسم نہیں ہے ہاں اگر تحریم میں قصداً قسم کی نیت کی ہو تو غیر حرام کو حرام بنانا قسم ہو جاتا ہے جیسے ماریہ اور شہد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے حرام بنالیا تھا اور اس سے قسم کی نیت کی تھی۔ (جس کا ذکر قرآن کی مذکورہ آیت میں ہے) اس آیت میں تحریم ارادی ہے، تحریم التزامی نہیں۔ پس جب تک قسم کی نیت نہ ہوگی نذر ہوگی۔ نذر کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو کیونکہ یہی حقیقی معنی ہے (اور حقیقی معنی پر دلالت نیت کی محتاج نہیں ہوتی) اور جب قسم کی نیت کی ہو اور نذر کی نفی کی ہو تو یہ قسم ہوگی (نذر کا مجازی معنی قسم ہے اور مجازی معنی نیت کا محتاج ہے) اور جب نذر کی نفی نہ ہو خواہ اسکی نیت کی ہو یا نہ کی ہو اور قسم کی نیت کی ہو تو لفظ کے لحاظ سے یہ نذر ہوگی اور مقتضی (مفہوم التزامی) کے اعتبار سے قسم ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فصل: نذر معصیت دو طرح کی ہوتی ہے (۱) ایسی نظر جس کا کوئی فرد معصیت سے خالی نہیں ہو سکتا جیسے شراب پینے اور زنا کرنے کی نذر، امام ابو حنیفہ نے ایسی نذر کے متعلق فرمایا اگر اس نذر سے قسم کی نیت ہو تو نذر منعقد ہو جائے گی اور قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا ہوگا، اگر قسم کی نیت نہ ہوگی تو نذر منعقد نہ ہوگی لغو کلام قرار دیا جائے گا اور آیت مذکورہ میں یہ مراد بھی نہیں ہے اور باتفاق علماء اس کو پورا کرنے کا حکم بھی اس آیت میں نہیں دیا گیا ہے۔ اللہ فحشاء اور کھلے گناہ کا حکم نہیں دیتا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام احمد نے فرمایا یہ نذر منعقد ہو جائے گی اور (اس صورت میں بھی) کفارہ ادا کرنا ہوگا خواہ قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ ابن ہمام نے کہا اکثر مشائخ حنفیہ نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ اگر نذر کی معصیت کی طرف نسبت کی اور یوں کہا کہ (اگر میرا یہ کام ہو جائے گا (تو) میں اللہ کے لئے نذر مانتا ہوں کہ زید کو قتل کر دوں گا۔ تو یہ قسم ہو جائے گی اور اس کو توڑ کر کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ میں کہتا ہوں طحاوی کے اس قول کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ کے حقیقی معنی مراد لینا جب ناممکن ہے تو لامحالہ مجازی معنی ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ معصیت میں نذر نہیں اور نذر معصیت کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے، امام صاحب کے نزدیک اس حدیث میں قسم کے جس کفارہ کا ذکر ہے اس سے مراد قسم کا وہ کفارہ ہے جو نیت قسم کے بعد عائد ہوتا ہے (یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نذر معصیت تو جائز نہیں۔ نذر معصیت میں اگر قسم کی نیت کر لی ہو تو کفارۂ قسم لازم ہے)

(۲) نذر معصیت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جس چیز کی نذر مانی ہے وہ ہے تو گناہ لیکن اسی نذر کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جو معصیت سے پاک اور خالص طاعت ہیں۔ مثلاً کسی نے عید الفطر کے دن کے روزہ کی نذر مانی یا طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنے کی منت مانی امام ابو حنیفہ کے نزدیک نذر کا انعقاد ہو جائے گا اور عید کے دن روزہ نہ رکھنا اور پھر کسی دن اس کے عوض روزہ رکھنا واجب ہے، کفارہ کا وجوب نہیں ہے اور۔ (اگر عید کے دن) اس نے روزہ رکھ لیا تو نذر پوری ہو جائے گی (عید کے دن روزہ رکھنے کا گناہ بجائے خود اس پر ہوگا نذر کا اس سے کوئی تعلق نہیں نذر کا ایفاء ہو جائے گا) اور نذر کی نفی کر دی اور قسم کی نیت کی تو کفارۂ قسم لازم ہے اور اگر نذر کی نفی نہیں کی (اور نیت بھی نہیں کی صرف قسم کی نیت کی) تو قضاء نذر بھی ضروری ہے اور کفارۂ قسم بھی۔ جیسا نذر طاعت میں ہوتا ہے۔

امام احمد نے فرمایا عید کے دن روزہ توڑ دینا اور دوسرے کسی دن اس کی قضاء کرنا اور قسم کا کفارہ دینا لازم ہے اگر روزہ رکھ لے گا تو کافی نہ ہوگا۔ دوسری روایت میں امام احمد کا قول آیا ہے کہ اگر عید کے دن روزہ رکھ لے گا تو نذر پوری ہو جائے گی، امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ نذر معصیت نمبر دو کا انعقاد ہی نہیں ہوتا جس طرح نذر معصیت نمبر ایک کا انعقاد نہیں ہوتا، دونوں میں کوئی فرق نہیں وہ بھی معصیت یہ بھی معصیت بندے کے خود ساختہ ایجاب سے معصیت واجب نہیں ہو جاتی۔

امام ابو حنیفہ کے قول کی توجیہ اس طرح کی گئی ہے کہ معصیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ذاتی وفی نفسہ جیسے شراب کا پینا جو ہر وقت حرام ہے اس کی معصیت ذاتی ہے) اور اضافی[۲] (معصیت لغیرہ جو فی نفسہ معصیت نہیں بلکہ کسی دوسری وجہ سے حلال چیز حرام اور طاعت معصیت بن گئی ہے) جیسے روزہ جو بجائے خود ممنوع نہیں طاعت ہے لیکن عید کے دن کی وجہ سے اس میں معصیت پیدا ہوگئی (اصل کے لحاظ سے) نذر تو منعقد ہو جائے گی لیکن روزہ نہ رکھنا واجب ہے تاکہ اضافی معصیت سے اجتناب ہو جائے اور پھر اس کی قضاء کرلی جائے تاکہ واجب ساقط ہو جائے۔ اب کسی نے عید کے دن ہی روزہ رکھ لیا تو جس بات کا ذمہ لیا تھا وہ تو پوری ہوگئی۔ آئمہ کا یہ اختلاف اصولی اختلاف پر مبنی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر افعال شرعیہ (مشروعہ) سے منع کردیا گیا ہو تو ان افعال میں قبح اضافی ہوتا ہے بجائے خود ان کے اندر مشروعیت ہوتی ہے اور امام شافعی کے نزدیک افعال شرعیہ سے ممانعت کردی گئی ہو تو اس سے ان افعال میں قبح ذاتی اور فی نفسہ غیر مشروعیت ہو جاتی ہے۔

امام احمد نے فرمایا نذر صوم کا انعقاد اس وجہ سے ہوتا ہے کہ صوم طاعت ہے۔ معصیت کے لحاظ سے انعقاد نہیں ہوتا اس لئے کامل صوم ہو تو اداءِ نذر ہوگی، عید کے دن روزہ رکھ لیا تو اداءِ نذر نہ ہوگی۔ (کیونکہ یہ صوم کامل نہیں) اور شریعت میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ بعض افعال واجب ہوتے ہیں اور اصل وقت میں ان کو ادا کرنا حرام ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں بطور قضاء ان کو ادا کرنا لازم ہوتا ہے جیسے حائضہ پر رمضان کے روزے واجب ہوتے ہیں اور رمضان میں اگر وہ رکھ لے گی تو ادا نہ ہوں گے بلکہ دوسرے ایام میں ان کی قضا لازم ہوگی۔

(۳) اگر امر مباح کو ترک کرنے کی نذر مانی تو ایسی نذر لغو ہے انعقاد نذر نہ ہوگا ہاں اگر قسم کی نیت کرلے گا تو قسم شکنی پر کفارۂ قسم دینا ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا نذر تو بہر حال نہ ہوگی ہاں قسم کا حکم ضرور عائد ہو جائے گا قسم کی نیت ہو یا نہ ہو اور قسم شکنی کی صورت میں کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا امام شافعی کا قول راجح یہی ہے کذا فی المنہاج۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کردی ہے کہ جب حقیقی معنی مراد نہیں ہو سکتے تو مجازی معنی کی طرف رجوع کیا جائے گا یعنی قسم مراد ہو کیونکہ جو چیز واجب نہیں اس کو واجب قرار دینا تحریم مباح ہے (اور تحریم مباح قسم ہے) میں کہتا ہوں یہ دلیل وہی پیش کرسکتا ہے جو تحریم مباح کو قسم کہتا ہے۔

توضیح اقوال مذکورہ کے لئے چند احادیث کا بیان

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی ہو وہ طاعت بجالائے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی ہو وہ نافرمانی نہ کرے (بخاری) حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نذر صرف وہ ہے جس میں اللہ کی رضامندی مطلوب ہو۔ اس حدیث کا ورود اس شخص کے سلسلہ میں ہوا جس نے دھوپ میں کھڑے رہنے کی نذر مانی تھی۔ رواہ احمد۔ بیہقی نے ایک اور قصہ کے سلسلہ میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ ابوداؤد نے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے ان احادیث کا عموم بتا رہا ہے کہ نذر طاعت بہر حال منعقد ہو جاتی ہے خواہ وہ طاعت ایسی ہو کہ اس جیسی طاعت اللہ نے واجب کی ہو، (جیسے نماز روزہ وغیرہ) یا اس جیسی طاعت اللہ نے واجب نہ کی ہو (جیسے عیادت مریض) حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر معصیت کو پورا کرنا (جائز) نہیں نہ اس نذر کو پورا کرنا ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو (مثلاً زید نے نذر مانی کہ عمر کے غلام کو میں آزاد کردوں گا) رواہ مسلم۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس چیز کا آدمی مالک نہ ہو اس کی نذر نہیں۔ اسی حدیث کی وجہ سے

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے کہا اگر میں یہ کام کروں تو ایک ہزار درہم میرے مال میں سے خیرات ہیں اور اس کا مال سو درہم سے زائد نہیں تو امام ابو حنیفہ کا صحیح قول یہ ہے کہ جتنے مال کا وہ اس وقت مالک ہوگا اتنے ہی حصہ میں نذر جاری ہوگی اور جس مال کا مالک نہیں اس کی نذر نہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں اس کی نذر کی نسبت نہ ملک کی طرف ہوگی نہ سبب ملک کی طرف۔ اور اگر اس نے کسی شخص کی خاص بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس بکری کو قربانی کے لئے میں بیت اللہ کو بھیجوں گا تو اس پر نذر لازم نہ ہوگی۔

حضرت عقبہ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ مسلم طبرانی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے نذر قسم ہے اور نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ اس حدیث کے الفاظ میں بھی عموم ہے (جو ہر نذر کو شامل ہے)

مسئلہ: جس نے نذر مانی اور پوری نہ کر سکا خواہ اس وجہ سے کہ وہ شرعی گناہ کی نذر تھی اس لئے پوری نہ کر سکا یا طبعاً ناقابل ایفاء تھی کہ پوری کر ہی نہیں سکتا تھا جیسے ہمیشہ ہر روز روزہ رکھنے کی نذر یا برداشت تو کر سکتا تھا لیکن اس کا وقت جاتا رہا اور اس کا تدارک ممکن نہ رہا اس وجہ سے کہ وہ مباح الترک تھی یا اس وجہ سے کہ نذر تو مان لی تھی لیکن کیا نذر مانی تھی اس کی تعیین نہیں کی تھی مثلاً یوں کہا تھا کہ اگر اللہ نے یہ کام میرا کر دیا تو اس کے نام کی نذر دلاؤں گا ان سب صورتوں میں قسم کا کفارہ ادا کرنا واجب ہے خواہ قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نذر مانی اور جس چیز کی نذر مانی اس کی تعیین نہیں کی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے نذر مانی اور اس میں معصیت ہے تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے اور جس نے ناقابل طاقت نذر مانی تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے اور جس نے نذر طاعت (قابل برداشت) مانی تو وہ اپنی نذر پوری کرے۔ رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ۔ بعض اہل حدیث نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس کا قول قرار دیا ہے۔ یہ حدیث گزشتہ حدیث کا بیان ہے۔

مسئلہ: جس نے نذر طاعت مانی اور ادا کرنے کی طاقت بھی ہے تو ایسی صورت میں ادائے نذر نہ کرنا اور کفارہ ادا کرنے کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں اگر کفارہ دے گا تو ادائے نذر کے لئے کافی نہ ہوگا کیونکہ حضرت عمران بن حصین کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معصیت کی کوئی نذر (جائز) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ النسائی والحاکم والبیہقی

امام احمد کا جو مسلک ہے کہ نذر معصیت منعقد ہو جاتی ہے اور اس کا کفارہ قسم کے کفارہ کی طرح ادا کرنا واجب ہے۔ حدیث مذکور کے اطلاق سے ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہے لیکن اس حدیث کی سند میں ایک راوی محمد بن الزبیر حنظلی ہے جو قوی نہیں ہے ابن زبیر کی روایت میں اہل روایت نے اختلاف کیا ہے عبد الرزاق نے محمد کے باپ زبیر کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے حافظ نے لکھا ہے کہ دوسرے طریقے سے بھی یہ حدیث آئی ہے جس کی سند صحیح ہے مگر معلول ہے۔

امام احمد، بیہقی اور اصحاب السنن نے زہری کی روایت سے بحوالہ ابو سلمہ از ابوہریرہ یہ حدیث بیان کی ہے لیکن یہ روایت منقطع ہے زہری کی ابو سلمہ سے سماعت ثابت نہیں (بیچ کا راوی منقطع ہے)

ابوداؤد، ترمذی۔ نسائی اور ابن ماجہ نے سلیمان بن بلال کی روایت سے بحوالہ موسیٰ بن عقبہ و محمد بن عتیق از زہری از سلیمان بن ارقم از یحییٰ بن کثیر از ابو سلمہ از عائشہؓ یہ حدیث نقل کی ہے۔ نسائی نے لکھا سلیمان بن ارقم متروک الحدیث ہے یحییٰ بن کثیر کے متعدد شاگردوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور یحییٰ بن کثیر کے حوالہ سے بروایت محمد بن الزبیر حنظلی عن ابیہ عن عمران یہ حدیث نقل کی ہے گویا وہی سند لوٹ آئی جو پہلے گزر چکی۔

حافظ نے لکھا ہے یہ حدیث معمر نے بروایت یحییٰ بن کثیر بیان کی ہے اور یحییٰ نے ابو سلمہ اور بنی حنیفہ میں سے ایک اور آدمی کے حوالہ سے مرسلاً رسول اللہ ﷺ کا فرمان قرار دیا ہے۔ بنی حنیفہ کے اس آدمی کا نام حاکم نے محمد بن الزبیر کہا ہے اور یہ

بھی کہا ہے کہ بنی حنیفہ میں سے اس کو قرار دینا پڑھنے کی غلطی ہے یہ تو بنی حنظلہ میں سے تھا۔
ایک اور سند سے حضرت عائشہؓ کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا گیا ہے جس کو دار قطنی، ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی نے بروایت غالب بن عبداللہ الجوزی عن عطاء عن عائشہؓ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے اوپر نذر معصیت واجب کر لی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ غالب بن عبداللہ متروک الحدیث ہے۔
ابوداؤد نے ایک اور طریق سے بروایت کریب از ابن عباس بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے اس کی سند اچھی ہے لیکن اس کی سند میں بھی یحییٰ آتا ہے جو مختلف فیہ ہے۔
نووی نے لکھا ہے حدیث لانذر فی معصیة و کفارته کفارة یمین۔ ضعیف ہے محدثین کا اس پر اتفاق ہے حافظ نے لکھا ہے باتفاق محدثین کہنا غلط ہے طحاوی اور ابو علی ابن السکن نے تو اس کو صحیح قرار دیا ہے میں کہتا ہوں سیوطی نے جامع صغیر میں اس حدیث پر صحیح ہونے کی نشانی لکھ دی ہے۔
امام ابو حنیفہ جو نذر معصیت میں (جب کہ وہ معصیت ایسی ہو جس کی حرمت ذاتی ہو اضافی نہ ہو) کفارے کو واجب نہیں قرار دیتے (اور کلام کو لغو قرار دیتے ہیں) حضرت عمران بن حصین کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذریں دو ہوتی ہیں (ایک) نذر طاعت یہ اللہ کے لئے ہوتی ہے اور اس کو پورا کرنا واجب ہے (دوسری) نذر معصیت یہ شیطان کے لئے ہوتی ہے اس کا پورا کرنا جائز نہیں۔ صورت استدلال یہ ہے کہ کفارہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب نذر کو پورا کرنا واجب ہو (اور نذر کو پورا نہ کیا ہو) کفارہ سے نذر (پوری نہ کرنے) کا گناہ ساقط ہو جاتا ہے اور جہاں نذر کو پورا کرنا ہی واجب نہیں تو کفارہ کا وجوب کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ استدلال نص کے مقابلہ میں قیاسی استدلال ہے (جو مقبول نہیں پھر) ہر جگہ اس کا اجراء بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ دیکھو نذر معصیت کو پورا کرنا واجب نہیں توڑ دینا اور اس کے خلاف کرنا واجب ہے اور کفارہ لازم ہے تاکہ اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ ہو اور عظمت قائم رہے۔
حضرت ثابت بن ضحاک راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک شخص نے مقام بوانہ میں اونٹ کی قربانی کی نذر مانی اور خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اطلاع دی حضور ﷺ نے فرمایا کیا جاہلیت کے زمانہ میں وہاں کوئی بت تھا جس کی تو پوجا کرتا تھا صحابہ نے جواب دیا نہیں (وہاں کوئی بت نہیں تھا) فرمایا تو کیا جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ وہاں لگتا تھا صحابہ نے عرض کیا، نہیں۔ فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ بلاشبہ نذر معصیت کی وفا (جائز) نہیں اور نہ اس چیز کی نذر (صحیح) ہے جو نذر کرنے والے کی ملکیت میں نہ ہو۔ رواہ ابوداؤد بسند صحیح۔
عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے حوالے سے دادا کی روایت بیان کی کہ ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے نذر مانی تھی کہ (اظہار مسرت کے لئے) آپ کے سر پر دف بجاؤں گی۔ فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ رواہ ابوداؤد۔ ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے منت مانی تھی کہ فلاں فلاں مقامات پر قربانی کروں گی۔ عورت نے ان مقامات کے نام لئے جہاں اہل جاہلیت ذبح کیا کرتے تھے، فرمایا جاہلیت کے بتوں میں سے کیا وہاں کوئی بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی عورت نے جواب دیا۔ نہیں فرمایا کیا وہاں اہل جاہلیت کا کوئی میلہ لگتا تھا (تہوار منایا جاتا تھا) عورت نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ میں کہتا ہوں نذر کو پورا کرنے کا حکم اس جگہ وجوبی نہیں ہے، اسی پر علماء کا اجماع ہے ایسا اس لئے کہا گیا کہ احادیث میں تعارض نہ رہے اور رسول اللہ ﷺ نے تو فرما ہی دیا تھا کہ نذر وہ ہے۔ جس میں اللہ کی خالص رضا مطلوب ہو اور اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جو نذر طاعت نہیں وہ نہ واجب ہو سکتی ہے نہ خالص خدا کے لئے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اس جگہ امر اباحت کے لئے ہے جب نذر معصیت میں معصیت کو ترک کرنا اور کفارہ ادا کرنا ضروری ہے تو یہاں بدرجۂ اولیٰ ترک معصیت لازم ہے۔

مسئلہ: جس شخص نے نذر طاعت تو کی لیکن اس کو کچھ قیود و اوصاف سے مقید کر دیا تو کیا ایسی قیود قابل لحاظ ہوں گی۔

امام صاحب کا اس کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ اگر قیود و صفات ایسی ہوں جو اللہ کو پسند ہوں اور کثرت ثواب و ترقی درجات کی موجب ہوں تو نذر کو مع قیود اوصاف کے پورا کرنا واجب ہے قیود کو نظر انداز کر کے نفس نذر کا حکم باقی رکھنا ممکن نہیں اور اگر قیود و اوصاف غیر شرعی اور عند اللہ ناپسندیدہ ہوں تو شرائط کی پابندی ضروری نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر قیود و شرائط موجود نہ ہوں تو کیا کفارہ واجب ہوگا اس مسئلہ میں وہی اختلاف ہے جو ہر منذور مباح کے ترک کرنے کی صورت میں ہے مثلاً کسی نے بازار میں نماز پڑھنے کی یا ہفتہ کے دن نماز پڑھنے کی نذر مانی یا یہ نذر مانی کہ میں روزہ رکھوں گا اور کھڑا نہ ہوں گا یا روزہ میں بات نہیں کروں گا یا سایہ میں نہیں جاؤں گا یا یہ نذر مانی کہ یہ ایک روپیہ اس غریب کو دوں گا یا اس شہر میں کسی غریب کو دوں گا ان سب صورتوں میں اس پر روزہ رکھنا اور نماز پڑھنا اور کسی فقیر کو ایک روپیہ کسی جگہ دینا واجب ہوگا شرائط ساقط الاعتبار ہیں ہر جگہ ہر وقت نماز پڑھ سکتا ہے روزہ رکھنا ضروری ہے۔ خاموش رہنا یا بیٹھا رہنا یا سایہ سے دور رہنا ضروری نہیں اور ایک روپیہ دینا خواہ کسی غریب آدمی کو ہو کسی شہر میں ہو لازم ہے۔ حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص کھڑا ہوا ہے اس کے متعلق دریافت کیا صحابہ نے عرض کیا یہ ابو اسرائیل ہے اس نے کھڑے رہنے کی نذر مانی ہے نہ بیٹھتا ہے نہ سایہ میں جاتا ہے نہ بات کرتا ہے اور روزہ رکھے ہوئے ہے۔ فرمایا اس کو حکم دو کہ بات کرے سایہ میں جائے بیٹھ جائے اور اپنا روزہ پورا کرے۔ رواہ البخاری۔ اس حدیث میں کفارہ دینے کا حکم نہیں ہے اگر کسی نے پے در پے تین روزے رکھنے کی نذر مانی یا کھڑا ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو نذر کو پورا کرنا اس پر واجب ہے اگر متفرق طور پر روزے رکھے گا یا بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو نذر پوری نہیں ہوگی اور (نذر کے مطابق) دوبارہ روزے رکھنا اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنا لازم ہوگا کیونکہ بیٹھ کر نماز کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے آدھی ہے رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی فرمایا ہے رواہ احمد والنسائی وابن ماجۃ بسند صحیح عن انس۔ ورواہ ابن ماجۃ عن عبد اللہ بن عمرو۔ والطبرانی عن ابن عمرو عن عبد اللہ بن السائب، وعن المطلب بن ابی ودیعۃ ورواہ احمد وابوداؤد عن عمران بن حصین، ورواہ مسلم وابوداؤد والنسائی عن ابن عمرو نحوہ۔ پے در پے روزے رکھنا اللہ کو پسند ہے اسی لئے مختلف کفاروں میں پے در پے روزوں کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ: اگر نماز پڑھنے کی نذر مانی اور کھڑے بیٹھے کی کوئی نیت نہیں کی تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا ہی اصل ہے اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر دونوں طرح نماز پڑھنے سے نذر پوری ہو جائے گی۔

مسئلہ: اگر کروٹ سے یا چت لیٹ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ جب تک اضطراری حالت نہ ہو لیٹ کر نماز پڑھنا شرعاً معروف نہیں ہاں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ لیٹ کر نماز وہ مریض پڑھ سکتا ہے جو بیٹھ بھی نہ سکے۔ ایسا بیمار اگر لیٹ کر نماز پڑھنے کی نذر مانے گا اور لیٹ کر پڑھ لے گا تو نذر پوری ہو جائے گی لیکن اگر نذر پوری کرنے سے پہلے (بیٹھنے کے قابل) صحت ہو گئی تو لیٹ کر پڑھنے سے نذر پوری نہ ہو گی۔ (بیٹھ کر نماز پڑھے گا اور کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا تو) صرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے نذر پوری ہو گی۔

مسئلہ: اگر کعبہ میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک جس جگہ چاہے پڑھ لے نذر پوری ہو جائے گی۔ امام زفر اور امام ابو یوسف کا قول ہے کہ اگر بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی اور پڑھ لی مسجد نبوی یا کعبہ میں تو نذر پوری ہو جائے گی اور جس نے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نذر مانی اور کعبہ میں پڑھ لی تب بھی نذر پوری ہو جائے گی اور مسجد نبوی اور کعبہ کے علاوہ کسی اور مسجد میں ادا کی تو نذر پوری نہ ہو گی اور جس نے کعبہ کے اندر نماز نماز پڑھنے کی نذر مانی تو کعبہ کے اندر پڑھے کعبہ کے علاوہ کسی اور مسجد میں پڑھنے سے نذر پوری نہ ہو گی۔

امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی۔ یا رسول اللہ ﷺ میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ فتح مکہ عنایت

کردے تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز (شکرانہ) پڑھوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہیں پڑھ لو۔ اس شخص نے دوبارہ وہی پہلی گزارش کی فرمایا یہیں پڑھ لو اس نے تیسری بار پھر گزارش کی تو حضور ﷺ نے فرمایا تم کو اپنا اختیار ہے رواہ ابوداؤد والطحاوی والدارمی۔

امام ابو یوسف اور امام زفر نے فرمایا ہم اسی حدیث کی رو سے تو کہتے ہیں کہ مسجد بیت المقدسؒ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ کعبہ میں نماز نذر پڑھ لے رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن کعبہ میں ہی موجود تھے لیکن جس نے کعبہ میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو بیت المقدس یا کسی اور مسجد میں نماز پڑھنا (نذر کے لئے) کیسے کافی ہو سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تو ارشاد فرمایا تھا کہ آدمی کی اپنے گھر میں نماز (بس) ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے اور محلہ کی مسجد میں ایک نماز پچیس (گھر والی) نمازوں کے برابر ہے اور جامع مسجد میں ایک نماز پڑھنی (گھر کی) پانسو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز (گھر کی) ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور کعبہ کے اندر ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے رواہ ابن ماجۃ من حدیث انسؓ۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی راویت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مسجد میں ایک نماز کعبہ کے علاوہ دوسری جگہ کی ہزار نمازوں سے افضل ہے طحاوی نے حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عائشہؓ حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت میمونہ اور حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے وہی حدیث بیان کی ہے جو صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے آئی ہے۔ طحاوی نے حضرت عطاء بن الزبیر کی روایت کردہ یہ حدیث بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز کعبہ کے علاوہ دوسری مساجد میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے اور کعبہ میں ایک نماز اس مسجد کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ کی موقوف روایت اور حضرت جابر بن عبد اللہ کی مرفوع روایت سے بھی یہ حدیث اسی طرح آئی ہے۔

امام ابو حنیفہ نے ان احادیث کے جواب میں فرمایا کہ احادیث مذکورہ میں نمازوں سے صرف فرض نمازیں مراد ہیں۔ مساجد میں فرض نمازوں کا ثواب اسی ترتیب کے ساتھ ہے جو ترتیب احادیث میں بیان کی گئی ہے نوافل مراد نہیں کیونکہ نوافل تو گھروں میں افضل ہیں۔ صحیحین میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے فرض نماز کے دوسری نمازیں اپنے گھر کے ندر افضل ہیں۔

ابوداؤد و ترمذی نے حضرت زید بن ثابت کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی کی اپنے گھر کے اندر نماز میری اس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے سوائے فرائض کے۔ طحاوی نے حضرت عبد اللہ بن سعد کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ اپنے گھر کے اندر نماز پڑھنی مسجد میں نماز پڑھنے سے مجھے زیادہ پسند ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے بیمار کے تندرست ہو جانے یا مسافر کے واپس آجانے کی شرط کے ساتھ اپنی نذر صوم کو مشروط کیا اور یوں کہا جب میرا مسافر واپس آجائے گا یا بیمار تندرست ہو جائے گا تو میں ایک ماہ کے روزے محض اللہ کے لئے رکھوں گا تو شرط پوری ہونے کے بعد ایفاء نذر اس پر واجب ہے وجود شرط سے پہلے اگر روزے رکھ لے گا تو ادائے نذر کے لئے) کافی نہ ہوگا دوبارہ روزہ رکھنے ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک شرط انعقاد سبب ہی سے مانع ہے (شرط کی موجودگی میں سبب ہی نہیں پیدا ہوتا) اور وجود سبب کے بغیر ادا کا کوئی معنی نہیں۔ امام شافعی وجود شرط سے پہلے ادا کو کافی سمجھتے ہیں ان کی نظر میں شرط حکم سے مانع ہے وجود سبب سے مانع نہیں۔ اس لئے اگر وقوع شرط سے پہلے روزے رکھ لئے تو نذر پوری ہو جائے گی۔ جیسے نصاب زکوٰۃ ہو جانے کے بعد، سال تمام ہونے سے پہلے اگر زکوٰۃ ادا کر دی جاتی ہے تو ادا ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: اگر وجوب ادا کی نسبت کسی خاص وقت یا زمانہ کی طرف کی (مثلاً یوں کہا کہ اس مقدمہ میں اللہ مجھے کامیاب کردے گا تو میں اس کے نام پر سارے ماہ رجب کے روزے رکھوں گا۔ یا آئندہ سال حج کروں گا) تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک وقت آنے سے پہلے بھی نذر کو ادا کر سکتا ہے (رجب آنے سے پہلے بھی ایک ماہ کے روزے رکھ سکتا ہے) امام محمد

فرماتے ہیں وقت کی طرف نسبت ایسی ہی ہے جیسے کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا (اور جب تک شرط اور قید موجود نہ ہو ادا صحیح نہیں اسی طرح اگر وقت مقرر نہ آیا ہو تو ادا صحیح نہیں) شیخین فرماتے ہیں نذر کی وقت کی طرف نسبت شرط کی طرح نہیں ہے (وقت کی طرف نسبت کرنے سے نذر مشروط نہیں ہو جاتی بلکہ) یہ نذر محض (بلا شرط) ہے صرف وقت کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے اور قیود قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ جیسے کسی نے اگر بازار میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو کہیں نماز پڑھے نذر ادا ہو جائے گی اسی طرح وقت مقرر سے پہلے روزے رکھ لینا بھی جائز ہے اور نذر پوری ہو جائے گی اور اگر مقررہ وقت گزر گیا اور روزے نہ رکھے اور حج نہ کیا تو اس کے بعد روزے رکھے جا سکتے ہیں اور حج کیا جا سکتا ہے۔

امام زفر نے فرمایا ادائے نذر کی جس وقت کی جانب نسبت کی ہے اگر شرعاً اس وقت کو افضلیت حاصل ہے اور مقررہ وقت سے پہلے جس وقت میں نذر ادا کر رہا ہے وہ وقت فضیلت میں مقررہ وقت سے کم ہے اور قبل از وقت نذر ادا کر دی تو ادا نہ ہو گی بلکہ دوبارہ (مقررہ وقت آنے پر) ادا کرنی ہو گی اور اگر ایک وقت کو دوسرے وقت پر کوئی فضیلت نہ ہو تو وقت مقرر آنے سے پہلے بھی نذر ادا ہو جائے گی۔ میرے نزدیک یہی قول زیادہ مناسب ہے مثلاً کسی نے عرفہ کے دن یا عاشورہ کے دن یا پورے ماہ محرم کے روزے رکھنے کی نذر مانی تو مقررہ ایام کے آنے سے پہلے اگر روزے رکھ لئے تو نذر پوری نہ ہو گی (ان ایام کو فضیلت حاصل ہے) اسی طرح وسط رات میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو رات آنے سے پہلے دن میں یا رات کے بعد آنے والے دن میں نماز پڑھنے سے نذر ادا نہ ہو گی (وسط رات کا وقت فضیلت رکھتا ہے۔)

اگر شبہ کیا جائے کہ رات آنے سے پہلے ہی دن میں جو نماز پڑھ لیتا ہے وہ ایفائے نذر میں احتیاط سے کام لیتا ہے معلوم نہیں آنے والی رات تک زندہ رہے یا نہ رہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آنے والی رات تک زندہ رہنا عموماً ہو تا ہی ہے (کیونکہ نذر ماننے والا کسی مہلک مرض میں مبتلا نہیں، نہ مرنے کے قرآئن موجود ہیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عرفہ کے روزے سے میں اللہ سے ثواب کی امید اتنی رکھتا ہوں کہ وہ پچھلے سال (کے گناہوں) کا بھی کفارہ ہو جائے گا اور آنے والے ایک سال (کے گناہوں) کا بھی۔ اور عاشورہ کے روزے سے مجھے اللہ سے اتنی امید ثواب ہے کہ وہ پچھلے سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ رواہ مسلم وابن حبان والترمذی وابن ماجۃ من حدیث ابی قتادۃ وروی ابن ماجۃ من حدیث ابی سعید الخدری عن قتادۃ بن نعمان نحوہ۔ اس مبحث کی حدیث حضرت زید بن ارقم اور حضرت سہل بن سعد اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی آئی ہے رواہ الطبرانی۔ حضرت عائشہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے رواہ احمد۔ حافظ ابن حجر نے کہا حضرت انس وغیرہ سے اس موضوع کی روایت آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی دوسرے ایام ایسے نہیں کہ ان ایام (یعنی ایام تشریق) سے زیادہ ان میں نیک عمل کرنا اللہ کو محبوب ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ راہ خدا میں جہاد بھی (ان ایام کی نیکی سے زیادہ محبوب) نہیں۔ فرمایا راہ خدا میں جہاد بھی نہیں۔ ہاں (اگر کسی نے ایسا جہاد کیا ہو کہ) راہ خدا میں جان و مال لے کر نکلا اور پھر اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لایا ہو (تو ایسا جہاد اللہ کو ان ایام میں عمل صالح کرنے سے زیادہ محبوب ہو جائے گا) رواہ ابو داؤد من حدیث ابن عباسؓ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایام عشرہ (یعنی عشرۂ ذی الحجہ کی عبادت) سے زیادہ محبوب اللہ کے نزدیک اور کسی ایام کی عبادت نہیں ان دنوں میں ایک دن کا روزہ (دوسرے ایام کے) ایک سال کے (روزوں کے) برابر ہے اور (ان دنوں کی) ایک رات شب قدر کے برابر ہے۔ رواہ ابن ماجۃ من حدیث ابی ہریرۃ یہ حدیث ضعیف ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ماہ رمضان کے بعد سب سے افضل روزے خدا کے مہینے کے یعنی محرم کے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔ رواہ مسلم واصحاب السنن الاربعۃ عن ابی ہریرۃؓ والرویانی فی مسندہ والطبرانی عن جندب۔

مسئلہ: جس نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی اس کو اختیار ہے پیدل جائے یا سواری پر۔ مبسوط میں امام ابو حنیفہ کا یہی

مسلک بتایا گیا ہے یعنی پیدل چلنا اس پر واجب نہیں ہے بعض دوسرے علماء بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس قول کی بناء اسی گزشتہ نظریہ پر ہے کہ جس نے نذر طاعت کی ہو لیکن اس میں شرط لگادی ہو جو طاعت نہ ہو تو شرط کی پابندی اس کے لئے لازم نہیں ہے۔

قدوری اور اکثر متون میں (امام کا مسلک یہ) بیان کیا گیا ہے کہ پیدل جانا اس کے لئے لازم ہے سوار نہ ہو اور یہ حکم طواف زیارت تک قائم رہے گا۔

پیدل چلنا کس جگہ سے لازم ہے یہ مسئلہ اختلافی ہے بعض نے کہا میقات سے پیدل جانا لازم ہے کیونکہ میقات سے ہی حج شروع ہوتا ہے صحیح تر قول یہ ہے کہ گھر سے ہی اس کو پیدل (حج کو) جانا لازم ہے ہاں اگر گھر سے پیدل نہ چلنے کی نیت کی ہو تو جہاں سے پیدل چلنے کی نیت کی ہو اس کی پابندی کرے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے یہ یعنی جو قدوری نے ذکر کیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ پیدل چلنا نذر کی وجہ سے واجب ہو جاتا ہے۔ طحاوی نے کہا یہی قول امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا ہے۔

جو لوگ سوار ہو کر حج کو جانے کو پیدل حج کو جانے سے افضل جانتے ہیں ان کی دلیل تو صاف ہے کہ عبادت کی نذر مانی گئی ہے (یعنی مقصد نذر حج ہے) اور پیدل جانے میں ترک افضل ہے (کیونکہ اللہ نے استطاعت حج کے لئے شرط کی ہے اور استطاعت میں سواری بھی شامل ہے اس لئے سوار ہو کر جانا افضل ہے) امام صاحب کے نزدیک پیدل جانا بشرطیکہ پیدل چلنے کی طاقت اور برداشت ہو افضل ہے لیکن آپ کے نزدیک ادائے منذور کے لئے شرط یہ ہے کہ واجبات مقصودہ میں سے اللہ کی طرف سے کوئی واجب اس منذور کا ہم جنس ہو اور پیدل چلنا اللہ کی طرف سے کسی جگہ بھی واجب نہیں ہے لہٰذا پیدل حج کرنے کی نذر ماننے کی صورت میں بھی پیدل جانا ضروری نہیں۔

پیدل حج کی نذر کرنے کی صورت میں سوار ہو کر جانے کی افضلیت احادیث سے بھی ثابت ہے حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ ایک بوڑھا شخص اپنے دونوں طرف اپنے دونوں بیٹوں پر سہارا لگا کر چل رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے معاینہ فرمایا اور دریافت کیا اس کو کیا ہو گیا صحابہ نے عرض کیا حضور اس نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے، فرمایا یہ جو اپنے کو خود دکھ دے رہا ہے خدا کو اس (کی اذیت کوشی) کی ضرورت نہیں پھر اسی بوڑھے آدمی کو سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت میں حدیث مذکور کے یہ الفاظ ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا بوڑھے آدمی تیری (اس محنت) اور تیری نذر کی خدا کو ضرورت نہیں۔ رواہ مسلم۔

حضرت عقبہ بن عامر جہنی کا بیان ہے میری بہن نے پیدل کعبہ کو جانے کی منت مانی اور مجھے مسئلہ دریافت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا (میں نے حاضر خدمت ہو کر مسئلہ دریافت کیا) فرمایا اس کو چاہئے کہ پیدل (بھی) چلے اور سوار (بھی) ہو جائے۔ متفق علیہ۔

جو لوگ پیدل جانا ضروری قرار دیتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ جب پیدل جانے کی نذر مانی ہے تو پیدل جائے، رہی اس کی نظیر شرعی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک طواف زیارت پیادہ پا کرنا واجب ہے یہ عبادت مقصودہ ہے اس لئے نذر ماننے والا اس کی نذر مان سکتا ہے اور حسب نذر ادائے منذور ضروری قرار پا سکتی ہے۔

رہا احادیث مذکورہ کا جواب تو وہ خود روایت ہی سے ظاہر ہے کہ جب وہ بوڑھا پیدل نہیں چل سکتا تھا (جیسا کہ حضرت انس کی روایت میں صراحتاً آیا ہے) تو حضور نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیدیا اسی طرح حضرت عقبہ کی بہن کا قصہ تھا کہ وہ طاقت نہیں رکھتی تھی۔ (ابوداؤد کی حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے) ان حدیثوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پیدل حج کرنے والے پر نذر کے مطابق حج کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عذر کی وجہ سے سوار ہونا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر پیدل حج کو جانے کی نذر مانی اور کسی عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے سوار ہو گیا تو باتفاق علماء دوبارہ پیدل حج کرنا واجب نہیں لیکن امام ابو حنیفہ کے مسلمہ نظریہ کے مطابق قیاس کا تقاضا تھا کہ دوبارہ پیدل حج کرنا واجب ہو، جس طرح پے در

پے روزے رکھنے کی نذر یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر کی صورت میں خلاف ورزی کرنے سے اعادہ مطابق نذر واجب ہوتا ہے لیکن سوار ہو جانے کی اجازت چونکہ حدیث میں آگئی ہے اس لئے قیاس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

ایک سوال

احادیث مذکورہ سے سوار ہونے کی اجازت اس شخص کے لئے ثابت ہوتی ہے جس میں پیدل چلنے کی طاقت نہ ہو۔ جس میں پیدل چلنے کی طاقت ہو اس کے لئے سوار ہونے کی اجازت احادیث سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے پیدل حج کی نذر ماننے والا اگر بلا عذر سوار ہو جائے تو اس کی نذر پوری نہ ہونی چاہئے۔

جواب

حضرت عمران بن حصین نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب بھی ہم کو خطاب فرمایا صدقہ کرنے کا حکم ضرور دیا اور مثلہ کرنے کی ممانعت ضرور فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ پیدل حج کو جانے کی نذر ماننی بھی مثلہ کی ہی ایک شاخ ہے جس نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہو وہ ایک قربانی بھیج دے اور سوار ہو جائے۔ رواہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شریعت کے احکام اکثر عام ہوتے ہیں اور حج کے لئے عام طور پر پیدل جانے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے علماء نے کہا ہے کہ توشۂ راہ اور سواری سفر میں سہولت پیدا کرنے والی چیزیں ہی نہیں ہیں بلکہ ضروری چیزیں ہیں جن کے بغیر عام طور پر حج ممکن نہیں ہوتا اسی لئے ہم سوار ہونے کے جواز کے قائل ہیں حضرت عمران کی روایت کردہ حدیث مذکور سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واجب کا ترک کسی عذر کی وجہ سے ہو یا بغیر عذر کے دونوں صورتیں چاہتی ہیں (کہ سوار ہو جانے سے چونکہ واجب کا ترک ہوا ہے) دوبارہ ادا بطور قضا کی جائے اب اگر پیدل چلنا عبادت مقصودہ ہو اور مستقل ہو تو ترک کی صورت میں اس کی دوبارہ ادا بصورت قضا ہونی چاہئے اور اگر اس کو خود مستقل عبادت نہ قرار دیا جائے بلکہ عبادت کا وصف یا شرط کہا جائے تو چونکہ غیر مستقل ہے اس لئے اس کی قضاء بمثل معقول تو ممکن ہی نہیں اور بمثل غیر معقول قضاء کا ضرور تصور کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا اختیار شارع کو ہے، رائے اور قیاس سے کسی مثل غیر معقول کی تعیین نہیں کی جاسکتی۔ جیسے واجبات صلوٰۃ کی قضا نے سجدۂ سہو کو مقرر کیا ہے (جو مثل غیر معقول ہے) مثل غیر معقول کی تعیین شارع پر موقوف ہے شارع نے اگر کسی چیز کا مثل غیر معقول مقرر کر دیا ہو تو مثل غیر معقول سے اس چیز کی ادائیگی (بطور قضا) ہو جائے گی ورنہ اس فوت شدہ عبادت کو دوبارہ لوٹایا جائے گا اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر روزے پے درپے نہ رکھے ہوں یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر کی صورت میں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھی ہو تو صوم و صلوٰۃ کو دوبارہ ادا کیا جائے (کیونکہ اس کا مثل غیر معقول شارع نے مقرر نہیں کیا) اور اگر پیدل حج کو جانے کی نذر میں سوار ہو کر حج کو گیا تو اس کی تلافی ایک قربانی پیش کرنے سے ہو جائے گی شریعت نے اس کے لئے مثل غیر معقول (یعنی قربانی پیش کرنے) کی تعیین کر دی ہے۔ دوبارہ حج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں عذر اور غیر عذر کا کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں فرق تو صرف گناہ کا ہوگا مزدلفہ میں قیام اگر بلا عذر ترک کر دیا تو یہ ناجائز ہے اور کسی عذر (شرعی) کی وجہ سے ایسا کر لیا تو جائز ہے۔ اور قربانی پیش کرنا دونوں صورتوں میں واجب ہے۔

مسئلہ: جس نے حج کو پیدل جانے کی نذر مانی اور پیدل نہ گیا خواہ کسی عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے تو ایک قربانی واجب ہے امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے نزدیک کم سے کم ایک بکری کی قربانی کرنی چاہئے اور اگر اس نذر میں قسم کی نیت کی ہو تو قسم کا کفارہ بھی لازم ہے، طحاوی نے امام صاحب اور صاحبین کا یہی قول بیان کیا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس صورت میں صرف کفارۂ قسم کافی ہے (قربانی کی ضرورت نہیں)

پیدل حج کرنے کی نذر ماننے کی صورت میں اگر سوار ہو جائے تو قربانی دینی چاہئے اس کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر کی بہن والی حدیث ہے جو بروایت ابو داؤد اس طرح آئی ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو سوار ہو (کر) جانے اور ایک قربانی پیش کرنے

کا حکم دیا۔ یہ روایت صرف ابوداؤد کی ہے اور ابوداؤد کی سند اہل حدیث کے نزدیک معتبر ہے۔ صحیحین میں حضرت عقبہ کی بہن والی جو حدیث آئی ہے وہ مختصر ہے (اس میں قربانی پیش کرنے کا حکم نہیں یہ حکم ابوداؤد کی روایت میں زائد ہے) اور باوثوق راوی کی روایت میں (اگر دوسری روایتوں سے کچھ) زیادتی قابل قبول ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس حدیث میں مطلق قربانی کا حکم ہے اور قربانی کم سے کم بکری کی ہوتی ہے) اس لئے امام ابوحنیفہ کا یہ قول صحیح ہے کہ ایک بکری کی قربانی بھی کافی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ قربانی کے لئے حدیث میں بدنہ کا خاص طور پر ذکر آیا ہے (بدنہ صرف اونٹ یا بھینس گائے کو کہتے ہیں بلکہ صاحب قاموس کے نزدیک تو اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے بہرحال بدنہ بکری کو نہیں کہتے) طحاوی کی روایت کے بموجب حضرت عقبہ بن عامر کی بہن کے واقعہ میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو حکم دو کہ سوار ہو جائے اور ایک بدنہ کی قربانی دے۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس کی روایت سے جو یہ حدیث نقل کی ہے اس میں بھی صرف بدنہ کی قربانی کا حکم ہے۔ روایت اس طرح ہے کہ عقبہ کی بہن نے پیدل حج کو جانے کی نذر مانی تھی لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ایسا کر سکے حضور ﷺ نے حضرت عقبہ سے فرمایا اللہ کو تیری بہن کے پیدل چلنے کی ضرورت نہیں اس کو سوار ہو جانا چاہئے اور ایک بدنہ کی قربانی دیدے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث حسن ہے اس کا سلسلہ سند اس طرح ہے ابوداؤد از عیسیٰ بن ابراہیم از عبدالعزیز بن مسلم از مطر الوراق از عکرمہ از ابن عباس اور سوائے دونوں آخری راویوں کے سب نے یہ حدیث حدثنا کے لفظ سے بیان کی ہے۔

سند حدیث پر شبہ

عبدالعزیز بن مسلم غیر معروف ہے اور مطر وراق کو ابن سعد نے ضعیف الحدیث کہا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ذہبی نے عبدالعزیز کو معروف کہا ہے اگر کسی کی نظر میں مجہول ہو تو اس سے عبدالعزیز کے معروف ہونے میں فرق نہیں آتا اور مطر الوراق مسلم کے راویوں میں سے ہے (اس لئے ضعیف الحدیث نہیں ہو سکتا) ذہبی نے کہا یہ ثقہ ہے امام احمد اور ابن معین نے مطر وراق کو ضعیف الحدیث کہا ہے لیکن عطاء سے روایت کرنے میں اس کو ضعیف کہا ہے اور یہ حدیث مطر نے بروایت عکرمہ بیان کی ہے۔

ابن ہمام نے کہا امام ابوحنیفہ نے جو مطلق قربانی کو کافی قرار دیا ہے (اگرچہ بکری کی ہو) اونٹ کی تعیین نہیں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی قوی ہیں (اور بدنہ کی تخصیص کے راوی کمزور ہیں)

میں کہتا ہوں مطلق قربانی والی حدیث کو قوی الروایت کہنا نا قابل تسلیم ہے اور مان بھی لی جائے تب بھی قوی کو ترجیح ضعیف پر اسی وقت ہوتی ہے جب دونوں میں (نا قابل ازالہ) تعارض ہو اور اس جگہ دونوں میں تعارض ہی نہیں ہے ایک مطلق ہے دوسری مقید اور ایک ہی واقعہ سے دونوں کا تعلق ہے اور دونوں میں ایک ہی حکم ہے اس لئے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا اور مطلق سے بھی مقید ہی مراد ہو گا حضرت علی اور بعض دوسرے صحابہ کے اقوال میں یہ آیا بھی ہے (کہ دونوں حدیثوں میں مقید ہی مراد ہے) یہ اگرچہ اقوال صحابہ ہیں جو حدیث موقوف کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ایسے مباحث میں (کوئی صحابی اپنی طرف سے کسی قید کا اضافہ نہیں کر سکتا) موقوف کو مرفوع کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ امام شافعی نے بسلسلہ سعد بن ابی عروبہ از قتادہ بحوالہ حسن نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کے متعلق جس نے پیدل جانے کی قسم کھائی ہو، فرمایا وہ پیدل جائے اور اگر پیدل چلنے سے عاجز ہو جائے تو سوار ہو جائے اور بدنہ کی قربانی کرے۔

عبدالرزاق نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے پیدل کعبہ کو جانے کی نذر مانی ہو وہ کیا کرے یہ سوال حضرت علی سے کیا گیا، فرمایا پیدل جائے، اگر تھک جائے تو سوار ہو جائے اور اونٹ کی قربانی کر دے۔ حضرت ابن عمر حضرت ابن عباس اور قتادہ و حسن کے اقوال بھی ایسے ہی روایت میں آئے ہیں۔

مسئلہ: جس نے بیت اللہ یا کعبہ کو پیدل جانے کی نذر مانی اور حج یا عمرہ کا لفظ نہیں کہا تو استحساناً اس پر پیدل حج یا عمرہ کرنا

واجب ہے لیکن قیاس کا تقاضا ہے کہ اس پر کچھ واجب نہ ہو (نہ حج نہ عمرہ) استحسان کی وجہ محض عرف عام ہے (کعبہ یا بیت اللہ کو جانے کا معنی عرف عام میں حج یا عمرہ کرنا ہی ہوتا ہے) اور اگر حرم تک پیدل جانے کی نذر مانی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہیں کیونکہ عرف عام میں حرم تک جانے کا معنی حج یا عمرہ کرنا نہیں ہے۔ صاحبین کے نزدیک احتیاطاً حج یا عمرہ کرنا اس پر لازم ہے لیکن اگر صفا یا مروہ یا عرفات یا مزدلفہ یا منی یا مقام ابراہیمؑ تک جانے کی نذر مانی تو باتفاق ائمہ کچھ واجب نہیں۔ اسی طرح اگر پیدل جانے کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ خروج یا بیت اللہ تک سفر کرنے کا لفظ بولا اور نذر مانی تب بھی کچھ واجب نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کا مدار عرف عام پر ہے عرف عام میں اگر کسی لفظ سے نذر عبادت کا مفہوم ذہن میں آتا ہے تو اس عبادت کا وجوب ہو جائے گا ورنہ نہیں ہوگا۔

اگر یوں کہا کہ مجھ پر خانہ خدا کو جانا واجب ہے اور یہ الفاظ کہتے وقت نیت کی یا مسجد مدینہ کی مسجد بیت المقدس کی یا کسی اور مسجد کی تو شرعاً اس پر کچھ لازم نہیں ہوتا کیونکہ خانہ خدا کا اطلاق ہر مسجد پر صحیح ہے۔

مسئلہ: جس نے کسی طاعت کی نذر کی تو اس پر وہ طاعت بھی واجب ہو جائے گی اور جن شرائط و لوازم پر وہ طاعت موقوف ہے وہ سب واجب ہو جائیں گی۔ مثلاً کسی نے بغیر وضو کے یا بغیر قرأت (قرآن) کے دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی یا ایک رکعت یا تین رکعتیں پڑھنے کی نذر مانی تو باوضو اور مع قرأت کے دو رکعتیں واجب ہوں گی اور ایک رکعت کی بجائے دو رکعتیں اور تین کی بجائے چار رکعتیں لازم ہوں گی امام محمد نے فرمایا بلا وضو نماز پڑھنے کی نذر ہی درست نہیں بلا وضو نماز طاعت ہی نہیں ہے ہاں بلا قرأت نماز۔ بھی طاعت ہوتی ہے جیسے امی (جاہل ناخواندہ جس کو کوئی آیت بھی یاد نہ ہو) کی نماز باقی تینوں صورتوں میں امام محمد کا قول امام ابو حنیفہ کے قول کے موافق ہے۔ امام زفر نے فرمایا تین رکعتوں کی نذر مانی تو دو رکعتیں لازم ہوں گی اور باقی صورتوں میں کچھ واجب نہ ہوگا کیونکہ بے وضو اور بے قرأت نماز طاعت نہیں اور ایک رکعت بھی طاعت نہیں خواہ تنہا ایک ہی ہو یا اس سے پہلے دو رکعتیں ہوں، اس لئے ان صورتوں میں نذر ہی صحیح نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کسی چیز کی ذمہ داری لینے کے ساتھ ان چیزوں کا التزام ضروری ہو جاتا ہے جن پر اس چیز کا وجود موقوف ہو۔

مسئلہ: جس نے پیدل حج کو جانے کی منت مانی اور کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر سوار ہو کر گیا اور ایک قربانی کر دی تو کیا قسم کا کفارہ بھی اس پر واجب ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ نے نفی کو اختیار کیا ہے کفارۂ قسم واجب نہیں ہاں اگر قسم کی نیت کی ہو تو قسم کا کفارہ لازم ہے اس مسئلہ میں ویسا ہی اختلاف ہے جیسا اصل منذور کے فوت ہونے کی صورت میں پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ: اگر صرف اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو روزہ رکھنا بھی امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک واجب ہے کیونکہ ان دونوں اماموں کے نزدیک اعتکاف بغیر روزہ کے صحیح نہیں۔ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک صرف اعتکاف کافی ہے روزہ واجب نہیں۔ اعتکاف کے لئے روزہ شرط نہیں۔ اعتکاف رات کا بھی ہو سکتا ہے اور کم سے کم اعتکاف کی مدت ایک ساعت ہے۔ ایک روایت میں امام احمد کا قول بھی امام مالک کے قول کے موافق آیا ہے۔ اصل میں امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ واجب اعتکاف کی صحت کے لئے روزہ شرط ہے نفل اعتکاف بغیر روزہ کے بھی ہو سکتا ہے۔ امام محمد کا بھی یہی قول ہے۔

اعتکاف کے لئے روزہ کی شرط کا ثبوت مندرجہ ذیل حدیث سے ہوتا ہے جو دار قطنی نے بحوالۂ سوید بن عبدالعزیز بروایت سفیان بن حسین بوساطت زہری از عروہ بیان کی ہے کہ حضرت بن عبدالعزیز بروایت سفیان بن حسین بوساطت زہری از عروہ بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اعتکاف بغیر روزہ کے نہیں (ہوتا) دار قطنی نے کہا اس حدیث کی روایت میں سوید منفرد ہے اور امام احمد کے نزدیک سوید متروک الحدیث ہے۔ بخاری نے کہا ہے سوید کی حدیث میں نظر ہے یحییٰ نے کہا یہ ہیچ ہے۔ سفیان کے متعلق امام احمد نے کہا یہ قوی نہیں ہے ابن حبان نے کہا دوسری روایات میں تو سفیان ثقہ ہے لیکن زہری کی حدیث الٹی نقل کرتا ہے میں کہتا ہوں ذہبی نے اس کو صدوق (بڑا سچا) اور مشہور کہا ہے اور مسلم نے اس کی روایت لی ہے۔ ابن ہمام نے الکمال میں لکھا ہے کہ ابن حجر نے کہا میں نے ہیثم سے سفیان کے متعلق دریافت کیا ہیثم

نے اس کے متعلق اچھے کلمات کہے۔ بعض علماء نے کہا یوں تو سفیان ٹھیک ہے لیکن زہری کی روایت نقل کرنے میں اس کے متعلق لاباس بہ نہیں کہا جاسکتا اور چونکہ مذکورہ حدیث زہری کی روایت سے نقل کی ہے اس لئے صحیح نہیں ہے سوید اور سفیان از زہری اس کے راوی ہیں۔

دوسری حدیث ابوداؤد نے بحوالۂ عبدالرحمٰن بن اسحاق بروایت زہری از عروہ بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ معتکف کسی مریض کی عیادت کو نہ جائے کسی جنازہ میں شریک نہ ہو عورت کو مس بھی نہ کرے، نہ مباشرت کرے اور سوائے (فطری) ضروریات کے اور کسی حاجت کے لئے نہ نکلے اور اعتکاف بغیر روزہ کے نہیں ہوتا اور جماعت والی مسجد کے علاوہ (کسی اور جگہ) بھی نہیں ہوتا۔

ایک شبہ

ابوداؤد نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحاق کے علاوہ کسی نے بھی اس حدیث کے متعلق سنت کا لفظ نہیں کہا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے اور دار قطنی نے عبدالرحمٰن کو ضعیف کہا ہے۔

ازالہ

اس حدیث کو مرفوع قرار دینا (راوی کی طرف سے دوسروں کی روایت پر) زیادتی ہے اور (ثقہ کی روایت میں زیادتی مقبول ہے) اور عبدالرحمٰن ثقہ ہے البتہ قدری ضرور ہے (قدریہ فرقہ کے عقیدہ کا ہے) ابوداؤد نے یہی کہا ہے۔ ابن معین نے اس کو ثقہ مانا ہے اور امام احمد نے اس کو صالح الحدیث کہا ہے اور مسلم نے بھی اس کی راویت لی ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث (گو صحیح ہو پھر بھی) استدلال کے قابل نہیں کیونکہ لا اعتکاف کا لفظ جو اس حدیث میں آیا ہے وہ سنت علی المعتکف کے ذیل میں تو آہی نہیں سکتا ایسا کرنا ترتیب کلام کے اقتضاء کے خلاف ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے تب بھی مدعی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اعتکاف کے لئے روزہ کے سنت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف تو شرط ہونے میں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ روزہ کو اعتکاف کے لئے شرط قرار دیتے ہیں۔ اور شرط کے لئے کوئی دلیل ہونی چاہئے (اور اس حدیث سے روزہ کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے)

ابن جوزی نے التحقیق میں بحوالہ دار قطنی بروایت زہری از سعید بن میسب و عروہ یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرتے تھے اور معتکف کے لئے سنت یہ ہے کہ سوائے (فطری) حاجت کے اور کسی غرض سے (مسجد سے) باہر نہ نکلے نہ جنازے کے ساتھ جائے نہ مریض کی عیادت کرے نہ عورت کو مس کرے نہ مباشرت (مس بدن) کرے اور اعتکاف مسجد جماعت کے سوا (اور جگہ) نہیں ہوتا اور اعتکاف کرنے والے کو حضور روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ اس حدیث کی صحت پر ابن جوزی نے اعتراض کیا ہے کیونکہ اس کی روایت میں ایک راوی ابراہیم بن محسر آیا ہے جس کو ابن عدی نے کہا کہ اس کی روایت کردہ حدیثیں منکر ہیں۔ دار قطنی نے کہا اس حدیث میں جو الفاظ آئے ہیں کہ معتکف کے لئے...... سنت ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہیں ہے بلکہ یہ زہری کا کلام ہے جس نے اس کو حدیث میں داخل سمجھا ہے اس کو وہم ہو گیا ہے ایک حدیث ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بدیل کی روایت سے بحوالۂ عمرو بن دینار بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دور جاہلیت میں کعبہ کے پاس ایک دن رات کا اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی (اسلام کے بعد) رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا حضور ﷺ نے فرمایا اعتکاف کرلو۔ اور روزہ رکھو۔ نسائی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ اس روایت کے لئے دار قطنی نے کہا اس میں عبدالرحمٰن بن بدیل منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے۔ نافع نے حضرت ابن عمر کی روایت سے جو حدیث بیان کی ہے اس میں روزہ کا ذکر نہیں ہے اور یہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ دار قطنی نے کہا میں نے ابوبکر نیشاپوری کو کہتے سنا کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ عمرو بن دینار کے معتمد تلامذہ میں سے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا نہ ابن جریج نے نہ ابن عیینہ نے نہ حماد بن سلمہ وغیرہ نے ابن

ہمام نے اس کو ضرور ثقہ کہا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابن معین نے اس کو صالح الحدیث قرار دیا ہے۔ اور ابن حبان نے بھی اس کا شمار قابل وثوق راویوں میں کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے سفیان کی توثیق میں کچھ نہیں کہا۔ بالفرض اگر حضرت عمرؓ کو اعتکاف کے ساتھ روزہ رکھنے کا حکم روایۃً ثابت بھی ہو جائے تب بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر نے پہلے اعتکاف کی مع روزے کے نذر مانی ہو گی اور سوال بھی دونوں ہی کے متعلق کیا ہو گا لیکن راوی کے (ذہول یا نسیان کی وجہ سے) سوال کی روایت میں صوم کا لفظ رہ گیا جس طرح اکثر صحیح روایتوں میں جواب کے اندر صوم کا ذکر نہیں کیا گیا۔

دار قطنی نے اپنی سند سے بروایت سعید بن بشیر از عبداللہ بن عمر از نافع از حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے شرک کے زمانہ میں اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کی نذر مانی تھی اور اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔

عبدالحق نے کہا ہے کہ اس حدیث کی روایت میں سعید بن بشیر منفرد ہے ابن جوزی نے یحییٰ اور ابن نمیر کا قول نقل کیا ہے کہ سعید ہیچ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حافظ نے سعید کی شخصیت کو مختلف فیہ قرار دیا ہے ذہبی نے لکھا ہے کہ قتادہ کے شاگرد سعید بن بشیر کو شعبہ نے ثقہ قرار دیا ہے۔ بخاری نے کہا اس کی قوت حفظ میں کلام کیا گیا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قدری تھا۔ میں کہتا ہوں یہ امر نا قابل شک ہے کہ سعید بن بشیر ابن بدیل سے زیادہ ضعیف نہ تھا، امام شافعی اور امام احمد نے اپنے استدلال میں حضرت ابن عباس کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے کہ معتکف پر روزہ رکھنا (لازم) نہیں ہے مگر یہ کہ وہ خود ہی اپنے اوپر واجب کر لے (اور مع روزہ کے اعتکاف کی نیت کر لے) رواہ الحاکم، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ابن جوزی نے بھی اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی۔

بخاری (جن کے نزدیک اعتکاف کے لئے روزہ ضروری نہیں) نے حضرت ابن عمر کے بیان سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی کہ میں نے دور جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ ایک رات مسجد حرام میں اعتکاف کروں گا (اب میرے لئے کیا حکم ہے) فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ متفق علیہ۔ اس حدیث میں صراحت ہے کہ رات کو اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی اور ظاہر ہے کہ رات کو روزہ کا حکم نہیں ہے۔ بطور اعتراض اس روایت کے مقابلہ میں مسلم کی نقل کردہ وہ حدیث پیش کی جاسکتی ہے جو شعبہ نے بروایت عبیداللہ بیان کی ہے اس روایت میں بجائے رات (لیلۃ) کے دن (یوماً) کا لفظ صراحتاً آیا ہے اب دونوں حدیثوں کے اختلاف کو دور کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ لیلۃ (رات) سے مراد ہو گی رات مع دن کے اور یوماً (دن) سے مراد ہو گا دن مع رات کے (یعنی دونوں حدیثوں میں پورے چوبیس گھنٹے مراد ہوں گے) اس اعتراض کا جواب دیا جاسکتا ہے کہ جس روایت میں یوماً کا لفظ آیا ہے وہ شاذ ہے اور یوماً کی روایت کو اگر درست مان بھی لیا جائے، تب بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت عمر نے دن کو اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہی گزارش بھی کی تھی اور حضور ﷺ نے صرف ایفاء نذر کا حکم دیا روزہ کا ذکر بھی نہیں کیا اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کے لئے روزہ شرط نہیں ہے۔

(اعتکاف شب بلا صوم کی تائید میں) یہ روایت بھی پیش کی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن انیس نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں صحرا کا رہنے والا ہوں وہیں رہتا ہوں اور الحمد للہ وہیں نماز بھی پڑھتا ہوں مجھے اجازت مرحمت فرمادیجئے کہ میں اس مسجد میں ایک رات کے لئے فروکش ہو جایا کروں۔ فرمایا بیسویں تاریخ کی رات کو اس میں رہ جایا کرو۔

عبداللہ کے بیٹے سے لوگوں نے پوچھا پھر تمہارے باپ اس حکم کے بعد کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا میرے والد نماز عصر کے بعد یہاں داخل ہو جاتے تھے اور صبح تک کسی کام کے لئے بھی مسجد سے باہر نہیں نکلتے تھے جب فجر کی نماز پڑھ لیتے تو باہر آتے تھے مسجد کے دروازے پر ان کا گھوڑا موجود ہی ہوتا تھا اس پر بیٹھ کر اپنے صحرا کو چلے جاتے تھے۔ رواہ ابوداؤد، اس روایت سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے کہ صرف رات کا بھی اعتکاف درست ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم اس کو اعتکاف نہیں کہتے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے اس میں کوئی قباحت نہیں اصطلاحات میں کوئی نزاع کی گنجائش نہیں چاہیں آپ اس کو اعتکاف

نہیں کہیں لیکن اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ بہ نیت طاعت مسجد کے اندر ٹھہرے رہنا طاعت ہے اور نذر کی وجہ سے (مستحب) طاعت بھی واجب ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے رمضان میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو رمضان میں ہی اعتکاف کرنا لازم ہے، رمضان کی شرط ساقط نہیں کی جاسکتی کیونکہ رمضان میں ہر عبادت کا ثواب دوسرے ایام کی عبادت سے زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے رمضان میں کوئی کار خیر بطور نفل کیا اس کی حالت اس شخص کی طرح ہے جس نے رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں کوئی فرض ادا کیا ہو۔ (یعنی رمضان میں نفل نیکی کا ثواب دوسرے دنوں میں فرض نیکی کے برابر ہوتا ہے) اور جس نے رمضان میں ایک فریضہ ادا کیا تو اس کی حالت اس شخص کی طرح ہوگی جس نے رمضان کے علاوہ دوسرے ایام میں ستر فرض ادا کئے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن سلمان الفارسیؓ فی حدیث طویل۔

اگر مطلق رمضان میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو ہر رمضان میں اعتکاف کر سکتا ہے کوئی رمضان ہو اور اگر کوئی رمضان معین کر دیا ہے تو اسی رمضان میں اعتکاف کرنا لازم ہے۔

ابن ہمام نے کہا لیکن یہ فتویٰ اس ضابطہ کے مطابق نہیں ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جس شرط کو بحیثیت طاعت دوسری طاعت پر فضیلت حاصل نہ ہو اس کی پابندی لازم نہیں اور ظاہر ہے کہ ایک رمضان کو دوسرے رمضان پر کوئی برتری حاصل نہیں، اس لئے اولیٰ یہ ہے کہ اگر اعتکاف کے لئے اول ترین رمضان معین کیا گیا ہے تو پابندی کرے جہاں تک ہو سکے طاعت میں عجلت سے کام لیا جائے اللہ نے فرمایا ہے یسارعون فی الخیرات وھم لھا سابقون اور اگر کوئی اور رمضان معین کیا ہے اور پہلے رمضان میں اعتکاف کر لیا تو نذر ادا ہو جائے گی بلکہ اس صورت میں بھی اول ترین رمضان میں ہی ادا کرنا مناسب ہے کیونکہ آئندہ رمضان تک معلوم نہیں زندہ رہے یا نہ رہے۔

مسئلہ: اگر معین رمضان میں اعتکاف کی نذر مانی اور مقرر کردہ رمضان بغیر اعتکاف کے گزر گیا تو دوسرے ایام میں قضاء اعتکاف لازم ہے اور انہی ایام میں روزے رکھنے بھی ضروری ہیں (کیونکہ ادائے نذر کا اصل وقت فوت ہو گیا لہٰذا دوسرے ایام میں بالارادہ روزے رکھے اور اعتکاف کرے) امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا قول یہی ہے اور امام ابو یوسف کا ایک قول بھی اس کی موافقت میں مروی ہے اور دوسرا قول یہ مروی ہے کہ قضاء آئندہ زمانے میں نہ کرے۔ (نذر کی خلاف ورزی ہو گئی اب اس کی تلافی ممکن نہیں) یہی قول امام زفر کا ہے کیونکہ رمضان میں اعتکاف افضل ہے، دوسرے ایام میں فوت شدہ رمضان کی تلافی نہیں ہو سکتی جیسے کسی نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی اور بیٹھ کر پڑھی تو نذر پوری نہ ہو گی۔ یا پے در پے روزے رکھنے کی نذر مانی اور متفرق ایام میں روزے رکھے تو نذر ادا نہ ہو گی اور جب ایفاء نذر بالقضاء ممکن نہیں ہے تو نذر ساقط ہو جائے گی۔

ہم کہتے ہیں مقرر کردہ رمضان فوت ہو گیا جس کا تدارک ممکن نہیں یعنی فضیلت ایام حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے فضیلت ساقط ہو گئی لیکن اعتکاف کا تدارک تو ممکن ہے لہٰذا رمضان کے بعد اعتکاف مع الصوم کرنے سے نذر ادا ہو جائے گی۔ فضیلت رمضان نہ ہو گی۔ رہا دوسرے رمضان کا انتظار اور اس وقت تک اعتکاف کو موخر کرنا تو اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے رمضان تک زندگی باقی بھی رہے گی۔ مدت انتظار طویل ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی وقت کی فرض نماز فوت ہو گئی، یا رمضان کے روزے فوت ہو گئے تو دوسرے وقت نماز اور صوم رمضان کی ادائیگی اصل نماز اور اصل روزوں کو ادا کرنے کی نیت سے کرنا لازم ہے، اس صورت میں فضیلت وقت ضرور ساقط ہو جائے گی اس کا تدارک تو ممکن ہی نہیں ہے لیکن نفس فریضہ تو ادا ہو جائے گا۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر ماننا اور بیٹھ کر ادا کرنا نذر کو اس لئے پورا نہیں کرتا ہے کہ دوبارہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن ہے تدارک ہو سکتا ہے۔

ایک شبہ

جب رمضان کا اعتکاف فوت ہو گیا تو مناسب یہ تھا کہ آئندہ رمضان میں اعتکاف کیا جاتا لیکن مرنے کا احتمال تھا اس

لئے جلد از جلد دوسرے ایام میں روزوں کے ساتھ اعتکاف کرنے پر مجبور ہو گیا اور رمضان کے علاوہ دوسرے ایام میں روزوں کے ساتھ اعتکاف کر لیا لیکن جب زندگی میں دوسرا رمضان آگیا تو دوبارہ اس رمضان میں اعتکاف کرنا واجب ہونا چاہئے جیسے کسی شخص پر اگر حج واجب ہو اور کسی عذر کی وجہ سے حج نہ کر سکا اور دوسرے کو اپنی طرف سے حج کرنے کو بھیج دیا اور وہ شخص اس کی طرف سے حج کر آیا پھر اصل شخص کا عذر جاتا رہا اور خود حج پر قادر ہو گیا تو پہلا حج کر لیا ہوا باطل ہو گیا اور از سر نو حج کرنا واجب ہو گیا۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا، نص سے اعتکاف کے روزے رکھنے واجب ہو گئے ہیں تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ رمضان میں اعتکاف ادا ہی نہ ہو۔ (بلکہ اعتکاف کے لئے بالقصد دوسرے روزے رکھے) جب نذر کی وجہ سے اعتکاف واجب قرار پایا تو (رمضان سے الگ) اعتکاف کے روزے بھی واجب قرار پائے اور ظاہر ہے کہ نذر کے روزے رمضان کے روزوں سے ادا نہیں ہو سکتے کیونکہ رمضان کے روزوں کا وجوب نذر کا محتاج نہیں ہے وہ تو پہلے ہی اللہ کی طرف سے واجب ہیں لیکن وقت کی فضیلت کی وجہ سے ہم نے رمضان میں اعتکاف کو جائز قرار دے دیا اور چونکہ یہ جواز ضرورتاً تھا اور رمضان کا اعتکاف فوت ہونے سے فضیلت وقت کی ضرورت فوت ہو گئی اس لئے حکم اصل کی طرف لوٹ آیا اور اعتکاف کے لئے بالقصد دوسرے ایام میں روزے رکھنے لازم ہو گئے یہ ساری تفصیل اس بنیاد پر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اعتکاف کے لئے روزہ ضروری ہے جو روزہ کو ضروری قرار نہیں دیتا اس کے نزدیک رمضان کے بعد بغیر روزے رکھے فوت شدہ اعتکاف ادا ہو سکتا ہے اور دوسرا رمضان آجائے تو اس میں بھی اعتکاف ادا ہو سکتا ہے۔ بلکہ رمضان کے روزے **اگر فوت ہو گئے اور ان کے عوض رمضان کے بعد دوسرے روزے رکھے یا کفارہ کے روزے رکھے ہر صورت میں فوت شدہ اعتکاف ادا ہو جائیگا بس اعتکاف کر کے کسی طرح کے روزے رکھے یا بالکل نہ رکھے** اب فوت شدہ اعتکاف کے عوض جب اعتکاف کر لیا خواہ روزے کے ساتھ یا بغیر روزے کے اور پھر دوسرا رمضان آگیا تو دوبارہ اعتکاف نہیں کرے گا جیسے کسی کی وقتی نماز اگر فوت ہو جائے اور اس وقت پانی بھی موجود تھا پھر دوسرے وقت اس نے فوت شدہ نماز تیمّم سے پڑھ لی کیونکہ اس وقت پانی نہیں مل سکتا تھا۔ پھر پانی مل گیا تو دوبارہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یا جیسے کسی نے کپڑا نہ ملنے کی وجہ سے برہنہ بدن نماز پڑھ لی پھر کپڑا میسر آگیا تو اعادۂ صلوٰۃ لازم نہیں۔

مسئلہ: حالت کفر میں کسی کافر نے نذر طاعت کی پھر ایفاء نذر سے پہلے مسلمان ہو گیا، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں، حالت کفر کی نذر کا ایفا حالت اسلام میں واجب ہے، حضرت عمر نے حالت کفر میں اعتکاف کی نذر مانی تھی مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے حکم دریافت کیا، حضور ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک حالت کفر کی نذر کو حالت اسلام میں پورا کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ کافر طاعت کا اہل ہی نہیں ہے کافر کی طاعت معصیت ہے اس کی طاعت خلوص ایمانی کے ساتھ نہیں ہوتی اور نذر معصیت کو پورا کرنا واجب نہیں۔ حضرت عمر کو رسول اللہ ﷺ نے جو نذر اعتکاف پورا کرنے کا حکم دیا تھا، اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ نذر سابق کا ایفاء لازم ہے بلکہ حضرت عمر کو اعتکاف کی خواہش تھی حضور ﷺ نے آپ کی شدت رغبت کو محسوس کر کے ابتدائی حکم دیدیا یہ نذر جاہلیت کو پورا کرنے کا حکم نہ تھا۔

مسئلہ: نذر طاعت کرنے کے بعد (ایفاء سے پہلے) اگر کوئی مرتد ہو گیا پھر کچھ مدت کے بعد اسلام میں لوٹ آیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایفاء نذر واجب نہیں کیونکہ طاعت کی نذر بھی طاعت ہے اور ہر قربت مرتد ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئی۔ معدوم ہو گئی اس کا اثر بھی باقی نہیں رہا۔

مسئلہ: اگر ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی لیکن معاشی مشاغل کی وجہ سے دوامی روزے نہ رکھ سکا تو جتنے دن روزے نہ رکھے ہوں ہر روزہ کے بدلے ایک صاع (تقریباً چار سیر) گیہوں خیرات کرے (کذا قال فی الفتاوی الکبریٰ) ابن ہمام نے بھی یہی لکھا ہے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ تنگدستی کی وجہ سے اگر مالی خیرات نہ کر سکے تو اللہ سے معافی کا خواستگار ہو۔ فتویٰ اس بات پر ہے کہ

جس نے دوامی روزے رکھنے کی نذر مانی ہو اس کو اختیار ہے چاہے روزے رکھے چاہے ہر روزہ کا کفارہ (چار سیر گندم) دیدے۔ (کذافی الفتاوی الحجۃ) ناقابل برداشت چیز یا کام کی نذر ماننے کے حکم میں بھی یہی اختلاف ہے جو لوگ کفارہ کے قائل ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو حضرت ابن عباس کی روایت سے آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے ناقابل استطاعت نذر مانی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس نے دس یا سو حج کرنے کی نذر مانی کیا اس پر نذر کے مطابق سب حج کرنے لازم ہیں یا اتنے حج کرنے ضروری ہیں جتنے حج کرنے کی زندگی اجازت دے خلاصہ میں اول الذکر قول اختیار کیا گیا ہے دوسرے لوگوں نے مؤخر الذکر قول کی نسبت صاحبین کی طرف کی ہے سرخسی کا بھی یہی قول مختار ہے۔

اگر اسی سال دس حج کرنے کی نذر مانی تو سرخسی کی مختار روایت میں اس پر دس سال میں دس حج کرنے لازم ہوں گے۔ خلاصہ کی روایت کے اعتبار سے اسی سال دس حج لازم ہوں گے اب اگر اس نے اپنی طرف سے دس آدمیوں کو دس حج کرادیئے اور دس سال ابھی نہیں گزرے تو نذر پوری ہو جائے گی بشرطیکہ دس سال گزرنے سے پہلے وہ مرجائے لیکن اگر وہ دس سال تک زندہ رہا تو ہر سال خود حج کرنا اس پر واجب ہے، دوسروں سے کرائے ہوئے حج کافی نہیں ہوں گے۔ پھر اگر باوجود دس سال تک زندہ رہنے کے ہر سال حج کرنے کی اس میں طاقت نہ ہو۔ تو کیا کفارہ ادا کرنا کافی ہو جائے گا۔ حسب سابق یہ بھی مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں حج کروں گا تو یہ وعدۂ حج ہے اس لفظ سے اس پر حج کرنا لازم نہیں ہو جاتا یہ نذر نہیں ہے ہاں وعدہ کو پورا کرنا مستحب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ مجھے اس بیماری سے شفا عطا فرمادے گا تو میں حج کروں گا، یہ نذر ہو گئی۔ اسلامی فریضہ کے علاوہ حج نذر بھی اس پر لازم ہو گیا آئندہ اگر بغیر کسی تعیینی نیت کے اس نے حج کیا تو فرض حج مانا جائے گا اور اس کے بعد اگر اس نے دوسرا حج کیا اور کوئی نیت نہیں کی تو بعض اقوال میں آیا ہے کہ یہ نفل حج ہو گا۔ نذر والا حج نہیں ہو گا اور ادائے نذر کے لئے نیت ضروری ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا مجھ پر حج لازم ہے اگر زید چاہے اور زید نے کہا ہاں میں چاہتا ہوں تو حج نذر لازم ہو گیا اور یہ ضروری نہیں کہ جس وقت زید کو اس قول کی اطلاع ملے اسی مجلس میں وہ اپنی مشیت کا اظہار کردے۔ تعلیق طلاق بالمشیت کا مسئلہ اس کے خلاف ہے دونوں میں فرق ہے طلاق میں تو تملیک (اور تفویض) کا معنی ہوتا ہے اور حج کے مسئلہ میں تعلیق بمشیت زید محض ایک شرط ہے۔

مسئلہ: جس نے نذر مانی کہ اپنا تمام مال خیرات کردے گا تو احساناً اس پر لازم ہے کہ جتنے مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اتنا خیرات کردے کیونکہ اللہ کی طرف سے مقدار نصاب پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اسی پر ایجاب عبد یعنی التزام نذر کو بھی قیاس کرلیا جائے گا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ کلام سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مال کو خیرات کرنا مقصود ہے اور فاضل مال وہی ہوتا ہے جو نصاب زکوٰۃ ہے وصیت کا حکم اس کے خلاف ہے کیونکہ وصیت ایسے وقت ہوتی ہے جب وصیت کرنے والا مال کا ضرورت مند نہیں ہوتا۔ ہاں اگر یہ نذر مانی کہ میری ملک میں جو کچھ ہے میں خیرات کردوں گا اس صورت میں امام ابو حنیفہؒ نیز صاحبین کے نزدیک کل مال خیرات کرنا لازم ہے امام احمدؒ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں کل مال کا لفظ ہو یا کل ملک کا دونوں صورتوں میں سارا مال خیرات کرنا لازم ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا دونوں صورتوں میں ایک تہائی مال دینا پڑے گا۔ رزین کی روایت ہے کہ حضرت ابولبابہ نے خدمت گرامی ﷺ میں عرض کیا میری توبہ کی یہ بھی تکمیل ہے کہ میں اپنے اس گھر سے بے تعلق ہو جاؤں جہاں میں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اپنے کل مال سے الگ ہو جاؤں کل مال خیرات کردوں حضور ﷺ نے فرمایا تیری طرف سے ایک تہائی کافی ہے۔ ہم

کہتے ہیں حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں نہ اشارہ ہے کہ حضرت ابولبابہ نے کل مال خیرات کرنے کی نذر مانی تھی۔ صرف اتنا سمجھا جاسکتا ہے کہ آپ نے کل مال خیرات کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔ حضور ﷺ نے ایک تہائی مال خیرات کرنے کا مشورہ دیدیا۔ تاکہ غریبوں کے جو حقوق ابولبابہ پر تھے وہ ضائع نہ ہوں۔ اس معنی کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ کعب بن مالک کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تہائی مال کا بھی ذکر نہیں فرمایا۔ صحیحین میں شیخین نے بیان کیا کہ حضرت کعب بن مالک نے فرمایا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میری توبہ کی تکمیل یہ ہے کہ میں اپنے مال سے قطع تعلق کرلوں اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کر دوں فرمایا کچھ مال اپنے پاس روک لے یہ تیرے لئے بہتر ہے، میں نے عرض کیا تو میں اپنا وہ حصہ رو کے لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔

مسئلہ: اگر یوں کہا کہ میرا مال غریبوں کے لئے خیرات ہے تو اس میں وہ مال داخل نہیں مانا جائے گا جو اس کا لوگوں پر ہو۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا کہ میرا تمام مال جو اس وقت میری ملک میں ہے اور جو آئندہ میری ملک میں آئے گا سب خیرات کرنے کی نذر مانتا ہوں تو اس میں اپنی ذات کا ضروری صرف اور بیوی کا نفقہ اور ان تمام متعلقین کا نفقہ جن کے مصارف اس کے ذمہ ہوں داخل نہ ہوگا جیسے کہ کسی نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی تو رمضان کے روزے اس میں داخل نہیں ہوں گے اس لئے ان کا کفارہ بھی نہیں دے گا کیونکہ رمضان کے روزے تو حق خداوندی سے متعلق ہیں اب کسی وجہ سے رمضان کے علاوہ دوسرے ایام کے روزے نہ رکھ سکے تو انہی ایام کا کفارہ ادا کرے۔

مسئلہ: اگر کسی نے اس طرح کہا اللہ کے لئے ایک بکری یا گائے یا اونٹ ذبح کرنا میرے اوپر لازم ہے تو (نذر کا حکم ہو جائے گا) فی الحال ذبح کرنا لازم ہے اور اگر کوئی شرط لگائی مثلاً یوں کہا کہ میرا بھائی شفایاب ہو جائے گا تو اللہ کے لئے یہ جانور ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے تو جب شرط پوری ہو جائے اس وقت ذبح کرنا لازم ہوگا اور اختیار ہوگا جہاں چاہے ذبح کرے لیکن گوشت فقراء و مساکین کو تقسیم کرے۔

نوادر ابن سماعہ میں مذکور ہے کہ لفظ مذکور کہنے سے نذر نہیں ہوتی۔ ذبح کرنا واجب نہیں ہو جاتا۔ ہاں اگر کلام مذکور میں بطور خیرات زائد کہہ دیا تو یہ نذر ہو جائے گی ہم کہتے ہیں الفاظ مذکور دلالت کر رہے ہیں کہ اس نے مال دینے کا ذمہ لیا ہے اور مال ایسا ہے کہ فقراء کو دیا جاسکتا ہے اس لئے ذبح کرنے سے مراد ہوگا قربانی کر کے فقراء کو گوشت تقسیم کرنا ہاں اگر اس نے نیت ہی صرف ذبح کرنے کی کی ہو (تو گوشت کی تقسیم لازم نہ ہوگی اور اس کلام کو نذر پر محمول نہیں کیا جائے گا) اور اگر یوں کہا کہ اللہ کے لئے مجھ پر ہدی (قربانی) ہے تو بھیڑ بکری، اونٹ، گائے، بھینس جس جانور کی قربانی جائز ہے اس کو ذبح کر سکتا ہے۔ البتہ کسی جنس کا جانور اگر نیت میں متعین کر لیا ہے تو اسی قسم کا جانور ذبح کرنا ہوگا۔

صورت مذکورہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ حرم کے اندر ہی ذبح کرے (ہدی کا لفظ حرم کو ہی چاہتا ہے) اب اگر یہ واقعہ ایام نحر کا ہے تو منیٰ میں قربانی کرنا سنت ہے ورنہ مکہ میں جہاں مرضی ہو ذبح کرے اور (مکہ کی تخصیص جواز کے لئے نہیں بلکہ) حرم کے اندر جہاں چاہے ذبح کرے اور اگر لفظ ہدی کے ساتھ جزور کا لفظ کہا ہے تو حرم کے اندر اونٹ کی قربانی لازم ہوگی اور اگر جزور کے لفظ کے ساتھ ہدی کا لفظ نہیں کہا (اور ذبح کا یا اس کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ کہا) تو قربانی اونٹ کی کرنی ہوگی۔ حرم کے اندر ہو یا حرم کے باہر۔ اور اگر بدنہ کا لفظ کہا اور ہدی کا لفظ نہیں کہا تو چونکہ بدنہ (بمعنی اونٹ) عام استعمال میں اسی اونٹ کو کہتے ہیں جو حرم کے اندر قربانی کے لئے حاجی پہلے سے بھیج دیتے ہیں اس لئے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حرم کے اندر ہی قربانی کرنی لازم ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بدنہ کی نذر ماننے سے اونٹ کو حرم کے اندر ذبح کرنا لازم نہیں ہوتا۔ ہاں اگر علی بدنۃ من شعائر اللہ کہا تو چونکہ شعائر اللہ وہی اونٹ ہوتے ہیں جن پر خصوصی علامت اس بات کی بنادی جاتی ہے کہ یہ اونٹ حرم کو

قربانی کے لئے جارہے ہیں اس لئے اس بدنہ نذر کو بھی حرم کے اندر ذبح کرنا لازم ہوگا۔ اب اگر ہدی کو حرم میں ذبح کیا ہو تو حرم کے فقیروں کو اس کا گوشت تقسیم کردے اگرچہ حرم کے علاوہ دوسرے فقیروں اور غریبوں کو دینا بھی جائز ہے۔

اگر ہدی کی نذر مانی تو کیا ہدی کی قیمت حرم میں بھیج کر وہاں کے غریبوں میں تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں اول قول ابو سلیمان کی روایت میں آیا ہے جس طرح جانوروں کی زکوٰۃ ان کی قیمت کی شکل میں ادا کی جاسکتی ہے اسی طرح نذر ہدی میں ہدی کی قیمت تقسیم کی جاسکتی ہے۔

ابو حفص کی روایت میں عدم جواز آیا ہے کیونکہ لفظ ہدی کے اندر ذبح کا مفہوم ہے اس لئے ذبح کرنا ہی ضروری ہے اور یہی طاعت ہے۔ رہا تقسیم کرنا تو یہ ذیلی چیز ہے جو ذبح کے بعد مقصد ثانوی کی حیثیت رکھتی ہے اور زکوٰۃ میں اصل مقصد جانوروں کی زکوٰۃ ہے۔ یعنی بقدر نصاب جانور دے دینا، پس اس کی دونوں صورتیں ہیں جانور دیدے یا قیمت (زکوٰۃ میں ذبح کا مفہوم نہیں ہے۔)

مسئلہ: جس نے بکری کی نذر مانی اور اونٹ ذبح کردیا تو بہتر ہے۔ نذر ادا ہوگئی یہ صورت اداء بقیمت کی نہیں ہے کہ کافی نہ ہو کیونکہ ایفائے نذر بھی ذبح کی شکل میں کیا ہے لیکن دو بکریوں کی نذر مانی اور ایک ایسی بکری کی قربانی کردی جو قیمت میں چار بکریوں کے برابر تھی تو وفاء نذر کے لئے کافی نہ ہوگی صرف ایک ہی بکری مانی جائے گی۔

مسئلہ: جس اگر معین بکری ذبح کرنے کی نذر مانی تو اسی بکری کو ذبح کرنا ہوگا، اگر وہ مرجائے یا چوری ہوجائے تو دوسری لازم نہ ہوگی۔ اس طرح معین روپیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو خیرات کرنے کی نذر مانی اور روپیہ ضائع ہوگیا۔ چوری ہوگیا یا کچھ اور ہوگیا تو دوسرا معین روپیہ اس کی جگہ لازم نہ ہوگا لیکن اگر وہ روپیہ موجود ہو اور اس کی جگہ اتنا ہی دوسرا روپیہ خیرات کردیا جائے تو کافی ہوگا اور اگر روٹی خیرات کرنے کی نذر مانی اور روٹی کی قیمت خیرات کردی جائے تو جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کپڑا خیرات کرنے کی نذر مانی اور کعبہ کے غریب دربانوں کو دیدیا تو جائز ہے۔ اگر دربان غریب نہیں ہیں تو ان کو دینے سے نذر پوری نہ ہوگی اور اگر نذر کے کپڑے سے کعبہ کے پردے یا دیواروں کے غلاف وغیرہ بنادیئے تو نذر پوری نہ ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ یہ جانور بیت اللہ یا کعبہ یا مکہ تک (ذبح ہونے کے لئے) بھیجوں گا تو نذر کی وفا لازم ہوگی اور اگر کعبہ اور بیت اللہ اور مکہ کی جگہ حرم یا مسجد حرام کا لفظ بولا تو نذر حسب قول موجب نہیں ہوئی۔ صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں نذر موجب ہوگئی اور وفا حسب قول لازم ہوگئی لیکن اگر لفظ صفا بولا تو سب کے نزدیک اس کا التزام ضروری نہیں

ایک شبہ

اگر صرف لفظ ہدی استعمال کیا ہے تو حرم میں ذبح کرنا لازم ہوجاتا ہے پھر کیا وجہ کہ جب لفظ ہدی کے ساتھ لفظ حرم یا لفظ صفا بھی استعمال کیا تو کیوں حرم میں ذبح کرنا واجب نہیں ہوگا۔

جواب

اگر صرف لفظ ہدی بولا تو بیت اللہ یا مکہ کو لفظ ہدی کی مناسبت سے دل میں پوشیدہ ماننا پڑے گا لیکن جب لفظ حرم یا مسجد کہہ دیا تو اب کعبہ یا بیت اللہ یا مکہ دل میں پوشیدہ نہیں مانا جاسکتا اس لئے التزام ضروری نہیں قرار پایا۔

مسئلہ: اگر اس طرح کہا میں اپنے اس کپڑے سے بیت اللہ کا ستر (غلاف) کروں گا یا حطیم پر لگاؤں گا تو استحساناً اس کو نذر قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ عرفاً اس سے ہدیہ ہی مراد ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر کسی شخص کی بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اگر میں اس بکری کو خریدوں گا تو کعبہ کو ہدیہ کردوں گا (یعنی وہاں قربانی کروں گا) تو امام شافعیؒ کے نزدیک یہ نذر لغو ہوگی کیونکہ تعلیق بالشرط انعقاد حکم سے مانع ہے سبب سے مانع نہیں اور انعقاد سبب کے وقت بکری دوسرے کی ملک میں تھی اور غیر مملوک چیز کی نذر صحیح نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ

آدمی کی ملک میں جو چیز نہ ہو اس کی نذر (صحیح) نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شرط انعقاد سبب سے مانع ہوتی ہے وجود شرط کے بعد سبب کا انعقاد ہوتا ہے یعنی خریدنے کے بعد سبب کا انعقاد ہوتا ہے اس لئے نذر لغو نہیں ہوگی۔ وجود شرط کے بعد اس کو پورا کرنا لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے اپنے آپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے غلام کو ذبح کردینے کی منت مانی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ نذر معصیت ہے جو لغو ہے کچھ لازم نہ ہوگا۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک استحسانا ایک بکری کی قربانی کرنی چاہئے اور اگر اس نے چند بیٹوں بیٹیوں کی ذبح کرنے کی منت مانی ہو تو ہر بیٹے یا بیٹی کے عوض ایک بکری کی قربانی کرے امام محمد کے نزدیک اولاد کو ذبح کردینے کی منت مانی ہو تو بکری کی قربانی لازم ہے لیکن اگر اپنے آپ کو یا اپنے غلام کو ذبح کرنے کی نذر مانی ہو تو نذر لغو ہے کچھ لازم نہیں۔ استحسان کی وجہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ پر حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنا واجب کردیا گیا تو حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ میں مینڈھے کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا اور ظاہر ہے کہ اپنی جان کو یا اولاد کو قتل کرنا تو شرعاً معصیت ہے اس کی اجازت نہیں ہے اور نذر کی صورت میں اس نے خود اپنے اوپر قربانی کو واجب کرلیا ہے اس لئے جان یا اولاد کے عوض بکری کی قربانی اس کے قائم مقام ہوجائے گی محمد بن منتشر راوی ہیں کہ ایک آدمی نے اپنے آپ کو قربان کرنے کی نذر مانی اور یوں کہا کہ اللہ نے دشمن سے مجھے نجات دیدی تو اپنے کو قربان کردوں گا پھر حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر حکم دریافت کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مسروق سے جاکر پوچھو وہ شخص مسروق کے پاس گیا۔ مسروق نے فرمایا خود اپنے کو قتل نہ کرو اگر تم مومن ہو تو مومن کے قاتل بن جاؤ گے اور کافر ہو تو دوزخ میں جلد پہنچ جاؤ گے بلکہ ایک مینڈھا خرید کر غریبوں کے لئے اس کو ذبح کردو۔ حضرت اسحاق تم سے افضل تھے ان کے فدیہ میں بھی مینڈھے کی قربانی کرادی گئی تھی۔ اس فتویٰ کی اطلاع اس شخص نے حضرت ابن عباس کو جاکر دی۔ آپ نے فرمایا میں نے بھی ایسا ہی فتویٰ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ رواہ ابن رزین۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا مجھے تیرے مال سے جو نفع حاصل ہو مجھ پر اس کو خیرات کردینا لازم ہے تو جو نفع مخاطب کے مال سے حاصل ہوگا اس کو خیرات کرنا لازم ہے لیکن اگر مخاطب نے اس کی دعوت کی اور کھانا پیش کیا تو اس کو خیرات کرنا لازم نہیں۔

مسئلہ: اگر اس طرح نذر مانی میں اگر ایسا کروں تو جو کچھ میں کھاؤں اس کے مقابل خیرات کرنا مجھ پر لازم ہے یا جو میں پیوں اس کے مقابل خیرات کرنا مجھ پر لازم ہے اول صورت میں ہر لقمہ کے عوض ایک درہم اور دوسری صورت میں ہر گھونٹ کے عوض ایک درہم خیرات کرنا لازم ہے اس سے کم کھانے پینے کا اختیار نہیں (۔عرفی معنی یہی ہے)

مسئلہ: جس روز زید آجائے اللہ کے شکر کے طور پر اس روز مجھ پر روزہ رکھنا لازم ہے۔ اگر کسی نے ایسا کہا تو یہ قسم ہوگئی اب اگر زید ماہ رمضان کے کسی دن کے وقت آیا تو قسم کا کفارہ ہوگا نذر کی قضا لازم نہ ہوگی۔ شرط یعنی صوم بہ نیت شکر کا وجود ہی متحقق نہیں ہوا لیکن اگر روزہ کی نیت سے پہلے زید آگیا پھر اس نے صوم شکر کی نیت کرلی اور رمضان کی نیت نہ کی تو قسم پوری ہوجائے گی اور رمضان کا روزہ بھی ادا ہوجائے گا اور نذر کی قضا لازم نہ آئے گی۔ اگر الفاظ مذکورہ کہتے وقت قسم کی نیت نہیں کی اور نذر مانی تو یہ نذر ہی صحیح نہ ہوگی رمضان کا روزہ تو پہلے ہی سے فرض ہے اس کی جگہ صوم نذر نہیں لے سکتا۔ اس صورت میں نہ کفارہ ہے (کیونکہ قسم کی نیت نہیں) اور نہ قضاء نذر (کیونکہ نذر ہی صحیح نہیں)

مسئلہ: اگر کسی بیمار نے ایک ماہ کے روزوں کی نذر مانی اور تندرست ہونے سے پہلے مرگیا تو اس پر کچھ لازم نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی نے سال یا مہینہ کی کسی معین تاریخ کے روزہ کی نذر مانی تو ہر سال یا ہر ماہ جب بھی وہ تاریخ آئے گی روزہ رکھنا لازم ہوگا (یعنی عمر بھر کے لئے اس تاریخ کا روزہ لازم ہوگیا)

مسئلہ: اگر کسی نے پیر یا جمعرات کے دن کے روزہ کی نذر مانی تو ایک ہی پیر یا جمعرات کا روزہ کافی ہوگا۔ ہاں اگر ہر پیر یا ہر

جمعرات کو روزہ رکھنے کی نیت کی ہو گی تو ہر پیر یا ہر جمعرات کو روزہ رکھنا ہو گا۔

مسئلہ: اگر نذر کے الفاظ بلا ارادہ زبان پر آجائیں تو نذر کا حکم ہو جائے گا جسکو پورا کرنا ضروری ہو جائے گا۔ کیونکہ نذر انشاء ہے (خبر نہیں ہے جس میں جھوٹ سچ دنوں کا احتمال ہوتا ہے لفظ انشاء میں جھوٹ کا کوئی احتمال نہیں) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ہیں جن کی سنجیدگی اور واقعیت بھی سنجیدگی ہی ہے (یعنی ان کو صحیح مانا جائے گا اور ان کے احکام نافذ ہوں گے) اور جن میں مذاق بھی سنجیدگی ہی ہے۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اس سال اللہ کے لئے مجھ پر روزے ہیں (یعنی سال بھر کے روزوں کی نذر مانی، تو وقت نذر سے آئندہ بارہ مہینوں کے روزے لازم ہو گئے لیکن فتاویٰ قاضی خان اور خلاصہ میں ہے سنت یہ ہے کہ محرم سے شروع کرے اور آخر ذی الحجہ پر ختم کر دے لیکن اگر اس نے سال رواں کی طرف اشارہ کیا ہے تو وقت نذر سے آخر ذوالحجہ تک روزے رکھنا لازم ہو گا اور سال رواں کے جو مہینے یا دن گزر گئے ان کے روزے لازم نہ ہوں گے اسی طرح اگر کسی نے کہا میں گزرے ہوئے کل کا روزہ رکھنے کی نذر مانتا ہوں یہ کلام لغو ہے گزرا ہوا کل لوٹ کر نہیں آتا ہے۔

اگر کسی نے ماہ رواں کی طرف اشارہ کر کے اس مہینے کے روزوں کی نذر مانی تو مہینہ کے جتنے دن باقی ہوں ان کے روزے تو لازم ہوں گے اور گزرے ہوئے دنوں کی نذر لغو قرار پائے گی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا آج مجھ پر گزرے ہوئے کل کا روزہ رکھنا لازم ہے تو گزرے ہوئے کل کی قضا لازم نہ ہو گی صرف اسی دن کا روزہ رکھے گا۔ جس دن یہ الفاظ کہے ہوں گے۔

مسئلہ: اگر ایک سال کے روزوں کی نذر مانی تو جن دنوں کے روزے شرعاً ممنوع ہیں وہ دن مستثنیٰ ہوں گے اور ممنوعہ ایام کے علاوہ روزے رکھے گا۔ اسی طرح عورت کے ایام حیض مستثنیٰ رہیں گے اور باقی ایام میں روزے رکھنے لازم ہوں گے۔

مسئلہ: کسی عورت نے ایام حیض میں روزے رکھنے کی نذر مانی تو نذر صحیح نہیں اسی لئے قضا واجب نہیں اگر کسی نے رات کا روزہ رکھنے کی نذر مانی تو یہ نذر بھی صحیح نہیں شرعی روزہ دن میں ہوتا ہے۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ اور چاہئے کہ بیت عتیق کا طواف کریں۔ حضرت ابن عباس حضرت زبیر مجاہد اور قتادہ کے حوالہ سے بغوی نے عتیق کہنے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ ہر جابر اور بادشاہ ظالم کے قبضہ سے اللہ نے اس گھر کو ہمیشہ آزاد رکھا ہے کوئی جبار حاکم کبھی اس پر قبضہ نہ کر سکا نہ قبضہ کر سکے گا اس لئے اس کو عتیق کہا جاتا ہے لیکن اس توجیہ کی تردید حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو صحیحین میں مذکور ہے کہ ایک چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی کعبہ کو برباد کر دے گا۔ حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ منظر میری نظروں کے سامنے ہے کہ ایک حبشی چری ہوئی رانوں والا کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھاڑ رہا ہے۔ رواہ البخاری۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک حبشی تم کو چھوڑے رکھیں تم بھی ان سے تعرض نہ کرو کیونکہ کعبہ کا خزانہ سوائے اس حبشی کے جو چھوٹی پنڈلیوں والا ہو گا اور کوئی نہ نکال سکے گا۔ رواہ ابوداؤد والحاکم وصححہ۔

بعض نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی کہ اللہ نے کعبہ کو ڈوبنے سے آزاد رکھا طوفان نوح کے زمانے میں اس کو اٹھا لیا گیا تھا۔ ابن زید اور حسن نے عتیق کا معنی پرانا قدیم بیان کیا ہے یہ سب سے اول تعمیر انسانی ہے دینار عتیق۔ قدیم دینار۔

بعض نے کہا عتیق کا معنی ہے معزز عمدہ، اعلیٰ، عتاق الخیل اعلیٰ گھوڑے، عتق الرقیق، غلام کا غلامی کی ذلت سے آزاد ہو کر آزادی کی عزت حاصل کرنا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا کوئی انسان کبھی نہ اس کا مالک ہوا نہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کے گرداگرد سارا حرم بھی انسانی ملکیت سے آزاد ہے۔ سَوَاءَنِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ

تنبیہ

بیت اللہ کا طواف عبادت مقصودہ ہے اور خلاف عقل نہیں ہے اس کی حالت نماز کی طرح ہے۔ طواف تین طرح کا ہوتا

ہے۔

(۱) طواف فرض، یہ حج اور عمرہ کا رکن اور جزء ضروری ہے۔

(۲) طواف واجب، یہ طواف قدوم ورجوع ہے (پہلی زیارت کے وقت کا اور واپسی کے وقت کا طواف)

(۳) ان دونوں قسموں کے علاوہ ہر طواف نفل ہے، جس کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اولاد عبد مناف، تم میں سے جو کوئی لوگوں کے امور میں سے کسی امر کا والی ہو (یعنی حکومت کا کوئی رکن ہو یا حکومت میں اس کا دخل ہو) تو لوگوں کو رات دن میں کسی وقت بیت اللہ کا طواف کرنے سے نہ روکے۔ رواہ الشافعی واصحاب السنن وابن خزیمۃ و ابن حبان والدار قطنی والحاکم عن جبیر بن مطعم وصححہ الترمذی، یہ حدیث دار قطنی نے دوسرے دو طرق سے حضرت جابر کی روایت سے بیان کی ہے مگر یہ معلول ہے دار قطنی نے حضرت ابن عباس کی راویت سے بھی اس کو بیان کیا ہے، ابو نعیم نے تاریخ اصبہان میں اور خطیب نے تلخیص میں ایک سلسلہ سے حضرت ابن عباس تک اس حدیث کی روایت کو پہنچایا ہے مگر یہ سلسلہ بھی مجروح ہے۔ ابن عدی نے بحوالہ سعید بن راشد از عطاء از ابو ہریرہؓ اس کو بیان کیا ہے۔

مسئلہ : طواف قدوم (ابتدائی طواف) امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ کے نزدیک سنت ہے اور امام مالک کے نزدیک واجب ہے ابو الثور شافعی کا یہی قول ہے اس کو ترک کرنے سے قربانی واجب ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ فوت ہو جائے تو باتفاق علماء حج ادا ہو جاتا ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا۔ جس کی تفصیل حضرت عائشہؓ نے مجھے یہ بتائی کہ مکہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے وضو کر کے طواف کیا۔ اس کے بعد کوئی عمرہ نہ تھا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے حج کیا اور سب سے پہلے کعبہ کا طواف کیا اب بھی عمرہ نہ تھا، عمرہ اس کے بعد کیا، پھر حضرت عثمانؓ نے ایسا ہی کیا۔ متفق علیہ۔

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مکہ میں) آکر سب سے اول جو حج یا عمرہ کا طواف کیا اس میں پہلے تین چکر لپک کر (تیزی کے ساتھ کئے) اور چار چکر معمولی چال سے پھر دو سجدے کئے پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ متفق علیہ۔

امام مالکؒ نے حضرت عروہ بن زبیر کی روایت سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تنہا حج کیا تھا کیونکہ اس حدیث میں آیا ہے پھر عمرہ نہ تھا اور طواف قدوم کا وجود مذکورہ دو حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کیونکہ دونوں حدیثوں میں ہے کہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے طواف کیا اور یہ بھی صحیح روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مناسک (حج کے طریقے) مجھ سے لے لو۔ (سیکھ لو) اسی حکم کی وجہ سے طواف قدوم واجب ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ باتفاق علماء طواف قدوم کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنی جائز ہے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنی بالاجماع واجب ہے اور سعی سے طواف کرنا بھی لازم ہے طواف کے بعد سعی ہونا چاہئے اس لئے طواف بھی واجب ہونا چاہئے کیونکہ کوئی واجب نفل (یا سنت) کا تابع نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے باشندوں کے لئے طواف زیارت سے پہلے صفا و مروہ کے دریمان سعی جائز نہیں۔ کیونکہ اہل مکہ کے لئے طواف قدوم نہیں ہے اور طواف کے بعد بطور نفل سعی جائز نہیں۔ اگر شبہ کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے افراد نہیں قران کیا (حج اور عمرہ دونوں کی نیت ساتھ ساتھ کی تھی) بکثرت احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کی لبیک کہتے ہوئے میں نے خود سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے لبیک عمرۃ وحجا متفق علیہ۔

حضرت عمران بن حصین راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا حج اور عمرہ یکجا کیا تھا۔ حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ حج وداع میں رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کرنے کے بعد حج تک تمتع کیا تھا اور قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے جن کی قربانی کی تھی۔ متفق علیہ۔

اس حدیث سے اور اس جیسی دوسری روایتوں کو دیکھ کر امام احمدؒ کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نہ تنہا حج کیا نہ قران بلکہ) تمتع کیا تھا۔ ہم کہتے ہیں اس حدیث میں تمتع سے قران ہی مراد ہے کیونکہ لغت کے اعتبار سے تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ کا معنی صرف یہ ہے کہ ایک یہ سال میں حج کے مہینہ میں عمرہ اور حج دونوں کئے جائیں۔ خواہ ایک احرام سے کئے جائیں یا دونوں کا احرام الگ الگ باندھا جائے اور دو احرام کئے جائیں۔ آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ میں بھی مراد ہے۔ ہاں فقہاء کی اصطلاح میں تمتع الگ ہے اور قران الگ۔ لیکن حدیث یا قرآن کی آیت میں فقہاء کا اصطلاحی معنی مراد نہیں ہے۔ احادیث مذکورہ بالا سے بصراحت معلوم ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں کے لئے ایک ہی احرام یکجائی باندھا تھا۔ البتہ اہل روایت کا اس امر میں اختلاف ہے کہ مکہ میں داخل ہونے کے بعد ایک ہی طواف کیا تھا (یعنی طواف قدوم) یا دو طواف کئے تھے۔ ایک طواف قدوم اور دوسرا طواف عمرہ۔ جمہور کا قول ہے کہ ایک ہی طواف کیا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا دو طواف کئے تھے جمہور کے قول کی تائید بخاری کی بیان کردہ حضرت ابن عباس کی روایت سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ مکہ میں آئے اور طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور (پھر) طواف کرنے کے لئے کعبہ کے قریب بھی نہیں گئے یہاں تک کہ عرفہ سے واپس آگئے (پھر طواف کیا) صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر کے حج کا واقعہ مذکور ہے۔

جس سال حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر لشکر کشی کی تھی اور حضرت ابن زبیرؓ کا گھیر اڈالے پڑا تھا اسی سال حضرت ابن عمرؓ نے حج کا ارادہ کیا۔ عرض کیا گیا لوگ جنگ و جدال کی حالت میں ہیں، ہمیں اندیشہ ہے وہ آپ کو حج سے روک دیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (اگر مجھے روک دیا گیا تو) میں وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے عمرہ واجب کر لیا، پھر آپ روانہ ہو گئے جب بیداء کے باہر پہنچے تو فرمایا حج اور عمرہ کی ایک ہی حالت ہے، میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے عمرہ کے ساتھ حج کو بھی واجب کر لیا، آپ نے قدید سے خریدی ہوئی ایک قربانی بھی ساتھ لے لی، اور یوم النحر سے پہلے نہ قربانی کی نہ احرام کھولا، نہ سر منڈوایا نہ بال کتروائے نہ کسی ایسے کام کا ارتکاب کیا جو احرام کی حالت میں ممنوع ہے، جب یوم النحر آیا تو قربانی کی اور سر منڈوایا اور خیال کیا کہ پہلے ہی طواف سے آپ کا حج بھی ادا ہو گیا اور عمرہ بھی۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عمر فرماتے تھے جس نے حج اور عمرہ کو ملا کر ادا کیا اس کے لئے ایک ہی طواف کافی ہے (جب تک دونوں کو ادا نہ کردے احرام نہ کھولے) دونوں کو ادا کردے تو ساتھ ساتھ احرام کھولے۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ جب کعبہ کے پاس پہنچے تو سات چکر لگائے اور صفا و مروہ کے درمیان سات سعی کی اور (اس سے) زیادہ (کچھ) نہیں کیا اور خیال کیا کہ بس یہی کافی ہو گیا۔

حنفیہ نے حضرت علیؓ کے عمل سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے حج و عمرہ کو یکجا ساتھ ساتھ ادا کیا اور دونوں کے لئے (جدا جدا) وہ طواف کئے اور (علیحدہ علیحدہ) دونوں کے دوبار سعی کی اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ رواہ الدار قطنی والنسائی بطرق۔ امام محمد نے کتاب الآثار میں حضرت ابو حنیفہ کی روایت سے موقوفاً بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا جب حج و عمرہ کا یکجا احرام باندھو تو دونوں کے لئے دو طواف کرو اور صفا و مروہ کے درمیان دونوں کے لئے دوبار سعی کرو۔

طحاوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود نے فرمایا قران کرنے والا (کعبہ کے) دو طواف کرے اور (صفا و مروہ کے درمیان) دو سعی کرے۔

حافظ نے کہا حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً اس حدیث کی روایت کے تمام طرق ضعیف ہیں ہاں موقوفاً جنہیں طحاوی نے مختلف سندوں سے حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کے اقوال قرار دیا ہے وہ مجموعی لحاظ سے قابل قبول ہیں ان میں کوئی ضعف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث اگر صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں

پہنچے تو منیٰ جانے سے پہلے آپ نے کعبہ کے دو طواف کئے ایک قدوم حج کا دوسرا عمرہ کا بلکہ حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کے لئے (کعبہ کا) طواف کیا اور اس کے لئے سعی کی اور یہ (عمرہ) منیٰ کو جانے سے پہلے کیا۔ پھر قربانی کے دن حج کے لئے طواف کیا اور سعی کی۔ یہی مطلب حضرت عمران بن حصین کی روایت کردہ حدیث کا ہے حضور ﷺ نے دو طواف کئے اور دو مرتبہ سعی کی۔ رواہ الدار قطنی۔

کسی قوی یا ضعیف روایت میں یہ نہیں آیا کہ طواف عمرہ کے بعد حضور ﷺ نے طواف قدوم کیا صرف مسند ابی حنیفہ میں ضبی بن معبد کی روایت سے ایسا آیا ہے ضبی نے بیان کیا میں جزیرہ سے حج قران کرنے کے لئے چلا۔ سلیمان بن ربیعہ اور زید بن صوحان کی طرف سے میرا گزر ہوا میں ملا کر کہہ رہا تھا لبیک بحجۃ و عمرۃ۔ دونوں بزرگوں نے میری لبیک کو سنا، سن کر ایک صاحب نے کہا یہ (شخص) اونٹ سے بھی زیادہ گمراہ ہے، دوسرے نے بھی اسی طرح کی بات کہی لیکن میں (اپنے شغل میں) برابر مصروف رہا اور حج ادا کر لیا اور پھر امیر المومنین عمر بن خطاب کی طرف مجھے جانا ہوا۔ راوی نے اس سے آگے کچھ تفصیل بیان کی جس کے آخر میں کہا امیر المومنین نے دریافت فرمایا پھر تو نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا میں نے برابر (اپنی لبیک) جاری رکھی، پھر عمرہ کے لئے طواف کیا اور سعی کی پھر دوبارہ ایسا ہی اپنے حج کے لئے کیا پھر میں احرام کی ہی حالت میں رہا اور وہاں ٹھہر کر وہی کیا جو حاجی کرتے ہیں یہاں تک کہ آخری نسک (رکن) بھی پورا کر لیا امیر المومنین نے فرمایا تجھے رسول اللہ ﷺ کی سنت مل گئی۔ مسند ابو حنیفہ ناقابل اعتماد ہے اس کے مؤلف اور امام ابو حنیفہ کے درمیان بہت سے مجہول غیر معروف راوی ہیں اس کی احادیث کو صحیح بخاری کی حضرت ابن عباس کی اس روایت کے مقابلہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا جس میں صراحت ہے کہ عرفہ سے واپسی تک پھر حضور ﷺ کعبہ کے قریب بھی نہیں گئے۔

اور جب یہ امر طے شدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قران کیا تھا اور سوائے طواف عمرہ کے حج کا طواف قدوم نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ طواف قدوم نہ رکن حج ہے نہ مستقل طور پر واجب بلکہ صلوۃ تحیۃ المسجد کی طرح سنت ہے، دوسرے واجب یا سنت کے ذیل میں یہ سنت پوری ہو جاتی ہے، جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں پہنچے اور عمرہ کے لئے طواف کر لیا تو طواف قدوم کی جگہ یہ طواف کافی ہو گیا۔

مسئلہ: طواف نفل، نماز نفل کی طرح نذر سے واجب ہو جاتا ہے اور آیت مذکورہ بالا میں طواف سے حج کا طواف زیارت باتفاق علماء مراد ہے طواف زیارت ارکان حج میں سے ایک رکن ضروری ہے اس پر علماء کا اجماع ہے باقی کوئی طواف رکن حج نہیں ہے۔

مسئلہ: طواف صدر بھی باتفاق امت رکن حج نہیں ہے امام ابو حنیفہ امام احمد اور (صاحبین) کے نزدیک واجب ہے ایک روایت میں امام شافعی کا بھی یہی قول آیا ہے۔ امام ابو حنیفہ اس کو واجبات حج میں سے شمار کرتے ہیں اور امام محمد مستقل واجب قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی نے طواف وداع کر لیا اور پھر کسی وجہ سے مکہ میں ٹھہر ا رہا پھر کچھ مدت کے بعد واپس ہوا تو مکہ چھوڑنے کے وقت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طواف وداع کی ضرورت نہیں لیکن امام محمد کہتے ہیں کہ دوبارہ طواف رخصت کرنا ہو گا، مسافر جب مکہ سے واپس ہو گا تو اس پر طواف وداع لازم ہے۔

امام مالک کے نزدیک طواف صدر سنت ہے ایک روایت میں امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے۔

طواف صدر حیض یا کسی طاقت کے رکاوٹ ڈالنے سے باجماع امت ساقط ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ (حج کے بعد) لوگ ہر طریقہ سے واپس ہو جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک آخری ملاقات بیت اللہ سے نہ کر لے (مکہ سے) نہ نکلے۔ رواہ احمد، دار قطنی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں لوگ منیٰ سے نکل کر اپنے اپنے رخ پر جاتے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ (ہر شخص کی) آخری ملاقات بیت اللہ سے ہونی چاہئے اور حضور ﷺ نے حائضہ کو (بغیر طواف صدر کئے) اجازت دیدی تھی۔ مسلم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے تم میں سے کوئی (مکہ

سے) نہ نکلے جب تک اس کی آخری ملاقات بیت اللہ سے نہ ہو جائے۔ متفق علیہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے حضور ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آخر میں بیت اللہ کی زیارت کریں۔ مگر آپ نے حائضہ عورت کے لئے حکم میں تخفیف کر دی۔

حضرت ابن عمر نے فرمایا جو کعبہ کا حج کرے اس کا آخری کام بیت اللہ کا طواف ہونا چاہئے حیض والی عورتیں مستثنیٰ ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان کو رخصت دیدی ہے، رواہ الترمذی وصحہ وحسنہ۔

حضرت عبداللہ بن اوس کا بیان ہے میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا، حضور ﷺ فرما رہے تھے جو کوئی اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اس کی آخری ملاقات اس گھر سے ہونی چاہئے۔ رواہ الترمذی۔

امام ابو حنیفہ نے اس آخری حدیث سے طواف صدر کے واجب ہونے پر استدلال کیا اور واجبات حج سے قرار دیا ہے کیونکہ اس حدیث میں مَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ آیا ہے۔

میں کہتا ہوں اس حدیث میں اواعتمر کا لفظ بھی آیا ہے تو طواف صدر عمرہ میں بھی واجب ہونا چاہئے لیکن اس کا کوئی قائل نہیں۔

امام احمد نے فرمایا لا ینفر احد کا لفظ عام ہے اس لئے طواف صدر کا واجب ہونا ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مسلک پر مطلق کو مقید پر محمول کرنا لازم نہیں آتا کیونکہ تقیید سبب پر وارد ہے جس طرح حدیث مبارک ہے ادا کرو ہر آزاد اور غلام کی طرف سے، دوسری حدیث ہے ادا کرو ہر مسلمان آزاد اور غلام کی طرف سے دوسری حدیث میں لفظ مسلمان مذکور ہے اور پہلی حدیث میں یہ لفظ مذکور نہیں ہے لامحالہ مطلق کو ہی مقید پر محمول کیا جائے گا۔ یعنی پہلی حدیث میں بھی مسلمان آزاد و غلام مراد ہو گا) لیکن طواف صدر کی حدیث میں ایسا نہیں ہے قید سبب پر وارد ہے مکہ سے مطلق نکلنا موجب طواف ہے اور حج کے بعد مکہ سے نکلنا بھی موجب طواف ہے اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

فصل

طواف کعبہ کی کچھ شرطیں ہیں۔ کچھ ارکان (یعنی فرائض) ہیں۔ کچھ واجبات ہیں، کچھ سنتیں ہیں کچھ آداب (یعنی مستحبات) ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) شرائط طواف کے لئے نیت شرط ہے، ہر مستقل عبادت کے لئے نیت شرط ہے۔ شرعی نصوص سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے اور اسی پر اجماع ہے۔

طواف زیارت کے لئے مطلق طواف کی نیت کافی ہے، فرض طواف کی نیت ضروری نہیں۔

ایک سوال

وقوف عرفات کی طرح طواف زیارت بھی حج کا ایک ضروری رکن ہے اور عرفات میں ٹھہرنے کی نیت ضروری نہیں ہے اگر سوتے میں یا بیہوشی کی حالت میں عرفات میں قیام ہو جائے یا مختلف پہاڑیوں پر ٹھہراؤ ہو جائے جن میں عرفہ کی پہاڑی بھی ہو اور وقوف کرنے والے کو معلوم بھی نہ ہو کہ یہ عرفات کی پہاڑی ہے تو رکن حج ادا ہو جائے گا۔ حضرت عروہ بن مضرس نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ میں بنی طے کے پہاڑ سے آیا ہوں میں نے (کثرت سفر کی وجہ سے) اپنی اونٹنی کو گھلا دیا اور خود بھی بڑی تکلیفیں اٹھائیں کہ میں تھک گیا، خدا کی قسم میں نے کوئی پہاڑی ایسی نہ چھوڑی جس پر قیام (وقوف) نہ کیا ہو کیا میرا حج ہو جائے گا حضور ﷺ نے فرمایا جس نے ہمارے ساتھ یہ نماز یعنی فجر کی نماز مقام جمع میں پالی اور اس سے پہلے رات کو یا دن میں عرفات میں پہنچ گیا اس کا حج پورا ہو گیا۔ رواہ ابوداؤد۔

پھر اگر طواف زیارت کے لئے نیت شرط ہے تو بغیر تعیین فرض کے مطلق طواف کی نیت کافی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ تعیین نیت فرض تو ہر اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے شرط ہے جس کے لئے وقت ظرف ہے اور معیار نہیں ہے (یعنی ادائیگی

کے بعد بھی وقت باقی رہتا ہے) جیسے نماز۔

جواب

تحقیق مقام یہ ہے کہ جب احرام کی شکل میں حج کی نیت ہو جاتی ہے تو تمام ارکان حج کی نیت ہو جاتی ہے، اب اگر کوئی دوسری نیت مناسک کی نیت کے خلاف نہ ہو تو سابق کی (ابتدائی) نیت معتبر سمجھی جائے گی۔ اور ہر رکن کی ادائیگی کے وقت اس نیت کو برقرار مانا جائے گا ہر رکن کے لئے تجدید نیت کی شرط نہ ہو گی، جیسے نماز کی (ابتدائی نیت کافی ہوتی ہے) ہر رکن کی ادائیگی کے لئے جدید نیت کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر کوئی رکن عبادت مستقل عبادت کی حیثیت رکھتا ہو جیسے طواف اور طواف کی دو رکعتیں تو ایسے رکن کی ادائیگی کے لئے تجدید نیت ضروری ہے اور اس رکن کو شروع کرتے وقت مطلق نیت کافی ہے۔ نماز ہو یا طواف ہر ایک کی دو حیثیتیں ہیں ایک مستقل عبادت ہونے کی دوسری جز عبادت ہونے کی اول حیثیت کے لحاظ سے رکن کو شروع کرتے وقت اس رکن کو ادا کرنے کی نیت لازم ہے اور دوسری صورت میں سابقہ ابتدائی نیت کافی ہے جو احرام کے وقت ہوتی ہے ہم نے دونوں حیثیتوں کو ملحوظ رکھا ہے مستقل عبادت کی حیثیت میں مستقل نئی نیت اور جز عبادت ہونے کی صورت میں ابتدائی سابقہ نیت، پس شروع کے وقت مطلق نیت کافی ہے کیونکہ عبادت ہے اور عبادت کے لئے مطلق نیت کافی ہے اور طواف زیارت کی تعیینی نیت ضروری نہیں کیونکہ طواف زیارت جز عبادت ہے۔

اور جو عمل بجائے خود عبادت نہ ہو بلکہ جزء حج ہونے کی وجہ سے اس کو عبادت قرار دے لیا گیا ہو جیسے عرفہ میں قیام اور صفا و مروہ کے درمیان سعی اس کے لئے علیحدہ کسی نیت کی ضرورت نہیں ابتدائی احراء کی نیت کافی ہے۔

مسئلہ: ایک شخص نے دوسرے کو اپنے اوپر اٹھالیا اور اسی حالت میں طواف کیا اس کی چند صورتیں ہیں جن کے احکام بھی مختلف ہیں۔

۱۔ حامل محرم نہ تھا اور محمول محرم تھا اور حامل نے محمول کے طواف کی نیت کی تھی اور محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو محمول کا طواف ہو جائے گا۔

۲۔ حامل محرم تھا اور محمول محرم نہ تھا اور حامل نے اپنے طواف کی نیت کی تو اس کا طواف باتفاق ائمہ صحیح ہو گا۔

۳۔ حامل و محمول دونوں محرم تھے اور حامل نے محمول کے طواف کی نیت کی تو صرف محمول کا طواف ہو جائے گا اور اگر اپنے طواف کی نیت کی تو اس کا طواف ہو جائے گا اور اگر دونوں کے طواف کی نیت کی تو امام شافعی کے نزدیک صرف حامل کا طواف ہو گا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک محرم حامل نے اگر اپنے طواف کی نیت کی یا اپنے ساتھ محمول کی بھی نیت کی اور محمول نے اپنے طواف کی نیت کی تو دونوں کا طواف ہو جائے گا کیونکہ دونوں کی اپنی اپنی جگہ نیت درست ہے دونوں کی نیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

مسئلہ: ۔ شرائط طواف میں سے حدث اکبر و اصغر سے طہارت بھی شرط ہے اور بدن۔ لباس اور جگہ کی طہارت بھی لازم ہے۔ اور جمہور کے نزدیک ستر عورت بھی لازم ہے حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر گزر چکی ہے کہ مکہ میں داخل ہو کر رسول اللہ ﷺ نے پہلے وضو کیا پھر طواف کیا اور یہ بھی فرمایا مجھ سے حج کے طریقے سیکھو۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا حائضہ ہونے کی حالت میں میں مکہ میں آئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کام حاجی کرتے ہیں تم بھی کرنا البتہ جب تک طہارت نہ ہو جائے کعبہ کا طواف نہ کرنا۔ (صحیحین) مسلم کی روایت میں آیا ہے جب تک غسل نہ کرو (طواف نہ کرنا) حضرت عائشہ راوی ہیں کہ مکہ سے روانگی کے دن صفیہ کو حیض شروع ہو گیا۔ اس حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا کیا اس نے قربانی کے دن طواف (زیارت) کر لیا عرض کیا گیا جی ہاں فرمایا تو روانہ ہو جاؤ۔ (صحیحین)

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے حج وداع سے پہلے جس حج کا امیر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو بنا کر بھیجا تھا اسی حج کے موقع پر قربانی کے دن حضرت ابو بکرؓ نے مجھے لوگوں میں یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں

کرے گا اور نہ کوئی ننگا (ہو کر) طواف کرے گا (اس حدیث سے ستر عورت کا ضروری ہونا ثابت ہو رہا ہے)
اللہ نے فرمایا ہے طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کرو اس عبارت سے تطہیر مکان کی ضرورت صراحتاً ثابت ہو رہی ہے اور لباس و جسم کی تطہیر کا حکم دلالتاً بطریق اولیٰ معلوم ہو رہا ہے خصوصاً حدث اکبر و اصغر سے طہارت کا تو بدرجۂ اولیٰ مستفاد ہو رہا ہے کیونکہ نجاست حقیقیہ سے حدث (یعنی نجاست حکمیہ) کا مرتبہ زیادہ اہم ہے بعض صورتوں میں نجاست کے ساتھ نماز ہو سکتی ہے اور بے وضو نماز ناجائز ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا، اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا اور فرمایا طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ اس آیت کو صلوٰۃ سے پہلے ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طواف نماز کی طرح ہے صرف اتنی بات ہے کہ طواف میں بولنا جائز قرار دیا ہے اور نماز میں بولنے کی ممانعت کی ہے پس جو شخص طواف میں بات کرے وہ نیک بات کرے۔ رواہ الحاکم فی المستدرک وصححہ والطبرانی والبیہقی۔

ترمذی، حاکم، دار قطنی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور بیہقی نے حدیث ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے بیت اللہ کا طواف نماز ہے صرف یہ بات ہے کہ اس میں اللہ نے کلام کو مباح کر دیا ہے۔ اس روایت کو ابن سکن نے صحیح کہا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک نجاست حقیقیہ سے طہارت سنت ہے اور نجاست حکمیہ (حدث) سے طہارت واجب ہے اور ستر عورت بھی واجب ہے اس کو ترک کرنے سے گناہ گار ہوگا۔ اگر برہنگی یا جنابت کی حالت میں طواف فرض کیا ہوگا تو ایک بدنہ (اونٹ، گائے) کی قربانی کرنی واجب ہوگی اور اگر بے وضو طواف فرض کیا ہے تو کوئی سی ایک قربانی لازم ہوگی (خواہ بکری ہی کی ہو) اسی طرح طواف غیر فرض اگر جنابت یا برہنگی کی حالت میں کیا ہے تو کوئی سی قربانی دینی ہوگی۔ (چھوٹی ہو یا بڑی) اور اگر غیر فرض طواف بے وضو کیا ہے تو نصف صاع گیہوں کسی مسکین کو بطور کفارہ دینا ہوں گے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک مذکورہ بالا اشیاء میں سے کوئی چیز بھی طواف کے لئے لازمی شرط نہیں ہے کیونکہ قرآن میں مطلق طواف کا حکم آیا ہے اور کتاب اللہ پر زیادتی کا معنی ہے حکم کتاب کو منسوخ کر دینا اور اخبار احاد سے کتاب کا حکم منسوخ کر دینا امام صاحب کے نزدیک جائز نہیں اس لئے ہم کسی شرط کو فرض لازمی نہیں قرار دے سکتے ہاں احادیث احاد پر عمل کرنا واجب ہے اس لئے مذکورہ امور بعض صورتوں میں واجب ہیں۔

مسئلہ: طواف زیارت کی ایک ضروری شرط وقت بھی ہے مقررہ وقت سے پہلے ادا نہیں کیا جا سکتا اور بعد از وقت بالاجماع قضا ضروری ہے اگر خود اپنی کوتاہی کی وجہ سے طواف زیارت کو وقت مقرر کے بعد ادا کیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک قربانی واجب ہے جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے اور اگر کسی عذر کی وجہ سے مؤخر کرنا پڑ گیا جیسے حیض یا جابر طاقت کی طرف سے بندش وغیرہ تو قربانی واجب نہیں۔

امام صاحب کے نزدیک طواف زیارت کا وقت قربانی کے دن کی فجر صادق سے شروع ہوتا ہے اور جمہور کے نزدیک یوم النحر کی آدھی رات سے شروع ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے شب نحر میں بھیج دیا تھا۔ میں نے فجر سے پہلے رمی جمرہ کی پھر جا کر طواف زیارت کیا۔ رواہ الدار قطنی۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے اس کے سلسلہ میں ضحاک بن عثمان راوی شامل ہے اور قطان نے اس کو نرم قرار دیا ہے۔ پھر یہ حدیث، حضرت ابن عباس کی روایت کے بھی خلاف ہے جس میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے متعلقین میں کمزور طبقہ کو پہلے سے بھیج دیا تھا اور یہ فرما دیا تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے رمی جمرات نہ کرنا۔ رواہ الترمذی وصححہ۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ طحاوی اور ابن حبان نے حسن عرنی کے طریق سے اس کو بیان کیا ہے اور یہ سلسلہ روایت حسن ہے ترمذی اور طحاوی نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔ ابو داؤد نسائی، طحاوی اور ابن حبان نے مختلف طریقوں سے اس کو نقل کیا ہے بعض طرق کی تائید بعض سے ہو کر حدیث میں قوت آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں فرمت الجمرة کے بعد ثم مضت فافاضت آیا ہے۔ یعنی رمی جمرہ تو فجر سے پہلے کر لی اس کے (کچھ دیر) بعد جا کر طواف

افاضہ (طواف زیارت) کیا۔ اس میں کوئی ثبوت نہیں کہ طواف بھی طلوع فجر سے پہلے کیا (بلکہ ثم کا لفظ تو بظاہر اس امر کا قرینہ ہے کہ طلوع فجر کے بعد طواف کیا)

طواف زیارت کا آخری وقت ایام تشریق کے دوسرے روز کے غروب آفتاب تک ہے یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ انتہائی وقت یوم النحر کے غروب تک ہے سورہ برات کی آیت وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ کی تفسیر میں ہم نے بیان کر دیا ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف زیارت کا وقت صرف یوم النحر ہے حضرت ابن عمر کی مرفوع حدیث اسی مضمون کی ابوداؤد اور حاکم نے بیان کی ہے حضرت علی کا بھی یہی قول روایت میں آیا ہے۔ ابن جریج نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یوم الحج الاکبر منی کے تمام ایام ہیں (یعنی صرف یوم النحر ہی مراد نہیں ہے) سفیان ثوری کا بھی یہی قول ہے سفیان نے یہ بھی فرمایا کہ یوم بمعنی وقت اور مدت کے آتا ہے۔ جیسے یوم صفین یوم الجبل، یوم بعاث ان الفاظ میں یوم سے مراد پوری مدت ہے۔

مسئلہ:۔ طواف کی ایک شرط امام مالک امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ترتیب بھی ہے امام محمد کا بھی یہی قول ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک ترتیب شرط نہیں (یعنی فرض نہیں) اکثر حنفیہ کے خیال میں سنت ہے جس کا ترک مکروہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک ترتیب واجب ہے جس کے ترک سے قربانی واجب ہو جاتی ہے رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس ترتیب پر عمل کیا اور یہ بھی فرما دیا مجھ سے اپنے حج کے طریقے سیکھو اگر ترتیب کو شرط فرض کیا جائے گا تو کتاب پر زیادتی لازم آئے گی۔ ترتیب کی صورت یہ ہے کہ حجر اسود کے پاس پہنچ کر سامنے کو رخ کر کے طواف شروع کرے پورا حجر اسود دائیں ہاتھ کو ہو اور بیت اللہ بائیں ہاتھ کو اس کے برعکس کرنا ناجائز ہے۔

مسئلہ:۔ علماء کا اتفاق ہے کہ طواف مسجد کے اندر کرے مسجد کے گرداگرد نہ کرے یہی طریقہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے متواتر چلا آیا ہے اگر کوئی مسجد کے گرداگرد طواف کرے تو اس کو طواف بیت اللہ نہیں کہا جاتا طواف مسجد کہا جاتا ہے حرف و محاورہ کی یہی شہادت ہے پس مسجد کے اندر جا کر طواف کرے۔

فصل:۔ طواف میں سات چکر رکن ضروری ہیں۔ ہر زمانہ میں ایسا کیا جانا قابل شک شہرت رکھتا ہے مشہور مستفیض روایات میں بھی صراحت آئی ہے کہ چکروں کی تعداد نماز کی رکعتوں کی تعداد کی طرح ہے۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ وَلْيَطَّوَّفُوْا امر کا صیغہ ہے اور امر نہیں چاہتا کہ مامور بہ کا تکرار کیا جائے (بس ایک مرتبہ طواف کرنے سے تعمیل امر ہو جائے گی) بات یہ ہے کہ مفہوم امر نہ تکرار فعل کا مقتضی ہوتا ہے نہ نفی تکرار کا اور نقل متواتر سے تکرار ثابت ہے (اس لئے سات چکر لگانا مفہوم آیت کے خلاف نہیں ہو سکتا)۔

مسئلہ: اگر چار چکر لگائے اور تین چھوڑ دیئے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ طواف کافی ہو جائے گا لیکن طواف زیارت میں ایک قربانی اور دوسرے طوافوں میں کچھ صدقہ خیرات لازم ہوگی۔ اکثر کا حکم مثل کل کے ہوتا ہے اور نقصان طواف کا تدارک قربانی یا خیرات سے ہو جائے گا۔

دوسرے آئمہ کے نزدیک سات سے کم چکر لگانے سے طواف پورا نہ ہوگا۔ طواف میں چکروں کی تعداد اسی طرح ہے جس طرح نماز میں رکعتوں کی تعداد اگر ظہر عصر وغیرہ کی نماز میں ایک رکعت کی بھی کمی کی جائے تو پوری نماز نہیں ہوتی۔

مسئلہ:۔ حطیم، کعبہ کا ہی حصہ ہے طواف کے اندر اس کو داخل کر لیا جائے۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ دیوار کیا بیت اللہ کا حصہ فرمایا ہاں میں نے کہا پھر لوگوں نے اس کو بیت اللہ کے ساتھ شامل کیوں نہیں کر لیا فرمایا تیری قوم کے پاس خرچ کی کمی ہو گئی تھی (اس لئے یہ ٹکڑا باہر ہی رہ گیا) میں نے عرض کیا بیت اللہ کا دروازہ کیوں رکھا گیا۔ فرمایا ایسا اس لئے کیا تھا کہ جس کو چاہیں اندر آنے دیں نہ چاہیں نہ گھسنے دیں (یعنی کوئی زبردستی اندر نہ آسکے دروازہ زینہ کے اوپر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو روکا جا سکتا ہے) اگر تمہاری قوم کا دور جاہلیت ابھی حال ہی میں نہ گزرا ہوتا تو میں اس ٹکڑے

کو بیت اللہ کے اندر داخل کر دیتا اور دروازہ کو زمین سے ملا دیتا مگر مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے دلوں کو یہ بات پسند نہ ہو گی۔ متفق علیہ۔

ترمذی اور نسائی کی روایت میں حضرت عائشہ کا بیان اس طرح آیا ہے، میں کعبہ کے اندر نماز پڑھنا پسند کرتی تھی رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حجر (حطیم) میں داخل کر دیا اور فرمایا یہاں نماز پڑھ لو یہ بھی کعبہ کا ہی ایک ٹکڑا ہے ابو داؤد کی روایت بھی اسی طرح ہے۔

اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ حطیم، کعبہ کا ہی حصہ ہے اور (اس کی لمبائی فقہی) چھ گز سے کچھ زائد ہے۔ مسلم نے حضرت عائشہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تیری قوم کے شرک کا زمانہ قریب ہی نہ گزرا ہوتا (اور مجھے ان کی ناگواری کا اندیشہ نہ ہوتا) تو میں کعبہ کو ڈھا کر زمین سے ملا دیتا (پھر از سر نو تعمیر کراتا) اور اس کے دو دروازے مشرقی و مغربی رکھتا اور حجر کی چھ گز (زمین) اس میں واپس لے آتا۔ مسلم کی دوسری روایت میں تقریباً سات گز آیا ہے بخاری نے اپنی سند سے جریر بن حازم کی روایت یہی نقل کی ہے۔

یزید بن رومان کا بیان ہے میں موجود تھا جب کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے بیت اللہ کو ڈھا کر (دوبارہ) اس کی تعمیر کی تھی اور حجر کو اندر داخل کر لیا تھا۔ میں نے اساس ابراہیم میں اونٹ کے کوہان کے برابر پتھر دیکھے تھے جریر کا بیان ہے کہ میں نے اندازہ کیا تقریباً چھ گز حجر (کی زمین) تھی۔

مجاہد نے کہا حضرت ابن زبیر نے حجر کی طرف کی چھ گز زمین بیت اللہ میں شامل کر لی تھی۔ دوسری روایت میں ایک بالشت اور چھ گز کا لفظ آیا ہے۔

مسئلہ:- اگر کسی نے طواف میں حطیم کو باہر چھوڑ دیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا طواف ہو جائے گا البتہ ایک قربانی دینی ہو گی کیونکہ حطیم کا جزء بیت اللہ ہونا خبر آحاد سے ثابت ہے (اس لئے حطیم کو طواف کے اندر لے لینا واجب ہے اور ترک واجب کی تلافی قربانی سے ہو جائے گی۔ حطیم کو جزء بیت اللہ قطعی طور پر نہیں قرار دیا جا سکتا (اس لئے حطیم کا طواف فرض نہیں ہے) ورنہ کتاب اللہ پر خبر واحد سے زیادتی لازم آئے گی جو نا جائز ہے۔

جمہور کے نزدیک حطیم کے اندر طواف کافی نہ ہو گا خبر آحاد سے کتاب اللہ میں زیادتی جائز ہے۔

میں کہتا ہوں حطیم کو طواف کے اندر لے لینے کو فرض قرار دینا کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہے کیونکہ اللہ نے البیت العتیق کے طواف کا حکم دیا ہے اور البیت میں الف لام عہدی ہے یعنی البیت سے مراد وہ بیت ہے جو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا (اور عمارت ابراہیمی میں حطیم کعبہ میں شامل تھا) رفتار آیت بھی اسی پر دلالت کر رہی ہے اللہ نے فرمایا ہے وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اور جب ظنی دلیل سے حطیم کا جزء بیت اللہ ہونا ثابت ہے تو اگر طواف کے وقت حطیم کو باہر چھوڑ دیا تو طواف کامل ہونے میں بہر حال شک رہے گا اور طواف کامل فرض تھا اس لئے طواف کامل ادا نہ ہو گا۔

یا یوں کہا جائے کہ حضرت ابراہیم نے جو کعبہ بنایا تھا وہ کتنا تھا یہ بات مجمل ہے احادیث میں اس کا بیان آ گیا ہے۔

مسئلہ:- طواف زیارت کسی عذر کی وجہ سے سوار ہو کر باتفاق آئمہ جائز ہے اور عذر نہ ہو تو پیدل طواف زیارت کرنا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے جس نے بلا عذر سوار ہو کر طواف کیا تو جب تک مکہ میں ہو دوبارہ طواف کرنا ضروری ہے اگر دوبارہ طواف نہ کیا ہو تو قربانی واجب ہے۔

دوسرے ائمہ کے نزدیک پیادہ طواف کرنا سنت ہے واجب نہیں ہے حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ پر سوار ہونے کی حالت میں طواف کیا جب رکن کے قریب پہنچتے تھے تو جو چیز آپ کے ہاتھ میں ہوتی (عصا چھڑی وغیرہ) اس سے رکن کی طرف اشارہ کرتے تھے اور اللہ اکبر کہتے تھے (متفق علیہ) حضرت جابر کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (اونٹ پر سوار ہونے کی حالت میں) صفا و مروہ کے درمیان چکر لگایا تا کہ لوگ آپ کو دیکھیں آپ (ان کی نظروں میں) نمایاں

ہو جائیں اور لوگ آپ سے مسائل دریافت کریں۔ رواہ مسلم۔
حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر کعبہ کا طواف کیا تھا اور (ہر چکر میں) رکن کو بوسہ دیتے تھے۔ آپ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ رکن سے کترا جائیں۔
حنفیہ کہتے ہیں حضور ﷺ نے ایسا بیماری کی وجہ سے کیا تھا کیونکہ حضرت ابن عباس کی روایت ہے جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں آئے تو کچھ بیمار تھے اس لئے آپ نے اونٹ پر سوار ہونے کی حالت میں طواف کیا۔ جب رکن کے پاس پہنچتے تھے تو اپنی چھڑی سے رکن کو چھو لیتے تھے، طواف سے فارغ ہو گئے تو اونٹ کو بٹھایا اور دو رکعتیں پڑھیں۔ رواہ ابوداؤد۔
آئمہ کی طرف سے حنفیہ کو یہ جواب دیا گیا ہے کہ صرف یہ احتمال کہ حضور اس وقت کچھ بیمار تھے ثبوت مدعی کے لئے کافی نہیں۔ رہی ابوداؤد کی روایت تو وہ ضعیف ہے اس کی سند میں ایک راوی یزید بن زیاد ہے جو قوی نہیں ہے اس کی روایت کردہ حدیث قابل استدلال نہیں۔ امام شافعی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور فرمایا میں نہیں جانتا کہ اس حج میں رسول اللہ ﷺ کچھ دکھی تھے (یا نہیں)
میں کہتا ہوں اگر مکہ میں تشریف لانے کے وقت حضور ﷺ کچھ بیمار ہوتے تو بیماری کی وجہ سے طواف قدوم بھی پیدل نہ کر سکتے۔ حالانکہ حضرت جابر وغیرہ کی صحیح روایت ہے کہ حضور ﷺ نے طواف قدوم اس طرح کیا کہ تین چکر تو تیزی سے کئے اور چار چکر معمولی پیدل رفتار سے۔ یہ بھی حضرت جابر کی صحیح روایت ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان حضور نے سعی کی اور رفتار کی شدت کی وجہ سے آپ اپنے بٹن گھما رہے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوار ہونے کی حالت میں طواف زیارت (کسی بیماری کی وجہ سے نہ تھا بلکہ) جواز کو ظاہر کرنے کے لئے اور لوگوں کو آداب حج سکھانے کے لئے تھا۔
طواف نافلہ سوار ہو کر بلا کراہیت جمہور کے نزدیک جائز ہے لیکن امام ابو حنیفہ کے ضابطہ کے لحاظ سے مکروہ ہے۔ جمہور کی دلیل بخاری کی وہ روایت ہے جو سورۃ الفتح کی تفسیر میں ہم نے بیان کی ہے کہ جب حضور ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو طواف قدوم اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں کیا۔
مسئلہ:۔ بغیر وقفہ کے مسلسل طواف باجماع علماء شرط (فرض) نہیں ہے سنت ہے سعید بن منصور راوی ہیں کہ حضرت ابن عمر بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے اتنے میں نماز کی اقامت ہوئی۔ آپ نے جماعت کے ساتھ پڑھ لی، نماز سے فارغ ہو کر پھر طواف کا باقی حصہ پورا کیا۔ عبدالرزاق اور عبدالرحمٰن بن ابوبکر کی روایت سے بھی یہ واقعہ منقول ہے سعید بن منصور کا بیان ہے کہ عطا کہتے تھے اگر کوئی شخص طواف کا کچھ حصہ کر چکا ہو پھر کوئی جنازہ آجائے اور یہ شخص طواف ناتمام چھوڑ کر جنازہ کی نماز میں جا کر شرکت کر لے تو نماز سے فارغ ہو کر اس کو اپنا بقیہ طواف پورا کر لینا چاہئے (از سر نو طواف شروع کرنے کی ضرورت نہیں)۔
نافع نے کہا طواف کی حالت میں طول قیام بدعت ہے۔ حسن نے کہا اگر کوئی شخص طواف میں مشغول ہو اور نماز کی اقامت ہو جائے اور وہ بیچ میں سے طواف کو چھوڑ کر نماز میں شریک ہو جائے تو نماز کے بعد اس کو از سر نو (پورا) طواف کرنا چاہئے۔
مسئلہ:۔ فرض طواف کو بیچ میں سے منقطع کرنا خواہ فرض نماز کی اقامت ہو گئی ہو مکروہ ہے۔ حضرت ام سلمہ کی روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے طواف صدر کیا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔
مسئلہ:۔ اگر فرض نماز کی اقامت ہو جائے یا جنازہ کی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو نفل طواف کو قطع کر دے نفل عبادت کے لئے نفل طواف کو منقطع کرنا جائز نہیں۔
وتر کی شرکت کے لئے نفل طواف کو منقطع کر دینا اولیٰ ہے حضرت عبدالرحمٰن بن حضرت ابوبکر صدیق کا اثر اس کا مؤید ہے۔

مسئلہ :۔ ہر سات چکروں کے بعد دو رکعت نماز پڑھنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے امام مالک کا بھی یہی قول روایت میں آیا ہے ایک قول امام شافعی کا بھی یہی ہے۔ اگر طواف کے بعد دو رکعتیں ترک کردیں تو قربانی واجب ہو گی۔ مسئلہ کی تمام شاخیں اور متعلقات کا ذکر ہم نے آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى کی تفسیر کے ذیل میں کر دیا ہے۔

فصل

آداب طواف یعنی مستحبات کا بیان

جب کعبہ پر نظر پڑے اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ پڑھے۔ اور دعا کرے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ کعبہ کو دیکھنے پر دعا کرنا مستحب ہے اگر حجر اسود کے پاس پہنچے تو دونوں ہونٹوں سے چومے بشرطیکہ دوسروں کو تکلیف پہنچائے بغیر ممکن ہو۔ بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر حجر اسود کو چھوتے اور چومتے تھے۔ شافعی کی مرفوع روایت ہے کہ آپ دیر تک دونوں لب حجر اسود پر رکھے رہے۔ ابن ماجہ کی روایت میں ہے دیر تک دونوں لب حجر اسود پر رکھے روتے رہے، حاکم کی روایت ہے آپ نے اسود کو چوما اور اس پر سجدہ کیا۔

اگر چومنے اور ہاتھ سے چھونے پر قادر نہ ہو تو کسی چیز سے چھولے پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا اور اپنی چھڑی سے رکن کو چھوا۔ اگر اتنا بھی ممکن نہ ہو تو حجر اسود کی طرف منہ کر کے رک جائے۔

سعید بن مسیب کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم قوی آدمی ہو، حجر اسود پر درانہ مت جانا (دھکے نہ دینا) کہ کمزور کو دکھ پہنچاؤ اگر جگہ خالی ہو تو چھو لینا ورنہ اس کی طرف منہ کر کے تکبیر و تہلیل کرنا۔ رواہ احمد۔

مسئلہ :۔ رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اسے چھولے، جمہور کا یہی قول ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک رکن یمانی کو چھونا مستحب ہے، سنت نہیں ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر کا قول آیا ہے، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ان دونوں کو یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کو چھو رہے تھے (یا چوم رہے تھے) دار قطنی نے مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ حضور ﷺ رکن یمانی کو بوسہ دے رہے تھے اور اس پر اپنا رخسار رکھ رہے تھے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے موکل ہیں جب کوئی شخص (وہاں) کہتا ہے۔ اللّٰھم انی اسئلک العفوو العافیة فی الدنیا والاخرة ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار۔ تو وہ مؤکل آمین کہتے ہیں۔

مسئلہ :۔ طواف قدوم میں پہلے تین چکر لپک کر کرے (تیز رفتار سے کرے) اور چادر کا ایک پلو دائیں بغل میں نیچے سے سینہ پر لا کر بائیں کندھے پر ڈالے رکھے (اس طرح دایاں مونڈھا کھلا رہے گا) چکر کو سنگ اسود سے شروع کر کے (گھوم کر) سنگ اسود پر ہی ختم کرنا سنت ہے صحیح روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سنگ اسود سے سنگ اسود تک تیز چال سے تین چکر لگائے۔ باقی چار چکروں میں معمولی رفتار رکھے اور جب حجر اسود اور رکن کے پاس پہنچے تو وہی کرے جو پہلے چکر میں کیا تھا۔ آخر طواف کو سنگ اسود کو چھو کر یا چوم کو ختم کرے رسول اللہ ﷺ کا عمل صحیح روایت میں یہی منقول ہے۔

پھر دوگانہ مقام ابراہیم کے پاس ادا کرے اور دو رکعتوں میں قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے پھر لوٹے حجر اسود کو چومے اور تکبیر و تہلیل پڑھے۔ حضرت جابر کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نماز میں) مقام ابراہیم کو اپنے اور کعبہ کے درمیان رکھا تھا (یعنی نماز میں حضور ﷺ کا رخ دونوں کی طرف تھا) اور دو رکعتیں پڑھی تھیں جن میں قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی تھی پھر لوٹ کر حجر اسود کو چوما تھا۔

ذٰلِكَ ۚ یعنی حکم یہی ہے جو واجب التعمیل ہے۔ ذلک سے گزشتہ احکام کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اور جو شخص اللہ کے محترم احکام کی وقعت

کرے گا۔ سو یہ اس کے حق میں اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے۔

حُرُمٰتِ اللّٰہِ سے مراد ہیں ممنوعات الٰہیہ اور گناہ و نافرمانی۔ ممنوعات کی تعظیم کا یہ معنی ہے کہ ان کے قریب جانا بھی اس کے لئے سخت شاق اور ناگوار ہو۔ مومن سے جو قصور صادر ہو جاتا ہے اس کو وہ پہاڑ سمجھتا ہے جو اس کے سر پر ٹوٹا پڑ رہا ہو اور منافق گناہ کو ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کی طرح جانتا ہے کہ ذرا ہاتھ ہلایا اور اڑ گئی۔ حدیث میں مومن و منافق کے گناہ کی یہی تشبیہ آئی ہے۔

لیث نے کہا حُرُمٰتِ اللّٰہِ وہ امور ہیں جن کی پابندی لازم ہے یعنی تمام اوامر و نواہی حرمات الٰہیہ ہیں (یہ اللہ کی طرف سے بندشیں ہیں جن کی پابندی ضروری ہے)

زجاج نے کہا حرمت وہ چیز جس کو پورا پورا ادا کرنا واجب ہے اور کسی طرح کی اس میں کمی کرنا حرام ہے۔

بعض اہل علم نے کہا حرمت اللّٰہ سے مراد ہیں آداب حج۔ ابن زید نے کہا اس جگہ حرمت اللّٰہ سے مراد ہے بلد حرام (حرمت والا شہر یعنی مکہ) اور بیت حرام (حرمت والا گھر یعنی کعبہ) اور ماہ حرام (یعنی وہ مہینے جن میں لڑنا بھڑنا حرام ہے) اللہ کے نزدیک بہتر ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا ثواب اللہ کی طرف سے بڑا ہوگا۔

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ اور سوائے انکے جن کی (حرمت کی) بابت تم کو سنائی جا رہا ہے باقی چوپائے تم پر حلال کر دیئے گئے ہیں۔ یعنی پھر کیوں مختلف قسم کے بحاروں اور سانڈوں (بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حامی) کو حرام قرار دیتے ہو (اللہ نے تو یہ حرمت نازل نہیں کی)

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ پس بتوں کی گندگی سے بچے رہو یعنی بت گندہ ہیں ان (کی پرستش سے ان سے دعائیں کرنے سے اور ان کو پکارنے) سے پرہیز رکھو۔ عقلمند سلیم الطبع آدمی بتوں سے ایسا ہی اجتناب رکھتے ہیں جیسا عام آدمی گندگی سے اجتناب (پرہیز) کے لفظ سے بتوں کی عبادت و تعظیم سے پرزور ممانعت کا اظہار کیا گیا ہے (یعنی بتوں کی تعظیم اور پوجا اتنی گندی چیز ہے کہ اس کے پاس بھی نہ جانا چاہئے) بعض نے رجس کا ترجمہ رجز کیا ہے اور رجز کا معنی ہے عذاب چونکہ بتوں کی پرستش موجب عذاب ہے اس لئے (بطور مجاز) بتوں کو ہی عذاب فرما دیا۔

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰ اور جھوٹی بات کہنے سے پرہیز رکھو۔

زور کا لفظ زور سے مشتق ہے زور کا معنی ہے مڑ جانا۔ جھوٹی بات بھی حق سے منحرف ہوتی ہے جس طرح افک کا لفظ افک (پھیر دینا موڑ دینا) سے بنا ہے اور جھوٹی بات صداقت سے برگشتہ ہوتی ہی ہے۔ زور کا لفظ اگرچہ عام ہے ہر قسم کی جھوٹی بات اس میں شامل ہے لیکن اس جگہ کافروں کے مشرکانہ مقولے مراد میں مثلاً وہ کہتے تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ بت اللہ کے دربار میں ہماری سفارش کریں گے لبیک کہتے کے وقت کہتے تھے لبیک لاشریک لک الا شریکا تملکہ وماملک تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جس کا تو مالک ہے وہ (تیرا) مالک نہیں۔

امام احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، طبرانی اور ابن المنذر نے حضرت حزیم بن فاتک کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد کھڑے ہوگئے اور فرمایا جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر ہے یہ بات تین بار فرمائی پھر آیت فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ تلاوت فرمائی۔

قتادہ نے کہا دور شرک میں لوگ حج کرتے تھے لیکن ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کو روکتے تھے اور اپنے کو حنیف کہتے تھے یعنی دین ابراہیمی پر قائم۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ دین ابراہیمی پر قائم ہونا چاہتے ہو تو بت پرستی چھوڑ دو اس گندگی سے بچو اور جھوٹی بات کہنے سے اجتناب رکھو۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ اللہ کے لئے دین کو خالص رکھنے والے (دین میں کسی مخلوق یہاں تک کہ اپنی نفسانیت کو دخل نہ دینے

والے) حنیف کا لفظ حنف سے نکلا ہے حنف کا معنی ہے استقامت (قاموس) اور حق پر قائم رہنے اور استقامت رکھنے کا معنی ہی ہے۔ اللہ کے لئے عبادت کو خالص کر لینا اور دوسروں کی پرستش سے منہ موڑ لینا۔

غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۚ ساجھی قرار دینے والے نہ ہو اس کے ساتھ۔ نہ عبادت میں نہ واجب الوجود ہونے میں نہ الوہیت میں مقصد یہ ہے کہ شرک کرنے والا نہ حنیف ہو سکتا نہ ابراہیم کے دین پر۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ الخ اگرچہ جملہ خبریہ ہے لیکن حکم امر میں ہے یعنی حرمات اللہ کی تعظیم کرو اور بت پرستی سے پرہیز رکھو بت پرستی ممنوعات میں نمبر اول پر ہے اور شرک آفریں بات کہنا سب سے بڑا اور سخت ترین جھوٹ ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑتا ہے پھر پرندے اس کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں یا طوفان اس کو کسی دور جگہ لے جا کر پھینک دیتا ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت کمال رفعت ہے اس سے اعلیٰ اور بالا کوئی چیز نہیں ہے جیسے کوئی شخص آسمان پر چڑھا ہوا ہو اور سب سے اونچا دکھائی دیتا ہو اس سے اونچا بلکہ اس کے برابر کوئی اور نہ ہو لیکن جب اللہ کی عبادت کے ساتھ کسی مخلوق کی عبادت کو کوئی شریک کر دیتا ہے تو وہ کمال رفعت کی چوٹی سے نیچے گر پڑتا ہے جیسے آسمان پر چڑھا ہوا آدمی پستی کے غار میں گر پڑے اس سے زیادہ پستی اور کیا ہو گی کہ آدمی اپنی ہی جیسی مخلوق کو پوجا کرنے لگے۔ ایسا آدمی تو پتھروں سے بھی زیادہ ذلیل اور پست درجہ ہے۔

پرندوں کے اچک لے جانے میں استعارہ بالکنایہ ہے پرندوں سے مراد ہیں تباہ کن خواہشات نفس جو انسان کی یکسوئی اور اطمینان خاطر کو چھین لیتی ہیں اور خیالات کو پریشان کر دیتی ہیں۔ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ میں استعارہ بالکنایہ ہے ریح (طوفان باد) سے مراد ہے شیطان۔ شیطان ہی انسان کو پرلے درجہ کے گمراہی کے مقام پر جا پھینکتا ہے۔ مکان سے مراد ہے گمراہی کا مقام اور سَحِيْقٍ کا معنی ہے دور یعنی حق سے دور، مطلب یہ ہے کہ مشرک پر نفس اور شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور شیطان انسان کو (ایمان کی) بلندی سے (گمراہی کی) پستی میں پھینک دیتا ہے۔

لفظ او منع خلو کے لئے ہے منع جمع کے لئے نہیں ہے (یعنی یہ ممکن ہے کہ ہوائی طوفان اس کو کہیں دور جا پھینکے اور پرندے بھی اچک لیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہو)

بیضاوی نے لکھا ہے اس جگہ او کا لفظ تقسیم کے لئے ہے کیونکہ مشرک دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) کبھی شرک سے نہ نکلیں شرک چھوڑنا ان کے لئے ممکن نہ ہو گویا وہ ایسے ہیں کہ جن کو پرندے اچک لیں اور چیر پھاڑ کر برابر کر دیں۔ (۲) کبھی مشرک توبہ کر لیتے ہیں اور شرک سے رہائی ممکن ہوتی ہے وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے طوفان کسی کو دور پھینک دے ممکن ہے وہ نہ مرے اور صحیح سالم گھر لوٹ آئے۔

صحیح یہ ہے کہ یہ تشبیہ مرکب بمرکب ہے شرک کرنے والے کی حالت اس شخص کی حالت کی طرح ظاہر کی گئی ہے جو آسمان سے گر پڑے اور کسی تدبیر سے وہ اپنے کو بچا نہ سکے اس کا ہلاک ہونا یقینی ہے خواہ اس طرح ہو کہ پرندے راستہ میں اس کو اچک لیں یا کوئی طوفان اس کو کہیں دور لے جا کر ٹپک دے۔

حسن نے کہا کافروں کے اعمال کو آسمان سے گرنے والے کے حال سے تشبیہ دی ہے کفار کے اعمال بھی اکارت جائیں گے اور کوئی عمل سودمند نہ ہو گا (اور آسمان سے گرنے والے کی ہر بچاؤ کی تدبیر بھی اکارت جائے گی کسی طرح اس کو ہلاکت سے بچا نہ سکے گی)

سورت اعراف کی آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت براء بن عازب کی روایت کردہ طویل حدیث کا ہم نے کچھ حصہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کافر بندہ کے مرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ملائکہ اس کی روح کو چڑھا لے جاتے ہیں جب آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں اور (دروازہ) کھلوانے کی خواہش کرتے ہیں تو کافر کی

روح کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا پھر حضور نے آیت لاتفتح لهم ابواب السماء الخ تلاوت فرمائی (اور فرمایا) پھر اللہ حکم دیتا ہے کہ اس کی کتاب نچلی زمین کے اندر سجین میں لکھ لو حسب الحکم اس کی روح پھینک دی جاتی ہے اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت ومن یشرک باللہ فکانما خرمن السماء فتخطفه الطیر الخ تلاوت فرمائی۔

ذٰلِكَ ق　(حقیقت) یہی ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾　اور جو شخص دین خداوندی کی ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھتا ہے تو اس کا یہ لحاظ رکھنا دلوں کے اندر (بیٹھے ہوئے) خوف خدا کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا شعائر اللہ سے مراد وہ اونٹ اور قربانی کے جانور ہیں جو قربانی کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ لفظ اشعار سے ماخوذ ہے اشعار کا معنی نشانی بنا دینا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اور تعظیم شعائر سے مراد ہے قربانی کے جانوروں کو موٹا کرنا۔ صحیح روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سو اونٹوں کی قربانی کی تھی۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بختی اونٹنی کی قربانی کی جس کی قیمت خریداروں نے تین سو دینار لگائی تھی۔

فانها من تقوى القلوب کا یہ مطلب ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم پاک دل والوں کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى　تمہارے لئے ایک مقرر وقت تک ان میں منافع (حاصل کرنے جائز) ہیں۔ یعنی قربانی کے نامزد اونٹوں پر بغیر ایذاء پہنچائے سوار ہونا۔ بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا تمہارے لئے جائز ہے اور ذبح ہونے کے وقت تک یہ عمل جائز ہے۔ عطاء بن رباح امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد اور اسحاقؒ نے آیت کا یہی مطلب بیان کیا ان حضرات کا مسلک ہے کہ قربانی کے نامزد اونٹوں اونٹنیوں پر سوار ہونا۔ بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا بشرطیکہ اس عمل سے ان کو ایذا نہ پہنچے جائز ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ (خود پیدل چل رہا تھا اور) قربانی کے اونٹ کو ہنکا کر لے جا رہا تھا۔ فرمایا اس پر سوار ہو جا اس شخص نے عرض کیا حضور یہ قربانی کا اونٹ ہے فرمایا سوار ہو جا۔ اس نے پھر کہا یہ قربانی کا اونٹ ہے فرمایا اس پر سوار ہو جا۔ دوسری یا تیسری مرتبہ میں حضور ﷺ نے فرمایا۔ تیرا برا ہو۔ متفق علیہ۔

حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عمر نے ایک شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ کو ہنکا کر لے جا رہا تھا۔ فرمایا اس پر سوار ہو جا رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ طریقہ سے زیادہ سیدھے کسی طریقہ پر تو نہیں چل سکتا (یعنی دوسرا طریقہ نہ اختیار کر قربانی کے جانور پر سوار ہونا سنت کے موافق ہے) رواہ الطحاوی۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا بغیر خاص ضرورت کے قربانی کے جانوروں پر نہ سوار ہونا جائز ہے نہ ان پر بوجھ لادنا نہ ان کا دودھ پینا کیونکہ جب ان کو اللہ کے لئے خالص طور پر نامزد کر دیا تو وہ سارے کے سارے اللہ کے ہو گئے اپنے فائدے کے لئے ان میں کوئی تصرف کرنا درست نہیں۔ یہ توجیہ ثابت کر رہی ہے کہ ضرورت کی وجہ سے ہو یا بغیر ضرورت کے کسی طور پر قربانی کے جانوروں سے فائدہ اندوزی جائز نہیں۔ صریح آیت ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ سوار ہونا اور بوجھ لادنا تعظیم کے خلاف ہے اور اس سے جانور کی فربہی پر اثر پڑتا ہے لیکن احادیث میں چونکہ قربانی کے جانوروں پر سوار ہونا اور بوجھ لادنا جائز قرار دیا گیا ہے اس لئے ضرورت کے وقت ہم بھی اس کو جائز کہتے ہیں تاکہ عمل بالسنۃ ترک نہ ہو اور احادیث میں جس اجازت کا ذکر ہے اس کو ہم ضرورت پر محمول کرتے ہیں اس کی تائید طحاوی کی بیان کردہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو دو سندوں سے بحوالہ حمید الطویل حضرت انس کی روایت سے طحاوی نے ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو قربانی کا اونٹ ہنکا کر لے جاتے دیکھا اور وہ شخص خود تھک چکا تھا فرمایا اس پر سوار ہو جا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو قربانی کا اونٹ ہے فرمایا اس پر سوار ہو جا دوسری روایت میں ہے فرمایا اس پر سوار ہو جا اگرچہ قربانی کا اونٹ ہو۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عمر نے اس شخص سے جو قربانی کے اونٹ کو ہنکا کر لے جارہا تھا اور خود تھک گیا تھا، فرمایا تھا اس پر سوار ہو جا۔ باقی روایت حسب سابق ہے۔

مسلم کا بیان ہے ابو الزبیر نے کہا میں نے سنا کہ حضرت جابر بن عبداللہ سے قربانی کے اونٹ پر سوار ہونے کا مسئلہ پوچھا جارہا تھا حضرت جابر بن عبداللہ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جب تو اس کی سواری پر مجبور ہے تو اس پر دستور کے مطابق سوار ہو جا تاوقتیکہ تجھے دوسری سواری نہ ملے۔ آیت مذکورہ میں ہمارے نزدیک منافع سے مراد مجبور کن ضرورت کے وقت سوار ہونا ہے۔

مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کی تفسیر میں مجاہد قتادہ اور ضحاک نے فرمایا تمہارے لئے قربانی کے جانوروں سے فائدہ اندوزی کی اس وقت تک اجازت ہے جب تک تم ان کو قربانی کے لئے نامزد اور مقرر نہ کر دو۔ اور ان کو ہدی نہ بنا دو۔ جب نامزد کر کے ہدی بنا دو تو پھر فائدہ اندوزی کا کوئی حق نہیں۔

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ پھر ان کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے۔ محل (ظرف مکان) قربانی کی جگہ۔ یا (ظرف زمان) قربانی کا وقت اور مقررہ زمانہ۔ ثُمَّ کا لفظ تراخی کو چاہتا ہے تراخی سے مراد یا تو تاخیر وقت حقیقۃً ہے فائدہ اندوزی کا وقت بہر حال قربانی سے پہلے ہوتا ہے یا تاخیر ترتیبی مراد ہے۔ اس وقت منافع سے مراد دنیوی فوائد ہوں گے اور قربانی ثواب آخرت کے لئے کی جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے قربانی کے جانوروں سے فائدہ اندوزی کا جواز ایک وقت مقرر تک دنیا میں بھی ہے پھر ان کی قربانی کا ثواب آخرت میں ملے گا۔

البیت العتیق سے مراد سارا حرم ہے پورا حرم انسانی ملکیت سے آزاد ہے کوئی شخص حرم کی زمین کو نہ فروخت کر سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے گویا تمام حرم بیت اللہ کے حکم میں ہے۔ عرب بولتے ہیں بلغت البلد یعنی میں حوالی شہر تک پہنچ گیا (شہر کے اندر داخل ہونا ضروری نہیں)

بعض کے نزدیک یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قربانیوں کے ذبح ہونے کا مقام حرم کے کناروں سے بیت عتیق، کعبہ تک ہے۔ اس آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ سارا حرم قربان گاہ ہے حرم کے اندر ہر جگہ قربانی جائز ہے۔

امام مالک نے فرمایا حاجی صرف منیٰ میں ذبح کرے اور عمرہ کرنے والا صرف مروہ میں اس کے خلاف ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔ ہم کہتے ہیں اگر رسول اللہ ﷺ نے منیٰ میں قربانی کی تو اس سے باقی حرم میں قربانی کرنے کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی (کہیں تو رسول اللہ ﷺ قربانی کرتے کسی ایک جگہ قربانی کرنے سے دوسرے مقام پر ذبح کرنے کی ممانعت کیسے مستفاد ہو سکتی ہے) جب کہ کتاب اللہ اور سنت سے حرم کے اندر دوسری جگہ ذبح کرنے کا جواز موجود ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سارا منیٰ قربانگاہ ہے مکہ کے تمام پہاڑی راستے قربان گاہ ہیں کل عرفات اور سارا مزدلفہ موقف ہے (ٹھہرنے اور قیام کرنے کی جگہ ہے) رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ من حدیث جابر بن عبد اللہؓ۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد ہیں خصوصی دینی نشانات اور ظاہر ہے کہ خاص دینی نشانات کی تعظیم اہل تقویٰ کا ناقابل شک کردار ہے اس تفسیر پر لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ کا رابطہ آیت وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سے ہوگا اور اجل مسمی سے مراد ہوگی موت اور محلہا سے مراد ہوگی انتہاء اور البیت سے مراد ہوگا وہ مقام رفیع جہاں تک اعمال کی رسائی ہوتی ہے یا اعمال کا ثواب ہوتا ہے۔ مطلب اس طرح ہوگا چوپایوں میں تمہارے لئے دنیوی منافع ہیں اور وقت موت تک یہ منافع حاصل ہوتے رہتے ہیں پھر ان کی انتہا اور آخری رسائی اس مقام تک ہوتی ہے جہاں تک اعمال پہنچتے ہیں۔ یا اعمال کا ثواب ہوتا ہے۔

بعض کے نزدیک شعائر سے مراد ہیں حج کے فرائض اور حاضری کے خاص خاص مقامات جہاں دنیوی تجارتی منافع بھی وقت مقرر یعنی وقت واپسی اور مکہ سے روانگی تک حاصل ہوتے ہیں اور مناسک حج کو ادا کرنے کا ثواب بھی ایام حج ختم ہونے تک

حاصل ہوتا ہے ثم محلھا یعنی پھر احرام کھولنا، بیت عتیق یعنی کعبہ پر پہنچ کر قربانی کے دن طواف زیارت کرنے کے بعد ہوتا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا اور ہر امت کے لئے ہم نے ایک منسک بنایا ہے منسک عبادت گاہ (اسم ظرف ہے) اور اگر منسک کو مصدر قرار دیا جائے تو اس سے مراد ہوگا، خون بہانا، قربانیاں ذبح کرنا یا وہ قربانی مراد ہوگی جس کو بارگاہ خداوندی میں پیش کر کے لوگ قرب الٰہی کے طلب گار ہوتے ہیں۔

لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ تاکہ وہ (صرف) اللہ کا نام ہمارے دیئے ہوئے چوپایوں (کو ذبح کرنے) پر ذکر کریں، یعنی اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام نہ لیں اور قربانی خاص اللہ کے لئے کریں۔ یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ قربانیاں کرنے کا مقصد محض اللہ کی یاد ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا ذکر ضروری اور شرط لازم ہے (بغیر اللہ کا نام لئے ذبیحہ حلال نہیں ہوتا)

بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ پر اللہ کا نام ذکر کرنے سے مراد ہے ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا۔

چوپائے کلام نہیں کرتے اسی لئے ان کو بہیمہ کہا جاتا ہے (انعام اونٹ گائے بیل بھینس بکری دنبہ) کچھ چوپائے انعام کے علاوہ بھی ہوتے ہیں، گھوڑا، گدھا، خچر بہائم تو ہیں لیکن ان کو انعام نہیں کہا جاتا اسی لئے ان کی قربانی جائز نہیں بہیمہ کے بعد الانعام کا لفظ بڑھانے سے دوسرے بہائم (گھوڑا گدھا وغیرہ) خارج ہوگئے۔

انعام میں سے بھی صرف پالتو جانوروں کی قربانی درست ہے اسی پر اتفاق ائمہ ہے (جنگلی گائے یعنی نیل گائے، جنگلی بکری یعنی پہاڑی وغیرہ کی قربانی درست نہیں)

جملہ مذکورہ میں پچھلی قوموں اور امتوں کا تذکرہ کر کے امت اسلامیہ کو قربانی کرنے کی ترغیب دینی مقصود ہے۔

فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ پس تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے یعنی اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لئے ذبح کرنے کے وقت اسی کا نام لیا کرو۔

فَلَهُ أَسْلِمُوا پس صرف اسی کی اطاعت کرو مطلب یہ ہے کہ قربانی اور ذکر کو اسی کے لئے خالص کرو، کسی دوسرے کو اس کا ساجھی نہ بناؤ نہ قربانی کے وقت نہ کسی ذکر کے وقت۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ اور (اللہ کے سامنے) خشوع و خضوع کرنے والوں کو جنت اور مرضی رب کی خوشخبری دیدو۔

خبیت، حقیر چیز جو شخص خشوع کرے اور اللہ کے سامنے اپنے کو عاجز و حقیر قرار دے وہ مخبت ہے۔ اخبت عاجزی اور فروتنی کی (قاموس) اسی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت ابن عباس اور قتادہ نے ترجمہ کیا ہے عاجزی کرنے والے تواضع کرنے والے۔ اخفش نے ترجمہ کیا خشوع کرنے والے۔ بعض اہل لغت نے کہا کہ خبت نشیبی مقام کو کہتے ہیں اسی معنی کی رعایت سے مجاہد نے ترجمہ کیا اللہ کی یاد میں مگن مطمئن۔ نخعی نے ترجمہ کیا، اہل اخلاص، اطمینان اور اخلاص کا ایک ہی معنی ہے کلبی نے کہا نرم دل لوگ عمرو بن اوس نے کہا مخبتین وہ لوگ ہیں جو کسی پر ظلم نہیں کرتے اور ان پر ظلم کیا جائے تو انتقام نہیں لیتے۔

الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ مخبتین وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ یعنی جلال خداوندی کی شعاعیں ان کے دلوں پر پڑتی ہیں اور عظمت الٰہیہ کے انوار پر تو انداز ہوتے ہیں اس لئے ان کے دل ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں۔

وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

اور مصیبتوں پر (خاص طور پر) صبر کرنے والوں کو۔ اور پابندی اوقات اور شرائط کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں کو اور (ان کو جو) ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے (کچھ راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ اور قربانی کے جانوروں کو (خصوصیت کے ساتھ) ہم نے

تمہارے لئے اللہ کے دین کے خاص نشانات میں سے قرار دیا۔

البدن۔ بدنۃ کی جمع ہے جیسے خشب خشبۃ کی جزری نے نہایہ میں لکھا ہے بدنہ کا اطلاق اونٹ اونٹنی اور گائے بیل، بھینس پر ہوتا ہے اور اس کا زیادہ استعمال اونٹوں، اونٹنیوں کے لئے کیا جاتا ہے۔ بدن کی جسامت بڑی ہونے کی وجہ سے ان کو بدنہ کہا جاتا ہے۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے بدنۃ (بحرکت ثلاثہ) اونٹ اونٹنی اور گائے بھینس۔ امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ عطاء اور سدی نے کہا، اونٹ گائے بدن ہیں بکریوں کو بدنہ نہیں کہا جاتا، امام شافعی کے نزدیک بدن کا لفظ اونٹنی اور اونٹ کے لئے مخصوص ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کلانی جسم کی وجہ سے اس لفظ کا اطلاق اونٹوں پر ہوتا ہے۔ بدن بدلتہ وہ کلاں جسم ہو گیا۔ بغوی نے لکھا ہے بڑی جسامت اور ضخامت کی وجہ سے بدنہ کہا جاتا ہے۔ یعنی بدن سے مراد ہوتے ہیں بڑی جسامت والے اونٹ، جب آدمی خوب جسیم اور ضخیم ہو جائے تو بدن الرجل بدانتہ کہا جاتا ہے اور جو زیادہ عمر رسیدہ ہو جائے گوشت ڈھیلا پڑ جائے تو باب تفعیل سے بدن الرجل تبدینا کہا جاتا ہے۔

جو لوگ بدنہ کا لفظ صرف اونٹوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں انہوں نے حضرت جابر کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کے سال قربانی کی سات کی طرف سے ایک گائے اور سات ہی کی طرف سے ایک بدنہ (مراد یہ ہے کہ ایک ایک گائے کی قربانی میں سات سات آدمی برابر کے شریک ہو گئے اسی طرح ایک ایک اونٹ میں سات سات سہام کر لئے) رواہ الترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

ہم کہتے ہیں مسلم کی روایت میں حضرت جابر کا بیان اس طرح آیا ہے کہ ہم مکہ میں پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے ساتھ قربانی نہ ہو وہ احرام کھول دے اور حضور ﷺ نے ہم کو حکم دیا کہ اونٹ اور گائے میں ہم میں کے سات سات آدمی ایک ایک بدنہ میں شریک ہو جائیں (اس حدیث میں بدنہ کا اطلاق بقر پر بھی کیا گیا ہے)

شعائر اللّٰہ، اللہ کے دین کے خاص نشانات جو اللہ نے بطور شریعت مقرر کئے ہیں۔

بعض لوگوں نے شعائر کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ یہ لفظ اشعار سے بنایا گیا ہے اور اشعار کا مطلب ہے اونٹ کے کوہان میں نیزے کی نوک چبھونا تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ اونٹ قربانی کا ہے جو کعبہ کو جا رہا ہے۔

لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ　تمہارے لئے اس میں بھلائی ہے یعنی دینی اور دنیاوی فوائد ہیں۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا　پس ان پر اللہ کا نام ذکر کرو (یعنی ذبح کے وقت اللہ کا نام لو۔ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرو) مستدرک میں حاکم نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ اگر اونٹ ہو تو اس کو کھڑا کر کے کہے اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر اللھم منک ولک اس کے بعد بسم اللہ کہہ کے اونٹ کے گلے میں (ہنسلی کے پاس) زور سے نیزہ چبھو دے۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ اور مستدرک میں حاکم نے حضرت جابر کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ عَلٰى مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ، إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ اللّٰھم منک ولک بسم اللہ واللہ اکبر۔

صَوَآفَّ　صف بستہ صاحب قاموس نے لکھا ہے صواف بروزن فواعل بمعنی مفاعل (صواف صاف کی جمع ہے اور صاف اسم فاعل ہے لیکن بمعنی مصفوف ہے اسم فاعل اسم مفعول کے معنی میں آجاتا ہے) یعنی تین ٹانگوں پر کھڑا ہوا دو پچھلی اور اگلی دائیں ٹانگ زمین پر ٹکی ہوئی اور اگلی بائیں ٹانگ میں دھنکنا بندھا ہوا (تاکہ بھاگ نہ سکے) اسی حالت میں سینہ میں نیزہ مارے۔

بخاری کی روایت ہے کہ ایک شخص اونٹ کو بٹھا کر حلقوم میں نیزہ مار رہا تھا، حضرت ابن عمر ادھر سے گزرے اور یہ حالت دیکھ کر فرمایا اس کو کھڑے کر دے اور پاؤں باندھ دے۔ محمد ﷺ کا یہی طریقہ ہے۔ عبد بن حمید۔ ابن ابی الدنیا (فی الاضاحی) ابن المنذر۔ ابن ابی حاتم، حاکم اور سنن میں بیہقی نے ابوظبیان کا بیان نقل کیا ہے، ابوظبیان نے کہا میں نے حضرت ابن عباس سے آیت فاذکروا اسم اللّٰہ علیھا صوآف کی تشریح پوچھی فرمایا، جب تو اونٹ کی قربانی کرنی چاہے تو اونٹ کو تین ٹانگوں پر کھڑا کر اور ٹانگوں کو بندھا رکھ پھر کہہ بسم اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللھم منک ولک۔ بخاری نے تعلیقاً بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے صواف کا ترجمہ قیاما کیا۔ سفیان بن عینیہ نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن یزید کی روایت سے بھی یہی بیان کیا ہے اور سعید بن منصور نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔

مجاہد نے کہا صواف اس وقت کہا جائے گا جب اونٹوں کو تین ٹانگوں پر کھڑا کیا جائے اور بائیں پچھلی ٹانگ باندھ دی جائے۔ حضرت ابن مسعود کی قرائت میں صواف کی جگہ صوافن آیا ہے۔ صافن وہ گھوڑا یا اونٹ وغیرہ جس کو تین ٹانگوں پر کھڑا کیا جائے اور اگلی ایک ٹانگ باندھ دی جائے۔ مجاہد اور حسن نے حضرت ابی کی قرات کے مطابق صوافی پڑھا ہے، یعنی خالص لوجہ اللہ۔

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا پھر جب ان کے پہلو (زمین پر) گر پڑے یعنی وہ مر جائیں۔

فَكُلُوْا مِنْهَا تو اس میں سے تم کھالو۔ یہ امر اباحت ہے امر وجوب کے لئے نہیں ہے اپنی قربانی کے جانور کا گوشت کھانا جائز ہے۔ یہ مسئلہ اوپر گزر چکا ہے۔

وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ اور کھانے کو دو بے سوال اور سوالی محتاج کو۔

عکرمہ، قتادہ اور ابراہیم نخعی نے کہا قانع وہ شخص جو خانہ نشین ہو گیا ہو۔ سوال سے بچتا ہو، جو کچھ اس کو مل جائے اسی پر قناعت کرتا ہو۔ اور معتر وہ مسکین جو سوال کرتا اور مانگتا ہو۔ عوفی نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ قانع وہ شخص ہے جو کسی سے تعرض نہیں کرتا اور نہ کسی سے سوال کرتا ہے اور معتر وہ شخص جو دینے والوں کے سامنے تو آتا ہے اپنے آپ کو دکھاتا بھی ہے مگر مانگتا نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں قانع قناعت سے مشتق ہوگا۔ قنع قناعۃ اس نے قناعت کی جو کچھ اس کو دے دیا گیا اس پر راضی رہا سوال نہیں کیا۔ سعید بن جبیر، حسن۔ اور کلبی نے کہا قانع سوال کرنے والے مسکین کو کہتے ہیں اور معتر وہ شخص جو سوال نہ کرے صرف اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے اس غرض سے لائے کہ کوئی اس کو کچھ دے دے اس مطلب پر قانع کا مصدر قنوعا ہوگا۔ قنوع، سوال کرنا۔ ابن زید نے کہا قانع کا معنی ہے مسکین اور معتر وہ شخص جو مسکین تو نہ ہو مگر خود بے بضاعتی اور مال کی کمی کی وجہ سے قربانی بھی نہ کر سکا ہو اور لوگوں کے سامنے کچھ گوشت حاصل کرنے کے لئے اپنے کو نمایاں کر رہا ہو۔

كَذٰلِكَ اسی طرح یعنی جس طرح اونٹ کو کھڑا کر کے نحر کرنے کی ہم نے تم کو طاقت عطا کی اسی طرح۔

سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ (باوجود عظیم الجثہ اور طاقتور ہو کے) ہم نے ان کو تمہارے قابو میں دے دیا کہ تم ان کو تین ٹانگوں پر کھڑا کرتے ہو اور نحر کرتے ہو۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۳۶ تاکہ تم ہمارے انعامات کے شکر گزار ہو اور اخلاص کے ساتھ قربانی پیش کرو۔

ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن المنذر نے ابن جریج کا بیان نقل کیا ہے کہ دور جاہلیت میں لوگ قربانی کا خون کعبہ میں چھڑکتے اور گوشت (کے پارچے) وہاں بکھیرتے تھے جب اسلامی دور آیا تو صحابہ نے کہا ہم اس عمل کے زیادہ مستحق ہیں ہم بھی کعبہ میں خون کا چھڑکاؤ کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ ابن المنذر اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ قربانی کے بعد مشرک ذبیح کا خون کعبہ کے سامنے لے جاتے اور کعبہ کی طرف کو چھینٹیں مارتے تھے، مسلمانوں نے بھی یہی عمل کرنے کا ارادہ کیا تو آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ
اللہ کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا تمہارا تقوی پہنچتا ہے۔ مقاتل نے نہ پہنچنے کا مطلب یہ بیان کیا کہ اللہ قربانیوں کے گوشت اور خون کو اٹھا کر اپنے پاس نہیں لے جاتا بلکہ تمہارے اعمال صالحہ اللہ کے پاس پہنچتے ہیں۔ تقویٰ سے مراد ہیں نیک اعمال۔ جن کی بناء اخلاص و تقویٰ پر ہو۔ اور محض خوشنودی خدا حاصل کرنے کے لئے بغیر شرک کی آمیزش کے ان کو کیا گیا ہو۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ اسی طرح اللہ نے جو جانوروں کو تمہارے زیر حکم کر دیا تا کہ تم اللہ کی راہ میں ان کی قربانی کر کے اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تم کو قربانی کرنے کی توفیق دی۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ سے نعمت تسخیر کی دوبارہ یاد دہانی کی گئی ہے تا کہ آئندہ ذکر کی جانے والی غرض یعنی اللہ کی تعظیم اور اعتراف کبریائی کا اظہار کیا جائے۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ یعنی تم اللہ کی عظمت کا اعتراف کرو اور یقین کرو کہ جس بات سے دوسرے عاجز ہیں اللہ کو اس پر قدرت تامہ ہے اور اس کے شکر میں تم اللہ کو کبریائی و عظمت میں واحد جانو۔

عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اس بات پر اللہ کی کبریائی کا اعتراف کرو کہ اس نے اپنے دین کے نشانات اور آداب حج بتائے جانوروں کو تابع بنالینے کا راستہ دکھایا اور قرب خداوندی تک پہنچنے کے لئے رہنمائی کی۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک تکبیر سے مراد ہے احرام کھولنے اور ذبح کرنے کے وقت تکبیر کہنا۔

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ اور اخلاص والوں کو خوش خبری سنادو۔ اس کا عطف بشر المخبتین۔ پر ہے حضرت ابن عباس کے نزدیک محسنین سے مراد ہیں موحدین۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾
بلا شبہ اللہ ان مشرکوں کے غلبہ اور ایذا کو ایمان والوں سے عنقریب ہٹا دے گا، بے شک اللہ کسی دغاباز کفر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

پسند نہ کرنے سے مراد ہے نفرت کرنا۔ خوان یعنی امانت الٰہیہ میں بڑی خیانت کرنے والا کفور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والا۔

زجاج نے کہا جو شخص ذبح کے وقت اللہ کے سوا دوسرے کا نام لیتا ہے اور دوسرے کے نام پر قربانی کرتا ہے اور بھینٹ چڑھا کر بتوں کا تقرب حاصل کرتا ہے وہ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ہے۔ امام احمد ترمذی، سدی اور حاکم نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ جب ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ مکہ سے نکلے تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، ان لوگوں نے اپنے نبی کو وطن سے نکلنے پر مجبور کیا ہے یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ اب (لڑنے کی) ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر بہت ظلم کیا گیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو جہاد کرنے اور کافروں سے لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ مکہ کے مشرک، صحابہ کو بہت زیادہ ایذائیں دیتے تھے، صحابہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کسی کا سر پھٹا ہوتا کوئی زخمی ہوتا کوئی پٹ کر آتا سب لوگ حضور ﷺ سے شکایت کرتے کہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیا جارہا ہے، حضور ان کو تسلی دیتے اور فرماتے صبر رکھو ابھی مجھے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے اس کے بعد یہ آیت ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔

عبد الرزاق۔ عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن

مردویہ، اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ کچھ اوپر ستر آیات میں قتال کی ممانعت کے بعد اجازت قتال کی یہ سب سے پہلی آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر کی روایت سے اور عبد الرزاق و ابن المنذر نے زہری کی روایت سے بھی اس کو تخریج کیا ہے۔ بغوی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان خاص لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کو جانے کے خیال سے نکلے تھے اور کافران کے لئے سنگ راہ بن کر رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ اس آیت میں اللہ نے ان کو کافروں اور رکاوٹ پیدا کرنے والوں سے لڑنے کی اجازت دے دی۔

بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا یعنی کافروں نے چونکہ ان پر زیادتیاں کی ہیں اور ناحق ایذائیں پہنچائی ہیں اس لئے ان کو بھی لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ مظلومیت کو اس آیت میں اجازت قتال کی علت قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن کافروں میں ظلم کرنے کی قوت نہیں ان سے مسلمانوں کا لڑنا اور ان کو قتل کرنا بھی جائز نہیں پس حربی کافروں کی عورتوں کو قتل کرنا باتفاق ائمہ ناجائز ہے ہاں اگر وہ مسلمانوں کے خلاف مشورہ دینے میں مددگار ہوں یا مالدار ہوں اور اپنے مال سے کافروں کی مدد کر رہی ہوں تو ان سے بھی جہاد کرنا جائز ہے۔ اور ان کو قتل کرنا درست ہے۔

اسی طرح ناکارہ بوڑھی، سادھو، راہب، نابینا، اپاہج، لنگڑے، لولے کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ کا ایک قول اس کے خلاف آیا ہے ان لوگوں کو قتل نہ کرنے کا حکم اس وقت ہے جب مسلمانوں سے لڑنے کے مشوروں اور تدبیروں میں شریک نہ ہوں اور اپنی دماغی اسکیموں سے مسلمانوں کے خلاف کافروں کی مدد نہ کرتے ہوں ورنہ بالاتفاق ان کا قتل جائز ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک مرتد عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ قید رکھا جائے گا اور اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک وہ توبہ نہ کرلے یا قید ہی میں مر نہ جائے۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ارتداد کے حکم میں عورت مرد کی کوئی تفریق نہیں، دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ ہماری دلیل حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث ہے حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ رواہ الشیخان۔

حضرت رباح بن الربیع کا بیان ہے ہم ایک جہاد میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھے، حضور ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ کسی چیز پر جمع ہیں آپ نے ایک آدمی کو بھیجا جو دیکھ کر آئے کہ کس چیز پر سب لوگ جمع ہے اس نے آکر اطلاع دی ایک مقتول عورت ہے جس پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے فرمایا یہ تو قتال نہیں کرتی تھی (یعنی مسلمانوں سے لڑنے کی اہل نہ تھی پھر کیوں اس کو قتل کیا گیا)۔ ہراول دستے کے کمانڈر اس وقت حضرت خالد بن ولید تھے، آپ نے ایک آدمی بھیج کر ان کو کہلوا دیا کہ کسی عورت کو قتل نہ کرنا اور نہ کسی مزدور (قلی) کو۔ رواہ ابو داؤد۔ اس حدیث میں لفظ عسیف کا ترجمہ شیخ فانی بھی کیا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث میں لفظ امراۃ نکرہ ہے یعنی عام عورت کو خواہ کوئی ہو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اس میں کافرہ بھی شامل ہیں اور مرتدہ بھی۔ اس حدیث میں عورت کو قتل نہ کرنے کی علت یہ بتائی کہ وہ لڑتی نہیں (یعنی قتال وہ جنگ کی اہل نہیں) حنفیہ کہتے ہیں کسی عمل کی سزا و جزاء کا اصل مقام تو دار آخرت ہے، دنیا میدان عمل ہے اللہ نے فرمایا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں جبر نہیں، یہ دنیا امتحان کا مقام ہے نتیجہ کی جگہ نہیں اب جو کچھ بعض اعمال کی حدود اور سزائیں اس زندگی میں دی جانے کے ضوابط مقرر کردیئے، مثلاً قصاص، چوری، شراب خواری، زنا تہمت زنا وغیرہ کی سزائیں سو ان میں ہمارے ہی فائدہ مضمر ہیں اور ہماری ہی مصالح کا ان سے تعلق ہے جان، مال، آبرو، نسب اور عقل کی حفاظت مقصود ہے۔ مرتد کو قتل کرنے کا وجوب اسی وقت ہوگا جب اس کی جنگ شرارت اور قتال سے مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہو، یہ قتل اس کے کافر ہونے کی سزا نہیں کفر کی سزا تو بہت بڑی ہے جو آخرت میں ملے گی۔ پس جو صنف قتال کی اہل ہے۔ یعنی مرد اگر مرتد ہو جائے تو اس کے شر سے بچنے کے لئے اس کو قتل کرنا ضروری ہو جائے گا اور جو صنف قتال کی اہل نہیں یعنی عورت، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ اصلی کافر

ہو یا مرتدہ۔ اسی لئے حربی کافروں کی عورتوں کو قتل کرنے سے حضور ﷺ نے ممانعت فرمادی۔ اگر کافر کا قتل کفر کی سزا ہوتی تو قتل کے بعد اس کا کفر سے پاک ہو جانا ضروری ہو جائے گا جیسے قصاص کے بعد قاتل کی تطہیر ہو جاتی ہے۔ پس مقتول کافر کو آخرت میں نجات یافتہ ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے۔

مرتد عورت کے قتل کو واجب قرار دینے والے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو (مسلمان) اپنا مذہب بدل دے اس کو قتل کر دو۔ رواہ البخاری من حدیث ابن عباس۔ طبرانی نے معجم کبیر میں بروایت بہز بن حکیم اور الاوسط میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی اس مضمون کی حدیثیں بیان کی ہیں۔ ان احادیث میں ہر مرتد کو قتل کر دینے کا حکم ہے خواہ مرد ہو یا عورت لفظ عام ہے۔

حنفیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مرتد کو قتل کر دینے کا حکم مخصوص البعض ہے دوسری احادیث میں عورتوں کو اس حکم سے الگ کر دیا گیا ہے اس لئے مرتد سے مراد مرتد مرد ہو گا۔ اگر عموم ہی مراد ہو تو پھر لازم آئے گا کہ جو کافر کفر کو چھوڑ کر مسلمان ہو جائے یا یہودیت چھوڑ کر عیسائی بن جائے اس کو بھی قتل کر دینے کا حکم ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ من بدل دینہ کا لفظ اپنے عموم پر نہیں ہے، دوسری احادیث اس کی مخصص ہیں۔

میں کہتا ہوں مذکورہ الفاظ کے ساتھ حدیث مذکور کا جواب تو حنفیہ نے دے دیا لیکن حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ جو شخص مسلمانوں میں سے اپنا مذہب بدل دے اس کو قتل کر دو۔ اس روایت میں تبدیل دین کرنے والے مسلمان کو واجب القتل قرار دیا ہے اس لئے کفر چھوڑ کر مسلمان ہونے والوں یا دوسرے مذاہب کا باہم تبادلہ کرنے والوں پر حدیث کا حکم لاگو ہی نہیں ہوتا۔

حافظ ابن حجر نے کہا حکم کی روایت کردہ حدیث کے سلسلہ میں ایک راوی حفص بن عمر عدنی واقع ہے جو مختلف فیہ ہے (کچھ علماء نے اس کو مجروح کہا ہے)۔

قتل مرتدہ کے جواز کے قائل کہتے ہیں کہ حضرت جابر کی روایت سے منقول ہے کہ ایک عورت جس کو ام مروان کہا جاتا تھا مرتد ہو گئی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اگر توبہ کر لے تو خیر ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ دار قطنی نے اس کو دو طریقوں سے روایت کیا ہے ایک طریق میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اس عورت نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا، اس لئے اس کو قتل کر دیا گیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا روایت کے دونوں طریق ضعیف ہیں۔ ابن ہمام نے لکھا اول روایت عمر بن رواحہ کی وجہ سے کمزور ہے اور دوسری روایت عبد اللہ بن اذینہ کی وجہ سے۔ ابن حبان نے کہا اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ احد کے دن ایک عورت اسلام سے پھر گئی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اس سے توبہ کرائی جائے اگر انکار کرے تو قتل کر دی جائے۔ اس حدیث کی سند میں محمد بن عبد الملک واقع ہے جس کو علماء نے واضع الحدیث کہا ہے پھر مذکورہ احادیث ان دوسری احادیث کے بھی خلاف ہیں جو دوسرے طریقوں سے مروی ہیں۔ دار قطنی نے بروایت ابن عباس تخریج کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر عورت مرتد ہو جائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ اس حدیث کی سند میں عبد اللہ بن علیس جزری ہے جس کو دار قطنی نے کذاب واضع الحدیث کہا ہے۔

ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے تخریج کی ہے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت مرتد ہو گئی مگر حضور ﷺ نے اس کو قتل نہیں کرایا، یہ روایت حفص بن سلیمان راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

طبرانی نے معجم میں حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ان کو یعنی (حضرت معاذ کو) جب رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف (گورنر بنا کر) بھیجا تو فرمایا، جو مرد اسلام سے پھر جائے اس کو پھر اسلام کی طرف بلانا، اگر وہ توبہ کر لے تو توبہ قبول کر لینا، اگر توبہ نہ کرے تو گردن مار دینا اور جو عورت اسلام سے پھر جائے تو اس کو اسلام کی دعوت دینا اور اگر توبہ کر لے تو

قبول کر لینا اور انکار کرے تو اس کو اس کے حال پر قائم رکھنا۔

امام ابو یوسف نے بروایت امام ابو حنیفہ از عاصم بن ابی النجود از ابو رزین بیان کیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اگر عورتیں مرتد ہو جائیں تو ان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ قید کر دیا جائے اور اسلام کی دعوت دی جائے اور مسلمان ہونے پر مجبور کیا جائے (یعنی اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں جبر کرنے کا مطلب مارنا پیٹنا اور آب و دانہ بند کر دینا نہیں) بلاغات محمد میں بھی حضرت ابن عباس کی روایت سے ایسا ہی آیا ہے۔

عبد الرزاق نے بیان کیا ہے کہ ایک عورت عیسائی ہو گئی، حضرت عمر نے حکم دیا اس کو ایسی جگہ لے جا کر فروخت کر دو۔ جہاں اس پر محنت و مشقت کرنے کا بار پڑے ایسی جگہ فروخت نہ کرنا جہاں اس کے ہم مذہب لوگوں کی آبادی ہو، چنانچہ دومۃ الجندل میں لے جا کر اس کو فروخت کر دیا گیا) غالباً یہ عورت باندی ہو گی کیونکہ حرہ کی بیع تو صحیح نہیں ہے)۔

دار قطنی نے حضرت علی کا قول بیان کیا ہے کہ (مرتد) عورت سے توبہ کرائی جائے قتل نہ کی جائے۔ اس سند میں ایک شخص جلاس ہے جس کی وجہ سے یہ سند کمزور ہو گئی۔

مسئلہ: اگر کسی حربی کی عورت کو امام قتل کر دینے کا حکم دے دے تو عورت اصلی کافرہ ہو یا مرتدہ بہر حال امام کی مصلحت کے پیش نظر ایسا حکم جائز ہے۔ سورۃ الفتح کی تفسیر میں ہم نے لکھ دیا ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے مقرر کردہ مسلمان سرداروں کو حکم دے دیا تھا کہ جب مکہ میں داخل ہو تو سوائے اس شخص کے جو تم سے جنگ کرے اور کسی کو قتل نہ کرنا لیکن چند آدمیوں کے نام لے کر فرما دیا تھا کہ ان کو ضرور قتل کر دینا خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے نیچے ہوں۔ ہم نے تفسیر سورۃ کے موقع پر ان کے نام بھی ذکر کر دیئے ہیں ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں (جن کو قتل کرنے کی ہدایت فرما دی تھی) عبد اللہ بن احظل کی دو گائیکہ باندیاں، قرینہ اور قرنہ۔ چنانچہ قرینہ تو قتل کر دی گئی اور قرنہ مسلمان ہو گئی۔ یہ دونوں عورتیں پہلے مرتد ہو چکی تھیں ایک عورت عمر بن ہاشم کی آزاد کردہ باندی تھی اور ابو سفیا کی بیوی ہندہ بھی۔ یہ دونوں اصلی کافر تھیں اور فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گئیں۔ واللہ اعلم۔

وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ اور بلا شبہ قطعاً اللہ ان کو فتحیاب کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ پہلے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم کافروں کی طرف سے ایذاؤں کو دور کر دیں گے اس آیت میں فتحیاب کرنے کا وعدہ ہے۔

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم (ان لوگوں کے لئے اجازت جہاد دی گئی) جن کو ان کے گھروں سے نکال باہر کر دیا گیا۔ یعنی مکہ والے گھروں سے نکال دیا گیا۔

بِغَيْرِ حَقٍّ ناحق۔ (محض ظلم سے جلاوطن کیا گیا)

إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ (جلاوطن کرنے کا ان کو کوئی حق نہ تھا) سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کو رب کہنا کوئی جرم نہیں کہ جس کی پاداش میں ان کو جلاوطن کیا جاتا مگر کافروں کے خیال میں تو یہ بہت بڑا جرم تھا۔ آیت ربنا اللہ کہنے کو کافروں کے خیال کے بموجب جرم قرار دیا ہے۔ آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ کافروں کو کوئی حق نہ تھا کہ مسلمانوں کو جلاوطن کرتے اگر ان کے خیال میں کوئی جرم تھا تو ایسا جرم تھا کہ اس کا جرم نہ ہونا ظاہر ہے۔ عرب کہتے ہیں فلاں شخص میں کوئی بھلائی نہیں اگر کوئی بھلائی ہے تو یہ ہے کہ وہ محسن کش ہے جو اس کے ساتھ بھلائی کرتا وہ اس کے عوض برائی کرتا ہے۔ گویا یہ دعویٰ مع دلیل ہے کافروں نے جلاوطن کیا اس حق کی بناء پر کہ مسلمان اللہ کو اپنا رب کہتے ہیں اور واقع میں یہ خوبی ہے برائی نہیں اس سے کافروں کو مسلمانوں کے گھر چھین لینے اور جلاوطن کرنے کا حق نہیں پیدا ہو جاتا معلوم ہوا کہ ظلماً جلاوطن کیا۔ یہی بلیغ اسلوب بیان آیت وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا تو ہم سے انتقام نہیں لیتا مگر اس بات کا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں میں ہے ایک شاعر نے کہا۔

وبلدة ليس بها انيس　　الا اليعافير و الا العيس

اور شہر جس میں سوائے ہرنوں اور خاکی رنگ کے اونٹوں کے اور کوئی انیس نہیں ہے (اور ظاہر ہے کہ ہرنوں اور اونٹوں سے آدمی کی وحشت میں مزید اضافہ ہوتا ہے یہ چیزیں تو وحشت افزا ہیں انس آفریں نہیں)۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ الا ان یقولوا میں استثناء منقطع ہے اور الا بمعنی لکن کے ہے لیکن اس سبب سے ان کو نکالا گیا کہ وہ کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے۔ حالانکہ یہ بات حق ہے یایوں کہا جائے کہ مستثنیٰ منہ محذوف ہے یعنی کسی اور وجہ سے نہیں نکالا صرف ربنا اللہ کہنے کی وجہ سے نکالا، حالانکہ یہ بات حق ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ

ل اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا تو تارک الدنیا درویشوں کی خانقاہیں اور عیسائیوں کے گرجا اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ڈھادی جاتیں۔ یعنی اگر اللہ کافروں پر مسلمانوں کو اقتدار و تسلط نہ عطا کرے تو یہ سارے عبادت گھر تباہ کردیئے جائیں (ہر مذہب والا دوسرے مذہب والوں کے عبادت خانہ کو ڈھادے) مجاہد اور ضحاک نے کہا صوامع سے مراد ہیں تارک الدنیا درویشوں کے عبادت خانے، خانقاہیں۔ قتادہ نے کہا صابیوں کے عبادت گھر مراد ہیں۔ بیع بیعۃ کی جمع ہے۔ عیسائیوں کے گرجا۔ صلوت یہودیوں کی عبادت گاہیں۔ عبرانی زبان میں یہودیوں کے عبادت خانو کو صلوت کہا جاتا تھا مساجد سے مراد ہیں مسلمانوں کی مسجدیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا تو ہر نبی کے دور میں اس کی امت کی عبادت خانے ڈھادیئے جاتے۔ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں صابیوں کے عبادت گھر۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں عیسائیوں کے گرجے اور صابیوں کے عبادت خانے (اور یہودیوں کے عبادت گھر) اور عہد محمدی ﷺ میں مسجدیں۔

يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ط　　(وہ مسجدیں) جن کے اندر اللہ کا ذکر بہت کیا جاتا ہے۔ فیہا کی ضمیر یا مساجد کی طرف راجع ہے یا چاروں مذکورہ عبادت خانوں کی طرف۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط　　اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی (یعنی اس کے دین کی) مدد کرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۴۰﴾　　بے شک اللہ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے۔ یعنی ان کو فتحیاب کرنے کی قوت رکھتا ہے اور ایسا غالب ہے کہ اس کے غلبہ کو روکا نہیں جاسکتا۔ یہ سابق وعدہ کی تاکید ہے۔

اَلَّذِينَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

وہ کہ جب ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے باز داشت کریں گے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو جماؤ، قوت اور اقتدار عطا کرنے کا وعدہ ہے بظاہر یہ جملہ شرطیہ ہے لیکن واقع میں شرط بمعنی خبر ہے اور جملہ خبریہ ہے۔

آیت میں مومنوں کے جن اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف خلفاء راشدین ہی میں موجود تھے۔ گویا یہ دلیل ہے خلفاء راشدین کی خلافت راشدہ کی۔ دوسرے مہاجرین کو کامل اقتدار عطا نہیں کیا گیا اس لئے یہ سب مہاجرین مفہوم آیت کے مصداق نہ تھے اور معاویہ مہاجر ہی نہ تھے ان کے لئے بھی یہ بشارت نہیں ہوسکتی۔ یہ تفسیری مطلب اس وقت ہوگا جب الذین ان مکنھم الخ کو آخر جز کی صفت تقییدی مانا جائے۔ لیکن بعض اہل تفسیر نے کہا ہے کہ اَلَّذِينَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ الخ من ینصرہ سے بدل ہے۔ مطلب اس طرح ہوگا، اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اللہ کے دین کی مدد کریں گے یعنی ان لوگوں کی مدد کرے گا کہ اللہ جب ان کو اقتدار عطا کرے گا تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ دیں گے اور اس میں شک نہیں کہ اللہ نے اپنا

ل ثابت بن عرفجہ تابعی نے کہا مجھ سے عبداللہ اور علی کے ۲۷ ساتھیوں نے کہا کہ حضرت علی نے فرمایا لولا دفع اللّٰہ الناس الخ کا مطلب یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے ذریعہ اللہ دوسروں کو دفع کرنا چاہتا تو عبادت خانے ڈھادیئے جاتے۔ الخ یہ نصرت الٰہیہ کا وعدہ ہے۔

یہ وعدہ پورا کیا، خلفاء راشدین کی مدد کی عرب کے جباروں، عجم کے شہنشاہوں اور روم کے پرحیروت جراروں پر فتح عنایت فرمائی، کافروں کے ملک ان کو عطا فرمادیئے (یہ صلہ تھا اس بات کا کہ انہوں نے بھی اللہ کے دین کی مدد کی، نمازیں قائم کیں، قانون زکوٰۃ نافذ کیا۔ زکوٰۃ دی اور دلوائی خصوصاً حضرت ابوبکر نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف لشکر کشی کی اور کامیاب ہوئے اور ہر طرح کی برائی کی بیخ کنی بقوت ایمانی بتبلیغ لسانی اور بزور شمشیر کی)

وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ اور تمام امور کا نتیجہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ تمام امور کا رجوع اللہ کے فیصلہ کی طرف ہے۔ اس کلام میں وعدۂ سابقہ کی تاکید ہے۔ (کہ چونکہ ہر کام کا نتیجہ اللہ ہی کے دست قدرت میں ہے اس لئے وہ مہاجرین مذکور الصدر کو کامیاب ضرور فرمائے گا)۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ اور (اے محمد ﷺ یہ کفار مکہ) اگر آپ کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى تو (آپ رنجیدہ نہ ہوں غم نہ کریں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) اس سے پہلے بھی قوم نوح (نوح) کو اور قوم عاد (ہود) کو اور قوم ثمود (صالح) کو اور قوم ابراہیم (ابراہیمؑ) کو اور قوم لوط (لوط) کو اور مدین والے (شعیب) کو جھوٹا قرار دے چکے ہیں اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی جاچکی ہے۔ یہ سارا کلام اپنے اندر رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسکین رکھتا ہے۔ ہر پیغمبر کی تکذیب اس کی قوم نے جس کی ہدایت کے لئے اس کو بھیجا گیا تھی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی تکذیب بنی اسرائیل نے نہیں کی جو آپ کی قوم تھی۔ بلکہ قوم فرعون نے کی جو قبطی تھی اس لئے اسلوب عبارت بدل دیا گیا۔ تمام امتوں کے لئے کذبت (اقوام انبیاء نے انبیاء کی تکذیب کی) فرمایا اور حضرت موسیٰؑ کے ذکر میں کذب موسیٰؑ کی تکذیب کی گئی ہے فرمایا کس نے تکذیب کی اس کا ذکر نہیں کیا۔

یا یوں کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ کے معجزات بہت واضح تھے اس لئے آپ کے ان معجزات کی موجودگی میں تکذیب زیادہ قابل مذمت اور شنیع تھی، اسی لئے سب سے الگ حضرت موسیٰ کا ذکر کیا۔

فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ سو میں نے کافروں کو مہلت دی (کچھ مدت تک عذاب ٹالے رکھا) آخر ان کو دھر پکڑا تو میرا انکار کیسا ہوا (کیسا رنگ لایا) کہ نعمت کو تکلیف سے، آبادی کو بربادی سے اور زندگی کی ہلاکت سے بدل دیا۔ یہ استفہام سوال کے لئے نہیں اللہ کو سب کچھ معلوم ہے اس کو سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تعجب آفرینی یا ہولناکی کے اظہار یا بیان عذاب کو پختہ کرنے کے لئے ہے کہ عذاب برمحل نازل کیا گیا۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

اور بہت بستیوں کو ہم نے تباہ کر دیا کیونکہ وہ ظالم تھیں سو اب وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ بستیوں کو تباہ کر دیا، یعنی بستیوں والوں کو کیونکہ وہ لوگ ظالم تھے۔ (ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے جگہ رکھنا) انہوں نے بھی مشرکانہ پوجا کو اللہ کی عبادت کے قائم مقام بنالیا تھا اللہ کا انکار کرتے تھے اور بتوں کو مانتے تھے۔ فھی پس وہ یعنی ان کے مکانوں کی دیواریں چھتوں پر ڈھی پڑی ہیں یعنی پہلے چھتیں گریں پھر ان کے اوپر سے دیواریں آپڑیں۔ اس مطلب پر علی عروشھا کا تعلق خاویۃ سے ہوگا۔ اور خاویۃ کا مطلب ڈھنے والی یا گرنے والی۔ یا خاویۃ کا معنی ہے خالی، ویران۔ اس وقت علی عروشھا کا تعلق قائمۃ یا کائنۃ محذوف سے ہوگا، یعنی وہ بستیاں ویران پڑی ہیں اور اپنی چھتوں سمیت کھڑی ہیں (مکان ویران ہوگئے ان میں رہنے والا کوئی موجود نہیں چھتیں دیواروں پر قائم ہیں) یا یہ مطلب ہے کہ چھتیں گر گئیں اور دیواریں ان پر جھکی ہوئی ہیں ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔

وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ اور بہت سے کنوئیں (یعنی بہت سے کنوؤں والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا اور کنوئیں) بے کار پڑے رہ گئے کوئی ان سے پانی کھینچنے والا ہی نہیں رہا۔

وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اور بہت سے مضبوط محل ہم نے برباد کر دیئے۔ یعنی محلوں میں رہنے والوں کو تباہ کر دیا۔

قتادہ، ضحاک اور مقاتل نے مشید کا ترجمہ کیا اونچے، بلند۔ شاد بناہ اس کی عمارت کو اونچا کیا عربی محاورہ ہے۔ سعید بن جبیر عطاء اور مجاہد نے کہا شید کا معنی ہے چونہ، گچ، مصالحہ اس لئے مشید کا ترجمہ ہوا چونے اور گچ سے چنے ہوئے۔ (مضبوط)۔

بغوی نے لکھا ہے بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ اور قَصْرٍ مَّشِيْدٍ دونوں یمن میں تھے، قصر پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور کنواں دامن کوہ میں، ہر ایک کے مالک کچھ لوگ تھے۔ بڑے عیش و راحت میں غرق لیکن جب انہوں نے کفر کیا تو اللہ نے ان کو تباہ کر دیا۔ اور کنواں ویران ہو گیا۔

ابوروق نے ضحاک کے حوالے سے بیان کیا وہ کنواں حضر موت کے ایک شہر میں تھا۔ شہر کا نام حاصورا تھا۔ یہ شہر ان چار ہزار مومنوں نے آباد کیا تھا جو حضرت صالح کے ہم رکاب حضر موت میں آ گئے تھے اسی حضر موت میں حضرت صالح کی وفات ہو گئی اسی لئے اس بستی کو حضر موت کہنے لگے (یعنی حضرت صالح یہاں آئے اور یہیں مر گئے) آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے (ایک حصار فصیل قائم کر دی یعنی) حاصورا کی تعمیر کی اور کنویں پر مستقل قیام کر لیا۔ اور اپنے آدمیوں میں ایک شخص کو امیر اور حاکم بنا لیا مدت دراز تک رہتے رہے نسلیں بڑھیں اور آبادی وسیع ہو گئی۔ آخر کچھ لوگ بگڑ گئے اور بتوں کی پوجا کرنے لگے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے حنظلہ بن صفوان کو نبی بنا کر بھیجا۔ حضرت حنظلہ قلی تھے لوگوں کا بوجھ اٹھایا کرتے تھے، آپ نے نصیحت کی، قوم نے نصیحت نہ مانی، تکذیب کی اور بازار میں آپ کو قتل کر دیا، نتیجہ میں اللہ نے ان کو بھی تباہ کر دیا، ان کے محل ویران اور کنویں بے کار پڑے رہ گئے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ

سو کیا یہ (منکر) لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ ان سے سمجھنے لگتے اور ایسے کان ہو جاتے جن سے وہ سننے لگتے۔

افلم یسیروا کا عطف فعل محذوف پر ہے پورا کلام اس طرح ہو گا کیا یہ لوگ گھروں سے نہیں نکلے اور ملک میں گھومے پھرے نہیں۔

یعقلون بہا یعنی ایسے دل ہوتے جن سے وہ ان امور کو سمجھتے جن کو سمجھنا لازم ہے، یعنی ان کو بصیرت حاصل ہوتی جس سے اللہ کی توحید کامل کو سمجھتے۔

او اذان الخ یا ان کے کان ہوتے جن سے حق کی آواز سنتے۔ گویا ملک میں چلنے پھرنے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ توحید کو سمجھنے والی بصیرت حاصل ہوتی اور نداء حق سننے والے کان۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ وہ دل نابینا ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ یعنی ان کی آنکھیں بینائی سے محروم نہیں ہیں کہ اقوام ہالکہ کے فرسودہ آثار قدیمہ سفر کے دوران ان کو دکھائی نہ دیں مگر ان کی نظر عبرت اندوز نہیں ہے۔ آیات توحید کو دیکھتے ہیں اور توحید کا عقیدہ نہیں رکھتے دلائل حق کو سنتے ہیں مگر دماغ میں ان کو جگہ نہیں دیتے۔ وجہ یہ ہے آنکھیں بینا ہونے کے باوجود ان کے دل نابینا ہیں وہ فاقد البصر نہیں، فاقد البصیرت ہیں اور دل بھی وہ جو سینوں میں ہیں (یعنی دلوں سے مراد قوت مدرکہ نہیں بلکہ وہ دل مراد ہیں جو مرکز ایمان ہوتے ہیں جو نور توحید کو دیکھتے ہیں)

آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ حقیقی نابینائی آنکھ کا اندھا پن نہیں بلکہ کور بصیرت ہونا ہے۔

قتادہ نے کہا آنکھ کی بینائی مرئی تک پہنچنے اور فائدہ اٹھانے کا ایک ذریعہ ہے اور دل کی بینائی حقیقت میں فائدہ بخش بینائی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دل کا نابینا ہونا بدترین اندھا پن ہے (رواہ البیہقی فی الدلائل وابن عساکر عن عقبۃ بن

عامر الجہنی وابو النصر السجزی فی الابانۃ عن ابی الدرداء ورواہ الشافعیؒ عن ابن مسعودؓ موقوفا)۔
آیت میں دل کی نابینائی سے مراد ہے دل کے تمام آلات علم وشعور کا مفقود ہو جانا گویا یوں فرمایا ان کے دلوں کی آنکھیں نابینا اور کان بہرے ہوگئے ہیں۔ (یعنی نابینائی سے صرف نابینائی ہی مراد نہیں جو آنکھوں کا عارضہ ہے بلکہ گوش قلب کا بہرا ہو جانا بھی اس میں داخل ہے۔)

بیضاوی نے لکھا ہے جب آیت وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ۔ نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں دنیا میں نابینا ہوں تو آخرت میں بھی نابینا رہوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول (اسی سے ملتا جلتا) نقل کیا ہے۔ قتادہ نے فرمایا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن زائدہ یعنی ابن ام مکتوم کے حق میں نازل ہوئی۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ اور (جس عذاب کی ان کو وعید سنائی جارہی ہے اس) عذاب کا نزول یہ لوگ آپ سے جلد چاہتے ہیں۔ اس جملہ میں کافروں کے دلوں کے نابینا ہونے کا ایک طرح کا ثبوت پیش کیا گیا ہے جو شخص عذاب میں مبتلا ہو جانے کا فوری خواستگار ہو وہ دل کا اندھا ہی ہوگا۔

بغوی نے لکھا ہے یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی جس نے دعا کی تھی اے اللہ اگر یہ جو محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں تیری طرف سے حق ہے اور یہ سچے ہیں اور ہم کو اس سے انکار ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔

وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبر کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔ اللہ نے جس عذاب کی وعید ان کو دی ہے وہ لامحالہ آکر رہے گا خواہ کچھ مدت کے بعد آئے۔ اللہ فوری سزا نہیں دیتا اس کا حکم بہت بڑا ہے۔ چنانچہ یہ وعید عذاب بدر کے دن پوری ہوگئی۔ اس آیت سے بظاہر ثابت ہو رہا ہے کہ جس طرح ثواب کے وعدے کا پورا نہ ہونا محال ہے، اسی طرح عذاب کی وعید کے خلاف ہونا نا ممکن ہے۔ (لیکن کیا اس سے اللہ کی صفت مغفرت معدوم ہو جائے گی کیونکہ گناہوں پر وعید اور نیکیوں پر ثواب کا وعدہ جب پورا ہو کر رہے گا تو پھر گناہوں کی مغفرت کی کیا گنجائش باقی رہتی ہے) حقیقت یہ ہے کہ آیات عذاب بعبارت قرآن وحدیث وباجماع علماء ناقابل مغفرت فرقہ کے ساتھ مخصوص ہیں (یعنی مشرکوں پر عذاب ضرور آئے گا۔ جو شرک پر مر گیا ہو یا اللہ کے علم میں ہو کہ شرک پر مرے گا اس کا عذاب میں مبتلا ہونا یقینی ہے اس کو اللہ کی صفت مغفرت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، باقی دوسرے گناہ گار تو ان کو عذاب میں مبتلا کرنے کا کوئی قطعی وعدہ نہیں اس لئے ان کی مغفرت ممکن ہے (ان کی مغفرت سے وعید الٰہی کا کذب لازم نہیں آتا)۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (یعنی قیامت کا دن لمبائی میں) تم لوگوں کی گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ عطا کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کا معنی یہ بیان کیا کہ اللہ کے پاس کا ایک دن اور تمہارے ایک ہزار سال مہلت دینے میں برابر ہیں کیونکہ اللہ قادر ہے جب چاہے گا پکڑ لے گا کوئی چیز اس کے قبضہ سے باہر نہیں ہے تاخیر کی وجہ سے کوئی چیز !اللہ کی دست قدرت سے باہر نہیں سکتی۔ عذاب کو فوراً نازل کر دینا اور کچھ مدت مؤخر کر دینا دونوں باتیں اس کی قدرت کے لئے مساوی ہیں بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جس عذاب موعود کے یہ لوگ فوری طلب گار ہیں اس کا ایک دن شدت تکلیف اور طول میں انسانوں کی گنتی کے ہزار سال کے برابر ہے سچ ہے غم کے دن لمبے ہوتے ہیں اور خوشی کے دن چھوٹے۔ پھر ایسے عذاب کے یہ فور طلب گار کیوں ہیں جس کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔

بعض اہل علم نے کہا یہ اللہ کے حلم کی انتہاء کا اظہار ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا لیکن اس نے عذاب کو اس دن تک مؤخر کر رکھا ہے جو تمہارے ہزار سال کے برابر ہوگا (یعنی قیامت کا دن)۔ مجاہد و عکرمہ نے کہا ایام آخرت کا ایک دن تمہارے ہزار سال کے برابر ہوگا اس کی تائید حضرت ابو سعید خدری کی اس روایت سے ہوتی ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فقراء مہاجرین کے گروہ تم کو بشارت ہو کہ قیامت کے دن تم کو نور کامل حاصل ہوگا تم جنت کے اندر مالداروں سے آدھا دن پہلے داخل ہو گے اور تمہارے رب کا ایک دن تمہارے ہزار سال کے برابر ہوگا۔ رواہ احمد، ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کو حسن کہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جنت کے اندر فقراء دولت مندوں سے پانچ سو برس اور آدھا دن پہلے داخل ہوں گے۔ رواہ الترمذی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

اور بہت سی بستیوں والوں کو میں نے مہلت دی اور وہ (تمہاری طرح) بے جا حرکتیں کرنے والے (کافر) تھے پھر میں نے ان کو دھر پکڑا اور میرے ہی (حکم کی) طرف (ان کو) لوٹ کر آنا ہو یا لوٹ کر (سب کو) آنا ہے۔

اس آیت میں شہادت پیش کی گئی ہے اس امر کی کہ اللہ اپنی وعید عذاب کے خلاف نہیں کرتا اور تاخیر عذاب سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ عذاب آئندہ نہیں آئے گا تاخیر عذاب اللہ کا دستور حکم ہی ہے دیکھو بہت سی ظالم بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جن کو فوری عذاب میں مبتلا نہیں کیا گیا مہلت اور ڈھیل دی گئی اور آخر ان کو پکڑ لیا گیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ اے محمد ﷺ کفار مکہ سے آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف تم کو کھول کر اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ یعنی عذاب لے آنے پر قادر نہیں ہوں واضح الفاظ میں وعید عذاب سنانا میرا کام ہے۔

رسول اللہ ﷺ بشیر بھی تھے اور نذیر بھی پھر صرف نذیر ہونے کا کیوں حکم دیا گیا

مشرکین ہی عذاب آنے کی جلدی مچاتے تھے اور خطاب کا رخ انہی کی طرف تھا اہل ایمان کے ثواب کا ذکر تو کافروں کے غصہ کو اور بھڑکانے والا تھا اس لئے صرف نذیر کا ذکر کیا نذیر کے ساتھ بشیر نہیں فرمایا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بشارت سے تخویف مقدم ہوتی ہے بشارت تو صرف فرماں برداروں کے لئے ہوتی ہے اور تخویف دونوں فریقوں کے لئے عام ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جو پیام مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی اور میری مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے اپنی قوم کو آکر متنبہ کیا اور کہا میں نے اپنی آنکھوں سے دشمن کے لشکر کو پہاڑ کے اس طرف دیکھا ہے اور میں تمہارے لئے نذیر عریاں ہوں پس جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ اور (بھاگو بھاگو) کچھ لوگوں نے اطلاع دینے والے کی بات مان لی اور رات سے ہی چل دیئے اور فرصت کو غنیمت سمجھ کر روانہ ہو گئے اور بچ گئے اور کچھ لوگوں نے اس کے کہے کو سچ نہ جانا اور صبح تک وہ اپنی جگہ پر رہے نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دشمن کے لشکر نے ان پر حملہ کر دیا سب کو غارت کر دیا اور ان کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دی۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے میرا کہا مانا اور جو کچھ میں لایا ہوں اس پر چلے اور ان لوگوں کی جنہوں نے میرا کہنا نہ مانا اور جو حق میں لے آیا ہوں اس کی انہوں نے تکذیب کی۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾

پس جن لوگوں نے (میرے لائے ہوئے پیام کو) مان لیا اور نیک کام کئے (یعنی جن کاموں کا میں نے حکم دیا اس کی انہوں نے تعمیل کی) انہی کے لئے (گزشتہ گناہوں کی) معافی ہے اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام ان گناہوں کو ڈھا دیتا ہے جو پہلے کئے ہوئے ہوتے ہیں رواہ مسلم عن عمرو بن العاص۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

اور جو لوگ (رد کرنے کے لئے) ہماری آیات کے متعلق کوشش کرتے رہتے ہیں (پیغمبر اور اہل ایمان کو) ہرانے کے لئے ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں۔

معجزین یعنی عناد اور سخت مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ قتادہ نے یہ مطلب بیان کیا کہ وہ اپنے خیال میں ہمیں ہرانا چاہتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ نہ قیامت ہوگی نہ جنت و دوزخ۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے ہم ان پر قادر نہ ہو سکیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم پر غالب آجائیں اور ہماری گرفت سے باہر ہو جائیں۔

میں کہتا ہوں معجزین کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے رسول کو عاجز بنا دینا چاہتے ہیں، پیغمبر ﷺ تو ان کو دوزخ میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ جہنم میں (زور کر کے) گھسے جاتے ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ روشن کی جب آگ خوب روشن ہوگئی اور گردوپیش میں روشنی پھیل گئی تو پروانے اور یہ کیڑے مکوڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس میں گرنے لگے وہ شخص پتنگوں اور کیڑوں کو آگ میں گرنے سے روکتا رہا مگر پتنگے اس پر غالب آئے اور آگ میں گھسنے لگے میں بھی اسی طرح تم کو کمر پکڑ پکڑ کر دوزخ میں گھسنے سے روک رہا ہوں اور تم اس کے اندر گھسے پڑتے ہو۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ سے آپ کی قوم والوں نے رخ پھیر لیا اور کلام اللہ سے ان کا دور دور رہنا حضور کو شاق گزرا تو آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش اللہ کی طرف سے کوئی طریقہ ایسا پیدا ہو جاتا جس سے قوم والے آپ کے قریب آجاتے آپ کو قوم والوں کے مسلمان ہو جانے کی بڑی ہی رغبت تھی۔ چنانچہ ایک روز آپ قریش کے جلسہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۃ النجم نازل ہوئی آپ نے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنائی جب پڑھتے پڑھتے آیت اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچے تو شیطان نے وہ دلی خواہش جو آپ کے سینہ میں پیدا ہوتی رہتی تھی زبان سے نکلوادی اور (بے ارادہ) آپ کی زبان سے آیت مذکورہ کے بعد نکل گیا تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی قریش نے جو یہ الفاظ سنے تو بڑے خوش ہوئے اور رسول اللہ ﷺ اپنی تلاوت میں مستغرق رہے اور اس طرح سورۃ ختم کر لی تو آخر سورہ میں سجدہ کیا۔ آپ کے سجدہ کرنے کی وجہ سے تمام مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا اور کعبہ میں جو مشرک موجود تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ کوئی مسلمان یا مشرک بغیر سجدہ کئے نہیں رہا صرف ولید بن مغیرہ اور سعید بن عاص نے سجدہ نہیں کیا اور ایک ایک مٹھی کنکریاں اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالیں اور بولے ہمارے لئے یہی کافی ہے بات یہ تھی کہ یہ دونوں بہت بوڑھے تھے سجدہ کرنے کی ان میں طاقت نہ تھی اس کے بعد قریش منتشر ہو گئے اور اپنے معبودوں کا جو ذکر سنا تھا اس سے بڑے خوش تھے اور کہہ رہے تھے اب تو محمد ﷺ نے بھی ہمارے معبودوں کا ذکر اچھے الفاظ میں کر دیا، ہم کو اقرار ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ ہی زندگی اور موت دیتا ہے وہی پیدا کرتا اور رزق دیتا ہے لیکن ہمارے یہ معبود اللہ کے دربار میں ہماری سفارش کریں گے۔ اب جبکہ محمد ﷺ نے بھی ان کو ان کا حصہ دے دیا تو اب ہم محمد کے ساتھ ہیں۔

غرض شام ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیلؑ آئے اور کہا محمد ﷺ آپ نے یہ کیا کیا کہ جو کلام میں آپ کے پاس اللہ کی طرف سے لایا تھا، اس کے سوا دوسرے کلام کی لوگوں کے سامنے آپ نے تلاوت کی۔ حضور والا یہ بات سن کر بہت غمگین ہوئے اور آپ کو اللہ کی طرف سے عتاب کا بڑا ڈر لگا اس پر اللہ نے آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ الخ نازل ہوئی اس میں اللہ نے آپ کو تسلی عطا فرمائی ہے جو صحابی اس زمانہ میں حبش میں تھے ان کو جو اطلاع ملی کہ قریش نے بھی سجدہ کیا اور یہ بھی کہا گیا کہ قریش مسلمان ہو گئے تو ان میں سے اکثر لوگ اپنے اپنے قبائل میں واپسی کے ارادے سے چل دیئے اور بولے مکہ والوں سے ہمیں محبت ہے لیکن جب مکہ کے قریب پہنچے تو ان کو اطلاع ملی کہ اہل مکہ کے مسلمان ہونے کی جو خبر ان کو پہنچی تھی وہ غلط تھی چنانچہ یہ لوگ مکہ میں یا چھپ چھپا کر داخل ہوئے یا کسی کی پناہ لے کر۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ ۚ

اور (اے محمد!) آپ سے پہلے بھی ہم نے کوئی رسول اللہ ﷺ اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا مگر (اس کو قصہ ضرور پیش

آیا کہ) جب اس نے اللہ کا کچھ کلام پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں مداخلت ضرور کی۔
بغوی نے لکھا ہے رسول وہ ہوتا ہے جس کے سامنے رودررو ہو کر جبرئیلؑ آئے اور نبی وہ ہوتا ہے جس کی نبوت بصورت الہام یا بصورت خواب ہو۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ رسول وہ ہے جس کو نئی شریعت دے کر بھیجا گیا ہو اور نبی کا لفظ عام ہے۔ رسول بھی نبی ہوتا ہے اور وہ شخص نبی ہوتا ہے جس کو سابق شریعت کی دعوت دینے اور اس کی تائید کرنے کے لئے بھیجا گیا ہو جیسے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان اسرائیل انبیاء تھے اس قول پر ہر رسول کا تو نبی ہونا لازم ہے اور ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔
حضرت ابوذر کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے پہلا نبی کونسا ہوا۔ فرمایا، آدمؑ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آدم نبی بھی تھے فرمایا، ہاں ایسے نبی تھے، جن سے کلام کیا گیا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مرسل کتنے ہوئے فرمایا ایک بڑی جماعت تین سو اور کچھ اوپر دس۔
حضرت ابولامہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوذر نے بیان کیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ انبیاء کی پوری گنتی کتنی ہوئی۔ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، ایک بڑی جماعت، ان میں تین سو پندرہ۔ رسول ہوئے۔ رواہ احمد وابن راہویہ فی مسندیہما وابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی المستدرک۔
اِذَا تَمَنّٰی کا ترجمہ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے جب اس نے پسند کیا جب اس نے دلی خواہش کی۔ جب اس نے دل ہی دل میں ایسی بات کی جس کا علم اس کو نہیں دیا گیا تھا (تمنی کا صحیح ترجمہ قرء ہے جو ہم نے ترجمۂ آیت کے ذیل میں لکھ دیا ہے)۔
اَلْقَى الشَّيْطٰنُ سے مراد ہے وسوسہ ڈالنا۔ وسوسہ کا راستہ پالینا اور مراد نبی میں (کچھ) ڈال دینا کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جب اس نے قوم کے ایمان لانے کی تمنا کی ہو اور شیطان نے اس کی تمنا میں کوئی ایسی بات نہ ڈال دی ہو، جو اس کی قوم کے لئے دل پسند ہو۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ جب پیغمبر اپنے دل کے اندر اپنی غلط مرغوبات پیدا کر لیتا ہے تو شیطان اس کے دل پسند خیال میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو دنیا میں انہماک کا موجب ہوتی ہے۔
فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے خیال کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یعنی شیطان کے وسوسہ کو نابود کر دیتا ہے، زائل کر دیتا ہے، پیغمبر کو اس خیال کی طرف جھکنے سے محفوظ رکھتا ہے اور ایسا راستہ بتا دیتا ہے کہ شیطانی وسوسہ دور ہو جائے۔
ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ اس کے بعد اللہ اپنی آیات کو (اور) مضبوط کر دیتا ہے۔ یعنی ایسی آیات کو محکم کر دیتا ہے جو امر آخرت میں پیغمبر کے استغراق کا موجب ہوتی ہیں (دنیوی خیال بالکل زائل کر دیتا ہے) اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ تمنی کا معنی ہے پڑھا اور امنیۃ کا معنی ہے قرات یعنی پیغمبر نے جب اللہ کی کتاب پڑھی تو شیطان نے اس کی قرات میں مداخلت کی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ایک شاعر نے کہا۔

تمنی کتاب اللہ اول لیلۃ واخرھا لاقی حمام المقادر

شروع رات میں آپ نے کتاب اللہ کی تلاوت کی اور آخر رات میں موت مقدرہ سے ملاقات کی۔

ایک قوی شبہ

رسول اللہ ﷺ معصوم تھے، اصل دین (قرآن) میں آپ سے غلطی ممکن نہ تھی، اللہ نے فرمایا ہے لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ شیطان اس کے پاس نہیں آسکتا نہ آگے سے نہ پیچھے سے اسی وجہ سے بیضاوی نے اس سارے قصے کو جو آیت کے نزول کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے، ماننے سے انکار کر دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اہل تحقیق کی نظر میں یہ

ساری داستان غلط ہے۔ لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا ہے کہ اس قصہ کو بزار اور ابن مردویہ اور طبرانی نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بزار نے اس قصہ کو صرف اسی اسناد سے متصلاً ذکر کیا ہے ورنہ اور کوئی سند متصل نہیں ہے اور اس متصل سند میں امیہ بن خالد راوی بیچ کا حلقۂ اتصال ہے اور یہ راوی مشہور ثقہ ہے۔ ابن ابی حاتم ابن جریر اور ابن المنذر نے صحیح سند سے بروایت سعید بن جبیر مرسلاً بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے کہ سورۂ والنجم نازل ہوئی، اور آپ نے لوگوں کے سامنے اس کو پڑھا پڑھتے پڑھتے جب آیت اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰی وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی تک پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے تلک الغرانیق العلی و ان شفا عتهن لترتجی۔ مشرک یہ الفاظ سن کر کہنے لگے محمد ﷺ نے اس سے پہلے تو ہمارے معبودوں کا ذکر کبھی بھلائی کے ساتھ نہیں کیا رسول اللہ ﷺ نے سورت پڑھ کر سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا، اس پر آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ الخ نازل ہوئی۔

نحاس نے متصل سند کے ساتھ اس قصہ کی روایت کی حضرت ابن عباس کی طرف نسبت کی ہے لیکن اس سند میں واقدی راوی ہے جو غیر معتبر ہے۔

ابن مردویہ نے بطریق کلبی از ابو صالح از ابن عباس..... اس کو بیان کیا ہے (اور کلبی غیر معتبر ہے)۔

ابن جریر نے بحوالہ عوفی از ابن عباس اس کو بیان کیا ہے۔ محمد بن اسحاق نے السیرۃ میں محمد بن کعب کی روایت سے۔ اور المغازی میں ابن شہاب کی روایت سے اور ابن جریر نے محمد بن کعب و محمد بن قیس کی وساطت سے اور ابن ابی حاتم نے سدی کے حوالہ سے یہ قصہ بیان کیا ہے اور سب روایتوں کا مطلب ایک ہی ہے اور ساری رایتیں یا ضعیف ہیں یا منقطع البتہ سعید بن جبیر کی اول الذکر روایت جو بزار، ابن مردویہ اور طبرانی نے نقل کی ہے ضرور متصل اور قوی ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے طرق روایت کی کثرت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کی کچھ اصل ہے خواہ سارے طرق روایت کمزور ہوں اور رویات کے دو طریقے ایسے بھی ہیں کہ گو دونوں مرسل ہیں لیکن صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں ان طریقوں سے یہ قصہ مرسلاً ضرور ثابت ہوتا ہے ایک سلسلہ روایت طبرانی کا بیان کردہ ہے یونس بن یزید ابن شہاب زہری از ابو بکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام اور دوسرا سلسلہ روایت بھی طبرانی نے ہی بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے معقیم بن سلیمان و حماد بن سلمہ از داؤد از ابو ہند از ابو العالیہ۔

علماء نے مختلف طور پر اس شبہ کا جواب دیا ہے (۱) رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ نہیں پڑھے تھے۔ نہ صحابہ نے یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلتے سنے صرف شیطان نے (آپ کی آواز بنا کر) مشرکوں کے کانوں میں یہ الفاظ ڈال دیئے۔ مشرکوں نے خیال کر لیا کہ یہ الفاظ محمد ﷺ نے کہے ہیں (۲) قتادہ نے کہا رسول اللہ ﷺ کی حالت اس وقت نیم بیہوشی کی تھی کہ القاء شیطانی کی وجہ سے یہ الفاظ آپ کی زبان سے سہواً نکل گئے۔ لیکن فوراً ہی اللہ[ل] نے آپ کو متنبہ فرما دیا۔ یہ قول بھی آیا ہے کہ ایک شیطان نے

ل قاضی عیاض نے شفاء میں لکھا ہے کہ کسی صحیح الروایت عالم نے اس قصہ کی تخریج نہیں کی اور نہ کسی متصل صحیح سند سے اس کی روایت ثابت ہے ایسی پر غرابت داستانیں مورخین اور مفسرین ہی بیان کرتے ہیں جو ہر صحیح و غلط قصہ کتابوں سے نقل کرتے ہیں (اور اصحاب روایت و حدیث کے معیار پر کس کر نہیں دیکھتے کہ یہ سونا ہے یا پیتل) سچ کہا ہے قاضی بکر بن علاء مالکی نے کہ بعض اہل ہوا بدعتی اہل تفسیر کے پیچھے پیچھے لوگ چلنے لگتے ہیں اور باوجودیکہ روایت کو نقل کرنے والے ضعیف ہوتے ہیں روایت میں بھی اضطراب ہوتا ہے، سندیں بھی منقطع ہوتی ہے اور الفاظ میں بھی اختلاف ہوتا ہے لیکن بے دین ملحد پھر بھی انہی روایات سے چپٹے رہتے ہیں۔ اسی قصہ کے سلسلہ میں اہل رایت کے اقوال مختلف ہیں کوئی کہتا ہوں یہ واقعہ نماز کے اندر کا ہے کوئی کہتا ہے اس سورہ کے نزول تلاوت کے وقت رسول اللہ ﷺ قوم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے دل میں خود ہی یہ خیال سہواً پیدا ہوا تھا اور اونگھنے کی حالت میں یہ بات ہو گئی بعض قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی آواز بنا کر شیطان نے کلمات کہے تھے جب حضور ﷺ کو اس کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جس کو ابیض (گورا شیطان) کہا جاتا ہے، یہ حرکت کی تھی اور یہ ایک بڑی آزمائش تھی، اللہ اپنے بندوں کی طرح طرح سے آزمائش کرتا ہی ہے۔ اگر شبہ کیا جائے کہ کوئی صورت بھی ہوئی ہو خواہ شیطان نے رسول اللہ ﷺ کی آواز میں پڑھا ہو اور لوگوں نے سمجھا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ پڑھے ہیں یا نیم بیہوشی کی حالت میں یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکل گئے ہوں بہر حال اگر اس کو مان لیا جائے تو قرآن پر اعتماد ہی فوت ہو جائے گا کیا معلوم کہ حضور ﷺ نے کس حالت میں اس کو پڑھ کر سنایا اور کیا سنایا، یا شیطان نے آپ کی آواز بنا کر پڑھ دیا۔

اس شبہ کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ قرآن پر اعتماد کے لئے تو اتنا کافی ہے کہ اللہ نے اس کے بعد خود ہی فرما دیا ہے فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ یعنی پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نابود کر دیتا ہے، جو شیطان الفاظ ہوتے ہیں ان کو زائل کر دیتا ہے اور ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ القاء شیطانی ہے پھر نازل کردہ آیات کو قائم رکھتا ہے اور القاء شیطانی سے ان کو محفوظ بنا دیتا ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آیت فینسخ اللہ الخ بھی تو قابل اعتماد نہیں ہوگی جب پورا قرآن ناقابل وثوق ہو جائے گا تو یہ آیت کیسے قابل یقین ہوگی۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ عقل و برہان کا تقاضا ہے کہ جب اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو اصول دین (قرآن) کو بیان کرنے میں پیغمبر کو ہر غلطی اور نسیان سے ضرور محفوظ بنا دیا ہوگا یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ پیغمبر کو اصل دین کے اظہار میں معصوم و محفوظ ہونا چاہیے اس لئے آیت فینسخ اللہ اور دوسری تمام محکم آیات اور ضوابط و احکام ناقابل شک ہیں اللہ نے ان کو محکم بنا دیا ہے تاکہ اہل علم کو معلوم ہو جائے اور وہ یقین رکھیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں اور حق ہیں اور یہ یقین کر لینے کے بعد ان کے دل اللہ کے سامنے جھک جائیں اور خشوع کے ساتھ خوف زدہ ہو جائیں۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٢﴾ اور اللہ خوب جاننے والا (اور) حکمت والا ہے یعنی لوگوں کے احوال اور صلاحیتوں کو اللہ خوب جانتا ہے جو ہدایت کا مستحق ہوتا ہے اس کو ہدایت یاب کرتا ہے اور جو گمراہی کا مستحق ہوتا ہے اس کو گمراہ کر دیتا ہے وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت سے کرتا ہے کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ اللہ نے پیغمبر کے پاس وحی بھیجی اور شیطان نے جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا اللہ سب کو خوب جانتا ہے اور چونکہ وہ حکمت والا ہے اس لئے شیطان کے القاء کو زائل کر دیتا اور ارادۂ شیطان کو ناکام بنا دیتا ہے۔

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ

یہ سارا واقعہ اس لئے کیا گیا تاکہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو اللہ ایسے لوگوں کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنا دے جن کے دلوں میں شک کا مرض ہے اور جن کے دل بالکل ہی سخت ہیں۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اطلاع ملی تو فرمایا واللہ اس طرح تو یہ آیات نازل نہیں ہوئی تھیں کسی نے کہا شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ رواں کر دیئے تھے اور جب آپ نے جبرئیل کے سامنے یہ کلمات پڑھے تو جبرئیل نے کہا میں نے تو آپ کو یہ الفاظ نہیں پڑھائے تھے۔ اس داستان کی جس مفسر اور تابعی کی طرف نسبت کی جاتی ہے کسی نے بھی اس کی نسبت کسی صحابی کی طرف نہیں کی اس کے اکثر طرق ضعیف بلکہ پوچ ہیں۔ صرف سعید از ابوالبشر از سعید بن جبیر از ابن عباس کا سلسلہ ضرور مرفوع قرار دیا جاتا ہے (یعنی ابن عباس تک اس کی سند ملائی جاتی ہے) لیکن اس سلسلہ میں شک ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ اس وقت مکہ میں تھے (کعبہ میں یا قوم کی مجلس میں یا منیٰ میں) ابو بکر بزار نے کہا ہم نہیں جانتے کہ اس حدیث کی کوئی ایسی متصل سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچی ہو جس کا ذکر کرنا جائز ہو۔ صرف سعید بن جبیر والی سند متصل ہے۔ لیکن امیہ بن خالد وغیرہ نے سعید بن جبیر سے یہ روایت مرسلاً بیان کی ہے (یعنی سعید بن جبیر کا بیان قرار دیا ہے)۔ حضرت ابن عباس کا بیان نہیں قرار دیا صرف کلبی نے بحوالہ ابو صالح اس کو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔ ابو بکر نے کہا اس کے علاوہ اس داستان کا کوئی اور طریق روایت قابل ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ بھی کتنا کمزور ہے کلبی کی بیان کردہ احادیث کا تو ذکر بھی جائز نہیں اس کی احادیث کا تو ذکر بھی جائز نہیں اس کی احادیث انتہائی کمزور ہوتی ہیں.... کیونکہ یہ مشہور دروغ گو ہے۔ (از، مؤلف قدس سرہ)

فتنہ یعنی آزمائش اور مصیبت۔ مرض سے مراد ہے شک و نفاق۔ سخت دل والوں سے مراد ہیں مشرک۔

وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۵۳﴾ اور واقعی یہ ظالم لوگ بڑی مخالفت میں ہیں۔

الظالمین سے مراد ہیں منافق اور مشرک۔ شقاق سے مراد ہے خلاف حق۔ یا رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کی مخالفت انھم کی جگہ ان الظالمین صراحت کے ساتھ اس لئے کہا گیا تاکہ منافقوں اور مشرکوں کی ناحق کوشی کی صراحت ہو جائے۔

وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَیُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ

اور تاکہ جن لوگوں کو فہم (صحیح) عطا ہوا ہے وہ زیادہ یقین کر لیں کہ یہ (جو نبی نے پڑھا ہے) بلا شک و شبہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اس یقین کی وجہ سے ایمان پر اور زیادہ قائم ہو جائیں پھر اس کی طرف ان کے دل اور بھی جھک جائیں۔

لیعلم کا تعلق فعل محذوف سے ہے یعنی ہم نے جو شیطان کو القاء کی قدرت عطا فرمائی پھر القاء شیطانی کو نابود کر دیا اور اپنی آیات کو مضبوط کر دیا اس کی دو وجوہ ہیں ایک سبب تو یہ ہے کہ القاء شیطانی کو بیمار دل والے منافقوں اور مشرکوں کے لئے فتنہ بنا دینا مقصود ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل علم کے علم میں ایمانی پختگی پیدا کرنا مقصود ہے تاکہ بلا شک و شبہ وہ یقین کر لیں کہ یہ حق ہے اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے اور اس مستحکم ایمان کے بعد ان کے دل اللہ کی طرف عاجزی کے ساتھ اور جھک جائیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لیجعل اور لیعلم میں لام عاقبت کا ہو یعنی اللہ کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کافروں کے لئے فتنہ اور اہل ایمان کیلئے استحکام ایمان ہو جائے گا۔ جیسے دوسری آیت میں آیا ہے۔ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا موسیٰ کو فرعون کے گھر والوں نے پالیا، تاکہ مآل کار یہ نتیجہ نکلے کہ موسیٰ ان کے دشمن اور موجب رنج ہو جائیں۔

اوتوا العلم سے مراد ہیں وہ لوگ جو اللہ اور اس کے احکام سے واقف ہیں۔ سدی نے کہا باطل اور القاء شیطانی کو نابود کر دینے کی جو لوگ تصدیق کرتے ہیں وہ مراد ہیں۔

انہ یعنی جن آیات کو اللہ نے محکم اور مضبوط کر دیا ہے وہ حق ہیں، یا شیطان کو انسان کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی طاقت دینا حق ہے حضرت آدم کی تخلیق کے وقت سے دستور خداوندی یہی رہا ہے۔

فیو منوا بہ پس وہ قرآن پر (مزید پختہ) ایمان رکھیں اور دل میں گرہ باندھ لیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یا یہ مراد ہے کہ وہ اللہ پر مستحکم ترین یقین کر لیں۔ فیو منوا بہ پر ف لانا اور یعلم پر اس کا عطف کرنا اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ صرف جان لینے کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان صرف عطا الٰہی اور موہبت خداوندی ہے جو اکثر اہل علم کو علم کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

فتخبت، پس عاجزی کریں یعنی ان کے دلوں میں خشیت پیدا ہو جائے اور وہ مطیع حکم ہو جائیں اور ان کے دلوں میں اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۴﴾ اور یہ حقیقت ہے کہ ایمان والوں کو اللہ ہی راہ راست دکھاتا ہے۔

صراط مستقیم یعنی اسلام کا سیدھا راستہ اور صحیح اعتقاد مراد یہ ہے کہ شبہات کے مواقع پر جب سیدھا راستہ مشتبہ ہو جاتا ہے تو اللہ ہی اہل ایمان کو سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔

وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ یَاْتِیَهُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴿۵۵﴾

اور کافر لوگ اس (پڑھے ہوئے حکم) کی طرف سے برابر شک میں ہی پڑے رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک مقررہ ساعت آجائے یا بے برکت دن (یعنی روز قیامت) کا عذاب اللہ کی طرف سے ان پر آجائے۔

مریۃ شک منہ قرآن یا رسول یا اہل ایمان کی طرف سے ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کے خیال میں القاء شیطانی سے جو کچھ وسوسہ پیدا ہوتا ہے اس سے کافروں کے دل شک میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ اللہ کے رسول نے پہلے تو بتوں کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا پھر لوٹ گئے۔

الساعۃ موت کا وقت اور یوم عقیم سے مراد ہے قیامت کا دن۔ عکرمہ اور ضحاک نے یوم عقیم کی تشریح میں فرمایا، ایسا دن جس کی رات نہ ہوگی یعنی روز قیامت بعض کے نزدیک الساعۃ سے مراد روز قیامت اور یوم عقیم سے مرا بدر کا دن ہے کیونکہ اس روز کافروں کو کوئی بھلائی حاصل نہیں ہوئی۔

لغت میں عقیم بمعنی ممنوع آتا ہے ریح عقیم بغیر بارش کی ہوا یہ بھی ممکن ہے کہ الساعۃ اور یوم عقیم دونوں سے مراد قیامت کا دن ہو۔ ہولناکی کی تصویر کشی کے لئے دوبارہ یوم عقیم کہا گیا ہے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ (جس روز کافروں کا شک دور ہو جائے گا) اس روز حکومت صرف اللہ کی ہوگی وہی ان کے درمیان بصورت جزا و سزا (عملی) فیصلہ کر دے گا۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ۧ پس جن لوگوں نے مان لیا اور نیک کام کئے وہ عیش کے باغوں میں ہوں گے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھوٹا قرار دیا، سو انہیں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

فاو آلئک میں ف کا استعمال بتا رہا ہے کہ مومنوں کا جنت میں داخلہ محض اللہ کی مہربانی سے ہوگا (اعمال داخلہ کے موجب نہیں ہیں) اور کافروں کا جہنم میں داخلہ ان کے اعمال کی وجہ سے ہوگا کافروں کے اعمال موجب عذاب ہیں اسی لئے لھم عذاب خاص طور پر صرف انہی کے لئے عذاب ہوگا فرمایا ھم فی عذاب وہ عذاب میں ہوں گے نہیں فرمایا اور اہل جنت کے متعلق فرمایا وہ عیش کے باغوں میں ہوں گے یعنی اللہ کی مہربانی سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کے اعمال بھی (موجب نجات نہ ہوں گے) فرمایا نہ (میں اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق نجات ہوں گا) مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانک لے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی آئی کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا، سیدھی چال چلتے رہو اور خوش ہو جاؤ کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ بھی (اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے) فرمایا اور نہ میں مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے گا۔ مسلم میں حضرت جابر کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث ہے امام احمد نے حضرت ابو سعید کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابن ابی موسیٰ، شریک بن طارق، اسامہ بن شریک اور اسد بن کرز کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

ایک شبہ

اللہ نے فرمایا اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تم اپنے کئے ہوئے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت میں دخل اعمال کی وجہ سے ہوگا۔

جواب

جنت کے مختلف درجات اور مراتب ہیں جن پر رسائی اعمال کی وجہ سے ہوگی (جیسا عمل ہوگا ویسا ہی درجہ ملے گا) لیکن اصل داخلہ اور جن کے اندر ہمیشہ رہنا محض اللہ کی مہربانی سے ہوگا۔ ہناد نے الزہد میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا تو لوگ عفو الٰہی کی وجہ سے پل صراط سے پار ہو گے اور اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو گے اور اپنے اپنے اعمال کی وجہ سے مرتبے پاؤ گے۔ ابو نعیم نے عون بن عبد اللہ کی روایت سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۵۸﴾ اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر مارے گئے یا مر گئے اللہ ان کو اچھی روزی ضرور ضرور عطا فرمائے گا اور کوئی شبہ نہیں کہ اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

ھاجروا یعنی اعزاء واقارب اور وطن کو چھوڑ دیا۔ اللہ کی راہ میں یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے۔

ماتوا یعنی اپنی موت (بغیر قتل وقتال کے) سے مر گئے۔

لیرزقنھم اللہ یعنی جنت کے اندر اللہ ان کو رزق عطا فرمائے گا۔

رزقا حسنا یعنی عیش وراحت دوامی بے مثال۔

اللہ بہترین رازق ہے کیونکہ وہ بے حساب روزی عطا فرماتا ہے۔

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ ۗ بے شک ان کو ایسے مقام میں داخل فرمائے گا جس کو وہ پسند کریں گے یعنی جنت کے اندر داخل فرمائے گا جہاں ہر دل پسند چیز باصرہ نواز ہوگی، ایسی جس کو (اس سے پہلے) نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہو گا نہ کان نے سنا ہو گا نہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور آئے گا۔

وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۵۹﴾ اور بے شک اللہ (ان کے اور ان کے دشمنوں کے احوال سے) خوب واقف ہے (اور) بڑے تحمل والا کہ فوری سزا نہیں دیتا۔

ذَٰلِكَ ۚ بات یہی ہے۔ یا یہ بات حق ہے۔

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنصُرَنَّهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿۶۰﴾

اور جو شخص (دشمن کو) اسی قدر تکلیف پہنچائے جس قدر (اس دشمن کی طرف سے) اس کو تکلیف پہنچائی گئی تھی (اور) پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو اللہ اس شخص کی ضرور مدد کرے گا اللہ بڑا معاف کرنے والا کثیر المغفرت ہے۔ یعنی ظالم سے اتنا ہی بدلہ لے جتنا اس نے ظلم کیا ہے پھر دوبارہ اس پر ظلم کیا جائے تو اللہ یقیناً اس مظلوم کی مدد کرے گا۔ ابتدائی ظلم کو بھی عقاب کہا گیا۔ حالانکہ عقاب (بدلہ) وہ ہوتا ہے جو ظلم کے بعد بطور عوض دیا جائے۔ ایسا صرف ہم شکل ہونے کی وجہ سے کیا گیا۔ (ابتدائی ظلم ہو یا ظلم کا بدلہ دونوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے اگرچہ علت فعل میں اختلاف ہوتا ہے) اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی انتقام لینے والا، جذبات نفسانیہ کے زیر اثر ہی انتقام لیتا ہے۔ اور نفسانی جھکاؤ سے متاثر ہونا ایک طرح کا جرم ہے۔ (اس لئے انتقام لینا بھی ایک قسم کی نفسانی خباثت ہی ہے) لیکن اللہ مظلوم کو معاف کرنے والا ہے، وہ اگر بدلہ لے تو اللہ اس کی گرفت نہیں کرے گا۔

یا یوں کہا جائے کہ اللہ نے در گزر کرنے اور صبر کرنے کو اس کے لئے زیادہ مناسب اور اولیٰ قرار دیا تھا۔ اللہ نے فرمادیا تھا وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (جو صبر کرے اور معاف کردے تو یہ بلاشبہ بڑے عالی حوصلگی کا کام ہے) اور اس نے انتقام لے کر خلاف اولیٰ کیا (اور یہ ایک طرح کی غلط روی ہے)۔ اس کو اللہ معاف فرما دے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ آیت میں معاف کر دینے کی ترغیب ہے۔ اللہ باوجود قادر مطلق ہونے کے جب معاف فرمادیتا ہے تو جس بندے کی حق تلفی کی گئی ہو (اس میں تو انتقام لینے کی قدرت بھی پوری پوری نہیں ہے اس لئے) اس کو بدرجہ اولیٰ معاف کر دینا چاہئے۔ لفظ عفو سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ سزا دینے پر قادر ہے عفو کہتے ہی ہیں اس کو جس میں سزا دینے کی قدرت ہو۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حسن نے آیت مذکورہ کی تفسیر اس طرح کی ہے۔ مَنْ عَاقَبَ جو مشرکوں سے لڑا۔ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ جیسا مشرک اس سے لڑے۔ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ پھر اس پر زیادتی کی گئی کہ اس کو وطن سے نکال دیا گیا تو اللہ اس کی مدد کرے گا۔

بعض اہل روایت نے کہا ہے کہ کچھ مشرک مسلمانوں کی ایک جماعت پر ٢٨/ محرم کو لڑنے کے لئے چڑھ آئے مسلمانوں نے (ماہ حرام کے احترام کی وجہ سے) لڑنا مناسب نہ سمجھا اور مشرکوں سے درخواست کی کہ محرم میں جنگ نہ کرو، لیکن مشرکوں نے یہ درخواست رد کر دی اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ یہ مشرکوں کی طرف سے مسلمانوں پر زیادتی ہوئی۔ مسلمان اپنی جگہ قائم رہے اور اللہ کی طرف سے ان کی مدد ہوئی۔

میں کہتا ہوں اس مطلب پر عفو غفور سے یہ مراد ہو گی کہ ماہ حرام میں جو مسلمانوں کو لڑنا پڑا اللہ اس کو معاف کر دینے والا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مقاتل کی تفسیر بھی اسی طرح نقل کی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (اللہ کی یہ مدد) اس لئے ہے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور ان کو رات میں داخل کرتا ہے۔ یعنی وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کا دستور یہ ہے کہ متضاد اشیاء میں ادل بدل کرتا رہتا ہے۔ رات کا دن میں اور دن کا رات میں داخلہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جتنا ایک کو بڑھاتا ہے اتنا ہی دوسرے کو گھٹا دیتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ روشنی کی جگہ غروب آفتاب کی وجہ سے تاریکی لے آتا ہے اور رات کی تاریکی کی جگہ طلوع آفتاب کی وجہ سے روشنی کر دیتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝٦١ اور اس وجہ سے بھی کہ اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ یعنی بدلہ لینے والے کے اور جس سے بدلہ لیا جائے اس کے اقوال کو سنتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اہل ایمان کی دعاؤں کو سنتا اور ان کو قبول فرماتا ہے اور دونوں کے عمل کو دیکھتا ہے پس کسی کے عمل کو ناکارہ نہیں چھوڑے گا (اور مطابق عمل سزا و جزا دے گا)۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝٦٢ یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں وہ بالکل ہی بے حقیقت ہیں اور اللہ ہی عالیشان اور (سب سے) بڑا ہے۔

الحق یعنی موجود بنفسہ اور تنہا واجب لذاتہ ہے اس کے واجب الوجود اور واحد و لاشریک ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ساری کائنات کا سرچشمۂ وجود ہو، ہر ایک ہی ہستی اسی کی عطا کردہ ہو وہ عالم بالذات بھی ہو اور دوسری ہر چیز کا عالم ہو۔ اور تمام صفات کمالیہ اس کی ذات میں موجود ہوں۔ کیونکہ جب تک اس کی قدرت کاملہ، علم ہمہ گیر اور سماعت و بصارت محیط کل نہ ہو وہ مستحق الوہیت نہیں ہو سکتا۔

الباطل یعنی معدوم ہے۔ ذاتی طور پر ممتنع الوجود ہے (یعنی کسی کا وجود ذاتی نہیں اور نہ وجود ذاتی ہو سکتا ہے۔ ممکن کہتے ہی ہیں اس کو جس کی ذات کی نسبت وجود و عدم سے برابر ہو جو اپنے وجود میں واجب کا محتاج ہے) یا باطل سے مراد ہے باطل الالوہیت یعنی اللہ کے سوا ہر چیز کی الوہیت باطل اور بے حقیقت ہے۔

العلی وہ برتر و بالا ہے اس بات سے کہ اس کا کوئی شریک ہو۔

الکبیر وہ عظیم الشان اور عالی مرتبہ ہے ایسا کہ اس کا کوئی مثل نہیں ہو سکتا۔

اَلَمْ تَرَ کیا تو نے نہیں دیکھا یا کیا تجھے معلوم نہیں (اول ترجمہ پر رویت سے مراد ہو گا آنکھوں سے دیکھنا اور دوسرا ترجمہ اس وقت ہو گا جب دیکھنے سے مراد ہو گا دل سے دیکھنا اور جاننا) استفہام انکاری یعنی دیکھ اور جان لے۔

اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ط کہ اللہ اوپر سے پانی اتارتا ہے جس سے سبزہ پیدا ہوتا ہے) پھر زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

اس جملہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ کی قدرت کامل اور علم محیط کل ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝٦٣ بے شک اللہ لطف والا (اور) مکمل باخبر ہے۔ لطیف سے مراد یا لطیف العلم

ہے یعنی اس کا علم دقیق ہے ہر ذرہ کا علم اس کو ہے یا لطیف کا معنی ہے مہربان یعنی اس کی مہربانی ہر چھوٹے بڑے کے شامل حال ہے۔ خبیر ہے یعنی ہر طرح کی ظاہری باطنی تدابیر، بندوں کے تمام احوال اور ان کی ضروریات رزق وغیرہ سے باخبر ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝۶۴

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے (یعنی وہی سب کا خالق اور مالک اور حاکم ہے) اور بلاشبہ اللہ (اپنی ذات میں) ہر چیز سے بے نیاز ہے اور مستحق ستائش ہے۔ یعنی اس کی صفات و افعال مستحق ستائش ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ بذات خود محمود ہے خواہ حمد کرنے والا اس کی ذات کے سوا کوئی اور موجود نہ ہو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ زمین میں ہے اس کو تم لوگوں کے کام پر اللہ نے لگا دیا ہے اور کشتیوں کو تمہارے کام پر لگا دیا ہے) جو سمندر میں اللہ کے حکم سے چلتی ہیں۔ مسخر کر دیا، یعنی تمہارے کام پر لگا دیا، تمہارے منافع کے لئے تیار کر دیا۔ بعض نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ زمین یعنی خشکی پر جو سواری کے جانور ہیں ان کو تمہارے تابع بنا دیا تاکہ تم ان پر سوار ہو اور سمندر میں سوار ہونے کے لئے کشتیوں کو تمہارے زیر اختیار کر دیا۔

وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ　اور وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے (ہاں) مگر اسی کا حکم ہو جائے تو خیر۔

آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ فلکی اجسام بھی ارضی اجسام کی طرح بالطبع نیچے گرنے کی طرف مائل ہیں مگر اللہ نے اپنی قدرت سے ان کو تھام رکھا ہے۔ بیضاوی نے، تھام رکھنے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ اللہ نے آسمانوں کی نوعی صورتیں ہی ایسی رکھی ہیں جو اوپر ہی رکھی رہنے کی خواستگار ہیں بیضاوی نے لکھا ہے کہ زمین پر آسمانوں کو گرنے کی اجازت قیامت کے دن ہوگی۔

میں کہتا ہوں قیامت کے دن آسمانوں کا زمین پر گرنا تو کہیں ثابت نہیں ہاں پھٹنا اور شگافتہ ہوتا اور تیل کی تلچھٹ کی طرح ہونا اور کاغذ کی طرح لپیٹ دیا جانا تو ضرور آیا ہے۔

اولیٰ یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ استثناء نہ مستثنیٰ کے وجود کو چاہتا ہے نہ عدم کو اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اذن کے بغیر آسمان زمین پر نہیں گر سکتا لیکن کیا کبھی زمین پر گرنے کی اس کو اجازت ہوگی یا نہیں یہ جملہ سے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۶۵　بے شک اللہ لوگوں کے حال پر بڑی شفقت اور رحمت فرمانے والا ہے، کہ اس نے حصول منافع کے دروازے کھول دیئے طرح طرح کی مصیبتوں کو دفع کر دیا اور (اپنی وحدانیت کو) سمجھانے کے لئے اسباب فراہم کر دیئے۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَحْیَاكُمْ ؗ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ　اور وہی تو ہے جس نے تم کو زندگی عطا کی پھر تم کو مردہ کر دیتا ہے پھر تم کو زندہ کرے گا۔ یعنی تم پہلے جمادی حالت میں تھے پھر غذا سے اس نے نطفہ بنایا پھر نطفہ کو بستہ کر کے لوتھڑا بنایا پھر بوٹی بنا دی پھر جسم بنا دیا پھر اس میں جان ڈال دی، پھر جب تمہارے مدت حیات پوری ہو جائے گی تو تمہارے بدن سے جان کھینچ لے گا، پھر دوبارہ جسم بنا کر اسی میں جان ڈال دے گا۔ یہ زندگی آخرت میں ملے گی۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶　بے شک انسان (یعنی مشرک) بڑا منکر نعمت ہے اللہ کی نعمتیں سامنے ہیں پھر بھی انکار کرتا ہے، نہ ابتدائی پیدائش کی نعمتوں کا اقرار کرتا ہے نہ مرنے کی نعمت کا حالانکہ یہ موت دوسری مقررہ زندگی سے قریب کر دیتی ہے، نہ آخرت کی زندگی کی نعمت کا اس کو اعتراف ہے جو مقصود بقاء دوام تک پہنچانے والی ہے۔ خلاصہ یہ کہ موت بھی ایک نعمت ہے اگر موت نہ ہوتی تو دوسری زندگی کے دروازے میں داخلہ کیسے ملتا اور دوسری زندگی نہ ہوتی تو جنت کا داخلہ اور مقام قرب کا حصول کیسے ممکن ہوتا یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے وجود وحدانیت، ربوبیت اور کمال قدرت و علم کے دلائل موجود ہیں پھر بھی مشرک انکار کرتا ہے اور اپنے رب کی وحدانیت کو نہیں مانتا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ

(جتنی صاحب شریعت امتیں گزری ہیں ان میں سے) ہر امت کے لئے ذبح کا طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر وہ ذبح کیا کرتے تھے سو ان لوگوں کو چاہئے کہ ذبح کے معاملہ میں آپ سے (خواہ مخواہ کا) جھگڑا نہ کریں۔

اس جملہ کا گزشتہ سے پیوستہ جملوں سے معنوی بعد تھا اس لئے حرف عاطف ذکر نہیں کیا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر اس طرح فرمائی، ہم نے ہر امت کے لئے ایک شریعت مقرر کر دی تھی جس پر وہ چلتے تھے۔ بعض نے منسک کا ترجمہ تیوہار کیا ہے، مجاہد اور قتادہ نے قربانی کا مقام ترجمہ کیا ہے جس مین وہ قربانی کرتے تھے۔ بعض کے نزدیک منسک سے مراد ہے عبادت گاہ۔ بعض نے کہا (میلہ) مرکز انس جس سے وہ مانوس تھے۔ عربی میں منسک اس مقام کو کہتے ہیں جہاں کسی اچھے یا برے کام کے لئے لوگ جمع ہونے کے عادی ہوں۔ مناسک حج کو مناسک اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ لوگ حج کے مقامات پر ہر سال آتے اور جمع ہوتے ہیں۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے نسک عبادت۔ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا ہم کو ہماری عبادت کے مقامات بتادے۔ منسک کا معنی نفس ذبح ہے اور مقام ذبح بھی۔ نسکیہ، ذبیحہ، نسک میلہ کا مقام، منسک بیٹھنے کی جگہ۔

الامر سے مراد ہے امر دین یا ذبح کے طریقے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ یا جاہل ہیں یا عنادی جھگڑالو، اگر عالم ہوتے اور عنادی نہ ہوتے تو آپ سے جھگڑا ہی نہ کرتے کیونکہ آپ کے دین کی صداقت ناقابل نزاع ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول بدیل بن ورقاء۔ یزید بن خنیس اور بشر بن سفیان کے متعلق ہوا ان لوگوں نے صحابہ کرام سے کہا تھا اس کی کیا وجہ ہے کہ جس جانور کو تم اپنے ہاتھوں سے قتل (ذبح) کرتے ہو اس کو تو کھاتے ہو اور جس کو خدا براہ راست مار دیتا ہے اس کو نہیں کھاتے (اس کو مردار سمجھتے ہو)۔

زجاج نے کہا بظاہر نزاع کی ممانعت مشرکوں کو ہے لیکن حقیقت میں ممانعت کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے۔ عرب کہتے ہیں فلاں شخص تم سے جھگڑا نہ کرے یعنی تم اس سے جھگڑا نہ کرو۔ لیکن ایسا افعال میں ہوتا ہے جو طرفین سے صادر ہو (لیکن اگر فعل کا صدور ایک ہی شخص کی طرف سے ہو تو مذکورہ بالا اسلوب بیان نہیں اختیار کیا جاسکتا)۔

پس لایضر بنک زید کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ تم زید کو نہ مارو۔ ہاں لایضار بنک زید (زید تم سے مار پیٹ نہ کرے) کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ تم زید کو نہ مارو۔

مخاصمت اور نزاع دو آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے صرف ایک شخص سے (نزاع بین الطرفین کا صدور نہیں ہو سکتا) جب ایک نزاع ترک کر دے تو وجود مخاصمت باقی نہیں رہتا۔ (صرف یک طرفہ خصومت باقی رہتی ہے)۔

وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾　اور لوگوں کو اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ آپ بلاشک وشبہ سیدھے راستے پر ہیں۔ یعنی اپنے رب کی توحید و عبادت کی طرف بلکہ اس کی ذات اور بلاکیف قرب کی طرف بلائیے آپ بلاشبہ اس سیدھے راستے پر ہیں جو حق اور مراتب قرب تک پہنچاتا ہے۔

وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾　اور (ظہور حق اور لزوم حجت کے بعد بھی) وہ آپ سے خواہ مخواہ کا جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں کہ اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ یعنی تمہارے اس صحیح غلط جھگڑے کا وہی بدلہ دے گا۔ اس آیت میں وعید ہے مشرکوں کو لیکن نرم لہجے میں۔ یہ حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے۔

اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ　اللہ ہی قیامت کے دن تمہارے درمیان (عملی) فیصلہ کرے گا۔ یعنی مومنوں اور کافروں کا فیصلہ کر دے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ حق و باطل کا اس روز فیصلہ ہو جائے گا۔ مومنوں کو ثواب ملے گا اور کافروں پر عذاب ہوگا (یہ عملی فیصلہ ہوگا) یوں فیصلہ تو دلائل اور براہین کے ساتھ دنیا میں بھی کر دیا گیا ہے۔

فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾　ان (دینی) امور کا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ اختلاف کا معنی

ہے دو جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے خلاف جانا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے یہ سب بلاشبہ ایک کتاب میں (درج) ہے۔ یقینی طور پر یہ اللہ کے لئے آسمان ہے۔ استفہام تقریری ہے (یعنی آپ ضرور جانتے ہیں) کتاب سے مراد ہے لوح محفوظ آسمان وزمین میں جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے اللہ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے پہلے وہ سب لوح محفوظ میں لکھ دیا تھا (پس ان مشرکوں کے ہر کردار و گفتار واطوار کا اندراج بھی لوح محفوظ میں موجود ہے) اس لئے آپ ان کے کردار اور خصومتوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ اللہ اس سب سے واقف ہے اور یہ سارے امور علم خداوندی میں محفوظ ہیں اور یہ علمی احاطہ یا لوح محفوظ میں درج کرنا یا قیامت کے دن جزا وسزا کا فیصلہ کرنا اللہ کے لئے کچھ دشوار نہیں کیونکہ ہمہ گیر علمی تقاضۂ ذاتی ہے اس لئے (گزشتہ ہوں یا آئندہ) تمام معلومات کی نسبت اس کی طرف برابر ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ

اور (مذکورہ دلائل توحید کے بعد بھی یہ مشرک) اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن (کی پرستش کے جواز) کی اللہ نے کوئی دلیل (اپنی کتابوں میں) نازل نہیں کی اور نہ ان کے پاس ان چیزوں کی عبادت کی کوئی (عقلی) دلیل ہے۔

سلطان یعنی جواز عبادت کی کوئی حجت یا دلیل۔

علم یعنی ان کے پاس کوئی ایسا علم نہیں جو بداہت عقلی یا نظری استدلال سے حاصل ہوا ہو یا کسی سچے خبر دینے والے کی خبر سے ملا ہو جس کی صداقت پر کوئی برہان دلالت کرتی ہو یا وہ متواتر خبر ہو جو اس خمسہ میں سے کسی ایک کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہو۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝ اور ان ظالموں کے لئے (یعنی ان مشرکوں کے لئے جنہوں نے ایسی بے جا حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے)۔ کوئی مددگار نہ ہوگا (جو اللہ کے عذاب سے ان کو بچا سکے)۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ

اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیات (یعنی جن کے مضامین کی حقانیت واضح ہے) پڑھی جاتی ہیں تو آپ ان کافروں کے چہروں پر ناگواری کے آثار پہچان لیں گے۔

ایتنا یعنی قرآن کی آیات۔

بینت یعنی جن کا اللہ کی طرف سے نازل ہونا کھلا ہوا ہے۔ یا صحیح عقائد پر جن کی دلالت واضح ہے۔

المنکر یعنی غصہ وناگواری وترش روئی کی وجہ سے آثار انکار ان کے چہروں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔

وجوھھم کی جگہ وجوہ الذین کفروا صراحت کے ساتھ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انکار کا باعث سوائے شدت کفر کے اور کوئی نہیں یا منکر سے مراد ہے وہ شرارت جو مومنوں کے ساتھ وہ کرنی چاہتے ہیں۔

يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ ایسا لگتا ہے کہ ان کے سامنے ہماری آیات کی جو لوگ تلاوت کرتے ہیں ان پر یہ حملہ کر بیٹھیں گے۔

یسطون پکڑ لیں گے یا ضرر پہنچانے کے لئے تلاوت کرنے والوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے۔ گھوڑا جب دو ٹانگوں پر کھڑا ہوتا ہے اور اگلے دونوں پاؤں اوپر اٹھا دیتا ہے۔ خواہ شدت نشاط کی وجہ سے یا اکڑ اور غرور کی وجہ سے یا مادہ پر کودنے کی غرض سے تو کہا جاتا ہے سطا الفرس (باب نصر)۔

قاموس میں ہے۔ سطا علیہ اور سطا بہ (دونوں ہم معنی ہیں) سطو اور سطوۃ مصدر۔ اس پر حملہ کیا یا پکڑنے کے لئے جبر کیا۔

یتلون علیھم یعنی محمد ﷺ اور صحابہؓ جو آیات پڑھتے ہیں۔

قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾

(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کیا میں اس سے بھی زیادہ ناگوار چیز تم کو بتاؤں وہ دوزخ ہے اللہ نے کافروں سے (اس کے اندر داخل کرنے کا) وعدہ کرلیا ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

بشر یعنی جو تمہارے لئے زیادہ بری اور زیادہ ناگوار ہوگی۔

ذلکم اس قرآن سے یا تمہارے اس غصہ و غضب سے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے سے بری یا اس اکتاہٹ اور ملال سے بری جو تلاوت قرآن سن کر تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اے لوگو ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو۔

مَثَلٌ عجیب حالت یا عجیب قصہ۔

فاستمعوالہ یعنی اس مثال کو کان لگا کر اور غور کے ساتھ سنو۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ میری مثل دوسروں کو قرار دیا گیا ہے، یعنی کافروں نے استحقاق عبادت میں اللہ کی طرح دوسروں کو قرار دے رکھا ہے۔ اللہ مستحق عبادت ہے انہوں نے بتوں کو بھی معبود بنا رکھا ہے۔ سوان کی حالت سنو اور خود فیصلہ کرو کہ اللہ کی مثل کسی کو قرار دینا کیا جائز ہے اس کے بعد اگلی آیت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ

(وہ یہ ہے کہ) جن کی خدا کے سوا تم پوجا کرتے ہو وہ ایک (حقیر) مکھی کو بھی پیدا نہیں کر سکتے گو اس (کام) کے لئے سب جمع ہوجائیں (اور اجتماعی طاقت صرف کردیں۔ پھر تمہاری کیا حاجت روائی کرسکیں گے) یعنی اے کافرو جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کو معبود کہہ کر پکارتے ہو تو وہ ایک مکھی کو پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اتنی حقیر ذلیل اور بے مقدار چیز کو بھی نہیں بناسکتے۔

ذباب کی جمع قلت اذبۃ اور جمع کثرت ذبان ہے، جیسے غراب کی جمع اغربۃ اور غربان آتی ہے۔ ذباب کا لفظ ذب سے مشتق ہے ذب کا معنی ہے دفع کرنا مکھی کو بھی ہر شخص دفع کرتا ہے اس لئے اس کو ذباب کہا جاتا ہے (گویا ذباب بمعنی مذبوب ہے)۔

ولواجتمعوالہ اگرچہ وہ سب بت مل کر ایک مکھی کو پیدا کرنے کے لئے جمع ہوجائیں۔ مقصود یہ کہ وہ سب مل کر بھی تخلیق ذباب پر قادر نہیں ہوسکتے۔ انفرادی طور پر قادر نہ ہونے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ مکھی سے چھڑا نہیں سکتے۔ مشرکین بتوں پر زعفران کا لیپ کرتے تھے اور ان کے سامنے کھانا رکھتے تھے۔ مکھیاں کھانے پر گرتی تھیں اور اس میں سے کچھ لے اڑتی تھیں، مگر بت ان سے چھین نہ سکتے تھے، اسی مضمون کو آیت مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ نے یہ دونوں حالتیں بیان کر کے کافروں کی انتہائی جہالت کا اظہار کیا ہے۔ اول تو یہ ظاہر کیا کہ وہ اللہ جس کے قبضہ میں ساری کائنات ہے اور وہ سب کا خالق و موجد ہے اس کے ساتھ مشرک ایسی چیزوں کو شریک بناتے ہیں جو حقیر ترین اور ذلیل مخلوق کو پیدا کرنے کی نہ اجتماعی قوت رکھتے ہیں نہ انفرادی۔ دوئم یہ کہ وہ چیزیں جن کو معبود قرار دیا گیا ہے اتنی بے بس اور عاجز ہیں کہ حقیر ترین مخلوق بھی اگر ان سے کوئی چیز چھین کرلے جائے تو وہ چھڑا نہیں سکتیں، اور اپنی طرف سے اس کا دفاع بھی نہیں کرسکتیں۔

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ طالب اور مطلوب (دونوں) کمزور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے

فرمایا، طالب سے مراد ہے مکھی جو اس چیز کی طلبگار ہوتی ہے جس کو وہ بت سے چھینتی ہے۔ اور مطلوب سے مراد ہے بت۔ جس سے مٹھائی وغیرہ مکھی طلب کرتی ہے۔ طلب کمزور ہے اور مطلوب بالکل ہی بے بس۔ بعض نے اس کے برعکس تفسیر کی ہے۔ طلب بت اور مطلوب مکھی۔ لیکن بت تو بے جان ہے وہ کسی چیز کی بھی طلب نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کو طالب قرار دینا صرف ظاہری صورت کے لحاظ سے کہا جائے گا اور طالب استنقاذ فرض کر لیا جائے گا۔ ضحاک نے کہا، طالب سے مراد بت پرست اور مطلوب سے مراد بت ہے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾ انہوں نے اللہ کے مرتبہ کا اندازہ ویسا نہیں کیا جیسا کرنا چاہئے تھے بیشک اللہ بڑی قوت والا (اور سب پر) غالب ہے۔ یعنی اللہ کی جیسی تعظیم کرنی چاہیے تھی ویسی تعظیم انہوں نے نہیں کی اور اللہ کو ویسا نہیں پہچانا جیسا مناسب تھا، اور نہ اس کی صفات کا صحیح اندازہ کیا۔ اسی لئے حقیر ترین چیزوں کو اس کی عبادت میں شریک قرار دے لیا۔

قوی ہے، یعنی تمام ممکنات کی تخلیق پر قدرت رکھتا ہے۔

عزیز ہے، یعنی وہ سب پر غالب ہے اس پر کوئی چیز غالب نہیں اور دوسرے معبود، عاجز بے بس ہیں حقیر ترین مخلوق بھی ان پر غالب ہے وہ ادنیٰ چیز سے بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اللہ ہی ملائکہ میں اپنے پیغامبر منتخب کر لیتا ہے اور آدمیوں میں سے بھی (رسالت کے لئے بعض آدمیوں کو چھانٹ لیتا ہے)۔

بعض فرشتے اللہ کے قاصد ہیں، اللہ کے احکام وحی کے ذریعہ انبیاء تک پہنچاتے ہیں اور لوگوں کی روحیں قبض کرنے اور رزق پہنچانے میں بھی درمیانی واسطہ کا کام انجام دیتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے مرسل ملائکہ جبرئیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ، عزرائیلؑ وغیرہ ہیں آدمیوں میں سے اللہ کے پیغمبر سب لوگوں کو حق کی طرف بلاتے ہیں، اللہ کی طرف سے جو احکام ان پر نازل ہوتے ہیں وہ دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ سب سے پہلے رسول حضرت آدمؑ تھے، اور سب سے آخری رسول حضرت محمد ﷺ۔

بغوی نے لکھا ہے یہ آیت اس وقت اتری جب مشرکوں نے کہا تھا ءَ اُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا کیا ہماری جماعت میں سے اس (معمولی) شخص پر قرآن اتار اگیا (اور اس کو نبی بنایا گیا حالانکہ ہم میں بڑے بڑے سردار اور عزت رکھنے والے لوگ موجود ہیں) اس کی تردید میں فرمایا کہ پیغمبر بنانے کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے پیغمبری کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے پہلی آیات میں وحدانیت ذاتی اور الوہیت کو ثابت کیا اور توحید صفاتی کا اظہار کر دیا۔ اس آیت میں نبوت کو ثابت کر دیا اور کافروں کے قول کی تردید کر دی۔ کافروں نے بت پرستی اور ملائکہ پرستی کی توجیہ کرتے ہوئے کہا تھا مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اور یہ بھی کہا تھا۔ اَلْمَلٰٓئِكَةُ بَنَاتُ اللّٰهِ۔

اللہ نے اس آیت میں فرمایا کہ اللہ کے کچھ منتخب بندے ہیں جن کو اللہ اپنے اختیار سے چن لیتا ہے۔ وہ اللہ اور بندوں کے درمیان پیغامبر ہوتے ہیں انہی کے حکم کو ماننے اور اس پر چلنے سے اللہ کی اطاعت تک دوسروں کی رسائی ہوتی ہے۔ پیغمبروں کی پیروی ہی دوسرے لوگوں کی ترقی کا بلند ترین درجہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿ۚ۷۵﴾ بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ یعنی (مسموعات ہوں یا مرئیات) سب چیزوں سے واقف ہے اس کو ہر چیز کا علم ہے (اور بغیر حواس کے وہ ہر چیز کو جانتا ہے)۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وہ ان (سب فرشتوں اور آدمیوں کی) آئندہ اور گزشتہ حالتوں کو جانتا ہے۔

حضرت ابن عباس نے آگے پیچھے کی تشریح میں فرمایا جو کچھ انہوں نے اپنے آگے بھیج دیا اور جو کچھ پیچھے چھوڑ آئے (اچھا یا برا عمل آگے بھیج دیا یا مرنے کے بعد اچھا برا طریقہ جاری کر کے چھوڑ آئے) حسن نے کہا جو کچھ عمل کر چکے اور جو آئندہ کرنے والے ہیں، بعض اہل تفسیر نے کہا کہ ھم ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہے یعنی پیغمبروں کی پیدائش سے پہلے کے احوال اور ان کے مرنے کے بعد کے احوال سے اللہ واقف ہے۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ اور تمام امور کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے۔ وہی مالک ہے اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ ایسا کیوں کیا، یہ باز پرس تو بندوں سے کی جائے گی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ اے اہل ایمان تم رکوع اور سجدے کیا کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کیا کرو۔ یہ امید رکھتے ہوئے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

رکوع اور سجود سے مراد ہے نماز یہ دونوں نماز کے ضروری ارکان ہیں جن کے بغیر نماز کا وجود ہی نہیں ہوتا قرأت و قیام وغیرہ بھی ارکان ہیں لیکن اتنے اہم نہیں ہیں ضرورت کے وقت ساقط ہو جاتے ہیں، گونگے سے قرأت ساقط ہے جو کھڑا نہ ہو سکتا ہو اس سے قیام ساقط ہے رکوع و سجود کا سقوط کسی وقت نہیں ہوتا اسی لئے امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ جو شخص سر کے اشارہ سے بھی رکوع و سجود نہ کر سکتا ہو وہ نماز مؤخر کر دے (آئندہ جب قدرت ہو تو ادا کر لے) اشارۂ ابرو یا صرف نیت قلب سے نماز نہیں ہو سکتی۔

عبادت کرو، یعنی اس طور سے عبادت کرو جو اللہ کی عبادت کا مقرر طریقہ ہے۔

اور نیکی کرو، حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد ہے قرابتداروں سے اچھا سلوک کرنا ان کو جوڑے رکھنا اور اعلیٰ اخلاق اختیار کرنا۔ بظاہر لفظ خیر عام ہے اس کے اندر ہر نیکی داخل ہے تمام اچھے کاموں کو یہ لفظ شامل ہے مراد یہ ہے کہ جو بھلائی کا کام ہے وہ کرو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ فلاح پانے کی امید رکھتے ہوئے یہ تمام نیک کام کرو، یعنی یقین مت کرو کہ تمہارے یہ نیک کام قطعی طور پر تم کو بامراد کر دیں گے امید رکھو کہ کامیاب ہو گے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسرائیلی انبیاء میں سے ایک نبی کے پاس وحی کے ذریعہ سے یہ حکم آیا کہ تمہارے امت میں جو لوگ میرے اطاعت گزار ہیں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھنا کیونکہ قیامت کے دن جس شخص کو میں حساب فہمی کے مقام پر کھڑا کروں گا اور اس کو عذاب دینا چاہوں گا تو ضرور عذاب دوں گا (یعنی حساب فہمی میں سختی کروں گا اور درگزر سے کام نہ لوں گا تو لامحالہ وہ شخص عذاب میں ماخوذ ہو جائے گا) اور اپنی امت کے گناہگاروں سے کہہ دو کہ وہ خود اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالیں (ہلاک شدہ نہ سمجھیں اور ناامید نہ ہوں) کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ گاروں کو بخش دوں گا اور مجھے پروا بھی نہ ہو گی۔ رواہ ابو نعیم عن علیؓ۔

بزار نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے لئے تین رجسٹر نکال کر لائے جائیں گے ایک رجسٹر میں اس کے نیک اعمال درج ہوں گے ایک رجسٹر گناہوں کا ہو گا جس میں گناہوں کا اندراج ہو گا اور ایک رجسٹر اللہ کی نعمتوں کا (جس میں اللہ کی وہ تمام نعمتیں درج ہوں گی جو اس بندے کو عطا فرمائی گئی ہوں گی) پھر اللہ اپنی سب سے چھوٹی نعمت سے فرمائے گا اپنے مقابلہ میں اس بندے کے نیک (اعمال میں سے کسی) عمل کا انتخاب کر لے، نعمت اپنے مقابلہ پر سب نیک اعمال کو لے آئے گی (اور پھر بھی سارے اعمال صالحہ کے مقابلہ میں نعمت کا پلڑہ بھاری رہے گا) نعمت عرض کرے گی اے اللہ تیری عزت کی قسم میں نے اپنے مقابل ایک ایک کر کے ساری نیکیاں لے لیں اور ساری نیکیاں ختم ہو گئیں اب گناہ رہ گئے عمل صالح (تو ایک ہی نعمت کے مقابلہ میں) ختم ہو گئے۔ اگر اللہ بندہ پر رحم کرنا چاہے گا تو فرمائے گا میرے بندے میں

نے تیرے لئے تری نیکیاں چند گنا کردیں اور تیرے گناہوں سے میں نے اعراض کیا اور تجھ کو اپنی نعمت بخش دی۔

مسئلہ:۔ کیا آیت مذکورہ میں سجدۂ تلاوت واجب ہے علماء کا اس میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ امام مالک، سفیان ثوری اور کچھ دوسرے علماء کہتے ہیں یہاں سجدہ واجب نہیں اس جگہ سجدہ سے مراد تو نماز کا سجدہ ہے۔ کیونکہ آیت میں سجدہ کے ساتھ رکوع کا بھی حکم دیا ہے اور آیات قرآن کو تلاش کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی آیات میں سجدہ سے مراد سجدۂ نماز ہوتا ہے جیسے وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ۔ میں سجدۂ نماز مراد ہے کیونکہ اس کے ساتھ رکوع کا بھی حکم دیا گیا ہے اور ابن مبارکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد وغیرہ قائل ہیں کہ اس جگہ سجدۂ تلاوت ضرور کرنا چاہئے کیونکہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ کیا سورۂ حج کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں فرمایا، ہاں جو یہ دو سجدے نہ کرے وہ ان آیتوں کو نہ پڑھے۔ رواہ احمد وابو داؤد والترمذی۔ حدیث مذکورہ کو بالفاظ مذکورہ ترمذی نے نقل کیا ہے ورواہ الدار قطنی والبیہقی والحاکم۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اس کے سلسلۂ روایت میں ایک شخص ابن لہیعہ شامل ہے جو ضعیف ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ابن وہب نے کہا ابن لہیعہ یوں تو سچا ہے لیکن حافظہ (کی کمزوری) کی وجہ سے اس کو ضعیف کہا گیا ہے۔ حاکم نے لکھا ہے عبداللہ بن لہیعہ یوں تو امام ہے لیکن آخری عمر میں اس کا حافظہ درست نہیں رہا تھا (وسواس پیدا ہو گیا تھا) اور اس حدیث کا راوی تنہا یہی شخص ہے (اس لئے حدیث ضعیف ہو گئی۔)

ابوداؤد نے المراسیل میں لکھا ہے کہ ابن لہیعہ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بیان کیا کہ سورۂ حج کو دو سجدوں پر مشتمل ہونے کی فضیلت حاصل ہے۔ اس روایت کو مسند کہنا صحیح نہیں۔

حضرت عمرو بن عاصؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن میں مجھے سجدے کی پندرہ آیات پڑھائیں تین سجدے مفصلات میں اور دو سورۂ حج میں۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والدار قطنی والحاکم والمنذری والنووی۔

عبدالحق اور ابن القطان نے اس کو ضعیف کہا ہے اس میں عبداللہ بن منین کلالی غیر معروف ہے اور اس سے حارث بن سعید ثقفی مصری نے روایت کی ہے اور یہ بھی مجہول ہے۔

حاکم نے حضرت عقبہ بن عامر والی حدیث کی تاکید کے لئے کہا ہے کہ حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابو درداء، حضرت ابو موسیٰ اور حضرت عمار کے اقوال جو براویت صحیحہ موقوفاً آئے ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ بیہقی نے المعرفۃ میں خالدن بن معدان کے طریق سے مرسلاً روایت اس کی تائید میں بیان کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہی اقوال حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ہیں۔

میں کہتا ہوں اس باب میں موقوف کو مرفوع کا درجہ حاصل ہے (کیونکہ کسی آیت میں سجدۂ تلاوت ہونے یا نہ ہونے کا مدار محض روایت پر ہے اگر ان صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو خود ایسا نہیں فرماتے) سجود تلاوت کے مسائل ہم نے سورت انشقاق میں مفصل بیان کر دیئے ہیں۔

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ　　اور اللہ کے راستہ میں کوشش کرو۔ جیسی کوشش کرنے کا حق ہے۔

جہد بالضم وسعت، طاقت، جہد بالفتح مشقت، بعض اہل لغت کے نزدیک جہد کا معنی ہے انتہائی کوشش۔ بعض کے نزدیک جہد اور جہد دونوں کے معنی ہیں، وسعت اور طاقت، لیکن مشقت اور انتہائی کوشش کے لئے صرف لفظ جہد کا استعمال ہوتا ہے جہاد اور مجاہدہ (باب مفاعلۃ)۔ جہد سے ہی بنا ہے۔ یعنی طرفین سے انتہائی کوشش و مشقت۔ دشمن سے جنگ کرنے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے طرفین سے غالب آنے کی انتہائی کوشش ہوتی ہے اور ہر فریق اپنی انتہائی وسعت و طاقت صرف کرتا ہے اور قولی و عملی جہاد کرتا ہے۔

فی اللّٰہ یعنی اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کو سر بلند کرنے اور مضبوط کرنے کے لئے بعض نے فی اللہ کا ترجمہ کیا ہے لوجہ اللہ، خالص اللہ کے لئے۔

حَقَّ جِهَادِهٖ کی ترکیب مقلوب ہے یعنی جہاد کرو ایسا جہاد جو حق ہو، خالص اللہ کے لئے ہو۔ حق کی اضافت جہاد کی طرف معنی میں زور پیدا کرنے کے لئے کر دی گئی جیسے بولتے ہیں ھو حق عالم خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ خالص اللہ کی لئے جہاد کرو۔ اسی لئے حضرت ابن عباس نے حق جہادہ کی تشریح میں فرمایا اپنی پوری طاقت اللہ کی راہ میں لگا دینا اور اللہ کے دین میں کسی برا کہنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنا ہی حق جہاد ہے۔ مقاتل اور ضحاک نے کہا اللہ کے لئے کام کرو جیسا کہ کام کرنے کا حق ہے اور اس کی عبادت کرو جیسا عبادت کا حق ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا حق جہاد یہ ہے کہ نیت خالص اللہ کے لئے ہو، سدی نے کہا حق جہاد یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے۔

عبد اللہ بن مبارک نے کہا نفس اور نفسانی ہوا و ہوس سے جہاد کرنا ہی جہاد اکبر اور حق جہاد ہے۔

بغوی نے بیان کیا، روایت میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس آئے تو فرمایا ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے۔ بیہقی نے الزہد میں حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ غازی لوگ حاضر ہوئی، حضور ﷺ نے ان کو خوش آمدید فرمایا، اور فرمایا تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے۔

عرض کیا گیا جہاد اکبر کیا ہے۔ فرمایا، بندہ کا اپنی نفسانی خواہشات سے جہاد کرنا بیہقی نے کہا اس کی سند میں ضعف ہے۔

میں کہتا ہوں اس آیت میں جہاد سے صرف کفار سے جنگ کرنا ہی مراد نہیں ہے۔ رفتار آیت اس تخصیص کے خلاف ہے۔ ترتیب آیت میں خاص کے بعد عام کا ذکر کیا گیا ہے پہلے وَاسْجُدُوْا وَارْكَعُوْا فرما کر نماز کا حکم دیا اس کے بعد عام عبادت کا حکم دیا جس میں نماز بھی داخل ہے اس کے بعد ہر عمل خیر کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے اندر اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق، تمام نمازیں، روزے، کافروں سے جنگ، اخلاق کریمہ اختیار کرنا اور تمام نیکیاں کرنا داخل ہے۔ سنن اور مستحبات کو بھی یہ حکم شامل ہے اس کے بعد جہاد کا حکم دیا تو اس ترتیب بیان کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ جہاد کو کافروں سے جنگ کے لئے مخصوص سمجھ لیا جائے بلکہ اس سے مراد ہوگا تمام گفتار، رفتار اور اطوار میں اخلاص اور یہ اخلاص اسی وقت حاصل ہوگا جب نفس اور خواہشات نفس کی مخالفت کی جائے کیونکہ جب تک دل کی صفائی نہ ہو اور نفس کو فنا نہ کر دیا جائے اس وقت تک اخلاص کا حصول ممکن نہیں اور دل کی صفائی اور فناء نفس اس وقت ممکن ہے جب نفس امّارہ اور اس کی خواہشات سے جہاد کیا جائے لیکن اس کے ساتھ مشکوٰۃ نبوت سے نور چینی بھی لازم ہے اسی کو اصطلاح میں سلوک اور جذب کہا جاتا ہے قدماء مفسرین کے اقوال میں اسی کو اخلاص کہا گیا ہے۔ صوفی جب نفس کو فنا کر دیتا ہے اور دل کی صفائی اس کو حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا شمار مخلصین میں ہو جاتا ہے اس وقت وہ کسی کے برا کہنے کی پروا نہیں کرتا اور بغیر دکھاوے اور شہرت طلبی کے خالص نیت کے ساتھ لوجہ اللہ اپنے رب کی عبادت کرتا ہے، ہر دم اس کی فرماں برداری کرتا ہے، کبھی نافرمانی نہیں کرتا در حقیقت یہی جہاد اکبر ہے۔ کافروں سے لڑنا تو جہاد کی ایک ظاہری شکل ہے بلکہ تمام عبادتیں جہاد کی صورتیں ہیں اگر خالص لوجہ اللہ نہ ہوں تو بے کار ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تمام اعمال نیت کے ساتھ ہوتے ہیں ہر شخص کے لئے وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی پس جس شخص نے اللہ اور اللہ کے رسول اللہ ﷺ کے لئے گھر بار اور وطن چھوڑا تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوگی اور جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لئے ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہوگی۔ متفق علیہ بروایت حضرت عمر بن خطابؓ۔

بیہقی اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے میں سب شریکوں سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں جس نے کوئی نیک عمل کیا اور میرے ساتھ دوسرے کو بھی اس میں شریک کر لیا تو میں اس کے عمل سے بیزار ہوں۔ اس کا یہ عمل اسی

کے لئے ہو گا جس کے لئے اس نے کیا ہو گا۔ رواہ مسلم۔

فائدہ:۔ اللہ کے رسول نے فرمایا تھا کہ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آئے اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد کرنا سب سے بڑا جہاد ہے اور یہ شیخ کامل کی صحبت سے مرید کو حاصل ہوتا ہے کافروں سے جنگ کرنے کے بعد جب صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور برکت صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے اور انوار رسالت کی کچھ کرنوں کا پرتو ان کے دلوں پر پڑا تھا تو ان کے دل پاک صاف ہو گئے اور نفس کی نفسانیت فنا ہو گئی۔ صحابہ نے بھی اس کے جواب میں کہا کہ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے صحابہ کا یہ قول بھی بلاشک صحیح تھا، کافروں سے جنگ کرنے کے وقت اگرچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے لیکن دشمن سے لڑنے کی طرف ان کی کامل توجہ تھی کفار کی مدافعت ہی ان کے پیش نظر تھی دوسری طرف ان کی توجہ ہی نہ تھی یا تھی تو کمزور تھی لیکن جب مدینہ میں پہنچ کر امن کے ساتھ صحبت رسول اللہ ﷺ میں کامل توجہ کے ساتھ حاضر ہوئے تو انوار رسالت سے نور چیننے کا زیادہ موقع ملا۔ اور علوم ظاہری و باطنی کو حاصل کرنے کی کامل فرصت ملی۔ اور یہی سب سے بڑا جہاد تھا۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ اسی نے تم کو (اور امتوں سے) ممتاز فرمایا اور اس نے تم پر دین (کے کام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔

حضرت مؤلف نے فرمایا، اللہ نے تم کو اپنے نبی اور حبیب کی مصاحبت کے لئے تمام لوگوں میں سے منتخب فرما لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ نے (سارے انسانوں میں سے) مجھے منتخب فرما لیا اور میرے لئے میرے ساتھی منتخب فرما دیئے اور ساتھیوں میں سے میرے لئے سسرالی رشتہ دار اور مددگار منتخب فرما دیئے۔

حضرت واثلہ بن اسقع کا بیان ہے، میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اللہ نے اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے کنانہ کو برگزیدہ بنا دیا اور بنی کنانہ میں سے قریش کو بزرگی عطا فرمائی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب کر لیا اور بنی ہاشم میں مجھے منتخب فرمایا۔ رواہ مسلم۔

ترمذی کی روایت میں ہے ابراہیمؑ کی اولاد میں سے اسمٰعیل کو چھانٹ لیا اور اولاد اسمٰعیلؑ میں سے بنی کنانہ کو۔

اور دین میں تم پر تنگی نہیں کی یعنی ایسی تنگی اور سختی نہیں کی جس کی تعمیل و تکمیل تمہارے لئے سخت ہو جاتی۔

بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مومن جب کسی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کے لئے گناہ کی سزا سے نکلنے کا راستہ ضرور بنا دیتا ہے، توبہ کے ذریعہ سے ہو یا دنیوی سزا اور اداء حقوق کی صورت میں ہو یا کفارہ دے کر ہو، بہر حال اللہ نے دین اسلام میں ایسی تنگی نہیں رکھی کہ کسی طرح اس گناہ سے پاک ہونے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ گزشتہ امتوں کے لئے بعض گناہوں سے توبہ کرنے اور توبہ قبول ہونے کا اللہ نے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا۔

بعض اہل علم نے کہا تنگی نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے اداء فرائض کے اوقات میں کوئی اشتباہ نہیں رکھا، فرائض کو ادا کرنے کے اوقات مقرر فرما دیئے مثلاً ہلال رمضان۔ ہلال فطر وقت حج وغیرہ۔

مقاتل نے کہا تنگی نہیں کی یعنی ضرورت کے وقت سہولت کا باب کھول دیا مثلاً سفر میں نماز کا قصر۔ پانی نہ ملنے یا نقصان رساں ہونے کی صورت میں تیمّم۔ سخت ضرورت کے وقت مردار کو کھانا، مجبوری کے وقت بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر نماز ادا کرنا، کلبی نے بھی یہی تشریح کی ہے۔ یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا کہ جب میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو جتنا ہو سکے اس کی تعمیل کرو۔

حضرت ابن عباس کا قول مروی ہے تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بنی اسرائیل پر (سخت احکام کے) جو بار تھے (اور سخت بندشیں تھیں) اللہ نے اس امت سے ان کو ساقط کر دیا۔

میں کہتا ہوں دین میں تنگی نہ رکھنے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے شرعی احکام کی پابندی کو مسلمانوں کے لئے

تکلیف دہ نہیں رہنے دیا، احکام شرعی کی پابندی تمہارے لئے طبعی مرغوبات سے بھی زیادہ لذیذ ہوگئی۔ اجتباء و امتیاز کی یہی خصوصیت لازمہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، نماز میں میری خنکی چشم بنادی گئی ہے۔ رواہ احمد النسائی والحاکم (وصححہ) والبیہقی عن انسؓ۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ　تم اپنے باپ ابراہیم کی (اس) ملت پر (ہمیشہ قائم رہو) یہ سورت مکی ہے اس لئے بظاہر آیت میں خطاب قریشی مومنوں کو ہے اور دوسرے لوگ ذیلی طور پر اس میں داخل ہو جائیں گے (کیونکہ قریش کے علاوہ بہت کثرت سے ایسے لوگ تھے جن کے نسبی مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم نہ تھے) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اس معاملہ میں دوسرے لوگ قریش کے پیرو ہیں، مسلمان مسلمان قریشیوں کے اور کافر کافر قریشیوں کے۔ متفق علیہ من حدیث ابی ہریرہؓ۔

مسلم نے حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، خیر و شر میں لوگ قریش کے پیرو ہیں۔

بعض علماء کے نزدیک تمام عرب کو خطاب ہے کیونکہ سارے عرب حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے لیکن حضرت سلیمان فارسی حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی اور موالی کی کثیر جماعت تو عرب نہ تھی اور قیامت تک آنے والے لوگ بھی نسل ابراہیمی سے نہیں ہوں گے اس لئے یہ تفسیر کمزور ہے (مترجم) بعض نے کہا کہ تمام مسلمان مخاطب ہیں حضرت ابراہیم رسول اللہ ﷺ کے جداعلیٰ تھے اور امت کے لئے رسول اللہ ﷺ باپ کی طرح ہیں (نسبی نہیں بلکہ) آپ تم مسلمانوں کی ابدی زندگی کا سبب تھے اور مسلمانوں کی حقیقی زندگی کا سبب تھے اور مسلمانوں کی حقیقی زندگی حضور کی ہی عطا کردہ تھی اس لئے اللہ نے فرمایا وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ اور رسول اللہ ﷺ کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہارے لئے باپ کی طرح ہوں تم کو تعلیم دیتا ہوں، جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء میں جائے تو قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھے نہ پشت کر کے اور دائیں ہاتھ سے استنجانہ کرے۔ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی و ابن ماجہ وابن حبان عن ابی ہریرہؓ۔

اہل مکہ کو دین ابراہیمی مرغوب تھا، مسلمانوں کو بھی اور کافروں کو بھی۔ مشرکوں کا بھی دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیم پر ہیں اس خیال کر تردید میں اللہ نے تنبیہ فرمائی کہ تمہارا یہ گمان غلط ہے دین ابراہیمی پر تو شریعت محمدی پر چلنے والے ہیں ملت محمدی ہی ملت ابراہیمی ہے دوسری آیت میں فرمایا ہے اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کے متبع ہیں اور یہ نبی (اور اس نبی پر) ایمان والے لوگ بھی۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا　اسی نے (یعنی اللہ نے) اس سے پہلے (بھی یعنی نزول قرآن سے پہلے سابق کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی۔

ابن زید نے کہا ھو کی ضمیر ابراہیم کی طرف راجع ہے یعنی اس زمانے سے پہلے اپنے زمانے میں ابراہیم نے تمہارا نام مسلمان رکھا، حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں کہا تھا۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اے ہمارے رب ہم کو اپنا مسلم (مطیع) بنادے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان امت (یعنی اہل مکہ کو مسلمانامت) بنادے اگرچہ حضرت ابراہیم نے اس قرآن میں امت محمدی کو مسلمان کا خطاب نہیں دیا، لیکن آپ نے اپنی دعا میں چونکہ اس امت کو امت مسلمہ کہا تھا (اور اللہ نے آپ کی دعا کو قبول فرمالیا) اور اسی سبب سے اللہ نے اس امت کو قرآن میں مسلمہ کا خطاب دیا تو گویا حضرت ابراہیم نے ہی اس قرآن میں امت محمدی کو مسلمہ کہا، بعض علماء نے کہا اصل کلام اس طرح تھا ابراہیمؑ نے تمہارا نام اس سے پہلے مسلم رکھا اور اس قرآن میں تم کو مسلمان کے نام سے موسوم کرنے کا بیان ہے۔ یہ جملہ در حقیقت هُوَ اجْتَبٰىكُمْ کا بیان ہے کیونکہ سچے اسلام کی ہدایت کرنا اور مسلمان نام رکھنا اسی وجہ سے ہے کہ اللہ نے تم کو منتخب کرلیا ہے۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

(اللہ نے تم کو مسلمان ہونے کی وفیق دی اور تم کو مسلمان بنایا اور تمہارا نام مسلمان رکھا) تاکہ قیامت کے دن رسول شہادت دیں (کہ میں نے تم کو اسلام پہنچا دیا تھا) اور تم دوسرے لوگوں پر گواہ ہو جاؤ (کہ ان کے پیغمبروں نے ان کو اللہ کا پیام پہنچا دیا تھا)۔

ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن میں اور میری امت والے اونچے ٹیلوں پر ہوں گے اور اوپر سے مخلوق کو دیکھ رہے ہوں گے ہر شخص کی دلی خواہش ہو گی کہ وہ ہم میں سے ہو جائے (یعنی ہمارے پاس ٹیلہ پر آجائے) اور کوئی نبی ایسا نہ ہو گا کہ اس کی قوم نے اس کی تکذیب نہ کی ہو اور ہم شہادت دیں گے کہ اس نے اپنی قوم کو اپنے رب کا پیام پہنچا دیا تھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں لکھا ہے ہم کو ابن سعد نے اپنے چچا کے بیٹے پر محول کرتے ہوئے اطلاع دی کہ ابو حیلہ نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اسرافیل کو بلایا جائے گا اور اللہ اس سے فرمائے گا کیا تو نے میرا پیام پہنچا دیا تھا۔ اسرافیل جواب دیں گے جی ہاں، میں نے جبرئیلؑ کو تیرا پیام پہنچا دیا تھا۔ جبرئیل کو بلا کر پوچھا جائے گا کیا اسرافیل نے تجھے میرا پیام پہنچا دیا تھا، جبرئیلؑ جواب دیں گے جی ہاں اس قول پر اسرافیل سبکدوش ہو جائیں گے، اللہ جبرئیلؑ سے فرمائے گا پھر تو نے میرے حکم کی کیا تعمیل کی جبرئیل عرض کریں گے میں نے وہ حکم پیغمبروں کو پہنچا دیا تھا۔ پھر پیغمبروں کو طلب کیا جائے گا اور دریافت کیا جائے گا کیا جبرئیلؑ نے تم کو میرا حکم پہنچا دیا تھا، پیغمبر عرض کریں گے جی ہاں۔ دریافت کیا جائے گا پھر تم نے میرے حکم کا کیا کیا پیغمبر جواب دیں گے ہم نے اپنی اپنی امتوں کو پہنچا دیا اس پر امتوں کو طلب کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کیا تم کو پیغمبروں نے میرا حکم پہنچا دیا تھا کچھ لوگ اپنے جواب میں انبیاء کی تکذیب کریں گے اور کچھ تصدیق کریں گے انبیاء عرض کریں گے ہمارے پاس تبلیغ حکم پر شہادت دینے والے گواہ موجود ہیں اللہ فرمائے گا شاہد کون ہے انبیاء عرض کریں گے محمد کی امت شاہد ہے کہ ہم نے اپنی اپنی امتوں کو تیرا حکم پہنچا دیا تھا) چنانچہ امت محمدی کو طلب کیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا تم شہادت دیتے ہو کہ انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو میرا حکم پہنچا دیا تھا محمد کی امت والے جواب دیں گے جی ہاں (ہم اس کی شہادت دیتے ہیں) اس وقت انبیاء کی امتیں کہیں گی اے ہمارے رب (یہ لوگ تو ہمارے بعد پیدا ہوئے تھے) انہوں نے تو ہمارا زمانہ نہیں پایا، پھر یہ کیسے شہادت دے رہے ہیں۔ اللہ فرمائے گا تم لوگوں نے تو ان امتوں کا زمانہ نہیں پایا پھر کس طرح ان پر شہادت دے رہے ہو۔ امت محمدی کہے گی، اے ہمارے رب! تو نے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا تھا اور ہم پر ایک کتاب اتاری تھی اور اس کتاب میں بیان کیا تھا کہ انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو تیرا پیام پہنچا دیا۔ یہی مضمون ہے آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ کا اس آیت کی تشریح میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بخاری وغیرہ نے جو حدیث بیان کی ہے اس کی تفصیل سورت بقرۃ کی اسی آیت کی تفسیر کے موقع پر ہم نے کر دی ہے۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ پس نماز کی پابندی کرو۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی (جسمانی و مالی) طاعت کرو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ اور (اپنے تمام امور میں) اللہ پر بھروسا رکھو اور اللہ کے سوا کسی اور سے کسی کام میں مدد طلب نہ کرو۔ حسن نے کہا وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو، حضرت ابن عباس کا قول ایک روایت میں آیا ہے اپنے رب سے مانگو وہ تمام مکروہات سے تم کو محفوظ رکھے گا۔ بعض نے کہا اپنے رب سے دعا کرو تاکہ وہ دین پر تم کو ثابت قدم رکھے۔

بعض کا قول ہے کہ اعتصام باللہ کا معنی ہے قرآن اور سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا تھا، میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں کہ جب تک ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ۔ رواہ مالک فی الموطا مرسلاً حضرت عصیف بن حارث یمنی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نہیں پیدا کی کسی قوم نے (اپنے دین کے اندر بلا ثبوت) کوئی نئی بات (مگر اس کے مقابلہ میں) ویسی ہی ایک سنت اٹھا دی گئی (مطلب یہ ہے کہ دین کے اندر جب کوئی نئی بات داخل کی جائے گی تو اللہ کے رسول کی سنت اتنی ہی مٹتی چلی جائے گی) پس سنت کو پکڑے رہنا دین میں بدعت کو ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔ رواہ احمد۔

هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ وہی تمہارا مددگار ہے، وہی تمہارا محافظ ہے۔ وہ تمہارے کاموں کا کارساز، ذمہ دار ہے۔

فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٧٨﴾ وہی تمہارا سب سے اچھا کارساز اور اچھا مددگار ہے۔

فنعم میں ف سببیت کے لئے ہے، یعنی جب ثابت ہو گیا کہ اللہ تمہارا کارساز و مددگار ہے تو بس وہی سب سے اعلیٰ کارساز و مددگار ہے۔ اس کی مثل کوئی نہیں۔ بلکہ حقیقت میں اس کے سوا کوئی دوسرا کارساز و مددگار ہی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

الحمد للہ۔ ۸ ذی الحجہ ۱۲۰۳ھ کو سورۂ حج کی تفسیر ختم ہوئی۔

۱۶ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ کو اللہ کی مدد سے تفسیر مظہری سورۂ حج کا ترجمہ ختم ہوا۔

فللہ الحمد اولا و آخرا و باطنا و ظاہرا

سورۃ المؤمنون

اٹھارہواں پارہ قد افلح شروع

یہ سورۃ مکی ہے اس میں قراء بصرہ کے نزدیک ۱۱۹ آیات اور علمائے کوفہ کے

نزدیک ۱۱۸ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حاکم نے حسب شرط شیخین حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا اور اس کو صحیح قرار دیا کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے میں اپنی نظر کو اوپر آسمان کی طرف اٹھالیتے تھے اس پر آیات ذیل کا نزول ہوا۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ① الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ② بے شک ان مومنوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

اس آیت کے نزول ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر نیچے جھکالیا۔ ابن مردویہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے، رسول اللہ ﷺ آسمان میں ادھر ادھر نظر گھمالیا کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی نماز کے اندر آسمان کی طرف اپنی نظر اٹھالیا کرتے تھے جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو سجدہ گاہ پر نظر جمانے لگے۔

ابن ابی حاتم نے ابن سیرین کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ صحابہ نماز کے اندر آسمان کی طرف نظریں اٹھالیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لفظ قد کسی امر متوقع کے ثبوت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے لما کسی امر متوقع کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔ قد اگر ماضی پر داخل ہو تو تحقق وقوع کے علاوہ قرب حال کا مفہوم بھی اس کے اندر آجاتا ہے اقد قام ابھی کھڑا ہوگیا۔ قد اکل ابھی ابھی وہ کھاچکا مومنوں کو اللہ کے فضل سے فلاح کی توقع تھی قد کے لانے سے فلاح یاب ہونے کی مسلمانوں کی لئے بشارت ہوگئی (گویا مسلمان فلاح یاب ہوچکے)۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے فلاح کامیابی اور کسی قابل خوف چیز سے نجات اور امر خیر میں باقی رہنا۔ فلاح دنیوی بھی ہوتی ہے اور آخرت کی بھی اس جگہ اخروی مراد ہے۔ کامل فلاح اخروی یہ ہے کہ بالکل عذاب نہ ہو، نہ قبر میں، نہ حساب کے وقت (حساب فہمی کی سختی کی شکل میں) نہ شدائد قیامت میں مبتلا ہو کر، نہ دوزخ میں داخل ہونے کی صورت میں، نہ صراط پر سے گزرنے میں (خلاصہ یہ ہے کہ عذاب قبر سے حساب فہمی کی سختی سے شدائد قیامت سے، روز قیامت کی ظلمت سے، دوزخ کی آگ اور ہر طرح کی تکلیفوں سے اور پل صراط پر گزرنے کی دشواری سے بالکل بجات مل جائے) اور اس نجات کے بعد جنت میں داخلہ مل جائے۔ مرتبۂ قرب اور دیدار باری تعالیٰ نصیب ہو جائے۔ اور مولیٰ کریم کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

رہی فی الجملہ ناقص کامیابی تو اس کی خصوصیت انہی اہل ایمان کے ساتھ نہیں ہے جن کی صفات کا تذکرہ اس آیت میں

کیا گیا ہے بلکہ ہر وہ شخص جو لا الہ الا اللہ کا قائل ہو وہ آخرت میں ضرور فلاح یاب ہوگا۔ (خواہ اس کی فلاح کامل نہ ہو) اللہ نے فرمادیا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ جو ذرہ (یا چھوٹی سرخ چیونٹی کے) برابر نیکی کرے گا وہ اس کی نظر کے سامنے آئے گی۔ اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا وہ بھی اس کی نظر کے سامنے آئے گی اور نفس ایمان و توحید تمام نیکیوں کا سر کردہ ہے (اس لئے ہر مومن کا فلاح یاب ہونا ضروری ہے خواہ کسی قدر گناہ گار ہو)۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، توحید کی تصدیق کرنے والے سعادت یاب ہوں گے اور جنت میں (ہمیشہ) رہیں گے۔

حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے جنت عدن کو پیدا کیا اس کے درختوں میں پھل لٹکائے۔ (یعنی درختوں میں اتنی کثرت سے پھل پیدا کئے کہ ان کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھک گئیں اور پھل لٹک گئے) اور جنت کے اندر نہریں نکالیں پھر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا بات کر، جنت نے عرض کیا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ اللہ نے فرمایا، قسم اپنی عزت و جلال کی کوئی بخیل تیرے اندر میرے قریب بھی نہیں آئے گا۔ رواہ الطبرانی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث میں شاید بخیل سے مراد کافر ہے کیونکہ کافر اللہ کا حق توحید ادا کرنے میں بخیل ہوتا ہے۔

دوسری سند سے طبرانی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب اللہ نے جنت عدن کو پیدا کیا تو اس کے اندر ایسی چیزیں پیدا کیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی شخص کے دل میں ان کا خیال آیا، پھر فرمایا بات کر، جنت میں نے عرض کیا قد افلح المؤمنون۔

بزار، طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بھی ایسی ہی مرفوع روایت نقل کی ہے بیہقی نے مجاہد اور کعبؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے، حاکم کا بیان حضرت انسؓ کی روایت سے اسی طرح آیا ہے، ابن ابی الدنیا نے صفۃ الجنت میں حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ نے جنت عدن کو ایک سفید موتی اور یاقوت سرخ اور زمرد سبز کی اینٹوں سے بنایا ہے اس کا پلاستر مشک کا ہے اس کی گھاس زعفران ہے اس کی پتھریاں موتی ہیں اور اس مٹی عنبر ہے، اور فرمایا بات کر۔ جنت نے عرض کیا قد افلح المؤمنون اللہ نے فرمایا، قسم ہے اپنی عزت کی تیرے اندر میرے قرب میں کوئی بخیل نہیں آئے گا۔

حضرت مؤلف نے کہا ہو سکتا ہے کہ آیت میں فلاح سے مراد جنت کا داخلہ ہو خواہ عذاب کے بعد ہی مل جائے، اس وقت المؤمنون سے تمام مومن مراد ہوں گے کیونکہ کسی نہ کسی وقت سب مومنوں کا جنت میں داخلہ ہو جائے گا جیسا کہ احادیث مذکورہ سے ثابت ہے۔ اس تفسیر پر آیت میں مومنوں کی جو صفات بیان کی ہیں وہ قید احترازی کے طور پر نہ ہوں گی۔ (کہ جن مومنوں میں وہ صفات نہ ہوں وہ فلاح یاب نہ ہوں بلکہ صفات مدحیہ ہوں گی)۔ مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ ان صفات کا حامل ہو اگر ان صفات کو قید احترازی قرار دیا جائے اور فلاح سے کامل فلاح مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ کامل فلاح پانے والے وہ مومن ہوں گے وہ مطلقاً فلاح یاب نہ ہوں گے۔ ہم مفہوم مخالف کے قائل نہیں۔ خواہ مفہوم مخالف کسی صفت کی تقیید سے پیدا ہوا ہو یا شرط کے ذکر سے اصول فقہ میں یہ تحقیقی مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی صفت یا شرط کے ذکر کے صورت میں (بے شک حکم اس صفت اور شرط پر مرتب ہوتا ہے لیکن) جس میں وہ صفت یا شرط موجود نہ ہو اس کا حکم معلوم نہیں ہوتا اس کی طرف سے سکوت سمجھا جاتا ہے۔ نفی حکم تعیین کے ساتھ نہیں ہوتی، احتراز کا یہی مطلب ہوتا ہے (کہ جس میں صفت یا شرط مذکور موجود نہ ہو اس سے نہ نفی حکم تعیین کے ساتھ سمجھی جائے نہ اثبات حکم۔ گویا تعیین نفی سے احتراز ہوتا ہے۔)

اہل سنت کا اجماع ہے کہ جو گناہ گار بغیر مومن بغیر توبہ کے مر جائیں وہ جنت میں بالآخر ضرور داخل ہوں گے اللہ کو اختیار ہے کہ سزا دینے کے بعد جنت میں داخل فرمادے یا معاف فرمادے اور بغیر عذاب دیئے جنت میں بھیج دے۔

الخاشعون سے کون لوگ مراد ہیں۔ حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا عاجزی کرنے والے، اللہ کے سامنے اظہار عجز

کرنے والے۔ حسن نے کہا ڈرنے والے۔ مقاتل نے کہا تواضع کرنے والے اور اپنے آپ کو پست قرار دینے والے۔ مجاہد نے کہا نظریں نیچی اور آواز پست رکھنے والے۔ ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول آیا ہے (نماز میں) ادھر ادھر التفات نہ کرنا خشوع ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا خشوع یہ ہے کہ یہ معلوم بھی نہ ہو کون دائیں طرف ہے اور کون بائیں طرف۔ اور دائیں بائیں نظر نہ ڈالے۔

عمرو بن دینار نے کہا، خشوع سے مراد ہے سکون، اور حسن ہیئت علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ خشوع سے مراد ہے سجدہ گاہ سے نظر نہ ہٹانا۔ عطاء نے کہا اپنے بدن کے کسی حصے سے نہ کھیلنا مثلاً بے وجہ نہ کھجانا مراد ہے۔

بعض نے کہا نماز میں خشوع نام ہے توجہ کی یکسوئی کا کہ دوسری طرف خیال نہ جائے اور زبان سے جو الفاظ ادا کر رہا ہے اس پر غور کرتا جائے، نماز سے ادھر ادھر نہ ہٹے۔ دائیں بائیں نظر نہ گھمائے کسی طرف حائل نہ ہو، انگلیاں نہ چٹکائے، کنکریوں کو (جو زمین پر پڑی ہوں) کو الٹ پلٹ نہ کرے اور نماز کے نامناسب کوئی حرکت نہ کرے۔

حضرت ابو درداء نے فرمایا خشوع سے مراد ہے قولی اخلاص (اللہ کے سامنے) تعظیم کے ساتھ کھڑا ہونا کامل یقین اور پوری توجہ و یکسوئی۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے خشوع کا معنی ہے خضوع یعنی تواضع اخشوع کا مفہوم تواضع کے قریب ہے۔ یا خشوع کا تعلق اعضائے بدن سے ہوتا ہے اور خضوع آواز کی پستی و عاجزی اور نگاہ اور سکون اور اظہار عجز سب سے متعلق ہے۔ نہایہ میں ہے خشوع نگاہ اور آواز میں ہوتا ہے جیسے خضوع کا تعلق اجزائے بدن سے ہوتا ہے۔

حضرت ابوذر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ بندے کی طرف برابر متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ نماز میں ادھر ادھر نظر کو متوجہ نہیں کرتا۔ جب بندہ ادھر ادھر التفات کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف سے توجہ پھیر لیتا ہے۔ رواہ احمد، وابوداؤد، والنسائی، والدارمی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے التفات فی الصلوۃ کے متعلق دریافت کیا فرمایا، یہ ایک جھپٹا ہوتا ہے جو شیطان بندے کی نماز میں سے اچک لیتا ہے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین۔

حضرت انس بن مالک راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ نماز کے اندر اپنی نگاہ آسمان کی طرف کیوں اٹھاتے ہیں، حضور ﷺ کا فرمان اس معاملہ میں اتنا سخت تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا لوگوں کو اس حرکت سے باز آجانا چاہیئے ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔ رواہ البغوی۔ مسلم اور نسائی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا نماز میں دعا کے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے سے لوگوں کو باز آجانا چاہیئے ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔

حضرت جابر بن سمرہ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نماز کے اندر آسمان کی طرف نظر اٹھانے سے لوگوں کو باز آجانا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نگاہیں واپس نہ آئیں۔ رواہ مسلم وابوداؤد واحمد وابن ماجہ۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز کے اندر اپنی داڑھی سے کھیلتے دیکھا فرمایا اگر اس کی دل میں خشوع ہوتا تو اعضائے بدن میں بھی ہوتا۔ رواہ الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول، بسند ضعیف.... حضرت ابو بکر صدیقؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہم نفاق والے خشوع سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ نفاق والا خشوع کیسا ہوتا ہے فرمایا بدن کا خشوع اور دل کا نفاق (یعنی دل کسی اور طرف مشغول ہو اور بظاہر اعضاء نماز میں ہوں)۔

مجاہد کا بیان ہے حضرت عبداللہ بن زبیر نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لکڑی کا تھم (اپنی جگہ) کھڑا ہے حضرت ابو بکر صدیق کی بھی یہی حالت تھی۔

حضرت اسماء بنت حضرت ابو بکر صدیقؓ راوی ہیں کہ ان کی والدہ حضرت ام رومان نے بیان کیا کہ حضرت ابو بکرؓ نے مجھے نماز میں ادھر ادھر جھکتے دیکھا تو اتنا سخت ڈانٹا کہ قریب تھا میں نماز توڑ دوں اور فرمایا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے

تھے جب تم میں سے کوئی نماز کو کھڑا ہو تو اس کے ہاتھ پاؤں میں سکون رہنا چاہئے، یہودیوں کی طرح ادھر ادھر نہ جھکے، نماز میں ہاتھ پاؤں کا ساکن رہنا نماز کا جزء تکمیل ہے۔ (ازالتہ الخفاء)

حضرت ابوالاحوص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جب کوئی نماز کو کھڑا ہو جائے تو پتھریوں کو صاف نہ کرے کیونکہ (اللہ کی) رحمت اس کے منہ کے سامنے ہوتی ہے (اس کی طرف سے توجہ نہ ہٹائے) رواہ البغوی، امام احمد، ابن عدی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے یہ حدیث حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کی ہے۔

فصل

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اپنی نظر سجدہ کرنے کے مقام پر رکھا کرو۔ رواہ البیہقی فی سننہ الکبیر۔

یہ بھی حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا بیٹے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے سے پرہیز رکھ۔ نماز کے اندر ادھر ادھر نظر کرنا (نماز کی) بربادی ہے اگر مجبور ہو تو نفل میں (ایسا کر سکتا ہے)۔ فرض میں نہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ اور جو لغو باتوں سے (قولی ہوں یا فعلی) اعراض کرنے والے ہیں۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا کہ لغو سے مراد شرک ہے حسن نے کہا گناہ اور نافرمانیاں مراد ہیں۔ میں کہتا ہوں آخرت میں کام نہ آنے والے امور مراد لینا بہتر ہے خواہ وہ امور قول سے تعلق رکھتے ہوں یا عمل سے۔

معرضون سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شرک اور معاصی اور آخرت میں ضرر پہنچانے والے امور کے ارتکاب کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ تو بے کار اور غیر مفید باتوں سے بھی الگ رہتے ہیں۔ اور پرہیز کرتے ہیں۔

بعض نے کہا لغو سے اعراض کرنے کا یہ مطلب ہے کہ کافروں کے مقابلہ میں وہ گالیاں نہیں دیتے اور سبّ و شتم نہیں کرتے۔

دوسری آیت میں اللہ نے خود فرمایا ہے وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا مطلب یہ ہے کہ جب وہ بری بات سنتے ہیں تو خود اس کے اندر گھس نہیں پڑتے بلکہ۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ اور جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں زکوٰۃ اس مالی مقدار کو بھی کہتے ہیں جس کو زکوٰۃ دینے والا ادا کرتا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کو بھی زکوٰۃ کہا جاتا ہے (یعنی مصدر بھی ہے) آیت میں لفظ فاعلون موجود ہے (اور فعل کا وقوع نفس مال پر نہیں ہو سکتا بلکہ فعل کا تعلق ادا کرنے سے ہے) اس لئے اس جگہ زکوٰۃ ادا کرنا ہی مراد ہے اور اگر زکوٰۃ سے مقدار مالی مراد ہو گی تو لفظ الزکوٰۃ سے پہلے لفظ ادا محذوف ماننا پڑے گا۔ یعنی فاعلون لاداء الزکوٰۃ۔

لف فاعلون میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ زکوٰۃ سے مراد ہے عمل صالح۔ یعنی وہ نیک عمل کرنے والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝

اور جو (تمام عورتوں سے) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت رکھنے والے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور اپنی (شرعی) باندیوں کے کیونکہ (بیویوں اور اپنی باندیوں سے شرم گاہوں کی حفاظت نہ کرنے پر) ان پر کوئی الزام قائم نہیں کیا جائے گا۔

فرج، شرم گاہ مرد کی ہو یا عورت کی۔ حفظ الفرج حرام سے پاک دامن رہنا۔ علی ازواجھم کا تعلق حفظون سے ہے۔ احفظ علی عنان فرسی میرے گھوڑے کی لگام کو پکڑے رکھ آزاد نہ چھوڑ۔ یہ عربی مقولہ ہے حٰفِظُوْنَ عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ میں حافظون کے بعد علی کا استعمال اسی محاورے کے مطابق ہے۔ چونکہ حفظ کے اندر نفی بذل کا مفہوم ہے تو گویا

حافظون کا معنی ہو گیا لایبذلون الا علی ازواجھم وہ اپنی شرمگاہوں کو کہیں استعمال نہیں کرتے سوائے اپنی بیویوں کے۔ یا علی ازواجھم کا تعلق فعل محذوف سے ہے یعنی ھم لایبذلون الا علی ازواجھم۔

مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ سے مراد ہیں باندیاں مطلب یہ ہے کہ سوائے اپنی بیویوں اور اپنی باندیوں کے کسی اور عورت سے وہ قربت صنفی نہیں کرتے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ لفظ ما کا استعمال بے عقل چیزوں کے لئے جو عموماً کسی کی ملک میں ہوتی ہیں اور جتنے مملوک (باندی، غلام) ہوتے ہیں وہ بھی اہل عقل کی فہرست سے (گویا)، خارج ہوتے ہیں کیونکہ کسی کی ملک میں ضرور داخل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ (بجائے من کے جوذی عقل کے لئے موضوع ہے۔) ما کا لفظ ذکر کیا۔ لیکن اس پر شبہ ہو سکتا ہے کہ جب فرج کا لفظ عام ہے مرد کی شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں اور عورت کی شرمگاہ کو بھی اور حٰفِظُوْنَ لِفُرُوْجِهِمْ سے ازواج (جوڑے) اور ماملکت ایمانھم کا استثناء کیا گیا ہے اور ماملکت کا لفظ حسب تشریح بیضاوی غلاموں کو بھی شامل ہے تو پھر جو عورت غلام رکھتی ہو اس کو غلام سے قربت صنفی جائز ہونی چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے حضرت مؤلف نے فرمایا کہ ماملکت ایمانھم سے صرف باندیاں مراد ہیں کیونکہ عورتوں کو کم عقلی کی وجہ سے بے عقل چیزوں کے حکم میں داخل سمجھا جاتا ہے اسی لئے مؤنث کی ضمیریں بے عقل چیزوں کی طرف راجع کر دی جاتی ہیں۔ پس لفظ ما کا اس جگہ ذکر کرنا دلالت کر رہا ہے کہ اس سے باندیاں مراد ہیں غلام مراد نہیں ہیں خلاصہ یہ کہ عورتوں کے لئے اپنے غلاموں سے قربت ناجائز ہے اور آیت سے اس کا جواز مستفاد نہیں ہوتا۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ پھر جو اس کے علاوہ اور جگہ شہوت رانی کے طلبگار ہوں گے تو وہ حد شرعی سے نکلنے والے ہیں۔

العادون یعنی ظلم اور زیادتی میں کامل ہیں، حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں اس آیت سے متعہ کرنے کی اجازت منسوخ ہو گئی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا ابتدائے اسلام میں عورتوں سے متعہ کرنا جائز تھا۔ کوئی شخص اجنبی شہر میں جاتا اور وہاں کوئی جان پہچان والا نہ ہوتا تو جس قدر قیام کا ارادہ ہوتا اتنی مدت کے لئے کسی عورت سے نکاح کر لیتا تا کہ عورت اس کے لئے کھانا تیار کر دے اور سامان کی حفاظت رکھے یہاں تک کہ جب آیت الا علی ازواجھم اوما ملکت ایمانھم نازل ہوئی تو سوائے ان دونوں قسموں کے ہر عورت حرام ہو گئی۔ رواہ الترمذی۔ جن عورتوں سے متعہ کیا جاتا ہے وہ بیویاں یقیناً نہیں ہوتیں۔ فرقہ شیعہ کے نزدیک بھی نہ ان کو شوہر کی میراث ملتی ہے نہ شوہر کو ان کی میراث۔ اور باندیاں بھی یقیناً نہیں ہیں اور تیسری کوئی قسم حسب صراحت آیت حلال نہیں ہے اور زوجین کے درمیان توارث صراحت قرآن کے بموجب ضروری ہے۔ متعہ کا مسئلہ نساء کی آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً کی تفسیر میں ہم نے مفصل بیان کر دیا ہے۔

آیت مذکورہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ عمل بالید جلق بھی حرام ہے۔ عام علماء کا یہی قول ہے۔ ابن جریج کا قول ہے، میں نے عطاء سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے کہا مکروہ ہے (یعنی مکروہ تحریمی جو حکم حرام میں ہوتا ہے۔ مترجم) عطاء نے کہا میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگوں کا حشر ایسی حالت میں ہوگا کہ ان کے ہاتھ حاملہ ہوں گے، میرا خیال ہے کہ وہ یہی عمل کرنے والے ہوں گے۔ سعید بن جبیر نے کہا کچھ لوگ اپنے آلات مردمی سے خود کھیلتے تھے اللہ نے ان پر عذاب نازل فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ اور جو اپنے پاس رکھی ہوئی امانتوں کا اور کئے ہوئے معاہدات کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔

امانتوں سے مراد ہیں، وہ چیزیں جو بطور امانت مومنوں کے پاس رکھی جائیں ان کو ان چیزوں کا امین بنا دیا جائے۔

عہد وعدہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک عہد وہ ہے جو اللہ نے بندوں سے لیا اور بندوں نے اللہ سے کیا ہے۔ نماز، روزہ

اور تمام عبادتیں اس کے ذیل میں آتی ہیں۔ دوسرا عہد وہ ہے جو آدمی آپس میں کرتے ہیں۔ امانت، ودیعت، تجارت اور دوسرے معاہدات جن کا تعلق باہم انسانوں سے ہوتا ہے دونوں کی پابندی اور ان کو پورا کرنا، مسلمانوں پر واجب ہے (بشرطیکہ گناہ اور اللہ کی نافرمانی کا معاہدہ نہ ہو۔ مترجم۔)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے حساب فہمی نماز کی ہوگی۔ نماز ٹھیک نکلی تو بندہ کامیاب اور بامراد ہوگیا اور نماز بگڑی تو ناکام ونامراد ہوجائے گا۔ اگر کسی فرض کی ادائیگی میں کوئی کمی نکلے گی تو رب کریم فرمائے گا میرے بندے کے نوافل کو دیکھو (اگر کچھ نوافل ہوئے تو) ان سے فرض کی کمی پوری کردی جائے گی، پھر باقی اعمال کا حال بھی اسی طرح ہوگا (دوسری روایت میں آیا ہے پھر زکوٰۃ کی حالت بھی اسی طرح ہوگی۔ پھر تمام اعمال کی حساب فہمی اس طریقے سے ہوگی۔ رواہ ابوداؤد۔ امام احمد نے یہ حدیث بہ روایت رجل بیان کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اور جو اپنی نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔ یعنی ہمیشہ ہر نماز کو اس کے وقت پر پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں شروع میں نماز کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا تھا آخری وصف بھی ادائے نماز کو ہی قرار دیا گیا۔ اس سے نماز کی اہمیت ظاہر ہورہی ہے۔ لیکن ابتدائی آیت میں نماز میں خشوع رکھنے کا ذکر کیا گیا تھا اور اس جگہ نماز کی حفاظت کا دونوں صفتیں الگ الگ ہیں تکرار اوصاف نہیں ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے۔

اولئک یعنی یہی لوگ جو اوصاف مذکورہ کے حامل ہیں۔

الوارثون یعنی اس بات کے مستحق ہیں کہ صرف انہی کو (فردوس کا) وارث کہا جائے گا۔

الذین یرثون یہ الوارثون کا وصف ہے اور جس چیز کے وارث ہوں گے اس کا بیان ہے پہلے بلا تعین وراثت کا ذکر کیا گیا پھر تعین کے ساتھ وراثت فردوس کا ذکر کیا۔ اس سے وراثت کی عظمت اور بلندئ شان ظاہر ہوگئی۔ (شبہ کیا جاسکتا ہے کہ وارث ہونے کا لفظ چاہتا ہے کہ پہلے فردوس کسی اور کی تھی پھر مومنوں کو دیدی جائے گی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے حضرت مفسر نے فرمایا) مراد یہ ہے کہ فردوس کے اندر کافروں کے لئے بھی نامزد کچھ مکان ہوں گے کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو وہ مکان ان کو دیدیئے جاتے اور چونکہ وہ مسلمان نہ ہوئے اس لئے ان کے مکانوں کا وارث مومنوں کو کردیا جائے گا۔ یرثون کا یہی مطلب ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو گھر ہیں۔ ایک گھر جنت میں اور دوسرا دوزخ میں۔ جب کوئی مر کر دوزخ میں چلا جاتا ہے تو اہل جنت اس کے جنت والے گھر کے وارث ہوجاتے ہیں۔ اللہ کے فرمان اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔ رواہ ابن ماجہ وسعید بن منصور وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ والبیہقی فی البعث۔

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور حاکم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ (بھی) آئی ہے کہ اہل جنت اپنے مکانوں کے بھی وارث (مالک) ہوں گے۔ اور اپنے ان بھائیوں کے مکانوں کے بھی کہ اگر وہ (اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کو) مان لیتے تو ان کے مالک ہوتے کہ ان کے لئے وہ مکان تیار کرہی دیئے گئے تھے۔

ابن ماجہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے وارث کی میراث سے بھاگے گا اللہ جنت کے اندر اس کا میراثی حصہ ختم کردے گا۔

بعض علماء نے کہا وارث ہونے کا یہ معنی ہے کہ مآل کار ان کو جنت ملے گی جیسے وارث بالآخر میراث پاتا ہے فردوس

سب سے اونچی جنت ہے اس کی مفصل تشریح سورۂ کہف میں گزر چکی ہے۔

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ⑪ وہ فردوس میں ہمیشہ رہیں گے نہ مریں گے نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

امام احمد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول ہوتا تھا تو اس وقت آپ کے چہرے کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کچھ بھنبھناہٹ سنی جاتی تھی۔ ایک روز جو وحی نازل ہونے لگی تو ہم (ختم وحی تک) ٹھہرے رہے (منتظر رہے) جب وحی کی حالت ختم ہو گئی تو حضور ﷺ نے قبلہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور کہا اے اللہ ہم کو اور دے، کمی نہ کر، ہم کو عزت عطا فرما، ذلیل نہ کر، ہم کو عطا فرما، محروم نہ کر، ہم کو دوسروں پر ترجیح عطا فرما، دوسروں کو ہم پر برتری نہ دے۔ ہم کو خوش کر دے اور ہم سے راضی ہو جا۔ پھر فرمایا مجھ پر دس آیات نازل کی گئی ہیں جو ان کو قائم کرے گا (یعنی ان پر پورا عمل کرے گا) وہ جنت میں داخل ہو گا اس کے بعد آپ نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے دس آیات تک تلاوت فرمائیں۔ نسائی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے لیکن حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ آیات تمام ابواب خیر کا مجموعہ ہیں ان میں مومنوں کے متعدد اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ نماز میں خشوع رکھنا اوقات کی پابندی کرنا ہمیشہ زکوٰۃ ادا کرتے رہنا لغو باتوں سے اعراض کرنا، تمام محرمات سے اجتناب رکھنا وغیرہ، ان اوصاف کا حامل تمام کثافتوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتا ہے اور ذاتی وصفاتی تجلیات کی پرتو اندوزی کی اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ⑫ اور بلاشبہ ہم نے (جنس) انسان (یعنی آدم) کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ اللہ کی عبادت اور طاعت واجب ہے اور وہ ہر عبادت کا استحقاق رکھتا ہے اس کی وجہ اور سبب کا اس آیت میں بیان ہے گویا یوں فرمایا ہم کو استحقاق ہے کہ بندے ہماری عبادت کریں اور ہم کو واحد مانیں کیونکہ ہم نے ان کو پیدا کیا ہے۔

سللتہ خلاصہ جوہر

من طین میں من بیانیہ ہے یعنی روئے زمین کا خلاصہ آدم کو خلاصۂ ارضی سے پیدا کیا گیا۔ اور باقی انسانوں کو نطفہ سے اور نطفہ غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا زمین سے پیدا ہوتی ہے۔

کلبی نے کہا طین سے مراد حضرت آدمؑ ہیں عبدالرزاق ابن جریر اور عبد بن حمید نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ طین سے مراد حضرت آدم ہیں۔

عبد بن حمید کا قول نقل کیا ہے کہ من سٰللة من طین سے مراد ہے بنی آدم کا نطفہ (گویا طین سے مراد ہوئے بنی آدم اور سٰللة سے مراد ہوا نطفہ)

بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ (سٰللة سے مراد ہے) پانی کا خلاصہ عکرمہ نے کہا سٰللة سے مراد ہے وہ پانی جو پشت سے کھینچا جاتا ہے۔ عرب نطفہ کو سٰللة کہتے ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ⑬ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق

پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدت معینہ تک) ایک محفوظ مقام (یعنی رحم) میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنایا پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت (کا لباس) پہنا دیا۔

جعلنہ ہم نے اس خلاصہ کو نطفہ سے بنایا ہ ضمیر سللتہ کی طرف راجع ہے کیونکہ سلالتہ بمعنی مسلول (اسم مفعول) ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر کا مرجع انسان ہو۔ نطفہ سے پہلے حرف جر محذوف ہے۔ حرف جر کو حذف کر کے نطفتہ کو منصوب کر دیا ہے یعنی من نطفة (نطفہ سے)

قرار ٹھہرنے کی جگہ۔ مکین محفوظ مراد رحم۔ مکین در حقیقت مکان قرار کی صفت نہیں ہے بلکہ قرار پکڑنے والے کی ہے۔ مجازاً قرار کی صفت کر دیا گیا ہے۔

ثم خلقنا پھر ہم نے بنا دیا سفید نطفہ کو سرخ خون کا لوتھڑا۔

مضغۃ گوشت کی بوٹی اتنی جو چبانے کے بقدر ہو گوشت کی بوٹی کی ہڈیاں بنا دینے کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اس کو سخت کر دیا۔ مضغہ کا جو حصہ ہڈی ہونے سے باقی رہا اس کا گوشت بنا کر ہم نے ہڈیوں کو اس گوشت کا لباس پہنا دیا (ہڈیوں پر چڑھا دیا)

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ پھر ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اس کو دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنا دیا۔

انشانہ میں یہ ضمیر سلالۃ کی طرف راجع ہے یا انسان کی طرف۔ حضرت ابن عباسؓ مجاہد، عکرمہ ضحاک اور ابو العالیہ نے کہا خلق آخر سے مراد ہے روح پھونکنا۔

میں کہتا ہوں ان حضرات کے اقوال میں شاید روح سے مراد روح سفلی یعنی روح حیوانی ہوتی ہے اور نفس سے مراد ہوتی ہے روح علوی کی سواری، روح علوی کا تعلق عالم ارواح سے ہے اس کی قرار گاہ نظر کشف میں عرش کے اوپر ہے یہ مکانی چیز نہیں ہے اور نفس ایک بخار لطیف کا نام ہے جو عناصر سے پیدا ہوتا ہے اور جسم کی ہیئت کو اختیار کر لیتا ہے یہ جسم کثیف میں سرایت کیئے ہوئے ہے چونکہ روح سے مراد روح سفلی ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سلالہ سے پیدا ہوئی ہے روح علوی کی پیدائش گاہ سلالہ سے نہیں اس لئے آیت میں روح علوی مراد نہیں ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ علوی ارواح کی تخلیق تو اجسام کی تخلیق پر مقدم ہے جب اللہ نے ارواح سے میثاق لیا تھا اس وقت اجسام تو موجود بھی نہ تھے۔

نفخ روح کیا ہے

نفخ روح اللہ کی ایک صفت ہے (جس کا وجود قدیم ہے) اللہ نے فرمایا وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ جب ہڈیاں گوشت کا جامہ پہن لیتی ہیں تو اس صفت کا تعلق جسم سے ہو جاتا ہے (گویا روح کا جسم سے تعلق حادث ہے اور روح بجائے خود قدیم ہے۔ ہاں اگر آیت میں انشاء پیدا کرنے سے مراد نفخ روح ہو پیدا کرنا نہ ہو تو اس توجیہ کی ضرورت نہیں)

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے سچے رسول ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں بشکل نطفہ چالیس روز تک جمع رکھا جاتا ہے پھر وہ مادہ خون کا لوتھڑا ہو جاتا ہے اور اس حالت میں اتنی ہی مدت تک رہتا ہے پھر گوشت کی بوٹی بن جاتا ہے اور اتنی ہی مدت تک (بوٹی کی شکل پر) رہتا ہے پھر اللہ فرشتہ کو چار احکام دے کر بھیجتا ہے فرشتہ اس کے (اچھے برے) اعمال اور مدت زندگی اور رزق اور سعید یا شقی ہونا (مومن یا کافر ہونا جنتی یا دوزخی ہونا) لکھ دیتا ہے پھر اس کے اندر روح پھونکی جاتی ہے پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) جنتیوں کے جیسے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے لیکن (تخلیقی) تحریر غالب آتی ہے اور وہ دوزخیوں کے کام کرنے لگتے ہیں (اور انہی اعمال پر خاتمہ ہو جاتا ہے) اور بعض لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے جیسے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان ایک گز سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا آخر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے اور وہ جنتیوں کے عمل کرنے لگتے ہیں (اور اسی پر ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے) متفق علیہ بخاری و مسلم۔

ایک سوال

آیت میں نطفہ کا علقہ بن جانا اور علقہ کا مضغہ بن جانا اور مضغہ کا ہڈیوں میں تبدیل ہونا اور ہڈیوں پر گوشت چڑھ جانا۔ حرف فا کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان حالات کا تبادلہ فوراً بلا تاخیر ہو جاتا ہے لیکن ان تمام تبدیلات کے درمیان حدیث میں لفظ ثم کا استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تغیرات کافی وقفے کے بعد ہوتے ہیں۔ اس طرح آیت وحدیث کے بیان میں بظاہر تضاد واختلاف معلوم ہوتا ہے۔

جواب

رسول اللہ ﷺ نے ہر دو حالتوں کی تبدیل کے درمیان چالیس روز کی مدت کی صراحت فرمائی ہے اس صورت میں لفظ ثم کا استعمال ہونا چاہئے تھا (جب ایک کام کے بعد دوسرا کام تاخیر اور وقفہ کے ساتھ ہو تو لفظ ثم استعمال کیا ہی جاتا ہے) لیکن یہ باہمی تبدیلیاں اگر چالیس چالیس روز کی مدت میں ہوتی ہیں مگر اتنی عظیم الشان اور نمایاں ہوتی ہیں کہ چالیس چالیس روز کا وقفہ بھی ایسی تبدیل کے لئے کچھ حیثیت نہیں رکھتا (گویا یہ وقفہ وقفہ ہی نہیں ہے) اس لئے اللہ کے کلام میں لفظ۔ ف۔ ذکر کیا گیا (تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایک ایک چلّہ گزرنا اور ہر تبدیلی کا ایک چلّہ کے بعد مکمل ہونا بھی ایسے عظیم الشان تغیرات کے لئے بے حقیقت ہے گویا یہ کوئی وقفہ ہی نہیں ہے)

پھر آیت کے طرز اور اسلوب بیان میں بھی اختلاف ہے اول دونوں حالتوں کو لفظ ثم سے ظاہر کیا گیا ہے پھر تین حالتوں کے تغیر کے درمیان لفظ ف استعمال کیا ہے پھر انشاء تخلیق آخر کو لفظ ثم کے ساتھ بیان کیا ہے طرز بیان کی یہ نیرنگی تغیرات کے تفاوت و تنوع کی طرف اشارہ کررہی ہے سلالہ (غذائی) کا نطفہ بن جانا بہت ہی عظیم الشان اور عجیب ہے پھر پشت پدر اور سینۂ مادر میں ایک طویل مدت تک استقرار پھر رحم مادر میں پہنچ کر مخلوط ہو کر چالیس روز تک بصورت نطفہ ٹھہرا رہنا بھی ندرت شان رکھتا ہے پھر نطفہ کا چالیس روز میں علقہ بن جانا بھی بہت نمایاں اور عظیم تغیر ہوتا ہے اس لئے ہر تغیر کو لفظ ثم سے ظاہر کیا لیکن علقہ کا مضغہ بن جانا اور مضغہ کے بعض اجزاء کا سخت ہو کر ہڈیاں بن جانا اور کچھ حصہ باقی رہ کر گوشت ہو جانا اتنا عظیم تغیر نہیں جتنا اول الذکر دونوں صورتوں میں ہوتا ہے اور چونکہ تخلیق آخر کا زمانہ بہت دیر میں آتا ہے اور اتنا عجیب ہوتا ہے کہ کایا پلٹ جاتی ہے اس لئے آخر میں لفظ ثم سے اس انقلاب کو ظاہر کرنے کے لئے نہایت ضروری تھا۔

مسئلہ:- اگر کسی نے کوئی انڈا غصب کیا اور غاصب کے پاس پہنچ کر انڈے سے بچہ نکل آیا اور پھر بچہ مر گیا یا حرم کے اندر سے انڈا باہر نکال کر لے آیا اور حرم سے باہر انڈے سے بچہ پیدا ہو گیا تو دونوں صورتوں میں انڈے کا ضمان (تاوان) دینا پڑے گا کیونکہ بچہ کا پیدا ہونا تخلیق آخر ہے اور اسی دور میں روح سفلی یعنی روح حیوانی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے ضمان کا تعلق تخلیق اول سے ہی ہوگا۔

قتادہ نے کہا انشاء خلق آخر سے مراد ہے دانت اور بال نکل آنا۔

ابن جریج نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ مکمل جوان ہونا مراد ہے۔

حسن نے کہا نر یا مادہ ہونا مراد ہے عوفی کی روایت حضرت ابن عباس کا تفسیری قول ہے کہ انشاء تخلیق آخر سے زندگی کے سارے تدریجی تغیرات اور انقلابات مراد ہیں پیدا ہونا پھر چیخنا پھر دودھ پینا پھر آہستہ آہستہ بیٹھنا پھر رفتہ رفتہ کھڑا ہونا پھر چلنا اور دودھ ترک کر کے کچھ غذائی چیزیں کھانا پینا پھر بچپن سے دھیرے دھیرے جوانی کی حدود میں داخل ہونا اور ملک ملک میں گھومنا پھرنا سب ہی انشاء خلق آخر کی صورتیں ہیں۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ انشاء تخلیق آخر سے مراد دوسری ولادت ہو جو صوفی کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ مرتبۂ فنا پر پہنچ جاتا ہے اور تمام بہیمی اور سبعی بشری صفات سے نکل کر ملکوتی صفات اختیار کر لیتا ہے اور پھر ملکوتی صفات سے ترقی کر کے رحمانی صفات کی طرف منتقل ہوتا ہے اور بقاء باللہ یا بقاء بصفات اللہ کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ لفظ ثم کا استعمال کرنے کی یہ وجہ زیادہ مناسب ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (تخلیق کے گزشتہ احوال دلیل ہیں اس امر کی کہ) اللہ کی بہت بڑی شان ہے جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

تبرک اللہ یعنی اللہ کی شان اعلیٰ و برتر ہے اس بات سے کہ وہ اپنا کوئی شریک بنائے یا اس کے احکام کی پابندی اور تعمیل میں سستی کی جائے۔ فتبرک میں ف سببیت کے لئے ہے (گزشتہ کلام آئندہ کلام کی علت ہے، مطلب یہ ہے کہ تخلیق

خداوندی کی گزشتہ کیفیت اور مذکورہ بالا احوال اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ کی قدرت کامل ہے اس کی حکمت بالغہ ہے اس کی شان کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی رفعت مقتضی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ شریک ہونا ممکن ہے۔ وہ احسن الخالقین ہے۔

معتزلہ کا قول

معتزلہ فرقہ والے کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے یعنی بندہ ہی اپنے اختیاری افعال کو پیدا کرتا ہے دیکھو اس آیت سے ثابت ہورہا ہے کہ خالق بہت ہیں اور اللہ سب سے اچھا خالق ہے (تفضیل کا تحقق اور تصور بغیر مفضل علیہ کے وجود کے نہیں ہوسکتا) ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تمام عقلی اور شرعی دلائل سے ثابت ہے کہ بندوں کے سارے اختیاری افعال کا خالق اللہ ہی ہے بندہ خالق نہیں ہے اللہ نے فرمایا ہے خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔

جس ممکن کا وجود بھی اپنا نہیں اللہ کا عطا کردہ ہے اس کی ذات مقتضی وجود نہیں وہ دوسرے کو کیسے وجود دے سکتا ہے۔

تمام صحابہ اور علماء امت کا اتفاق ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں۔

رہا معتزلہ کے اعتراض کا جواب تو اس کی توضیح کے لئے ہم کہتے ہیں کہ لفظ خلق میں ہمارا کوئی جھگڑا نہیں اس لفظ کا اطلاق تو بندے پر بھی ہوا ہے حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ اللہ نے خود فرمایا ہے وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا لیکن بندے کی طرف جب لفظ خلق کی نسبت کی جاتی ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے بنانا۔ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل کی ایک چیز بناتا ہوں اور تم جھوٹ بناتے ہو۔ اس میں کوئی نزاع نہیں کہ لفظ خلق کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے لیکن اس وقت خلق کا معنی ایجاد معدوم نہیں ہوتا بلکہ کسب اور صنعت ہوتا ہے یہ یقینی بات ہے کہ انسان کو اپنے اختیار سے افعال کو کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور اس کے ارادے اور اختیار کو اپنے اعمال میں دخل ہے یہی ارادہ و اختیار مدار تکلیف ہے تمام اوامر و نواہی کا مکلف بندے کو اسی اختیار کی وجہ سے کیا گیا ہے ثواب و عذاب بھی انہی اختیاری افعال پر مرتب ہوتا ہے۔ ہم اسی کو کسب کہتے ہیں پس بندہ، کاسب، ہے لیکن بندہ کا یہ ارادہ اور اختیار ایجاد معدوم کے لئے بالکل کافی نہیں نہ یہ کسی جوہر کو موجود کرسکتا ہے نہ کسی عرض (یعنی عمل اور حالت) کو ایجاد تو اللہ ہی کی قدرت و اختیار سے وابستہ ہے جب اللہ کی قدرت و اختیار کسی مخلوق سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ تو ہم اس کو تخلیق کہتے ہیں اور اختیار عبد کو بھی اس میں دخیل بنالیا جائے تو یہ کسب عبد کہلاتا ہے لیکن کسب عبد موجد نہیں۔ موجد تو وہ قدرت و ارادہ ہے جس نے کسب عبد کو بعض چیزوں میں دخیل بنایا ہے بندہ کی طرف لفظ خلق کی نسبت سے یہ سمجھ لینا کہ بندہ اپنے افعال کا خود موجد ہے غلط ہے۔ ہاں بندے کو کاسب اور بنانے والا کہہ سکتے ہیں اسی لئے مجاہد نے کہا تھا کہ بندے بھی بناتے ہیں اور اللہ بھی بناتا ہے اور اللہ سب صناعوں سے بہتر بنانے والا ہے۔

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ الخالقین کا معنی ہے صورتیں بنانے والے یا اندازہ کرنے والے لغت میں خلق کا معنی ہے اندازہ کرنا۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ کلام کی بناء فرض محال پر ہے اور فرض محال ناممکن نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر فرض کرلیا جائے کہ دوسرے بھی خالق ہیں تب بھی اللہ سب سے اچھا خالق ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے حضرت عمر نے فرمایا چار باتوں میں (اتفاقاً) میری موافقت اپنے رب سے ہوگئی۔ ایک یہ کہ جب وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ الخ نازل ہوئی تو اس کے آخر میں میری زبان سے نکل گیا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ چنانچہ آخر میں یہی الفاظ نازل ہوگئے (الحدیث)

حضرت عمر کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک آیت سے کم قرآنی عبارت معجزہ نہیں ہے نازل ہونے سے پہلے دوسرے انسانوں کی زبان سے بھی اتنی عبارت نکل سکتی ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا (وحی نازل ہوتی تو آپ اس سے وحی

کی کتابت بھی کرالیا کرتے تھے) ایک بار رسول اللہ ﷺ کے لکھوائے بغیر یہ جملہ اس نے آیت مذکورہ کے اختتام پر زبان سے کہہ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی طرح لکھ دے یہ یوں ہی نازل ہوا ہے عبداللہ نے (لوگوں سے) کہا اگر محمد نبی ہیں ان کے پاس وحی آتی ہے تو میں بھی نبی ہوں میرے پاس بھی وحی آتی ہے یہ کہہ کر اسلام سے پھر گیا اور مکہ چلا گیا کچھ مدت کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو جہاں اور چند لوگوں کو حضور ﷺ نے واجب القتل قرار دیا وہاں اس کو بھی مباح الدم قرار دیدیا اور حکم دیدیا کہ جہاں ملے قتل کر دیا جائے۔ عبداللہ حضرت عثمان بن عفان کی خدمت میں حاضر ہو کر سفارش کا خواستگار ہوا حضرت عثمان نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے لئے امان کی درخواست کی۔ حضور ﷺ دیر تک خاموش رہے پھر دیر کے بعد فرمایا اچھا (عبداللہ کو امان مل گئی) حضرت عثمان واپس چلے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا (تم نے میرے اچھا کہنے سے پہلے ہی اس کو قتل کیوں نہیں کر دیا) میں تو دیر تک اسی لئے خاموش رہا تھا کہ تم اس کو قتل کر دو۔

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ، حضور ﷺ نے ہم کو اشارہ کیوں نہ کر دیا، فرمایا نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ نگاہ کی چوری کرے۔ عبداللہ اسی روز دوبارہ مسلمان ہو گیا اور پھر اس کا اسلام اچھا رہا۔

میں کہتا ہوں سبیل الرشاد میں عبداللہ کا مرتد ہونا اور فتح مکہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مباح الدم ہونا اور حضرت عثمان کا سفارش کرنا یہ سب کچھ مذکور ہے لیکن وجہ ارتداد یہ ذکر نہیں کی کہ اس کی زبان سے نزول وحی سے پہلے ہی جملۂ مذکورہ نکل گیا تھا اور تاریخی حیثیت سے ایسا ہونا ممکن بھی نہیں کیونکہ عبداللہ مذکور کے ارتداد کا واقعہ مدینہ میں ہوا تھا اور یہ سورت مکی ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ پھر تم بعد اس (قصۂ عجیبہ) کے ضرور ہی مرنے والے ہو۔ یعنی گزشتہ تمام مراحل زندگی طے کرنے کے بعد جب تمہاری زندگی کے خاتمہ کا وقت آجائے گا تو مر جاؤ گے۔ مطلب یہ کہ لامحالہ تم کو موت کی طرف جانا ہے سب موت کی جانب جا رہے ہو۔

مَیِّت اور مائت وہ شخص جو مرنے والا ہو ابھی مرا نہ ہو اور میت وہ شخص جو مر چکا ہو اسی لئے اس جگہ مَیِّتُون تخفیف کے ساتھ پڑھنا درست نہیں ہے جیسے انک میّت وانھم میّتون میں تخفیف و تشدید جائز نہیں (کذا ذکر البغوی) صاحب قاموس نے لکھا ہے مات یموت (نصر) یمات (فتح) یمیت (ضرب) میّت اور میت دونوں طرح سے حی کی ضد ہے۔ مات کا معنی سو گیا اور سکون پایا بھی ہے یا یوں کہا جائے کہ میت بالتخفیف وہ شخص جو مر چکا ہو اور میت و مائت وہ شخص جو ابھی مرا نہ ہو (آئندہ مرنے والا ہو)

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ پھر قیامت کے دن یقیناً (قبروں سے حساب فہمی اور جزا و سزا کے لئے) تم اٹھائے جاؤ گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے اور ہم مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے۔

طرائق سے مراد آسمان ہیں، کیونکہ ہر اوپر والا آسمان نیچے والے پر چڑھا ہوا ہے اگر نچلی چیز بالائی چیز کی طرح ہو تو نچلی کو بالائی چیز کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ طرائف کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں یا سیاروں کے چلنے کی گزرگاہیں ہیں۔

الخلق سے مراد ہے مخلوق کوئی ہو۔

غٰفلین یعنی ان کے معاملہ سے بے خبر، ان کو یوں ہی بے کار چھوڑ دینے والے نہیں ہیں بلکہ اختلال اور نظام کی ابتری سے ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کی نگرانی رکھتے ہیں اور حسب حکمت و مصلحت ان کے مناسب حد کمال تک پہنچانے کا انتظام قائم رکھتے ہیں اور آسمانوں کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہیں۔

جملہ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ جملۂ سابق کی علت ہے۔ پورا مطلب اس طرح ہوگا کہ ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے تاکہ رزق اور برکات کے دروازے تمہارے اوپر کھلے رہیں سورج چاند اور ستارے تم پر چمکتے دمکتے رہیں کیونکہ تمہاری مصلحتوں اور احوال کو درست رکھنے والے امور سے ہم غافل نہیں ہیں (یا غافل نہ تھے)

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ اور ہم نے (مناسب) مقدار میں اوپر سے پانی برسایا پھر اس کو زمین میں ٹھہرایا اور اس کو (بالکل) معدوم کردینے پر بھی بلاشبہ قدرت رکھنے والے ہیں۔

پانی سے مراد بارش کا پانی۔ بقدر یعنی مناسب مقدار کے ساتھ جتنا تقاضائے مصلحت تھا۔ زمین میں ٹھہرانے کا مطلب بعض اہل علم نے یہ بیان کیا کہ تالابوں اور حوضوں اور گڑھوں میں ہم نے پانی کو جمع کردیا تاکہ بارش نہ ہو تو لوگ اس سے کام چلائیں۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ اس سے زمین کا پانی پینا مراد ہے پانی کو زمین چوس لیتی ہے۔ زمین کے مسامات میں پانی گھس جاتا ہے پھر اس سے چشمے اور سوت پھوٹ نکلتے ہیں۔ زمین سے جتنا پانی برآمد ہوتا ہے وہ آسمان سے برسا ہوا ہی ہوتا ہے۔

ذهاب م بہ اس کو لے جانا زائل کردینا مراد یہ ہے کہ ہم اس کو خراب بھی کرسکتے ہیں کہ کسی کام نہ آئے اور بھاپ بنا کر اڑا بھی سکتے ہیں اور زمین کے اندر انتہائی گہرائی تک بھی پہنچا سکتے ہیں کہ کسی کے ہاتھ نہ آئے۔

لقدرون بلاشبہ ہم پانی کو فنا کردینے پر بھی اسی طرح قادر ہیں جس طرح اس کو برسانے پر قادر ہیں اگر ہم پانی کو فنا کردیں تو تم پیاسے مرجاؤ تمہارے جانور بھی مرجائیں اور تمہاری زمینیں بنجر ہوجائیں۔

بغوی نے لکھا ہے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے جنت سے چار دریا نازل کئے ہیں۔ سیحون، جیحون، دجلہ، فرات یہ بھی بغوی نے لکھا ہے کہ امام حسن بن سفیان نے سند کے ساتھ بوساطت عکرمہ حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے جنت کے ایک چشمہ سے جو جنت کے نچلے نشیبی حصہ میں تھا پانچ دریا جبرئیل کے دونوں بازوؤں پر نازل فرمائے۔ سیحون، جیحون، دجلہ، فرات، نیل، جبرئیل نے یہ دریا بطور امانت پہاڑوں کے سپرد کردیئے اور زمین میں بہادیئے اور لوگوں کے لئے فائدہ بخش بنادیئے آیت وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فی الارض سے اسی طرف اشارہ ہے پھر جب یاجوج وماجوج کا زمانہ آئے گا تو اللہ جبرئیل کو بھیج کر زمین سے قرآن اور تمام (دینی) علم کو اور سنگ اسود کو اور مقام ابراہیم کو اور تابوت موسیٰ کو مع اس کی اندرونی چیزوں کے اور ان پانچوں دریاؤں کو آسمان کی طرف اٹھا لے گا۔ آیت وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔ جب یہ چیزیں زمین سے اٹھالی جائیں گی تو اہل ارض دنیا اور دین کی ہر بھلائی سے محروم ہوجائیں گے۔

میں کہتا ہوں شاید زمین کے سارے دریا جنت ہی سے آئے ہیں۔ حدیث میں صرف پانچ کا تذکرہ بطور تمثیل کیا گیا ہے۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ پھر ہم نے اس (پانی) سے کھجوروں اور انگوروں کے باغ تمہارے لئے پیدا کئے جن کے اندر تمہارے واسطے بکثرت میوے ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ یعنی کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ بھی تمہارے لئے بکثرت میوے ان باغوں میں ہوتے ہیں جن سے تم لذت اندوز ہوتے ہو۔

ومنہا یعنی باغوں کے پھلوں اور غلے کے کھیتوں سے بطور غذا تم بعض کو کھاتے ہو اور سامان زندگی حاصل کرتے ہو۔ کھجوروں اور انگوروں کا خصوصی تذکرہ بطور تمثیل کیا گیا ہے ورنہ کشمش اور چھوارے اور طرح طرح کے پھل اور شربت سب ہی باغوں کی پیداوار ہیں، یا پھلوں سے بنائے جاتے ہیں۔ انگور اور کھجور عرب میں دوسرے پھلوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں پس انہی کو بطور مثال ذکر کردیا۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ اور ہم نے ایک (اور) درخت پیدا کیا (یعنی زیتون) جو طور

سینا میں پیدا ہوتا ہے۔

سیناء کے معنی مختلف بیان کئے گئے ہیں مجاہد نے کہا سیناء کا معنی ہے برکت یعنی برکت والے پہاڑ سے ہم نے زیتون کو پیدا کیا۔

قتادہ، ضحاک اور عکرمہ نے کہا اس کا معنی ہے اچھا اور خوبصورت، ضحاک نے کہا یہ نبطی زبان کا لفظ ہے اور عکرمہ نے اس کو حبشی زبان کا لفظ کہا ہے کلبی نے کہا سیناء کا معنی ہے درختوں والا۔ بعض نے کہا سریانی زبان میں گھنے درختوں کی جھاڑی کو سیناء کہتے ہیں۔ مقاتل نے کہا جس پہاڑ پر بکثرت پھلدار درخت ہوں اس کو نبطی زبان میں سیناء اور سینین کہا جاتا ہے مجاہد نے کہا سینا۔ خاص پتھروں کی ایک قسم ہوتی ہے یہ طور میں بکثرت موجود ہیں اس لئے طور کی سیناء کی طرف اضافت کردی گئی۔ ابن زید نے کہا طور سیناء پورا نام اس پہاڑ کا ہے جو مصر اور ایلہ کے درمیان واقع ہے۔ جہاں سے حضرت موسیٰ کو ندا دی گئی تھی۔ جیسے امرء القیس پورا نام ہے۔

تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ۝۲۰ جو اگتا ہے تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوئے یعنی زیتون میں دونوں فائدے ہیں یعنی اس کے اندر روغن بھی جو مالش کے کام میں آتا ہے اور چراغ بھی اس سے جلائے جاتے ہیں اور یہ سالن بھی ہے کہ روٹی اس میں ڈبوئی جاتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے صبغ اور صباغ اس سالن کو کہتے ہیں جس میں روٹی ڈبوئی جاتی ہے اور روٹی پر اس کا رنگ آجاتا ہے اور ادام عام سالن کو کہتے ہیں جس کو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے خواہ اس سے روٹی رنگین ہو یا نہ ہو۔

مقاتل نے کہا اللہ نے اس درخت کو ادام (سالن) بھی بنایا ہے اور دہن (روغن۔زیت) بھی۔ مقاتل نے یہ بھی کہا کہ طور کے ساتھ زیتون کی خصوصیت اس وجہ سے کہ سب سے پہلے طور میں ہی زیتون کا درخت پیدا ہوا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ طوفان کے بعد زمین پر سب سے پہلے زیتون کا ہی درخت پیدا ہوا۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ اور تمہارے لئے مویشیوں میں بھی غور کرنے کا موقع ہے۔

عبرت، نشانی، دلیل جس سے صانع کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر تم استدلال کر سکتے ہو۔ عام لوگ چونکہ عبرت اندوز نظر سے چوپایوں کو نہیں دیکھتے اور ان کی تخلیق سے سبق نہیں لیتے اس لئے ان کو منکر قرار دے کر کلام کو پرزور طور پر تاکید کے ساتھ بیان کیا (اگر علامات انکار موجود ہوں خواہ مخاطب منکر نہ ہو تب بھی اس کو خطاب اسی طرح تاکید کے ساتھ کیا جاتا ہے جیسے منکر سے کیا جاتا ہے)

نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۲۱ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝۲۲

ہم تم کو ان کے پیٹوں کے اندر (پیدا شدہ) چیز (دودھ) سے پینے کو دیتے ہیں اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت فائدے ہیں اور ان میں سے تم بعض کو کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو۔

مما فی بطونہا سے مراد ہے دودھ، یا چارہ، اول صورت میں من (بمعنی کچھ) تبعیضیہ ہے اور دوسری صورت میں ابتدائیہ کیونکہ دودھ چارے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

فیہا یعنی چوپایوں کی پشت اور بال و اون وغیرہ میں بکثرت فوائد ہیں۔

ومنہا تاکلون اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو (یعنی گوشت چربی وغیرہ)

وعلیہا اور بعض چوپایوں پر سوار ہوتے ہو جیسے اونٹ اور بیل بعض اہل علم نے کہا صرف اونٹ مراد ہیں عرب اونٹوں پر ہی سوار ہوتے تھے اور لفظ فلک کے ساتھ بھی اونٹ مناسبت رکھتے ہیں۔ اونٹ خشکی کے جہاز مشہور ہیں۔ ذوالرمہ شاعر نے کہا ہے سفینۃ برتحت خدی زمامہا

تحملون تم لدے پھرتے ہو خشکی میں اور دریاؤں میں۔
نسقیکم الخ یہ عبرت کا بیان ہے کیونکہ گوبر اور خون کے بیچ میں سے خالص سفید خوشگوار دودھ بر آمد کرنا اپنے اندر درس عبرت رکھتا ہے۔ چوپایوں سے دودھ، گھی، اون اور بالوں کی پیداوار اور سواری وبار برداری کے لئے ان کا فرماں بردار ہو جانا اور ضعیف الجثہ انسان کی خدمت پر ایسے قوی ہیکل جانوروں کا لگ جانا اللہ کی قدرت تامہ کو ثابت کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ اور ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس۔

اس سورت کے آغاز میں اللہ نے مومنوں کے خصوصی احوال بیان فرمائے پھر ان دلائل و آیات کا تذکرہ کیا جو ایمان و طاعت کی دعوت دے رہی ہیں۔ اس کے بعد ان سرکش کافروں کا اور ان کے انجام کا ذکر فرمایا جو اللہ سے باغی تھے اور پیغمبر کے فرمان سے سرتابی کرنے والے۔

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾

پس انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو سوائے اس کے تمہارا اور کوئی معبود نہیں سو کیا تم (اس سے) ڈرتے نہیں۔ یعنی کیا تم کو اس بات کا اندیشہ نہیں کہ تم جو اس کے سوا دوسروں کی پوجا کرتے ہو اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہو۔ کہیں وہ تم سے یہ ساری نعمتیں چھین لے اور تم کو اس شرک کی وجہ سے (دنیا اور آخرت میں) عذاب میں مبتلا کر دے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

(اس کے جواب میں) ان کی قوم کے کافروں نے کہا کہ یہ شخص تو تم ہی جیسا انسان ہے (پیغمبری کا دعویٰ کر کے) چاہتا ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے۔ اگر اللہ کو (رسول بنانا) منظور ہوتا تو وہ (ہدایت کے لئے) فرشتوں کو اتار دیتا ہم نے تو یہ بات اپنے پہلے بزرگوں سے بھی نہیں سنی۔

الملاء سرادار ان قوم نے آپس میں (یا عوام سے) کہا کہ یہ نوحؑ تو تم ہی جیسا آدمی ہے تمہاری طرح کھاتا اور سوتا ہے پھر یہ اللہ کا بھیجا ہوا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ قوم نوح کا خیال تھا کہ پتھر بھی معبود ہونے میں اللہ کے شریک ہیں اور کوئی انسان اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا اگر خدا کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو کسی فرشتے کو بھیج دیتا اسی خیال کے زیر اثر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ نوح چونکہ رسالت کے مدعی ہیں اس لئے شاید ان کو اپنے آدمی ہونے کا انکار ہے یا فرشتہ ہونے کا دعویٰ ہے۔

یرید یعنی رسالت کا دعویٰ کرنے سے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم سب کا سردار بن جائے اور تم سب سے اعلیٰ و بالا ہو جائے۔

لو شاء اللّٰہ یعنی اگر اللہ کو منظور ہوتا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے یا کسی کو رسول بنا کر بھیجنا چاہتا۔

ماسمعنا بھذا ہم نے تو یہ بات جس کا نوح مدعی ہے کہ معبود ایک ہے اور آدمی کو پیغمبر بنا کر وہ بھیجتا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، اپنے پچھلے بزرگوں میں بھی کبھی نہیں سنی۔ ایسی بات کافروں نے یا تو محض عناد کی وجہ سے کہی تھی یا واقعی کسی پیغمبر کو آئے ہوئے ایک لمبی مدت گزر گئی تھی اور ان کو بزرگوں سے بھی کسی پیغمبر کا مبعوث ہونا معلوم نہیں ہوا تھا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ یہ صرف ایک ایسا آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے اب تم اس کو اس کی حالت پر ایک وقت تک رہنے دو اور منتظر رہو۔

جنۃ جنون، یعنی یہ جو رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے یہ اس کا جنون ہے در حقیقت یہ نفی رسالت کی تاکید ہے کیونکہ دیوانہ رسول نہیں ہو سکتا اور اس کو جنون ہے اس لئے رسول نہیں ہو سکتا۔

فتربصوا یعنی اس کو برداشت کرو اور اس وقت کا انتظار کرو کہ یہ خود ہی مر جائے یا اس کا جنون دور ہو جائے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۝ نوحؑ نے کہا اے میرے رب چونکہ انہوں نے میری تکذیب کی اس لئے میرا ان سے بدلہ لے۔ (یا مجھے ان کے مقابلے میں کامیاب کر) حضرت نوحؑ نے یہ دعا اس وقت کی جب آپ کو اللہ کی طرف سے اطلاع دے دی گئی کہ جو ایمان لے آئے ہیں ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔

انصرنی میری مدد کر یعنی جس عذاب سے میں نے ان کو ڈرایا تھا وہ عذاب نازل فرمادے۔ اور ان کو تباہ کر دے۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ (پس ہم نے نوح کی دعا قبول کی) پھر ان کے پاس وحی بھیجی۔

أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا کہ میری نگرانی میں میری وحی (تعلیم و حکم) کے موافق کشتی بناؤ۔

باعیننا یعنی ہماری نگرانی اور حفاظت میں کشتی بناؤ، کوئی تمہارا کام بگاڑ نہ سکے گا۔

فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ۙ فَاسْلُكْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۖ

پھر جب ہمارا حکم (عذاب کا یا سوار ہو جانے کا) آجائے اور روئے زمین سے پانی ابلنے لگے تو ہر ایک قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا (لے کر) کشتی میں داخل کر لینا اور اپنے متعلقین کو بھی (کشتی میں سوار کر لینا) استثناء ان لوگوں کے جن کے (ہلاک کرنے کے) متعلق پہلے ہی حکم نافذ ہو چکا ہے۔

فارا التنور تنور ابل جائے یعنی تنور سے پانی ابلنے لگے۔

حضرت مفسر کے نزدیک تنور سے مراد یہی روٹی پکانے کا تنور ہے حضرت نوحؑ کو عذاب (طوفان) آنے کی یہ نشانی بتائی گئی تھی چنانچہ تنور سے پانی پھوٹ نکلا بیوی نے آکر اطلاع دی آپ فوراً سوار ہو گئے۔ آپ کا مکان کوفہ کی مسجد کے اندر تھا کہ باب کندہ کی طرف سے داخل ہونے والے دائیں ہاتھ کو واقع تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ملک شام کی کسی (ٹیلہ کی) چوٹی پر آپ رہتے تھے۔

فَاسْلُكْ فِيهَا پس اس میں داخل کر لے سلک فعل لازم بھی ہے اور متعدی بھی سلکت فی کذا میں ایسے واقعہ میں داخل ہو گیا۔ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ تم کو دہکتی آگ میں کس نے داخل کیا۔

مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ اثنین مفعول ہے یعنی ہر طرح کے جانوروں میں دو دو نر اور مادہ کو داخل کر لو۔

اس قصہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر قسم کے جانوروں کو حضرت نوح کے پاس جمع کر دیا گیا آپ اپنے دونوں ہاتھ الگ الگ ہر قسم کے جانوروں پر مارتے تھے دلیاں ہاتھ نر اور بایاں ہاتھ مادہ پر پڑتا تھا آپ دونوں کو کشتی پر سوار کر لیتے تھے۔

واھلک یعنی اپنے گھر والوں کو بھی سوار کر لو یا اہل سے مراد ہیں وہ تمام لوگ جو حضرت نوح پر ایمان لے آئے تھے۔

إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ یعنی ان گھر والوں کو سوار نہ کرنا جن کا کفر کی وجہ سے ہلاک کیا جانا ازل میں طے ہو چکا ہے۔

من سبق سے مراد ہے حضرت نوح کی بیوی اور بیٹا کنعان۔ علیٰ ضرر کے لئے آتا ہے اور لام نفع کے لئے چونکہ ازلی فیصلہ ان لوگوں کے لئے ضرر رساں تھا اس لئے علیہ فرمایا اور آیت إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ میں ازلی فیصلہ نفع رساں تھا اس لئے لھم فرمایا۔

وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ۝ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے کلام نہ کرنا (یعنی ان کو بچانے کی مجھ سے دعا نہ کرنا) کیونکہ بلاشبہ وہ غرق کئے جانے والے ہیں۔

فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

پھر جب تم اور تمہارے ساتھی بیٹھ چکیں تو کہنا اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو کافر لوگوں (کے افعال اور ایذاؤں) سے نجات دی۔

وَقُلْ رَبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُبَارَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ۝

اور (یہ بھی) کہنا کہ اے میرے رب مجھے (زمین پر) برکت کے ساتھ اتارنا اور تو سب اتارنے والوں سے اچھا ہے۔

رب انزلنی حضرت مفسر نے فرمایا سوار ہونے کے بعد کشتی میں اور اترنے کے وقت زمین میں۔

منزلا مبارکا برکت کا اتارنا، کشتی میں برکت کا اتارنا یہ کہ اللہ کے دشمنوں کی صحبت سے نجات دی اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہو جانے کا موقع عنایت فرمایا اور زمین میں اترنے کے بابرکت ہونے کے یہ معنی کہ (اللہ نے ڈوبنے سے محفوظ رکھا مترجم) اور نسل و رزق میں کثرت عطا فرمائی اور بے غمی کے ساتھ عبادت رب میں مشغول ہو جانے کا موقع عنایت کیا۔

دعا کرنے کا حکم صرف حضرت نوح کو دیا اپنے لئے بھی اور اپنے ساتھیوں کے لئے بھی اس میں حضرت نوح کی بزرگی کا اظہار ہے اور اس امر کی طرف ایماء ہے کہ حضرت نوح کی دعا ساتھ والوں کے لئے بھی کافی ہے ساتھیوں کو اپنے لئے دعا کرنے کی ضرورت نہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ اس (واقعہ مذکورہ) میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾ اور (یہ نشانیاں بیان کر کے ہم اپنے بندوں کو) بلاشبہ آزمانے والے ہیں۔

فی ذلک یعنی نوح اور ان کی قوم کے قصہ میں۔

لایت بلاشبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اللہ کی قدرت کاملہ کو ثابت کرتی ہیں اور ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ مومنوں پر مہربانی کرتا ہے اور کافروں پر غضب نازل فرماتا ہے اس قصہ کے اندر درس عبرت ہے اہل نظر کے لئے۔

وَاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ان مخففہ ہے اصل میں ان تھا یعنی ہم یقیناً قوم نوح کو مصائب میں مبتلا کرنے والے تھے یا اپنے بندوں کی آزمائش کرنے والے تھے بعض مفسرین کے نزدیک ان نافیہ ہے اور لمبتلین میں لام بمعنی الا ہے یعنی نوح کو پیغمبر بنا کر بھیجنا اور ان کا وعظ و نصیحت کرنا اور کسی غرض سے نہ تھا مگر اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ہم کو نوحؑ کی قوم کی جانچ کرنی تھی ان کو آزمانا تھا ان کا امتحان لینا تھا کہ نزول عذاب سے پہلے ان کا عمل کیا ہوتا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

(ہم نے ان کو غرق کر دیا) ان کے بعد پھر ایک اور قوم کو پیدا کیا اور ان کے اندر انہی میں سے ایک شخص کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔

قرنا اخرین سے مراد ہے قوم عاد یا قوم ثمود۔ بقول بغوی اول زیادہ مناسب ہے (کیونکہ قوم نوح کے بعد قوم عاد ہی پیدا ہوئی جس کی ہدایت کے لئے اللہ نے رسول کو بھیجا تھا)

اگر عاد مراد ہو تو رسول سے حضرت ہودؑ مراد ہوں گے اور ثمود مراد ہو تو رسول سے مراد حضرت صالحؑ ہوں گے۔

منھم کا یہ مطلب ہے کہ رسول انہی کی قوم سے تھا جس کی سچائی اور خوش رفتاری سے سب لوگ واقف تھے اور سب کو اس کے سچا اور نیک ہونے کا اقرار تھا۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ (یہ پیام دے کر بھیجا) کہ اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں سو کیا تم (اس کے عذاب سے) نہیں ڈرتے (کہ دوسروں کی پوجا کرتے ہو)۔

ع ۲

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ اور (پیغمبر کی یہ بات سن کر) ان کی قوم میں جو سردار تھے جنہوں نے کفر کیا تھا اور قیامت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور دنیوی زندگی میں ہم نے ان کو عیش بھی دیا تھا کہنے لگے کہ یہ تو تمہاری طرح ایک معمولی آدمی ہے۔

بلقاء الاخرہ یعنی قیامت اور قیامت کے عذاب و ثواب کے منکر تھے۔

اترفنھم ہم نے ان کو خوش عیش بنایا تھا، مال و اولاد کی کثرت عطا کی تھی۔
مثلکم تم جیسا ہے یعنی انسانی احوال و اوصاف میں تمہاری طرح ہے۔
یَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ جو تم کھاتے ہو وہی یہ بھی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی یہ بھی پیتا ہے (یعنی تمہاری طرح کھانا کھانے اور پانی پینے کا ضرورتمند ہے)۔
وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اور بخدا اگر تم اپنے جیسے آدمی کے (کہے پر چلے اور) فرماں بردار بن گئے تو یقیناً اس وقت گھاٹے میں رہو گے۔ کہ اپنے جیسے آدمی کے فرماں بردار بنو گے اور خود اپنے کو ذلیل کرو گے وہ لوگ عجیب بیوقوف اور جاہل تھے کہ اپنے جیسے آدمی کی بات ماننے کا تو انکار کرتے تھے اور بے جان پتھروں کی پوجا کر کے اپنے ذلیل ہونے کا مظاہرہ کرتے تھے۔
اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ کیا یہ شخص تم سے کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور (بلا گوشت پوست کی خالی) ہڈیاں ہو جاؤ گے تو (دوبارہ زندہ کر کے زمین سے) نکالے جاؤ گے۔

ایعدکم میں استفہام انکاری ہے یعنی ایسا نہیں کہنا چاہئے یا سوال تقریری ہے یعنی یہ ضرور ایسا کہہ رہا ہے۔ نبوت پر جو انہوں نے طنز کیا تھا اس کو پختہ کرنے کے لئے کافروں نے یہ بات کہی (کہ یہ نبی کیسے ہو سکتا ہے یہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانے کا احمقانہ عقیدہ رکھتا ہے) یا مقولہ سابقہ کی علت ہے پہلے انہوں نے کہا کہ اپنے جیسے آدمی کی اگر اطاعت کرو گے تو گھاٹا پاؤ گے اس کا ثبوت یہ پیش کیا کہ یہ وقوع قیامت کا قائل ہے (دنیا کے سارے عیش میں خلل ڈالنا چاہتا ہے اس کی بات کو ماننے سے اس زندگی میں خسارہ ہی اٹھانا پڑے گا)۔
هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید (از عقل) ہے جو بات تم سے کہی جا رہی ہے (اور جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے)۔
لماتوعدون مبتدا محذوف کی خبر ہے (یعنی سچائی یا عقل سے) یہ دوری اس چیز کی ہے جو تم سے کہی جا رہی ہے۔ یا لام زائد ہے اور ماتوعدون ھیھات کا فاعل ہے اور ہیہات بمعنی ماضی ہے) بعض کے نزدیک ہیہات مصدر ہے یعنی دوری ہے اس بات کی جو تم سے کہی جا رہی ہے۔
اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا یہ زندگی اور کچھ نہیں سوائے اس دنیوی زندگی کے حیات دنیا یعنی وہ زندگی جس میں ہم ہیں اور جو ہمارے قریب ہے (دنو کا معنی ہے قرب۔ دنیا مؤنث ادنیٰ کا ہے اور ادنیٰ اسم تفضیل ہے دنو مادہ ہے مترجم)۔
نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے (رہتے) ہیں اور ہم (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھائے نہیں جائیں گے۔ یعنی ہم میں سے کوئی مرتا ہے کوئی پیدا ہوتا ہے بغوی نے کہا دوبارہ زندگی کے وہ لوگ منکر تھے اس لئے نحیا کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سب زندہ ہوں گے بلکہ کلام میں تقدیم تاخیر ہے یعنی ہم تم سب پیدا ہوتے ہیں پھر مر جاتے ہیں۔ یہ مطلب اس وقت ہو گا کہ نموت اور نحیا سے مراد ہوں سب آدمی (لیکن اگر بعض کا مرنا اور بعض کا پیدا ہونا مراد ہو تو اس تاویل کی ضرورت نہ ہو گی۔ مترجم)
میں کہتا ہوں اگر سب ہی لوگ مراد ہوں تب بھی بغوی کی تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ واؤ فقط عطف اور جمعیت کو ظاہر کرتا ہے (ترتیب پر بقول احناف دلالت نہیں کرتا پس مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب مرتے جیتے رہتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ ہم مر جائیں گے پھر دوبارہ زندہ ہوں گے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ یہ شخص (جو اللہ کی طرف سے رسول ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور وقوع قیامت کا قائل ہے) جھوٹا ہے اس نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے اور ہم تو اس کی بات کا یقین کرنے والے نہیں ہیں یہ جملہ مَاهٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی

تاکید ہے۔
قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ پیغمبر نے کہا اے میرے رب کافروں نے میری تکذیب کی (اب) تو میری مدد فرما اور ان پر عذاب نازل کر یعنی میرا انتقام لے۔
قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ اللہ نے فرمایا کچھ ہی وقت کے بعد یہ لوگ ضرور پشیمان ہوں گے۔

عما میں ما زائد ہے جو مفہوم قلت کی تاکید کر رہا ہے یا نکرہ ہے اور قلیل اس کی صفت ہے یعنی تھوڑے وقت کے بعد مراد یہ ہے کہ جب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ایسا عنقریب ہو جائے گا تو ضرور پشیمان ہوں گے۔
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ چنانچہ ان کو ایک سخت چیخ (یعنی عذاب) نے موافق (وعدہ) حق کے آپکڑا اور پھر ہم نے خس وخاشاک (کی طرح پامال) کر دیا۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ صیحۃ سے مراد ہے ہلاکت قاموس میں ہے صیحۃ اور صیاح سخت چیخ۔ صیح بہم ان کو گھبرا دیا گیا۔ صیح فیہم وہ ہلاک ہو گئے اور صیحۃ عذاب کو بھی کہتے ہیں۔

اگر قرنا اخرین سے قوم عاد مراد ہو تو صیحۃ سے مراد ہوگا عذاب اور اگر یہ قصہ ثمود کا ہے تو صیحۃ سے مراد ہوگی چیخ۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم نے بیان کر دیا ہے کہ آسمان سے ایک چیخ سنائی دی اور ہر چیز سے ایک چیخ نکلی اور بادل کا کڑکا بھی ہوا جس سے سب کے دل پھٹ گئے (قوم عاد پر چیخ کا عذاب نہیں آیا تھا بلکہ طوفان ہوائی آیا تھا جس کے جھکڑ سات دن تک مسلسل جاری رہے اور سب ہلاک ہو گئے اس لئے اگر آیت مذکورہ میں عاد کا قصہ بیان کیا گیا ہے تو صیحۃ سے مراد چیخ نہ ہوگی عذاب مراد ہوگا)۔

"ہم نے ان کو خس وخاشاک بنا دیا" یعنی ہلاک کر دیا جیسے سیلاب کے اوپر کوڑا کرکٹ بہہ کر آجاتا ہے۔ ہم نے اس کوڑے کی طرح ان کو کر دیا۔ جو شخص ہلاک ہو جائے، عرب اس کے متعلق کہتے ہیں سال بہ الوادی۔ نالا کا سیلاب اس کو بہا لے گیا۔

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾ سو خدا کی مار کافر لوگوں پر۔

بعد وہ ہلاک ہو گیا۔ بعدا مصدر ہے۔ جملہ یا خبریہ ہے ہلاکت ہو گئی ان کافروں کی۔ یا انشائیہ دعائیہ، ہلاکت ہو ان کافروں کی۔ للقوم الظلمین قائم مقام فاعل کے ہے اور بعدا مصدر ہے فعل کے قائم مقام اور لام زائد ہے یا مصدری معنی کو قوت پہنچانے کے لئے لایا گیا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۴۲﴾ؕ پھر قوم عاد کے بعد ہم نے دوسری قومیں پیدا کیں جیسے قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب وغیرہ۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ؕ (ان امتوں میں سے) کوئی امت نہ اپنی (ہلاکت کے) مقررہ میعاد سے پہلے ہلاک ہو سکتی تھی نہ مقررہ وقت ہلاکت سے پیچھے (باقی) رہ سکتی تھی۔ یعنی ہلاکت کا جو وقت مقرر تھا نہ اس سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ وقت مقرر کے بعد زندہ رہ سکتی تھی۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ پھر ہم نے ان کے پاس اپنے پیغمبروں کو (ہدایت کے لئے) پے در پے بھیجا۔

تترا اصل میں وترا تھا وترا وتر سے مشتق ہے۔ وتر (طاق) شفع (جفت) کی ضد کو کہتے ہیں۔ تواتر اور مواترہ چیزوں کا پے در پے یعنی ایک کے بعد دوسرے کا اور دوسرے کے بعد تیسرے کا آنا اور بغیر کسی اجتماعیت کے تسلسل قائم ہونا۔

قاموس میں ہے تواتر پے در پے ہونا۔ (بغیر کسی انقطاع وخلا کے) یا مع انقطاع کے۔ واتر مواترہ ووتارا ایک کے پیچھے

دوسرا آیا، کیونکہ مواترت بین الاشیاء اسی وقت ہوتی ہے جب ان چیزوں کے درمیان انقطاع ہو۔
حضرت مفسر نے فرمایا مراد یہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اشیاء میں تواتر اسی وقت ہوگا جب ان کے درمیان انقطاع ہو (اتصال والتصاق نہ ہو) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں آیا ہے لاباس بقضاء رمضان تترا رمضان کے جو روزے ناغہ ہوگئے ہوں ان کو متفرق طور پر ادا کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ کذا فی النہایۃ۔ اصمعی نے کہا واترت الخبر اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک کے پیچھے دوسری خبر دی جائے اور دونوں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔
میں کہتا ہوں اسی وجہ سے خبر متواتر اس خبر کو کہتے ہیں جو الگ الگ اتنی اسناد اور اتنے راویوں سے منقول ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہو جانا ناممکن ہو۔

ثم ارسلنا کا عطف ثم انشانا پر ہے اس میں جمع کا جمع سے مقابلہ ضرور ہے مگر اس طور پر کہ ایک جمع کی اکائی کو دوسری جمع کی اکائی کے ساتھ ملا دیا جائے گویا مطلب اس طرح ہوا۔ پھر ہم نے ایک قوم پیدا کی پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول کو بھیجا، پھر ہم نے دوسری امت پیدا کی اور اس کی ہدایت کے لئے پھر دوسرا نبی بھیجا۔ اسی طرح آگے اس توضیح کے بعد معنی میں کوئی بگاڑ نہیں ہوگا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ہم نے کچھ اقوام کو پیدا کیا پھر ان کے بعد کچھ پیغمبروں کو بھیجا۔

كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

جب کبھی کسی امت کے پاس ان کا رسول (ہدایت کے لئے) آیا تو انہوں نے رسول کو جھٹلایا سو ہم نے بھی (ہلاک کرنے میں) ایک کے بعد ایک کا نمبر لگا دیا اور ان کو کہانیاں بنا دیا پس خدا کی مار بے ایمان لوگوں پر۔
رسول کے ساتھ اگر بھیجنے کا ذکر ہو تو بھیجنے والے کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ (جیسے ہم نے اپنا رسول بھیجا) اور اگر رسول کے ساتھ پہنچنے اور آنے کا ذکر ہو تو جن کی طرف رسول کو بھیجا جاتا ہے ان لوگوں کی طرف رسول کی نسبت کی جاتی ہے (جیسے اللہ کا رسول اول کی مثال میں اور قوم ثمود کا رسول دوسرے کی مثال میں کہا جا سکتا ہے) بھیجنا مبداء ہے اس لئے مرسل کی طرف نسبت ہونی چاہئے اور پہنچنا منتہا ہے اس لئے مرسل الیہم کی طرف نسبت ہونی چاہئے۔
کذبوہ یعنی اکثر لوگوں نے تکذیب کی اکثر کے لئے حکم کل کا ہوتا ہے اس لئے سب کی طرف نسبت تکذیب کر دی (باوجودیکہ بعض ایمان لانے والے بھی تھے)۔
فاتبعنا بعضھم بعضا یعنی جس طرح پیغمبروں کو ہم نے یکے بعد دیگرے بھیجا اسی طرح امتوں کو بھی ایک کے بعد ایک کو ہلاک کر دیا۔
وجعلنھم احادیث اور ہم نے ان کو کہانیاں بنا دیا۔ یعنی ان کی داستانیں اور ہلاکت کے قصے رہ گئے جن کو لوگ بطور داستان بیان کرتے ہیں اور عبرت آموز دماغوں والے ان سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔
احادیث، احدوثۃ کی جمع ہے۔ احدوثۃ وہ قصہ ہے جس کو لوگ دل بہلانے کے لئے تعجب کے ساتھ پڑھتے اور بیان کرتے ہیں۔ اخفش نے کہا یہ یعنی لفظ احدوثۃ اور احادیث کا استعمال شر کے موقع پر ہوتا ہے اور خیر کے موقع پر یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم نے ان کو احادیث بنا دیا بلکہ یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص حدیث (ایک افسانہ یا واقعہ) ہو گیا۔
بعض نے کہا احادیث حدیث کا اسم جمع ہے احادیث النبی ﷺ (رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں) کہا جاتا ہے۔
فبعد القوم لا یومنون یعنی جو لوگ پیغمبروں پر ایمان نہیں لاتے اور ان کو سچا نہیں جانتے ان پر خدا کی مار وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾
پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارونؑ کو اپنی آیات

اور کھلی ہوئی دلیل دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا سو انہوں نے (ماننے اور تصدیق کرنے سے) تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی متکبر۔

سلطٰن مبین کھلی دلیل جو مقابل حریف کو لاجواب بنا دینے والی ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلطٰن مبین سے مراد عصا ہو، سب سے پہلا معجزہ یہی تھا اسی لئے اس کو مستقل طور پر ذکر کیا۔ اسی سے متعدد معجزات صادر ہوئے تھے۔ مثلاً وہ سانپ بن جاتی تھی۔ جادوگروں نے رسیوں سے جو سانپ بنائے تھے انکو یہ لاٹھی نگل گئی تھی۔ اسی کی ضرب سے سمندر کا پانی پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا تھا، اسی کی ضرب سے پتھر سے چشمے جاری ہو جاتے تھے، یہ پڑاؤ کرنے کے وقت چاروں طرف گھوم کر لشکر کی حفاظت کرتی تھی۔ یہی رات میں شمع کا کام دیتی تھی یہی پھلدار درخت بن گئی تھی یہی چشموں کے اندر سے پانی نکالنے کے لئے رسی ڈول کا کام دیتی تھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیات سے مراد معجزات ہوں، یا دونوں سے مراد معجزات ہوں۔ یہ سب نشان نبوت تھے اور حضرت موسیٰ کے دعوے کی دلیل تھے۔ (عام اہل تفسیر کے نزدیک آیات سے مراد نو معجزات نہیں بلکہ احکام مراد ہیں مترجم)

عالین یعنی وہ لوگ مغرور تھے لوگوں پر جبر اور ظلم کیا کرتے تھے۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

چنانچہ (باہم) کہنے لگے کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں کو پیغمبر مان لیں، حالانکہ ان کی قوم والے لوگ (سب کے سب) ہمارے زیر حکم ہیں اس غرور کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے موسیٰؑ وہارونؑ کو جھوٹا قرار دیا اور ہلاک کردہ (قوموں) میں سے ہو گئے۔

انومن میں استفہام انکاری ہے یعنی ان دونوں کی فضیلت اور نبوت کو ہم تسلیم نہیں کریں گے اور ان کی تصدیق نہیں کریں گے

لبشرین بشر کا اطلاق ایک پر بھی ہوتا ہے جیسے آیت فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا میں اور جمع پر بھی اطلاق ہوتا ہے جیسے آیت فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا میں۔

مثلنا لفظ مثل کا اطلاق ایک پر بھی ہوتا ہے اور دو پر بھی اور بہت پر بھی اور مذکر پر بھی اور مؤنث پر بھی۔ وقومھما قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ لنا عبدون ہمارے خدمت گار ہیں زیر حکم ہیں عرب لوگ ہر اس شخص کو عابد کہہ دیتے ہیں جو کسی کا خدمتی اور حکم بردار ہو۔

من المھلکین یعنی غرق کر دیئے گئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توریت) عطا کی تاکہ وہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل) سیدھا راستہ پالیں (یعنی ان کو اللہ کے احکام معلوم ہو جائیں اور معرفت کا راستہ پالیں)۔

لعلھم کی ضمیر بنی اسرائیل کی طرف راجع ہے قوم فرعون کی طرف راجع نہیں ہے کیونکہ قوم فرعون کے ڈوبنے کے بعد توریت کا نزول ہوا تھا۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اور ہم نے مریم کے بیٹے (عیسیٰؑ) کو اور ان کی ماں (مریم) کو ایک بڑی نشانی بنایا۔ نشانی بنانے سے مراد ہے بغیر باپ کے پیدا کرنا اور یہ نشانی دونوں کی ایک ہی تھی اس لئے لفظ آیۃ بصیغۂ واحد ذکر کیا۔ یا یوں کہا جائے کہ ابن مریم کے بعد لفظ آیۃ محذوف ہے یعنی ہم نے ابن مریم کو نشانی بنایا کہ انہوں نے شیر خوار ہونے کی حالت میں جب کہ پالنے میں تھے بات کی اور ماں کی پاک دامنی ظاہر کی اور دوسرے معجزے ان سے ظاہر ہوئے۔ اور ان کی ماں کو بھی نشانی بنایا کہ بغیر مرد کی قربت کے ان کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوا۔

اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ اور ہم نے دونوں کو ایک ایسی بلند زمین پر لے جا کر پناہ دی جو (بوجہ اناج اور میوہ جات کے) ٹھہرنے کے قابل اور شاداب جگہ تھی۔

ربوۃ زمین میں اونچی جگہ، حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا۔ یہ دمشق تھا۔ سعید بن مسیب اور مقاتل کا بھی یہی قول

ع ۳ ۱۸/۳

ہے۔

ضحاک نے کہا غوطہ دمشق مراد ہے۔[1] حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا (ابوہ سے رملہ مراد ہے عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ ربوہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہی قول قتادہ اور کعب کا ہے۔ کعب نے کہا ربوہ کا حصہ بہ نسبت دوسری زمین کے اٹھارہ میل آسمان کے قریب تھا۔ ابن زید کے نزدیک مصر مراد ہے (یہی قول تاریخی حیثیت سے زیادہ قوی ہے کیونکہ یہودی بادشاہ ہیرودس جب حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے درپے ہو گیا تھا تو حضرت مریم اپنے بچہ کو لے کر مصر چلی گئی تھیں۔ مترجم) سدی کے نزدیک فلسطین کی سرزمین مراد ہے۔

ذات قرار قرار والی ہموار زمین جس پر رہنے والے ٹھہر سکیں۔

بعض نے کہا پھلوں اور اناج والی زمین جس کی وجہ سے لوگ وہاں رہ سکیں۔ معین جاری پانی۔ معن الماء پانی بہنے لگا۔ یا معین ماعون سے بنا ہے اور ماعون کا معنی ہے نفع پانی بھی بڑی کام کی چیز ہے۔ یا معین عان کا اسم مفعول ہے عان کا معنی ہے آنکھ سے دیکھا ربوہ بھی اونچی زمین تھی (دور سے) آنکھوں سے دیکھی جا سکتی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اے پیغمبر و حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

طیبت سے مراد ہیں حلال چیزیں اور امر وجوب کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ حرام چیزیں نہ کھاؤ (اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حلال چیزیں کھاؤ یعنی کل حلال چیزیں کھانے کا حکم وجوبی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حرام چیزیں نہ کھاؤ مترجم) یا لذیذ مباح چیزیں مراد ہیں اس وقت امر اباحت اور سہولت پیدا کرنے کے لئے ہوگا اس سے رہبانیت اور ترک لذات کی تردید ہو جائے گی۔

بعض نے کہا اس سے حلال صاف قوام والا مراد ہے حلال تو حرام کی ضد ہوتا ہے اور صاف سے یہ مراد ہے کہ اس کے کھانے سے اللہ کی یاد نہ بھولے اس کا کھانا اللہ کی یاد سے غافل نہ بنادے اور خواہشات نفسانی میں نہ ڈال دے اور قوام سے یہ مراد ہے کہ نفس کی خواہش کو روک دے عقل کی حفاظت رکھے، یعنی سیری کی مقدار سے زائد نہ ہو۔

نیک کام سے مراد ہے اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنا جو محض اللہ کی خوشنودی کے لئے کیا جائے اس میں کسی قسم کے شرک کی آمیزش بھی نہ ہو، فاسد نہ ہو یعنی قول و فعل نہ ہو جو اللہ کو پسند نہیں ہے۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر زمانہ میں اس زمانہ کے پیغمبر کو حکم دیدیا تھا کہ حرام چیز نہ کھانا حلال کھانا اور نیک کام کرنا۔ یہ کلام حقیقت میں گزشتہ واقعات کا بیان ہے۔

حسن، مجاہد، قتادہ، سدی، کلبی اور مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یایہا الرسل سے خطاب صرف رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ عرب کا طریقہ ہے کہ ایک کو جمع کے صیغہ سے خطاب کر لیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ایک کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے جمع کے صیغہ سے خطاب کیا جاتا ہے اس قسم کے خطاب میں مخاطب کی بزرگی کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ ایک جماعت کے قائم مقام ہے پس جمع کا صیغہ بول کر رسول اللہ ﷺ کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے اور ایماء ہے اس طرف کہ آپ کو سب لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا کہ صیغۂ جمع سے خطاب رسول اللہ ﷺ اور علمائے امت کو ہو رسول اللہ اور علمائے امت کے درمیان ایک برزخی درجہ رکھتا ہے اور علمائے امت رسول اور دوسرے لوگوں کے درمیان برزخی درجہ رکھتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے علماء انبیاء کے قائم مقام ہیں یا علوم انبیاء کے وارث ہیں۔

بعض اہل علم نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کو خطاب ہے اور یہ خطاب اس وقت کیا گیا تھا جب ربوہ میں وہ پناہ گزیں ہو گئے تھے اس خطاب میں اس حکم کو بیان فرمایا ہے جو انبیائے سابقین کو دیا گیا تھا۔ تاکہ یہ دونوں بزرگ بھی سابق انبیاء کی

[1] غوطہ نشیبی زمین گڑھا۔ غوطہ دمشق کے قریب ایک شہر کا نام ہے (مجمع البحار) یہ بھی مجمع البحار کے مؤلف نے بیان کیا ہے کہ غوطۂ دمشق ان باغوں اور چشموں کو کہا جاتا ہے جو شہر کے گرداگرد ہیں۔

پیروی کریں۔ بیان قصہ کا تقاضا یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کو ہی مخاطب قرار دیا جائے۔

اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۵۱﴾ جو کچھ تم کرتے ہو میں بلاشبہ اس کو جانتا ہوں (تمہارے اعمال کے مطابق جزا دوں گا)۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ اور یہ ہے تمہارا طریقہ۔ ایک طریقہ اور میں تمہارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرو (میری ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ بناؤ اور نہ میری نافرمانی کرو۔ مترجم)۔

امتکم یعنی تمہاری ملت اور شریعت جس پر تم سب قائم ہو۔

امۃ واحدہ ایک طریقہ یعنی اسلام عقائد اور اصول اعمال (اور بنیادی دستور) میں سب کا ایک طریقہ ہے۔ فرعی اعمال میں حسب حکم خداوندی زمانہ کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہے اور منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل ضروری ہے۔

فاتقون ف سببیہ ہے یعنی میں چونکہ تمہارا رب ہوں اس لئے مجھ سے ڈرو۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ سو لوگوں نے اپنے دین میں (اپنا طریق الگ الگ کر کے) اختلاف پیدا کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ دین ہے وہ اسی پر اترائے ہوئے ہیں۔ یعنی جن لوگوں کے پاس پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے پیغمبروں کے بعد دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور ایک دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اصولی اختلاف دین بنا لیا اور ایک دین کے چند دین بنا لئے کوئی تو تمام پیغمبروں کو اور ان کے لائے ہوئے احکام کی تصدیق کرتا رہا یہ ہر زمانے میں اہل حق کا گروہ رہا اور کچھ لوگ کسی پیغمبر اور کسی حکم پر ایمان لائے۔ دوسرے انبیاء و احکام کا انکار کر دیا۔ جیسے یہودی اور عیسائی اور صابی بعض نے سب ہی کا انکار کر دیا جیسے مجوسی اور بت پرست مذکورہ بالا تفسیری مطلب اس صورت میں ہوگا جب تقطعوا کو قطعوا کے معنی میں مانا جائے (تفعّل بمعنی تفعیل آتا ہے لیکن یہ بھی جائز ہے کہ امرھم سے پہلے حرف جر (فی) محذوف ہو۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ وہ دین کے معاملہ میں پارہ پارہ ہو گئے گروہ گروہ بن گئے اور ایک دین کے انہوں نے بکثرت دین بنا لئے۔

تقطعوا اور امرھم اور بینھم کی ضمیریں ان لوگوں کی طرف راجع ہیں جن کے پاس پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا۔ مثلاً حضرت نوح کی قوم کے متعلق فرمایا تھا۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ یا اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رُسُلَنَا تَتْرٰی۔

زبراً گروہ گروہ فرقہ فرقہ ٹکڑے ٹکڑے زبر زبور کی جمع ہے۔ زبور کا معنی ہے ٹکڑا فرقہ زبر الحدید لوہے کے ٹکڑے۔

بعض علماء نے زبرا کا ترجمہ کیا ہے کتابیں۔ زبرت الکتاب میں نے جلی حروف میں کتاب لکھی ہر جلی موٹے حروف کی کتاب کو زبور کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا دین پہلے ایک کتاب کی شکل میں تھا جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی تھی لیکن انہوں نے اس کی متعدد تحریف کردہ کتابیں بنا ڈالیں۔

حسن نے اس طرح مطلب بیان کیا کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور بگاڑ دیا۔

بما لدیھم جو کچھ ان کے پاس تھا یعنی جو دین ان کے پاس تھا یا جو نفسانی خواہش ان کی تھی۔

فرحون اتراتے ہیں اپنے دین کو حق سمجھتے ہیں اسی پر مغرور ہیں۔

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ سو آپ ان کو اسی جہالت میں ایک خاص وقت تک رہنے دیجئے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (یعنی) کفر و گمراہی میں (رہنے دیجئے) بعض نے کہا عمرہ سے مراد ہے غفلت اور باوجود نہ جاننے کے جاننے کا دعویٰ کرنا۔ غفلت کو اس پانی سے تشبیہ دی۔ جس میں آدمی ڈوب جاتا ہے اس کے قد سے بھی پانی اونچا ہو جاتا ہے۔

حتی حین ایک خاص وقت تک یعنی وقت موت تک یا اس وقت تک کہ اللہ آپ کو جہاد کا حکم دیدے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ ان کے کفر سے رنجیدہ نہ ہوں۔ ہم ان کی گرفت ضرور کریں گے یا اپنی طرف سے براہ راست عذاب بھیج کر آپ کے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے۔

اَيَحْسَبُونَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

کیا ان لوگوں کا یہ گمان ہے کہ ہم ان کو جو کچھ مال و اولاد دیتے چلے جاتے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی زیادہ فائدے دے رہے ہیں (ایسا ہرگز نہیں ہے) بلکہ (اس کی وجہ کا) ان کو احساس نہیں ہے۔ یعنی جو لوگ اپنی گمراہی میں خوش ہیں اور پیغمبروں کا فرمان نہیں مانتے ان کو جھوٹا جانتے ہیں اور جو کچھ ہم ان کو مسلسل دیتے چلے جاتے ہیں اور مال و اولاد کی مدد پہنچا رہے ہیں اس سے ان کا خیال ہوتا ہے کہ ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں اس عطاء میں ان کی بھلائی ہے عزت افزائی ہے اور ان کے اعمال کی جزاء ہے اور اللہ ان سے خوش ہے ایسا ہرگز نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں ان میں نہ دانش ہے نہ شعور۔

حسن بصری نے فرمایا مومن نیکی بھی کرتا ہے اور پھر ڈرتا بھی رہتا ہے اور منافق بدی کرتا ہے اور پھر بے فکر بھی رہتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾

بے شک جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔ آیات سے مراد ہیں قرآنی آیات جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتی ہیں یا وہ نشانیاں مراد ہیں جو توحید کو ثابت کر رہی ہیں۔

یومنون ایمان رکھتے ہیں یعنی نشانیاں اور آیات سے جس چیز کا اظہار ہوتا ہے اس کو مانتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں قرار دیتے یعنی اپنے رب کی عبادت میں کسی طرح کے شرک کی آمیزش نہیں کرتے نہ شرک جلی کرتے ہیں۔ نہ شرک خفی۔ شرک نہ کرنے کا جو مطلب بیان کیا ہے اس سے مضمون کی تکرار کا شبہ جاتا رہا بظاہر اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے ساتھ شریک قرار نہ دینا ایک ہی مفہوم رکھتا ہے لیکن جب شرک سے عبادت میں شرک مراد لے لیا جائے تو وحدت مضمون باقی نہیں رہتی کیونکہ اللہ کو ماننے کے بعد بھی اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیا جا سکتا تھا (جیسے عرب کے مشرک بلکہ تمام بت پرست کرتے ہیں کہ اللہ کو بھی مانتے ہیں اور اسی کے ساتھ دوسروں کی بھی پوجا کرتے ہیں)۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾

اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) جو کچھ دیتے ہیں ایسی حالت میں دیتے ہیں کہ ان کے دل اس بات سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔

ما اتوا یعنی جو کچھ خیر خیرات کرتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ یہ آیت یوتون ما اتوا پڑھتی تھیں تو فرماتی تھیں جو کچھ نیک کام کرتے ہیں (یعنی حضرت عائشہ کے نزدیک دینے سے مراد صرف مال دینا نہیں بلکہ ہر کار خیر کرنا مراد ہے)۔

وجلة ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کی خیر خیرات رد نہ کر دی جائے اور قبول نہ کی جائے۔ یا اس طریقے سے نہ ہو پائے جو بارگاہ کبریائی میں پیش ہونے کے مناسب ہے اور اس پر ان کی پکڑ ہو جائے یا ان کو اپنے گناہوں کی کثرت اور طاعت کی قلت کی وجہ سے یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ خیر خیرات بھی ان کو اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکے۔

اِنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ یہ کلام سابق کی علت ہے لام (تعلیلیہ) محذوف ہے یعنی ان کے دل خوف زدہ رہتے ہیں اس وجہ سے کہ ان کی واپسی اللہ کے پاس ہو گی یا من محذوف ہے یعنی اس بات سے ان کے دل ڈرتے ہیں کہ اللہ کے پاس ان کو لوٹ کر جانا ہے اور وہ ان کے ہر عمل سے واقف ہیں حسن بصریؒ نے فرمایا وہ اللہ کی طاعت کرتے ہیں اور کوشش کے ساتھ کرتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی طاعت نامقبول نہ ہو جائے حضرت عائشہ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے آیت والذین یوتون ماآتوا وقلوبھم وجلۃ کے متعلق دریافت کیا اور عرض کیا (کیا) یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے اور چوری کرتے ہیں فرمایا نہیں اے صدیق کی بیٹی بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں نمازیں پڑھتے ہیں اور خیرات کرتے ہیں اور پھر بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کی یہ طاعت نامقبول نہ ہو جائے یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ۔

بیہقی کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے بیان کیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ کیا یہ وہ شخص ہے جو زنا کرتا شراب پیتا اور چوری کرتا ہے فرمایا نہیں اے صدیق کی بیٹی! (یہ وہ شخص نہیں) بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو رات کو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے اور خیرات کرتا ہے اور (پھر بھی) ڈرتا ہے کہ کہیں قبول نہ ہو۔

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ یہ لوگ (البتہ) اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور بھلائیوں کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ طاعتوں کی بہت زیادہ رغبت رکھتے ہیں اس لئے جلدی جلدی طاعتیں کرتے ہیں تاکہ کوئی طاعت فوت نہ ہو جائے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ طاعتوں میں پیش قدمی کرنے پر جن اخروی بھلائیوں کا وعدہ کیا گیا ہے اور نیک اعمال میں تیزی کرنے سے جن دنیوی فوائد کو وابستہ کیا گیا ہے سب فائدوں کے حاصل کرنے کے لئے وہ تیزی سے کام لیتے ہیں اور جلدی جلدی حاصل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مصیبت کو کوئی چیز رد نہیں کرتی سوائے دعا کے اور عمر میں کوئی چیز زیادتی نہیں کرتی مگر نیکی (یعنی خیر خیرات حسن سلوک) اس تفسیر پر اس آیت کا مضمون ویسا ہی ہو گا۔ جیسا آیت فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ کا ہے گویا ان کو وہ ثواب ملے گا جو ان کے مخالف لوگوں کو نہیں ملے گا۔

میں کہتا ہوں جن بھلائیوں کی طرف دنیا میں مومن تیزی سے بڑھتے ہیں ان سے مراد شاید یہ ہو کہ مومن کو اللہ کی یاد میں لذت آتی ہے اس کے دل کو چین ملتا ہے۔ وہ بقدر کفاف رزق پر قناعت کرتا اور سیر ہو جاتا ہے اس کو دنیوی نعمتوں کے زوال کا کوئی خوف نہیں ہوتا وہ سوائے اللہ کے نہ کسی سے امید وابستہ رکھتا ہے نہ ڈرتا ہے اس کو خواب میں یا بطور الہام مبشرات پہنچتی رہتی ہے۔

وھم لھاسبقون یعنی وہ نیکیوں کی طرف پیش قدمی کی وجہ سے جنت کی طرف سب سے آگے بڑھنے والے ہیں۔ یا سابقون سے (مراد سب سے آگے بڑھنا اور سبقت کر جانا نہیں بلکہ مراد ہے طاعتوں کی طرف یا ثواب کی طرف یا جنت کی طرف بڑھنا۔ یا یہ مراد ہے کہ آخرت سے پہلے وہ دنیوی فائدوں کی طرف بڑھنے والے ہیں کیونکہ (ثواب آخرت ... سے پہلے) فوری طور پر ان کے لئے دنیوی فائدے فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ لھاسبقون میں لام بمعنی الٰی ہے یعنی وہ بھلائیوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جیسے آیت لمانھوا عنہ میں لام بمعنی الٰی ہے اسی وجہ سے کلبی نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ تمام اقوام سے بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کی طرف سے ان کے لئے سعادت پہلے ہی سے (مقدر) ہو چکی ہے۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور ہم کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کام کا حکم نہیں دیتے (پس جتنے احکام شرعی ہیں سب انسان کی وسعت کے اندر

ہیں ناقابل برداشت نہیں ہیں) اور ہمارے پاس ایک دفتر (نامۂ اعمال کا) محفوظ ہے جو ٹھیک ٹھیک (سب کا حال) بتادے گا اور کسی پر ذرا ظلم نہ ہوگا۔

یعنی وہ لوگ جو نیکیوں کی طرف دوڑتے ہیں وہ اپنی خوش دلی اور طبیعت کی رغبت کی وجہ سے دوڑتے ہیں اور ہم نے ان کو برداشت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا ہم کسی کو وسعت سے بڑھ کر کام کرنے کا حکم نہیں دیتے۔ ولدینا کتب اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے کتاب سے مراد یا لوح محفوظ ہے یا اعمال ناموں کا رجسٹر ینطق بالحق جو ٹھیک ٹھیک بولے گی یعنی بتائے گی کہ تمام اعمال اس میں درج ہیں، موجود ہیں ہم ان میں سے کسی کو ضائع نہیں کریں گے۔ سب کا ثواب دیں گے۔ وھم لایظلمون اور کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی، نہ نیکیوں میں کمی کی جائے گی۔ نہ گناہوں میں زیادتی۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا بلکہ ان کے دل اس (دین) کی طرف سے جہالت (اور شک) میں پڑے ہوئے ہیں۔

غمرة چھا جانے والی غفلت۔

من ھذا یعنی عدم شعور سے بھی پس وہ دین کا شعور نہیں رکھتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ شعور نہیں رکھتے (جاہل مرکب ہیں) یا یہ مطلب ہے کہ نفس شعور سے غافل ہیں نہ اب جانتے ہیں نہ آئندہ سمجھیں گے چھا جانے والی غفلت کی وجہ سے ان میں شعور کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس امر سے بالکل غافل ہیں کہ انہوں نے اللہ کے پسندیدہ دین کو چھوڑ دیا ہے اور دین کو بدل کر فرقے فرقے بن گئے ہیں اور اپنی خواہش کے موافق دین اختیار کر رکھا ہے یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس قرآن سے غافل ہیں یا اہل ایمان کے محاسن کمالیہ سے غافل ہیں یا اعمالناموں کے رجسٹر سے غافل ہیں۔

وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ اور اس کے علاوہ ان کے اور بھی (برے برے) اعمال ہیں جن کو وہ کرتے رہتے ہیں۔

من دون ذلک اس کے دو مطلب ہیں ایک تو یہی جو ترجمہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ شرک اور کفر کے سوا ان کی بداعمالیاں اور بھی ہیں دوسرا مطلب یہ کہ مومنوں کے جو اوصاف و اعمال ہیں کافروں کے اعمال ان کے علاوہ اور ان سے ہٹ کر ہیں۔

عملون کرتے رہتے ہیں ان اعمال کے عادی ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ یہاں تک کہ جب ان کے خوش حال لوگوں کو (مرنے کے بعد) ہم عذاب میں دھر پکڑیں گے تو فوراً وہ چلا اٹھیں گے۔ مترفیھم ان میں کے خوش عیش، آرام میں پڑے ہوئے لوگ۔ بالعذاب ابن جریر نے بوساطت ابن جریج حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ العذاب سے مراد ہے بدر کی لڑائی میں قتل ہونا۔ ضحاک نے کہا وہ قحط مراد ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے ان پر پڑا تھا۔ حضور نے بددعا میں فرمایا تھا اے اللہ اپنی روندھ مضر (قریش کنانہ وغیرہ) پر سخت کردے اور ان پر یوسف کے زمانہ کے کال کی طرح (سات سال کا) قحط ڈال دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قحط کی مصیبت میں مبتلا ہوگئے۔ یہاں تک کہ کتوں کو اور مردار کو اور جلی ہوئی ہڈیوں کو بھی کھا گئے۔ یہ بددعا صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آئی ہے۔

جئر دہائی دینا چیخ پڑنا حتی کا ماقبل مابعد والے کلام کا سبب ہوتا ہے یہاں بھی کافروں کی غفلت ان کے ہلاک ہونے اور چیخ پڑنے کی علت ہے۔

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ اب مت چلاؤ ہماری طرف سے تمہاری مطلق مدد نہیں ہوگی۔ یعنی ان سے کہا جائے گا کہ اب مت چلاؤ تم کو چلانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد

ہو گی اور ہماری مدد کے بغیر عذاب سے تمہارا چھٹکارا نہ ہو گا۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

میری آیات تم کو پڑھ پڑھ کر سنائی جایا کرتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے (اس قرآن کی شان میں) بیہودہ بکتے ہوئے۔ نکوص الٹے پاؤں پلٹنا یعنی تم پشت پھیر کر منہ موڑ کر چل دیتے تھے عمل تو کیا اس کو مانتے بھی نہ تھے سنتے بھی نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے سے اور ان پر ایمان لانے سے تمہارا غرور روکتا تھا تم دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے۔

بہ حرم کی وجہ سے بہ کی ضمیر حرم کی طرف راجع ہے اگرچہ حرم کا لفظ مذکور نہیں ہے کیونکہ حرم والے ہونے کی وجہ سے ان کا غرور مشہور تھا۔ اس لئے مرجع کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ قریش کہا کرتے تھے ہم اہل حرم ہیں۔ خانہ خدا کے پڑوسی ہیں ہم کسی سے نہیں ڈرتے ہم پر کوئی غالب نہ ہو گا۔ حضرت ابن عباس مجاہد اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہی تفسیر کی ہے۔

بعض علماء قائل ہیں کہ آیات کی طرف ضمیر راجع ہے کیونکہ آیات اگرچہ جمع مؤنث ہے لیکن بمعنی کتاب ہے اس لئے واحد مذکر کی ضمیر ذکر کر دی گئی۔ اس صورت میں ب سببیہ ہو گی کیونکہ ان کے اندر مسلمانوں پر اپنی فوقیت کا غرور قرآن سننے کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

سمرا سمر کا مطلب ہے رات کو داستان قصے کہانیاں کہنا یعنی رات کو کعبے کے گرداگرد اپنے اپنے جلسوں میں قصے کہانیاں کہتے رہتے ہو (اور قرآن سننے سے تکبر کرتے ہو) سامر اسم جمع ہے جیسے باقر اور حامل (اس جگہ جمع مراد ہے کیونکہ سامرا مستکبرین کے فاعل سے حال ہے اور مستکبرین جمع کا صیغہ ہے) ہم سمار بھی کہا جاتا ہے اور ہم سامر بھی کذا فی النہایۃ حدیث قیلہ میں آیا ہے اذجاء زوجها من السامر جب اس کا شوہر ان لوگوں کے پاس سے آیا جو قصے کہانیاں کہنے میں مشغول تھے۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے سمر سمرا وسمورا پیدار ہا۔ ہم السمار والسامرہ اور سامر اسم جمع ہے۔ سمر رات کی کہانیاں چاندنی، تاریکی، زمانہ، بیضاوی نے لکھا ہے سامر بروزن فاعل اصل میں مصدر ہے جیسے عافیت، بعض کے نزدیک سامر مفرد ہے لیکن محل جمع میں آسکتا ہے جیسے طفل اطفال کے بجائے مستعمل ہے آیت میں آیا ہے یخرجکم طفلا یعنی اطفالاً۔

بعض نے کہا سامر تاریک رات کو کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہے اس تفسیر پر سامر اظرف ہو گا یعنی فی السامر یعنی رات میں تم اپنے قصوں میں مشغول ہوتے ہو اور قرآن سننے سے تکبر کرتے ہو۔

تہجرون ہجر کا معنی ہے فحش بکنا، بری باتیں کہنا، یا یہ لفظ ہجر سے مشتق ہے اور ہجر کا معنی ہے کٹ جانا کترا جانا یا بیہودہ بکواس کرنا۔ یعنی تم قرآن سے کٹ جاتے ہو کتراتے ہو یا رسول اللہ ﷺ کی شان میں یا قرآن کی شان میں بیہودہ بکتے ہو ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ قریش کعبے کے گرداگرد رات کو قصے کہانیاں تو کہتے تھے مگر طواف نہیں کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت مستکبرین بہ سمرا تہجرون نازل ہوئی۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ کیا ان لوگوں نے اس کلام الٰہی میں غور نہیں کیا۔ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ القول سے مراد ہے قرآن مجید الف لام عہدی ہے یعنی وہ کلام جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا اور آپ ﷺ نے پیش کیا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے تو قرآن پر خوب غور کر دیکھا ہے اور اس کے مقابلے کی بھرپور کوشش بھی کر لی ہے اور ایک چھوٹی سورت کی مثل بھی نہیں بنا سکے ہیں جس سے قرآن کا اعجاز ان پر واضح ہو گیا ہے اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے بڑوں کے پاس نہیں آئی۔

ام بمعنی بل ہے اور استفہامی ہمزہ، انکاری ہے پورا مطلب اس طرح ہوا بلکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں آئی جو ان

کے اول بزرگوں کے پاس نہ آئی ہو بلکہ وہی چیز آئی ہے جو ان کے پہلے بڑوں (حضرت ابراہیمؑ) حضرت اسماعیلؑ اور ان کے اس آچکی ہے۔ یعنی نبوت اور کتاب ان کے اعلیٰ مورثوں کے پاس بھی آچکی ہے اور محمد ﷺ کے پاس بھی اللہ نے بھیجی۔

قریش کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی نبوت کا اقرار تھا اور رسول اللہ ﷺ بھی انہی کی طرح تھے لہذا کوئی ناممکن (نئی) بات نہیں ہوئی۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ یا یہ لوگ اپنے رسول ﷺ کو پہچانتے نہیں پس (کیا وجہ ہے کہ) ان کے منکر ہیں۔ یعنی بچپن سے بڑے ہونے تک ہمیشہ جانتے رہے ان کے نسب کو امانت داری سچائی، حسن اخلاق، تہذیب، ادب ایفائے وعدہ کمال علمی اور کسی انسان سے تعلیم حاصل نہ کرنے سے بھی واقف رہے کذا قال ابن عباس۔

خلاصہ یہ کہ جب وجوہ مذکورہ میں سے انکار کی کوئی ایک وجہ بھی موجود نہیں تو پھر انکار کرنا جائز ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول کو جنون ہے یہ بھی ام منقطعہ ہے مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو دیوانہ کہتے ہیں حالانکہ انکو علم ہے کہ اللہ کے رسول کی دانش بڑی وزنی اور نظر و فکر کی گہرائی سب سے زیادہ ہے ایسے شخص کی طرف جنون کی نسبت سوائے دیوانہ یا عنادی دشمن کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام مقامات پر ام متصلہ ہو اور جملہ افلم یدبروا جملہ مستانفہ ہے اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ جب آیت قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ الخ سننے والوں نے سنی تو خواہ مخواہ دل میں سوال پیدا ہوا کہ آخر قرآن سے کترانے، الٹے پاؤں لوٹنے، غرور کرنے اور بیہودہ بکواس کی وجہ کیا ہے۔ کیا قرآن پر انہوں نے غور نہیں کیا یا ان کو اس سے پہلے گزشتہ زمانہ میں کسی پیغمبر کے آنے کی اطلاع نہیں ملی یا اس نبی کی امانت داری اور سچائی وغیرہ کو یہ پہچانتے نہیں۔ یا یہ رسول اللہ صلعم کو دیوانہ خیال کرتے ہیں اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ بلکہ (اس عناد اور جھگڑے کا سبب یہ ہے کہ) یہ رسول ان کے پاس حق بات لے کر آئے ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ حق سے نفرت کرنے والے ہیں۔

الحق واقعی سچی بات جس کی سچائی عقلاً نقلاً ظاہر ہو اس کی صحت سورج کی طرح ناقابل انکار ہو۔

اکثرھم للحق کرھون ان میں اکثر لوگ محض عناد یا سرداری کی خواہش اور حکومت کی طمع یا خواہشات کے پرستار ہونے یا جاہلوں کی تقلید کرنے یا رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے حق سے نفرت کرتے ہیں۔ تقاضائے دانش و فہم باعث نفرت نہیں۔

اکثر کا لفظ اس لئے ذکر کیا کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی قوم کے خوف یا فہم و دانش کی کمی یا غور و فکر کی وجہ سے ایمان کو ترک کیا تھا ان کے دلوں میں حق سے عناد نہ تھا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ

اور (بفرض محال) اگر (دین) حق ان کے خیالات کے تابع ہو جاتا ہے تو تمام آسمان زمین اور جو ان میں آباد ہیں سب تباہ ہو جاتے۔

اگر حق ان کے خیالات کے تابع ہو جاتا یعنی ان کی خواہش کے مطابق چند معبود واقع میں ہوتے تو سارا جہان تباہ ہو جاتا یعنی موجود ہی نہ ہو پاتا عدم سے وجود میں ہی نہ آتا یہی مطلب ہے آیت لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا الخ کا۔

ابن جریج مقاتل، سدی اور اہل حق کی ایک جماعت کے نزدیک الحق سے مراد اللہ ہے فراء اور زجاج کے نزدیک الحق سے قرآن مراد ہے یعنی اللہ اگر ان کی مراد کی موافقت کرتا اور دوسروں کو اپنا شریک بنا لیتا یا اپنے لئے اولاد اختیار کر لیتا اور قرآن کو ان کی خواہشات کے مطابق نازل فرما دیتا اور قرآن شرک و معاصی کی تعلیم دیتا تو اللہ اللہ ہی نہ رہتا۔ الوہیت کے لئے شرکت ناقابل برداشت ہے اللہ بیہودہ باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ بیہودہ فحش باتوں کا حکم سخت عیب اور برائی ہے اور الوہیت چاہتی ہے کہ

اللہ کی ذات ہر عیب اور خرابی سے پاک ہو اور جب اللہ اللہ نہ رہتا تو ممکنات کا وجود کہاں سے آتا۔

بعض اہل علم نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر حق ان کی خواہشات کا تابع ہوتا اور باطل ہو جاتا تو پھر وہ چیز (حق و عدل) ہی باقی نہ رہتی جس پر قوام عالم موقوف ہے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو دین حق رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں اگر وہ کافروں کی خواہشات کا تابع ہو جاتا اور توحید کی جگہ شرک لے لیتا تو اللہ ان کافروں پر عذاب نازل کر دیتا اور سارا عالم اللہ کی آتش غضب سے جل بھن جاتا۔

بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت کی بات بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت کی بات سے بھی روگردانی کرتے ہیں۔

ذکرھم یعنی ایسی کتاب جو ان کو اللہ کی یاد دلاتی ہے یا نصیحت و یادداشت۔ یا وہ ذکر جس کی انہوں نے اپنے اس قول میں تمنا کی تھی لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ حضرت ابن عباس نے فرمایا ذکرھم سے مراد ہے وہ کتاب جس میں ان کی بزرگی اور شرف کا بیان ہے یعنی قرآن مجید اسی مضمون کی دوسری آیت آئی ہے۔ فرمایا ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی جس میں تمہارے لئے شرف اور بزرگی ہے ایک اور آیت میں فرمایا وانه لذکر لک اور بلاشبہ یہ آپ کے لئے باعث شرف ہے بات یہ ہے کہ قرآن کی زبان وہ اختیار کی گئی جو قریش کی تھی اور زبان میں لوگوں کو قریش کا تابع بنایا گیا اور خلافت صرف قریش کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ پس وہ ایسی کتاب کی طرف بھی التفات نہیں کرتے جو ان کے لئے باعث شرف ہے۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَیْرٌ ۖ وَّهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۷۲﴾ یا آپ ان سے کسی آمدنی کے خواستگار ہیں سو آمدنی تو آپ کے رب کی (عطا کردہ) سب سے بہتر ہے اور وہی سب سے اعلیٰ دینے والا ہے۔

یہ بھی استفہام انکاری ہے یعنی آپ ان سے کسی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں کہ تاوان ادا کرنے کے ڈر سے یہ ایمان لانے میں تامل کریں۔ فخراج ربک یعنی وہ معاوضہ اور ثواب جو آخرت میں اللہ آپ کو عطا کرے گا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے خرج خراج کی طرح بمعنی تاوان ہے بیضاوی نے لکھا ہے خرج (خرچ) دخل (آمدنی) کے مقابل کو کہتے ہیں۔ خرج کا معنی ہے دوسرے کو دینا خراج کا زیادہ استعمال اس ٹیکس کے لئے ہوتا ہے جو حکومت کی طرف سے زمین پر مقرر ہوتا ہے خیر بہتر ہے کیونکہ سب سے وسیع بھی ہے اور ہمیشہ جاری رہنے والا بھی ہے اس لئے خداداد خرج کی وجہ سے آپ ان سے تاوان وصول کرنے کے حاجت مند نہیں ہیں۔

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۷۳﴾ اور آپ تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں یعنی ایسی راہ (زندگی) پر چلنے کی دعوت دے رہے ہیں جس میں کوئی کجی نہیں جس کی استقامت کی شاہد تمام سلیم عقلیں ہیں۔

اللہ نے مذکورہ بالا آیات میں ان تمام اسباب کی نفی کر دی جو دعوت رسول ﷺ سے انکار کرنے کے موجب بن سکتے تھے۔ راستہ میں کجی نہیں اس راہ کے مستقیم ہونے کی شاہد ہر عقل سلیم ہے۔ دعوت دینے والے کو کوئی لالچ نہیں وہ کچھ مال مانگتا نہیں۔ اس دعوت نامے میں ان لوگوں کے لئے شرف بھی ہے جن کو دعوت دی جا رہی ہے اس لئے انکار دعوت کا سبب سوائے حق سے عداوت رکھنے کے یا دانش کے فقدان کے اور کوئی نہیں اور ازل ہی میں یہ بدبختی ان کے لئے لکھ دی گئی تھی یوں تو وہ بڑے عقلمند تھے دنیاوی منافع حاصل کرنے کی بہت سوجھ بوجھ رکھتے تھے اس لئے دوامی منافع کے حصول سے محروم رہنا اور ان کو نہ سمجھنا صرف ازلی شقاوت تھی جو مقدر ہو چکی تھی۔ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے اور راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرما دیتا ہے۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾ اور جو لوگ آخرت

پر ایمان نہیں رکھتے وہ بلاشبہ سیدھے راستے سے ہٹتے جا رہے ہیں۔

الصراط میں الف لام عہدی ہے یعنی سیدھا راستہ لنکبون مڑ رہے ہیں ان میں استعداد اور صلاحیت ہی نہیں ہے ان کی تخلیق ہی اللہ کے اسم مضل کے پر تو سے ہوئی ہے ان کے لئے سیدھے راستے پر چلنا ممکن ہی نہیں ہے۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اگر ہم ان پر مہربانی کر دیتے اور ان کو جو تکلیف ہے اس کو دور کر دیتے تب بھی یہ لوگ اپنی گمراہی میں بھٹکتے سرگرداں پھرتے رہتے۔

ضر (دکھ) یعنی وہ عذاب جس میں خوشحال لوگوں کو مبتلا کیا گیا تھا خواہ اس سے مراد جنگ بدر میں مارا جانا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے یا قحط مراد ہو جیسا کہ ضحاک کا قول ہے یہ دونوں قول اوپر ذکر کر دیئے گئے ہیں۔

للجوا تب بھی یہ اڑے رہیں، دشمنی پر جمے رہیں۔

فی طغیانهم یعنی اپنے غرور اور حد سے بڑھے ہوئے کفر اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان پر رحم نہیں کیا اور اگر مہربانی کر کے ان کے دکھ کو دور کر دیتے تب بھی یہ کفر پر اڑے رہتے اور اپنی گمراہی میں سرگرداں پھرتے رہتے۔

نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ابوسفیان نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا محمد ﷺ میں تم کو اللہ کا اور قرابت داری کا واسطہ دیتا ہوں (کہ اس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کر دو) اب تو ہم اون اور خون بھی کھانے لگے (بھوک سے انتہائی مجبور ہو گئے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾

اور ہم نے ان کو گرفتار عذاب بھی کیا تب بھی انہوں نے اپنے رب کے سامنے نہ عاجزی اختیار کی نہ گڑگڑائے۔ (نہ زاری کی)

العذاب یعنی بدر کی لڑائی میں مارا جانا یا قحط پڑنا۔

فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ یعنی انہوں نے توبہ نہیں کی۔ اپنے رب کی طرف رجوع نہیں ہو۔ بلکہ اپنی سرکشی پر قائم رہے استکانوا یا باب استفعال سے ہے اس کا مادہ کون ہے۔ محتاج بھی ایک کون سے دوسرے کون کی طرف۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ (ہر دم ایک نئے تغیر کا طلبگار ہوتا ہے) یا استکانوا باب افتعال سے ہے اس کا مادہ سکن ہے ک کے بعد الف اشباعی ہے۔

وما یتضرعون یعنی وہ زاری کرنے عاجزی کرنے اور خشوع کرنے سے مانوس ہی نہیں ہیں (خشو خضوع کا مادہ ہی ان کے اندر نہیں ہے)۔

بیہقی نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ ابن اثال حنفی جب گرفتار ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضور ﷺ نے اس سے وعدہ لے کر چھوڑ دیا پھر وہ مکہ کو چلا گیا اور مسلمان ہو گیا (قریش نے اس کو گرفتار کرنا چاہا وہ بھاگ کر) مکہ اور یمامہ کے درمیان آکر آبیٹھا اور یمامہ سے جو غلے کی رسد مکہ کو آیا کرتی تھی اس کو روک دیا۔ قریش بھوکے مرنے لگے یہاں تک کہ جانوروں کا اون کھانے لگے مجبور ہو کر ابوسفیان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کیا آپ کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ آپ کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بے شک یہی بات ہے ابوسفیان نے کہا تو (یہ کیسی رحمت ہے کہ) آپ نے آباؤ اجداد کو تو تلوار سے قتل کر دیا اور ان کی اولاد کو قحط سالی سے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں (گویا) شہادت ہے اس بات کی کہ اگر ہم نے دوسرا عذاب بھی ان سے دور کر دیا تو یہ اللہ کے سامنے زاری نہیں کریں گے جیسے پہلے عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد اللہ کی طرف انہوں نے رجوع نہیں کیا اور زاری نہیں کی۔

ایک شبہ

تفسیر مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے خوش حال کافروں کو جس عذاب میں گرفتار کیا تھا وہ عذاب دور نہیں کیا حالانکہ بغوی نے صراحت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کے لئے بددعا کی اور فرمایا اے اللہ! دور یوسفی کی طرح ان کو بھی قحط سالیوں میں مبتلا کر دے اور قریش قحط زدہ ہو گئے۔ پھر ابوسفیان نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ میں آپ سے اللہ اور قرابت داری کے حوالے سے پوچھتا ہوں کیا آپ کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ آپ کو لوگوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بے شک یہی بات ہے۔ ابوسفیان نے کہا تو آپ نے باپوں کو تلوار سے قتل کرا دیا اور ان کی اولاد کو قحط سے اب اللہ سے دعا کیجئے کہ خدا اس قحط کو دفع کر دے چنانچہ حضور ﷺ نے دعا کی اور اللہ نے قحط کو دور کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بددعا کی وجہ سے جو قحط قریش پر پڑا تھا وہ حضور ﷺ کی دعا سے اللہ نے دور کر دیا (اور آپ کا بیان کردہ تفسیری مطلب بتا رہا ہے کہ قحط سالی دور نہیں کی گئی)

میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ان پر رحم نہیں کیا گیا اور عذاب دور نہیں کیا گیا کیونکہ اللہ جانتا تھا کہ عذاب دور ہونے کے بعد بھی یہ لوگ کفر پر اڑے رہیں گے لیکن عذاب (کبھی) دفع نہ ہو گا آیت میں اس کی صراحت نہیں ہے چنانچہ پہلے ان سے عذاب دور نہیں کیا گیا، پھر رسول اللہ ﷺ کی دعا سے دور کر دیا گیا لیکن انہوں نے پھر بھی توبہ نہیں کی اور اپنی سرکشی پر اڑے رہے اور گمراہی میں ہی سرگرداں گھومتے رہے۔

حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾

یہاں تک کہ جب سخت عذاب کا دروازہ ان پر کھول دیا تو یکدم حیران و نراس ہو گئے یہاں تک کہ سب سے زیادہ سرکش و متمرد شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائے رحمت کا طلبگار ہوا اس آیت میں عذاب شدید سے قحط کا عذاب مراد ہے بشرطیکہ آیت حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ میں العذاب سے مراد ہو جنگ بدر میں مارا جانا جیسا کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے بھوک کا عذاب قید اور قتل کے عذاب سے سخت ہوتا ہے اسی لئے اس کو عذاب شدید فرمایا اور اگر العذاب سے قحط اور بھوک کا عذاب مراد ہو جیسا کہ ضحاک کا خیال ہے تو پھر عذاب شدید سے مراد ہو گا عذاب موت، یا عذاب قبر یا عذاب قیامت اور عذاب دوزخ اور اس وقت فتحنا ماضی کا صیغہ مستقبل کے معنی میں ہو گا چونکہ آئندہ عذاب کا وقوع یقینی تھا اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جیسے آیت اذا الشمس کورت میں ماضی بمعنی مستقبل ہے اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے ہر طرح کی مصیبت ڈال کر ان کا امتحان لیا۔ قید و قتل کا بھی اور قحط و بھوک کا بھی لیکن انہوں نے عاجزی نہیں کی اور اللہ کے سامنے زاری نہیں کی آخر جب عذاب آخرت میں گرفتار ہوں گے تو اس وقت حیران اور نراس ہو کر رہ جائیں گے اسی حیرانی اور ناامیدی کا اظہار آیت یوم تقوم الساعتہ یبلس المجرمون میں کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اللہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے کان آنکھیں اور دل پیدا کئے تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ کان اور آنکھیں بنائیں تاکہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں تم ان کے ذریعے سے معلوم کرو اور دل بنائے اس لئے کہ تم ان نشانیوں پر غور کرو اور سوچ و بچار سے کام لو (اور تمام دینی دنیوی منافع کو حاصل کرو)

قلیلا ما میں ما زائد ہے اور قلیلا سے مراد ہے تھوڑا شکر یا کم وقت میں شکر کیونکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ کان ناک دل کا استعمال اس غرض کے لئے کیا جائے جس کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے اور ان کو پیدا کرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ بعض نے کہا محاورہ میں قلیل بمعنی عدم کے مستعمل ہے اس صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ تم بالکل شکر نہیں کرتے۔

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ اور اللہ وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں پیدا کیا (اور توالد تناسل کے ذریعہ زمین پر پھیلایا)

وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ اور (قیامت کے دن اسی کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے یعنی پہلے پراگندہ اور جدا جدا ہو گے پھر جمع کئے جاؤ گے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ اور وہی ہے جو جلاتا ہے اور مردہ کرتا ہے (یعنی زندگی اور موت اسی کے قبضہ میں ہے جس کو چاہتا ہے زندگی عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے زندگی چھین لیتا ہے)

وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾ اور اسی کے اختیار میں رات و دن کا گھٹنا بڑھنا ہے سو کیا تم اتنی بات نہیں سمجھتے۔

لہ یعنی اسی کے حکم اور فیصلہ کے ماتحت ہے۔ اختلاف الیل و النہار یعنی تاریکی اور روشنی میں رات دن کا اختلاف ہر ایک کے منافع میں اختلاف یا چھوٹے بڑے ہونے میں اختلاف۔

افلا تعقلون یعنی غور اور فکر سے کام لے کر اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ سب کچھ ہماری قدرت سے ہو رہا ہے اور ساری کائنات ہماری قدرت کے اندر ہے اس لئے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے پر بھی ہم قادر ہیں۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْۤا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾

بلکہ یہ بھی ویسی ہی بات کہتے ہیں جو اگلے (کافروں) نے کہی تھی یہ کہتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن کر رہ جائیں گے تو کیا (دوبارہ) زندہ کر کے ہم اٹھائے جائیں گے۔

یعنی کفار مکہ وہی بات کہہ رہے ہیں جو ان سے پہلے گزشتہ اقوام کے کافروں نے کہی تھی۔

ء انا لمبعوثون میں سوال انکاری ہے یعنی ایسا ہو نہیں سکتا کہ ہم دوبارہ اٹھائے جائیں۔ کافروں نے اپنی ابتدائی پیدائش پر غور نہیں کیا اور اتنا نہ سوچا کہ اس زندگی سے پہلے وہ مٹی تھے اور اس سے پہلے کچھ بھی نہ تھے (معدوم محض تھے عدم سے نکل کر مٹی کی شکل میں پھر غذائی شکل میں پھر خون اور نطفہ کی شکل میں زندہ انسان کی شکل میں آئے)

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾

اس کا تو ہم سے اور ہم سے پہلے ہمارے بڑوں سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے، یہ کچھ نہیں محض بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں۔

یعنی مرنے کے بعد جی اٹھنے کا وعدہ تو ہمارے بڑوں سے وہ لوگ کرتے ہی چلے آئے ہیں جنہوں نے اللہ کے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ھذا یعنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا۔ اس کا وعدہ تمام مدعیان نبوت کرتے چلے آئے ہیں۔

من قبل اب سے پہلے لیکن اتنی طویل مدت گزرنے کے بعد بھی اب تک وہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔

ان ھذا نہیں ہے یہ وعدۂ قیامت۔

الا اساطیر الاولین مگر اگلے لوگوں کی جھوٹی بنائی ہوئی باتیں۔ سطر، قطار، کتاب کی سطر بوئے ہوئے درختوں کی لائن کھڑے ہوئے آدمیوں کی لائن یہاں اول معنی مراد ہے سطر فلاں فلاں شخص نے لکھا سطر کی جمع اسطر اور سطور اور اسطار آتی ہے اور اساطیر اسطار کی جمع ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بات خدا کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے بلکہ اگلے لوگوں کی بے بنیاد جھوٹ لکھی ہوئی چلی آتی ہے مبرد نے کہا اساطیر اسطورہ کی جمع ہے جیسے اراجیح ارجوحہ کی اور احادیث احدوثہ کی اور اعاجیب اعجوبہ کی اور اضاحیک اضحوکہ کی اس کا استعمال تفریح اور دل بہلانے کے لئے لکھی ہوئی جھوٹی تحریروں کے لئے ہوتا ہے اسی لئے اساطیر کا تفسیری ترجمہ اکاذیب کیا گیا ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ آپ ان سے پوچھیے زمین اور جو بھی زمین میں ہیں کس کے (پیدا کئے ہوئے) ہیں اگر تم جانتے ہو (یا اگر تم اہل علم میں سے ہو) تو بتاؤ استفہام تقریری ہے یعنی مخاطب کو اقرار پر آمادہ کیا گیا ہے کہ اس کو سوائے اقرار کے کوئی چارہ نہ رہے۔

ان کنتم تعلمون اگر تم اہل علم میں سے ہو یا اگر تم جانتے ہو تو جواب دو بتاؤ مخاطب کی اہانت اور تحقیر اس سوال سے مقصود ہے کہ ایسی بات جس کو بچے اور دیوانے بھی جانتے ہیں تم نہیں جانتے تمہارا حال اور قول تمہاری جہالت کا شاہد ہے یہ ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن ہی نہیں تمام لوگ اس کے قائل ہیں عقل صریح اور نقل صحیح اس کی گواہ ہے اس لئے ان کو کہنا پڑے گا۔

سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ کہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے پھر اس اقرار کے بعد

قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ آپ ان سے کہیے (کہ جب اللہ ہی کا سب کچھ ہے) تو پھر تم کیوں غور نہیں کرتے کہ جس نے زمین اور زمین کے باشندوں کو پہلی مرتبہ پیدا کیا وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہوگا اعادۂ ایجاد کی قدرت کا انکار کیا معنی رکھتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾

آپ (یہ بھی) ان سے کہیے کہ ان سات آسمانوں کا مالک کون ہے اور عرش عظیم کا مالک کون ہے وہ ضرور جواب میں کہیں گے کہ (یہ سب کچھ) اللہ کا ہے آپ کہیئے تو پھر تم (اس سے) کیوں نہیں ڈرتے۔ یعنی جب تم اقرار کرتے ہو کہ آسمانوں اور عرش عظیم کا خالق اللہ ہی ہے اور کوئی نہیں تو پھر تم اس کے عذاب سے کیوں نہیں ڈرتے کیوں دوسروں کو اس کا ساجھی قرار دیتے ہو اور وہ چیزیں جو اس کے دائرہ قدرت میں داخل ہیں کیوں ان کو قدرت سے خارج سمجھتے ہو۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ آپ ان سے پوچھیے کہ ہر چیز کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔

ملکوت کا معنی ہے حکومت عزت غلبہ، ملکوت میں واؤ مبالغہ کی ہے۔ یعنی انتہائی غلبہ جتنا تصور کیا جاسکتا ہو اسی لئے اس لفظ کا استعمال صرف اللہ کی حکومت واقتدار کے لئے مخصوص ہے بعض کے نزدیک ملکوت سے مراد ہیں خزانے اور (بے گنتی) ذخیرے۔

وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ اور وہی (جس کو چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ۔

یجیر حفاظت کرتا ہے برائی سے بچاتا ہے جس کو چاہتا ہے پناہ دیتا ہے۔

ولا یجار علیہ یعنی جس کو اللہ پناہ نہ دے اس کو کوئی پناہ نہیں دے سکتا اللہ جس کو دکھ پہنچانا چاہے اس کو دکھ پہنچنے سے کوئی بچا نہیں سکتا اور کوئی شخص اللہ کو ضرر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ (اب بھی) وہ ضرور کہیں گے کہ (یہ سب حکمت و قدرت اللہ کی ہے تو ان سے کہیے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو رہا ہے یعنی جب تم ان باتوں کا اقرار کرتے ہو تو پھر کس فریب میں پڑکر حق وہدایت سے روگرداں ہو رہے ہو یا یہ مطلب ہے کہ جب اس کا اعتراف کرتے ہو تو پھر حق کو باطل تم کس طرح خیال کرتے ہو۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ بلکہ ہم نے ان کو سچی بات پہنچائی ہے وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

الحق سے مراد توحید اور قیامت کا وعدہ اور کاذب ہونے سے یہ مراد ہے کہ یہ توحید اور قیامت کے انکار میں جھوٹے ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اللہ نے کسی کو (اپنی) اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔

اس کی اولاد نہیں (کیونکہ اولاد اپنے باپ کی ہم جنس ہوتی ہے اور) اللہ کی مثل اور ہم جنس کوئی نہیں وہ ہر مماثلت اور

مجانست سے پاک ہے اور نہ کوئی اور خدا ہے جو الوہیت میں اللہ کا شریک ہو۔

إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ (جب کوئی اور بھی الہ ہوتا تو وہ ضرور خالق بھی ہوتا) اور ہر الہ (خدا) اپنی مخلوق کو (تقسیم کر کے) جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔

اپنی مخلوق کو لے کر جدا ہو جاتا اور دوسرے کو اپنی مخلوق پر تصرف کرنے سے روک دیتا اور ہر ایک کی ملکیت دوسرے کی ملکیت سے علیحدہ ہو جاتی (اور ان کے باہم لڑائی ہوتی) اور (لڑائی میں) ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔ جیسے دنیا کے بادشاہوں کا طریقہ ہے تعداد آلہہ کے وقت باہمی جنگ و جدال ناممکن نہیں اور جنگ میں ایک دوسرے پر غلبہ ہونا ہی چاہئے نتیجہ میں ایک مغلوب ہوتا اور مغلوب خدا نہیں ہو سکتا مغلوبیت کمزوری اور حدوث کی علامت ہے۔ اور اگر کوئی کسی پر غالب نہ آسکتا تو دونوں غالب آنے سے عاجز ہوتے اور عجز علامت حدوث ہے الوہیت کے منافی ہے۔

سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٩١﴾ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٩٢﴾

ع ۵ ۱۵

اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ (اس کی شان میں بیان کرتے ہیں جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا۔ غرض ان کی شرک آفرینیوں سے اللہ بزرگ و برتر ہے۔ یعنی اولاد اور شریک سے اللہ پاک ہے جس کی دلیل اوپر ذکر کر دی گئی۔

عالم الغیب والشهادة نفی شریک کی دوسری دلیل ہے (اگر کسی موصوف کی کوئی خاص صفت بیان کی جائے تو وہ صفت ہی کسی حکم کی علت ہوتی ہے جیسے احسن یزید صدیقک القدیم اپنے پرانے دوست زید کے ساتھ بھلائی کر۔ بھلائی کرنے کے حکم کی علت زید کی پرانی دوستی ہے۔ پس اللہ کا شریک نہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہی پوشیدہ اور ظاہر کا عالم ہے یعنی عالم کل ہے اس کے سوا کوئی ہمہ گیر علم نہیں رکھتا) یہ بات مشرک بھی مانتے تھے کہ علمی ہمہ گیری میں اللہ منفرد ہے۔

قُل رَّبِّ إِمَّا تُرِيَنِّي مَا يُوعَدُونَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٩٤﴾ وَإِنَّا عَلَىٰ أَن نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَادِرُونَ ﴿٩٥﴾

آپ دعا کیجئے کہ اے میرے رب جس عذاب کا ان کافروں سے وعدہ کیا جائے گا اگر وہ عذاب تو مجھے دکھادے تو اے میرے رب مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کر دینا۔ اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جس (عقراب) کا وعدہ ہم ان سے کر رہے ہیں وہ آپ کو دکھادیں۔

لیکن بیخ بن سے اکھاڑ دینے والا غارت کن عذاب ہم ان پر نازل نہیں کرتے کیونکہ آپ ان میں موجود ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئیں گے اور بعض کی نسل میں مومن پیدا ہوں گے۔

انا علی ان نریک دوسرا جملہ معترضہ ہے قیامت کا اور عذاب موعود کا وہ لوگ انکار کرتے تھے اور بطور استہزاء جلد نزول عذاب کے خواستگار تھے ان کے انکار اور عجلت طلبی کو رد کرنے کے لئے یہ جملہ ذکر فرمایا۔

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ آپ ان کی برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ (خصلت) سے کر دیا کیجئے جو بہت ہی اچھا اور نرم ہو۔

سب سے اچھی خصلت سے مراد ہے درگزر کرنا رخ پھیر لینا، صبر کرنا اور بھلائی کرنا۔ یعنی ان کی برائی کے مقابلے میں اپنی طرف سے ان کے ساتھ بھلائی کرو۔ اس تفسیر پر آیت میں کافروں کی ایذا رسانی پر صبر کا اور جنگ سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور آیت جہاد سے اس آیت کا حکم منسوخ قرار دیا جائے گا۔ بعض کے نزدیک حسنہ سے کلمۂ توحید اور سیہ سے کلمۂ شرک مراد ہے بعض کے خیال میں سیہ برا کام (گناہ کا کام) ہے اور حسنہ سے مراد ہے برے کام سے باز داشت اور ممانعت۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ﴿٩٦﴾ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہم اس سے بخوبی واقف ہیں یعنی آپ کے متعلق کافر جو کچھ کہتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ آپ کے حالات کے خلاف بیان کرتے ہیں ہم اس سے بخوبی واقف ہیں اور سزا دینے پر

قدرت بھی رکھتے ہیں اس لئے آپ خود انتقام کے درپے نہ ہوں اور سارے معاملے کو ہمارے سپرد کر دیں۔ یہ جملہ گویا دفع السیئہ بالحسنہ کی علت ہے آپ بھلائی کریں اور برائی کے مقابلہ میں بھلائی سے کام لیں اس لئے کہ ہم آپ کا انتقام لے لیں گے ہم ان کے بیان کو بھی خوب جانتے ہیں اور سزا دینے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

اور آپ دعا کیجئے اے میرے رب میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس آئیں۔

ھمزت زور سے دھکا دینا یعنی وسوسے ڈال کر گناہوں کی طرف لے جانا۔

ان یحضرون کہ میرے پاس آئیں۔ یعنی میری نماز میں عبادت میں اور دوسرے امور میں میرے پاس بھی آئیں کیونکہ شیطان جب پاس آئے گا تو ضرور وسوسہ بھی پیدا کرے گا۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی (کے سر) پر موت آکھڑی ہوتی ہے اس وقت کہتا ہے اے میرے رب مجھے (دنیا میں) پھر واپس بھیج دے تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں پھر جا کر نیک کام کروں۔

حتی ابتدائیہ ہے اسکا تعلق یصفون سے ہے یا کاذبون سے ہے یعنی جب اس کو دونوں ٹھکانے دکھائی دینے لگتے ہیں کہ اگر ایمان لاتا تو جنت کا یہ ٹھکانہ اس کو ملتا اور ایمان نہیں لایا تو دوزخ کے اندر اس کا یہ ٹھکانہ ہے اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ جنت کے ٹھکانے کی جگہ اللہ نے دوزخ کے اندر یہ ٹھکانہ مقرر کر دیا تو اس وقت وہ کہتا ہے اے میرے رب مجھے دنیا میں واپس کر دیجئے۔

ارجعون میں خطاب رب کو ہی ہے لیکن تعظیماً جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ بعض نے کہا تکرار فعل مقصود ہے اس لئے جمع کا صیغہ ذکر کیا گویا اصل کلام یوں تھا ارجعنی ارجعنی بعض کا قول ہے کہ رب اور روح قبض کرنے والے ملائکہ سب کو خطاب ہے اول رب کو مخاطب بنایا کیونکہ فریاد اصل میں اسی سے کی پھر ملائکہ سے درخواست کی کہ وہ دنیا میں پھر لوٹا دیں۔

فیما ترکت ما سے مراد ایمان ہے یعنی وہ ایمان جس کو میں نے ترک کر دیا تھا اس میں داخل ہو کر میں نیک کام کروں یا مال یا دنیا مراد ہے یعنی جو مال دنیا میں چھوڑ آیا ہوں پھر اس میں جا کر نیک کام کروں۔

ابن جریج کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مومن کو (موت کے) فرشتے نظر آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کیا ہم تجھے دنیا کی طرف لوٹا دیں۔ مومن کہتا ہے کیا افکار و آلام کے گھر کی طرف (تم مجھے لوٹانا چاہتے ہو میں ایسا نہیں چاہتا) بلکہ میں تو اللہ کے پاس جانا چاہتا ہوں اور کافر (کے سامنے جب ملائکہ آتے ہیں تو وہ) کہتا ہے رب ارجعون

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو اللہ سے ملنا برا سمجھتا ہے اللہ بھی اس سے ملنے سے نفرت کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے یا کسی اور بی بی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں (کون مرنا چاہتا ہے) فرمایا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ بات یوں ہے کہ مومن کے سامنے جب موت آتی ہے تو اس کو اللہ کی خوشنودی اور عزت بخشی کی بشارت دی جاتی ہے اس وقت (پیچھے رہنے والی) کوئی چیز بھی آگے آنے والی چیز سے زیادہ محبوب نہیں ہوتی اس لئے وہ اللہ سے ملنے کو پسند کرتا ہے اور اللہ اس سے ملنا پسند کرتا ہے لیکن جب کافر کے مرنے کا وقت آتا ہے تو اس کو اللہ کے عذاب اور سزا کی اطلاع دی جاتی ہے اس وقت پیش آنے والی چیز سے زیادہ بری کوئی چیز اس کی نظر میں نہیں ہوتی اس لئے وہ اللہ سے ملنے کو ناگوار سمجھتا ہے اور اللہ بھی اس سے ملنے سے نفرت کرتا ہے۔

كَلَّا ۗ ہر گز نہیں دنیا کی طرف واپسی ہر گز نہیں ہو سکتی۔

اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۗ اس کی یہ ایک بات ہی بات ہے جس کو وہ کہے جا رہا ہے کلمۃ سے مراد ہے پورے کلام کا ایک ٹکڑا یعنی مفید جملہ نحو کی اصطلاح میں کلمہ مفرد لفظ کو کہتے ہیں (لیکن عربی محاورہ میں مفید کلام کو کلمہ کہا جاتا ہے)۔

ھو قائلھا یعنی حسرت اس پر چھا جاتی ہے عذاب کا ڈر ہوتا ہے اس لئے ایسی بات کہتا ہے ورنہ دنیا میں واپس جانا ناممکن ہوتا ہے واپسی کی درخواست بیکار ہوتی ہے۔

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اور ان لوگوں سے آگے ایک چیز آڑ ہے اس دن تک جبکہ ان کو اٹھایا جائے گا۔

من ورائھم ان کے آگے برزخ مجاہد نے کہا ان لوگوں کے اور واپسی کے درمیان حجاب ہے (آڑ ہے) قتادہ نے کہا برزخ سے مراد ہے دنیا کی باقی عمر کیونکہ جب تک دنیا کی باقی مدت ختم نہ ہو جائے گی زندگی کی طرف واپسی نہ ہو گی۔ ضحاک نے کہا برزخ موت سے قیامت تک کی مدت بعض نے کہا برزخ سے مراد قبر ہے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ پھر جب (قیامت میں) صور پھونکا جائے گا تو ان میں باہمی رشتے ناتے اس روز نہ رہیں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ صور پھونکے جانے سے مراد اس جگہ پہلا نفخۂ صور ہے یعنی نفخۂ بیہوشی، جس کے متعلق فرمایا ہے فَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ جب صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے اور اس روز ان کے درمیان (دنیا والی) رشتہ داریاں نہیں رہیں گی اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو ایک دم سب (اٹھ کے) کھڑے ہو جائیں گے اور (حیرت سے) دیکھتے ہوں گے واقبل نفخہ علی بعض یتساء لون اور ایک دوسرے کی جانب رخ کر کے باہم پوچھیں گے الخ۔

صحیح یہ ہے کہ آیت میں نفخہ سے مراد نفخۂ بعث (جس کے بعد سب لوگ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے) مراد ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا قیامت کے دن بندے یا بندی کا ہاتھ پکڑ کر علی الاعلان سب اگلوں اور پچھلوں کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور ایک منادی نداء دے گا یہ فلاں بن فلاں ہے اس کی طرف کسی کا حق ہو تو وہ اپنا حق لینے آ جائے اس وقت جس شخص کا اپنے باپ یا بیٹے یا بی بی یا بھائی پر کوئی حق ہو گا وہ خوش ہو گا اور اپنا حق وصول کرے گا۔ اس کے بعد حضرت ابن مسعود نے آیت فلا انساب الخ پڑھی۔ عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول بھی آیا ہے کہ اس جگہ نفخہ سے مراد دوسرا نفخہ ہے۔

فلا انساب بینھم یعنی دنیا میں تو شرافت نسب پر فخر کرتے تھے قیامت کے دن کوئی کسی پر نسبی (اور نسلی) فخر نہ کر سکے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ رشتے ناتے اس روز فائدہ نہیں پہنچائیں گے کیونکہ سب اتنے وحشت زدہ اور حیران ہوں گے کہ کوئی کسی سے محبت نہیں کرے گا اور آپس میں مہربانی کا جذبہ معدوم ہو جائے گا اور یہ حالت ہو جائے گی کہ آدمی اپنے بھائی اور ماں باپ اور بیوی بچوں سے بھی بھاگے گا۔

بینھم کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے کافروں ہی کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے مومن مراد نہیں ہیں۔ مومنوں کے متعلق تو اللہ نے فرمایا ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی شامل کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کا دن ہو گا تو اس روز مسلمانوں کے لڑکے نکلیں گے (یعنی کوثر و تسنیم کے پاس سے ایسی حالت میں برآمد ہوں گے) کہ ان کے ہاتھوں میں شربت (شراب طہور) ہو گا۔ لوگ ان سے کہیں گے ہم کو پلا دو، وہ جواب دیں گے (نہیں) ہم اپنے

ماں باپ کو پلائیں گے۔ اپنے ماں باپ کو پلائیں گے یہاں تک کہ ساقط شدہ بچہ بھی جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا کہے گا جب تک میرے باپ اندر نہ جائیں گا۔ میں اندر داخل نہ ہوں گے رواہ ابن ابی الدنیا عن عبداللہ بن عمر اللیثی ابوزرارہ کی حدیث بھی اسی کے ہم معنی آئی ہے۔

ایک شبہ

ابن عساکر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میرے نسبی اور سسرالی ناتے کے علاوہ ہر نسبی اور سسرالی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

جواب

مومنوں کی نسبی رشتہ داریاں رسول اللہ ﷺ کے ضمن میں داخل ہیں۔ حضور ﷺ سب مسلمانوں کے باپ تھے اور آپ کی بی بیاں مسلمانوں کی مائیں تھیں۔ (پس آپ کا رشتہ منقطع نہ ہوگا یعنی مومنوں کے رشتے ناتے منقطع نہ ہوں گے)

بغوی نے کہا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کوئی ذریعہ اور نسب سودمند نہ ہوگا سوائے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اور نسبت کے یعنی سوائے قرآن وایمان کے۔

ولا یتساء لون کا یہ مطلب ہے کہ باہم رشتے نہیں پوچھیں گے جیسے دنیا میں پوچھا کرتے تھے کہ تم کس خاندان اور کس قبیلے سے ہو۔

ایک شبہ

اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باہم احوال دریافت کریں گے۔

جواب

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کے احوال اور مواقع مختلف ہوں گے کسی مقام پر تو اتنا خوف طاری ہوگا کہ کوئی کسی کو نہ پوچھے گا اور بعض مواقع ایسے بھی آئیں گے کہ ذرا افاقہ اور سکون ہوگا اس وقت ایک دوسرے کی حالت دریافت کرے گا۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ سو جس شخص کا (ایمان اور نیکی کا) پلڑہ بھاری ہوگا وہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

موازین موزون کی جمع ہے یعنی (وزن کئے ہوئے) عقائد اور نیک اعمال بھاری ہوں گے بھاری ہونے سے مراد ہے زیادہ ہونا۔ نیکیوں کا گناہوں کے مقابلے میں نیچے کو جھک جانا۔ یا موازین میزان کی جمع ہے (اور میزان کا معنی ہے ترازو) یعنی جس کی ترازو میں نیکیوں کا پلڑہ نیچے کو جھکا ہوگا۔ موازین کو بصیغۂ جمع اس لئے ذکر کیا کہ ہر شخص کی (وزن کشی کی) ترازو الگ ہوگی۔ یا تعدد میزان سے مراد وزن کا تعدد ہے۔

المفلحون نجات پانے والے اور درجات پر پہنچنے والے۔

علمائے اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میزان کا قائم ہونا اور اعمال کا اس میں تولا جانا حق ہے خوارج معتزلہ اور شیعہ اس کا انکار کرتے ہیں اور اکثر اہل بدعت (جو سلف صالحین کے خلاف عقائد رکھتے ہیں) اس کے منکر ہیں۔

بیہقی نے البعث میں حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے حدیث جبرئیلؑ نقل کی ہے اس حدیث میں ہے کہ جبرئیلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا محمد ﷺ! ایمان کیا ہے۔ حضور نے فرمایا اللہ کو ماننا اللہ کے فرشتوں اور رسولوں کو ماننا اور جنت دوزخ، میزان اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھائے جانے کا یقین کرنا اور اس بات کو ماننا کہ اچھی بری تقدیر اللہ کی طرف سے (مقرر) ہے (یعنی دنیا میں جو اچھائی برائی ہوتی ہے اللہ نے اس کا علمی اندازہ پہلے سے کر لیا تھا) جبرئیلؑ نے کہا اگر میں ایسا کرلوں تو کیا میں مومن ہو جاؤں گا۔ فرمایا ہاں جبرئیلؑ نے کہا آپ نے سچ کہا۔

حاکم نے مستدرک میں بر شرط مسلم حضرت سلمان کی روایت سے بیان کیا ہے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میزان قائم کی جائے گی (اتنی بڑی ہوگی کہ) اگر آسمان وزمین اس میں رکھ دیئے جائیں تو اس میں سما جائیں۔
ابن مبارک نے الزہد میں اور اجری نے الشریعت میں حضرت سلمانؓ کا قول موقوفاً نقل کیا ہے اور ابو الشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا قول بھی یہی بیان کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے۔
ابن ابی الدنیا نے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت حذیفہ کا قول بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن میزان والے حضرت جبرئیلؑ ہوں گے۔
میزان کے متعلق احادیث متواتر المعنی ہیں۔

فصل

وزن کشی کیسے ہوگی کیفیت اور وزن کی تفصیل میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ بندے کو مع اس کے اعمال کے تولا جائے گا۔ مومن کا وزن اس کی نیکیوں کے موافق ہوگا اور کافر کا کوئی وزن ہی نہیں نکلے گا۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بعض لوگ آئیں گے جو عظیم الجثہ اور موٹے ہوں گے اور خدا کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے آیت فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا تلاوت فرمائی۔ متفق علیہ من حدیث ابی ہریرہؓ
اس تفسیر کی بناء پر جن لوگوں کا وزن ہلکا ہوگا وہ کفار ہی ہوں گے۔ (گناہ گار مومن خفیف الوزن نہ ہوں گے)
بعض نے کہا اعمال نامے تولے جائیں گے یعنی وہ صحیفے جن کے اندر نیکیاں اور بدیاں لکھی ہوں گی۔ ان کی وزن کشی ہوگی، ترمذی ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میری امت کے ایک آدمی کو سب کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے طومار رکھولے جائیں گے ہر طومار کا طول بقدر رسائی نظر ہوگا پھر (اللہ اس سے) فرمائے گا کیا اس میں سے کسی بات کا تجھے انکار ہے کیا میری طرف سے اعمال نویسوں نے تیرے اوپر کوئی ظلم کیا ہے وہ شخص عرض کرے گا نہیں اے میرے رب (اعمال نویسوں نے میری کوئی حق تلفی نہیں کی) اللہ فرمائے گا کیوں نہیں میرے پاس تیری ایک نیکی ہے تجھ پر آج ظلم مطلقاً نہ ہوگا (اس نیکی کا بدلہ ملے گا) چنانچہ اس شخص کا ایک کارڈ نکالا جائے گا جس میں اشہد ان لا الہ الا اللّٰہ واشہدان محمد اعبدہ و رسولہ لکھا ہوگا بندہ عرض کرے گا اے میرے رب ان طوماروں کی موجودگی میں اس کارڈ کی کیا حقیقت ہے اللہ فرمائے گا تیری حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ تمام طومار ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور وہ کارڈ دوسرے پلڑے میں طوماروں والا پلڑا اوپر کو اڑ جائے گا۔ (یعنی اٹھ جائے گا) اور کارڈ بھاری نکلے گا۔ اللہ کے نام سے کوئی چیز بھاری نہیں ہوتی۔ امام احمد نے حسن، صحیح سند سے حضرت ابن عمر کی روایت سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔
بعض نے کہا اعمال کو مجسم بنا کر تولا جائے گا حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آسمانوں کو اور زمین اور ان کے اندر کی اور ان دونوں کے درمیان کی اور ان کے نیچے کی ساری کائنات کو لا کر میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ کی گواہی کو رکھا جائے تو لا الہ الا اللہ کی شہادت والا پلڑہ جھک جائے گا۔ (وزنی نکلے گا) رواہ الطبرانی۔
ابن عبد الرزاق نے علم کی فضیلت کے باب میں اپنی سند سے ابراہیم نخعی کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے عمل لا کر اس کی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں گے تو وہ پلڑا ہلکا رہے گا پھر بادلوں کی طرح ایک چیز لا کر ترازو کے دوسرے، پلڑے میں رکھ دی جائے گی وہ وزنی نکلے گی۔ پھر اس شخص سے کہا جائے گا تو جانتا ہے یہ کیا ہے وہ شخص جواب دیگا نہیں (میں واقف نہیں) کہا جائے گا یہ علم کی فضیلت ہے جو تو لوگوں کو تعلیم دیتا تھا۔

ذہبی نے علم کی فضیلت کے بیان میں حضرت عمران بن حصین کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہیدوں کے خون کا موازنہ کیا جائے گا تو علماء کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھاری نکلے گی۔

میں کہتا ہوں کہ مومن بندہ کو مع اس کے نیک اعمال ناموں یا مع مجسم نیک اعمال کے (دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے) ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور دوسرے کافر بندہ کو مع اس کے برے اعمالناموں کے یا مع اس کے مجسم برے اعمال کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو کافر کا وزن مچھر کے پر کی برابر نہ نکلے گا۔ اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے ومن خفت موازینہ یعنی اس کی میزان میں (اس کا) کوئی وزن ہی نہ ہوگا۔ مومن کی ترازو میں ضرور (کچھ نہ کچھ) وزن ہوگا خواہ لاالہ الااللہ کی شہادت کے سبب ہی ہو اسی کے متعلق اللہ نے بطور کنایہ فرمایا فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ مگر مومن کے ثقل کے درجات ہوں گے جو کبیرہ گناہوں سے بچتے رہے ہوں گے اور اللہ نے ان کے گناہ ساقط کردیئے ہوں گے تو ان کی میزانوں میں وزن سب سے زیادہ ہوگا بدیوں کا پلڑہ اڑ جائے گا۔ بالکل خالی رہے گا (اس میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا) اور جن لوگوں کے عمل مخلوط ہوں گے اچھے عمل بھی ہوں اور برے عمل بھی۔ ان میں جنت کے اندر داخل ہونے کی صلاحیت ہوگی انہیں کے متعلق حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں کی حساب فہمی ہوگی گناہوں کی بہ نسبت ایک نیکی بھی اگر کسی کی زائد ہوگی تو وہ جنت میں چلا جائے گا اور جس کے گناہ نیکیوں سے زیادہ ہوں گے وہ دوزخ میں چلا جائے گا۔ یعنی گناہوں کی کثافت سے پاک صاف بنانے کے لئے اس کو آگ میں داخل کیا جائے گا جیسے لوہا آگ میں پڑ کر میل کچیل سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ایک دانگ کے وزن سے بھی میزان کا وزن ہلکا بھاری ہوگا۔ اور جن اشخاص کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی وہ اصحاب اعراف ہوں گے اس وقت تک اعراف میں رہیں گے جب تک اللہ ان کے جنت میں داخلے کا حکم دیدے اس کے بعد جنت میں چلے جائیں گے۔

حضرت ابن عباس کا یہ قول ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے اس قول میں کافروں کی حالت کا بیان نہیں ہے کیونکہ کافر کی کوئی نیکی ہی نہ ہوگی۔ اور قرآن میں صرف مومنین صالحین کا ذکر ہے یا کافروں کا۔ گناہ گار مومنوں کا کوئی تذکرہ نہیں اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نزول قرآن کے زمانہ میں سارے مومن صالح ہی تھے سب صحابہ تھے کبائر سے پرہیز رکھنے والے تھے۔ یا گناہوں سے توبہ کرنے والے تھے اور گناہوں سے توبہ کرنے والے بے گناہ کی طرح ہو جاتے ہیں۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور جن لوگوں کی میزانیں ہلکی ہوں گی تو وہ ایسے ہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنی جانوں کو گھاٹے میں رکھا جہنم میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جن کے اچھے اعمال ہلکے ہوں گے یا اچھے اعمال کا پلڑہ ہلکا ہوگا ایسا کہ ان کی نیکیوں کا کوئی وزن ہی نہ ہوگا ایسے لوگ لامحالہ کافر ہی ہوں گے۔

بزار اور بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن آدم کے بیٹے کو لاکر میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اور ایک فرشتہ کو میزان پر مقرر کردیا جائے گا اب اگر اس کی میزانیں بھاری نکلیں تو وہ فرشتہ ایسی آواز سے جس کو ساری مخلوق سنے گی کہے گا فلاں شخص خوش نصیب ہو گیا اس کے بعد کبھی بدنصیب نہ ہوگا اور اگر اس کی میزانیں ہلکی نکلیں تو وہ فرشتہ ایسی آواز سے جس کو ساری مخلوق سنے گی کہے گا فلاں شخص بدنصیب ہو گیا آئندہ اس کے بعد کبھی خوش نصیب نہ ہوگا۔ اس حدیث میں خفت سے مراد ہے بالکل وزن نہ ہونا۔

میں کہتا ہوں شاید گناہ گار مومنوں کے اعمال دوبار تولے جائیں گے اگر اس کی نیکیوں میں کسی قدر ہلکا پن ہوگا تو اس کو اس وقت تک کے لئے دوزخ میں داخل کردیا جائے گا کہ وہ پاک صاف ہو جائے پھر پاک صاف ہونے کے بعد اس کے اعمال کی پھر تول کی جائے گی اس وقت اس کی میزانیں بھاری نکلیں گی تو فرشتہ ندا دے گا فلاں شخص خوش نصیب ہو گیا اس کے بعد کبھی

بد نصیب نہ ہوگا۔ ہم نے سورت القارعہ میں اس مبحث کی کسی قدر تحقیق کردی ہے۔

آیت مندرجہ بالا میں صرف کفار مراد ہیں اس کی دلیل اس سے آگے آنے والی آیت ہے فرمایا ہے فاولئک الذین الخ کہ یہی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا اور نفس کو کامل کرنے کا جو وقت تھا وہ کھو دیا۔

تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ جھلس دے گی ان کے چہروں کو آگ یعنی ان کے چہروں کو آگ جلا ڈالے گی۔ (کذا فی القاموس) اور مومن کے چہرے کو آگ نہیں جلائے گی۔ مسلم نے حضرت جابر کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس امت کے کچھ لوگ دوزخ میں جائیں گے اور آگ ان کو جلائے گی لیکن ان کے چہروں کے گھیرے کو نہیں جلائے گی پھر کچھ مدت کے بعد ان کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا ابن مردویہ اور ضیاء نے حضرت ابو درداء کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے آیت تلفح وجوھھم النار کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا آگ کی ان کو ایک لپٹ لگے گی کہ ان کے گوشت بہ کر ایڑیوں پر جا پڑیں گے طبرانی نے الاوسط میں اور ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہنم کی طرف جب دوزخیوں کو ہنکا کر لے جایا جائے گا تو آگ کی ایک لپیٹ ان کو ایسی لگے گی کہ گوشت کو ہڈی پر لگا نہ چھوڑے گی سارا گوشت ایڑیوں پر (بہا کر) ڈال دے گی۔

وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿۱۰۴﴾ اور آگ کے اندر ان کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔ کلوح کا معنی ہے دونوں ہونٹوں کا دانتوں کے اوپر سے سکڑ جانا (یعنی نیچے کا ہونٹ نیچے کی طرف آجانا اور اوپر کا ہونٹ اوپر کو اٹھ جانا) ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وھم فیھا کلحون کی تشریح میں فرمایا آگ اس کو بھون ڈالے گی کہ اوپر کا ہونٹ بالائی جانب کو اتنا اٹھ جائے گا کہ سر کے وسط تک پہنچ جائے گا اور نچلا ہونٹ اتنا لٹک جائے گا کہ ناف سے جا لگے گا۔

ہناد نے بیان کیا کہ حضرت ابو مسعود نے آیت وھم فیھا کلحون کے متعلق فرمایا جیسے پکی ہوئی سری جس کے دانت باہر نکل آئے ہوں اور ہونٹ سکڑ گئے ہوں۔

أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿۱۰۵﴾ کیا میری آیات تم کو پڑھ کر نہیں سنائی گئی پھر تم ان کو جھوٹا قرار دیتے ہو یعنی بطور زجر اور استحقاق عذاب کے باعث کو یاد دلانے کے لئے ان سے کہا جائے گا۔

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿۱۰۶﴾ وہ کہیں گے اے ہمارے رب واقعی ہماری بدبختی نے ہم کو گھیر لیا اور بیشک ہم گمراہ لوگ تھے یعنی ہماری بدبختی نے ہم پر قابو پا لیا یہاں تک کہ ہمارے احوال نے ہم کو اس انجام بد تک پہنچا دیا ہم حق سے بھٹکے ہوئے تھے۔

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿۱۰۷﴾ اے ہمارے رب اب ہم کو اس (جہنم) سے نکال لے اگر پھر دوبارہ ہم ایسا کریں تو بے شک قصوروار ہوں گے۔

فان عدنا یعنی اگر پھر ہم تکذیب کی طرف لوٹے ہم نے دوبارہ تکذیب کی تو بے شک اس وقت ہم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوں گے اس وقت عذاب سے تو ہم کو رہائی نہ دینا۔

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿۱۰۸﴾ اللہ فرمائے گا اسی جہنم میں ذلت کے ساتھ راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

اخسئو ذلت کے ساتھ چپ رہو۔ یہ دعا کا مقام نہیں ہے اور دور رہو صاحب قاموس نے لکھا ہے خسا الکلب کتے کو دھتکار کر باہر نکال دیا۔ خسا الکلب کتا دور ہو گیا۔ جیسے انخسئا دور ہو گیا (باب انفعال) گویا خساء لازم بھی ہے اور متعدی بھی خساء اور خسوء مصدر ہے۔

ولا تکلمون اور مجھ سے کوئی بات مت کرو یا عذاب دور کرنے کی بات مت کرو۔ عذاب دور نہیں کیا جائے گا۔ اس

کلام کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائیں گے ان کی ہر امید ختم ہو جائے گی۔
حسن نے کہا دوزخیوں سے یہ آخری کلام ہو گا اس کے بعد وہ کلام نہ کر سکیں گے سوائے دم گھٹنے اور آہیں بھرنے کے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے کتوں کی طرح بھونکیں گے نہ خود بات سمجھیں گے۔ نہ اپنی بات سمجھا سکیں گے۔ قرطبی نے کہا جب اخسئوا فیھا ولا تکلمون ان سے کہہ دیا جائے گا تو ان کی ساری امیدیں کٹ جائیں گی بالکل نراس ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے بھونکیں گے اس وقت دوزخ اوپر سے بند کر دی جائے گی۔
ہناد، طبرانی، ابن ابی حاتم، حاکم اور بیہقی نے بیان کیا اور عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اس کو نقل کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا کہ دوزخی مالک کو پکاریں گے اور کہیں گے مالک (جہنم کا داروغہ دوزخ کے فرشتوں کا آفیسر) اب تو تیرے رب کو چاہئے کہ ہمارا کام تمام کر دے مالک چالیس برس تک ان کو کوئی جواب نہیں دے گا چالیس سال کے بعد جواب دے گا تو کہے گا انکم ماکثون تم کو (یہیں ہمیشہ) رہنا ہے۔ یہ جواب ملنے کے بعد وہ اپنے رب کو پکاریں گے اور کہیں گے رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ اللہ ان کو دنیا کی مدت سے دوگنی مدت تک کوئی جواب نہیں دے گا یوں ہی پڑا رہنے دے گا اس مدت کے بعد جواب دے گا تو فرمائے گا اخسوا فیھا ولا تکلمون اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے اور کوئی بات نہیں کر سکیں گے اور سوائے دم گھٹنے اور گڑگڑ کرنے کے ایک کلمہ بھی ان کے منہ سے نہیں نکلے گا۔
سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب کا بیان نقل کیا ہے کہ دوزخی پانچ مرتبہ پکاریں گے چار دعاؤں کے بعد تو اللہ ان کو جواب دے گا اور پانچویں کے بعد وہ خود بات نہ کر سکیں گے وہ کہیں گے اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ اے ہمارے رب تو نے دو بار ہم کو مردہ کیا اور دوبارہ زندگی عطا کی۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں کیا اب یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے اللہ اس کے جواب میں فرمائے گا۔ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ تمہاری یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ جب ایک خدا کو پکارا جاتا تھا۔ تو تم انکار کرتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا جاتا تھا تو تم یقین کر لیتے تھے پس (آج) فیصل اسی اللہ کے ہاتھ میں ہے جو سب سے بالا اور بزرگ ہے۔ پھر وہ کہیں گے رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ اے ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ ہم نیک کام کریں بلاشبہ ہم یقین رکھتے ہیں اللہ جواب میں فرمائے گا فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تم اس دن کے پیش آنے کو بھول گئے تھے۔ (یقین نہ رکھتے تھے سو اس کا مزہ چکھو) ہم نے بھی تم کو آگ میں ڈال کر) بھولا بسرا کر دیا اور اپنے کرتوت کے بدلے دوامی عذاب کا مزہ چکھو۔ وہ کہیں گے رَبَّنَا اَخِّرْنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اے ہمارے رب ہم کو تھوڑی مدت کی مہلت دے دے کہ ہم تیری دعوت کو قبول کر لیں اور پیغمبروں کے کہے پر چلیں۔ اللہ جواب میں فرمائے گا۔ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ کیا تم نے اس (قیامت کے برپا ہونے) سے پہلے (اپنی زندگی میں) قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم کو زوال نہ ہو گا۔ وہ عرض کریں گے رَبَّنَا اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ اے ہمارے رب ہم کو یہاں سے نکال لے تاکہ ہم اپنے گزشتہ اعمال کے خلاف (اب) نیک عمل کریں۔ اللہ جواب میں فرمائے گا۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ کیا ہم نے تم کو اتنی زندگی نہیں دی کہ جو نصیحت پذیر ہوتا ہو جاتا اور (کیا) تمہارے پاس ڈرانے والا (نہیں) آیا تھا اب مزہ چکھو (آج) کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ دوزخی کہیں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّيْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ اللہ جواب میں فرمائے گا اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ اس جواب کے بعد ان کے چہرے پارۂ گوشت (کی طرح) ہو جائیں گے جس میں نہ منہ ہوں گے نہ ناک کے سوراخ اور سانس اندر ہی اندر گھومے گا ان پر آگ کے سانپ اور بچھو ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر ان میں سے ایک سانپ مشرق میں پھونک مار دے تو مغرب والے سوختہ ہو جائیں۔ اور اگر ایک بچھو دنیا

والوں کے ڈنک مار دے تو (اس کے زہر سے) سب جل جائیں گے یہ سانپ اور بچھوان پر ٹوٹ پڑیں گے اور انکے گوشت پوست میں گھس جائیں گے اور ان کی آواز ایسی سنائی دے گی جیسے بیابانوں میں وحشی جانوروں کی آوازیں ہوتی ہیں۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو کہا کرتا تھا اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے ہیں سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے سو تم نے ان کو مسخرہ بنایا۔

سخریا کسائی اور فراء نے کہا سخریا بہ کسر سین کسی کا باتوں میں مذاق اڑانا، استہزاء کرنا اور سخریا بضم سین کسی کو عملاً غلام بنالینا تحقیر کرنا۔ سورۂ زخرف میں باتفاق اہل قرأت بضم سین ہے استہزاء قولی کا احتمال ہی وہاں نہیں ہے۔ خلیل نے کہا دونوں لفظ ہم معنی ہیں جیسے بُحْرٌ لُجِّیٌّ اور بحر لجی اور کوکب دری اور کوکب دری قاموس میں بھی اسی طرح آیا ہے صاحب قاموس نے لکھا ہے سخرہ سخریا وسخریا اس کو روک دیا یا مجبور کیا ایسے کام کا مکلّف کیا جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔ کذا فی النہایہ۔

بہر حال سخری مصدر اور مبالغہ کے لئے یاء بڑھادی گئی ہے اور یہاں استہزاء مراد ہے کیونکہ آگے آتا ہے۔

حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿١١٠﴾ یہاں تک (ان سے مذاق کرنے کا مشغلہ کیا) کہ اس مشغلہ نے تم کو میری یاد بھلادی اور تم ان سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

ہنسی استہزاء قولی کے بعد ہی ہوتی ہے یاد خدا کو بھلانے کی نسبت مومنوں کی طرف مجازاً کی گئی ہے حقیقت میں اہل ایمان کے ساتھ ہنسی کرنے اور ان کا مذاق بنانے کا مشغلہ موجب نسیان تھا اور اس جگہ یہی مراد ہے۔

مقاتل نے کہا اس آیت کا نزول فقراء صحابہ کے متعلق ہوا جیسے حضرت عمار حضرت صہیب حضرت سلمان وغیرہ قریش کے کافر ان سے بہت استہزاء کرتے تھے اور ان کی ہنسی بنایا کرتے تھے۔

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿١١١﴾ آج ان کے صبر کا بدلہ میں نے یہ دیا کہ بس وہی کامیاب ہوئے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾ ارشاد ہوگا آج یہ بتاؤ کہ سالوں کی گنتی کے اعتبار سے تم کتنی مدت زمین پر رہے۔

قال یعنی قیامت کے دن اللہ کافروں سے فرمائے گا۔

کم لبثتم تم زمین میں کتنی مدت رہے یعنی زندگی کی حالت میں اور مرنے کے بعد قبروں میں۔

قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ ﴿١١٣﴾ وہ کہیں گے ایک دن یا ایک دن سے کم رہے (صحیح یاد نہیں) تو گنتی کرنے والوں سے دریافت کرلے۔

کافروں نے پچھلی مدت کو بہت کم قرار دیا۔ اس کی مختلف وجوہ ہوسکتی ہیں (۱) دکھ اور تکلیف کے وقت کو آدمی طویل سمجھتا ہے اور اس سے پہلے گزرے ہوئے زمانے کو چھوٹا جانتا ہے (۲) پچھلی مدت تو گزر چکی تھی اور جو مدت گزر چکے وہ حقیر ہی معلوم ہوتی ہے (۳) آخرت کی زندگی لامحدود ہے اس کے مقابلے میں یہ دنیوی زندگی اور قبر میں رہنے کی مدت بہت ہی کم ہے۔ (۴) پچھلی زندگی خوشی میں گزری اور خوشی کے ایام چھوٹے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ آخری توجیہ اس صورت میں صحیح ہوگی جب مدت قیام سے صرف دنیا میں زندگی کی مدت مراد ہو۔ قبر کی مدت مراد نہ ہو کیونکہ نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ (کافروں کے لئے خصوصیت کے ساتھ) عذاب قبر حق ہے۔

فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ گنتی کرنے والوں سے پوچھ لے یعنی ان لوگوں سے دریافت کرلے جو گنتی کرسکتے ہوں۔ ہم تو جس

عذاب میں گرفتار ہیں وہ ہم کو گنتی کرنے سے مانع ہے۔ یا العادین سے مراد ہیں اعمال نامے لکھنے والے، ملائکہ، اعمال نویس، ملائکہ انسانوں کے اعمال محفوظ رکھتے ہیں تو مدت قیام بدرجۂ اولیٰ ان کے پاس محفوظ ہوگی۔

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ ارشاد ہوگا تم دنیا میں تھوڑے ہی وقت رہے لیکن کیا خوب ہوتا کہ یہ بات دنیا میں تم سمجھتے ہوتے۔

قلیلا یعنی پیش آنے والے عذاب کے مقابلہ میں تم تھوڑے وقت ہی رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، آخر میں یہ دنیا بس ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی انگلی (ذرا) سمندر میں ڈال (کر نکال) لے پھر دیکھے کہ انگلی (سمندر کے پانی سے) کیا لے کر لوٹی۔ رواہ احمد وابن ماجہ ومسلم عن المستورد۔

لو انکم لو تمنائی ہے جس کے اندر توبیخ وملامت بھی ہے، یعنی کاش تم دنیا میں جان لیتے کہ وہاں تمہاری مدت قیام تھوڑی ہے پھر اس زندگی کو کھیل کود، تکمیل خواہشات اور نفس پستی میں نہ کھودیتے اور آج کے دن کی پیشی کو نہ بھولتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، دنیا میں ایسے رہو جیسے تم مسافر یا راہ گیر ہو۔ رواہ البخاری عن ابن عمر، امام، ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں حدیث مذکورہ کے آخر میں یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو قبروں والوں میں شمار کرو۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ سو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو محض بے کار پیدا کیا ہے اور کیا تم گمان کرتے تھے کہ تم ہمارے پاس لوٹا کر نہیں لائے جاؤ گے

افحسبتم ہمزہ انکاریہ توبیخیہ ہے، عبثا بے کار بغیر کسی حکمت کے یا محض کھیل کے طور پر یا صرف اس لئے کہ تم کھیلو کودو، بے کار زندگی گزارو ایسا نہیں ہے بلکہ تم کو اس لئے پیدا کیا کہ تم اللہ کو پہچانو اس کی عبادت کرو۔ اس کے فرماں بردار بنو۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾
پس بہت ہی عالی شان ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، وہی بزرگی والے عرش کا مالک ہے۔

الملک الحق حقیقی بادشاہ جس کو حکومت کا حق ہے اور (جس کی حکومت واقعی ہے) دوسری مخلوق بالذات مالک نہیں مملوک ہے، (حاکم نہیں محکوم ہے) اس کی مالکیت اور (شاہیت) بالعرض ہے یعنی جب اللہ ہی بادشاہ حقیقی ہے تو اس کا فعل عبث نہیں ہو سکتا۔

العرش الکریم عرش بزرگ۔ اللہ کی پر عظمت تجلیات خصوصی طور پر عرش پر پڑتی ہیں اسی لئے اس کی صفت کریم قرار دی۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾
اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی بھی عبادت کرے کہ جس کے معبود ہونے پر اس کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہی جا کر ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہوگی (بلکہ ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں پڑے رہیں گے)۔

پکارنے سے مراد ہے عبادت کرنا۔ لا برھان لہ بہ یہ دوسری صفت ہے اللہ کے سوا دوسرے کی عبادت باطل ہے اور باطل کی کوئی دلیل نہیں یہ دوسری صفت یا تو محض تاکید ہے یا اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ حکم توحید کی بنا اسی پر ہے۔ اس امر پر تنبیہ بھی ہے کہ کوئی ایسا دین اختیار کرنا جس کی کوئی دلیل نہ ہو ممنوع ہے چہ جائے کہ اس عقیدہ و عمل کے خلاف دلیل موجود ہو۔

فانما حسابہ یعنی اللہ بقدر استحقاق اس کو سزا دے گا۔ سزا یہ کہ کافروں کو کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔ جنت میں کبھی نہ جائیں گے، دوزخ سے کبھی رہائی نہ ملے گی۔

آغاز سورۃ میں اللہ نے مومنوں کے فلاح یاب ہونے کا ذکر کیا تھا اور قد افلح المؤمنون فرمایا تھا اور ختم سورۃ پر

کافروں کے فلاح نہ پانے کی صراحت فرمادی۔ اس سے آگے اپنے رسول ﷺ کو استدعاء رحمت اور استغفار کا حکم دیا، تاکہ آپ کی امت والے آپ کی پیروی کر کے مدارج فلاح پر فائز ہو جائیں۔

رکوع ۶ ع

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اور آپ کہا کریں اے میرے رب (میری خطائیں) معاف کردے اور (میرے حال پر) رحم فرما تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ اغفر اور ارحم کا مفعول محذوف ہے تاکہ ہر طرح کی مضرتوں کو دفع کرنے اور ہر قسم کی فائدہ مند چیزوں کے حصول میں عموم پیدا ہو جائے یعنی دعا عام ہو جائے۔ یعنی اے اللہ تو میری تمام خطاؤں کو معاف فرمادے (خطاؤں کی معافی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر تکلیف دہ، ضرر رساں چیز سے حفاظت ہو جائے گی) اور مجھ پر رحم فرما (ہر طرح کے رحم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ ہر فائدہ بخش چیز عنایت فرمادے گا۔ مغفرت کا لازمی نتیجہ دفع مضرت ہے اور رحمت کا لازمی نتیجہ حصول منفعت)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حنش نے بیان کیا ایک مجنون کو حضرت ابن مسعود کے پاس لایا گیا آپ نے اس کے دونوں کانوں میں آیت افحسبتم انما خلقنکم الخ آخر تک پڑھ کر دم کردی اللہ نے اس کو اچھا کردیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابن مسعود سے فرمایا، تم نے اس کے کانوں میں کیا دم کیا۔ حضرت ابن مسعود نے واقعہ عرض کردیا، حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر کوئی شخص اس کو پڑھ کر پہاڑ پر دم کردے تو پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے۔

الحمد للہ ماہ صفر ۱۲۰۴ھ کو سورۂ المؤمنون کی تفسیر ختم ہوئی۔

اللہ کا شکر ہے کہ ۲۸ رمضان ۱۳۷۹ھ کو صبح کے وقت ترجمہ پورا ہوا۔

سورۃ النور

یہ سورۃ مدنی ہے۔ اس میں ۶۴ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا یہ ایسی سورۃ ہے جو ہم نے نازل کی ہے۔

انزلنھا۔ سورۃ کی صفت ہے۔

وَفَرَضْنٰهَا یعنی جو احکام ہم نے بذریعۂ وحی بھیجے ہیں ان پر عمل کرنا تمہارے لئے لازمی کر دیا ہے، بعض نے کہا فرضنھا کا یہ معنی ہے کہ ہم نے تفصیل کے ساتھ الگ الگ کھول کھول کر اس کو بیان کر دیا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے فَرَضْنٰهَا کا ترجمہ کیا قدرناھا یعنی اس کے اندر حدود ہم نے مقرر کر دی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۱ اور ہم نے اس کے اندر کھلی آیات نازل کی ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

بینت یعنی جن کے مرادی معنی الفاظ سے ظاہر اور واضح ہیں۔

تذکرون تاکہ تم نصیحت حاصل کرو یا یہ مطلب کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچتے رہو۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد (کا حکم ہم بیان کرتے ہیں) پس تم ان میں سے ہر ایک کو کوڑے مارو۔

فاجلدوا حکم زنا کا بیان ہے۔ یعنی جب دونوں کا فعل زنا ثابت ہو جائے تو کوڑے مارو۔ یہ مطلب بر قول سیبویہ بیان کیا گیا ہے۔ مبرد نے کہا الزانی اور الزانیة میں الف لام موصولہ ہے اور معنیٔ شرط کو متضمن ہے اس لئے فاجلدوا میں ف جزائیہ ہے۔ ہے جو زنا کرنے والی اور زنا کرنے والا ہے تو کوڑے مارو۔

جلد جلد بدن پر مارنا۔ جلدہٗ اس کی جلد پر مارا، جیسے راسہ، اس کے سر پر مارا، بطنہ اس کے پیٹ پر مارا۔

فاجلدوا کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ صرف جلد بدن پر مارو۔ ایسا نہ مارو جو کھال کو ادھیڑ کو گوشت تک پہنچ جائے۔ اسی سے فقہاء نے مسئلہ ذیل کا استنباط کیا ہے۔

مسئلہ:۔ ایسے درمیانی سائز کے کوڑے سے مارا جائے جب کے سرے پر گھنڈی (گانٹھ) نہ ہو اور ضرب بھی درمیانی طور پر ماری جائے۔ ابن ابی شیبہ نے حنظلہ سدوسی کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت انس بن مالک فرماتے تھے، حکم دیا جاتا تھا کہ کوڑے کی گھنڈی کاٹ دی جائے، پھر اس کے سرے کو دو پتھروں میں رکھ کر خوب کوٹ دیا جائے پھر مارا جائے۔ حنظلہ کا بیان ہے، میں نے دریافت کیا حضرت کس کے زمانہ میں ایسا کیا جاتا تھا فرمایا حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد (خلافت) میں۔

عبد الرزاق نے یحییٰ بن ابی کثیر کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے ایسے جرم کا ارتکاب ہو گیا جو موجب حد ہے اس لئے مجھ پر حد (شرعی) جاری فرما دیجئے۔ حضور ﷺ نے ایک کوڑا طلب فرمایا، حکم کی تعمیل کی گئی، لیکن جو کوڑا پیش کیا گیا وہ سخت بھی تھا اور اس میں سرے پر گھنڈی تھی۔ حضور نے فرمایا اس سے کم (سخت) لاؤ۔ حسب الحکم ایک اور کوڑا پیش کیا گیا جو شکستہ بھی تھا اور نرم بھی فرمایا اس سے اونچے درجہ کا لاؤ (یعنی اتنا نرم

بھی نہ ہو اور پہلے کوڑے کی طرح سخت اور گرہ دار بھی نہ ہو) چنانچہ درمیانی حیثیت کا کوڑا لایا گیا، فرمایا، یہ ٹھیک ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کوڑے سے اس شخص کو پٹوایا۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن اسلم کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اور امام مالک نے موطا میں بھی اس کو ذکر کیا ہے۔

مِائَةَ جَلْدَةٍ سو ضربیں مارو۔

زنا کی رغبت کا ظہور عموماً عورت کی طرف سے پہلے ہوتا ہے وہ اکثر مردوں کے سامنے خود نمائی کرتی ہے اس لئے آیت میں زانیہ کا لفظ زانی کے لفظ سے پہلے ذکر کیا اور چوری کا صدور عام طور پر مردوں سے ہی ہوتا ہے اس لئے آیت سرقہ میں السارق کا ذکر السارقۃ سے پہلے کیا۔

مسئلہ :- علمائے امت اسلامیہ کا اتفاق ہے کہ اگر زانی اور زانیہ آزاد عاقل بالغ اور کنوارے ہوں تو ہر ایک کے سو کوڑے مارے جائیں اس آیت میں یہی حکم دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اور کوئی سزا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نہیں دی جاسکتی، لیکن امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ سو کوڑے مار کر ایک سال کے لئے شہر بدر کر کے اتنی مسافت پر بھیج دیا جائے جتنی قصر صلوٰۃ کی مسافت ہو (یعنی تین بریدیا ۴۰ سے ۴۸ میل تک باختلاف اقوال) اگر راستہ پُرامن ہو خطرناک نہ ہو تو بغیر محرم کے تنہا زانیہ عورت کو شہر بدر کرنے کے مسئلہ میں امام شافعی اور امام احمد کے دو قول ہیں۔ منہاج میں ہے کہ صحیح ترین قول یہی ہے کہ تنہا عورت کو جلاوطن نہ کیا جائے بلکہ شوہر یا کسی محرم کے ساتھ شہر بدر کیا جائے خواہ محرم یا شوہر کو ساتھ جانے کا کچھ معاوضہ ہی دینا پڑے لیکن معاوضہ کہاں سے دیا جائے اس کے متعلق پھر دو قول ہیں ایک قول میں آیا ہے کہ عورت کے مال سے دیا جائے دوسرے قول میں ہے کہ بیت المال سے دیا جائے۔ اگر معاوضہ کی پیش کش کے باوجود شوہر یا محرم ساتھ جانے سے انکار کر دے تو ایک قول میں آیا ہے کہ امام (حاکم) اس کو جبراً عورت کے ساتھ بھیجے منہاج میں ہے کہ صحیح ترین قول یہ ہے کہ امام ساتھ جانے کے لئے جبر نہیں کر سکتا۔ امام مالک کے نزدیک زانیہ کو اجراء حد کے بعد شہر بدر نہیں کیا جائے گا۔

امام شافعی نے مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، البکر بالبکر (کنوارا مرد، کنواری عورت سے زنا کرے تو) جلدہ مأۃ و تغریب عام (سو کوڑے مارنا اور ایک سال کے لئے شہر بدر کرنا) والثیب بالثیب (اور شادی شدہ، شادی شدہ کے ساتھ زنا کرے تو) جلد مأۃ و الرجم (سو کوڑے مارنا اور سنگسار کر دینا) اس حدیث کے شروع میں ہے مجھ سے لے لو مجھ سے لے لو (یعنی مجھ سے یہ حکم سیکھ لو) اللہ نے ان (زانی عورتوں) کے لئے راہ مقرر کر دی (یعنی آخری حکم نازل فرما دیا پہلے حکم دیا گیا تھا کہ زانی عورت کو قید رکھو جب تک اللہ ان کے لئے کوئی راہ نہ نکال دے یعنی آخری فیصلہ صادر نہ فرمادے اس آیت میں آخری فیصلہ زانی عورت کے لئے بلکہ زانی مرد کے لئے بھی صادر فرما دیا) سورت النساء کی آیت فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا کی تفسیر کے ذیل میں حدیث مذکور ہم نے نقل کر دی ہے۔

حضرت زید بن خالد کا بیان ہے میں نے خود سنا کنخدا زانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے، سو کوڑے مارنا اور ایک سال کی جلاوطنی۔ رواہ البخاری۔

صحیحین میں حضرت زید بن خالد اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو شخصوں نے اپنا مقدمہ پیش کیا، ایک نے کہا کتاب اللہ کے موافق ہمارے درمیان فیصلہ کر دیجئے اور مجھے کچھ بولنے کی اجازت دیجئے، حضور ﷺ نے فرمایا بیان کرو۔ اس شخص نے کہا میرا بیٹا اس شخص کے پاس مزدور تھا۔ میرے بیٹے نے اس کی بیوی سے زنا کیا لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تیرے بیٹے کو سنگسار کی سزا دی جائے گی میں نے سزا سے بچانے کے لئے بطور معاوضہ اس شخص کو سو بکریاں اور ایک باندی دے دی پھر علماء سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا تیرے بیٹے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لئے شہر بدر کیا جائے گا اور اس عورت کو سنگسار کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بیان سننے کے بعد فرمایا قسم ہے اس کی جس

کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تم دونوں کا فیصلہ کتاب اللہ کے موافق کروں گا، تیری بکریاں اور باندی تو واپس کی جائیں گی اور تیرے بیٹے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لئے شہر بدر کیا جائے گا اور (حضرت انسؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا) انیس اٹھ اور میرے پاس اس شخص کی عورت کو لوٹا کر لے آ۔ اگر وہ اقرار کر لے تو اس کو سنگسار کر دے، چنانچہ اس عورت نے اقرار کر لیا اور اس کو آپ نے سنگسار کرا دیا۔

امام مالک نے اس کے جواب میں فرمایا کہ البکر بالبکر جلد مائۃ و تغریب عام میں عورتیں داخل نہیں ہیں (بکر کا لفظ عورتوں کو شامل نہیں ہے) لہٰذا عورتوں کو شہر بدر کرنے کا حکم اس حدیث سے نہیں نکلتا۔ مگر امام مالک کا یہ قول قطعاً غلط ہے۔ حدیث کی رفتار عورتوں ہی کے لئے ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث کے شروع میں فرمایا ہے مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو۔ اللہ نے عورتوں کے لئے ایک راہ بنا دی۔

پھر لفظ بکر میں عورتوں کو داخل نہ سمجھنا غلط ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا تھا بکر سے اجازت لی جائے (یعنی کنواری بالغ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت لے کر کیا جائے) اس کے علاوہ حضرت زید کی حدیث میں من زنی کا لفظ عام ہے مرد اور عورت دونوں اس میں داخل ہیں، امام مالک کی طرف سے صحیح جواب یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اور فرمایا ہے عورت بغیر محرم کو ساتھ لئے سفر نہ کرے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین، و احمد، و ابو داؤد عن ابن عمر۔

حضرت ابن عباس کی روایت سے امام احمد نے بھی اور صحیحین میں بخاری و مسلم نے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے شہر بدر کرنے کا حکم صرف مردوں کے لئے خاص قرار دیا ہے اور عورتوں کے لئے شہر بدر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور امام شافعی نے محرم کے ہمراہ ہونے کی شرط لگائی ہے۔

طحاوی نے لکھا ہے کہ جب عورتوں کے لئے تنہا سفر کرنے کی وجہ سے شہر بدر کرنے کا حکم ان کے لئے باقی نہیں رہا تو مردوں کو شہر بدر کرنے کی نفی بھی اس سے نکل آئی (کیونکہ من زنی کا لفظ جب از روائے حدیث مخصوص البعض ہو گیا تو مزید تخصیص قیاس سے کی جا سکتی ہے جو عام مخصوص البعض نہ ہو اس کی تخصیص قیاس سے نہیں کی جا سکتی۔ مترجم) طحاوی نے لکھا ہے کہ حد زنا میں تغریب (جلاوطنی) داخل نہیں اس کا ثبوت حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اگر تم میں سے کسی کی باندی زنا کرے اور فعل زنا ثابت ہو جائے تو اس کو کوڑے لگائے جائیں اور ڈانٹ ڈپٹ یا زجر و توبیخ نہ کرے (حدیث میں لا یثرب علیھا آیا ہے جس کا ترجمہ ایک تو یہی ہے جو ہم نے کر دیا، دوسرا ترجمہ مرادی یہ ہے کہ صرف زجر و توبیخ پر اکتفا نہ کرے بلکہ حد زنا جاری کرے) اگر وہ پھر (دوبارہ) زنا کرے تو اس کو کوڑے لگائے جائیں تثریب نہ کرے تیسری مرتبہ اگر پھر زنا کرے اور اس کا زنا ثابت ہو جائے تو اس کو فروخت کر دے خواہ بالوں کی ایک رسی ہی کے عوض فروخت کرنا پڑے۔ متفق علیہ۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے (تیسری بار زنا کرنے پر) باندی کو فروخت کر دینے کا حکم دیا اور ظاہر ہے کہ اگر حد زنا جاری کرنے کے لئے جلاوطن کرنا ضروری قرار دیا جائے گا تو باندی بائع کے قبضہ میں نہیں رہے گی اور وہ خریدار کو باندی پر قبضہ نہ دے سکے گا اور یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ بائع کو ایسی چیز کو فروخت کر دینے کا حکم دیتے جس پر خریدار کا قبضہ ممکن نہیں، اس حدیث سے زانیہ باندی کو شہر بدر کرنے کی سزا نہ دینے کا حکم نکل رہا ہے اور جب باندیوں کو شہر بدر کرنا جائز نہیں تو آزاد عورتیں جن سے زنا کا صدور ہو گیا ہو بدرجۂ اولیٰ جلاوطن نہ کئے جانے کی مستحق ہیں کیونکہ اللہ نے باندیوں کی سزا آزاد عورتوں سے آدھی رکھی ہے فرمایا ہے عَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ اور جب آزاد عورتوں کے لئے تغریب کا حکم نہیں تو آزاد مردوں کے لئے بھی نہیں ہو سکتا (کیونکہ زنا کی جو سزا آزاد عورت کے لئے مقرر ہے وہی آزاد مرد کے لئے مقرر ہے۔ مرد کو زنا کی سزا زائد نہیں دی جا سکتی لیکن

طحاوی کی یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ عام عورتوں یا باندیوں کیلئے تغریب نہ ہونے کا حکم تو احادیث میں تعارض کی وجہ سے ہے اور مردوں کے لئے (تنہا سفر کرنے کی ممانعت نہیں اس لئے مردوں کے لئے اگر تغریب کا حکم ہو تو) کوئی تعارض نہیں۔

بعض احناف نے کہا حدیث تغریب پر عمل کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ کتاب اللہ پر زیادتی ہے اور کتاب اللہ پر زیادتی کا معنی یہ ہوگا کہ حکم قرآنی کو حدیث نے منسوخ کر دیا اور خبر آحاد سے آیت قرآنی کا نسخ جائز نہیں۔

احناف کی یہ دلیل قابل قبول نہیں۔ حکم نسخ میں جس زیادتی کو مانا جاتا ہے وہ ہر زیادتی نہیں بلکہ مامور بہ میں کسی رکن یا شرط یا وصف کی زیادتی کو حکم نسخ میں جائز قرار دیا جاتا ہے تاکہ جائز کو ناجائز قرار دینا نہ پڑے مثلاً ''نماز کے ارکان میں سورت فاتحہ کی تعیین یا کفارہ میں بردہ آزاد کرنے کے لئے اس کے مومن ہونے کی شرط یا قضا روزہ رکھنے میں پے در پے مسلسل روزے رکھنے کی شرط یا طواف میں طہارت کی ضرورت یہ تمام زیادتیاں کتاب اللہ پر زیادتیاں شمار کی جائیں گی جن کا کوئی جواز نہیں ان سے حکم کتاب کا نسخ لازم آئے گا۔ لیکن کتاب اللہ پر ہر زیادتی ممنوع نہیں ہے ورنہ اکثر احادیث باطل قرار پا جائیں گی دیکھو عدت وفات قرآن سے ثابت ہے لیکن عدت میں سوگ کرنے کا ثبوت قرآن سے نہیں، حدیث سے ہے مگر سوگ عدت کی شرط لازم نہیں اگر کوئی عورت چار ماہ دس روز عدت کے پورے کر لے اور اس مدت میں سوگ نہ کرے تو عدت پوری ہو جائے گی مگر ترک واجب کی وجہ سے گناہگار ہوگی۔

بغیر سوگ کے عدت گزارنے کے بعد اس کے لئے جدید نکاح درست ہو جائے گا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے نزدیک سورۂ فاتحہ کی نماز میں تعیین اور کسی سورت کا اس کے ساتھ ملانا بھی واجب ہے رکن صلوٰۃ نہیں ہے۔ پس اگر حدیث کی روشنی میں کوڑے مارنے کی سزا کے ساتھ یک سالہ جلاوطنی کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو اس سے جائز ناجائز نہیں ہو جائے گا۔

اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ تغریب اور عدم تغریب دونوں کی طرف سے آیت خاموش ہے آیت میں ایسی کوئی تعیین نہیں کہ اگر اس کے خلاف کیا جائے تو آیت کا منسوخ ہونا لازم آجائے پس حدیث کی رو سے تغریب کا اضافہ نسخ آیت کا موجب نہیں۔

محققین احناف کہتے ہیں کہ جس حکم کا سورت نساء میں وعدہ کیا گیا ہے فجلدوا میں اس کا بیان ہے پس اس آیت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تکمیل حکم کا درجہ رکھتا ہے اس آیت میں بر قول سیبویہ حکم موعود کا پورا پورا بیان کر دیا گیا اگر اس کو پورا بیان نہ قرار دیا جائے گا تو اس سے جہل مرکب میں مبتلا کرنا لازم آئے گا کیونکہ آیت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے اور واقع میں پورا بیان ہوگا نہیں تو پڑھنے والے جہل مرکب میں مبتلا ہو جائیں گے، ایسے بیان سے تو ترک بیان اولیٰ ہے۔ لیکن اگر مبرد کے قول کے مطابق فاجلدوا کو شرط کی جزا کہا جائے گا تو مطلب یہ ہوگا کہ سو کوڑے مارنے کا حکم تو واقعی موجود ہے اب اگر تغریب کو بھی سزائے تازیانہ کے ساتھ ثابت مانا جائے گا تو یہ اصل حکم کے معارض اور زیادتی ممنوعہ ہوگی مسکوت عنہ کا اثبات نہ ہوگا۔

ایک شبہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ حدیث مشہور ہے ساری امت نے اس کو حدیث مانا ہے اور ایسی مشہور حدیث سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ نے بے شک اس حدیث کی سند کو صحیح مانا ہے اور حدیث صحیح ہے لیکن صحت سند کو ماننے سے حدیث احاد کی فہرست سے باہر نہیں ہو جاتی اور اگر صحیح ماننے کا یہ مطلب ہے کہ سب امت نے اس کے موافق عمل کرنے پر اتفاق اور اجماع کر لیا ہے تو یہ غلط ہے (امت اسلامیہ میں بکثرت اشخاص اور گروہ اس کی ضرورت نہیں مانتے)۔

ایک شبہ:۔ آیت متواتر قطعی ہے لیکن آیت کا مراد معنی کیا ہے یہ ظنی ہے کیونکہ باجماع علمائے امت آیت میں عموم مخصوص البعض ہے سو کوڑے مارنے کا حکم (اگرچہ آیت میں ہر زانی کے لئے ہے لیکن یہ حکم) آزاد مردوں اور آزاد عورتوں پر جاری ہوگا اور اکثر امت کے نزدیک زانی اور زانیہ کا ناکتخدا ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر صرف کوڑے مارنے پر اکتفا کیا جائے یا اس کے ساتھ شہر بدر بھی کیا جائے یہ بات بجائے خود ظنی ہے اس کا استنباط رائے سے کیا گیا ہے، حد یہ ہے کہ اکثر فقہاء

اور لغت عربی کے عالم اس استنباط کے قائل بھی نہیں ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آیت قطعی السند اور ظنی الدلالت ہے اور حدیث مذکور آحاد میں سے ہے ظنی السند ہے مگر قطعی الدلالت ہے (معنیٔ مراد کی تعیین میں کوئی شک استنباط بالرائے نہیں کیا گیا الفاظ کے جو معین معنیٰ ہیں وہی مراد ہیں) پس جب حدیث آحاد حکم کتاب کی ناسخ ہو سکتی ہے تو بدرجۂ اولیٰ اس سے کتاب پر زیادتی جائز ہو سکتی ہے (زیادتی میں تو اصل حکم باقی ہے اور نسخ میں اصل حکم ہی ختم ہو جاتا ہے)۔

ازالہ:- اگر مساوات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی اتنا ماننا ہی پڑے گا کہ زانی مردوں اور عورتوں کے حق میں حدیث کا حکم اول ترین حکم ہے کیونکہ حضرت عبادہ والی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے (سن) لو اللہ نے ان (زانی عورتوں) کے لئے راہ نکال دی نا کتخدا، نا کتخدا کے ساتھ سو کوڑے مارنا اور ایک سال کے لئے شہر بدر کرنا، اور شادی شدہ شادی شدہ کے ساتھ سو کوڑے مارنا اور سنگسار کر دینا۔ اب (مساوات کی صورت میں) آیت کا حدیث سے تعارض ہو گا اور آیت و حدیث کے تعارض کے وقت آیت ناسخ ہو گی۔ منسوخ نہیں ہو گی اور امام شافعی کا یہ قول ہے کہ شادی شدہ کے حق میں کوڑے مارنے کا حکم منسوخ ہے (شادی شدہ زانی کو صرف سنگسار کیا جائے) تو پھر نا کتخدا کے لئے تغریب کا حکم (جو حدیث میں مذکور ہے) اگر منسوخ قرار دے دیا جائے تو کیا خرابی ہے اور ناسخ بھی یہی آیت ہو گی (کوئی قیاس ناسخ نہیں ہو گا)۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں کہ جس سے تغریب واجب کا وجوب اس طرح ثابت ہوتا ہو کہ ہم اس کو بطریق حد (زنا) واجب قرار دے سکیں۔ زائد سے زائد البکر بالبکر جلد مائۃ و تغریب عام کے الفاظ آئے ہیں اور اس میں ایک واجب (یعنی تغریب) کا عطف دوسرے واجب یعنی (جلد مائۃ) پر ہے اور اس عطف سے وجوب تغریب بطور حد ثابت نہیں ہوتا بلکہ بخاری کی روایت میں تو صراحۃً حضرت ابو ہریرہؓ کے یہ الفاظ آئے ہیں کہ نا کتخدا زانی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے شہر بدر کرنے اور حد کو قائم کرنے یعنی سو کوڑے مارنے کا فیصلہ کیا ہے حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ شہر بدر کرنے کا حکم بطور حد زنا نہ تھا، حد زنا صرف کوڑے مارنا تھا، اب زنا کی سزا کے دو ٹکڑے مانے جائیں (سزائے تازیانہ اور جلاوطن) اور ایک جز کا دوسرے جز پر عطف مانا جائے تو یہ تاویل (حضرت ابو ہریرہؓ کے قول کی روشنی میں) انتہائی رکیک ہو گی، کسی دلیل سے اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اقامت حد (یعنی سزائے تازیانہ کے بعد) اگر حاکم وقت کی مصلحت عامہ کا تقاضا ہو اور وہ شہر بدر بھی کر دے تو اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔

فائدہ:- علمائے شافعیہ نے حدیث تغریب کی ترجیح کے لئے ایک عقلی توجیہ یہ بھی کی ہے کہ جلا کر دینے سے زنا کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے، پھر اس شخص کو زنا کے مواقع ہی حاصل نہیں ہوتے سب چہرے اجنبی ہوتے ہیں۔ علمائے احناف نے کہا اس سے تو فتنہ کا دروازہ اور کھل جانے کا خطرہ ہے، زنا کرنے والی عورت جب اپنے کنبہ قبیلہ سے کٹ جائے گی تو اس کو جھجک بھی نہیں رہے گا اگر نفسانی جذبات اس کے قوی ہوئے تو بلا خوف و خطر وہ مزید زنا میں مبتلا ہو جائے گی اور نفسانی جذبہ میں اگر ہیجان نہ بھی ہو تب بھی اس کو بعض اوقات گزر بسر کے لئے روپے کی ضرورت ہو گی اور اس مجبوری سے ممکن ہے وہ زنا میں پڑ جائے اس کی تائید عبد الرزاق اور محمد بن حسن شیبانی کی کتاب الآثار والی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ دونوں بزرگوں نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے بروایت حماد بوساطت ابراہیم نخعی بیان کیا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا نا کتخدا اگر نا کتخدا سے زنا کرے تو دونوں کے سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے شہر بدر کر دیا جائے حضرت علی نے فرمایا شہر بدر کر دینے سے تو بڑا فتنہ پیدا ہو گا۔

عبد الرزاق نے زہری کی روایت سے سعید بن مسیب کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے شراب خواری کی سزا میں ربیعہ بن امیہ کو جلاوطن کر کے خیبر بھیج دیا ربیعہ ہرقل سے جا کر مل گیا اور عیسائی ہو گیا حضرت عمر کو جب یہ اطلاع ملی تو فرمایا آئندہ میں کسی مسلمان کو جلاوطنی کی سزا نہیں دوں گا۔

مسئلہ:- اگر حاکم وقت مصلحت سمجھے کہ سزاء تازیانہ کے ساتھ شہر بدر بھی کر سکتا ہے، بمصلحت حاکم شہر بدر کرنا

جائز ہے رسول اللہ ﷺ کی حدیث تغریب اور حضرت ابو بکر و حضرت عمر و حضرت عثمان کے فیصلے جو روایت میں آتے ہیں ان سب کا مطلب یہی ہے کہ (حاکم کا یہ اختیار تمیزی ہے اگر وہ چاہے تو جلاوطن بھی کر دے) نسائی ترمذی اور حاکم نے بیان کیا اور حاکم نے برشرط شیخین اس کی تصحیح بھی کی ہے اور دار قطنی کا بیان بھی یہی ہے کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوڑے بھی لگوائے اور شہر بدر بھی کیا اور حضرت ابو بکر نے کوڑے لگوائے اور شہر بدر کیا اور حضرت عمر نے پٹوایا اور شہر بدر کیا۔ ابن قطان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے اور دار قطنی نے اس روایت کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔

ابن ابی شیبہ نے مجہول سند کے ساتھ بیان کیا کہ حضرت عثمان نے ایک عورت کو زنا کی سزا میں کوڑے لگوائے اور خیبر کی طرف شہر بدر کر کے بھیج دیا۔

شہر بدر کرنے کا جواز صرف زنا کی صورت میں ہی نہیں ہے بلکہ حاکم اگر مصلحت سمجھے تو ہر مفسد کو جلاوطن کر سکتا ہے۔

طحاوی نے حضرت عمرو بن شعیب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو قتل کر دیا رسول اللہ ﷺ نے اس کے سو کوڑے لگوائے پھر اس کو ایک سال کے لئے شہر بدر کر دیا اور (اس کا حصہ) مسلمانوں کی فہرست سے خارج کر دیا اور ایک بردہ آزاد کرنے کا اس کو حکم دیا۔

سعید بن منصور راوی ہیں کہ ایک شخص نے رمضان میں شراب پی تھی حضرت عمر نے اس کے دو سو کوڑے لگوائے جلا وطن کر کے شام کی طرف بھیج دیا۔ بخاری نے اس روایت کے ایک حصہ کو بطور تعلیق بیان کیا ہے۔ بغوی نے الجعدیات میں اتنا زائد بیان کیا ہے کہ حضرت عمر جب کسی شخص پر غضب ناک ہوتے تھے تو اس کو شام کیطرف بھیج دیتے تھے بیہقی کی روایت میں آیا ہے کہ بصرہ کی طرف جلاوطن کر کے بھیج دیتے تھے۔ عبد الرزاق نے بوساطت معمر از ایوب از نافع بیان کیا کہ حضرت عمر نے فدک کی طرف (ایک شخص) کو شہر بدر کر کے بھیج دیا۔

مشائخ کرام اسی لئے اگر کسی مرید کے اندر غلبۂ نفسانیت محسوس کرتے تو اس کو کچھ مدت کے لئے ترک وطن کا حکم دے دیتے تھے تاکہ اس کی نفسانیت کا غلبہ ٹوٹ جائے اور دل میں نرمی آجائے۔

میں کہتا ہوں اگر کسی مسلمان کو کوئی حاکم مبتلاء معصیت دیکھے اور اس مسلمان کو اپنے کئے پر ندامت بھی ہو اور وہ اپنے قصور پر شرمندہ بھی ہو تو اس کو سفر کرنے اور وطن کو (کچھ مدت کے لئے) چھوڑ دینے کا حکم دے دے لیکن جو مجرم اپنے قصور پر شرمندہ اور پشیمان نہ ہو اس کی سزا یہ ہے کہ جب تک توبہ نہ کرے ساری زمین سے اس کو نکال دیا جائے۔ ساری زمین سے نکال دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو قید کر دیا جائے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اگر زانی اور زانیہ شادی شدہ ہوں تو ان کو سنگسار کیا جائے گا، صحابہ کرام کا اس پر اتفاق ہے بعد کے علماء کا بھی اسی پر اجماع ہے۔ صرف خارجی اس کے منکر ہیں کیونکہ اجماع صحابہ اور خبر آحاد کا وہ انکار کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ رجم سنگسار کرنے کا حکم قرآن سے ثابت نہیں۔ خبر آحاد میں آیا ہے اور خبر آحاد موجب حکم نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ رجم کا حکم احادیث متواترہ سے ثابت ہے ان احادیث کا تواتر لفظی نہ سہی معنوی تواتر ضرور ہے۔ جیسے حضرت علی کی شجاعت اور حاتم کی سخاوت۔ تفصیلی لحاظ سے اگرچہ تواتر کو نہیں پہنچتی لیکن اجمالی فوقیت متواترہ ہے نا قابل انکار ہے۔ اسی طرح رجم کا ثبوت متواتر ہے گو تفصیلی حالات صورتیں اور خصوصیت خبر آحاد میں آئی ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا کہ اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجا آپ پر کتاب نازل فرمائی من جملہ دوسری آیات کے آیت رجم بھی نازل فرمائی رسول اللہ ﷺ نے سنگسار کرایا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کرایا۔ اور کتاب اللہ میں کتخدا زانی مرد اور عورت کو رجم کر دینے کا حکم صحیح ہے بشرطیکہ گواہوں سے ثبوت ہو جائے یا حمل ہو جائے یا مجرم اعتراف کرلے۔ متفق علیہ۔

بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے خطبہ دیا اور خطبہ میں فرمایا، اللہ نے محمد ﷺ کو نبی برحق بنا کر بھیجا اور آپ پر کتاب

نازل فرمائی۔ نازل کردہ آیات میں آیت رجم بھی نازل فرمائی ہم نے وہ آیت پڑھی اور یاد رکھی آیت یہ تھی الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة نكالا من الله والله عزیز حکیم بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جب زنا کریں تو دونوں کو قطعاً اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر سنگسار کر دو اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رجم کرایا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کرایا۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہنے لگیں گے عمر نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا تو میں مصحف کے حاشیہ پر آیت رجم لکھ دیتا ابوداؤد نے حضرت عمر کا خطبہ نقل کیا ہے اس خطبہ میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ جب طویل زمانہ گزر جائے گا تو لوگ کہنے لگیں گے کہ رجم کا حکم ہم کو کتاب اللہ میں نہیں ملتا۔ ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں (حضرت عمر نے خطبہ میں فرمایا) مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ کہیں عمر نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا، اگر یہ خیال نہ ہوتا تو میں اس کو قرآن میں لکھ دیتا۔ کیونکہ مجھے ڈر لگا ہوا ہے کہ آئندہ کچھ لوگ آئیں گے اور اس آیت کو قرآن میں نہیں پائیں گے تو اس کے منکر ہو جائیں گے اور کہیں گے رجم کی کوئی آیت قرآن میں نہیں ہے) حضرت عمر نے یہ خطبہ صحابہ کے سامنے دیا تھا اور کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا (معلوم ہوا کہ آیت رجم کا قرآن میں ہونا اجماعی ہے) حاکم اور طبرانی نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے حدیث مذکوران الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جب زنا کریں تو ان کو اس لذت اندوزی کی پاداش میں سنگسار کر دو۔ صحیح ابن حبان میں آیا ہے کہ سورت احزاب سورۂ بقرة کے برابر تھی اور اس میں آیت رجم الشیخ والشیخة اذا زنیا الخ بھی تھی۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان لا اله الا الله اور محمد رسول الله کی شہادت دیتا ہو اس کا خون حلال نہیں مگر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے (۱) جان کے بدلے جان یعنی قصاص کی وجہ سے (۲) یا شادی شدہ زانی ہو (۳) یا دین سے نکل گیا ہو جماعت مسلمین کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا ہو۔

حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف کا بیان ہے کہ جس روز حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تھا اس روز دریچہ سے باہر گردن نکال کر آپ نے فرمایا میں تم لوگوں کو اللہ کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ مسلمان شخص کا خون حلال نہیں مگر تین وجوہ میں کسی ایک وجہ سے (۱) شادی شدہ ہونے کے بعد اس نے زنا کیا ہو (۲) مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا ہو (۳) یا ناحق کسی کو قتل کر دیا ہو۔ پس خدا کی قسم میں نے زنا نہیں کیا نہ اسلامی دور سے پہلے نہ اسلام کی حالت میں اور نہ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے کے بعد میں اسلام سے پھرا اور نہ کسی کو ناحق قتل کیا جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہو تو پھر تم لوگ مجھے کیوں قتل کرتے ہو۔ رواه الترمذی والنسائی وابن ماجه والدارمی۔ ورواه الشافعی فی مسنده ورواه البزار و الحاکم۔ حاکم نے اس کو بر شرط شیخین صحیح قرار دیا ہے ورواه البیهقی وابوداؤد...... بخاری نے حسب روایت ابو قلابہ اس حدیث کو فعلی قرار دیا ہے، حضرت ابو قلابہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو قتل نہیں کیا مگر تین وجوہ سے (اگر) کسی نے ناحق قتل کیا تو اس کو (قصاص میں) قتل کیا گیا۔ یا شادی شدہ ہوتے ہوئے کسی نے زنا کیا (تو اس کو سنگسار کیا گیا) یا کوئی اللہ اور رسول ﷺ سے لڑا اور اسلام سے مرتد ہو گیا (تو اس کو قتل کیا۔)

صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز بن مالک کو سنگسار کرایا تھا جبکہ انہوں نے خود زنا کا اقرار کیا تھا، رواه مسلم و البخاری من حدیث ابن عباس ورواه الترمذی وابن ماجه من حدیث ابی هریره۔ صحیحین میں یہ حدیث حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور بعض دوسرے لوگوں کے حوالے سے جن کے نام نہیں بتائے گئے نقل کی گئی ہے۔

مسلم نے حضرت بریدہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ماعز بن مالک نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ مجھے پاک کر دیجئے۔ الحدیث۔

رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ غامد کی ایک عورت کو بھی سنگسار کرایا تھا جس نے خود حاضر ہو کر عرض کیا تھا اور اقرار کیا تھا کہ وہ حاملہ ہے اور اس کو زنا کا حمل ہے، حضور ﷺ نے وضع حمل کے بعد اس کو سنگسار کرایا تھا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ جب

اس کا بچہ کھانا کھانے لگا اس وقت عورت کو سنگسار کرلیا۔

رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت کو بھی رجم کرلیا تھا، جب اس نے زنا کا خود اعتراف کیا تھا۔ رواہ مسلم من حدیث عمران بن حصین۔

علمائے فقہ وحدیث قائل ہیں کہ خلفائے راشدین کا بھی یہی عمل رہا اور ان کا رجم کرنا روایۃً حد تواتر کو پہنچ گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اگر ایک شادی شدہ ہو اور دوسرا نا کتخدا تو شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے گا اور نا کتخدا کو کوڑے لگائے جائیں گے جیسا رسول اللہ ﷺ نے اس مقدمہ میں فیصلہ کیا تھا جس میں ایک شخص کے مزدور نے اس کی بیوی سے زنا کیا تھی (مزدور کو کوڑے مارے گئے اور شادی شدہ عورت کو سنگسار کرایا گیا)۔

مسئلہ:۔ کیا شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے سے پہلے سزائے تازیانہ بھی دی جائے گی۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امام احمد نے فرمایا، اس آیت کے حکم کے مطابق پہلے سو کوڑے مارے جائیں گے پھر سنگسار کردیا جائے گا، گویا امام احمد کے نزدیک آیت کا حکم صرف نا کتخدا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نہ منسوخ ہے۔ امام احمد نے یہ بھی فرمایا کہ کوڑے کا جو حکم آیت میں مذکور ہے وہ پوری سزا نہیں ہے بلکہ سزائے زنا کا ایک حصہ ہے دوسرا حصہ وہ ہے جو حدیث میں مذکورہ ہے کہ نا کتخدا کو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلا وطن کردیا جائے اور شادی شدی کو سنگسار کردیا جائے اور جس طرح حدیث تغریب اور حکم آیت میں تضاد نہیں ہے (بلکہ حدیث، آیت کا جزء تکمیلی ہے) اسی طرح آیت کے حکم کا ٹکراؤ حدیث رجم سے بھی نہیں ہوتا (آیت کے حکم کا جزء تکمیلی حدیث رجم ہے) اگرچہ حدیث رجم متواتر ہے اس لئے دونوں آیت اور حدیث پر عمل کیا جائے گا، اس کی تائید حضرت عبادہ بن صامت کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بکر بکر سے زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ شادی شدہ سے زنا کرے تو سو کوڑے اور سنگساری۔

حضرت سلمٰی بن محبق راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو۔ اللہ نے ان زنا کرنے والی عورتوں کی راہ بتادی بکر سے بکر زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ شادی شدہ سے زنا کرے تو سو کوڑے اور سنگسار کردینا۔ حضرت علی کے مندرجہ ذیل اثر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس کو احمد اور حاکم اور نسائی نے بروایت شعبی بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے کوفہ میں سراحہ ہمدانیہ کو کوڑے لگوائے پھر اس کو سنگسار کرادیا۔ جمعرات کے دن کوڑے لگوائے اور جمعہ کے دن رجم کرادیا تھا اور فرمایا تھا، میں کتاب اللہ کے موافق اس کے کوڑے لگوا رہا ہوں اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق سنگسار کرا رہا ہوں۔ اصل روایت صحیح بخاری میں موجود ہے مگر عورت کا نام مذکور نہیں۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک آیت کا حکم مخصوص ہے نا کتخدا کے ساتھ اس کی خصوصیت ہے، یا شادی شدہ کے حق میں منسوخ ہے۔ حضرت عبادہ اور حضرت سلمٰی کی روایت کردہ حدیثیں بھی یہی حکم رکھتی ہیں (یا مخصوص البعض ہیں یا شادی شدہ کے حق میں منسوخ ہیں) اس کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماعز اور غامدیہ عورت اور جہنیہ عورت کو رجم کرایا، مختلف روایت سے اور متعدد طریقوں سے یہ واقعات منقول ہیں لیکن کسی روایت اور کسی طریقۂ سند سے یہ بات ثابت نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کو سنگسار کرانے سے پہلے کوڑے بھی لگوائے تھے۔

حضرت زید بن خالد کی روایت کردہ حدیث پہلے نقل کی جاچکی ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک شخص کے مزدور نے اس کی بیوی سے زنا کیا تھا حضور نے زانی کے تو کوڑے لگوائے اور ایک سال کے لئے شہر بدر کرنے کا حکم دیا۔ اور حضرت انس سے فرمایا، انیس اٹھ کر جا، اگر عورت اعتراف کرلے تو اس کو سنگسار کردے، حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے اس کے کوڑے مارنا اور پھر سنگسار کرنا (ناسخ کی تین قسمیں ہیں (۱) ناسخ کسی منسوخ کے حکم کو منسوخ کردے مگر منسوخ کی تلاوت باقی ہو، (دوسرا) وہ ناسخ ہوتا ہے جو وحی پر تو مبنی ہوتا ہے مگر وہ غیر متلو ہوتی ہے۔ (تیسرا) وہ ناسخ ہوتا ہے جس کا حکم باقی ہوتا ہے اور تلاوت منسوخ

ہوتی ہے جیسے الشیخ و الشیخة اذا زنیا الخ اس آیت کی تلاوت منسوخ ہے (اور حکم باقی ہے مگر) اس آیت کو ہم ناسخ اسی مطلب پر کہہ سکتے ہیں جو محققین حنفیہ نے اس آیت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ الزانیة و الزانی فاجلدوا دلالت کر رہی ہے کہ کوڑے مارنا پوری سزا واجب ہے اور آیت الشیخ والشیخة دلالت کر رہی ہے کہ رجم پوری سزا ہے، دونوں میں تعارض اور تضاد ہے لامحالہ ایک ناسخ اور دوسری منسوخ ہوگی۔ اگر ہر آیت کے حکم کو مکمل واجبی سزا نہ قرار دیا جائے گا تو دونوں میں تعارض نہ ہوگا اور ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دینے کی بھی ضرورت نہ ہوگی بلکہ دونوں سزائیں دینا واجب ہوں گی۔ سزائے تازیانہ بھی اور رجم بھی۔ جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔

رہا حضرت علی کا اثر تو اس کے مقابل حضرت عمر کا اثر بھی آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اجتہادی تھا۔ طحاوی نے حضرت ابو واقد لیثی اشجعی صحابی کا بیان نقل کیا ہے، حضرت ابو واقد نے فرمایا، ہم حضرت عمر کے پاس موجود تھے۔ ایک شخص حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا امیر المومنین میری بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، اور وہ اس فعل کا اعتراف کرتی ہے، حضرت عمر نے مجھ کو چند لوگوں کے ساتھ اس عورت کے پاس دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ حسب الحکم ہم نے جا کر دریافت کیا اس عورت نے وہی بیان کیا جو اس کے شوہر نے کہا تھا اور کہا میرے شوہر نے سچ کہا، ہم نے یہ اطلاع حضرت عمر کو جا کر دے دی۔ آپ نے اس عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ سنگسار کرنے سے پہلے کوڑے نہیں لگوائے اور یہ واقعہ صحابہ کی جماعت کے سامنے کا ہے۔ (کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔)

میں کہتا ہوں حضرت علی نے جو ہمدانیہ کو دوہری سزا دی اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پہلے اس کا شادی شدہ ہونا آپ کو معلوم نہیں ہوا تھا اس لئے کوڑے لگوائے پھر شادی شدہ ہونا معلوم ہو گیا تو رجم کی سزا دی۔ اور حضرت علی نے جو فرمایا کہ کتاب اللہ کے موافق میں اس کے کوڑے لگواتا ہوں اور سنت رسول اللہ ﷺ کے موافق اس کو رجم کرتا ہوں اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ناکتخدا کی سزا کوڑے مارنا قرآن میں مذکور ہے اور شادی شدہ کو سنگسار کرنے کا حکم حدیث میں ہے، پس جب تک اس کے شادی شدہ ہونے کا علم نہ تھا آپ نے قرآن کے مطابق اس کے کوڑے لگوا دیئے اور جب شادی شدہ ہونے کا علم ہو گیا تو آپ نے اس کو رجم کرا دیا، یہی تشریح ایک روایت میں بھی آئی ہے۔ طحاوی نے حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے زنا کا ارتکاب کیا حضور ﷺ کے حکم کے مطابق اس کے کوڑے مار دیئے گئے، پھر آپ کو اطلاع ملی کہ وہ شادی شدہ ہے تو آپ ﷺ نے اس کو رجم کرا دیا۔

فائدہ:۔ قرآن مجید میں احصان متعدد معانی آئے ہیں (۱) آزادی اور (۲) نکاح جیسے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ میں المحصنت سے نکاحی عورتیں مراد ہیں اور فاذا حصن فان اتین بفاحشة فعلیھن نصف مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ میں احصن سے مراد ہے نکاح کر لینا اور المحصنت سے مراد ہیں آزاد عورتیں۔

احصان بمعنی عفت جیسے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ میں پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن کتابی عورتیں مراد ہیں۔

زانی اور زانیہ کو رجم کرنے کے لئے جو احصان کی شرط شرعاً ضروری ہے اس سے مراد ہے۔ نکاحی ہونا یعنی صحیح نکاح میں ہونا، کیونکہ نکاح کے بعد عورت مرد کی حصن و حفاظت میں داخل ہو جاتی ہے، نتیجہ تزویج محصن ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے محصن کو کتخدا اور غیر محصن کو ناکتخدا (ثیب اور بکر) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

علماء نے احصان رجم کی شرائط میں سے زانی کا آزاد، عاقل بالغ، ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے اور یہ بھی لازم قرار دیا ہے کہ اس نے صحیح طریقے سے نکاح کیا ہو اور نکاح کے بعد زوجہ سے قربت صنفی بھی کر لی ہو۔ یہ پانچوں شرطیں باجماع علماء ضروری ہیں (ان میں سے اگر کوئی شرط مفقود ہو تو رجم کا حکم جاری نہیں کیا جا سکتا عقل اور بلوغ تو قابل سزا ہونے کی بلکہ اللہ کی طرف سے احکام کا مکلف اور مامور ہونے کی ضروری شرط ہے احصان رجم ہی میں ان کا خصوصی ذکر مناسب نہیں اور آزاد ہونا ہر سزا کی

تکمیل کی شرط ہے رجم ہی کی کوئی خصوصیت نہیں، یہاں تک کہ غلام کے سو کوڑے بھی نہیں مارے جائیں گے بلکہ آدھی سزا دی جائے گی، ہاں نکاح کا صحیح ہونا رجم کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔

امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام محمد کے نزدیک زانی کو سنگسار کرنے کے لئے اس کا مسلمان ہونا بھی ضروری ہے۔ امام شافعی، امام احمد، اور امام ابو یوسف اسلام کو ضروری نہیں قرار دیتے۔ امام ابو حنیفہ کے قول کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ محصن نہیں ہے یہ حدیث اسحاق بن راہو یہ نے مسند میں..... حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کی ہے اور دونوں طرح سے بیان کی ہے مرفوعاً بھی اور موقوفاً بھی، یعنی ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان قرار دیا ہے اور دوسری جگہ حضرت ابن عمر کا قول۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ سوائے اسحاق کے کسی نے اس حدیث کو مرفوعاً نہیں بیان کیا۔ بعض اہل روایت کا قول ہے کہ اسحاق نے اس حدیث کو مرفوع کرنے سے رجوع کر لیا تھا صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے (حضرت ابن عمر کا قول ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت غیر محقق ہے) ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اگر سند صحیح ہو تو ایسی حدیث کو مرفوع ہی قرار دیا جائے گا کیونکہ راوی اگر مفتی ہو تو اس کے فتویٰ کی بناء کسی واقعہ پر ہی ہو گی۔

میں کہتا ہوں جب اسحاق نے رجوع کر لیا اور اس کو رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں قرار دیا تو پھر کوئی دوسرا اس کو مرفوع کہنے کا کیا حق رکھتا ہے اور بالفرض اگر اس کو مرفوع مان بھی لیا جائے تب بھی لیس بمحصن کے لفظ سے خصوصیت کے ساتھ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ رجم کے لئے جس احسان کی شرط ہے وہ باقی نہیں رہا۔ قرآن میں احصان کے مختلف معنی آئے ہیں۔ ممکن ہے اس حدیث میں محصن بمعنی عفیف ہو یعنی مشرک عفیف نہیں ہوتا (پاک دامن نہیں ہوتا شرک سے بڑھ کر تردامنی اور کیا ہو سکتی ہے، جب مشرک ہو گیا تو اس نے اپنی پاک دامنی کھو دی) پس اس پر تہمت زنا لگانے والا حد قذف کا مستحق نہیں ہوتا (کیونکہ پاک دامن آدمی پر تہمت زنا لگانے والا حد قذف کا مستحق ہوتا ہے اگر پاک دامن نہ ہو تو اس پر تہمت زنا دھرنے والا حد قذف کا مستحق نہیں قرار پاتا)۔ پس اس حدیث سے رجم کے لئے مسلمان ہونے کی شرط ضروری نہیں قرار دی جاسکتی۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ حدیث الثیب بالثیب میں لفظ ثیب (شادی شدہ) عام ہے مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کچھ یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے آپ ﷺ کا ان کے متعلق کیا فیصلہ ہے، حضور ﷺ نے فرمایا رجم کی بابت توریت میں تم کو کیا ملتا ہے۔ کہنے لگے (توریت کے مواقف تو) زنا کرنے والوں کو ہم تعزیر کرتے ہیں (یعنی منہ کالا کر کے بازار میں گشت کراتے اور مشتہری کرتے ہیں) اور کوڑے مارتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام بولے تم نے جھوٹ کہا توریت میں تو سنگسار کر دینے کا حکم ہے۔ توریت لاؤ۔ توریت لائی گئی اور اس کو کھول کر پڑھا گیا تو ایک یہودی نے آیت رجم پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس نے اول و آخر کی عبارت پڑھ دی، عبداللہ نے فرمایا ہاتھ ہٹاؤ۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو آیت رجم سامنے آگئی۔ اس پر یہودی کہنے لگے محمد ﷺ! عبداللہ نے سچ کہا، توریت میں آیت رجم ہے۔ حضور ﷺ نے دونوں کو سنگسار کر دینے کا حکم نافذ فرما دیا۔ حسب الحکم دونوں کو رجم کر دیا گیا۔ اس حدیث سے امام احمد و امام شافعی کے قول کا ثبوت ہوتا ہے کہ زانی کو رجم کرنے کے لئے اسلام کی شرط نہیں ہے۔

صاحب ہدایہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ یہ حکم تو توریت میں تھا جو شریعت اسلامیہ میں منسوخ کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ گزشتہ شریعتوں کے احکام ہمارے لئے واجب العمل ہیں تاوقتیکہ ان کا منسوخ کیا جانا ہماری شریعت میں واضح طور پر نہ آگیا ہو خاص کر اس صورت میں تو ان کا واجب العمل ہونا ضروری قرار پاتا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے ان پر عمل کیا ہو شریعت سابقہ کے حکم پر رسول اللہ ﷺ کا عمل کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حکم ہماری شریعت میں بھی باقی ہے اگر ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس پر ہرگز عمل نہ کرتے اور اللہ کے (آخری) نازل کردہ حکم کے خلاف کبھی حکم نہ دیتے۔ جب امام ابو حنیفہ کا خود یہ قول ہے کہ بغیر شرعی ناسخ کے شریعت سابقہ کا

حکم ہمارے لئے بھی واجب العمل ہے تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی آیت یا حدیث ایسی ہے جو حکم رجم کو منسوخ کر رہی ہو ہم کو تو ایسی نہ کوئی آیت ملتی ہے نہ حدیث، زانی زانیہ، شیخ، شیخہ، ثیب اور بکر کے الفاظ تو عام ہیں مومن کو بھی شامل ہیں اور کافر کو بھی اور ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حدیث من اشرک باللہ فلیس بمحصن سے رجم کے لئے مسلمان ہونے کی شرط ثابت نہیں ہوتی۔ آیت میں احصان نہ ہونے سے مراد ہے پاک دامن نہ ہونا، یعنی مشرک پاکدامن نہیں اس لئے اس پر تہمت زنا لگانے سے حد قذف جاری نہ ہو گی۔

مسئلہ :۔امام ابو حنیفہ نے رجم کے لئے محصن ہونے کی شرط کی تفصیل یہ بیان کی کہ زوجین صحیح نکاح کے ساتھ قربت کر چکے ہوں، دونوں مسلمان عاقل، بالغ اور آزاد ہوں۔ امام احمد نے مسلمان ہونے کی شرط کے علاوہ باقی شرائط میں امام ابو حنیفہ سے اتفاق کیا ہے یہاں تک کہ اگر کسی آزاد مسلمان عاقل بالغ نے باندی سے یا نابالغہ سے یا دیوانی عورت سے یا کتابیہ عورت سے قربت کر لی ہو اور جماع ہو گیا ہو تب بھی وہ محصن نہیں قرار پائے گا اگر اس کے بعد زنا کرے گا تو قابل رجم نہ ہو گا۔ اسی طرح اگر آزاد عاقل بالغ عورت نے کسی غلام یا نابالغ یا دیوانے سے نکاح کر لیا اور جماعی قربت بھی ہو گئی تب بھی محصنہ نہیں قرار پائے گی اگر اس کے بعد زنا کی مرتکب ہو جائے گی تو اس کو رجم نہیں کیا جائے ہو گا۔ اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی عورت سے نکاح کر لیا، اور قربت کر لی پھر قربت کے بعد وہ مسلمان ہو گئی اور اس کے مسلمان ہونے کے بعد شوہر نے اس سے قربت نہیں کی پھر عورت زنا کی مرتکب ہو گئی وہ قابل رجم نہیں قرار پائے گی۔

اگر کسی مسلمان عاقل بالغ نے اپنی باندی سے قربت کی پھر اس کو آزاد کر دیا اور ازاد کرنے کے بعد اس سے قربت نہیں کی پھر اس باندی نے زنا کا ارتکاب کیا تو قابل رجم نہ ہو گی۔ سنگسار نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ نے اپنے قول کے ثبوت میں دار قطنی اور ابن عدی کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے کہ ابو بکر بن عبد اللہ بن ابی مریم نے بروایت علی بن ابی طلحہ حضرت کعب بن مالک کا یہ بیان نقل کیا کعب نے ایک یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کو منع کر دیا اور فرمایا وہ تم کو محصن نہیں بنا سکے گی۔

دار قطنی نے کہا ابو بکر بن عبد اللہ بہت ضعیف راوی ہے اور علی بن ابی طلحہ نے حضرت کعب بن مالک کو نہیں پایا (اس لئے یہ روایت ضعیف نا قابل اعتماد ہے)۔

ابن ہمام نے کہا اس حدیث کو بقیہ بن ولید نے بحوالہ عتبہ بن نمیم بروایت علی بن ابی طلحہ از کعب بن مالک بھی بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی سند بھی منقطع ہے۔

میں کہتا ہوں بقیہ بن ولید ضعیف اور تدلیس کرنے والا ہے ابن ہمام نے کہا ہمارے نزدیک کسی روایت کا منقطع ہونا مرسل ہونے کا حکم رکھتا ہے اور مرسل ہمارے نزدیک قابل استدلال ہے، بشرطیکہ .... تمام راوی عادل ہوں۔ میں کہتا ہوں ایک زانی یہودی اور زانیہ یہودن کو رسول اللہ ﷺ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا، یہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے اور روایت مذکورہ اس سے متعارض ہے لیکن صحیحین کی حدیث کی برابر قوت نہیں رکھتی اس لئے اس پر عمل نا جائز ہے۔

امام احمد چونکہ احصان کے لئے مسلمان ہونے کی شرط کو ضروری نہیں قرار دیتے اس لئے وہ بھی اپنے قول کی تائید میں ایسی حدیث کو نہیں پیش کر سکتے۔

بیہقی نے بطریق ابو وہب از یونس بیان کیا کہ زہری نے کہا میں نے خود سنا کہ عبد الملک۔ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے دریافت کر رہا تھا کیا باندی سے (قربت) آزاد مرد کو محصن بنا سکتی ہے۔ عبید اللہ نے کہا ہاں، عبد الملک نے کہا تم یہ کس کی روایت سے بیان کر رہے، عبید اللہ نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو ایسا ہی فرماتے پایا ہے۔ بیہقی کا قول ہے کہ ہم کو اطلاع ملی ہے کہ محمد بن یحییٰ نے اوزاعی کا قول بھی یہی بیان کیا تھا۔ بیہقی نے بطریق عبد الرزاق از معمر از زہری بھی عبید اللہ بن عبد اللہ کا قول اسی طرح بیان کیا ہے۔

مسئلہ :- اگر مرد اور عورت میں سے ایک محصن ہو اور دوسرا محصن نہ ہو تو شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے گا اور نا کتخدا کو کوڑے مارے جائیں گے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ حضرت زید بن خالد اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث اوپر ذکر کی جاچکی ہے کہ مزدور کو حضور ﷺ نے کوڑے لگوائے اور جس عورت نے اس سے فعل زنا کیا تھا (چونکہ وہ شوہر دار تھی اس لئے) اس کو سنگسار کرنے کا حکم تھا۔ پوری حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ :- اگر دونوں میں سے ایک پاگل اور دوسرا عاقل ہو تو امام مالکؒ و امام شافعیؒ و امام احمدؒ کے نزدیک دونوں میں سے جو مجنون نہ ہوگا اس پر حد شرعی قائم کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا اگر مرد عاقل ہے اور عورت پاگل تو حد شرعی مرد پر جاری ہوگی اور اگر عورت عاقل ہے اور مرد پاگل تو عورت پر حد جاری نہ ہوگی۔ کیونکہ فعل زنا کا فاعل تو مرد ہوتا ہے عورت تو محل زنا ہے عورت کو زانیہ مجازاً کہا جاتا ہے (حقیقت میں عورت مزنیہ ہوتی ہے) عورت کو جو زنا کی سزا دی جاتی ہے وہ صرف اس وجہ سے کہ اس نے مرد کو فعل زنا کی اجازت دی۔ باقی ائمہ نے کہا اگر عورت عذر شرعی رکھتی ہو اور اس کو سزا نہ دی جائے تو مرد جو غیر معذور ہے اجماعاً شرعی سزا سے نہیں بچ سکتا اسی طرح اگر مرد معذور ہو اور عورت عاقل ہو تو مرد کا معذور ہونا عورت سے حد شرعی کو ساقط نہیں کر سکتا۔ اور ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ عورت کو مرتکب زنا مجازاً کہا جاتا ہے اور اگر اس کو مان بھی لیں تب بھی یہ مجازی معنی، یعنی مرد کو زنا کرنے کی اجازت دینا، عورت پر حد شرعی جاری ہونے کا موجب ہے۔ باقی یہ کہنا کہ بچے اور دیوانہ کا فعل (غیر مکلّف ہونے کی وجہ سے) زنا نہیں ہے ناقابل تسلیم ہے بلکہ لغت اور شریعت دونوں میں اس کو زنا کہا گیا ہے، تکلیف شرعی نہ ہونے کی وجہ سے نفاذ حد نہیں ہوتا۔

فصل

مسئلہ :- مرد کا عورت سے آگے کے مقام میں بغیر کسی استحقاق ملکیت کے یعنی بغیر نکاح اور بغیر ملکیت شخص کے جماع کرنا شرعاً اور لغۃً زنا کہلاتا ہے دبر میں جماع کرنا زنا نہیں کہلاتا خواہ مفعول عورت ہو یا مرد۔ سورت نساء کی آیت والذان یاتیا نہا منکم فاذوھما کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے لواطت کی سزا کی تشریح کر دی ہے۔

پس اگر کسی نے اپنی حائضہ بی بی سے یا اپنی روزہ دار بیوی سے یا محرم (یعنی جس نے حج یا عمرہ کا احرام کر لیا ہو) بیوی سے یا استبراء کی مدت (تقریباً ایک ماہ کے ختم کا انتظار کئے بغیر یا اس باندی سے جو اس کے اور دوسرے شخص کے درمیان مشترک ہو یا مشرک باندی سے یا دوسرے کی منکوحہ باندی سے یا اس باندی سے جو دودھ کے رشتہ سے حرام ہو گئی ہے صحبت کر لی تو اس کو زنا نہیں کہا جائے گا نہ اس فعل پر شرعی سزا جاری ہوگی۔ کیونکہ ان تمام صورتوں میں کسی قدر ملکیت موجود ہے ہاں ایسا کرنے پر گناہ گار ضرور ہوگا۔ اگر شبہ ملک ہو تو شرعاً اس کا حکم بھی ملک کی طرح ہے، چاروں ائمہ اور سوائے ظاہریہ فرقہ کے تمام علماء کے نزدیک حد ساقط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کر دو (یعنی اگر ارتکاب جرم میں شبہ پیدا ہو جائے تو اس فعل کی مقررہ شرعی سزا جاری مت کرو) ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث بواسطہ مقسم حضرت ابن عباس کی روایت سے مسند ابوحنیفہ میں مذکور ہے۔ ترمذی، حاکم اور بیہقی نے بطریق زہری بواسطۂ عروہ حضرت عائشہ کی روایت سے حدیث مذکور کی یہ الفاظ نقل کئے ہیں، جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو ساقط کرو اگر اس (مجرم) کے لئے کوئی راستہ نکل سکے تو اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ حاکم کا معافی میں غلطی کرنا، غلط طور پر سزا دینے سے بہتر ہے۔ اس روایت میں یزید بن زیاد دمشقی ضعیف ہے بخاری نے اس کو منکر اور نسائی نے متروک قرار دیا ہے۔ وکیع نے اس حدیث کو موقوفاً بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ ترمذی نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ متعدد صحابہ کا بھی یہی قول ہے۔ بیہقی نے وکیع کی روایت کو سنن میں اقرب الی الصواب کہا ہے۔ رشدین نے بواسطۂ عقیل بروایت زہری اس کو بیان کیا ہے۔ لیکن رشدین ضعیف ہے۔

حضرت علیؓ کی مرفوع روایت کے یہ الفاظ ہیں شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کر دو اور حدود کو معطل کر دینا (جاری نہ کرنا) حاکم کے لئے جائز نہیں ہے (یعنی شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کر دینا چاہئے لیکن ثبوت کے بعد حاکم حدود کو معطل

نہیں کر سکتا) اس کی سند میں مختار بن نافع ہے جو منکر الحدیث ہے۔ امام بخاری نے اس کے متعلق یہی کہا ہے۔
اس موضوع کی صحیح ترین حدیث سفیان ثوری کی سلسلہ سے آئی ہے جس کے قائل حضرت ابن مسعود ہیں کہ شبہات سے حدود کو ساقط کردو اور جہاں تک تم سے ہوسکے مسلمانوں سے قتل (یعنی جان لینے والی سزا) کو دفع کرو رواہ ابن ابی شیبہ، حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت معاذ سے بھی یہ حدیث موقوفاً مروی ہے۔ رواہ ابن ابی شیبۃ۔ حضرت عمر سے بھی منقطعاً اور موقوفاً یہ حدیث آئی ہے ابن حزم نے کتاب الایصال میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عمر پر اس کو موقوف قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابراہیم نخعی کے طریق سے حضرت عمر کا قول اس طرح نقل کیا ہے اگر شبہات کی وجہ سے میں غلطی سے حدود ساقط کردوں تو میرے نزدیک یہ فعل اس سے بہتر ہے کہ شبہات کی موجودگی میں میں حدود جاری کروں۔
ظاہر یہ فرقہ کہتا ہے کہ ثبوت کے بعد کسی شبہ کی وجہ سے حد ساقط نہیں کی جاسکتی۔ سقوط حد کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان ثابت نہیں بلکہ بعض صحابہ کا قول ہے اور وہ بھی ناپسندیدہ سند سے مروی ہے۔ رہی حضرت ابن مسعود کی موقوف حدیث سووہ مرسل ہے اور ابن ابی شیبہ کی روایت کے علاوہ عبدالرزاق نے جو حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے اس کی سند میں اسحاق بن ابی فروہ آتا ہے جو معلل ہے۔
ابن ہمام نے لکھا ہے کہ شبہ کی وجہ سے سقوط حد کی حدیث کو ساری امت نے قبول کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے جو اقوال اس سلسلہ میں مروی ہیں تو مسئلہ کا قطعی الثبوت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماعز سے فرمایا تھا۔ شاید تو نے بوسہ لیا ہوگا۔ شاید تو نے چھولیا ہوگا شاید تو نے دبالیا ہوگا، گویا حضور ﷺ نے اقرار زنا کے بعد حضرت ماعز کو اپنے اقرار سے لوٹ جانے کی درپردہ تلقین فرمائی تھی اور اس کا فائدہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ اگر وہ حضور ﷺ کے سوال کے جواب میں ہاں کہہ دیتے تو حضور ﷺ ان کو چھوڑ دیتے۔ اسی طرح جو چور حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اس کے متعلق بھی حضور ﷺ نے فرمایا میرے خیال میں اس نے چوری نہیں کی۔
غامدیہ عورت جس نے زنا کا اقرار کیا تھا اسے بھی ایسا ہی فرمایا تھا۔ حضرت علی نے بھی اسی طرح سراحہ سے جس نے زنا کا اقرار کیا تھا فرمایا تھا، شاید تو سورہی ہوگی اور وہ تیرے اوپر آپڑا ہوگا۔ شاید اس نے تجھ پر جبر کیا ہو گیا شاید تیرے آقا نے تیرا نکاح اسی سے کرادیا ہوگا اور تو اس بات کو چھپا رہی ہے۔ صحابہ کے اس طرح کے اقوال تلاش کے بعد بہت مل سکتے ہیں جن کی تفصیل موجب طول ہے خلاصہ یہ کہ تمام احادیث و آثار کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ حد کو ساقط کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی جائے۔

مسئلہ:۔ شبہ دو طرح کا ہوتا ہے۔
(۱) شبہ اشتباہ:۔ یعنی ایسا شبہ جو شبہ میں پڑنے والوں کے لئے تو ہوتا ہے اور جو شبہ نہ کریں ان کے لئے نہیں ہوتا، ایسا شبہ اس وقت ہوتا ہے جب حلت کی کوئی واقعی دلیل تو موجود نہیں ہوتی، لیکن مرتکب زنا اس چیز کو دلیل سمجھ لیتا ہے جو واقعی میں دلیل نہیں ہوسکتی۔
مثلاً کسی نے ماں باپ یا اپنی بی بی کی باندی سے یہ سمجھتے ہوئے صحبت کرلی کہ ماں باپ کے ساتھ رشتۂ ولادت کی وجہ سے اور بی بی سے رشتۂ زوجیت کی وجہ سے ملکیت مشترک ہے اسی لئے ماں باپ اور بی بی کے لئے اس کی شہادت اور اس کے لئے والدین اور بی بی کی شہادت شرعاً قابل قبول نہیں۔ یا جس عورت کو تین طلاقیں دے چکا ہے اور وہ ابھی عدت میں ہے اس سے قربت کرلی یہ سمجھ کر کہ ابھی حقوق نکاح باقی ہیں عدت کا نفقہ میں دے رہا ہوں اور عدت میں عورت کا نکاح کسی دوسرے سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ان تمام صورتوں میں اگر اس کو حرمت قربت کا علم نہیں ہے اور صحبت کرلی تو (اگرچہ یہ فعل زنا ہوگا لیکن) حد زنا جاری نہیں ہوگی اور اگر حرمت صحبت کا علم رکھنے کے بعد ایسا کرے گا تو حد زنا جاری ہوگی۔
(۲) شبہ ملک:۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب واقع میں حلت کی کوئی دلیل موجود ہے (لیکن شبہ کرنے والے نے سمجھنے میں غلطی کی ہو) جیسے بیٹے کی باندی سے اس حدیث کی روشنی میں قربت کرلی جو حضرت جابر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے

خدمت گرامی میں گزارش کی یارسول اللہ ﷺ میرا مال بھی ہے اور اولاد بھی مگر میرا باپ میرا مال چھین لینا چاہتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا تو اور تیرا مال (سب کچھ) تیرے باپ کا ہے، ابن القطان اور منذری نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ یہ حدیث طبرانی نے الاصغر میں اور بیہقی نے دلائل میں بھی نقل کی ہے (بظاہر اس حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ بیٹے کی باندی بھی باپ ہی کی ملک ہے اس لئے باپ کی قربت بیٹے کی باندی سے جائز ہے۔ یہ دلیل اگرچہ غلط ہے لیکن بہر حال دلیل ہے) اسی طرح جس عورت کو طلاق کنائی دی ہو اور وہ عدت میں ہو اس سے طلاق دینے والے نے (بغیر نکاح جدید کے) قربت کرلی تو حد زنا جاری نہ ہو گی کیونکہ صحابہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک طلاق کنائی دینے کے بعد حق رجوع باقی رہتا ہے اسی طرح بغیر گواہوں کے نکاح کا مسئلہ ہے کہ بغیر گواہ منکوحہ سے قربت حد زنا کی موجب نہیں۔ ان تمام صورتوں میں چونکہ حلت کی کسی نہ کسی طرح کی دلیل موجود ہے (اس لئے) قربت کرنے والے پر حد زنا جاری نہ ہو گی خواہ وہ حرمت کا ہی عقیدہ رکھتا ہو۔

اسی طرح اگر پہلی مرتبہ کوئی عورت رخصتی کے بعد شوہر کے گھر میں آئی اور عورتوں نے کہا یہ تیری بی بی ہے اور شوہر نے قربت کرلی (اور واقع میں وہ عورت اس کی منکوحہ نہ تھی) تو حد جاری نہ ہو گی، البتہ مہر دینا پڑے گا۔ علماء کا اس پر اجماع ہے حضرت علی نے یہی فیصلہ کیا تھا اور عورت کو عدت بھی کرنی ہو گی۔ حد جاری نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہے کہ اس نے عورتوں کی خبر پر اعتماد کیا اور کرنا ہی چاہئے تھا کیونکہ پہلی مرتبہ میں کسی کو بھی اپنی بی بی اور غیر عورت کے درمیان امتیاز نہیں ہوتا (دوسری عورتوں کی اطلاع کا اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے ہاں اگر کسی نے اپنے بستر پر کسی عورت کو پایا اور اس سے صحبت کرلی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر حد جاری کی جائے گی، امام مالک، شافعی اور امام احمد کا قول اس مسئلہ میں بھی مسئلہ اول کی طرح ہے ان حضرات کے نزدیک اس صورت میں بھی حد جاری نہیں کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا ایک مدت تک ساتھ رہنے کے بعد دھوکہ ہو جانے کا کوئی معنی نہیں اگر اس صورت میں بھی اس کو اپنے بستر پر موجود اجنبی عورت پر اپنی بی بی کا گمان ہوتا ہے تو بے دلیل ہوتا ہے۔

اگر مرد نابینا ہے اور عورت کو دیکھ نہیں سکتا تب بھی امام صاحب کا یہی قول ہے کیونکہ وہ سوال کر سکتا ہے اور دوسرے طریقے استعمال کر سکتا ہے ہاں اگر نابینا نے اپنی عورت کو بلایا اور اجنبی عورت پہنچ گئی اور اس نے کہا میں تیری بی بی ہوں تو نابینا دھوکہ کھا سکتا ہے اجنبی عورت اس کی بی بی کی آواز بنا سکتی ہے آواز آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے خصوصاً ایسی صورت میں تو زیادہ دھوکہ ہو سکتا ہے جب ساتھ رہتے زیادہ مدت نہ گزری ہو۔

مسئلہ:۔ جس عورت سے نکاح حرام ہے اور کسی نے اس سے نکاح کرلیا اور صحبت کرلی تو امام ابو حنیفہ، امام زفر اور سفیان ثوری کے نزدیک زنا کی حد اس پر جاری نہ ہو گی لیکن اس جرم کی سزا اس کو بہت ہی شدید دی جائے گی (جو حد زنا سے بھی زیادہ سخت ہو گی)۔

میں کہتا ہوں اس کو قتل کر دینے کا فیصلہ زیادہ مناسب ہے تاکہ حدیث کا اتباع ہو جائے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک کا قول ہے کہ اگر حرمت نکاح کا علم رکھتے ہوئے نکاح کیا ہو تو حد زنا جاری کی جائے گی کیونکہ اس نے ایسی عورت سے صحبت کی جس کی حرمت اجماعی ہے کسی کو اس کی حرمت میں اختلاف نہیں نہ ملک ہے نہ ملک کا شبہ۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہر عورت محل نکاح ہے اس نے عورت سے ہی نکاح کیا ہے ہاں بعض عورتیں نکاح مخصوص کا محل نہیں ہیں اسی لئے ان سے نکاح باطل ہے اس لئے شبہ پیدا ہو گیا، شبہ اسی کو کہتے ہیں جو حقیقت سے مشابہت رکھتا ہو وہ حقیقت تو نہیں بن جاتا پس شبہ نہیں چاہتا کہ کس طور پر اس کی حلت ہو سکتی ہو (قطعاً حرام ہونے کی صورت میں بھی حلت کا شبہ ہو سکتا ہے اور جب شبہ ملک پیدا ہو گیا تو یہ فعل زنا نہیں ہوا، اس لئے حد زنا اس پر جاری نہ ہو گی۔ رہی یہ بات کہ یہ عمل زنا سے زیادہ سخت ہے تو اس عمل کی شدت اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ اس کو زنا کی سزا دی جائے۔ حدود تو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ دیکھو: تہمت زنا لگانے کی سزا شرعاً اسی کوڑے مقرر ہے اور تہمت کفر تہمت زنا سے زیادہ سخت ہے مگر اس کی کوئی سزا

شرعاً مقرر نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے غیبت کو زنا سے زیادہ سخت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان، عن ابی سعید و جابر (اس کے باوجود غیبت کی کوئی شرعی سزا مقرر نہیں)۔

جن عورتوں سے نکاح حلال نہیں ان سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے نکاح کی حرمت دوامی ہو کبھی ان سے نکاح حلال نہ ہو خواہ نسبی قرابت دار ہوں یا رضاعی یا سسرالی رشتہ دار ہوں (مثلاً ''ماں''، دادی، نانی تمام اصول اور بیٹی، پوتی، نواسی تمام فروع اسی طرح تمام رضاعی محرمات یعنی رضاعی ماں کے تمام اصول و فروع وغیرہ اور منکوحہ موطوءہ بیوی کے تمام اصول و فروع وغیرہ) لیکن اگر صحت نکاح اختلافی ہو۔ جیسے بلا گواہوں کے نکاح تو ان سے نکاح حد زنا کو ساقط کر دیتا ہے کیونکہ تمام علماء کے نزدیک اس میں (ملکیت کا) شبہ ہے اگر نکاح کی حرمت تو متفق علیہ ہو لیکن یہ حرمت دوامی نہ ہو، جیسے آزاد عورت پر باندی سے نکاح یا مجوسی عورت سے نکاح یا کسی باندی سے اس کے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح یا غلام کا اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح یا دوسرے کی منکوحہ سے نکاح یا اس عورت سے نکاح جو کسی کی مطلقہ ہو اور عدت میں ہو یا اس کا شوہر مر گیا اور وہ عدت میں ہو یا بی بی کو تین طلاقیں دینے کے بعد (بغیر حلالہ کیئے) اس سے نکاح یا بی بی سے نکاح ہوتے ہوئے سالی سے نکاح یا بی بی کو طلاق دینے کے بعد اس کی عدت کے زمانے میں سالی سے نکاح یا بیبیوں کے باوجود پانچویں سے نکاح یہ سب نکاح حرام ہیں مگر حرمت دوامی نہیں اس لئے امام ابو حنیفہ کے نزدیک ان محرمات سے نکاح اور نکاح کے بعد صحبت حد زنا کا موجب نہیں، صاحبین کے دو قول مروی ہیں ایک روایت میں ان سے نکاح کو موجب حد کہا گیا ہے اور دوسری روایت میں صاحبین کا قول امام صاحب کے قول کے موافق کہا گیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو طحاوی نے بیان کی ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت سے اس کی عدت کے زمانے میں نکاح کر لیا، یہ معاملہ حضرت عمر تک پہنچا، آپ نے اس کو پٹوایا مگر حد زنا سے کم اور عورت کو مہر دلوایا اور دونوں میں تفریق کرادی اور فرمایا آئندہ یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہوں گے۔

محارم سے نکاح کرنے کے مسئلہ میں حضرت جابر کی روایت سے آیا ہے کہ ایسے شخص کی گردن ماردی جائے امام احمد اور اسحاق اور اہل ظاہر کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن ابن حزم نے قتل کی سزا صرف اس شخص کے لئے تجویز کی ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے باپ کے مرنے کے بعد نکاح کیا ہو کیونکہ حدیث میں قتل کی سزا کا حکم اسی شخص کے متعلق ہوا تھا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا دوسری روایت میں امام احمد کا قول آیا ہے کہ ایسے آدمی کی گردن ماردی جائے اور مال ضبط کر لیا جائے۔ کیونکہ حضرت براء بن عازب کا بیان ہے کہ میں اپنے ماموں سے ملا اس وقت وہ ایک جھنڈا لئے کہیں جارہے تھے۔ میں نے پوچھا آپ کہاں جانے کا ارادہ کر رہے ہیں، انہوں نے جواب دیا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کی طرف بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے، حضور ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس کی گردن ماردوں اور اس کا مال لے لو۔ رواہ ابو داؤد و الترمذی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔

طحاوی نے بعض طریقوں سے اس کو بیان کیا ہے لیکن ان میں مال پر قبضہ کر لینے کا ذکر نہیں ہے۔ بعض طریقوں میں مال پر قبضہ کر لینے کا ذکر ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی محرم عورت پر پڑ جائے اس کو قتل کر دو۔ معاویہ بن قرہ نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا کہ قرہ کے باپ یعنی میرے دادا معاویہ کو حضور ﷺ نے ایک ایسے شخص کی گردن مار دینے اور اس کے مال پر قبضہ کر لینے کے لئے بھیجا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا۔

حنفیہ ان تمام احادیث کے جواب میں کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی حدیث میں زنا کی مقرر حد جاری کرنے کا حکم نہیں ہے

نہ کوڑے مارنے کا نہ سنگسار کرنے کا نہ کسی محرم عورت سے صحبت کرنے کا ذکر ہے۔ صرف محرم عورت سے نکاح کر لینے کا بیان ہے اور محرم سے صرف نکاح کر لینا باجماع علماء سزاء زنا کا موجب نہیں اس لئے کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو قتل کرنے اور اس کا مال چھین لینے کا حکم محض سیاست کے طور پر دیا تھا یا یوں کہا جائے کہ جس شخص نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا اس نے اس نکاح کو حلال سمجھ کر کیا تھا، جاہلیت کے دور میں لوگ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ پس حرام قطعی کو حلال سمجھنے والا مرتد ہو گیا اور ممکن ہے وہ محارب (اسلام کے خلاف جنگ کرنے والا) بھی ہو گیا ہو اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کو قتل کرنے اور اس کے مال پر قبضہ کر کے بیت المال میں داخل کرنے کا اور پانچواں حصہ نکالنے کا حکم دیا۔

مسئلہ:- اگر اجرت ٹھہرا کر کسی عورت سے زنا کیا تو حد جاری نہ ہو گی یہ شبہ عقد کی صورت ہے البتہ تعزیز (سیاسی سزا) دی جائے گی، امام ابو حنیفہ کا یہی قول ہے جمہور کے نزدیک حد زنا جاری کی جائے گی، عقد اجارہ سے حلت زنا نہیں ہو سکتا اجرت زنا مقرر کر کے زنا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کھانا پکانے کے لئے اجرت پر کسی عورت کو مقرر کرنا اور پھر اس سے زنا کرنا (اجرت بجائے خود اجرت ہے اور زنا بہر حال زنا)۔

امام صاحب نے فرمایا، اجرت زنا مقرر کرنے میں بے شک نفع اندوزی معقود علیہ ہوتی ہے لیکن محل اجرت مقرر ہے جو عقد اجارہ کا محل ہوتا ہے تو گویا یہ اجارۂ منافع اجارۂ عین کی طرح ہے (جیسے کوئی گھوڑا یا مکان استعمال کے لئے کرایہ پر لیا محل اجارہ مقرر ہے نفع اندوزی عقد اجارہ کا نتیجہ ہے لیکن محل اجارہ معین ہونے کی وجہ سے یہ اجارۂ منافع اجارۂ عین کی طرح ہے) اس لئے شبہ (ملکیت) پیدا ہو گیا۔ کھانا پکانے کی اجرت کی یہ حالت نہیں ہوتی اس میں تو اجارہ کی نسبت استیفاء جماع کی طرف نہیں ہوتی اس لئے یہاں شبہ عقد نکاح نہیں ہو سکتا جب اجارہ کی نسبت دوسرے محل (کھانا پکانے) کی طرف کی تو شبہ عقد کیسے ہو سکتا ہے۔

مسئلہ:- علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ زنا کے ثبوت کے لئے چار مردوں کی شہادت ضروری ہے عورتوں کی شہادت سے ثبوت زنا نہیں ہوتا اور چار مردوں سے کم کی شہادت بھی کافی نہیں ہے اللہ نے فرمایا ہے فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ عورتوں کے زنا پر اپنے میں سے یعنی مسلمانوں میں سے چار مردوں کی شہادت لو۔ دوسری آیت میں ہے لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ انہوں نے اس بات پر چار مرد گواہ کیوں پیش نہیں کئے۔

مسئلہ:- اگر چار مردوں نے الگ الگ (متفرق اوقات یا متعدد مجالس میں) شہادت دی تو امام شافعی کے نزدیک ثبوت زنا ہو جائے گا اور حد زنا جاری کر دی جائے گی۔ دوسرے تینوں اماموں کے نزدیک زنا کا ثبوت نہ ہو گا اور شاہدوں کو تہمت زنا لگانے والا قرار دیا جائے گا کیونکہ ابتدا میں ایک گواہ یا دو گواہ یا تین گواہ پیش ہوئے تھے اس وقت نصاب شہادت پورا نہ تھا اور شہادت واجب الرد ہو گئی اور جب قلت تعداد کی وجہ سے ان کی شہادت رد کر دی گئی تو دوبارہ صرف اس وجہ سے کہ چوتھا شاہد بھی آ گیا اور اس نے شہادت دے دی رد شدہ شہادتوں کو قبول نہیں کیا جا سکتا پہلی شہادتوں کا اعتبار تو ختم ہو گیا اگر گواہ آئے تو الگ الگ پھر شہادت دینے کے وقت سب جمع ہو گئے اور سب نے ساتھ شہادت دی تو امام احمد کے نزدیک ایسی شہادت قبول کر لی جائے گی لیکن امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک چاروں گواہوں کا ساتھ آنا اور ساتھ ساتھ شہادت دینا ضروری ہے اس لئے الگ الگ آنے والے لوگوں کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی گو شہادت کے وقت سب کا اجتماع ہو جائے۔

مسئلہ:- کیا اقرار کی صورت میں متعدد بار اقرار ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام احمد اور اکثر علماء کے نزدیک اقرار کا تعدد لازم ہے۔ عاقل بالغ شخص ثبوت شہادت نہ ہونے کی صورت میں اگر خود چار مرتبہ اقرار کرے گا تو ثبوت زنا ہو جائے گا اس تعداد سے کم اقرار کافی نہیں ہے۔ پھر امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک ہی مجلس میں چار بار اقرار کرنا بھی کافی نہیں ہے ہر اقرار کی مجلس بھی الگ ہونی چاہیئے ثبوت زنا میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ امام احمد اور ابو یعلیٰ کے نزدیک چار مرتبہ اقرار خواہ ایک ہی مجلس میں ہو ثبوت زنا کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ صحیحین میں بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے

کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے پکار کر کہا یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا ہے حضور ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، وہ شخص گھوم کر پھر حضور ﷺ کے سامنے آگیا اور کہا میں نے زنا کیا ہے۔ آپ نے پھر منہ پھیر لیا، وہ شخص گھوم کر پھر حضور ﷺ کے سامنے آگیا اور کہا میں نے زنا کیا ہے۔ آپ نے پھر منہ پھر لیا۔ جب اس نے چار مرتبہ زنا کا اقرار کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کیا تجھے جنون ہے اس نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا کیا تیری شادی ہو گئی ہے، اس نے عرض کیا، جی ہاں، اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا اس کو لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔ الحدیث۔

امام ابوحنیفہ نے اپنے استدلال میں وہ حدیث پیش کی ہے جو حضرت بریدہ کی روایت سے مسلم نے بیان کی ہے کہ حضرت ماعز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرتکب زنا ہونے کا اقرار کیا حضور ﷺ نے ان (کے اقرار) کو رد کر دیا، دوسرے روز وہ پھر حاضر ہوئے، آپ نے پھر بھی (ان کے اقرار کو) رد کر دیا۔ پھر ان کے قبیلے کے پاس کسی کو بھیج کر معلوم کرلیا کہ کیا ماعز کی عقل میں کچھ خرابی ہے۔ قبیلہ والوں نے کہا ہم تو ان کو کامل العقل اور نیک جانتے ہیں تیسری مرتبہ پھر ماعز خدمت گرامی میں حاضر ہوئے (اور پہلے کی طرح اقرار زنا کیا) آپ نے پھر ان کی قبیلہ والوں سے دریافت کرلیا (کیا ماعز کی عقل میں کچھ فتور ہے) قبیلہ والوں نے کہا نے اس میں کوئی خرابی ہے نہ اس کی عقل میں جب چوتھی مرتبہ بھی ایسا ہی واقعہ ہوا (کہ ماعز نے حاضر ہو کر اپنے زانی ہونے کا اقرار کیا) تو آپ نے ایک گڑھا کھدوا کر (ماعز کو اس میں کھڑا کر کے) سنگسار کرا دیا۔

امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور مصنف میں ابن ابی شیبہ نے حضرت ابوبکر کی روایت سے بیان کیا میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا کہ ماعز نے حاضر ہو کر ایک بار (زنا کا) اقرار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو رد کر دیا، ماعز پھر آئے اور آ کر دوبارہ اقرار کیا آپ نے پھر بھی لوٹا دیا وہ پھر آئے اور تیسری بار اقرار کیا۔ میں نے ماعز سے کہا اب اگر چوتھی بار تم نے اقرار کیا تو حضور تم کو سنگسار کر دیں گے مگر ماعز نے چوتھی بار بھی اقرار کیا اس وقت حضور نے اس کو قید کر دیا، اور اس کے متعلق (قبیلہ والوں سے) دریافت کیا کہ یہ کیسا آدمی ہے اس کو جنون تو نہیں ہے سب نے کہا ہم کو تو (اس کے اندر) بھلائی ہی معلوم ہے آخر حضور ﷺ نے سنگسار کرا دیا۔

اس حدیث سے بھی صراحۃً معلوم ہو رہا ہے کہ ماعز متعدد مرتبہ آئے تھے۔ اور تعدد آمد بغیر غائب ہوئے ممکن نہیں اسی لئے حنفیہ قائل ہیں کہ اگر غائب ہو کر پھر لوٹ آئے تو یہ دوسری مجلس مانی جائے گی۔

ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ماعز بن مالک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا میں بدکار مرتکب زنا ہو گیا، حضور نے فرمایا، تیرا برا ہو تو نہیں جانتا کہ زنا کیا ہوتا ہے پھر حسب الحکم ماعز کو دھتکار کے (مجلس سے) باہر کر دیا گیا لیکن اس نے دوبارہ آ کر وہی پہلی بات کہی اور حضور نے بھی حکم دے کر دھتکار کر اس کو نکلوا دیا ماعز پھر تیسری مرتبہ آئے اور وہی بات کہی جو پہلے کہی تھی اور حضور ﷺ نے حکم دے کر دھکے دلوا کر اس کو نکلوا دیا آخر میں ماعز نے جب چوتھی بار آ کر وہی پہلی بات کہی تو حضور نے فرمایا کیا تو نے دخول و خروج کیا تھا ماعز نے جواب دیا جی ہاں اس وقت حضور ﷺ نے اس کو سنگسار کر دینے کا حکم دے دیا۔

یہ حدیث اور جیسی دوسری حدیثیں جن کا ذکر موجب طوالت ہے صاف طور پر تعدد مجالس پر دلالت کر رہی ہیں اس لئے اول الذکر حدیث کو بھی ہم تعدد مجالس پر محمول کریں گے اور پہلی حدیث میں جو آیا ہے کہ ماعز ہٹ کر رسول اللہ ﷺ کے منہ کے سامنے آگئے اس کو اقرار اول کا ہی ایک حصہ شمار کریں گے کیونکہ مجلس نہیں بدلی تھی اس سے آگے جو ذکر کیا گیا ہے کہ ماعز نے چار شہادتیں دیں (چار مرتبہ اقرار کیا) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چار مجالس میں اقرار کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چار مجالس میں اقرار کیا تھا اس طرح سب روایت میں مطابقت ہو جائے گی۔

امام مالک، امام شافعی ابوثور۔ حسن اور حماد بن سلیمان کے نزدیک ایک بار اقرار کرنے سے ہی زنا کا ثبوت ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت زید بن خالد اور حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے کہ جب مزدور نے صاحب خانہ کی بیوی سے زنا

کا اقرار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے (حضرت انس سے) فرمایا اس عورت کے پاس جاؤ۔ اگر وہ اقرار کرلے تو اس کو سنگسار کردو۔ حضرت انس نے جا کر اس سے دریافت کیا اس نے اقرار کرلیا حضرت انس نے اس کو سنگسار کردیا۔ ان علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ غامدیہ عورت کے قصہ میں ایک بار اقرار کرنے کا ذکر ہے معلوم ہوا کہ ثبوت زنا کے لئے ایک بار اقرار کرنا کافی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ اگر وہ اقرار کرلے تو اس کو سنگسار کردینا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا اقرار کرلے جو حد زنا کے لئے قابل قبول یعنی چار بار اقرار کرلے تو اس کو سنگسار کردینا۔ یہ تفصیل حضور ﷺ نے اس لئے بیان نہیں کی کہ آپ واقف تھے کہ صحابہ اس کو جانتے ہیں۔ ماعز وغیرہ کا واقعہ صحابہ کے سامنے گزر ہی چکا تھا۔ باقی یہ کہنا کہ غامدیہ عورت کے قصہ میں صرف ایک بار اقرار کرنے کا ذکر ہے قابل تسلیم نہیں ہے بلکہ ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں تو یہ بھی آیا ہے کہ صحابہ آپس میں کہتے تھے کہ ماعز اور غامدیہ عورت اگر اقرار کے بعد بھی لوٹ جاتے تو حضور ان سے مواخذہ نہ کرتے۔ آپ نے چار مرتبہ اقرار کے بعد ہی دونوں کو رجم کرلیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل ثابت کررہا ہے کہ غامدیہ عورت نے چار بار اقرار کیا تھا۔ البتہ اس کی تفصیل کسی روایت میں نہیں آئی۔ ہاں بزار نے مسند میں زکریا بن سلیم کی وساطت سے کسی قریشی بوڑھے کے حوالہ سے بروایت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ، ابوبکرہ کا بیان نقل کیا ہے کہ غامدیہ عورت نے چار مرتبہ اقرار کیا تھا اور ہر مرتبہ رسول اللہ ﷺ اس کو رد کرتے رہے پھر آخر میں اس سے فرمایا، جا اور وضع حمل کا انتظار کر۔ اس روایت میں ایک رواى مجہول ہے اس لئے ابوداؤد و نسائی کی روایت کی کمی اس سے پوری نہیں ہوسکتی۔

مسئلہ:- حاکم کے لئے مستحب ہے کہ اقرار زنا کرنے والے کو پردے پردے میں اقرار سے لوٹ جانے کی تعلیم دے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماعز سے فرمایا، شاید تو نے بوسہ لیا ہوگا، شاید تو نے چھولیا ہوگا۔

مسئلہ:- چار مرتبہ اقرار کرنے کے بعد حد جاری ہونے سے پہلے یا حد جاری ہونے کے بعد اقرار سے لوٹ جائے تو تینوں اماموں کے نزدیک اس کا رجوع قبول کیا جائے گا اور حد ساقط ہوجائے گی۔ امام مالک کے اس مسئلہ میں دو قول مروی ہیں (منفی۔ مثبت) ائمہ کی دلیل یہ ہے کہ اقرار کی طرح خبر میں سچے اور جھوٹے ہونے کا احتمال ہے اور تکذیب کرنے والا کوئی شخص موجود نہیں ہے اس لئے اقرار کے بعد انکار کی وجہ سے اقرار میں شبہ پیدا ہوجائے گا اور حدود شبہات سے ساقط ہوجاتی ہیں۔ ہاں جن مسائل میں حق عبد موجود ہو اور اللہ کے حق کے ساتھ بندے کا حق بھی اس سے متعلق ہو۔) تو اقرار کے بعد انکار معتبر نہیں مثلاً قصاص اور تہمت زنا کی حد کا سقوط نہیں ہوسکتا کیونکہ اس صورت میں انکار کی تکذیب کرنے والا شخص (مدعی) موجود ہوتا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت یزید بن منعم کی روایت سے حضرت ماعز کے قصہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں راوی کا یہ قول بھی منقول ہے کہ پتھر لگنے سے ماعز کو جب چوٹ کی تکلیف محسوس ہوئی تو وہ تیزی کے ساتھ بھاگ نکلے۔ سب مارنے والے لوگ پکڑنہ سکے صرف عبداللہ بن انیس نے ماعز کو جالیا اور اونٹ کے پاؤں کی ہڈی ماعز کے پھینک ماری جس سے وہ ختم ہوگئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا۔ شاید وہ توبہ کرلیتا اور اللہ اس کو توبہ قبول کرلیتا (اور گناہ معاف فرمادیتا) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے حضرت ماعز کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ اسی جیسا ہے۔

فصل

مسئلہ:- اگر مریض زنا کرلے اور رجم کا مستحق ہوجائے تو اس کو سنگسار کردیا جائے گا۔ بیماری کا عذر مانع نہ ہوگا کیونکہ رجم کا مقصد ہی ہلاک کردینا ہے لیکن اگر زانی مریض سزائے تازیانہ کا مستحق ہو تو صحت یاب ہونے تک سزا کو ملتوی رکھا جائے گا تاکہ سزا موجب ہلاکت نہ ہوجائے۔ اگر زانی مریض ایسے مرض میں مبتلا ہو جس سے صحت یاب ہونے کی امید ہی نہ ہو۔ مثلاً سل کے مرض میں مبتلا ہو یا پیدائشی طور پر ضعیف ہو تو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک ایک ایسا گچھا جس میں سو قمچیاں ہوں لے کر ایک مرتبہ اس گچھے سے اس کو اس طرح مارا جائے کہ ہر قمچی اس کے بدن پر پڑجائے۔ جیسا کہ بغوی نے شرح

السنتہ میں اور ابن ماجہ نے حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف کی وساطت سے حسب روایت سعید بن سعد بن عبادہ بیان کیا ہے کہ ہماری باندیوں میں ایک مرد رہتا تھا جو پیدائشی طور پر بہت کمزور تھا ایک روز دیکھتے کیا ہیں کہ وہ ایک باندی پر پڑا ہوا فعل گناہ میں مشغول ہے۔ حضرت سعد بن عبادہ نے اس کا واقعہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچادیا حضور ﷺ نے فرمایا اس کے سو کوڑے مارو۔ حضرت سعد نے عرض کیا اے اللہ کے رسول، وہ تو بہت ہی کمزور ہے اگر ہم اس کے سو کوڑے ماریں گے تو وہ یقیناً مر جائے گا فرمایا، تو ایک گچھا جس میں سو قمچیاں ہوا ایک بار اس کے مارو اور پھر اس کو نکال دو۔ ابوداؤد نے یہ حدیث حضرت ابوامامہ بن سہل کی روایت سے ایک انصاری کے حوالہ سے بیان کی ہے اور نسائی نے بروایت ابوامامہ بن سہل عن ابیہ (یعنی سہل کی وساطت سے) اور طبرانی نے بروایت ابوامامہ بحوالہ ابوسعید خدری بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے یہ تمام طرق روایت محفوظ ہیں گویا ابوامامہ نے صحابہ کی ایک جماعت کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے اور بیہقی نے اس کو ابوامامہ سے مرسلاً بیان کیا ہے۔

مسئلہ :- حاملہ عورت کو زنا کی سزا میں وضع حمل سے پہلے حد زنا نہیں ماری جائے گی تاکہ پیٹ کا بچہ ہلاک نہ ہو جائے اگر وہ سزائے تازیانہ کی مستحق ہو تو نفاس سے فراغت سے پہلے اس کو کوڑے نہ مارے جائیں حضرت علی نے ارشاد فرمایا تھا لوگو اپنے باندی غلاموں پر حد شرعی جاری کرو۔ شادی شدہ ہو یا نہ کتخدا...... رسول اللہ ﷺ کی ایک باندی نے جب زنا کیا تھا تو حضور ﷺ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اس کے کوڑے ماروں لیکن نفاس شروع ہوئے اس کو تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں اس کے کوڑے ماروں گا تو یہ مر جائے گی۔ میں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ فرمایا تم نے خوب کیا، رواہ مسلم۔ ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے اس وقت تک باندی کو رہنے دو کہ اس کا خون بند ہو جائے پھر اس پر حد جاری کرنا اور اپنے باندی غلاموں پر پر حد زنا قائم کرتے رہنا۔

اور اگر نفاس میں مبتلا عورت کی سزا رجم ہو تو اس کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بچہ پیدا ہو چکا اور وہ رجم کی مستحق ہے اس کو تو مرنا ہی ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا، عورت کو رجم کرنے سے اتنی مدت تاخیر کی جائے گی کہ بچہ کو اس کی ضرورت نہ رہے کیونکہ اگر کوئی شخص بچہ کی تربیت کا ذمہ دار نہ ہو گا تو وہ ہلاک ہو جائے گا اس لئے بچہ کی حفاظت کے لئے اس صورت میں ماں کا ہونا ضروری ہے مسلم نے حضرت بریدہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ غامدیہ عورت کے رجم کرنے کو وضع حمل تک حضور ﷺ نے ملتوی کر دیا تھا ایک انصاری نے اس کی ذمہ داری لے لی جب بچہ پیدا ہو گیا تو انصاری نے آکر اطلاع دی کہ بچہ پیدا ہو گیا فرمایا ابھی رجم نہ کرو کیونکہ اس صورت میں شیر خوار بچہ رہ جائے گا اور کوئی دودھ پلانے والی نہ ہو گی یہ سن کر ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا یا رسول اللہ ﷺ اس کو دودھ پلوانا میرا ذمہ ہے، انصاری کی بات سن کر حضور ﷺ نے غامدیہ کو سنگسار کرادیا دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غامدیہ سے فرمایا جا اور اس وقت تک انتظار کر کہ بچہ پیدا ہو جائے جب بچہ پیدا ہو گیا اور وہ عورت پھر آئی تو حضور ﷺ نے فرمایا جا اور بچہ کو دودھ پلاتی رہ جب دودھ چھڑا دے تو آنا جب غامدیہ نے مدت پوری کر کے دودھ چھڑا دیا تو بچہ کو لے کر آئی بچہ کے ہاتھ میں روٹی کی کرچ تھی، عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اب میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا اور یہ کھانا کھانے لگا ہے حضور نے وہ بچہ ایک مسلمان کے سپرد کر دیا (تاکہ وہ پرورش کرتا رہے) اس کے بعد ایک گڑھا کھدوا کر جس کی گہرائی عورت کے سینہ تک تھی لوگوں کو حکم دیا کہ اس کو سنگسار کر دو۔ سب نے سنگسار کر دیا۔

مسئلہ :- آیت فاجلدوا میں حاکموں کو خطاب ہے اس لئے امام ابوحنیفہ کے نزدیک کوئی آقا، حاکم کی اجازت کے بغیر اپنے باندی غلام پر حد جاری نہیں کر سکتا، امام شافعی، امام احمد اور امام مالک کا قول اس کے خلاف ہے ایک روایت میں امام مالک کے نزدیک باندی پر اس کا آقا اجازت حاکم کے بغیر حد جاری کر سکتا ہے ہاں اگر باندی کسی کی منکوحہ ہو تو خود حد جاری نہیں کر سکتا۔ امام شافعی نے کہا اگر آقا کوئی ذمی کافر ہو یا مکاتب ہو یا عورت ہو تو اس کو از خود حاکم کی اجازت کے بغیر حد قائم کرنے کا اختیار نہیں ہے امام شافعی کا اختلاف ہر حد شرعی کے سلسلہ میں یہاں تک کہ مرتد کو قتل کرنے یا رہزن کو مار ڈالنے یا چور کا ہاتھ

کاٹنے کا بھی بغیر حاکم کی اجازت کے اختیار ہے، نووی (شافعی) نے کہا صحیح تر یہ بات ہے کہ (بغیر اجازت حاکم کے) اقامت حدود کا حکم عام ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ میں اطلاق ہے (ہر حد کی اقامت کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے) تہذیب میں ہے کہ قطع دست اور قتل کرا دینے کا اختیار صرف حاکم کو ہے یہی صحیح ترین قول ہے۔

تینوں ائمہ نے مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا جس باندی نے زنا کیا ہو اور وہ منکوحہ نہ ہو تو اس کا کیا حکم ہے فرمایا اگر اس نے زنا کیا ہو اس کے کوڑے مارو پھر دوبارہ زنا کرے تو کوڑے مارو، پھر بھی زنا کرے تو کوڑے مارو۔ اگر چوتھی بار پھر زنا کرے تو اس کو بیچ ڈالو خواہ بالوں کی ایک رسّی کے عوض ہی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جن (باندی غلاموں) کے تم مالک ہو ان پر حدود جاری کرو۔ رواہ النسائی والبیہقی من حدیث علیؓ۔ مسلم میں یہ حدیث حضرت علیؓ پر موقوفاً آئی ہے۔

امام شافعیؒ نے روایت کی ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے اپنی باندی کے جس نے زنا کیا تھا کوڑے لگوائے تھے (یعنی خود حد زنا جاری کی تھی) ابن وہب نے بوساطت ابن جریج روایت عمرو بن دینار بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اپنی باندی کے پچاس کوڑے لگواتی تھیں اگر اس نے ارتکاب زنا کیا ہوتا تھا۔ امام شافعی نے بحوالہ، امام مالک بروایت نافع بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک غلام نے چوری کی، حضرت عبداللہ نے سعید بن عاص حاکم مدینہ کے پاس ہاتھ کاٹنے کے لئے بھیج دیا۔ سعید نے غلام کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کر دیا اور کہا غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر اس نے چوری کی ہو۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا آپ نے یہ کس کتاب میں پڑھا ہے، پھر آپ نے خود حکم دے دیا اور اس غلام کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

عبدالرزاق نے مصنف میں بروایت معمر از ایوب نافع کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر کے ایک غلام نے چوری کی تھی اور ایک غلام نے زنا کا ارتکاب کیا آپ نے از خود حاکم کے پاس بھیجے بغیر چور غلام کا ہاتھ کٹوا دیا اور زانی کے کوڑے لگوائے۔ ابن ماجہ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی روایت نقل کی ہے لیکن اس میں یہ قصہ حضرت عائشہ کا بیان کیا ہے سعید بن منصور نے بروایت ہشیم از ابن ابی لیلیٰ از نافع بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں لکھا ہے اور امام شافعی نے امام مالک کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ مکہ کو تشریف لے گئیں آپ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن حضرت ابو بکر صدیق کی اولاد کا ایک غلام بھی تھا، اس قصہ میں آیا ہے کہ اس غلام نے چوری کی اور اقرار کر لیا حضرت عائشہ کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ امام مالک نے مؤطا میں لکھا ہے کہ حضرت حفصہ نے اپنی ایک باندی کو قتل کرا دیا جس نے جادو کیا تھا۔ عبدالرزاق نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اتنا زائد بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے اس فعل کو غیر مشروع قرار دیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا، آپ ام المومنین کے اس عمل کو غیر مشروع قرار دے رہے ہیں جو انہوں نے ایک جادوگر عورت کے سلسلہ میں کیا تھا۔

امام ابو حنیفہ نے اپنے مسلک کے استدلال میں اصحاب السنن کی اس روایت کو پیش کیا جو انہوں نے اپنی کتابوں میں موقوفاً و مرفوعاً لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر نے چار چیزوں کو حاکموں کے اختیار میں دیا ہے۔ حدود، زکوٰۃ (کی وصولی اور تقسیم) صلوٰۃ جمعہ اور مال فے (یعنی مال غنیمت کو جمع کرنا اور تقسیم کرنا)۔

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ　　اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہیے۔

رافت بمعنی رحم فی ،دین اللہ اللہ کی طاعت میں یعنی اللہ کی قائم کردہ حدود کو ترک نہ کرو کہ رحم کی وجہ سے ان کو جاری کرنا چھوڑ دو۔ مجاہد، عکرمہ، عطا، نخعی، شعبی اور سعید بن جبیر نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی قریش کے لئے اس معاملہ نے بڑی پریشان کن حیثیت اختیار کر لی انہوں نے مشہور کیا کہ کوئی رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کر دیتا، سب نے کہا کہ

سوائے اسامہ بن زید کے جو رسول اللہ ﷺ کے محبوب ہیں اور کوئی اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حضرت اسامہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں گزارش کی حضور نے فرمایا، کیا تم اللہ کی قائم کردہ حد کے متعلق سفارش کر رہے ہو۔ پھر حضور اقدس ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے تباہ کر دیئے گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تھا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اہل تفسیر نے آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ تم کو اللہ کے دین میں کوئی نرمی نہ پکڑ لے کہ ہلکی مار مارو۔ ایسا نہ کرو بلکہ دردناک مار مارو۔ سعید بن مسیب اور حسن نے یہی تفسیر کی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا، زنا کی حد تو سختی سے جاری کی جائے پھر اس سے کم سختی شراب کی حد مارنے میں کی جائے اور تہمت زنا کی سزا میں بھی خفت سے کام لیا جائے۔ کیونکہ ممکن میں تہمت زنا لگانے والا واقع میں سچا ہو (لیکن اپنے قول کو شہادت سے ثابت نہ کر سکا ہو) اور شراب پینے کی حد میں غلطی کا احتمال نہیں ہو سکتا اور زنا کا جرم شراب خواری سے بڑا ہے (اس لئے اس کی سزا کو جاری کرنے میں بہت زیادہ سختی سے کام لینا چاہیئے) قتادہ کا قول ہے کہ شراب خواری اور تہمت زنا کی سزا میں خفت برتی جائے۔ زنا کی سزا جاری کرنے میں سختی سے کام لیا جائے۔ زہری نے کہا جرم زنا اور تہمت زنا کی سزا دینے میں سختی کی جائے کیونکہ ان کی سزائیں کتاب اللہ میں مذکور ہیں اور شراب کی سزا میں خفت اختیار کی جائے کیونکہ شراب کی سزا صرف حدیث میں آئی ہے قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے۔

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی ایک باندی نے زنا کیا آپ نے اس کے کوڑے لگوائے اور کوڑے مارنے والے سے فرمایا اس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر کوڑے مارنا، آپ کے ایک بیٹے نے کہا لا تاخذکم بهما رافة فی دین الله (اللہ کا حکم ہے) حضرت عبد اللہ نے فرمایا بیٹے! اللہ نے مجھے یہ حکم نہیں دیا کہ میں اس کو قتل کر دوں۔ میں نے کوڑے مار دیئے اور درد پہنچا دیا۔ (اتنا ہی کافی ہے)۔

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اگر تم اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یعنی تمہارا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے تو اللہ کے حکم کی تعمیل میں سستی نہ کرو اور اس کی قائم کی ہوئی، حدود کو کوشش کے ساتھ جاری کرو۔ ایمان کا یہی تقاضا ہے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ اور ان کو سزا دینے کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر ہو تا کہ مجرم کو زیادہ عبرت ہو۔ بعض وقت رسوائی وہ عبرت آفریں اثر کرتی جو سزا نہیں کرتی۔ طائفة ایک گروہ۔ ممکن ہے کہ وہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو (یعنی تعداد بہت ہو) طائفہ، طوف سے ماخوذ ہے۔ طائفہ کی کم سے کم تعداد بعض علماء نے چار بیان کی ہے۔ جو چار اطراف میں ہوں۔ ہر طرف ایک آدمی۔ بعض نے کہا تین کافی ہیں۔ جمع کی کم سے کم تعداد تین ہے۔ اس مطلب پر طائفة، طائف کی جمع ہو گی۔ بعض نے کہا ایک دو پر بھی طائفہ کا اطلاق ہوتا ہے (اس وقت طائفہ کا معنی ہو گا ایک فریق)۔

اللہ نے فرمایا ہے وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا اگر مسلمانوں کے دو فریق لڑ پڑیں۔

قاموس میں ہے طائفة من الشئی کسی چیز کا ٹکڑا یا ایک اور زیادہ یا ایک سے ہزار تک یا کم سے کم دو آدمی یا ایک ہی آدمی۔ جب ایک آدمی مراد ہو گا تو نفس کے معنیٰ میں ہو گا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے یہ جمع ہو جس کو بطور کنایہ واحد کہا جاتا ہو۔ یہ بھی صحیح ہے کہ (بطور مبالغہ) راویہ اور علامہ کی طرح مبالغہ کا صیغہ قرار دیا جائے۔

نخعی اور مجاہد نے کہا کم سے کم ایک آدمی اور اس سے زیادہ کو طائفہ کہتے ہیں، حضرت ابن عباس سے بھی یہ معنی ایک روایت میں منقول ہیں۔

امام احمد، عطا، عکرمہ اور اسحاق نے کہا دو یا اس سے زیادہ طائفہ ہے۔ زہری اور قتادہ کے نزدیک دو اور اس سے زیادہ کو طائفہ کہتے ہیں۔ امام مالک اور ابن زید نے طائفہ کی تعداد چار بتائی ہے۔ (زنا کے) گواہوں کی یہی تعداد ہے۔ حسن بصری نے کہا دس اور اس سے زائد طائفہ ہے۔

میں کہتا ہوں یہی قول صحت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ آیت کا مقصد تشہیر ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ؗ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ

زنا کرنے والا نکاح نہیں کرتا مگر زنا کرنے والی سے یا شرک کرنے والی اور زانیہ سے نہیں نکاح کرتا مگر زانی یا مشرک۔

ابوداؤد ترمذی نسائی اور حاکم نے بروایت عمرو بن شعیب از شعیب از جد عمرو بیان کیا ہے کہ مرثد نام کا ایک آدمی تھا جو مکہ سے قیدیوں کو سوار کر کے لا رہا تھا تا کہ ان کو مدینہ پہنچا دے مکہ میں اس کی ایک عورت دوست تھی جس کا نام عناق تھا مرثد نے رسول اللہ ﷺ سے عناق کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضور ﷺ نے اس وقت کچھ جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ نزول آیت کے بعد حضور ﷺ نے مرثد کے سامنے یہ آیت وحرم ذلک علی المؤمنین تک تلاوت فرمائی اور فرمایا تم اس سے نکاح مت کرو۔

نسائی نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک عورت تھی جس کو ام مہزول کہا جاتا تھا، وہ بدکار پیشہ ور عورت تھی کسی صحابی نے اس سے نکاح کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

سعید بن منصور نے مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ جس وقت اللہ نے زنا کو حرام کر دیا اس زمانہ میں کچھ زناکار عورتیں تھیں جو خوبصورت تھیں، کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ جا کر ان سے نکاح کر لیں اس وقت اس آیت کا نزول ہوا۔

بغوی کا بیان ہے کہ جب مہاجر مدینہ میں آئے تو ان میں کچھ لوگ بالکل نادار تھے کچھ مال و متاع نہ تھا اور قبیلہ والے موجود نہ تھے۔ مدینہ میں کچھ پیشہ ور عورتیں رہتی تھیں جو خود فروش تھیں اور اس زمانہ میں مدینہ کے اندر سب سے زیادہ مالدار تھیں کچھ نادار مہاجروں نے ان سے نکاح کرنا چاہا تا کہ ان بے مایہ لوگوں کے خرچ کی کفالت وہ عورتیں کر لیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ان پیشہ ور عورتوں سے نکاح کرنا مومنوں کے لئے حرام کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ مشرک ہیں۔ یہ تفصیل و تفسیر عطاء بن ابی رباح، مجاہد قتادہ، زہری اور شعبی نے بیان کی اور عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔

میں کہتا ہوں اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں سعید بن جبیر کی مرسل حدیثوں کے مجموعے سے نقل کیا ہے (یعنی یہ قول مرسل ہے)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عکرمہ نے بیان کیا اس آیت کا نزول مکہ اور مدینہ کی چند عورتوں کے حق میں ہوا۔ جن میں سے نو عورتوں کے جھنڈے پیشہ ور عورتوں کی طرح لگے ہوئے تھے جن سے ان کی شناخت ہو جاتی تھی ان میں سے ایک عورت تھی ام مہزول یہ سائب بن ابی السائب مخزومی کی باندی تھی..... جاہلیت کے زمانہ میں لوگ زناکار عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے پھر ان کی کمائی کھاتے تھے کچھ مسلمانوں نے بھی ان عورتوں سے اسی طور پر نکاح کرنے کا ارادہ کیا (کہ نکاح کے بعد ان کی کمائی کھائیں گے) چنانچہ ایک مسلمان نے ام مہزول سے نکاح کرنے کی رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت اور احادیث مندرجہ بالا کی روشنی میں امام احمد نے فرمایا، جب تک زانی اور زانیہ توبہ نہ کرے ان کا نکاح جائز نہیں۔ توبہ کرنے کے بعد ان کو زانی نہیں کہا جائے گا (گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ الحدیث)

باقی تینوں اماموں کے نزدیک زانی کا نکاح بھی صحیح ہے اور زانیہ کا نکاح بھی۔ (لیکن یہ قول بظاہر مفہوم آیت کے خلاف ہے اس لئے) اس آیت کی تشریح میں تاویل کی گئی ہے بعض نے کہا کہ آیت میں نہی کا صیغہ ہے نفی کی خبر ہے جملہ خبریہ منفیہ ہے (ایک واقعہ اور ایک حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے) زانی فاسق ہوتا ہے اس لئے پاکدامن نیک عورتوں سے نکاح کرنے کی طرف

اس کو رغبت نہیں ہوتی اور زانیہ بھی فاسقہ ہوتی ہے اس لئے نیک مردوں کو بھی اس سے نکاح کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا اخلاقی مشابہت اور عملی یکسانیت موجب الفت ہوتی ہے اور خلقی اختلاف باعث نفرت ہوتا ہے۔

تقابلی بیان کا تقاضا تھا کہ اَلزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ کی بجائے الزانیة لاتنكح الا من زان کہا جاتا لیکن آیت کا منشا چونکہ مردوں کے احوال کا بیان ہے کہ مردوں کو ایسی عورتوں کی رغبت نہیں ہوتی اس لئے اسلوب بیان بدلا گیا۔

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اور یہ فعل مومنوں کے لئے حرام کردیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر تفسیر کے بموجب اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ مومن ایسا فعل نہیں کرتے ایسی حرکت سے بچتے رہتے ہیں اس عمل سے اہل ایمان کو پاک رکھا گیا ہے گویا تحریم سے مراد ہے پاک کردینا۔ تنزیہ اور تطہیر کو بطور مبالغہ تحریم فرمایا، امام مالک کے نزدیک زناکار سے نکاح مکروہ تحریمی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے بعض علماء کے نزدیک آیت میں نکاح سے مراد ہے جماع۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ زانی زنا نہیں کرتا مگر زانیہ سے یا مشرکہ سے اور زانیہ زنا نہیں کرتی مگر زانی یا مشرک سے۔ یہ تفسیری قول سعید بن جبیر اور ضحاک بن مزاحم کا ہے اور والبی نے اس قول کی نسبت حضرت ابن عباس کی طرف بھی کی ہے۔

زید بن ہارون نے کہا مراد یہ ہے کہ زانی اگر زانیہ سے جماع کو حلال سمجھ کر کرتا ہے تو وہ مشرک (کافر) ہے اور حرام سمجھ کر کرتا ہے تو وہ زانی ہے۔ اس تفسیر پر بھی جملہ منفیہ خبریہ ہوگا (انشائیہ منہیہ نہ ہوگا)

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت میں نفی بمعنی نہی ہے بلکہ لاینکح کی جگہ لاینکح (بصیغۂ نہی) بعض قرأتوں میں آیا بھی ہے زانیہ سے حرمت نکاح اپنی جگہ قائم ہے لیکن (ہر شخص کے لئے ممانعت نہیں ہے بلکہ) یہ حرمت ان خاص مہاجروں کے لئے تھی جنہوں نے زناکار عورتوں سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

لیکن یہ تخصیص مہاجرین میرے نزدیک بعید از صحت ہے کیونکہ کلام کا آغاز ممانعت سے کیا گیا ہے اگر ممانعت صرف مہاجروں کے لئے ہوتی تو کلام اس طرح ہوتا کہ مومن نکاح نہ کرے مگر صالحہ مومنہ سے۔ پھر (اقوال صحابہ کی روشنی میں بھی) یہ تخصیص غلط ہے حضرت ابن مسعود زانیہ سے نکاح کرنے کو حرام قرار دیتے تھے فرماتے تھے جب زانی زانیہ سے نکاح کرلیتا ہے تو ہمیشہ کے لئے دونوں زانی رہتے ہیں۔

حسن نے کہا سزا یافتہ زانی نکاح نہیں کرتا یا نکاح نہ کرے مگر سزا یافتہ زانیہ سے اور سزا یافتہ زانیہ سے نکاح نہیں کرتا یا نکاح نہ کرے مگر سزا یافتہ زانی۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب کی روایت سے بوساطت ابوسعید مقبری از ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سزا یافتہ زانی نکاح نہیں کرتا۔ (یا نکاح نہ کرے) مگر اپنی ہی جیسی سے۔ ان دونوں قولوں کا حاصل یہ ہے کہ حرمت عام اور آیت منسوخ نہیں ہے۔

سعید بن میتب اور اہل تفسیر کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اسی آیت کی وجہ سے زانیہ سے نکاح حرام تھا لیکن جب آیت وانكحوا لا يامى منكم نازل ہوئی تو اس سے حرمت مذکورہ منسوخ ہوگئی (بے شوہری عورتوں سے نکاح کرانے کی اجازت عام ہوگئی) زانیہ بھی ایامی میں داخل ہے اس سے بھی نکاح جائز ہوگیا۔

زانیہ سے نکاح کا جواز حضرت جابر کی روایت کردہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جو بغوی نے نقل کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری بیوی کسی چھونے والے (یا طلبگار) کے ہاتھ کو دفع نہیں کرتی۔ فرمایا تو اس کو طلاق دے دے، اس شخص نے کہا وہ خوبصورت ہے مجھے اس سے محبت ہے (طلاق کیسے دے دوں) فرمایا تو اسی سے مزے اڑا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تو ایسی حالت میں اسے روکے رکھ۔ کذا رواہ الطبرانی والبیہقی، عن عبید اللہ بن عمر عن عبد الکریم بن مالک عن ابی الزبیر عن جابر۔

ابن ابی جابر نے کہا میں نے اس حدیث کو اپنے باپ سے پوچھا تو انہوں نے کہا حدثنا محمد بن عبد کثیر عن عن معتمر،

عن عبد الکریم، حدثنی ابوالزبیر عن مولی لبنی ہاشم۔ ہم سے محمد بن کثیر نے بحوالہ معتمر از روایت عبد الکریم بیان کیا عبد الکریم نے کہا، مجھ سے ابوالزبیر نے بنی ہاشم کے کسی آزاد کردہ غلام کی روایت سے بیان کیا۔ کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے بعد حدیث مذکور راوی نے بیان کی۔

ثوری نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور اس حاضر ہونے والے آدمی کا نام ہشام بتایا ہے جو بنی ہشام کا آزاد کردہ تھا ابوداؤد اور نسائی نے عبد اللہ بن عبید اللہ بن عمیر کے طریق سے بروایت ابن عباس بیان کیا ہے اور نسائی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک راوی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس کی روایت تک پہنچایا ہے اور دوسرے راوی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس تک اس روایت کو نہیں پہنچایا۔ موصول ثابت نہیں اس کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ شافعی نے اس کی روایت مرسلاً کی ہے۔ نسائی اور ابو داؤد نے عکرمہ کی روایت سے اس کو حضرت ابن عباس تک پہنچایا ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا اس روایت کی سند بہت صحیح ہے۔ نووی نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے ابن جوزی نے باوجود یہ کہ اس کو صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے لیکن موضوعات میں اس کو داخل کیا ہے۔ امام احمد کا قول منقول ہے کہ اس موضوع کی کوئی حدیث نہیں اور ہر روایت بے اصل ہے۔

فائدہ

حدیث مذکور میں آیا ہے کہ اس شخص نے اپنی بیوی کی شکایت کرتے ہوئے عرض کیا وہ کسی چھونے والے یا طلبگار کے ہاتھ کو دفع نہیں کرتی۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ بعض اہل علم نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بدکاری کرنا چاہتا ہے اور اس کو چھوتا ہے وہ کسی کے ہاتھ کو نہیں روکتی یہ مطلب نسائی، ابوعبیدہ، ابن الاعرابی، فطابی، فریابی اور نووی نے بیان کیا ہے بغوی اور رافعی نے یہی مطلب سمجھ کر اس سے اپنے مقصد پر استدلال کیا ہے (کہ زانیہ سے نکاح جائز ہے وہ عورت زانیہ تھی مگر رسول اللہ ﷺ نے آخر اس شخص کو اجازت دے دی کہ اگر تو اس کو طلاق نہیں دے سکتا تو اپنے نکاح میں رد کے رکھ) بعض علماء نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی سائل کے ہاتھ کو رد نہیں کرتی بڑی فضول خرچ ہے جو کوئی اس سے کچھ چیز مانگتا ہے وہ دے دیتی ہے امام احمد اصمعی اور محمد بن نصر اسی مطلب کی طرف گئے ہیں۔ اس مطلب پر حدیث نا قابل استدلال ہے۔ زانیہ کے جواز نکاح کا ثبوت اس سے نہیں ہوتا۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے زنا کے سلسلہ میں ایک مرد ایک عورت کو پٹوایا اور ان کو ترغیب دی کہ دونوں میں نکاح ہو جائے لیکن اس مرد نے انکار کر دیا (معلوم ہوا کہ زانیہ سے زانی کا نکاح جائز ہے) طبرانی اور دار قطنی نے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا کرے اور پھر اس سے نکاح کر لینا چاہے تو کیا حکم ہے، فرمایا حرام حلال کو حرام نہیں بنا دیتا۔ عبد الرزاق اور ابن ابی شیبہ نے اپنی اپنی مصنف میں بیان کیا ہے کہ کسی نے حضرت ابن عباس سے پوچھا اگر کسی نے کسی عورت سے زنا کیا ہو پھر نکاح کر لینا چاہتا ہو تو کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا اس کا آغاز زنا ہے اور انجام نکاح۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمت زنا لگاتے ہیں۔ یعنی صراحۃ لفظ زنا کی کسی پاک دامن عورت کی طرف نسبت کرتے ہیں مثلاً کوئی یوں کہتا ہو تو نے زنا کیا یا کہتا ہے اے زانیہ۔ یرمون کی یہ تفسیر تمام علمائے تفسیر و فقہ کے نزدیک مسلمہ ہے کیونکہ چار شہادتیں پیش کرنے کی شرط آیت میں صراحۃً مذکور ہے (اور یہ شرط صرف زنا ہی کے ثبوت کی ہے) اب کسی شخص نے کسی پر کسی دوسرے گناہ کی تہمت لگائی تو باجماع علماء حد قذف (تہمت زنا لگانے کی سزا) اس پر لازم نہ ہوگی۔ بلکہ حاکم حسب صوابدید اس کو تعزیز کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر صراحۃً زنا کی تہمت نہیں لگائی بلکہ پردے پردے میں تعریضاً کسی کی طرح زنا کی نسبت کی (مثلاً یوں کہا، میں تو زانی نہیں۔ مطلب یہ کہ تم زانی ہو) تو امام ابو حنیفہ امام شافعی، امام احمد، سفیان ثوری، ابن سیرین اور حسن بن صلاح کے نزدیک حد قذف جاری نہیں کی جائے گی۔ امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک تعریض زنا پر بھی حد قذف جاری کی جائے گی۔ کیونکہ زہری نے بوساطت سالم حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ تعریض زنا پر بھی حضرت عمرؓ حد جاری کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے متعلق بھی روایت میں

آیا ہے کہ آپ نے تعریض زنا پر کوڑے لگوائے تھے۔
تعریض زنا حقیقت میں صراحۃً تہمت زنا لگانے کی طرح ہے اس لئے اس پر بھی حد جاری ہونا چاہیئے۔ ہم کہتے ہیں تعریض، تصریح کی طرح نہیں ہوتی اسی لئے عدت کے زمانے میں بیوہ یا مطلقہ عورتوں کو پردے پردے میں پیام نکاح دینا جائز ہے اور صراحت کے ساتھ پیام نکاح عدت میں دینا نا جائز ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے ولا جناح علیکم فیما عرضتم به من خطبة النساء۔
المحصنت پاک دامن عورتیں۔ پاک دامن مردوں کو زنا کے ساتھ متہم کرنے کا بھی یہی حکم ہے اجماع امت اسی پر ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پاک دامن عورتوں کا لفظ خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے ذکر کیا کہ اس آیت کا سبب نزول ایک خاص واقعہ تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عورتوں پر زنا کی تہمت لگانے کے مقابلے میں کثیر الواقع ہے اور زیادہ شنیع بھی ہے۔
باجماع علماء احصان سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ آزاد ہو بالغ ہو عاقل ہو مسلمان ہو پاکدامن ہو اس سے پہلے متہم بالزنا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا من اشرک باللہ فلیس بمحصن (جس نے کسی کو اللہ کے ساتھ عبادت میں ساجھی بنایا وہ محصن نہیں ہے) اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔
اگر کسی نے اپنی عمر میں کبھی جرم زنا کا ارتکاب کیا ہو پھر توبہ کرلی ہو اور اس کی حالت درست ہو گئی ہو اور درستی پر ایک مدت گزر گئی ہو پھر اس کی طرف مجرم زنا ہونے کی کوئی نسبت کرے تو تہمت لگانے والے پر حد قذف جاری نہیں کی جائے گی کیونکہ زنا کی نسبت کرنے والا اپنے قول میں سچا ہوتا ہے البتہ اس کو تعزیر کی جائے گی کیونکہ جس شخص نے توبہ کرلی ہے اس کی طرف اس نے گزشتہ گناہ کی نسبت کی حالانکہ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی باندی غلام یا بچے یا پاگل کی طرف زنا کی نسبت کرنے والا بھی حد قذف کا مستوجب نہیں ہوتا۔ داؤد کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ ان کے نزدیک باندی غلام پر تہمت زنا لگانے والے پر حد قذف جاری کی جائے گی۔
ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ پھر نہ لائے چار مرد گواہ، یعنی متہم بالزنا نے اگر زنا کا انکار کیا ہو اور تہمت زنا لگانے والا چار گواہ نہ پیش کر سکا ہو تو تہمت لگانے والے کے کوڑے مارو اور اگر چار گواہ زنا کے پیش کردے تو اب قذف کرنے والا سبکدوش ہو جائے گا اس کے اوپر حد قذف جاری نہیں کی جائے گی (بلکہ ثبوت زنا مکمل ہو جانے کی وجہ سے زانی کو کوڑے مارے جائیں گے) اگر چار گواہ زنا کے تو پیش کردیئے لیکن مختلف اوقات میں متفرق طور پر پیش کئے اور سب گواہ مجتمع ہو کر نہیں آئے تو زنا کا ثبوت نہ ہوگا اور جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس پر حد زنا جاری نہ ہوگی، امام ابو حنیفہ کا یہی مسلک ہے لیکن تہمت لگانے والا بھی مستحق سزا نہیں رہے گا وہ بھی حد قذف سے محفوظ ہو جائے گا۔ کیونکہ زنا کی شہادت کی تعداد تو بہر حال موجود ہے گواہوں کے ساتھ ساتھ آنے کی شرط محض احتیاطاً لگائی گئی ہے تاکہ زنا کی حد ساقط ہو جائے۔ قاذف (تہمت زنا لگانے والے) پر حد قاذف لازم کرنے کے لئے شرط نہیں لگائی گئی ہے (کہ اگر گواہ اجتماعی شکل میں شہادت نہ دیں یا ساتھ نہ آئیں تو قاذف پر حد جاری کردی جائے)۔ اسی طرح اگر متہم بالزنا نے ایک بار اقرار کرلیا تو اس پر حد زنا جاری نہ ہوگی اور نہ قاذف پر حد قذف جاری ہوگی۔
آیت میں شہداء سے مراد وہ شاہد ہیں جو شرعاً شہادت کے اہل ہوں، اسی لئے اگر اندھوں نے شہادت دی یا ایسے لوگوں نے شہادت دی جو جرم قذف کے سزایافتہ ہوں یا شاہدوں میں کوئی غلام ہو، ان سب صورتوں میں زنا کا ثبوت نہ ہوگا، بلکہ ان گواہوں پر حد قذف جاری کی جائے گی ایسے لوگ شرعاً شہادت کے قابل نہیں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے غلام تو نہ شاہد بننے کا اہل ہے نہ شہادت دینے کا اس کی شہادت سے تو زنا کے شبہ کا ثبوت بھی نہ ہوگا زنا کا ثبوت تو ادائے شہادت سے ہوتا ہے۔
لیکن اگر گواہ فاسق ہوں تو ان پر حد قذف تو جاری نہ ہوگی لیکن ان کی شہادت سے زنا کا ثبوت بھی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے متہم بالزنا پر حد زنا بھی جاری نہ ہوگی، کیونکہ فاسق شہادت ادا کرنے اور شاہد بننے کا اہل تو ہے لیکن فسق کی وجہ سے اس کی شہادت

میں کسی قدر ضعف ہے اس لئے فاسقوں کی شہادت سے شبہ زنا تو پیدا ہو جائے گا اور وہ حد قذف سے محفوظ رہیں گے اور ثبوت زنا نہ ہوگا اس لئے زانی پر حد زنا جاری نہ ہوگی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فاسق گواہوں پر حد قذف جاری کی جائے گی کیونکہ شافعی کے نزدیک فاسق غلام کی طرح شہادت کا اہل ہی نہیں ہے۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو تو ان پر حد قذف جاری کی جائے گی (اللہ کی قائم کی ہوئی حد معطل نہ ہو اور مجرم آزادی کے ساتھ جرم نہ کریں) اس نیت خیر کے لئے زنا کی اور ہر جرم کی شہادت کی ضرورت تھی اور چار سے کم گواہ ہوں تو یہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی (پھر گواہوں کی گواہی صرف بدنام کرنے اور مسلمانوں کی آبروریزی کے جذبہ کے زیر اثر مانی جائے گی بلکہ واقع میں بھی ایسا ہی ہوگا کیونکہ جب گواہوں کو معلوم ہے کہ ہماری شہادت کی تعداد کم ہے اور حد زنا ہم جاری نہیں کرا سکتے تو پھر گواہی کیوں دیتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نیت میں شر ہے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان کی رسوائی ہو اور خواہ جرم زنا ثابت نہ ہو سکے) حاکم نے مستدرک میں ابو نعیم نے المعرفتہ میں ابو موسیٰ نے الدلائل میں اور بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر کے سامنے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی شہادت ابو بکرہ اور نافع اور شبل بن معبد نے دی اور چوتھا گواہ زیاد تھا، اس نے صراحت کے ساتھ شہادت نہ دی تو حضرت عمرؓ نے تینوں گواہوں کو کوڑے لگوائے اور یہ واقعہ صحابہ کی ایک جماعت کی موجودگی میں ہوا اور کسی نے اس فیصلے کے خلاف انکار نہیں کیا۔ (معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ اجماعی تھا) بخاری نے اس واقعہ کے ایک حصہ کو بطور تعلیق بیان کیا ہے۔ عبدالرزاق نے بوساطت ثوری بحوالہ سلیمان تیمی بروایت نہدی یہ واقعہ نقل کیا ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ جب زیاد نے شہادت دینے سے گریز کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، یہ آدمی ناحق شہادت دینے والا نہیں ہے پھر تینوں کے کوڑے لگوائے۔

فَاجْلِدُوْهُمْ تو ان کے کوڑے مارو۔ یعنی اگر وہ شخص جس کے زانی ہونے کی شہادت گواہوں نے دی ہے مطالبہ کرے تو گواہوں کے کوڑے مارو۔ مطالبہ کرنے کی شرط باجماع علماء ہے، کیونکہ اس میں عبد کا حق شامل ہے اگرچہ حق اللہ کا پہلو غالب ہے اور بندے کا حق کمزور حیثیت رکھتا ہے۔ پھر بھی بندے کا حق اس سے متعلق ہے (اس کی عزت وذلت کا معاملہ ہے) اور بندے کے حق کے لئے مدعی کی طرف سے اپنے حق کی طلب ضروری ہے۔

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً بشرطیکہ گواہی دینے والے آزاد ہوں غلام نہ ہوں اگر گواہ غلام ہوں تو باجماع فقہاء ہر ایک کی سزا آدھی ہو جائے گی، یعنی ہر غلام گواہ کے چالیس کوڑے مارے جائیں گے۔ فقہاء نے حد قذف کو حد زنا پر قیاس کیا ہے (زانی غلام یا باندی ہو تو پچاس کوڑے مارے جانے کا حکم آیت قرآنی اور حدیث میں آیا ہے۔ اس لئے قاذف اگر غلام ہو تو اس کی سزا بھی آدھی ہو گی)۔ اللہ نے زانی باندیوں کے متعلق فرمایا فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔

بیہقی نے اپنی سند سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے بیان کیا میں نے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد والے خلفاء کے دور خلاف میں ہر خلیفہ کو یہی پایا کہ وہ باندی غلام کو (جس نے کسی پر تہمت زنا لگائی ہو) چالیس کوڑے مارتے تھے۔

امام مالک نے مؤطا میں یہ اثر نقل کیا ہے مگر اس میں حضرت ابو بکرؓ کا نام نہیں ہے، امام اوزاعی کے نزدیک غلام کی حد قذف آزاد کے برابر ہے۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا اور انکی شہادت آئندہ کبھی قبول نہ کرو۔ اس جملہ کا عطف فاجلدوا پر ہے۔ مبتداء میں شرط کا معنی ہے فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا پوری عبارت جزا ہے، ہمارے نزدیک یہ دونوں ٹکڑے یعنی کوڑے مارنا اور آئندہ کبھی شہادت نہ قبول کیا جانا حد قذف کے دو جزو ہیں، دونوں کا مجموعہ پوری سزا ہے کیونکہ دونوں میں خطاب حاکموں کو ہے انہیں کو حکم دیا گیا ہے کہ کوڑے ماریں اور آئندہ شہادت قبول نہ کریں۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾ اور یہ لوگ یقیناً اللہ کے نافرمان ہیں۔ یہ جملہ علیحدہ ہے اس کا تعلق پہلے

دونوں جملوں سے نہیں ہے، پہلے دونوں انشائیہ ہیں اور یہ جملہ خبریہ ہے حقیقت میں اس جملہ سے ایک شبہ کو دفع کرنا مقصود ہے۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ حدود تو صرف شبہ پیدا ہونے سے ساقط ہو جاتی ہیں پھر قاذف پر حد جاری کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ قذف میں سچے ہونے کا بھی تو احتمال ہے (خواہ نصاب شہادت مکمل نہ ہو) اور یہ بھی ممکن ہے کہ قاذف نے محض نیکی کے جذبے کے زیر اثر اللہ کے قانون کو تعطل سے محفوظ رکھنے کے لئے لوجہ اللہ شہادت دی ہو۔ (اور نصاب شہادت پورا نہ ہونے کی وجہ سے ثبوت زنا نہ ہو سکا)۔ اس شبہ کو زائل کرنے کے لئے فرمایا کہ ایسے لوگ فاسق ہیں، اللہ کے نافرمان ہیں۔ جب چار گواہ نہیں پیش کر سکتے تو معلوم ہوتا ہے ان کی نیت بخیر نہیں یہ مسلمان کی آبروریزی کرنی چاہتے ہیں، ان کے دلوں کے اندر نیکی کا جذبہ نہیں ہے۔ ان کو حد خداوندی کا اجراء مقصود نہیں ہے۔ اس لئے سزا کے مستحق ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا لا تقبلوا لھم علیحدہ جملہ ہے عدم قبول شہادت کو حد قذف میں دخل نہیں (سزائے تازیانہ صرف حد قذف ہے) شہادت قبول نہ کرنے کی حد قذف سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ حد قذف ایک فعل ہے جس کی اقامت حاکم پر لازم ہے اور عدم قبول شہادت حرمت فعل ہے۔ (اس کی حیثیت سلبی اور منفی ہے) اس کے بعد اولئک ھم الفسقون شہادت کو رد کر دینے کی علت ہے۔

ہم کہتے ہیں رد شہادت کی مناسبت حد قذف سے بہت زیادہ ہے۔ قاذف پر حد جاری کرنے کا حکم زجر و توبیخ کے لئے دیا گیا ہے تاکہ لوگ جھوٹی تہمت زنا نہ لگائیں اور دوامی رد شہادت میں زجر ضرب تازیانہ سے زیادہ ہے۔ اسی لئے عدم قبول شہادت کے بعد ابداً کا لفظ فرمایا۔ ظاہر ہے کہ فسق سے ہمیشہ کے لئے شہادت رد نہیں ہوتی، فاسق کی شہادت اسی وقت تک قابل رد ہے جب تک وہ فاسق ہو۔

ایک شبہ:۔ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا کا یہ مطلب ہے کہ جب تک قاذف تہمت زنا پر جما رہے اس کی شہادت قبول نہ کرو اور جب توبہ کر لے تو اس کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔ جیسے یوں کہا جائے کہ کافر کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ کفر پر قائم رہے اس کی شہادت قبول نہ کرو جب کفر سے تائب ہو جائے تو اس کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔

ازالہ:۔ کافر پر فاسق کو قیاس کرنا غلط ہے کافر کی شہادت قبول نہیں کی جاتی یا نہ قبول کرو۔ اس کے اندر تو خود یہ مفہوم موجود ہے کہ جب تک وہ کافر ہے اس کی شہادت قبول نہ کرو۔ اس لئے ابداً کا لفظ بڑھانے کی ضرورت نہیں، اگر کسی مشتق پر کوئی حکم مبنی ہو تو وصفی معنی حکم کی علت ہوتا ہے (جیسے اپنے دوست زید سے اچھا سلوک کرو۔ یعنی اچھا سلوک زید سے اس لئے کرو کہ وہ تمہارا دوست ہے زید کے دوست ہونے کا وصف حسن سلوک کے حکم کی علت ہے ہکذا صرح الشیخ عبد القاہر۔ مترجم) پس کافر کی شہادت قبول نہ کرنے کے حکم کی ساتھ ابداً کی قید لغو اور بے فائدہ ہے (لیکن قاذف کی شہادت قبول نہ کرنے کے حکم کے ساتھ ابداً زیادتی زجر و توبیخ کا فائدہ دے رہی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور (اپنے اعمال و احوال کو) درست کر لیں تو اللہ غفور (و) رحیم ہے۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا الا الذین کا استثناء گزشتہ آخری جملہ کی طرف راجع ہے (یعنی جو لوگ توبہ کر لیں گے اور اپنے احوال کی درستی کر لیں گے وہ فاسق نہیں رہیں گے مطلب یہ ہے کہ توبہ سے قذف کی سزا معاف نہیں ہوگی صرف فاسق ہونے کا حکم جاتا رہے گا) اصول فقہ میں امام ابو حنیفہ کا مسلک یہی ہے کہ جب استثناء چند جملوں کے بعد آئے تو اس کا رجوع آخری جملہ کی طرف ہوتا ہے ہاں اگر کوئی قرینہ ایسا موجود ہو جو آخری جملہ کی طرف راجع کرنے سے مانع ہو تو مجبوراً کل کی طرف استثناء کو راجع کیا جائے گا۔

امام صاحب کی تفسیر مذکور کے چند دلائل ہیں (۱) استثناء کے ساتھ آخری جملہ ہی متصل ہے (۲) آخری جملہ اپنے حکم کے لحاظ سے سابق جملوں سے کٹا ہوا ہے اس کی رفتاری ترتیب ہی جدا ہے گو ضمیر اور اسم اشارہ کے لحاظ سے، اس کا اتصال گزشتہ

تمام جملوں کے ساتھ ہے (۳) استثناء کی شرط یہ ہے کہ مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ متصل ہو اور اس جگہ آخری جملہ سابقہ گزشتہ جملوں کے اور مستثنیٰ کے درمیان حائل ہے (۴) استثناء کا رجوع سابق کلام کی طرف اس مجبوری کے تحت ہوتا ہے کہ تنہا استثناء کا کوئی مستقل معنی نہیں ہوتا اور یہ ضرورت صرف ایک جملہ سے مربوط کرنے سے پوری ہو جاتی ہے اور جملۂ اخیرہ کی طرف رجوع تو بہر حال سب علماء کے نزدیک مسلم ہے اس لئے دوسرے جملوں سے وابستہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ گزشتہ کلام استثناء پر موقوف ہوتا ہے کیونکہ اس کے حکم کو بدلنا تو ضروری ہوتا ہے، استثناء سے وہ حکم بدل جاتا ہے اب یہ تغییر حکم کی ضرورت آخری جملہ کی طرف راجع کرنے سے پوری ہو جاتی ہے۔

ایک شبہ: واؤ عطف کے لئے اور سابق کلام کو لاحق کلام کے ساتھ شریک کرنے کے لئے آتا ہے اور سابق میں معطوف معطوف علیہ کی شکل میں چند جملے مذکور ہیں۔ لہٰذا تمام جملوں کا استثناء میں اشتراک ہونا چاہئے۔

ازالہ: عطف کا یہ مطلب نہیں کہ پورے جملہ کا حکم میں اشتراک ہو حرف عطف تو شرکت اعرابی کو ظاہر کرتا ہے (ہر جملے کا حکم جدا جدا ہوتا ہے) استثناء سے کلام سابق کا حکم بدل جاتا ہے۔ پس ہر جملے کی شرکت استثناء میں نہیں ہوگی۔

(۵) توبہ سے فسق ختم ہو جاتا ہے، حدود ساقط نہیں ہوتیں۔ امام شافعی وغیرہ کے نزدیک اگر کوئی قرینہ مانع نہ ہو تو سابق میں جتنے جملے معطوف معطوف علیہ کی شکل میں ذکر کئے گئے ہوں سب کی طرف استثناء کا رجوع ہوتا ہے۔ اسی لئے امام شافعی کا قول ہے کہ توبہ سے حد قذف ساقط ہو جاتی ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک توبہ سے حد ساقط نہیں ہوتی۔

امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس جگہ استثناء کا رجوع آخر کے دو جملوں کی طرف ہے اول جملہ کی طرف نہیں ہے۔ جملہ لا تقبلوا چونکہ سابق سے بالکل منقطع ہے اور عدم قبول شہادت حد قذف میں داخل نہیں ہے۔ اس لئے استثناء کا رجوع پہلے جملے کی طرف نہیں ہوگا اس سے روکنے والا قرینہ موجود ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ استثناء کا رجوع گزشتہ تینوں جملوں کی طرف ہے اور اس سے لازم نہیں آتا کہ توبہ کے بعد حد ساقط ہو جائے۔ کیونکہ توبہ کامل اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک حد شرعی کے اجراء کو قبول نہ کرلے، یا جس پر تہمت لگائی ہے۔ اس سے معافی طلب کرلے اور وہ معاف کردے۔

میں کہتا ہوں توبہ کا معنی صرف یہ ہے کہ اپنے کئے پر ندامت ہو اور اللہ سے معافی طلب کرلے۔ پس اگر توبہ سے حد کا ساقط ہو جانا فرض کرلیا جائے تو پھر حد شرعی کو قبول کرنا واجب نہیں قرار پاتا، اسی بنیاد پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ تہمت لگانے والے کی شہادت صرف تہمت زنا لگانے سے ہی واجب الرد ہو جاتی ہے، خواہ تہمت زدہ شخص حد قذف کا مطالبہ کرے یا نہ کرے کیونکہ قاذف فاسق ہو جاتا ہے۔ اب توبہ کرنے اور پشیمان ہونے اور اپنی حالت کو درست کرلینے کے بعد اس کی شہادت قابل قبول ہو جاتی ہے۔ خواہ اجراء حد کے بعد پشیمان ہو جائے اور توبہ کرلے یا اجراء سزا سے پہلے بہر حال فسق کا دھبّہ توبہ کے بعد زائل ہو جاتا ہے اور آئندہ مردود الشہادہ نہیں رہتا۔

بغوی نے لکھا ہے یہ تشریح حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، شعبی، عکرمہ، زہری اور عمر بن عبدالعزیز کا بھی قول ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا، حد لگائے جانے کے بعد تو قاذف کی حالت اجراء حد سے پہلے کے مقابلہ میں بہتر ہو جاتی ہے کیونکہ حدود گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ (ان سے گناہوں کا اتار ہو جاتا ہے) تو پھر کیا وجہ اچھی حالت ہونے کے بعد تو اس کی شہادت رد کر دی جائے اور بری حالت میں جبکہ اس پر ابھی حد جاری نہ کی گئی ہو اس کی شہادت قابل قبول ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک جو قاذف کی شہادت محض قذف سے ہی (اجرائے حد سے پہلے ہی) واجب الرد ہو جاتی ہے خواہ تہمت زدہ معصوم مطالبہ کرے یا نہ کرے کیونکہ تہمت زنا لگاتے ہی وہ فاسق ہو جاتا ہے اب اگر تہمت زدہ شخص اجرائے حد کا مطالبہ نہیں کرتا تو حد جاری نہیں کی جائے گی، لیکن جب تک توبہ نہ کرے گا شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ

کی روایت میں آیا ہے کہ آیت الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کا توبہ کرنا ہی اپنے قول (تہمت زنا) کو جھٹلاتا ہے (یعنی جب انہوں نے توبہ کی اور اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو جھوٹا مان لیا اور تسلیم کر لیا کہ ہم نے جھوٹ کہا) اب اگر انہوں نے خود اپنی تکذیب کر دی (یعنی توبہ کر لی) تو مردود الشہادۃ آئندہ نہ رہے، یہ حدیث اگر پایۂ صحت کو پہنچ جائے تو امام شافعی کے مسلک کا ثبوت اس سے ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں احادیث احاد اگر صراحت قرآن کے خلاف ہوں تو ان کو نہیں مانا جا سکتا۔ قرآن میں تو لا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا صراحت کے ساتھ آ گیا ہے اب اگر توبہ کر لے گا تو قبول شہادت کے قابل ہو جائے گا۔ فسق کا دھبہ چھوٹ جائے گا۔ اور اگر تہمت زدہ کے مطالبہ کی وجہ سے حد جاری ہو گئی اور اسّی کوڑے لگ گئے تو اس کی شہادت اب کبھی قبول نہیں کی جائے گی خواہ اس نے توبہ کر لی ہو یا نہ کی ہو، کیونکہ رد شہادت کا حکم حق عبد کی وجہ سے ہے اور بندے کا حق توبہ سے ساقط نہیں ہوتا۔

فائدہ

علماء کا اتفاق ہے کہ حد قذف سے اللہ کے حق کا بھی تعلق ہے اور بندے کے حق کا بھی تہمت زدہ شخص کی رسوائی اور آبروریزی کے عار کو دور کرنے کے لئے حد قذف کا قانون جاری کیا گیا ہے۔ اس سے تہمت زدہ شخص کو خصوصی فائدہ پہنچتا ہے اسی لئے علماء اس کو حق عبد قرار دیتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حد قذف جرائم سے روکنے والی ہے اس لئے اس کو حد کہا جاتا ہے اس قانون کو جاری کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا تباہی فساد اور فتنہ سے محفوظ رہے اس لئے اس کو حق اللہ کہا جاتا ہے چونکہ یہ بندے کا حق ہے اس لئے اس کو جاری کرنے کے لئے مدعی کی طرف سے مطالبہ شرط ہے اور قدیم ہونے کی وجہ سے شہادت باطل نہیں ہو جاتی اور مستامن کافر پر بھی اس کا اجراء ہوتا ہے اور قاضی کو اگر اس کا علم مدت حکومت کے زمانے میں ہو تو وہ یہ سزا جاری کر دے گا، لیکن اگر زمانۂ حکومت سے پہلے علم تھا تو جب تک حکومت کے زمانہ میں شہادت اس کے سامنے نہ آئے وہ سابق شہادت پر حد جاری نہیں کرے گا اور اگر ایک شخص حد زنا اور حد قذف دونوں کا مستحق ہو یا حد سرقہ اور حد قذف دونوں کا مجرم قرار پائے تو حد قذف پہلے جاری کی جائے گی (کیونکہ حد زنا اور حد سرقہ دونوں خالص حق اللہ ہیں اور بندے کا حق اللہ کے حق پر مقدم ہوتا ہے) اور اقرار کے بعد اس سے لوٹ جانا درست نہیں (زنا کے اقرار سے لوٹ جانا تو صحیح ہے لیکن شہادت زنا دینے کے بعد لوٹ جانا جائز نہیں) اور چونکہ حد قذف سے اللہ کا حق متعلق ہے اس لئے تہمت زدہ شخص یعنی مدعی خود قاذف کو سزا نہیں دے سکتا۔ سزا جاری کرنے کا اختیار صرف حاکم کو ہے اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں حد قذف ساقط ہو جاتی ہے (کیونکہ حق اللہ ہے) اور حد ساقط ہو جانے کے بعد (دیت کی طرح) مالی معاوضہ میں بتدیل نہیں ہو جاتی۔ اور نہ قاذف سے قسم لی جا سکتی ہے (اگر بندہ کا خالص حق ہوتا ہے تو شہادت نہ ہونے کی صورت میں قاذف سے حلف لیا جاتا) اور غلام قاذف ہو تو سزا آدھی ہو جاتی ہے۔ حقوق اللہ کی حیثیت سے جو سزائیں واجب ہیں ان سب میں غلام کے لئے تنصیف ہو جاتی ہے۔ علوم ہوا کہ حد قذف بھی اللہ کا حق ہے۔ البتہ حق عبد کے سلسلہ میں کی جو سزائیں ہیں اور ان کی مقدار کی کمی بیشی تلف ہو ہی حق کی کمی بیشی کے موافق ہوتی ہے۔ حق تلف کرنے والا کوئی ہو غلام ہو یا آزاد اس سے سزا کی کمی بیشی کا تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا تمام فروعی مسائل پر ائمہ کا اتفاق ہے اور حد قذف میں اللہ اور بندے کے حق کا مشترک ہونا اجماعی فیصلہ ہے لیکن اس میں غالب کس کا حق ہے اللہ کا یا بندہ کا، اس میں ضرور اختلاف ہے، امام شافعی کے نزدیک بندے کا حق غالب ہے، بندہ محتاج ہے اور اللہ بے نیاز۔ امام ابو حنیفہ کا قول اس کے برعکس ہے کیونکہ بندے کے حق کا ذمہ دار تو اللہ ہے، اللہ کے حق میں بندے کا حق بھی ملحوظ رہتا ہے اور اللہ کا حق بندہ وصول نہیں کر سکتا، ہاں اللہ کا نائب ہونے کی حیثیت سے وصول کرتا ہے اس اختلاف پر بہت سے مختلف مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ جن کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حد قذف کے مطالبہ کا حق تہمت زدہ کے وارثوں کو بھی منتقل ہو سکتا ہے، امام شافعی کا یہی قول ہے، امام ابو حنیفہ کے نزدیک حد قذف کے مطالبہ کا حق وارثوں کو نہیں ہوتا اللہ کے حق میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ بدنوں کے حقوق کا انتقال

وارثوں کی جانب ہو سکتا ہے خواہ وہ حقوق مالی ہوں یا مال سے تعلق رکھنے والے ہوں جیسے ضمانت و کفالت یا مال میں تبدیل ہو جاتے ہوں جیسے قصاص۔ اور حد قذف ان تینوں شقوں میں سے کسی میں شامل نہیں ہے اس لئے تہمت زدہ شخص کے وارثوں کو یہ حق منتقل نہیں ہو سکتا، بلکہ مقذوف کے مرنے کے بعد حد قذف باطل ہو جاتی ہے خواہ اقامت حد سے پہلے مقذوف مر جائے تو جتنی حد باقی رہ گئی ہو وہ باطل ہو جائے گی۔ شافعی کا قول اس کے خلاف ہے۔

(۲) ثبوت حد کے بعد اگر مقذوف معاف کر دے تو حد ساقط نہیں ہو جاتی۔ امام ابو حنیفہ کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعی اور ایک روایت کے بموجب امام ابو یوسف کے نزدیک ساقط ہو جاتی ہے ہاں اگر مقذوف کہے کہ اس نے مجھے تہمت زنا نہیں لگائی اور گواہ جھوٹے ہیں تو بالاتفاق حد ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ (مدعی کے انکار و تردید کی صورت میں) تہمت زنا کا تحقق ہی نہیں پھر سزا کا وجوب کیسے ہو گا یہ بات نہیں ہے کہ سزا کا وجوب ہو گیا تھا پھر ساقط کر دی گئی۔ ہاں قصاص، وجوب (یعنی ثبوت قتل) کے بعد بھی ورثاء مقتول کی معاف کر دینے سے معاف ہو جاتا ہے کیونکہ قصاص میں حق عبد غالب ہے۔

(۳) امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مال یا کوئی اور چیز قذف کا عوض نہیں قرار دی جا سکتی کیونکہ حد قذف میں اللہ کا حق غالب ہے۔) امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک حد قذف کا معاوضہ ہو سکتا ہے۔

(۴) امام ابو حنیفہ کے نزدیک حد قذف میں مداخل ہو سکتا ہے (یعنی متعدد جرائم کی سزا میں ایک ہی مرتبہ حد جاری کی جائے گی) یہاں تک کہ اگر ایک ہی شخص پر چند مرتبہ تہمت زنا لگائی یا چند آدمیوں پر لگائی (اور ثبوت شرعی نہ ہو گا) تو سب کی پاداش میں ایک ہی حد قذف جاری کی جائے گی۔ بشرطیکہ ایک قذف کے بعد سزا نہ دی جا چکی ہو (یعنی اگر تہمت زنا میں حد قذف جاری کر دی گئی اور سزا پانے کے بعد اس شخص نے پھر دوبارہ کسی اور پر یا پہلے ہی شخص پر تہمت زنا لگائی تو دوبارہ حد جاری کی جائے گی پہلی سزا بعد والے جرم کے لئے کافی نہ ہو گی) اور اگر ایک مقذوف نے مطالبہ کیا اور حد جاری کر دی گئی اور ابھی کوڑے پورے اسی لگنے نہ پائے تھے کہ دوسرے شخص نے (جس پر اسی شخص نے تہمت لگائی تھی) بھی اپنے حق کا مطالبہ کیا تو (دوسری حد جاری نہ ہو گی بلکہ) پہلی ہی سزا کا باقی حصہ پورا کر دیا جائے گا۔ امام شافعیؒ جواز تداخل کے قائل نہیں ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ بات مسلمہ ہے کہ حد قذف میں اللہ کا حق اور بندے کا حق دونوں مشترک ہیں مذکورۃ الصدر متفق علیہا مسائل اس کے شاہد ہیں اور یہ امر بھی ثابت شدہ ہے کہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں تو گویا اس طرح کہا جائے کہ ایک حق تو وجوب حد کا مقتضی ہے اور دوسرا حق سقوط حد کا خواستگار لہٰذا سقوط حق کا فتویٰ ہونا چاہئے کیونکہ اگر غلط طور پر معافی ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ غلط طور پر سزا دی جائے (حضرت عمر کا یہ قول پہلے نقل کر دیا گیا ہے) اس تنقیح کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ جو حد قذف میں وراثت کو جائز نہیں قرار دیتے ان کا یہ قول صحیح ہے اور اگر مقذوف معاف کر دے تو سزا ساقط ہو جانا چاہئے مقذوف کی طرف سے مطالبہ ہی نہیں رہا اور اجرائے حد کے لئے مطالبہ شرط ہے پس امام شافعی جو اس صورت میں سقوط حد کے قائل ہیں ان کا قول اس مسئلہ میں درست ہے اور تداخل بھی حد قذف میں ہونا چاہئے جیسا کہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور اگر قاذف اور مقذوف نے کسی معاوضہ پر باہم صلح کر لی تو چونکہ مقذوف سقوط حد پر راضی ہو گیا اس لئے حد ساقط ہو جانا چاہئے اور چونکہ اللہ کے حق کا بھی تعلق ہے اس لئے قاذف کے ذمہ مال کی ادائیگی لازم نہ ہونی چاہئے۔

بخاری نے صحیح میں حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ ہلال بن امیہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی بیوی پر شریک بن سحما سے زنا کرنے کی تہمت لگائی (واقعہ یقیناً سچا تھا لیکن شرعی شہادت موجود نہیں تھی اس لئے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (یا تو شرعی ثبوت پیش کرو) ورنہ تمہاری پشت پر کوڑے مارے جائیں گے ہلال نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر کوئی شخص کسی کو اپنی بیوی پر دیکھے تو کیا گواہوں کو تلاش کرنے جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا گواہ یا تمہاری پشت پر کوڑے۔ ہلال نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے میں بلاشک و شبہ سچا ہوں اللہ ضرور (کوئی حکم ایسا) نازل فرمائے گا جس سے میری پشت کوڑوں سے بچ جائے گی۔ اس وقت جبرئیل آیات ذیل لے کر نازل ہوئے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ اور جو لوگ اپنی بیویوں کی طرف زنا کی نسبت کرتے ہیں۔ کیفیت وحی دور ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت ان کان من الصدقین تک تلاوت فرمائی حسب الحکم ہلال آئے اور انہوں نے شہادت دی یعنی لعان کیا اور حضور برابر فرماتے رہے کہ اللہ جانتا ہے کہ تم دونوں میں ایک جھوٹا ہے تو کیا تم دونوں میں سے کوئی ایک اپنے قول سے رجوع کرلے گا۔ ہلال کی شہادت کے بعد عورت کھڑی ہوئی اور اس نے شہادت دی یعنی لعان کیا جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا تو لوگوں نے اس کو روکا اور کہا یہ شہادت فیصلہ کردینے والی ہے (اگر تو نے جرم کیا ہے تو شہادت سے اب بھی لوٹ سکتی ہے) عورت ذرا جھجکی اور مڑی یہاں تک کہ ہمارا خیال ہوا کہ یہ (شہادت سے) لوٹ جائے گی پھر کہنے لگی میں اپنے خاندان کو آئندہ ہمیشہ کے لئے رسوا نہیں کروں گی چنانچہ اس نے شہادت جاری رکھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس عورت کو دیکھتے رہنا (اگر اس کے بچہ پیدا ہو) اور آنکھیں سرمگیں ہوں سرین بھاری ہوں اور پنڈلیاں گداز ہوں تو (خیال کرلینا کہ) وہ شریک بن سمحا کا ہے چنانچہ جب بچہ پیدا ہوا تو وہ ایسا ہی تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر کتاب اللہ کا فیصلہ نازل نہ ہوا ہوتا تو پھر میں اس عورت سے سمجھتا۔

صحیح میں حضرت سہل بن سعد ساعدی کی روایت سے آیا ہے کہ ابن عویمر عجلانی نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو (مشغول) دیکھ لے تو کیا کرے اگر وہ قتل کردے گا تو لوگ (قصاص میں) اس کو قتل کردیں گے (گواہ لینے جائے گا تو مرد فارغ ہو کر جاچکے گا) بتائیے وہ کیا کرے حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے اور تمہاری بیوی کے معاملہ میں حکم نازل ہو گیا ہے جاؤ اپنی بیوی کو لے آؤ حضرت سہل کا بیان ہے پھر دونوں نے مسجد کے اندر لعان کیا میں اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا لعان سے دونوں فارغ ہوگئے تو عویمر نے عرض کیا یارسول اللہ اب اس کے بعد میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں گا تو (گویا) میں نے اس پر تہمت تراشی کی (کیونکہ غیرت مند آدمی زنا کار عورت کو اپنے نکاح میں نہیں رکھتا ہے) چنانچہ انہوں نے عورت کو تین طلاقیں دیدیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ذرا دیکھتے رہنا اگر اس عورت کے بچہ پیدا ہو اور وہ سانولا، سیاہ چشم بھاری سرینوں اور گداز پنڈلیوں والا ہو تو میرا خیال ہو جائے گا کہ عویمر (یعنی ابن عویمر) نے سچ کہا تھا اور اگر اسی کی طرح سرخ رنگ کا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ عویمر نے اس عورت پر دروغ بندی کی چنانچہ جب بچہ پیدا ہوا تو وہ ویسا ہی تھا جس سے رسول اللہ ﷺ کے بیان کے مطابق عویمر کی سچائی ظاہر ہوتی تھی چنانچہ آئندہ اس بچہ کا نسب ماں سے ملایا جاتا (اور ولد عویمر نہیں کہا جاتا تھا)

امام احمد نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدو هم ثمنين جلدة ولا تقبلو الهم شهادة ابداً نازل ہوئی تو انصار کے سردار حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا (کیا) اسی طرح آیت نازل ہوئی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے گروہ انصار سن رہے ہو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے (اس کو نزول آیت میں شبہ ہے) انصار نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ان کو آپ برا نہ کہیں یہ بڑے غیرت مند آدمی ہیں بخدا انہوں نے (کبھی کسی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح نہیں کیا) ہمیشہ ناکتخدا سے ہی نکاح کیا اور نہ اپنی کسی بیوی کو طلاق دی (یعنی جس عورت کا پردہ کسی مرد نے اٹھالیا ہو اس کو انہوں نے کبھی ساتھ رکھنا پسند نہیں کیا اور انتہائی غیرت یہ کہ کسی عورت کو طلاق نہیں دی کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرسکے) ان کی اسی شدت غیرت کی وجہ سے ہم میں سے کوئی شخص جرأت نہیں کرسکتا کہ (اگر ان کی چھوڑی ہوئی کوئی عورت ہو تو) اس سے نکاح کرلے حضرت سعد نے عرض کیا یارسول اللہ میرے ماں باپ قربان بخدا یہ تو میں ضرور جانتا ہوں کہ یہ آیت حق ہے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے لیکن مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ اگر میں بدکار عورت کو اس حالت میں دیکھوں کہ کوئی شخص اس کو اپنی رانوں میں دبائے ہوئے ہے تو مجھے یہ بھی اجازت نہیں کہ میں اس کو اس کی جگہ سے ہلاسکوں جب تک کہ چار گواہ لاکر ان کو آنکھوں سے دکھا نہ دوں خدا کی قسم جب تک میں گواہ لاؤں گا وہ شخص اپنا کام کرکے چل دے گا۔ اس واقعہ کو زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ہلال بن امیہ کا قصہ ہو گیا حضرت ہلال

ان تینوں میں سے ایک تھے جن کی توبہ قبول ہونے کی صراحت آیت میں آئی تھی (غزوۂ تبوک کو تین شخص باوجود مقدرت کے نہیں گئے تھے اور واپسی کے وقت حاضر خدمت ہو کر انہوں نے سچ سچ عرض کر دیا تھا اور اپنے قصور کا اعتراف کر لیا تھا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان پر سخت عتاب کیا تھا اور مسلمانوں کو ان کے بائی کاٹ کا حکم دیدیا تھا انہوں نے چالیس پچاس دن برابر اللہ سے زاری کی اور روتے رہے آخر ان کی توبہ قبول ہوئی اور قبول توبہ کی آیت اللہ نے نازل فرما دی، واقعہ یوں ہوا کہ حضرت ہلال رات کو اندھیرا پڑے اپنی زمین سے واپس آئے آکر دیکھا کوئی شخص ان کی بیوی کے پاس موجود ہے (اور کام میں مشغول ہے) آپ نے اپنی آنکھوں سے ان کی حرکت دیکھی اور اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنیں لیکن اس شخص کو متنبہ نہیں کیا صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میں اندھیرا پڑے گھر آیا تو میں نے اپنی بیوی کے پاس ایک آدمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے (ان کی باتیں) سنیں رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع ناگوار ہوئی اور بار گزری۔ دوسری طرف انصار جمع ہوئے اور انہوں نے کہا سعد بن عبادہ کے قول نے ہم کو آزمائش میں ڈال دیا۔ اب ہلال بن امیہ کو رسول اللہ (کوڑے) لگوائیں گے اور لوگوں میں ان کی شہادت کو باطل قرار دیں گے۔ ہلال نے کہا خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لئے اس سے رہائی کا کوئی راستہ ضرور نکال دے گا (راوی کا بیان ہے) رسول اللہ ﷺ کوڑے لگوانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اللہ نے آپ پر وحی نازل فرمائی۔ جب وحی نازل ہو گئی (اور حضور ﷺ نے سنا دی) لوگ ہلال کو کوڑے مارنے سے رک گئے۔ آیت نازلہ یہ تھی والذین یرمون ازواجھم الخ ابو یعلی نے ایسا ہی بیان حضرت انس کا نقل کیا ہے بغوی نے یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد اس کے آخر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہلال تم کو خوش خبری ہو اللہ نے تمہارے لئے کشائش پیدا کر دی ہلال نے کہا مجھے اللہ سے اس کی امید تھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کو بلاؤ حسب الحکم عورت حاضر ہوئی جب دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اکٹھے ہوئے تو عورت سے (ہلال کا قول) کہا گیا عورت نے ہلال کے قول کو جھوٹا قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ یقیناً جانتا ہے کہ تم دونوں میں ایک جھوٹا ہے تو کیا تم دونوں میں سے کوئی (اپنے بیان سے) رجوع کرنے والا ہے۔ ہلال نے کہا یا رسول اللہ میرے ماں باپ قربان میں سچ کہہ چکا اور میں نے حق بات کہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ان دونوں کے درمیان لعان کرا دو۔ حسب الحکم ہلال سے کہا گیا شہادت دو ہلال سے فرمایا ہلال اللہ سے ڈرو دنیوی عذاب آخرت کے عذاب سے آسان ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کے عذاب سے بہت زیادہ سخت ہے اور یہ پانچویں شہادت واجب کر دینے والی ہے (اگر تو جھوٹا ہے تو) عذاب کو تجھ پر واجب کر دے گی۔ ہلال نے کہا خدا کی قسم اللہ اس شہادت پر مجھے عذاب نہیں دے گا جس طرح رسول اللہ ﷺ اس پر میرے کوڑے نہیں ماریں گے۔ اس کے بعد پانچویں شہادت میں ہلال نے کہا کہ اللہ کی لعنت مجھ پر اگر میں جھوٹا ہوں پھر پانچویں شہادت کے وقت رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو روکا اور فرمایا اللہ سے ڈر پانچویں شہادت یقیناً واجب کر دینے والی ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کے عذاب سے زیادہ سخت ہے یہ سن کر عورت تھوڑی دیر کے لئے کچھ جھجکی اور اقرار کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کہنے لگی خدا کی قسم میں اپنے خاندان کو رسوا نہیں کروں گی۔ چنانچہ اس نے پانچویں شہادت دے دی اور کہا اللہ کا مجھ پر غضب ہو اگر وہ (ہلال) سچا ہو، آخر رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو الگ الگ کر دیا اور فیصلہ کر دیا کہ بچہ (اگر ہو گا تو) عورت کا ہو گا باپ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جائے گی لیکن بچہ کو ولد حرام نہیں کہا جائے گا۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر بچہ ایسا ایسا ہو تو شوہر کا ہو گا اور اگر ایسا ایسا ہو تو وہ اس شخص کا ہو گا جس کا نام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جب بچہ پیدا ہوا تو خاکستری رنگ کے اونٹ کی طرح بدشکل تھا جو آئندہ زندگی میں مصر کا حاکم بنا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میرا باپ کون تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ تمام روایات میں حضرت ابن عباس کا بیان مندرجہ ذیل آیا ہے اور یہی مقاتل نے بیان کیا کہ جب آیت والذین یرمون المحصنت الخ نازل ہوئی اور منبر پر رسول اللہ ﷺ نے پڑھ کر سنائی تو عاصم بن عدی انصاری نے اٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ مجھے آپ پر قربان کر دے (یہ فرمائیے) اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو (مشغول) دیکھ لے اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو بیان کر دے تو اس کے اسی کوڑے مارے جائیں گے اور مسلمان اس کو فاسق

کہیں گے اور آئندہ اس کی گواہی کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ ہم گواہ اس وقت تک کہاں سے لاسکتے ہیں گواہوں کی تلاش میں جائیں گے تو اتنے وقت میں وہ شخص اپنے کام سے فارغ ہو کر جا چکا ہوگا۔ انہی عاصم کے ایک چچا زاد تھے جن کا نام عویمر تھا اور عویمر کی بیوی خولہ بنت قیس بن محصن تھیں (چند روز بعد کا ذکر ہے کہ) عویمر عاصم کے پاس پہنچے اور کہا (بھائی) میں نے اپنی بیوی خولہ کے پیٹ پر سوار خود شریک بن سحما کو دیکھ پایا (اب کیا کروں) عاصم نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور آئندہ جمعہ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ گزشتہ جمعہ جو جوبات میں نے عرض کی تھی اس میں مبتلا میرے ہی خاندان کا ایک شخص ہو گیا۔ عویمر، خولہ اور شریک سب عاصم کے بنی عم (یعنی ایک ہی دادا کے اولاد) تھے۔

رسول ﷺ نے سب کو طلب فرمایا اور عویمر سے ارشاد فرمایا وہ تیری بیوی اور تیرے چچا کی بیٹی ہے، اللہ سے ڈر اس کو بہتان تراشی کا نشانہ نہ بنا۔ عویمر نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے شریک کو اس کے پیٹ پر دیکھا اور چار مہینے سے میں خولہ کے قریب بھی نہیں گیا اس کو اگر حمل ہے تو کسی اور کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورت سے فرمایا اللہ سے ڈر اور جو کچھ تو نے کیا مجھ سے بیان کر دے۔ عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عویمر بڑا غیرت مند آدمی ہے اس نے دیکھا کہ میں اور شریک دیر تک بیدار رہتے اور باہم باتیں کرتے رہتے اس کو غیرت آئی اور غیرت نے اس سے وہ بات کہلوائی (جو اس نے آپ سے کہی تھی) رسول اللہ ﷺ نے شریک سے فرمایا تیرا کیا بیان ہے۔ اس نے کہا جو عورت کہہ رہی ہے وہی میں کہتا ہوں۔

اس پر اللہ نے آیت والذین یرمون ازواجھم نازل فرمائی۔ حضور ﷺ نے منادی کو حکم دیا کہ الصلوٰۃ جامعۃ کی نداء کر دے منادی نے ندا کر دی لوگ جمع ہو گئے آپ نے عصر کی نماز پڑھی پھر عویمر سے فرمایا اٹھ اور کھڑا ہو کر اللہ کو گواہ کر کے کہہ کہ خولہ زانیہ ہے اور میں یقیناً بلاشبہ سچا ہوں۔ عویمر نے کھڑے ہو کر یہی شہادت دی پھر دوسری شہادت میں عویمر نے کہا میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے شریک کو خولہ کے پیٹ پر دیکھا اور میں بلاشبہ سچا ہوں۔ پھر تیسری شہادت میں عویمر نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ اس عورت کو جو حمل ہے وہ میرا نہیں کسی اور کا ہے اور میں سچا ہوں پھر چوتھی شہادت میں عویمر نے کہا میں اللہ کو شاہد جان کر کہتا ہوں کہ میں نے چار مہینے سے اس سے قربت نہیں کی اور بلاشک میں سچا ہوں پھر پانچویں مرتبہ عویمر نے کہا اگر عویمر اس بات میں جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو (اس کے بعد) حضور ﷺ نے خولہ سے فرمایا کھڑی ہو (اور قسم کھا کر بیان کر) خولہ کھڑی ہوئی اور اس نے کہا میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں زانیہ نہیں ہوں اور عویمر جھوٹا ہے، پھر دوسری شہادت میں خولہ نے کہا میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ عویمر نے شریک کو میرے پیٹ پر نہیں دیکھا اور عویمر جھوٹا ہے پھر تیسری شہادت میں عورت نے کہا میں عویمر سے حاملہ ہوں اور یہ جھوٹا ہے۔ پھر چوتھی شہادت میں عورت نے کہا عویمر نے کبھی مجھے زنا کی حالت میں مبتلا نہیں دیکھا اور یہ جھوٹا ہے، پھر پانچویں شہادت میں اس نے کہا اگر عویمر اس قول میں سچا ہو تو خولہ پر اللہ کا عذاب ٹوٹے تکمیل شہادت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو الگ کرا دیا اور فرمایا اگر یہ قسمیں نہ ہوتیں تو اس وقت اس عورت کے معاملے میں کچھ رائے ہوتی پھر لوگوں سے فرمایا بچے کی پیدائش کے وقت کو دیکھتے رہو اگر بچے کے دونوں ابرو کشادہ ہوں دونوں میں فاصلہ ہو بال بھورے ہوں رنگ مائل بہ سیاہی ہو تو (سمجھو کہ) وہ شریک بن سحما کا ہے اور اگر رنگ خاکستری ہو بال گھنگھریالے ہوں۔ اعضاء کے جوڑ اونٹ کی طرح ہوں تو سمجھو کہ وہ اس شخص کا نہیں ہے جس کی طرف زنا کی نسبت کی گئی ہے (بلکہ وہ عویمر کا ہوگا) حضرت ابن عباس نے فرمایا خولہ کے بچہ پیدا ہوا تو وہ شریک سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ آئمہ (روایت) کا اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے کسی کے نزدیک عویمر کے حق میں اس کا نازل ہونا راجح ہے کسی نے ہلال کے بارے میں اس کے نزول کو راجح قرار دیا ہے۔

قرطبی نے آیت کا نزول دو مرتبہ مانا ہے بعض نے دونوں روایتوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت ہلال کے متعلق نازل ہوئی اور اتفاق سے اسی زمانے میں عویمر کا قصہ بھی ہو گیا اس لئے (کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں واقعات سبب نزول ہیں) علامہ نووی کا بھی اسی قول کی طرف میلان ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ پہلے ہلال

کے متعلق آیت کا نزول ہو چکا ہو پھر جب عویمر اپنا قصہ لے کر آئے اور ان کو ہلال کے واقعہ کا کچھ علم نہ تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم قرآنی بتادیا۔ اسی لئے حضرت ہلال کے قصے میں آیا ہے کہ جبرئیل یہ آیت لے کر اترے اور حضرت عویمر سے فرمایا کہ تیرے معاملے میں یعنی تیرے واقعہ کی طرح ایک واقعہ ایک اور شخص کا ہوا تھا اس کے معاملہ میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمادی ہے۔

ابن الصباغ نے الشامل میں بھی یہی جواب دیا ہے۔

مسئلہ :۔ چونکہ آیت والذین یرمون ازواجھم الخ عام ہے اس لئے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا کہ جو جوڑا (شوہر اور اس کی بیوی) ایسا ہو کہ ان کے درمیان طلاق ہو سکتی ہو ان کے درمیان لعان کا حکم بھی جاری ہو گا خواہ دونوں آزاد ہوں یا دونوں مملوک یا ایک آزاد اور دوسری مملوک دونوں عادل ہوں یا دونوں فاسق، یا ایک عادل ہو اور دوسرا فاسق بلکہ دونوں کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں۔ ایک مسلمان ہو اور دوسری کافر (کتابی) یا دونوں کافر ہوں۔ امام مالک نے کفر فریقین کی صورت میں اختلاف کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک کافروں کا آپس میں نکاح ہی صحیح نہیں ہوتا اس لئے طلاق بھی صحیح نہیں ہوتی اور طلاق نہیں تو لعان بھی جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا جب تک دو شرطیں نہ ہوں گی لعان جائز نہ ہو گا ایک شرط یہ ہے کہ مرد اہل شہادت ہو یعنی مسلمان آزاد عاقل بالغ ہو دوسری شرط یہ ہے کہ عورت ایسی ہو کہ اس کے قاذف (تہمت زنا لگانے والے) کو حد لگائی جا سکتی ہو یعنی مسلمان ہو آزاد ہو عاقل ہو بالغ ہو اور اس سے پہلے اس کی طرف زنا کی نسبت نہ کی گئی ہو امام صاحب کے اس قول پر اگر عورت ایسی ہو کہ (اس کے قاذف کو حد زنا لگائی جا سکتی ہو اور مرد غلام ہو یا کافر ہو یا تہمت زنا کا پہلے سزا یافتہ ہو (اور ایسا مرد تہمت زنا لگائے) تو لعان کا حکم نہیں دیا جائے گا بلکہ حاکم اگر مناسب سمجھے گا تو تعزیری سزا مرد کو دے گا۔ ہاں اگر شوہر نابینا فاسق ہے تو دونوں میں لعان کا حکم دینا جائز ہے کیونکہ فاسق کی شہادت کو قبول کرنے کا اختیار تو بہر حال قاضی کو حاصل ہے فاسق کی شہادت قابل قبول نہیں اگر حاکم چاہے تو لے سکتا ہے اور نابینا کی شہادت عام معاملات میں اس لئے قبول نہیں کی جاتی کہ وہ مدعی اور مدعی علیہ میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ لیکن قذف کا معاملہ تو اس کا ذاتی ہے وہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور اپنی بیوی سے اپنا امتیاز کرتا ہے اس لئے اس شہادت کا اہل ہے دوسری شہادتوں کا اہل نہیں ہے ابن مبارک نے امام ابو حنیفہ کا جو قول نقل کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک، نابینا قاذف ہو تو لعان نہیں کرایا جائے گا۔ اسی طرح امام صاحب کے نزدیک مندرجہ صورتوں میں نہ حد قذف ہے نہ لعان۔ عورت باندی ہو یا کافرہ ہو یا نابالغ ہو یا پاگل ہو یا اس نے نکاح فاسد کیا اور شوہر نے بہ نکاح فاسد اس سے قربت کر لی ہو۔ یا اس کا کوئی بچہ ہو جس کا باپ معلوم نہ ہو یا اس نے اپنی عمر میں کبھی زنا کیا ہو خواہ ایک ہی مرتبہ کیا ہو پھر توبہ کر لی ہو یا اس سے شبہ کے طور پر مرد نے جماع کر لیا ہو اور واقع میں وہ جماع حرام ہو مرد کو حلال ہونے کا شبہ ہو گیا تو ان تمام صورتوں میں نہ حد قذف قاذف پر جاری ہو گی نہ لعان کا حکم دیا جائے گا البتہ حاکم مناسب سمجھے تو عورت کو تعزیری سزا دے سکتا ہے۔

امام صاحب نے جو عورت کے لئے شرط لگائی ہے کہ وہ ایسی ہو جس کے قاذف کو حد لگائی جا سکتی ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ شوہر سے حد قذف کو دور کرنے کے لئے لعان کا حکم دیا گیا ہے جن احادیث میں نزول آیت کا سبب بیان کیا گیا ہے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے دیکھو رسول اللہ ﷺ نے ہلال سے فرمایا ہلال تم کو بشارت ہو اللہ نے تمہارے لئے کشائش پیدا کر دی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شوہر کے حق میں لعان حد قذف کا بدل ہے اسی لئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرو دنیا کا عذاب یعنی حد عذاب آخرت کے مقابلہ میں بہت آسان ہے پس جب ایسی عورت ہی نہ ہو جس کے قاذف پر حد قذف جاری ہو سکتی ہو تو پھر حد کا بدل یعنی لعان کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ ایک شرط امام صاحب نے یہ بھی لگائی تھی کہ شوہر شہادت کا اہل ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ اور ان کے پاس سوائے اپنے آپ کے اور گواہ نہ ہوں۔ اللہ نے اس آیت میں خود ازواج (شوہروں) کو شہداء (گواہ) قرار دیا ہے کیونکہ الا انفسهم کا نفی ہے استثناء کیا ہے اور نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے (ترجمہ یوں ہوگا اور نہ ہوں ان کے لئے گواہ سوائے اسکے کہ وہ اپنے آپ ہی گواہ ہوں)

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں مجاز اً شہداء سے مراد ہیں قسم کھانے والے کیونکہ اس تاویل پر مطلب یہ ہوگا کہ ان کے پاس قسم کھانے والے نہ ہوں سوائے اس کے کہ وہ خود ہی اپنے لئے قسم کھانے والے ہوں یہ مطلب درست نہیں ہے حقیقت میں اس جگہ شہادت کو بمعنی حلف لینا ایک کلّیہ کی فرع ہے جس کا بجائے خود کوئی وجود نہیں کلّیہ یہ ہے کہ (اپنے لئے اپنی شہادت ناجائز ہے اور) دوسرے کے لئے حلف جائز ہے۔ اگر شہادت کا حقیقی معنی قسم ہوتا بھی تب بھی اس جگہ مجازی معنی (یعنی گواہی) کی طرف رجوع کرنا پڑتا (کیونکہ دوسرے کے لئے حلف کا کوئی وجود نہیں) اور جب شہادت کا حقیقی معنیٰ حلف ہے ہی نہیں بلکہ شہادت سے قسم مجازاً مراد لے لی جاتی ہے تو بدرجہ اولیٰ اس جگہ شہادت سے مراد قسم نہیں بلکہ گواہی ہے۔

امام صاحب نے شوہر کے لئے شہادت کا اہل ہونے کی شرط لگائی ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ عورت ایسی ہو جس کے قاذف پر حد قذف جاری کی جاسکتی ہو ان دونوں باتوں کا ثبوت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت کردہ حدیث سے ملتا ہے اس حدیث کو ابن ماجہ اور دار قطنی نے چند طرق سے نقل کیا ہے۔

(۱) دار قطنی نے بروایت عثمان بن عبدالرحمٰن زہری بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار (صورتیں) ہیں جن میں لعان نہیں ہے۔ آزاد مرد اور باندی عورت کے درمیان لعان نہیں ہے غلام مرد اور آزاد بی بی کے درمیان لعان نہیں ہے مسلم مرد اور یہودیہ عورت کے درمیان لعان نہیں ہے۔ مسلم مرد اور نصرانی عورت کے درمیان لعان نہیں ہے۔ یحیٰی بخاری ابو حاتم رازی اور ابوداؤد نے کہا عثمان ابن عبدالرحمٰن کچھ نہیں ہے (ہیچ ہے ناقابل اعتبار ہے) یحیٰی نے ایک بار کہا وہ جھوٹ کہتا تھا ابن حبان نے کہا موضوع احادیث کی روایت کا سلسلہ قابل اعتماد راویوں سے ملاتا تھا اس کی روایت کردہ حدیث کو حجت میں پیش کرنا جائز نہیں۔ نسائی اور دار قطنی نے کہا یہ متروک الحدیث ہے۔

(۲) دار قطنی اور ابن ماجہ نے عثمان بن عطاء خراسانی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار عورتوں سے لعان نہیں۔ عیسائی عورت مسلمان مرد، یہودی عورت مسلمان مرد، باندی عورت آزاد مرد، آزاد عورت غلام مرد، یحیی اور دار قطنی نے عثمان بن عطاء کو ضعیف کہا ہے ابو حاتم اور ابن حبان نے کہا اس کی حدیث سے احتجاج جائز نہیں۔ علی بن جنید نے کہا یہ متروک الحدیث ہے۔

دار قطنی نے کہا عثمان کی متابعت یزید بن زریع نے بھی کی ہے اس نے بھی بروایت عطاء یہ حدیث بیان کی ہے لیکن یزید بن زریع بھی ضعیف ہے۔

(۳) دار قطنی نے عماد بن مطر کی وساطت سے عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عتاب بن اسید کو بھیجا اس کے بعد حدیث مذکور نقل کی ہے۔

ابو حاتم رازی نے کہا عماد بن مطر جھوٹ بنایا کرتا تھا، ابن عدی نے کہا اس کی حدیثیں بے حقیقت ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ امام احمد نے کہا حماد بن عمرو (جو عمار بن مطر کا راوی ہے) جھوٹ بناتا تھا اور حدیث خود گڑھتا تھا۔ ساجی نے کہا باجماع اہل روایت یہ متروک الحدیث ہے۔ نسائی اور دار قطنی نے حماد بن عمرو کے راوی زید بن رفیع کو ضعیف کہا ہے (گویا عماد بن مطر از حماد بن عمرو از زید بن رفیع از عمرو بن شعیب کے سلسلہ میں اول الذکر تینوں راوی ضعیف جھوٹے اور ناقابل اعتبار ہیں)

ابن جوزی نے لکھا ہے، اوزاعی اور ابن جریج نے جو امام الحدیث ہیں یہ حدیث بوساطت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ بیان کی ہے اور اس کو عمرو بن شعیب کے دادا کا قول قرار دیا ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی۔

ابن ہمام نے لکھا ہے ضعیف حدیث اگر متعدد طریقوں سے مروی ہو (اور ہر سند میں ضعف ہو) تو وہ حجت (قابل

استدلال) ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث اسی قسم کی ہے اس کی تائید اوزاعی اور ابن جریج کی روایت سے ہو رہی ہے کہ دونوں اماموں نے اس کو عمرو بن شعیب کے دادا کا قول قرار دیا ہے (اگرچہ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف نہیں کی اور مرفوعاً نہیں بیان کیا پھر بھی موقوفاً ضرور کہا ہے)

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ تو ان میں سے ایک (یعنی مرد) کی شہادت یہی ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہہ دے کہ بلاشبہ میں سچا ہوں امام شافعی نے اس آیت سے اپنے مسلک پر استدلال کیا ہے اس آیت میں شہادات سے مراد قسمیں ہیں۔ گواہیاں مراد نہیں ہیں کیونکہ لفظ شہادت میں دونوں معنی کا احتمال تھا گواہی اور قسم لیکن لفظ باللہ سے قسم کا معنی محکم ہو گیا۔ لفظ اشہد کہہ کر اگر کوئی قسم مراد لے تو قسم ہو جائے گی معلوم ہوا کہ شہادات کا لفظ بول کر قسمیں مراد لینے کا احتمال تھا لفظ باللہ نے اس معنی کو متعین کر دیا۔ شریعت میں اپنی ذات کے لئے خود شہادت دینا قابل قبول نہیں ہاں اپنے لئے قسم کھا سکتا ہے اور اس کی بھی شریعت میں کوئی نظیر نہیں کہ ایک مقام پر (ایک وقت میں) ایک ہی شخص بار بار شہادت ادا کرتا ہو، ہاں قسم کی تکرار کی مثال موجود ہے جیسے قسامت میں ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ شہادت کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے ہوتی اور قسم نفی کے لئے۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ حقیقت شہادت کا تعلق ایک ہی امر سے ہو لامحالہ ایک کی حقیقت اور دوسرے کے مجازی معنی پر عمل واجب ہوگا اور لفظ شہادت کا مجازی معنی (یعنی قسم) مراد ہوگا اور جب شہادت سے قسم مراد ہوگی تو لعان کے لئے شہادت کا اہل ہونا لازم نہ ہوگا۔

ہم کہتے ہیں بیشک اپنے لئے خود شہادت دینے اور بار بار ایک مقام پر شہادت ادا کرنے کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں ہے تو دوسرے کے لئے قسم کھانے کی مثال بھی تو کوئی نہیں ہے۔ اور کسی حکم کو واجب کرنے کے لئے قسم کھانا بھی تو شریعت میں کہیں موجود نہیں ہے۔ قسم تو دفع حکم کے لئے ہوتی ہے نہ کہ ایجاب حکم کے لئے پس جس کو موجود کرنے معدوم کرنے اور جیسا چاہے ویسا حکم دینے کا کامل اختیار و استحقاق ہے جب ایک محل میں دونوں امور کو ابتداءً مشروع کرنا اس کے لئے جائز ہے تو اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ ابتداء اس کو مشروع کر دے (اور اس کا ابتداءً قانون بنا دے نظیر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں)

رہا اپنے لئے خود شہادت دینے کی مثال تو یہ قرآن مجید میں موجود ہے اللہ نے فرمایا ہے شھد اللّٰہ انه لا اله الا ھو اللہ خود شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جو مؤذن کو اذان میں اشھدان لا اله الا الله و اشھد ان محمد رسول الله کہتے سنا تو فرمایا انا اشھد انا اشھد میں بھی شہادت دیتا ہوں میں بھی شہادت دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنی رسالت کی شہادت دینا خود اپنے لئے شہادت ہے۔

باقی اس جگہ تکرار شہادت کیوں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے گواہ جب کوئی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہو تو اس کی جگہ یہ چار شہادتیں بطور بدلیت ضروری قرار پاتی ہیں کیونکہ تہمت کے وقت اپنے لئے شہادت (یعنی ایک شہادت) قبول نہیں کی جا سکتی (اس لئے تکرار شہادت ضروری قرار پائی) اگر تہمت کا موقع نہ ہو تو ایک شہادت بھی اپنے لئے قبول کی جاتی ہے جیسے مندرجہ بالا آیت اور حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے پس کسی تہمت کے مقام میں اپنے لئے بار بار شہادت دینا اور قسم سے اس کو پختہ کرنا اور بصورت کذب اپنے لئے لعنت اور غضب خدا کی بددعا کرنا (اور لعنت و غضب کا اپنے کو مستحق ظاہر کرنا) بعید از فہم نہیں ہے۔

وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اور پانچویں شہادت یہ ہو کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

مسئلہ:۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر تہمت زنا لگائے یا یہ کہے کہ یہ حمل میرا نہیں ہے اور دونوں اہل لعان بھی

ہوں (جس کی اختلافی بحث اوپر گزر چکی) اور عورت قذف کی سزا کا مطالبہ کرے تو شوہر پر لعان کرنا واجب ہو جاتا ہے اگر مرد لعان سے انکار کر دے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک حاکم اس کو قید رکھے جب تک وہ لعان نہ کرے یا اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار نہ کرلے اگر خود اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرلے تو اس پر حد قذف جاری کرے۔

امام مالکؒ، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک صورت مذکورہ میں قید نہیں کیا جائے گا بلکہ لعان سے انکار کرتے ہی اس پر حد قذف جاری کی جائے گی کیونکہ قذف تو حد شرعی کے اجراء کو ہی چاہتا ہے لعان کی صورت تو شوہر کی سچائی کو ظاہر کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی اور جب قاذف خود اپنی سچائی ظاہر کرنے سے قاصر ہو تو فوراً حد جاری کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے قید کا مستحق نہیں ہوتا۔

امام شافعی کے نزدیک لعان سے انکار کرنے سے فاسق ہو جاتا ہے امام مالک کہتے ہیں صرف انکار سے فاسق نہیں ہو جاتا۔

امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ لعان سے انکار کرنا اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار ہے لیکن اس میں کسی قدر شبہ ہے (کیونکہ صراحتاً اس نے اقرار کذب نہیں کیا ہے) اور شبہ کی صورت میں حد جاری نہیں کی جاسکتی مجبوراً اس کو قید کیا جائے گا تاکہ وہ یا لعان پر تیار ہو جائے اور لعان کرے یا صراحتاً اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرے تاکہ اس پر حد قذف جاری کی جاسکے۔

اگر شوہر لعان کرلے تو عورت پر بھی لعان کرنا امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہو جاتا ہے اگر وہ انکار کرے تو حاکم اس کو قید کر دے اور اتنی مدت قید رکھے کہ وہ لعان کے لئے تیار ہو جائے یا زنا کا اقرار کرلے اور شوہر کی تصدیق کر دے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک اگر زوج نے لعان کرلیا تو عورت و مرد میں فرقت ہو گئی اور ہمیشہ کے لئے اس پر عورت حرام ہو گئی اور بچے کی نسبت بھی اس کی طرف نہیں ہو گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے دونوں لعان کرنے والے کبھی جمع نہیں ہوں گے۔

ہم کہتے ہیں لعان اس وقت تک مستحق نہیں ہوتا جب تک عورت بھی لعان نہ کرلے (کیونکہ لعان باب مفاعلۃ سے ہے اور دونوں کی شرکت کے بغیر باب مفاعلۃ کا مصدر متحقق نہیں ہوتا) اس لئے صرف شوہر کے لعان کرنے سے تفریق نہیں ہو سکتی جب تک دونوں لعان نہ کریں فرقت واقع نہ ہو گی۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ إِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑧ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ إِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨ اور عورت سے عذاب کو دور کر دے گا۔ چار مرتبہ اللہ کو گواہ کر کے یہ شہادت دینا کہ وہ یعنی شوہر جھوٹا ہے۔ اور پانچویں یہ کہ اللہ کا غضب آئے اس عورت پر اگر وہ شخص سچا ہے

العذاب سے مراد ہے حد زنا جس طرح آیت فعلیھن نصف ماعلی المحصنت من العذاب میں العذاب سے حد زنا مراد ہے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ہلال کی بیوی سے فرمایا تھا وان عذاب اللّٰہ اشدمن عذاب الناس اللہ کا عذاب لوگوں کے عذاب یعنی حد زنا سے زیادہ سخت ہے۔

لمن الکذبین کا یہ مطلب ہے کہ یہ شخص جو زنا کی تہمت مجھ پر لگا رہا ہے یا اپنا بچہ ہونے کا انکار کر رہا ہے ان دونوں باتوں میں یہ جھوٹا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ پہلی بات میں جھوٹا ہے یا یہ مراد ہے کہ دوسری بات میں جھوٹا ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک مرد کے لعان کرتے ہی حد زنا عورت پر واجب ہو جاتی ہے لیکن جب عورت لعان کر لیتی ہے تو وہ حد ساقط ہو جاتی ہے آیت کا مفہوم یہی ہے۔ آیت میں العذاب سے مراد حد زنا ہے۔

امام شافعی نے فرمایا عورت کے لعان کرنے سے صرف ایک ہی حکم کا تعلق ہوتا ہے یعنی حد زنا ساقط ہو جاتی ہے۔ اگر مرد گواہوں سے زنا ثابت کر دے تو لعان بیکار ہے، حد زنا اس سے ساقط نہیں ہو سکتی۔ اب اگر عورت نے لعان سے انکار کر دیا تو حد زنا واجب ہو گئی۔ امام صاحب نے فرمایا اگر عورت لعان سے انکار کر دے تو اس کو قید کر دیا جائے گا اور اس وقت تک قید رکھا جائے گا کہ وہ یا تو لعان کرے یا مرد کی تصدیق کرے اگر اس نے مرد کی تصدیق کر دی تو وجوب لعان کا سبب (یعنی عورت کا

انکار) نہ رہا اس لئے لعان کا حکم باقی نہیں رہا اور نہ حد زنا کا وجوب ہو گیا کیونکہ تصدیق براہ راست بالذات اقرار نہیں ہے اس لئے اس سے حد کا وجوب نہیں ہو جاتا ہاں لعان کا حکم جاتا رہتا ہے اور اگر بالفرض تصدیق کو اقرار مان بھی لیا جائے تو ایک ہی مرتبہ حد زنا جاری کرنے کے لئے کافی نہیں ہے پھر یہ کہنا کہ یَدْرَؤُعَنْهَا الْعَذَابَ میں العذاب سے مراد حد زنا ہے یہ بات بھی بلا دلیل ہے کیونکہ قید کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے قید بھی عذاب ہے۔ بہر حال شبہ پیدا ہو گیا اور شبہات سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ :۔ اگر عورت نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ واقعی یہ بچہ شوہر کا نہیں ہے انکار ولد میں یہ سچا ہے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس صورت میں نہ لعان کا حکم باقی رہے گا نہ حد زنا ثابت ہو گی اور بچہ دونوں کا مانا جائے گا کیونکہ لعان ہو جاتا تو بچے کی نسبت پھر شوہر سے نہ ہوتی لیکن لعان نہ ہوا اور زوجین سے نسبی الحاق بچے کا حق ہے اس لئے زوجین کے کہنے سے اس حق کا ابطال نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں امام شافعی اور امام ابو حنیفہ دونوں کے قول میرے لئے تعجب خیز ہیں امام شافعی کے قول پر تو تعجب کی یہ وجہ ہے کہ ان کے نزدیک لعان (یعنی لعان کی شہادت) قسم ہے اسی لئے وہ مرد کے لئے شہادت کی اہلیت کی شرط ضروری نہیں قرار دیتے اور ہر مرد کے لئے لعان کا حکم جاری کرتے ہیں خواہ قاذف غلام ہو یا کافر یا اس سے پہلے تہمت زنا کا سزا یافتہ ہو (کیونکہ یہ سب لوگ قسم کھا سکتے ہیں گو اہل شہادت نہیں ہیں) اور ظاہر ہے کہ قسم موجب مال بھی نہیں ہو سکتی (اگر مدعی قسم کھا کر کہے کہ میرا اتنا روپیہ فلاں شخص پر قرض ہے اور مدعی علیہ انکار کرے اور مدعی کے پاس ثبوت کے گواہ نہ ہوں تو مدعی کے صرف قسم کھانے سے مال کا وجوب مدعی علیہ پر نہیں ہو جاتا) اور جب قسم سے وجوب مال نہیں ہو جاتا تو عورت کو سنگسار کرنے کا وجوب کیسے ہو سکتا ہے رجم تو ہر حد سے زیادہ سخت سزا ہے۔

امام صاحب کا قول یوں عجیب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک لعان قسم نہیں شہادت ہے اسی لئے لعان کرنے والے کے لئے شہادت کی اہلیت ان کی نظر میں ضروری ہے اور یہ بھی امام صاحب نے فرمایا کہ ایک محل میں چار شہادتیں ایک ہی شخص کی، یہ زنا کے شاہدوں کے قائم مقام ہیں زنا کے چار گواہ ہونے ضروری ہیں اس لئے شاہد نہ ہونے کی صورت میں چار بار خود شہادت دینی ضروری ہے اور یہ بھی آپ نے فرمایا کہ مرد کے حق میں یہ چار شہادتیں حد قذف کے قائم مقام ہیں اور عورت کی چار شہادتیں حد زنا کے قائم مقام ہیں پھر تعجب ہے کہ مرد کی چار مرتبہ شہادتوں کے بعد حد زنا عورت پر امام صاحب کے نزدیک کیوں واجب نہیں ہو جاتی۔ اللہ نے تو یدرؤعنها العذاب فرمایا ہے یعنی عورت کے لعان سے عذاب ساقط ہو جاتا ہے۔ دراء کا لفظ خاص ہے اس کا معنی ہے ساقط کرنا یعنی موجب عذاب نہ رہے تو عذاب ساقط ہو جاتا ہے (معلوم ہوتا ہے کہ انکار لعان کی صورت میں حد زنا کا وجوب ہو جاتا ہے اور لعان کے بعد حد زنا کا سقوط ہو جاتا ہے) عورت کے حق میں جو لعان کو حد زناء کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر عورت لعان کرلے گی تو حد زنا اس پر جاری نہ ہو گی اور لعان سے انکار کر دے گی تو حد زنا جاری ہو گی (انکار لعان کی صورت میں قید کر دینے کی سزا کہاں سے نکل سکتی ہے عورت کا لعان تو حد زنا کے قائم مقام ہے قید کے قائم مقام نہیں، پس لعان سے انکار کی صورت میں حد زنا جاری ہو جانی چاہئے)

ایک شبہ

شوہر کی چار شہادتیں اگر چار مرد گواہوں کی شہادتوں کے قائم مقام ہیں لیکن قائم مقام ہونے کا یہ معنی نہیں کہ ان سے زنا کا یقینی ثبوت ہو جاتا ہے ان چار شہادتوں کا چار گواہوں کی شہادتوں کے قائم مقام ہونا مشتبہ ضرور ہوتا ہے اس لئے حد قذف تو اس کی وجہ سے ساقط ہو جائے گی اور حد زنا ثابت نہیں ہو گی۔ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔

ازالہ

مدعی کی چار شہادتوں کا چار مردوں کی شہادتوں کے قائم مقام ہونا تو یقینی اور قطعی ہے اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہے اور حدیث سے بھی اور اجماع امت سے بھی۔ ہاں زنا کا قطعی ناقابل شک ثبوت مدعی کی چار شہادتوں سے نہیں ہوتا تو چار

گواہوں کی شہادتوں سے بھی نا قابل شک ثبوت زنا کا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ چاروں نے جھوٹی شہادت دینے پر اتفاق کر لیا ہو اور کوئی خبر بھی ایسی نہیں ہوتی کہ اس میں جھوٹی ہونے کا احتمال ہی نہ ہو۔ ہاں اگر حد تواتر تک پہنچ جائے اور خبر دینے والا منجانب اللہ معصوم ہو تو ضرور موجب یقین اور قطعیت ہو جاتی ہے۔ دو یا چار گواہوں کی شہادت پر حکام جو فیصلہ کر دیتے ہیں وہ صرف حکم شریعت کی تعمیل ہے اس سے غلبۂ ظن حاصل ہو جاتا ہے اور غلبۂ ظن کی بناء پر حاکم فیصلہ کر دیتا ہے یہ مطلب نہیں کہ اس سے حاکم کو یقین ہو جاتا ہے مگر وہ حکم شریعت کی وجہ سے معذور ہے۔

جب چار مردوں کی شہادتوں سے زنا کا ثبوت (شرعی) ہو جاتا ہے اور حد زنا جاری ہو جاتی ہے تو مدعی کا چار مرتبہ قسم کھا کر شہادت دینا تو زیادہ موجب ثبوت ہونا چاہئے۔ اس کی شہادتیں تو اتنی پختہ ہوتی ہیں کہ دروغ ہونے کی صورت میں وہ اپنے لئے اللہ کی لعنت کا خواستگار ہوتا ہے۔ پھر وہ عادل بھی ہوتا ہے فاسق نہیں ہوتا۔ شہادت کی ہر طرح اہلیت بھی رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ عورت لعان سے انکار بھی کرتی ہے۔ دیکھو چار آدمی (جھوٹ پر) اگر متفق ہو جائیں تو ناممکن نہیں ہے اور کسی عورت کا شوہر اگر اس پر زنا کی تہمت لگاتا ہے اور عورت کو یقین بھی ہے کہ اگر میں لعان کر لوں گی تو زنا کی سزا سے بچ جاؤں گی اور باوجود اس کے وہ لعان سے گریز کرتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شوہر کی تصدیق کرتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شبہ سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں تو اس سے مراد اس قسم کا شبہ نہیں ہے یہ شبہ شریعت کی نظر میں ہیچ ہے ایسا شبہ تو بہر حال باقی رہتا ہے۔ چار شخص گواہی دیدیں یا شوہر لعان کر لے اور عورت لعان سے انکار کر دے بہر حال جھوٹ کا وہم تو باقی رہتا ہی ہے۔

پس میرے نزدیک امام ابو حنیفہؒ نے شوہر کے لئے اہلیت شہادت کی جو شرط ضروری قرار دی ہے اور عورت کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اس درجہ کی ہو کہ اس پر الزام رکھنے والے کو (ثبوت نہ ہونے کی صورت میں) قذف کی سزا دی جا سکے امام صاحب کا یہ قول زیادہ صحیح اور قابل ترجیح ہے اسی طرح امام شافعی نے جو فرمایا ہے کہ اگر عورت لعان سے گریز اور انکار کرے تو اس پر حد زنا جاری کی جائے سو امام شافعی کا یہ قول اقرب الی الصحت ہے۔

مسئلہ:۔ امام شافعی کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ فقط مرد کے لعان کرتے ہی زوجین میں فرقت ہو جاتی ہے یہ قول بے دلیل ہے امام زفر امام مالک اور (ایک روایت میں) امام احمد کا قول ہے کہ جب دونوں لعان کر گزریں تو زوجین میں فرقت ہوتی ہے خواہ حاکم نے فیصلہ نہ کیا ہو لیکن امام ابو حنیفہ امام محمد، امام ابو یوسف اور (ایک روایت میں) امام احمد کا قول ہے کہ حاکم کے فیصلہ سے پہلے فرقت نہیں ہو جاتی خواہ دونوں لعان کر چکے ہوں فریقین کے لعان کر چکنے کے بعد دونوں میں تفریق کرا دینا حاکم پر واجب ہو جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک یہ فرقت ایک طلاق بائنہ ہو گی، باقی اماموں کے نزدیک طلاق بائن نہیں بلکہ اس کو فسخ نکاح قرار دیا جائے گا۔ مؤخر الذکر قول کی دلیل یہ ہے کہ حرمت رضاعت کی طرح لعان سے دوامی حرمت ہو جاتی ہے (اور اسی کا نام فسخ ہے) صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں لعان کرنے والوں (یعنی مرد اور عورت) سے فرمایا تمہارا حساب اللہ کے ذمے ہے یقینی بات ہے کہ تم دونوں میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے (مرد کو مخاطب کر کے فرمایا) اب تیری اس پر کوئی راہ نہیں (یعنی اس سے ملنے کا اب تیرے لئے کوئی راستہ نہیں رہا دوامی انقطاع ہو گیا) اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا مال (یعنی جو مہر میں نے دیا اس کا کیا ہو گا) فرمایا اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو مال (مہر) اس علت کا معاوضہ ہو گیا جو تجھے اس سے جماع کرنے کی حاصل تھی (یعنی تو اس سے قربت کر چکا مہر اس کا معاوضہ ہو جائے گا) اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو یہ مال بہت دور چلا گیا اس لئے تیرے لئے اب کوئی مال نہیں ہو سکتا۔ ابوداؤد نے حضرت سہل بن سعد کی روایت سے لعان کرنے والے مرد و عورت کے مقدمہ میں جو حدیث بیان کی ہے وہ اوپر گزر چکی ہے کہ دونوں میں (دوامی) تفریق کرا دی جائے کہ آئندہ کبھی دونوں نہ مل سکیں۔ دار قطنی نے حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔

شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعود سے اس باب میں روایات عبد الرزاق اور ابن ابی شیبہ کے مصنف میں منقول ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس کی روایت سے حضرت ہلال بن امیہ کے قصہ کے آخر میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں تفریق کرادی اور حکم دے دیا کہ عورت پر تہمت زنا قائم نہ کی جائے اور نہ اس کے بچہ کو ولد الزنا کہا جائے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے لعان کیا، لعان کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں تفریق کرادی اور بچہ کا نسب ماں سے ملا دیا۔ (لعان کرنے والے مرد کو اس کا باپ نہیں قرار دیا نہ بچہ کو ولد الزنا قرار دیا) جمہور آئمہ کے قول کی سب سے واضح دلیل وہ روایت ہے جو ہلال بن امیہ کے قصہ میں حضرت ابن عباس کے حوالے سے ابوداؤد نے سنن میں بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان کے بعد فیصلہ فرمادیا کہ (تفریق کے بعد) عورت کا نفقہ مرد پر نہیں ہے نہ رہنے کی جگہ دینا مرد کے ذمے ہے کیونکہ دونوں میں تفریق ہوئی ہے نہ عورت بیوہ ہوئی ہے کہ اس کا شوہر مر گیا ہو نہ مرد نے اس کو طلاق دی ہے، لعان کے بعد جب خود دوامی حرمت ثابت ہو گئی تو اب حاکم کی تفریق کی ضرورت نہیں۔ دوامی حرمت نکاح کے منافی اسی طرح ہے جس طرح حرمت رضاعت نکاح کے خلاف ہے اس لئے حرمت لعان کو فسخ نکاح قرار دیا جائے گا (طلاق بائنہ نہیں مانا جائے گا)

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ثبوت حرمت فسخ نکاح کا تقاضا نہیں کرتا۔ دیکھو ظہار سے حرمت ہو جاتی ہے اور نکاح فسخ نہیں ہوتا (بلکہ کفارۂ ظہار ادا کرنے کے بعد پھر حلت ہو جاتی ہے) ہاں ثبوت حرمت کے بعد شوہر بیوی کو دستور شرعی کے مطابق اپنے پاس رکھنے سے جب قاصر ہے تو اچھی طرح بحسن وخوبی عورت کو آزاد کر دینا اس پر لازم ہے اور جب اس نے ایسا نہیں کیا تو حاکم نے قائم مقام کی حیثیت سے عورت کو اس سے الگ کر دیا تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو اس کا ثبوت صحیحین کی اس روایت سے ہوتا ہے جس کے راوی حضرت سہل بن سعد ہیں کہ دونوں کے لعان کر چکنے کے بعد عویمر نے کہا یارسول اللہ ﷺ اب اگر میں نے اس کو اپنے پاس روکے رکھا (یعنی اپنے نکاح میں رکھا) تو (گویا) میں نے اس پر جھوٹی تہمت تراشی کی چنانچہ لعان کے بعد عویمر نے اس کو تین طلاقیں دیدیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے طلاق دینے کے سلسلے میں اس کے خلاف کچھ نہیں فرمایا۔

دار قطنی نے جو حضرت ابن عمر کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث نقل کی ہے کہ دونوں کو الگ الگ کر دیا جائے آئندہ یہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کا فرمان رسول ہونا محل تامل ہے شیخ ابو بکر رازی نے اس کے فرمان رسول ہونے پر نکتہ چینی کی ہے۔

صاحب تنقیح نے لکھا ہے اس کی سند جید ہے (اس لئے اس کا فرمان رسول ہونا محقق ہے) اور اس کا مفہوم بتا رہا ہے کہ صرف لعان کرنے سے دونوں الگ الگ نہیں ہو جاتے (بلکہ فرمان حاکم کی ضرورت ہے یا اس مرد کا طلاق دینا لازم ہے) امام شافعیؒ کے خلاف اس حدیث کا مفہوم ایک بڑی دلیل ہے۔

رہی حضرت ابن عباس کی یہ روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمادیا کہ مرد پر عورت کا نہ نفقہ ہے نہ مسکن اس لئے کہ دونوں بغیر طلاق کے الگ الگ ہو جاتے ہیں تو نفقہ و مسکن نہ ہونے کی یہ دلیل حضرت ابن عباسؓ کی اجتہادی رائے کا نتیجہ ہے (رسول اللہ ﷺ نے یہ دلیل بیان نہیں فرمائی) مرفوع حدیث تو صرف اتنی ہے کہ (لعان ہو چکنے کے بعد) مرد پر عورت کا نہ نفقہ ہے نہ حق سکنیٰ۔ میں کہتا ہوں لعان کے بعد حرمت ہو جانا باجماع علماء ثابت ہے۔ امام شافعی امام زفر اور دوسرے آئمہ کے نزدیک تو حرمت کا ثبوت ظاہری ہے (کہ یہ حضرات لعان کو فسخ نکاح قرار دیتے ہیں اور لعان کے بعد بغیر حکم حاکم کے فرقت واقع ہو جاتی ہے) اور امام ابو حنیفہؒ کے قول پر بھی حرمت کا ثبوت یقینی ہے ورنہ رسول اللہ ﷺ لعان کے بعد دونوں میں تفریق نہ کراتے امام صاحب خود قائل ہیں کہ لعان کے بعد قاضی دونوں میں تفریق کرادے۔

لیکن یہ حرمت دوامی ہے حرمت ظہار کی طرح نہیں ہے حرمت ظہار تو کفارہ ادا کرنے سے ختم ہو جاتی ہے اور حرمت

دوامی نکاح کے بالکل منافی ہے، ہنگامی حرمت سے تو نکاح باقی رہتا ہے (نکاح کے فائدے سے وقتی محرومی ہو جاتی ہے) اور حرمت دوامی کا معنی سوائے فسخ نکاح کے اور کچھ نہیں ہے اور جب لعان سے خود نکاح فسخ ہو گیا تو حاکم کے حکم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ابن ہمام نے خود لکھا ہے کہ امام ابو یوسف کے قول پر قضاء قاضی پر تفریق موقوف نہیں رہتی کیونکہ قضاء قاضی سے پہلے ہی حرمت باتفاق علماء ثابت ہو چکتی ہے۔

امام صاحب کا یہ قول کہ چونکہ شوہر لعان کے بعد بیوی کو دستور شرعی کے مطابق اپنے پاس روک نہیں سکتا اس لئے حاکم عورت کو آزاد کرا دینے کا فیصلہ کر دے تسریح بالاحسان کے لئے قاضی شوہر کا قائم مقام ہے یہ قول چاہتا ہے کہ لعان کے بعد قاضی شوہر کو طلاق دینے کا حکم دے۔

اگر وہ طلاق نہ دے تو قاضی تفریق کا حکم جاری کر دے اور حکم تفریق بعد الانکار جاری کرنے کا تو کوئی بھی قائل نہیں نہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق دینے کا حکم دیا (عویمر نے خود طلاق دی)

رہی یہ بات کہ حضرت ابن عباس کا قول (عورت کے لئے نہ نفقہ ہے نہ حق سکنیٰ کیونکہ بغیر طلاق کے دونوں میں تفریق ہو جاتی ہے) گو حدیث رسول اللہ ﷺ نہ ہو لیکن مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ آپ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کی حقیقت اور کیفیت سے واقف تھے (جانتے تھے کہ حضور نے عورت کو نفقہ اور سکونت کے حق سے کیوں محروم قرار دیا) باقی یہ بات کہ جب تفریق لعان سے ہی ہو گئی تو عویمر نے طلاق دینی کیوں ضروری سمجھی تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عویمر کو اس کو اس وقت تک معلوم نہ ہوگا کہ لعان سے خود تفریق ہو جاتی ہے۔

رہا مفہوم شرط کا شافعی کے نزدیک حجت ہونا تو بے شک شافعی مفہوم شرط کو حجت جانتے ہیں لیکن اس جگہ چونکہ دوامی حرمت ثابت ہے اس لئے مفہوم شرط پر عمل ترک کر دیا گیا۔

یا یوں کہا جائے کہ المتلاعنان اذا افترقا لا یجتمعان ابدا کا یہ مطلب ہے کہ جب دونوں لعان کر چکے تو دونوں جدا ہو گئے آئندہ کبھی دونوں ساتھ نہیں رہیں گے امام ابو حنیفہ کے نزدیک حدیث "المتبایعان بالخیار مالم تیفرقا" کا یہ مطلب ہے کہ جب تک ایجاب و قبول نہ ہو گیا ہو اور قولی تفریق نہ ہو گئی ہو اس وقت تک ہر شخص کو بیع نہ کرنے کا اختیار ہے۔ (یعنی اس حدیث میں امام صاحب کے نزدیک تفرق سے مراد قولی تفریق ہے پس اسی طرح حدیث اذا افترقالا یجتمعان میں افتراق قولی (یعنی قول لعان) مراد ہے۔

مسئلہ :- لعان کر چکنے کے بعد اگر شوہر خود اپنی تکذیب کرلے اور اپنے جھوٹے ہونے کا اظہار کر دے تو کیا عورت سے دوبارہ اس کا نکاح ہو سکتا ہے یہ مسئلہ اختلافی ہے۔

امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک اس کا اقرار تکذیب مان تو لیا جائے گا لیکن صرف اس حد تک کہ جھوٹی تہمت زنا لگانے سے جو ضرر اس کو پہنچتا ہے وہ پہنچ جائے گا اور جو فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ نہ پہنچے گا مطلب یہ کہ حد قذف اس پر جاری کی جائے گی اور بچہ اس کا مانا جائے گا لیکن حرمت دوامی دور نہ ہو گی اس عورت سے نکاح کبھی نہ کر سکے گا۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا (اور ایک روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول ہے) کہ حد قذف جاری کی جائے گی اور چونکہ قذف کے اقرار کے بعد وہ لعان کا اہل نہیں رہا تو لعان کو صحیح نہیں مانا جائے گا اور جو حکم (یعنی نکاح جدید نہ کر سکنے کا حکم) لعان سے وابستہ تھا وہ بھی اٹھ جائے گا اور دوبارہ نکاح کر سکے گا اسی طرح اگر کسی دوسرے شخص پر تہمت زنا لگانے کی وجہ سے اس پر حد قذف جاری کر دی گئی ہو (تو لعان کا اہل نہیں رہے گا) یہی حکم اس وقت ہو گا جب عورت زنا کر چکی ہو اور سزایاب ہو چکی ہو تو اہل لعان نہیں رہے گی۔ اس لئے ان دونوں لعان کرنے والوں کے لئے جائز ہو گا کہ (شوہر نے جب اپنی تکذیب خود کر دی تو) دونوں باہم نکاح کر لیں۔

ہم کہتے ہیں اہلیت لعان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ لعان ہوا ہی نہیں (اور جب لعان ہو گیا تو پھر تزوج کے ناجائز ہونے کا حکم جاری رہے گا) دیکھو اگر کسی نے کسی اور پر الزام زنا رکھا (اور زنا ثابت نہ کر سکا) اور اس پر حد قذف جاری کر دی گئی پھر مقذوف نے (یعنی جس پر جھوٹی تہمت زنا لگائی تھی اس نے) زنا کیا اور زنا کی سزا اس کو دیدی گئی تو باوجودیکہ زانی اہل لعان نہیں ہوتا پھر بھی اس کے قاذف کی شہادت کبھی قبول نہیں کی جائے گی (بالکل یہی صورت اختلافی مسئلہ کی ہے کہ اپنی خود تکذیب کرنے کی وجہ سے وہ اہل لعان نہیں رہا۔ لیکن جو لعان ہو چکا اس کا حکم باقی رہے گا اور کبھی لعان کرنے والی عورت سے نکاح نہ کر سکے گا)

حنفیہ کہتے ہیں کہ المتلاعنان لایجتمعان ابداً قضیہ عرفیہ ہے اور قضیۂ عرفیہ میں حکم کی بنا اتصاف پر ہوتی ہے اس صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ لعان کرنے والے جب تک صفت لعان کے ساتھ متصف رہیں گے جمع نہیں ہو سکتے (اور جب صفت لعان ختم ہو گئی تو عدم اجتماع کا حکم بھی ختم ہو گیا کیونکہ مرد نے اپنی تکذیب خود کر دی تو صفت لعان جاتی رہی اور عدم اجتماع کا حکم زائل ہو گیا) ہم کہتے ہیں یہ قضیۂ عرفیہ نہیں ہے، قضیۂ عرفیہ میں صفت موضوع پائیدار ہوتی ہے اور لعان استمراری وصف نہیں ہے اس لئے اس جگہ حکم بشرط وصف نہیں ہو سکتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس مرد و عورت نے کبھی لعان کر لیا ہو ان کا آئندہ کبھی نکاح میں اجتماع نہیں ہو سکتا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جب تک وہ لعان پر قائم رہیں اور ہر ایک دوسرے کو جھوٹا کہتا رہے تو عدم تزوج کا حکم جاری رہے گا اور جب دونوں میں سے کوئی اپنے کو جھوٹا مان لے تو تزوج باہمی جائز ہو جائے گا۔

مسئلہ :۔ اگر مرد نے کہا کہ یہ بچہ مجھ سے نہیں ہے تو قاضی (لعان کے بعد) بچہ کا نسب اس شخص سے نہیں جوڑے گا (بچہ کا باپ اس لعان کرنے والے کو نہیں قرار دے گا) اور ماں سے اس کا الحاق کر دے گا جو لوگ لعان کے بعد تفریق کے لئے حاکم کے فیصلہ کو ضروری قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک مذکور الصدر فیصلہ کے اندر ضمنی طور پر تفریق کا فیصلہ بھی ہو جائے گا (اور جو لوگ تفریق کے لئے قضاء قاضی کی ضرورت نہیں سمجھتے ان کے نزدیک بہرحال تفریق ہو جائے گی) بصورت مذکورہ لعان کے وقت مرد کو یہ الفاظ کہنا ہوں گے کہ میں نے جو اپنا بچہ ہونے کا انکار کیا ہے خدا گواہ ہے میں اس قول میں سچا ہوں عورت بھی لعان میں ان الفاظ کا اضافہ کرے گی۔

اگر عورت کے زانی ہونے اور اپنا بچہ نہ ہونے کا مرد نے اظہار کیا ہے تو لعان میں دونوں باتوں کا ذکر کرنا ہو گا، پھر بچہ کا الحاق اس کی ماں سے کر دیا جائے گا حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرد اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرا لیا۔ مرد نے اپنا بچہ ہونے کا انکار کیا تھا حضور نے دونوں میں تفریق کرا دی اور بچہ کا الحاق ماں سے کر دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

مسئلہ :۔ اگر مرد نے عورت سے کہا تیرا (یہ) حمل مجھ سے نہیں ہے تو امام ابو حنیفہ امام زفر اور امام احمد کے نزدیک لعان کا حکم نہیں دیا جائے (نہ مرد پر حد قذف جاری ہو گی نہ عورت کو زانیہ قرار دیا جائے گا) کیونکہ بچہ ہونا یقینی نہیں ہے (ممکن ہے حمل ہی نہ ہو) امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک لعان کرا لیا جائے گا امام ابو یوسف اور امام محمد نے فرمایا اگر بچہ چھ ماہ سے کم مدت میں پیدا ہو جائے گا تو لعان واجب ہو جائے گا اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ بچے کے پیدا ہونے تک لعان نہیں کرایا جائے گا اگر چھ ماہ سے کم میں بچہ ہو گیا تو لعان واجب ہو گا ورنہ نہیں۔ بعض طرق روایت میں حضرت ہلال کے قصہ میں آیا ہے کہ لعان ولادت کے بعد کیا گیا تھا۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس کی روایت سے حضرت ہلال کے قصہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ ظاہر فرما دے اور بچہ اس شخص کی شکل کے مشابہ پیدا ہوا جس کے ساتھ زنا کا الزام ہلال نے قائم کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں لعان کر دیا۔

امام مالک اور امام شافعی نے اپنے قول کی دلیل میں حسب روایت ابو داؤد بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہلال اور ان کی

بیوی کے درمیان تفریق کرادی اور فیصلہ فرمایا کہ بچے کو باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے اور نہ اس کو ولد الزنا قرار دیا جائے۔ اور نہ اس کی ماں کو متہم بالزنا کیا جائے۔
جو شخص عورت کو زنا کے ساتھ اور بچہ کو والد الزنا ہونے کے ساتھ متہم کرے اس پر حد (زنا) جاری کی جائے۔
عکرمہ نے کہا وہ بچہ مصر کا گورنر ہوا اور کسی باپ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جاتی تھی۔
اکثر طرق روایت میں آیا ہے کہ لعان کرنے کے وقت ہلال کی بیوی حاملہ تھی۔
نسائی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عجلانی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرایا، بیوی اس وقت حاملہ تھی، عبد الرزاق نے بھی یہ واقعہ اسی طرح نقل کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ شوہر نے کہا میں عفار النخل سے ہی اس (عورت) کے قریب نہیں گیا ہوں (اس لئے یہ بچہ مجھ سے نہیں ہے) عفار النخل کا یہ معنی ہے کہ شاخ تراشی کے بعد دو مہینہ تک درخت کو سینچا نہ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ ظاہر کردے چنانچہ پیدا ہوا تو بڑی بری شکل کا تھا۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکار حمل کی صورت میں لعان جائز ہے۔
اس حدیث کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ ہلال نے عورت پر زنا کا الزام قائم کیا تھا انکار حمل نہیں کیا تھا اسی لئے لعان کرایا گیا۔ وکیع کی روایت میں جو آیا ہے کہ ہلال منکر حمل تھے اس لئے انہوں نے لعان کیا تھا۔ امام احمد نے اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ وکیع کی غلطی ہے کہ انہوں نے لعان کی وجہ انکار حمل کو قرار دیا حقیقت یہ ہے کہ ہلال جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بیوی کے زنا کی انہوں نے شہادت دی تو رسول اللہ ﷺ نے لعان کرایا انکار حمل لعان کی وجہ نہیں تھی۔
میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ ہلال نے دونوں الزام قائم کئے تھے بغوی نے حضرت ابن عباس اور قتادہ کی روایت سے جو قصہ نقل کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔
اگر ہلال کی طرف سے صرف زنا کا الزام ہوتا تو رسول اللہ ﷺ (صراحت کے ساتھ) اس کی طرف بچہ کو منسوب کرنے کی ممانعت نہ فرماتے، کیونکہ زانی کے علاوہ ہلال کے تخم سے بچہ کا ہونا بھی محتمل تھا صرف نفی حمل کی وجہ سے لعان کا جواز ہلال والی حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔
اسی طرح حضرت ابن عباس نے عجلانی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرنے کا جو واقعہ بیان کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس وقت وہ حاملہ تھی اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عجلانی نے صرف انکار حمل کیا تھا (اور زنا کا الزام قائم نہیں کیا تھا) بلکہ ابن سعد نے طبقات میں حضرت عبد اللہ بن جعفر کی روایت سے عویمر کے حالات کے ذیل میں بیان کیا کہ حضرت عبد اللہ بن جعفر نے فرمایا میرے سامنے کا واقعہ ہے میں موجود تھا جب کہ عویمر بن حارث عجلانی نے اپنی بیوی پر شریک بن سحما سے زنا کرنے کا الزام قائم کیا تھا اور اس کے حمل کا بھی انکار کردیا تھا عورت حاملہ تھی رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں لعان کرادیا میں نے خود دیکھا کہ منبر کے پاس کھڑے ہوئے دونوں لعان کر رہے تھے کچھ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوا تو شریک بن سحما سے وہ بہت زیادہ مشابہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بچے کا الحاق اس کی ماں سے کردیا۔
عویمر کو اس کے خاندان والے بہت ملامت کیا کرتے تھے اور کہتے تھے ہم تو اس عورت کو نیک ہی جانتے ہیں لیکن جب بچہ شریک کا ہم شکل پیدا ہوا تو پھر لوگوں نے عویمر کو معذور سمجھا (یعنی ملامت کرنا چھوڑ دیا) بچہ دو سال زندہ رہ کر مر گیا اس کی ماں بھی اس کے کچھ دنوں بعد مر گئی اور شریک اس واقعہ کے بعد لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو گیا۔ قصہ کی یہ تفصیل دلالت کر رہی ہے کہ عویمر نے عورت کے زنا کرنے کا بھی دعویٰ کیا تھا اور حمل کا بھی انکار کیا تھا۔
صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے کہ جب شوہر نے انکار حمل کردیا اور چھ ماہ سے کم میں بچہ پیدا ہو گیا تو اس سے ثابت ہو جائے گا کہ انکار کے وقت حمل موجود تھا لہٰذا قذف محقق ہو گیا اور حد قذف سے بچنے کے لئے لعان کیا جائے گا۔

امام صاحب نے فرمایا حمل کا وجود بالفعل یقینی نہیں تو گویا انکار ولد مشروط ہوا اور مطلب یہ ہوا کہ اگر تو حاملہ ہو تو تیرا یہ حمل مجھ سے نہیں ہے اور قذف کو مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔

مسئلہ :- اگر شوہر نے یہ الفاظ کہے تو نے زنا کیا اور تیرا حمل زنا کا ہے تو بالاتفاق لعان کرنا ہوگا۔ کیونکہ صراحت کے ساتھ اس نے زنا کا ذکر کیا ہے اس صورت میں امام صاحب کے نزدیک حاکم نفی نسب کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ (یعنی یہ حکم نہیں دے گا کہ یہ بچہ تیرا نہیں ہے کسی اور کا ہے) امام شافعیؒ کا قول اس کے خلاف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بچہ کا الحاق ہلال کے ساتھ نہ کرنے کا حکم دیا تھا اور ہلال نے جس وقت عورت پر الزام لگایا تھا اس وقت وہ حاملہ تھی۔ امام صاحب نے فرمایا احکام کا اجراء تو ولادت کے بعد ہوگا۔ ولادت سے پہلے محل کا یقین نہیں۔ باقی رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حمل کا موجود ہونا رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا (اس لئے آپ نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ بچہ کا الحاق ہلال سے نہ کیا جائے)

میں کہتا ہوں امام صاحب کی یہ بات بعید از فہم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ ظاہری امور کی بنیاد پر فیصلہ فرماتے تھے تاکہ مسلمان آپ کا اتباع کریں (پوشیدہ) وحی پر آپ کے فیصلوں کی بناء نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ یہ نہ فرماتے کہ تم دونوں میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے بلکہ یقین کے ساتھ دونوں میں سے ایک کے متعلق فرما دیتے کہ تو جھوٹا یا تو جھوٹی ہے۔

مسئلہ :- اگر بچہ کے پیدا ہونے کے بعد شوہر اپنا بچہ ہونے کا انکار کر دے تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا انکار صحیح مانا جائے گا بشرطیکہ پیدا ہونے کی خبر سنتے ہی اس نے انکار کر دیا ہو اس صورت میں لعان کیا جائے گا اور اگر خبر ولادت سنتے ہی کچھ نہیں کہا بعد کو انکار نسب کیا تو نسب ثابت مانا جائے گا (انکار صحیح نہ ہوگا) اور (قذف کی وجہ سے) لعان کرنا ہوگا۔

امام صاحب نے فرمایا مبارک باد کے وقت اس نے اگر انکار نسب کر دیا تو انکار صحیح مانا جائے گا۔ (ظاہر روایت کے اعتبار سے) تعیین مدت کے سلسلہ میں امام صاحب کا قول نہیں آیا۔ ابواللیث کی روایت میں آیا ہے کہ امام صاحب نے تین روز کی مدت (انکار کے لئے) مانی ہے۔ حسن کی روایت میں سات روز کا لفظ آیا ہے صاحبین کے نزدیک پوری مدت نفاس انکار کی مدت ہے ظاہر قیاس کا تقاضا ہے کہ فوراً ولادت کی خبر سن کر اگر انکار نسب کر دیا ہو تو مانا جائے اور کچھ وقفہ خاموشی میں گزر گیا ہو تو پھر انکار کو صحیح نہ قرار دیا جائے کیونکہ (موقع اظہار میں) خاموشی رضامندی کی علامت ہے لیکن دقیق قیاس (استحسان) کا فیصلہ ہے کہ اس کو سوچنے اور غور کرنے کی کچھ مدت ملنی چاہئے بغیر غور کئے اگر انکار نسب کر دے گا (اور واقع میں وہ بچہ اس کا ہوگا) تو یہ حرام ہے اور اگر دوسرے کا بچہ ہے اور اسکو وہ اپنا بچہ قرار دے دے گا تو یہ بھی حرام ہے (اپنے بچے کا باپ کسی دوسرے کو قرار دینا یا دوسرے بچے کا باپ اپنے کو ظاہر کرنا دونوں کبیرہ گناہ ہیں)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے جس عورت نے کسی دوسری قوم کے آدمی کو اپنی قوم میں شامل کیا (یعنی کسی دوسرے شخص سے زنا کرنے کے بچہ کو اپنے شوہر کا بتایا) وہ اللہ کی رحمت سے خارج ہو گئی اور اللہ قیامت کے دن اس کو جنت میں داخل نہیں فرمائے گا اور جس مرد نے دیدہ و دانستہ اپنے بچہ کا باپ ہونے سے انکار کر دیا تو اللہ قیامت کے دن اس سے پردہ کرے گا (اللہ کا دیدار اسے میسر نہ ہو گیا) اور اگلے پچھلوں کے سامنے اس کو رسوا کرے گا۔ رواہ ابوداؤد والنسائی والشافعی وابن حبان والحاکم۔ دارقطنی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابوبکرہ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام (کے دور) میں کسی نے غیر باپ کو اپنا باپ قرار دیا اور وہ واقف بھی ہے کہ جس شخص کی طرف وہ اپنے باپ ہونے کی نسبت کر رہا ہے وہ اس کا باپ نہیں ہے تو جنت اس پر حرام ہے۔

مسئلہ :- اگر بچے کی پیدائش کے وقت مرد کہیں غائب تھا تو واپس آنے کے بعد کی مدت کا اعتبار کیا جائے گا۔ صاحبین کے نزدیک اتنی مدت غور کرنے کے لئے دی جائے گی جتنی مدت نفاس کی ہوتی ہے اور امام صاحب کے نزدیک مدت مبارک باد

کی برابر مدت تامل کے لئے کافی ہے۔

مسئلہ :- اگر شوہر کو اپنی بیوی کے زنا کا یقین ہو گیا یا زید سے زنا کرنے کی خبر مشہور ہونے کی بناء پر پختہ گمان ہو گیا اور تائیدی قرینہ بھی موجود ہے (مثلاً) شوہر نے زید کو اس عورت کے ساتھ تنہائی میں دیکھ لیا تو اس صورت میں وہ عورت پر زنا کا الزام قائم کر سکتا ہے یا اگر عورت کے کوئی بچہ پیدا ہوا اور اس نے بیوی سے قربت ہی نہیں کی اس لئے اس کو یقین ہو گیا کہ یہ بچہ مجھ سے نہیں ہے تو انکار ولدیت کرنا جائز ہے۔ یا قربت تو کی تھی لیکن وقت قربت سے ابھی چھ مہینے گزرنے نہیں پائے تھے کہ بچہ ہو گیا یا دو سال گزرنے کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ ان سب صورتوں میں بچے سے انکار کر دینا اس کے لئے جائز ہے ہاں اگر چھ ماہ سے اوپر دو سال کے اندر بچہ پیدا ہوا یا حیض نہ آنے کی وجہ سے استبراء رحم نہیں ہوا تو اس صورت میں بچہ کی ولدیت سے انکار ناجائز ہے اور حیض آنے کے وقت سے اگر چھ ماہ سے زیادہ عرصہ کے بعد بچہ پیدا ہوا تو بچہ کو اپنانے سے انکار جائز ہے۔

مسئلہ :- اگر جماع کیا یا عزل کیا یا عورت کے زنا کرنے کا اس کو (یقینی) علم ہو گیا اور اس بات کا احتمال ہے کہ بچہ اسی کا ہو یا زانی کا ہو تو اپنا بچہ ہونے کا انکار حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ اور (اے امت محمد) اگر تم پر اللہ کا فضل ورحمت نہ ہوتی۔

وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيۡمٌ ۝۱۰ اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (تو اللہ تم کو رسوا کر دیتا اور دنیا میں ہی فوری عذاب دیدیتا)

تواب (لوٹنے والا) ہے یعنی جو شخص پشیمان ہو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی کا طلبگار ہوتا ہے اللہ اپنی رحمت کے ساتھ اس کی طرف التفات فرماتا اور لوٹتا ہے حکیم ہے یعنی جو حدود وغیرہ اللہ نے تم پر فرض کی ہیں وہ ان کی حکمت سے واقف ہے۔

شیخین وغیرہ نے بروایت زہری بوساطت عروہ بن زبیر وسعید بن میتب وعلقمہ بن وقاص وعبید اللہ بن عتبہ بن مسعود ام المومنین حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ بیان اس وقت دیا تھا جب تہمت تراشوں کے الزام سے اللہ نے حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی ظاہر فرما دی۔

زہری نے کہا مجھ سے متعدد اہل حدیث نے یہ قصہ بیان کیا۔ بعض نے کم بعض نے زیادہ لیکن ہر ایک کا بیان دوسرے کے بیان کی تائید کرتا ہے عروہ کی روایت میں حضرت عائشہ کا بیان حسب ذیل آیا ہے۔ ام المومنین نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ اندازی کرتے تھے جس بی بی کا نام نکل آتا اس کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک جہاد[1] پر آپ تشریف لے جانے لگے تو حسب معمول قرعہ اندازی کی میرا نام نکل آیا۔ مجھے آپ نے ساتھ لے لیا یہ واقعہ پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ میں ہودج میں سوار ہوئی میرا ہودج ہی اٹھا کر (اونٹ پر) رکھا جاتا تھا اور نیچے اتارا جاتا تھا (مجھے باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی) اس طرح ہم مدینے سے چل دیئے۔ جب جہاد سے فارغ ہو کر واپس ہوئے اور مدینے کے قریب پہنچ کر ایک جگہ اترے رات کو کوچ کرنے کا اعلان ہوا۔ میں (رفع ضرورت کو جانے کے لئے) اٹھی اور چل کر لشکر سے آگے نکل گئی۔ ضرورت سے فارغ ہو کر جب اپنے مقام پر پہنچی اور سینہ کو ٹٹولا تو عقیق[2] یمنی کا جو ہار میں پہنے تھی وہ ٹوٹ کر کہیں گر گیا۔ میں ہار کو ڈھونڈنے کے لئے فوراً لوٹ پڑی۔ ہار کی تلاش میں مجھے دیر ہو گئی میرے ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر رکھنے والے لوگ آئے اور یہ خیال کر کے کہ میں ہودج کے اندر ہوں خالی ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا۔ اس زمانہ میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں بھاری نہیں ہوتی تھیں ان پر گوشت نہیں چڑھا ہوتا تھا کھانا تھوڑا کھاتی تھیں اس لئے لوگوں نے ہودج کی خفت محسوس نہ کی۔ پھر میں تو کم سن لڑکی ہی تھی انہوں نے ہودج کو اونٹ پر لاد دیا اور اونٹ کو کھڑا کر کے چل

---

[1] یعنی غزوۂ بنی مصطلق جو ۶ ہجری میں ہوا۔ [2] جزع اظفار۔ اظفار ایک قسم کی خوشبو ہوتی ہے صحیح روایت میں ظفار آیا ہے ظفار یمن میں ایک شہر کا نام تھا جزع ظفار سے یمنی پوتھ یعنی عقیق یمنی مراد ہے۔

دیئے لشکر کے روانہ ہونے کے بعد مجھے ہار مل گیا۔ پڑاؤ پر واپس آئی تو وہاں کوئی بھی نہ تھا پڑاؤ بالکل خالی تھا مجبوراً میں اپنی فرودگاہ پر ہی رک گئی اور خیال کیا کہ جب لوگ مجھے نہ پائیں گے تو لوٹ کر ضرور آئیں گے۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آ گئی اور میں سو گئی۔

صفوان بن معطل سلمی ذکوانی نے لشکر سے پیچھے بہت دور قیام کیا تھا (کیونکہ لشکر کی کوئی گری پڑی چیز تلاش کرنے اور نگرانی رکھنے پر ان کو مامور کیا گیا تھا) وہ رات کے آخری حصہ میں اپنی فرودگاہ سے (حسب الحکم) روانہ ہوئے اور صبح کو میری فرودگاہ پر پہنچ گئے انہوں نے دیکھا کہ کوئی سو رہا ہے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا کیونکہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ میں ان کے پڑھنے کی آواز سے بیدار ہو گئی اور اپنا چہرہ چادر سے ڈھانک لیا خدا کی قسم انہوں نے مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی اور سوائے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کے اور کوئی لفظ میں نے ان سے نہیں سنا اپنی اونٹنی انہوں نے میرے پاس لا کر بٹھا دی اور اس کا دھنگنا باندھ دیا۔ میں اٹھ کر اونٹنی پر سوار ہو گئی وہ مہار پکڑے ہوئے آگے آگے چلتے رہے ہمارا لشکر ٹھیک دوپہر کے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا تھا میں۔

اس طرح لشکر تک پہنچ گئی۔ میرے معاملہ میں جس (تہمت تراش) کو ہلاک ہونا تھا وہ (غلط افواہیں پھیلا کر) مارا گیا۔ اس تہمت تراشی کا سب سے بڑا ذمہ دار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا میں مدینے پہنچ کر بیمار ہو گئی اور ایک مہینہ بیمار رہی لوگ الزام تراشوں کی باتوں میں مشغول تھے۔ بیماری کے زمانے میں مجھے پتہ نہیں تھا صرف یہ بات میرے لئے ضرور پریشان کن اور شبہ پیدا کرنے والی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا وہ التفات میری طرف نہ تھا جو میری بیماری میں پہلے ہوا کرتا تھا۔ بس اتنی بات ہوتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ (حسب معمول) آتے اور سلام علیک کرتے اور فرماتے تم لوگ کیسے ہو پھر واپس چلے جاتے اس سے مجھے شبہ ہوتا پریشانی ہوتی۔ لیکن راز کا پتہ نہ تھا۔ جب میں اچھی ہو گئی مگر کمزور تھی تو ایک رات کو ام مسطح کو ساتھ لے کر میں مناصع کی طرف جانے کے لئے نکلی پہلے ہمارے گھروں کے پاس بیت الخلاء بنے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ رفع ضرورت کے لئے رات کو ہم جنگل کی طرف عربوں کے پہلے رواج کے مطابق جایا کرتے تھے ہم کو گھروں کے قریب ٹٹیاں بنانے سے (بدبو سے) ایذا ہوتی تھی۔ (مسطح کی ماں ابورہم بن عبد مناف کی بیٹی تھی اور مسطح کی نانی صخر بن عامر کی بیٹی تھی صخر کی بیٹی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خالہ تھی اور اس کا بیٹا مسطح بن اثاثہ تھا) غرض میں اور ام مسطح دونوں ساتھ ساتھ ضرورت سے فارغ ہو کر گھر کی طرف کو لوٹے، ام مسطح کا پاؤں چادر میں الجھ گیا اور اس نے ٹھوکر کھائی گرتے ہی اس کے منہ سے نکلا مسطح مرے، میں نے کہا تم نے یہ بہت بری بات کہی کیا تم ایسے شخص کو کوس رہی ہو جو بدر میں شریک تھا۔ ام مسطح نے کہا بیٹی کیا تم نے اس کی بات نہیں سنی۔ میں نے کہا اس نے کیا کہا۔ اس پر ام مسطح نے مجھے تہمت تراشوں کی کہی ہوئی بات بتائی۔ اس بات کو سن کر میری بیماری اور بڑھ گئی جب گھر لوٹ کر آئی اور رسول اللہ ﷺ (حسب معمول) تشریف لائے اور دریافت کیا آپ لوگ کیسے ہیں تو میں نے کہا کیا آپ کی اجازت ہے میں اپنے والدین کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ مجھے یقینی خبر ماں باپ سے مل جائے گی۔ آپ نے اجازت دیدی میں والدین کے گھر پہنچی اور اپنی والدہ سے پوچھا اماں لوگ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں والدہ نے کہا بیٹا تم اس کا رنج نہ کرو جب کوئی عورت کسی شوہر کی نظر میں چہکیلی ہوتی ہے اور شوہر اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی سوکنیں بھی ہوتی ہیں تو سوکنیں اس کے خلاف بڑی بڑی باتیں بناتی ہیں میں نے کہا سبحان اللہ لوگ یہ باتیں کہہ رہے ہیں، میں اس خبر کو سن کر رات بھر روتی رہی صبح تک نہ میرا آنسو تھما نہ نیند آئی پھر صبح کو بھی روتی رہی۔

ادھر رسول اللہ ﷺ نے علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید کو مشورہ کے لئے بلایا کیونکہ وحی آنے میں دیر ہو گئی تھی (مدت سے وحی نہیں آئی تھی) اسامہ رسول اللہ ﷺ کی بیوی کی پاک دامنی سے واقف تھے انہوں نے پاک دامن ہونے کا ہی مشورہ دیا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ اسامہ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں کی محبت تھی اسی کے مطابق انہوں نے مشورہ دیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ آپ کی بیوی ہیں اور ہم تو ان کو اچھا ہی جانتے ہیں لیکن علی نے کہا آپ کے لئے اللہ

نے کوئی تنگی نہیں رکھی ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔ آپ خادمہ سے دریافت کریں وہ سچ سچ کہہ دے گی رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا کیا تو نے عائشہ کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہے جس سے تیرے دل میں کچھ شک گزرا ہو بریرہ نے کہا قسم ہے اسکی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے عائشہؓ کی کوئی بات ایسی نہیں دیکھی کہ میں نکتہ چینی کر سکوں ہاں بس اتنی بات ضرور ہے کہ وہ چونکہ کم سن لڑکی ہے سو جاتی ہے آٹا گوندھا ہوا رکھا رہتا ہے بکری آتی ہے اس کو کھا جاتی ہے۔ اس تحقیقات کے بعد رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور عبد اللہ بن ابی کی طرف سے معذرت پیش کرنے کے خواستگار ہوئے اور فرمایا اے گروہ اہل اسلام میرے گھر والوں کے معاملہ میں عبد اللہ بن ابی کی ذات سے مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے کیا کوئی اس کی طرف سے میرے سامنے کوئی عذر پیش کر سکتا ہے خدا کی قسم مجھے اپنی بیوی کے متعلق (کوئی بری بات نہیں معلوم ہوئی) اچھائی ہی معلوم ہوئی لوگ ایک ایسے آدمی کا نام لے رہے ہیں جس کے اندر مجھے کوئی برائی معلوم نہیں ہے (وہ اچھا ہی ہے) اور وہ میرے گھر کے اندر میرے ساتھ ہی جاتا ہے۔ (تنہا نہیں جاتا) یہ سن کر سعد بن معاذ اشہلی کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (اگر آپ کی طرف سے تہمت تراش کو کچھ دکھ پہنچ جائے تو) میں آپ کو معذور جانتا ہوں اگر وہ اوس کے قبیلہ میں ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہے تو آپ جو حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ یہ بات سنکر قبیلہ خزرج کا ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا حسان کی ماں اس شخص کے چچا کی بیٹی تھی۔ یعنی سعد بن عبادہ سردار خزرج کھڑے ہوئے پہلے یہ نیک آدمی تھے لیکن قبیلہ کی حمیت ان پر سوار ہو گئی اور سعد بن معاذ سے کہنے لگے خدا کی قسم تم نے جھوٹ کہا تم نہ اس کو قتل کرو گے نہ اس کو قتل کرنے کی تم میں ہمت ہے اور اگر تمہارے قبیلہ والوں میں سے وہ ہوتا تو میرے خیال میں تم اس کو قتل کرنے کا ارادہ ہی نہ کرتے اس پر سعد بن معاذ کے چچازاد بھائی اسید بن حضیر نے سعد بن عبادہ سے کہا تم نے خدا کی قسم جھوٹ کہا ہم اس کو ضرور بالضرور قتل کر دیں گے۔ تم یقیناً منافق ہو منافقوں کی طرف سے لڑتے ہو اس کے بعد اوس اور خزرج دونوں قبیلے جوش میں آگئے قریب تھا کہ آپس میں لڑ پڑیں رسول اللہ ﷺ منبر پر موجود تھے آپ سب کو ٹھنڈا کر رہے تھے آخر سب خاموش ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں اس روز بھی دن بھر روتی رہی اور رات بھر بھی روتی رہی اور رات بھر بھی میرا آنسو نہ تھمانہ نیند آئی والدین کو اندیشہ ہو گیا کہ روتے روتے میرا جگر نہ پھٹ جائے۔ دونوں حضرات میرے پاس بیٹھے ہی ہوئے تھے اور میں رو رہی تھی کہ ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت طلب کی میں نے اجازت دیدی وہ آکر بیٹھ گئی اور میرے ساتھ رونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے جب سے میرے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوئی تھیں رسول اللہ ﷺ میرے پاس نہیں بیٹھے تھے اور ایک مہینہ کا وقفہ گزر چکا تھا اس عرصہ میں میرے معاملے کے متعلق کوئی وحی بھی نہیں آئی تھی بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ نے اول کلمہ شہادت پڑھا، پھر فرمایا عائشہ مجھے تیرے متعلق ایسی ایسی خبریں پہنچی ہیں اگر تو ان سے پاک ہے تو اللہ تیری پاکی ظاہر فرمادے گا اور اگر تو اتفاقاً کسی گناہ میں مبتلا ہو گئی ہے تو اللہ سے توبہ و استغفار کر، بندہ جب گناہ کا اقرار کر لیتا ہے اور معافی کا طلبگار ہوتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنی بات پوری کر چکے تو میرے آنسو تھم گئے کہ ایک قطرہ بھی نکلتا مجھے محسوس نہ ہوا پھر میں نے اپنے والد سے کہا رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دیجئے، والد نے کہا خدا کی قسم مجھے کوئی جواب معلوم نہیں کیا جواب دوں پھر میں نے اپنی والدہ سے یہی بات کہی کہ آپ جواب دیجئے انہوں نے بھی والد کی طرح یہی کہا کہ میں کیا کہوں مجھے کوئی جواب معلوم نہیں آخر میں نے خود کہا (اس وقت میں نو عمر لڑکی تھی زیادہ قرآن بھی نہیں پڑھا تھا) خدا کی قسم میں جان گئی کہ تم لوگوں نے یہ بات سنکر اپنے دلوں میں جمالی ہے اور اس کو سچ ماننے لگے ہو، اب اگر میں کہوں کہ میں اس سے پاک ہوں اور خدا جانتا ہے کہ میں اس سے پاک ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے (اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتی) مجھے اپنی اور تمہاری حالت کی سوائے اس کے اور کوئی مثال نہیں ملتی جو یوسفؑ کے باپ نے کہا تھا فصبر جمیل واللّٰہ المستعان علی ماتصفون (پس میں یہی کہتی ہوں) یہ کہنے کے بعد میں نے منہ موڑ

لیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ چونکہ میں پاک ہوں اللہ ضرور میری پاکی کا اظہار فرما دے گا۔ لیکن میرا یہ گمان بھی نہ تھا کہ میرے معاملے میں اللہ کوئی ایسی وحی نازل فرمائے گا جو (ہمیشہ قرآن میں) پڑھی جائے گی۔ میرے دل میں میری حالت اس قابل نہ تھی کہ اللہ اس کے سلسلہ میں اپنا کلام نازل فرماتا جو (ہمیشہ) پڑھا جائے گا۔ مجھے تو یہ امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی طرف سے میری پاک دامنی کا کوئی خواب دکھا دیا جائے گا۔

خدا کی قسم رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہ تھے اور نہ کوئی گھر والا باہر نکلا تھا کہ اللہ نے اپنے نبی پر وحی نازل فرما دی اور نزول وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ پر جو تکلیف ہوتی تھی وہ ہونے لگی سخت سردی کے زمانے میں نزول وحی کے وقت چاندی کے موتیوں جیسے پسینے کے قطرے آپ کی پیشانی سے ٹپکے لگتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد وحی کی وہ حالت دور ہوئی اور ہنستے ہوئے جو لفظ آپ نے سب سے پہلے اپنے منہ سے نکالا وہ یہ تھا۔ عائشہؓ خوش ہو جا۔ اللہ نے تیری پاک دامنی کا اظہار کر دیا، میری ماں نے کہا اٹھ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا خدا کی قسم میں نہ اٹھ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف جاؤں گی۔ نہ اللہ کے سوا کسی کا شکر کروں گی۔ اللہ نے میری پاکی ظاہر فرمائی ہے اللہ نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرمائیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ جو لوگ طوفان لائے وہ تمہاری ہی ایک جماعت ہے۔

یہ دس آیات ہیں افک، انتہائی درجہ کا جھوٹ، افک کا لغوی معنی ہے موڑ دینا الٹ دینا، حضرت عائشہؓ پر تہمت کو افک اس وجہ سے فرمایا کہ آپ اپنی پاک دامنی اور شرافت نفس کی وجہ سے تعریف اور دعا کی مستحق تھیں صدیق اکبرؓ کی بیٹی تھیں رسول اللہ ﷺ کی بیوی تھیں۔ مسلمانوں کی ماں تھیں ہر طرح کی تعظیم و تکریم آپ کی واجب تھی پس اس کے برعکس جس نے آپ کے اوپر تہمت لگائی اس نے (گویا) حقیقت کو ہی الٹ دیا یہ قلب حقیقت ہو گیا۔

عصبة دس سے چالیس تک کے آدمیوں کی جماعت اس کا کوئی واحد نہیں کذا فی النہایۃ۔

منکم یعنی مسلمانوں میں سے۔

بخاری وغیرہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں (ام المومنین) زینب بنت جحش کو ان کی دینداری کی وجہ سے اللہ نے (اس تہمت تراشی سے) بچائے رکھا۔ انہوں نے سوائے کلمہ خیر کے اور کچھ نہیں کہا لیکن ان کی بہن حمنہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گئی (یعنی تہمت تراشی کرنے والوں کی ہمنوا بن گئی) یہ باتیں کرنے والے مسطح، حسان بن ثابت اور عبد اللہ بن ابی منافق تھے۔ عبد اللہ بن ابی ہی ایسی باتیں نکال کر لاتا اور جمع کرتا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے عروہ نے اہل افک میں صرف حسان بن ثابت مسطح بن اثاثہ، اور حمنہ بنت جحش کے نام دوسرے لوگوں کے ساتھ ذکر کئے۔ مجھے باقی لوگوں کے نام معلوم نہیں۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ایک جماعت تھی جیسا کہ اللہ نے عصبة منکم فرمایا ہے (اور عصبہ دس سے کم کو نہیں کہتے)

عروہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ کو پسند نہ تھا کہ آپ کے سامنے حضرت حسان کو برا کہا جائے آپ فرماتی تھیں حسان کا ہی تو یہ شعر ہے ؎

فان ابی ووالدتی و عرضی لعرض محمد منکم وقاء

میرے ماں باپ اور میری آبرو تم سے محمد کی آبرو کو بچانے والے ہیں

یعنی حضور ﷺ کی آبرو پر میرے والدین اور آبرو قربان۔

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ تم اس بات کو اپنے لئے برا نہ سمجھو یہ تو تمہارے لئے بہتر ہے۔

لا تحسبوہ کا خطاب رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کو ہے حضرت عائشہؓ پر عیب لگانے کا رنج رسول اللہ ﷺ کو تھا اور تمام مسلمانوں کو بھی تھا۔ حضرت عائشہؓ تمام مسلمانوں کی ماں تھیں۔

خیر لکم تمہارے لئے بہتر ہے۔ اسی سلسلے میں اللہ کے احکام تم کو ملے۔ تمہاری عزت عند اللہ کا اظہار ہوا۔ حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی اور عظمت شان کے اظہار کے لئے اللہ نے اپنے رسول پر آیات نازل فرمائیں۔ جن تہمت تراشی کرنے والوں نے یہ باتیں کیں اللہ نے ان کے لئے ہولناک وعید نازل فرمائی اور یہ تمام آیات قیامت تک محرابوں اور نمازوں میں پڑھی جائیں گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ ان میں سے ہر شخص کے لئے وہی گناہ ہے جو اس نے کمایا یعنی جس نے جتنا گناہ کیا اتنی سزا اس کے لئے مقرر ہے کسی نے خود الزام تراشی کی کسی نے اس کو پھیلانا پسند کیا۔ کسی نے دوسرے سے سن کر خود بھی بیان کرنا شروع کر دیا۔ کوئی صرف ہنس دیا زبان سے کچھ نہیں کہا اور کوئی سن کر خاموش رہا تردید نہیں کی۔ غرض جتنا گناہ کیا اتنی سزا اس کے لئے مقرر ہے۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عائشہ پر تہمت تراشی کی تھی رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک (پر حد قذف جاری کی ہر ایک) کو اسّی اسّی کوڑے لگوائے میں کہتا ہوں سزائے تازیانہ اور دنیا میں رسوائی تو ان کی دنیوی سزا تھی اور آخرت میں جتنی سزا اللہ کو منظور ہوگی مل جائے گی۔

وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١﴾ اور ان میں سے جس نے اس طوفان میں بڑا حصہ لیا اس کو سخت سزا ہوگی۔

یعنی جس نے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں اور مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لئے یہ طوفان سب سے پہلے اٹھایا اور اس کو پھیلایا اس کو سخت عذاب دیا جائے گا۔

زہری نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا اور عذاب عظیم سے مراد ہے دوزخ کا عذاب۔

ابن ابی ملیکہ نے بروایت عروہ قصۂ افک کے ذیل میں حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ ام المومنین نے فرمایا پھر میں سوار ہوگئی۔ صفوان نے اونٹ کی مہار پکڑلی (اور مہار پکڑے آگے آگے چلنے لگے) چلتے چلتے منافقوں کی ایک جماعت کی طرف سے ہمارا گزر ہوا منافقوں کا قاعدہ تھا کہ (مسلمانوں کے عام) لشکر سے الگ اپنا پڑاؤ کرتے تھے (ان کی فرودگاہ عام مسلمانوں کی فرودگاہ سے الگ ہوتی تھی) منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی کہنے لگا یہ عورت کون ہے۔ ساتھیوں نے جواب دیا عائشہ ہے عبداللہ بولا خدا کی قسم یہ اس سے نہیں بچی اور نہ وہ اس سے بچا تمہارے نبی کی بیوی رات بھر ایک مرد کے ساتھ رہی۔ پھر صبح ہوئی تو وہ شخص آگے آگے چلنے لگا۔ بعض کا قول ہے کہ الذی تولی کبرہ سے چار شخص مراد ہیں۔ عبداللہ بن ابی بن سلول حسان بن ثابت مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش۔ یہ قول کمزور ہے اگر ایسا ہوتا تو والذی تولی بجائے والذین تولوا (بصیغۂ جمع) ہوتا اس کے علاوہ مسطح اور حسان تو بدری تھے بدر میں شریک تھے اور شرکاء بدر کے تمام اگلے پچھلے گناہ اللہ نے معاف فرما دیئے ہیں (اس لئے ان پر آخرت میں عذاب عظیم نہیں ہو سکتا)

رسول اللہ ﷺ نے اہل بدر سے فرما دیا تھا جو چاہو کرو اللہ نے تم کو بخش دیا ہے۔ اللہ نے تمام (مخلص) صحابیوں کے متعلق فرمایا ہے وکلا وعد اللہ الحسنیٰ اور ہر ایک کے لئے اللہ نے جنت کا وعدہ کر لیا ہے۔ (اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عذاب نہ ہوگا ممکن ہے عذاب کے بعد جنت میں داخلہ ہو)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الذی تولی سے حسان مراد ہیں۔ بخاری نے مسروق کا بیان نقل کیا ہے۔ مسروق نے کہا میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا حسان بن ثابت اس وقت ام المومنین کے پاس موجود تھے اور حضرت عائشہؓ کی شان

میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

حصان رزان ما تزن بریبة وتصبح غرثی من لحوم الغوافل

وہ بڑی پاک دامن اور بڑی باوقار ہیں۔ کسی شبہ کی بات سے متہم نہیں کی جاسکتیں ان کا پیٹ بے خبر بھولی عورتوں کے گوشت سے خالی رہتا ہے (یعنی کسی کی غیبت نہیں کرتیں)

ام المومنین نے فرمایا مگر تم ایسے نہیں ہو۔ مسروق کہتے ہیں میں نے ام المومنین سے عرض کیا آپ ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں۔ اللہ نے تو فرمادیا ہے وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ام المومنین نے فرمایا نابینا ہو جانے سے سخت عذاب اور کیا ہوگا یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے (اپنے اشعار میں) دفاع کیا کرتے تھے یعنی جب مشرک رسول اللہ ﷺ کی ہجا کرتے تھے تو یہ مشرکوں کی ہجو کرتے تھے۔ مسروق کے اس بیان کی روشنی میں عذاب عظیم سے مراد دنیوی عذاب ہی ہوگا لیکن اول تفسیر ہی صحیح ہے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا

جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے (یعنی اپنے بھائیوں کے) متعلق نیک گمان کیوں نہیں کیا۔

اذسمعتموہ یعنی جب تم نے یہ خبر سنی تھی تو اپنے دینی بھائیوں کے متعلق نیک گمان کیوں نہیں رکھا۔ دوسرے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو۔ انفسھم (یعنی اپنی ذات) سے تعبیر کیا کیونکہ تمام مومنوں بلکہ ہر مذہب کے علمبردار آپس میں ایک ذات کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض دوسری آیات میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ وغیرہ۔ آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ ایمان کا تقاضا ہے تمام مومنوں کے متعلق اچھا گمان رکھنا۔ ان پر نکتہ چینی کرنے سے باز رہنا جو لوگ مومنوں کی عیب چینی کریں ان کا دفاع اس طرح کرنا جس طرح اپنی ذات کے خلاف حرف گیری کے وقت کیا جاتا ہے (خلاصہ یہ کہ تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی اپنی ذات کی طرح سمجھنا ایمان کا تقاضا ہے)

وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾ اور کیوں (نہیں) کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔

ایمان تو مدح اور تعظیم کا سبب ہے جو شخص اہل ایمان پر طعن و تشنیع کرتا ہے وہ گویا حقیقت ہی کو الٹ دیتا ہے اور تہمت تراشی اور غیبت کی وجہ سے فاسق گناہ گار ہو جاتا ہے اور فاسق کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔

مسئلہ:- اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق حسن ظن رکھنا واجب ہے جب تک کوئی شرعی دلیل اس کے خلاف موجود نہ ہو ہر مومن کے متعلق اچھا خیال رکھنا لازم ہے۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ اپنے قول کے ثبوت کے لئے چار گواہ کیوں نہیں لائے کہ ان کی شہادت کے بعد حد زنا جاری کی جاتی۔

فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ پس جب گواہ نہ لائے تو اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں کہ انہوں نے جو زنا کی خبر کا تذکرہ کیا وہ بہ نیت ثواب کیا (اللہ کی قائم کی ہوئی حد جاری کرانے کی کوشش باعث ثواب ہے) اگر کوئی کسی پر زنا کا الزام قائم کرے اور اتنے گواہ بھی پیش کردے جو زنا کی سزا جاری کرنے کے لئے کافی ہوں تو ممکن ہو اس کی نیت بخیر ہو وہ اللہ کی نافرمانی سے لوگوں کو روکنا چاہتا ہو لیکن ضروری شہادت پیش نہ کر سکے تو اس صورت میں کسی پر زنا کا الزام لگانے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ایک مسلمان کو بدنام کرنا چاہتا ہے حد شرعی قائم کرانا نہیں چاہتا اس حالت میں اگر وہ شرعی سزا قائم کرانے کی نیت کا دعویٰ کرتا ہے تو عند اللہ جھوٹا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے عند اللہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کی رو سے جھوٹے ہیں ان پر تہمت زنا

کی حد جاری کی جائے گی اس وقت آیت کا پورا مطلب یہ ہو گا کہ جب وہ چار گواہ نہ پیش کر سکے تو ان کو تہمت زنا لگانے کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ حکم شریعت کے لحاظ سے وہ جھوٹے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے چار آدمیوں پر حد قذف جاری کی عبداللہ بن ابی، حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اور اگر دنیا اور آخرت میں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو جس حرکت میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہو جاتا۔

یعنی اے مسلمانو! اگر نبی ﷺ کی وجہ سے تم پر اللہ کا کرم نہ ہوتا اور دنیا میں طرح طرح کی نعمتیں وہ اپنی رحمت سے نہ دیتا (بجملہ دوسری نعمتوں کے ایک اسلام کی توفیق اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا میسر آجانا بھی ہے جس کی وجہ سے عذاب کے نزول میں رکاوٹ ہوئی اور توبہ کا وقت مل گیا) اور آخرت میں اللہ کی رحمت تم پر نہ ہوتی (کہ اس نے عفو و درگزر اور جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرما لیا ہے) تو جس نازیبا اور پر معصیت مشغلہ میں تم گھس گئے تھے اس کی وجہ سے دنیا و آخرت میں تم پر بڑا عذاب آجاتا۔

افاضہ کسی کام میں گھس جانا بعض کے نزدیک افاضہ کا معنی ہے پھیلانا، خبر مستفیض مشہور خبر کو کہتے ہیں۔

لمسکم تو ضرور تم کو لگ جاتا جیسے دنیا میں عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب پر عذاب آیا کہ ان کی جڑیں ہی اکھڑ گئیں۔

یہ آیت ان مومنوں کے متعلق ہے جو تھے تو اہل افک کے ساتھ مگر مومن تھے منافق نہ تھے۔ اور آیت والذی تولی کبرہ منھم لہ عذاب عظیم میں صرف منافق مراد ہیں جن میں سے عبداللہ بن ابی بھی اور زید بن رفاعہ جیسے لوگ بھی تھے۔

آیت میں لولا کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ کے فضل و رحمت کی وجہ سے ان مومنوں پر عذاب نہ آیا جو افواہ میں شریک ہو گئے تھے کیونکہ لولا کا مفہوم ہے کسی چیز کا وجود میں نہ آنا کسی دوسری چیز کے موجود ہو جانے کی وجہ سے پس اللہ کا فضل و کرم چونکہ بروئے ظہور آگیا اس لئے عذاب وجود میں نہ آسکا اور والذی تولی کبرہ منھم لہ عذاب عظیم میں عذاب ہونے کی صراحت فرما دی ہے اس لئے ثبوت عذاب یقینی ہے۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ (تم کو عذاب پہنچ جاتا) جب کہ تم اس (طوفان و بہتان) کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی دلیل تم کو بالکل معلوم نہ تھی اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت سخت بات تھی۔

اذ ظرفیہ ہے اس کا تعلق مستکم یا افضتم سے ہے۔

تلقونہ تم اس کو اپنی زبانوں سے لے رہے تھے یعنی ایک دوسرے سے پوچھتا اور نقل کرتا تھا۔ کلبی نے کہا اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک شخص دوسرے سے ملتا اور کہتا تھا مجھے ایسی خبر ملی ہے کیا واقعہ ہے اس طرح ایک دوسرے سے زبانی لیتا تھا۔

مجاہد نے کہا ایک دوسرے سے روایت اور نقل کرتا تھا۔ زجاج نے کہا بعض بعض سے سیکھتے تھے۔

وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ الخ یعنی تم صرف افواہی باتیں کہتے تھے جن کی کوئی حقیقت نہ تھی منہ سے ایسی باتیں نکالتے تھے جن کی واقعیت تم کو معلوم نہ تھی۔

ھینا آسان خفیف، جس کے نتیجہ میں کوئی خرابی تمہاری نظر میں نہ تھی۔

عنداللہ عظیم وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی تھی بھاری گناہ تھا جو بڑے عذاب کا موجب تھا۔ یوں بھی پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانی بہت بڑا گناہ ہے۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ عام طور پر موجب عذاب ہو جاتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان الفاظ کی عذاب آفرینی کا کیا ٹھکانہ جن سے اللہ کے رسول کی عزت پر حرف آتا ہو اور آپ کی آبروریزی ہوتی ہو۔

حضرت معاذ بن جبل کا بیان ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لے جائے اور دوزخ سے دور کر دے فرمایا تم نے بڑی بات دریافت کی لیکن جس کے لئے اللہ آسان کر دے اس کے لئے آسان بھی ہے اللہ کی عبادت کرو۔ کسی چیز کو اس کے ساتھ (الوہیت و ربوبیت میں) ساجھی نہ بناؤ نماز قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو، کعبے کا حج کرو آخر میں فرمایا کیا میں تم کو بھلائی کے دروازے نہ بتادوں (یاد رکھو) روزہ (عذاب سے بچنے کی) سپر ہے خیرات گناہوں (کی آگ) کو اس طرح بجھا دیتی ہے جیسے پانی آگ کو اور رات کے جوف (وسط) میں نماز پڑھنا (بھی گناہ کی آگ کو بجھا دیتا ہے) پھر آپ نے آیت تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَعْمَلُوْنَ تک تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا کیا میں تمہیں (دینی) امور کا سر اور ستون اور اس کے کوہان کی چوٹی نہ بتادوں۔ اسلام اس کا سر ہے نماز اس کا ستون ہے اور جہاد اس کے کوہان کی چوٹی ہے، پھر فرمایا کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتادوں جس پر ان سب کا مدار ہے۔ میں نے عرض کیا ضرور فرمایئے حضور ﷺ نے اپنی زبان کو پکڑ کر فرمایا اس کو روکے رکھو۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ کیا بات کرنے پر بھی ہماری پکڑ ہو گی۔ فرمایا معاذ، تجھ پر تیری ماں روئے زبانوں کے نتائج ہی تو لوگوں کو اوندھے منہ دوزخ میں گرائیں گے۔ (یعنی باتوں کی کھیتی دوزخ کی شکل میں کٹ کر سامنے آئے گی رواہ احمد، والترمذی وابن ماجہ۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

اور (مسلمانو) جب تم نے (منافقوں سے یہ بہتان اور جھوٹ) سنا تھا تو ان کی تردید کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہمارے لئے یہ بات کہنی بھی جائز نہیں اے اللہ تو پاک ہے (تیرا رسول پاک ہے تیرے رسول کی بیوی پاک ہے) یہ بڑا بہتان ہے۔

مایکون لنا یعنی ہمارے لئے جائز نہیں سزاوار نہیں کہ یہ بات یا اس قسم کی باتیں کہیں، صدیق اکبر کی بیٹی اور رسول اللہ ﷺ کی بیوی کے متعلق ایسی بات کہنی تو سچے مسلمانوں کے لئے بہت ہی شاق تھی ویسے بھی کسی پاک دامن پر زنا کی تہمت لگانی فاسق بنا دیتی ہے آئندہ ایسے شخص کی شہادت قابل پذیرائی نہیں رہتی اور تہمت تراش مستحق سزا ہو جاتا ہے۔

سبحنک یعنی اے اللہ تو اس بات سے پاک ہے کہ تیرے نبی کی بیوی زانیہ ہو کیونکہ بیوی کی زناکاری تو شوہر کی آبرو کو تباہ کر دیتی ہے نبی لوگوں کو دعوت اصلاح دیتا ہے اس کے گھر میں ایسی بات ہوتی جو دوسروں کی نفرت کا باعث ہو کسی طرح جائز نہیں۔ (نہ عقلاً نہ نقلاً) پیغمبر کی بیوی کافرہ تو ہو سکتی ہے (کافروں کے لئے کفر باعث نفرت نہیں ہوتا اور پیغمبر کی بیوی کا کفر کسی کافر کو پیغمبر کے پاس آنے سے نہیں روکتا نہ بیوی کے کفر سے ان کی نظر میں نبی کی ذلت ہوتی ہے) جیسے حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں کافر تھیں لیکن بدکار نہیں تھیں۔

ھذا بھتان یعنی یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے کہ سننے والا اس کو سن کر حیران رہ جاتا ہے جس پر دروغ بندی کی جا رہی ہے اس کی عظمت شان اور پھر اس کی طرف ایسی ذلیل حرکت کی نسبت سننے والے کو متحیر بنا دیتی ہے جس پر دروغ تراشی کی جاتی ہے اس کے مرتبے کے موافق تہمت (کے ہلکے بھاری ہونے) کا اندازہ قائم کیا جاتا ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے (اور ممانعت فرماتا ہے) کہ ایسی حرکت دوبارہ پھر کبھی نہ کرنا۔ وعظ کا معنی ہے ایسی بازداشت جس میں خوف بھی دلایا گیا ہو خلیل نے کہا وعظ کا معنی ہے اس طور پر خیر کی یاددہانی کرنا کہ دلوں میں رقت پیدا ہو جائے مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو اپنا عذاب یاد دلاتا اور سزا سے ڈراتا ہے۔

ان تعودوا لمثلہ کہ ایسی بات دوبارہ زندگی بھر نہ کہو نہ سنو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تم کو تنبیہ کرتا ہے اور ڈراتا ہے

کیونکہ اس کو تمہارا پھر ایسا کرنا پسند نہیں ہے۔
مجاہد نے بعظکم کا ترجمہ کیا تم کو منع کرتا ہے دوبارہ ایسی حرکت کرنے سے۔
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ (یعنی) اگر تم مومن ہو تو نصیحت مانو، ایسی حرکت پھر کبھی نہ کرنا یہ حرکت تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔
جو شیعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کو متہم کرتے ہیں وہ مومن نہیں ہیں (یہ حضرت مؤلف کا استنباط ہے)
وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ اور اللہ تمہارے لئے آیات کھول کر بیان کرتا ہے یعنی ایسی آیات بیان کرتا ہے جو اوامر و نواہی اور محسان آداب و اخلاق کی کھلی تعلیم دیتی ہیں۔
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ اور اللہ خوب جانتا ہے یعنی اچھے برے امور سے بخوبی واقف ہے اس لئے بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں کی ممانعت فرماتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمام حالات کو جانتا ہے عائشہ کی پاکدامنی کو بھی جانتا ہے اور بہتان طرازوں کے جھوٹ کو بھی۔
حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وہ حکمت والا ہے۔ اس کی سب تدبیریں حکمت سے پُر ہیں وہ اپنے نبی کی طرف کسی برائی کی نسبت کو جائز نہیں قرار دیتا۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ
جو لوگ مسلمانوں میں بہت بری باتیں پھیلنے کے خواستگار ہیں ان کے لئے سخت تکلیف وہ سزا ہے۔
الفاحشة حد سے زیادہ بری بات۔
فِي الدُّنْيَا دنیا میں بھی کہ حد قذف ان پر جاری کی جاتی ہے۔
وَالْاٰخِرَةِ ؕ اور آخرت میں بھی کہ ان کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ جانتا ہے یعنی دلوں میں چھپی باتوں سے اللہ واقف ہے کہ کس کی نیت بخیر ہے اور کون بے حیائی کی باتیں مسلمانوں میں پھیلانا چاہتا ہے۔
وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ اور (اے لوگو)! تم نہیں جانتے۔ اس لئے تم کو تو ظاہری امور کا اتباع کرنا چاہئے تھا۔ اگر الزام زنا کے ثبوت میں کوئی چار شہادتیں شرعی پیش کردے تو اس کے متعلق گمان اچھا رکھو سمجھ لو اس نے بہ نیت ثواب ایسا کیا ہے کسی مسلمان کی آبروریزی اس کا مقصد نہیں وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرانا اور زمین سے بگاڑ کو دور کرنا چاہتا ہے لیکن اگر شرعی گواہ نہ ہوں تو الزام زنا لگانے والا اچھی نیت نہیں رکھتا۔ حدود الہیہ کو قائم نہیں کراسکتا۔ مسلمانوں کی آبروریزی کرنا اس کا مقصد ہے اس لئے حد قذف اس پر جاری کرو۔ خواہ واقع میں سچا ہو حقیقت خدا جانے۔ اللہ کے حکم کے بموجب وہ جھوٹا ہے تمام ظاہری احکام کے پابند ہو اللہ نے ایسے لوگوں کو بہتان تراش کہا، اور تہمت تراشی کی سزا مقرر کردی ہے۔
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾
اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے اور اللہ بڑا شفیق اور بڑا رحم کرنے والا ہے (تو تم بھی سزا سے نہ بچتے)
یہ خطاب ان مسلمانوں کو ہے جنہوں نے حضرت عائشہ کے قصہ میں کچھ دخل اندازی کی تھی۔ شرط کی جزاء محذوف ہے۔ یعنی اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا تو دنیا میں ایسا عذاب تم پر نازل کرتا کہ تمہاری بیخ و بُن اکھڑ جاتی اور آخرت میں تم کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دیتا۔
اللہ نے اس آیت میں دوبارہ عذاب سے ڈرایا ہے اور اپنی رحمت کا تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ بڑا اہم اور جرم بہت سنگین تھا۔
حضرت ابن عباس نے فرمایا آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ الخ میں عبداللہ بن ابی اور اس کے

ساتھی مراد ہیں اور لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ لا فی الدنیا و الاخرة سے مراد ہے دنیا میں حد قذف اور آخرت میں دوامی دوزخ۔
اور ولولافضل اللّٰہ علیکم و رحمتہ میں مراد ہیں حسان اور مسطح اور حمنہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ
اے ایمان والو شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ (تو ہمیشہ ہر شخص کو) بے حیائی اور نا معقول کام کرنے ہی کو کہے گا۔

الفحشاء وہ کام جس کی برائی عقلاً ونقلاً حد سے زیادہ ہو۔

المنکر وہ کام جو شرعاً نا معقول ہو۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی۔ یہ خطاب ان مسلمانوں کو ہے جو (اپنی نادانی کی وجہ سے) منافقوں کے ساتھ افواہ پھیلانے میں شامل ہوگئے تھے۔ اللہ کی ان پر یہ مہربانی ہوئی کہ گناہوں کو مٹادینے والی سزا کا حکم جاری کردیا گیا اور اللہ نے ان کو توبہ کی توفیق عنایت فرمادی۔

مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ تو (اس طوفان و بہتان کے گناہ سے) تم میں سے بھی کوئی پاک نہ ہوتا۔

وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ اور اللہ جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے (توبہ کی توفیق عطا فرماتا ہے اور اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے) اور اللہ ہر شخص کے کلام کو سننے والا اور نیتوں کو جاننے والا ہے۔

شیخین نے صحیحین میں اور بعض دوسرے اہل روایت نے ذکر کیا ہے کہ جب افک کا واقعہ ہوا تو حضرت ابو بکر نے فرمایا بخدا آئندہ مسطح کے لئے میں کچھ خرچ نہیں کروں گا۔

مسطح بن اثاثہ کی حضرت ابو بکرؓ سے رشتہ داری تھی اور مسطح نادار مفلس تھے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۽
اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں وہ اہل قرابت کو اور مسکینوں کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں۔

ولا یاتل یعنی قسم نہ کھائیں۔ یہ لفظ باب افتعال سے ہے الیہ سے مشتق ہے الیہ کا معنی ہے قسم۔ یا اس کا مادہ الو ہے الو کا معنی ہے کمی کرنا یعنی کمی نہ کریں۔ اس جگہ قسم کا معنی لینا زیادہ مناسب ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اثاثہ کو کچھ نہ دینے کی قسم کھائی تھی۔

الفضل سے مراد ہے دینی فضیلت (مال مراد نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد السعة کا لفظ مذکور ہے اور سعة کا معنی مالی کشائش) اگر مال مراد ہوگا تو تکرار لازم آئے گی (جو بے ضرورت جائز نہیں) اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ممانعت صرف انہیں لوگوں کے لئے ہے جو دینی فضیلت رکھتے ہوں ان کے مرتبے کا یہی تقاضا ہے ورنہ۔ کسی رشتہ دار سے اگر دکھ پہنچا ہو تو اس کو اپنا مال نہ دینا اور اس کے مصارف برداشت نہ کرنا عام لوگوں کے لئے حرام نہیں ہے۔

منکم میں حضرت ابو بکر اور ان جیسے صاحبان فضل کو خطاب ہے اس سے حضرت ابو بکرؓ کی دینی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ تم میں کے دولت مند لوگ دنیا ترک نہ کریں۔ خیرات کا حکم مال داروں کے لئے ہے (نادار کیا خیرات کرے گا)

اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ سے حضرت مسطح اور ان جیسے لوگ مراد ہیں حضرت مسطح مسکین بھی تھے، مہاجر بھی تھے، بدری بھی تھے اور حضرت ابو بکر کی خالہ کے بیٹے بھی تھے۔

وَلْيَعْفُوْا اور (جو ان کی طرف سے زیادتی ہو گئی ہے اس کو) معاف کر دیں۔
وَلْيَصْفَحُوْا ط اور ان سے در گزر کریں۔
اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (اے فضیلت اور دولت والو) کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ (تمہارے در گزر کرنے اور حسن سلوک کرنے اور معاف کر دینے کے بدلے میں) تمہارے قصور معاف کر دے تم پر اللہ کی نعمتیں اور حقوق بہت زیادہ ہیں اور وہ بدلہ لینے پر پوری پوری قدرت بھی رکھتا ہے اس کے باوجود وہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔ لہٰذا تم بھی اپنے اندر اللہ کی یہ پسندیدہ صفت پیدا کرو۔
شیخین وغیرہ کی روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا خدا کی قسم میں تو دل سے خواستگار ہوں کہ اللہ میرے قصور بخش دے اس کے بعد آپ نے دوبارہ حضرت مسطح کے مصارف جاری کر دیئے اور فرمایا واللہ! آئندہ کبھی میں یہ مصارف نہیں روکوں گا۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صلہ رحم جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو برابر کا بدلہ لے لے بلکہ واصل رحم وہ شخص ہے کہ اگر کوئی تم سے اپنا رشتہ توڑ لے تو تم اس کو جوڑے رکھو رواہ البخاری۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر اور دوسرے چند صحابیوں نے قسم کھالی تھی کہ جن لوگوں نے اس بہتان تراشی میں حصہ لیا ہے ان کو کچھ نہیں دیں گے اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ص وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ جو لوگ پاکدامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں وہ یقیناً دنیا اور آخرت میں ملعون ہیں اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔
الحصنت پاک دامن عورتیں۔
الغفلت زنا سے بے خبر بدکاری کا تصور بھی ان کے دل میں نہیں آتا۔
المومنت اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والیاں۔
عذاب عظیم یعنی دوزخ کے اندر ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔
یہ حکم ہر شخص کا ہے جو کسی پاک دامن ایماندار زنا سے بے خبر عورت پر زنا کی تہمت لگاتا ہے اور آیت والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم الخ میں ہر اس شخص کا حکم بیان کیا گیا جو پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگاتا ہے خواہ وہ عورت زنا کے تصور سے بے خبر ہو یا نہ ہو، بہر حال حد قذف اور شہادت کا ہمیشہ کے لئے قبول نہ ہونا ہر قاذف اور تہمت تراش کی سزا ہے خواہ وہ سچا ہی ہو مگر شرعی چار گواہ نہ پیش نہ کر سکتا ہو یا جھوٹا ہو اور ملعون ہونے کا حکم صرف اس شخص کے لئے مخصوص ہے جس نے جھوٹی تہمت لگائی ہو بے چاری بھولی بھالی عورت اس تہمت سے بے خبر ہوتی ہے۔ ایسے تہمت تراش کا جرم بہت بڑا ہوتا ہے لیکن جرم کتنا ہی بڑا ہو اس پر کفر عائد نہیں ہوتا۔ ایسا مجرم کافر نہیں ہو جاتا۔ صرف کافر ہی نہیں بعض کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والا بھی شرعاً مستحق لعن ہو جاتا ہے مثلاً قصداً مومن کو قتل کرنے والا بھی مستحق لعنت ہوتا ہے۔
مقاتل نے کہا یہ حکم صرف عبداللہ بن ابی کے لئے تھا مقاتل کے خیال میں ملعون صرف کافر ہوتا ہے۔
طبرانی نے لکھا ہے کہ خصیف نے بیان کیا میں نے سعید بن جبیر سے پوچھا زنا کرنے اور تہمت زنا لگانے میں سے کون زیادہ سخت ہے۔ (کس کا گناہ زیادہ ہے) سعید نے کہا زنا (زیادہ سخت ہے) میں نے کہا اللہ نے تو فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فرمایا یہ آیت حضرت عائشہؓ کے حق میں نازل ہوئی تھی، اس روایت کی سند میں یحییٰ حمانی ضعیف راوی ہے۔ بغوی نے بھی خصیف کی یہ روایت نقل کی ہے۔

عوام بن حوشب نے قبیلۂ بنی کاہل کے ایک شیخ کے حوالہ سے نقل کیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا آیت مذکورہ حضرت عائشہ اور دوسری امہات المومنین کے حق میں خاص طور پر نازل ہوئی اس میں توبہ کا ذکر نہیں ہے اور اگر کوئی کسی دوسری مومن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اس کے لئے اللہ نے توبہ کی گنجائش رکھی ہے اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے آیت وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا الخ تلاوت کی اور فرمایا ان لوگوں کے لئے توبہ کا ذکر کیا گیا اور (آیت مذکورہ بالا میں) ان لوگوں کے لئے توبہ کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح طبرانی نے ضحاک بن مزاحم کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول صرف امہات المومنین کے حق میں ہوا تھا۔

دوسرے اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ (اول) اس آیت کا نزول حضور ﷺ کی بیویوں کے حق میں ہوا تھا یہاں تک کہ (اس کے بعد) وہ آیت جو شروع سورت میں گزری نازل ہوئی یعنی آیت والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهداء الخ بعد کو نازل ہوئی اور اس میں حد قذف اور توبہ کا ذکر کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں ان مختلف اقوال کی بنیاد دو باتوں پر ہے (۱) اول یہ کہ آیت مذکور کے نزول کا سبب قصۂ افک ہے۔ (۲) دوئم یہ کہ کفر کے علاوہ دوسرے کبیرہ گناہوں کے مرتکب پر لعنت شریعت میں وارد نہیں ہے۔ اول کا جواب یہ ہے کہ مورد اور سبب نزول کی تخصیص عموم حکم سے مانع نہیں ہوتی، الفاظ میں عموم ہے اس لئے آیت کے اطلاع میں بھی عموم ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ لعنت کی خصوصیت کفر ہی کے ساتھ نہیں ہے قصداً قاتل کو بھی ملعون قرار دیا گیا ہے معلوم ہوا کہ بعض کبیرہ گناہ بھی مستحق لعنت بنا دیتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس آیت میں توبہ اور مغفرت کا ذکر نہیں کیا گیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امہات المومنین پر تہمت لگانے والوں کی توبہ قبول ہی نہ ہو اور ان کی مغفرت ممکن ہی نہ ہو اللہ نے صراحۃً فرمایا ہے وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ اور شرک کے علاوہ جس کو چاہے گا اللہ بخش دے گا۔

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

جس روز کہ ان کی زبانیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف (ہو کر) ان کے کئے ہوئے اعمال پر گواہی دیں گے (اس روز ان پر عذاب عظیم ہوگا)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن حساب کے لئے مومن کو طلب کیا جائے گا اور اس کا رب اس کے کئے ہوئے وہ اعمال اس کے سامنے لائے گا جو بندے اور رب کے درمیان تھے یعنی حقوق اللہ سے تعلق رکھنے والے اعمال جن سے بندہ واقف ہوگا اور اس کا رب۔ (بندے کے سامنے لائے جائیں گے) مومن ان کا اقرار کرے گا اور عرض کرے گا اے میرے رب! میں نے یہ کئے تھے میں نے یہ کئے تھے۔ اقرار کرانے کے بعد اللہ ان پر پردہ ڈال دے گا اور معاف فرما دے گا وہ گناہ اس طرح چھپا دیئے جائیں گے کہ روئے زمین پر کوئی مخلوق ان کو نہ دیکھ سکے گی۔ ہاں اس کی نیکیاں ہی نیکیاں نمایاں ہوں گی سارے لوگ اس کی نیکیاں دیکھیں گے اور باہم بیان کریں گے منافق کو جب حساب کے لئے طلب کیا جائے گا اور اس کا رب اس کے عمل اس کے سامنے لائے گا تو وہ انکار کرے گا اور عرض کرے گا اے میرے رب! تیری عزت کی قسم میں نے یہ کام نہیں کئے بن کئے کام فرشتے نے مجھ پر لکھ دیئے ہیں۔ فرشتہ کہے گا کیا تو نے فلاں دن فلاں جگہ یہ کام نہیں کیا تھا۔ منافق کہے گا قسم ہے عزت رب کی میں نے نہیں کئے اس وقت اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی (اور اعضاء شہادت دیں گے) حضرت ابو موسیٰ نے کہا میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے اس کی داہنی ران بولے گی۔ پھر ابو موسیٰ نے آیت اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ الخ تلاوت کی۔

ابو یعلی اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا (یعنی یہ حدیث مرفوع ہے)

احمد نے بسند صحیح اور طبرانی نے حضرت عقبہ بن عامر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جس روز

منہ پر مہر لگادی جائے گی اس روز انسان کی سب سے پہلی ہڈی جو کلام کرے گی وہ اس کی بائیں ران کی ہو گی۔ احمد، نسائی، حاکم اور بیہقی حضرت معاویہ بن جیدہ کی روایت سے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن (منافق) لوگ اس حالت میں آئیں گے کہ ان کے مونہوں پر دہانے چڑھے ہوں گے (کہ منہ بند ہوں گے بول نہ سکیں گے) سب سے پہلے آدمی کی ران اور ہتھیلی کلام کرے گی۔ مسلم نے رویت باری تعالیٰ کے باب میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ ایک طویل حدیث کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ آدمی کے عمل (کی شہادت دینے کے لئے) اس کی ران اور اس کا گوشت اور اس کی ہڈی بولے گی اور یہ شخص منافق ہو گا جس پر اللہ کا غضب ہو گا۔

ایک شبہ

اس جگہ اللہ نے فرمایا کہ ان کی زبانیں شہادت دیں گی اور دوسری آیت میں فرمایا ہے ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے (بظاہر) دونوں میں اختلاف ہے۔

ازالہ

منہ پر مہر لگانے کا یہ مطلب ہے کہ خود اپنے ارادے سے وہ منہ سے بول نہ سکیں گے (اپنی مرضی کے مطابق زبانوں سے کلام نہ کر سکیں گے) یہ مطلب نہیں کہ انکے ارادے کے خلاف بھی ان کی زبانوں سے کوئی لفظ نکل نہ سکے گا (اور گویائی کی قوت سلب ہو جائے گی)

قرطبی نے لکھا ہے جسمانی اعضاء ان لوگوں کے خلاف شہادت دیں گے جو اعمال ناموں کی تحریر کے منکر ہوں گے (اور اعمالنامہ کے اندراج کو غلط بتائیں گے) اور جھگڑا کریں گے۔ ایسے لوگوں کے خلاف اعضائے جسم شہادت دیں گے۔

میں کہتا ہوں اس تفسیر پر گزشتہ آیات کا نزول عبداللہ بن ابی کے لئے مانا جائے گا جیسا کہ قتادہ کا خیال ہے۔

يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ اس روز اللہ ان کو (ان کے عمل کا) پورا پورا عوض دے گا۔

یعنی ٹھیک واجبی بدلہ۔

دین بدلہ، عوض، حق واجب لازم

بعض کے نزدیک دین سے مراد ہے حساب اور الحق سے مراد ہے انصاف والا۔

وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا اور (بات کی حقیقت کو) کھول دینے والا ہے۔

الحق المبین موجود حقیقی اصلی ہے۔ تمام چیزوں کو (خواہ وہ جواہر ہو یا عرض) پیدا کرنے والا ہے تمام حقائق کائنات کو تھامے رکھنے والا ہے۔ گویا اسی کا وجود اصلی ہے اور ساری کائنات اسی کے وجود کا عکس ہیں۔ اس کی الوہیت کھلی ہوئی ہے الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں اور ثواب عذاب دینے پر اس کے سوا اور کوئی۔ قادر نہیں۔

یا الحق سے مراد ہے ذوالحق اور المبین سے مراد ہے بین یعنی اس کا انصاف ظاہر ہے یا المبین (ظاہر کرنے والا) کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو اس نے وعدہ کیا ہے قیامت کے دن اس کو ظاہر کرنے والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا عبداللہ بن ابی (دین کی صداقت) میں شک کرتا تھا قیامت کے دن اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق مبین ہے۔

میں کہتا ہوں شاید حضرت ابن عباس کے قول کا یہ مطلب ہے کہ عام لوگ خصوصاً کافر خیال کرتے ہیں کہ خدا کی ہستی موہوم ہے (واقعی خدا کا وجود نہیں) یہاں تک کہ وہ حوادث کائنات کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں یا ستاروں کی چال سے ان کو وابستہ سمجھتے ہیں اور انسانوں کے ہاتھ میں نفع نقصان کا حقیقی اختیار جانتے ہیں اسی لئے جتنا بادشاہوں سے ڈرتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے قیامت کے دن ان کے سامنے آجائے گا کہ جو کچھ وہ خیال کرتے تھے غلط تھا اور اللہ ہی حق مبین ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ

اور (یہ قاعدہ عام ہے کہ) گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق اور ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق۔

اکثر اہل تفسیر کے نزدیک الخبیثات سے مراد ہیں گندی باتیں، مذمت، تحقیر اور توہین کرنے والے ناپاک الفاظ ایسے الفاظ و کلمات گندے لوگوں کے لئے ہی زیبا ہیں ناپاک لوگوں کو ہی ایسی بری باتوں کا استحقاق ہے اور خبیث لوگ ہی مذمت و تحقیر وغیرہ کے اہل ہیں اور پاک کلمات یعنی تعریف ثناء اور دعا کے مستحق پاک لوگ ہیں اور پاک کلمات انہیں کے لئے زیبا ہیں۔ پس حضرت عائشہؓ ثنا اور تعریف کی مستحق ہیں دعا اور تعریف ہی ان کے لئے زیبا ہے ان پر تہمت تراشی اور بہتان بندی قطعاً ناجائز اور غیر مناسب ہے۔

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ یہ لوگ (یعنی حضرت عائشہؓ اور ان جیسے لوگ) ان (بیہودہ) باتوں سے پاک ہیں جو یہ (بہتان بندی کرنے والے) کہتے ہیں۔

زجاج نے آیت مذکورہ بالا کی تفسیر حسب ذیل کی ہے۔ گندے کلمات جیسے کلمۂ کفر، جھوٹ، صحابہ اور اہل بیت کو برا کہنا پاک دامن عورتوں پر زنا کا بہتان رکھنا اور اسی جیسی دوسری باتیں ناپاک آدمیوں جیسے عبداللہ بن ابی وغیرہ کے لئے ہی جچتی ہیں وہی ایسی باتیں کہہ سکتے ہیں۔ پاک لوگ ایسا کلام زبان سے نہیں نکال سکتے۔ گندے لوگوں کو انہیں گندی باتوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے ان کے خمیر میں یہی باتیں رکھی گئی ہیں۔ اور پاک کلمات جیسے اللہ کا ذکر، رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام، مومن مردوں اور عورتوں کے لئے دعا و مغفرت اور تلاوت قرآن وغیرہ کی توفیق پاک لوگوں کو ہی ملتی ہے پاک لوگوں کی تخلیق ہی پاک کلمات کے لئے کی گئی ہے ان کے خمیر میں یہ پاک باتیں رکھ دی گئی ہیں یہی پاک لوگ اس جرم کے ارتکاب سے پاک ہیں جو تہمت تراش ان کے متعلق کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں تہمت تراشی کرنے والوں کی مذمت ہے اور جن کی اللہ نے الزامات سے پاک ہونے کی صراحت کی ہے ان کی مدح ہے۔

ابن زید نے کہا خبیثات سے گندی عورتیں اور خبیثین سے گندے مرد مراد ہیں یعنی اکثر گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے ہوتے ہیں اور عائشہؓ پاک ہیں اسی لئے اللہ نے ان کو اپنے رسول کی زوجیت کے لئے منتخب فرمایا۔ عائشہؓ اور ان جیسے لوگ ان افتراء پردازوں کی الزام تراشی سے پاک ہیں۔ اگر عائشہؓ پاک نہ ہوتیں تو پاک رسول کی بیوی بننے کی اہل نہ ہوتیں۔

حضرت ہند بن ابی ہالہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کو ناپسند ہے کہ میں سوائے جنتی (عورت) کے کسی اور سے نکاح کروں۔ رواہ ابن عساکر

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾ ان کے (یعنی عائشہؓ اور ان جیسے لوگوں کے) لئے (گناہوں کی) مغفرت ہے اور عزت والا رزق یعنی جنت ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ روایت میں آیا ہے حضرت عائشہؓ چند باتوں پر ناز کرتی تھیں جو آپ ہی کو عطا کی گئی تھیں، کسی اور عورت کو نہیں دی گئیں۔

(۱) حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت عائشہؓ کی تصویر ایک ریشمی کپڑے میں (لپیٹ کر) لائے اور کہا یہ آپ کی بیوی ہیں۔

میں کہتا ہوں ترمذی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے۔ روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضرت عائشہؓ کی تصویر اپنے ہاتھ میں لائے تھے۔

(۲) حضرت عائشہؓ کے سوا کسی اور ناکتخدا (دوشیزہ) سے رسول اللہ ﷺ نے شادی نہیں کی۔
(۳) رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت حضور والا کا سر حضرت عائشہؓ کی گود میں تھا۔
(۴) حضرت عائشہؓ کے حجرے میں رسول اللہ ﷺ کا جسد مبارک دفن کیا گیا۔
(۵) جب رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک چادر میں ہوتے تو (کبھی اسی حالت میں) وحی آجاتی اور کسی بیوی کو یہ شرف حاصل نہ تھا)۔
(۶) حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی کی صراحت آسمان سے نازل ہوئی۔
(۷) آپ رسول اللہ ﷺ کے (اول) خلیفہ کی صاحبزادی ہیں۔
(۸) آپ صدیقہ طاہرہ تھیں۔
(۹) آپ سے مغفرت اور رزق کریم عطا فرمانے کا وعدہ کیا گیا۔

مسروق اگر حضرت عائشہؓ کی روایت سے کوئی حدیث بیان کرتے تو یہ الفاظ کہتے، مجھ سے بیان کیا صدیق کی صاحبزادی صدیقہ نے جو رسول اللہ ﷺ کی چہیتی بیوی تھیں اور جن کی پاک دامنی آسمان سے نازل کی گئی تھی۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اگر پورے قرآن میں تلاش کیا جائے تو کسی کے لئے کوئی وعید اتنی سخت نہیں نازل ہوئی۔ جتنی حضرت عائشہؓ پر تہمت تراشنے والوں کے حق میں نازل ہوئی۔

صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تجھے (یعنی تیری صورت کو) تین رات برابر) خواب میں میری نظر کے سامنے لایا گیا۔ فرشتہ ایک ریشمی کپڑے میں تجھے لاتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا یہ آپ کی بیوی ہے میں نے تیرے چہرے سے کپڑا اٹھایا تو وہ تیری ہی صورت تھی۔ میں نے کہا اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا کر دے گا۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ بھی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یہ جبرئیلؑ ہیں تم کو سلام کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کو وہ کچھ نظر آتا تھا جو میں نہیں دیکھتی تھی۔

یہ بھی حضرت عائشہؓ ہی کا بیان ہے کہ لوگ قصداً عائشہؓ کی باری کے دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے ہدیے بھیجتے تھے (باری کی اس تعیین سے) ان کو رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنا مقصود ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کے دو گروہ (جدا جدا) ہو گئے تھے۔ ایک گروہ عائشہ، حفصہ، صفیہ اور سودہ کا تھا اور دوسرا گروہ ام سلمہ اور باقی بیویوں کا تھا۔ ایک روز ام سلمہ کی ساتھ والی بیویوں نے ام سلمہ سے کہا آپ رسول اللہ سے عرض کریں کہ آپ لوگوں سے فرما دیں کہ اگر کسی شخص کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کوئی ہدیہ بھیجنا ہو تو رسول اللہ ﷺ جس بیوی کے گھر ہوں وہیں بھیج دیں (عائشہ کی باری ہی کی تخصیص نہ رکھیں) (بیویوں کا قول) چنانچہ ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کر دیا۔ حضور نے فرمایا تم مجھے عائشہؓ کے معاملے میں مت ستاؤ۔ سوائے عائشہؓ کے اور کسی عورت کی چادر میں اگر میں موجود ہوتا ہوں تو) میرے پاس وحی نہیں آتی۔ ام سلمہ نے کہا میں اللہ کے رسول کو ایذا دینے سے اللہ سے توبہ کرتی ہوں۔ اس کے بعد بیویوں نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی۔ فاطمہؓ کو اسی غرض سے حضور ﷺ کے پاس بھیجا اور (سیدہ) فاطمہؓ نے اس بات کے سلسلے میں گزارش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیٹا! کیا تجھے وہ بات ناپسند ہے جو مجھے پسند ہے سیدہ نے کہا کیوں نہیں (پسند ہے) فرمایا تو تو بھی اس سے محبت کر۔ متفق علیہ۔

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے آیا ہے (کہ حضور نے فرمایا) عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید (ایک خاص قسم کا کھانا) کی فضیلت اور کھانوں پر۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا صحابہ کو جب کسی حدیث (کے

سمجھنے) میں کوئی دشواری ہوتی اور ہم جاکر حضرت عائشہؓ سے دریافت کرتے تو اس کا علم ہم کو ان کے پاس ملتا۔ رواہ الترمذی
حضرت موسیٰ بن طلحہ کا بیان ہے میں نے عائشہؓ سے زیادہ سلیس بیان والا کسی کو نہیں پایا۔ رواہ الترمذی۔ بیضاوی نے لکھا ہے اللہ نے چار شخصوں کو چار کے ذریعہ پاکی (یعنی تہمت سے برأت) عنایت کردی۔

(۱) یوسف کو زلیخا کے ایک گھر والے (بچہ) کی شہادت کی وجہ سے

(۲) موسیٰ کو یہودیوں کی تہمت سے اس پتھر کے ذریعہ جو آپ کے کپڑے لے بھاگا تھا۔

(۳) مریمؑ کو انہی کے بچے (عیسیٰ) کی شہادت کی وجہ سے۔

(۴) عائشہؓ کو ان مذکور آیات کے ذریعے سے اور مختلف پُر زور طریقوں سے حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی کا اظہار اتنی مؤکد عبارتوں میں محض منصب رسول کی عظمت کو بیان کرنے اور آپ کے مرتبے کو بالا اور اعلیٰ بنانے کے لئے کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں اس سے اللہ اور اللہ کے رسول کی نظر میں حضرت عائشہؓ کی عظمت وشان کا اظہار بھی مقصود ہے۔

فریابی اور ابن جریر نے حضرت عدی بن ثابت کی روایت سے بیان کیا کہ ایک انصاری عورت نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ میں اپنے گھر کے اندر (بعض وقت) ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ میں نہیں چاہتی کہ اس حالت میں کوئی مجھے دیکھے، لیکن گھر کے آدمیوں سے کوئی (نہ کوئی) آدمی (بے روک ٹوک) اندر آجاتا ہے اور اس حالت میں مجھے دیکھ لیتا ہے میں کیا کروں۔ اس سوال پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا

اے ایمان والو! تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے علاوہ غیر گھروں میں داخل مت ہو جب تک ان سے اجازت حاصل نہ کرلو اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔

غیر بیوتکم یعنی ان مکانوں کے علاوہ جن میں تم رہتے ہو (خواہ ان غیر مکانوں کے تم ہی مالک ہو)

غیر بیوتکم میں اضافت تملیک کے لئے نہیں ہے، کیونکہ جو شخص اپنا مملوکہ مکان کسی دوسرے شخص کو کرایہ پر یا مفت رہنے کے لئے دیدے (وہ اگرچہ اس مکان کا مالک ہوتا ہے لیکن) اس کو بھی اجازت نہیں کہ رہنے والے کی اجازت کے بغیر اس مکان میں داخل ہو سکے۔

تستا نسوا کا مرادی معنی ہے اجازت حاصل کرلو ایک روایت میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں تستانسوا کی جگہ تستاذنوا بھی آیا ہے۔

لغت میں انس کا معنی ہے دیکھنا جاننا احساس کرنا اور وحشت نہ ہونا۔ ابن ابی حاتم نے کہا کہ حضرت ابوایوب کے بھتیجے حضرت ابو سورہ نے بیان کیا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ یہ سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں لیکن استیناس (طلب انس) کا کیا مطلب ہے، فرمایا (استیناس یہ ہے کہ) آدمی (باہر ہی رہ کر) سبحان اللہ اور اللہ اکبر اور الحمد للہ کہے اور کھنکھارے (تاکہ گھر والے کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے) پھر اہل خانہ اجازت دیدے۔ (تو اندر داخل ہو جائے)

قاموس میں ہے انس، ضد وحشت (کو کہتے ہیں) آنس الشئی کسی چیز کو دیکھا جانا، احساس کیا آنس الصوت آواز کو سنا، خلیل نے کہا استیناس کا معنی ہے دیکھنا۔ انست نارا میں نے آگ دیکھ پائی ہے طلب اذن کو استیناس کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ طلبگار اجازت کے دل میں ایک طرح کی وحشت ہوتی ہے اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید داخلے کی اجازت نہ ملے۔ جب داخلے کی اجازت مل جاتی ہے تو اس کی وحشت خاطر دور ہو جاتی ہے۔ طلب گار اجازت طالب علم بھی ہوتا ہے اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ داخلے کی اجازت گھر والے کی طرف سے ملے گی یا نہیں۔ اجازت ملنے کے بعد اس کو علم ہو جاتا ہے۔

تسلموا علی اھلھا یعنی گھر والوں کو السلام علیکم کہو۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیٹے جب تو گھر والوں کے پاس جائے تو انہیں سلام کر، تیرے اور تیرے گھر والوں کے لئے برکت حاصل ہو گی۔ رواہ الترمذی۔

طلب اجازت پہلے کی جائے یا سلام یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ آیت میں طلب اذن کا ذکر پہلے ہے اس لئے کچھ لوگوں کا قول ہے کہ پہلے اجازت داخلہ طلب کی جائے پھر سلام کیا جائے لیکن یہ قول بے دلیل ہے واؤ (عاطفہ) کا یہ معنی ہے کہ دونوں کام کئے جائیں پہلے پیچھے کس کو کیا جائے یہ واؤ سے نہیں معلوم ہوتا۔ پھر حضرت ابن مسعود کے مصحف میں تسلموا کا لفظ تستاذنوا سے پہلے آیا ہے۔

اکثر علماء کا قول ہے پہلے سلام کیا جائے حضرت کلدہ بن حنبل کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا پہنچا۔ نہ اجازت داخلہ مانگی نہ سلام کیا حضور ﷺ نے فرمایا واپس جاؤ اور واپس جا کر کہو السلام علیکم کیا میں اندر آسکتا ہوں، رواہ ابوداؤد والترمذی۔

حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے پہلے سلام نہ کیا ہو اس کو (داخلے کی) اجازت نہ دو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

بغوی نے لکھا ہے ایک شخص نے حضرت ابن عمر سے داخلہ کی اجازت طلب کی اور کہا کیا میں اندر آسکتا ہوں حضرت ابن عمر نے فرمایا نہیں ایک شخص نے آنے والے کو مشورہ دیا کہ پہلے سلام کر پھر اجازت داخلہ طلب کر۔ حسب مشورہ اس نے سلام کیا پھر اجازت طلب کی حضرت ابن عمر نے اجازت داخلہ دیدی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے اگر آنے والے کی نظر (گھر کے اندر) کسی آدمی پر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے اور کوئی نظر نہ آئے تو طلب اجازت پہلے کرے پھر سلام کرے۔

حضرت ابو موسیٰ اور حضرت حذیفہ اپنی محرم عورتوں کے پاس (گھر کے اندر) آنا چاہتے تو ان سے بھی اجازت داخلہ کے طلب گار ہوتے تھے حسن نے عطاء بن یسار کی روایت سے مرسلاً بیان کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، کیا میں اپنی ماں کے پاس بھی داخلے کی اجازت لے کر جاؤں۔ فرمایا ہاں اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں تو اس کے ساتھ رہتا ہی ہوں۔ فرمایا اس کے پاس جانے کے لئے اجازت طلب کر۔ اس نے عرض کیا حضور ﷺ میں تو اس کا خادم ہوں۔ فرمایا (پھر بھی) داخلے کی اجازت مانگ۔ کیا تو اپنی ماں کو برہنہ دیکھنا پسند کرے گا۔ اس نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو پھر اس سے داخلے کی اجازت مانگ رواہ مالک۔

مسئلہ:- اگر قاصد بھیج کر کسی کو بلوایا جائے اور وہ قاصد کے ساتھ آجائے تو مزید اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کو بلوایا جائے اور وہ قاصد کے ساتھ آجائے تو یہی اس کے لئے اجازت ہے۔ رواہ ابوداؤد۔

دوسری روایت میں آیا، کسی کو بلوانے کے لئے قاصد بھیجنا ہی اجازت ہے۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ یعنی اچانک اندر گھس پڑنے سے یا رسم جاہلیت سے یہ طریقہ بہتر ہے۔ حضرت عمران بن حصین کا بیان ہے ہم جاہلیت کے زمانے میں (بجائے سلام علیک کے) کہتے تھے۔ انعم اللہ بک عینا اللہ تم کو خنک چشم رکھے۔ انعم صباحا صبح بخیر جب اسلام آیا تو اس نے ہم کو ایسا کرنے کی ممانعت کر دی۔ رواہ ابوداؤد

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ اگر تم مکانوں کے اندر کسی کو نہ پاؤ۔ (کہ تم کو اجازت دے) تو جب تک اجازت نہ ملے اندر نہ جاؤ۔ یعنی جب تک گھر والا آکر تم کو اجازت نہ دے دے اندر نہ جاؤ۔ بات یہ ہے کہ بغیر اجازت اندر داخل ہو جانے کی ممانعت کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ بغیر اجازت داخلے سے ننگا کھلا آدمی سامنے آجاتا ہے اور بے پردگی ہو جاتی ہے، بلکہ ایک وجہ۔ ممانعت کی یہ بھی ہے کہ اس سے بعض

ان باتوں یا چیزوں کا اظہار ہو جاتا ہے جن کو آدمی لوگوں سے چھپانا چاہتا ہے پھر ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کی چیز میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا یوں بھی ممنوع ہے ہاں اس مکان میں بدون اجازت داخلہ کی ممانعت نہیں جس میں اچانک داخلہ کی کوئی معقول وجہ ہو مثلاً مکان میں آگ لگ گئی ہو یا گر رہا ہو۔ یا اس میں کوئی ممنوع فعل ہو رہا ہو (مثلاً چوری ہو رہی ہو یا قتل ہو رہا ہو یا شراب فروخت ہو رہی ہو)

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ اور اگر تم سے کہہ دیا جائے لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ (داخل ہونے پر اصرار نہ کرو) یہ ہی تمہارے لئے بہت پاکیزہ (عمل) ہے۔

یعنی دروازے پر کھڑا رہنے اور داخلے کے لئے اصرار کرنے سے بصورت انکار واپس چلا آنا تمہارے لئے پاکیزہ فعل ہے اڑنا اور داخلے کے لئے اصرار کرنا بری بات ہے اس میں شرف نفس کا ضیاع ہے۔

تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد بھی اگر گھر والا اجازت نہ دے (اندر سے اجازت نہ ملے خاموشی رہے) تو اس کا حکم بھی انکار اور رجوع کی طرح ہے یعنی لوٹ آنا چاہئے۔

حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے میرے پاس ابو موسیٰ اشعری آئے اور کہا مجھے حضرت عمرؓ نے آدمی بھیج کر بلوایا (آدمی کہہ کر واپس چلا گیا) حسب الطلب میں حضرت عمر کے دروازے پر پہنچا اور تین بار (باہر سے) سلام کیا لیکن (اندر سے) حضرت عمرؓ نے سلام کا جواب نہیں دیا میں لوٹ آیا۔ اب جو ملاقات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مجھ سے جواب طلب کیا کہ تم کیوں نہیں آئے۔ میں نے جواب دیا میں تو آیا تھا اور تین مرتبہ سلام کرنے کے بعد بھی جب سلام کا جواب آپ کی طرف سے نہیں ملا تو لوٹ گیا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمادیا تھا۔ اگر تم میں سے کوئی تین مرتبہ (داخلہ کی) اجازت طلب کرے اور اس کو اجازت نہ ملے تو اس کو لوٹ جانا چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس ارشاد پر شہادت پیش کرو (اگر آپ لوگوں میں سے کوئی اس فرمان کا شاہد ہو تو میرے ساتھ چل کر شہادت دیدے) حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا میں اٹھ کھڑا ہوں اور ان کے ساتھ جاکر حضرت عمرؓ کے سامنے شہادت دیدی۔ متفق علیہ۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی مرفوع روایت ہے کہ تسلیم (جس کا حکم آیت میں دیا گیا ہے) یہ ہے کہ تین مرتبہ کہے السلام علیکم، کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ اگر اجازت مل جائے تو اندر چلا جائے ورنہ لوٹ جائے۔ رواہ ابن ماجہ۔

بغوی نے لکھا ہے حدیث مذکور کو بشر بن سعید نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بھی بیان کیا ہے اس روایت کے بموجب حدیث کے یہ الفاظ ہیں اگر تم میں سے کوئی تین بار اجازت (داخلہ) طلب کرے اور اس کو اجازت نہ ملے تو لوٹ جائے۔

حسن نے کہا پہلی مرتبہ (اجازت طلبی اور سلام) اطلاع آمد ہے اور دوسری مرتبہ (سلام و اجازت طلبی) ایک قسم کا مشورہ اور طلب امر ہے اور تیسری مرتبہ (الفاظ مذکور کہنا) واپسی کے لئے اجازت کی طلب ہے۔ حضرت انس راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس (ملاقات کے لئے) تشریف لے گئے اور (باہر سے) داخلے کی اجازت طلب کی اور فرمایا السلام علیکم ورحمۃ اللہ حضرت سعد نے چپکے سے جواب دیدیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ لیکن رسول اللہ ﷺ نے نہیں سنا۔ یہاں تک کہ آپ نے تین بار سلام علیک کی اور سعد نے ایسی آواز سے جواب دیا کہ حضور ﷺ نہ سن سکے۔ بالآخر آپ لوٹ آئے۔ اب سعد پیچھے دوڑے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ حضور ﷺ پر نثار آپ نے جتنی بار سلام علیک کی میں نے اپنے کانوں سے اس کو سنا اور جواب بھی برابر دیا لیکن اپنا جواب آپ کو نہیں سنایا (اتنی پست آواز سے جواب دیا کہ آپ نہ سن سکیں (مجھے دل سے خواہش تھی کہ آپ کی طرف سے سلامتی اور برکت زیادہ سے زیادہ مجھے مل جائے۔ (آپ برابر مجھے برکت و سلامتی کی دعا دیتے رہیں) اس کے بعد سب لوگ سعد کے گھر کے اندر داخل ہوئے سعد نے کشمش پیش کی۔ حضور ﷺ نے نوش فرمائی اور کھانے سے فارغ ہو کر فرمایا، تمہارا کھانا نیک لوگوں نے کھایا اور ملائکہ نے تمہارے لئے نزول

رحمت کی دعا کی اور روزہ داروں نے تمہارے پاس روزہ کھولا۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔

مسئلہ: اگر کوئی کسی کے دروازے پر جائے اور اجازت داخلہ طلب نہ کرے بلکہ صاحب خانہ کے باہر نکلنے کے انتظار میں دروازے پر بیٹھ جائے تو جائز ہے۔ حضرت ابن عباس ایک انصاری کے دروازے پر طلب حدیث کے لئے جاتے اور انصاری کے برآمد ہونے کے انتظار میں دروازے پر بیٹھ جاتے۔ داخل ہونے کی اجازت طلب نہ کرتے۔ انصاری فرماتے اے رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے آپ نے مجھے اطلاع دیدی ہوتی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہم کو اسی طرح طلب علم کا حکم دیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ نے فرمایا ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یہ آیت بھی مضمون مذکور پر دلالت کر رہی ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کسی کے دروازے پر جائے اور اجازت طلب کرے اور دروازے پر پردہ نہ ہو تو دروازہ کے سامنے منہ کر کے نہ کھڑا ہو اور نہ دروازے کی جھریوں سے اندر جھانکے حضرت عبداللہ بن بسر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کے دروازے پر جاتے تو دروازے کے بالکل سامنے منہ کر کے نہیں کھڑے ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں بازو کے پاس کھڑے ہو کر فرماتے السلام علیکم، السلام علیکم اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں گھروں (کے دروازوں) پر پردے نہیں ہوتے تھے۔ رواہ ابوداؤد۔

حضرت سہل بن سعد ساعدی راوی ہیں کہ ایک بار ایک شخص نے حجرے کے پردے سے رسول اللہ ﷺ کو اندر جھانک کر دیکھا اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں کوئی نوک دار لوہے کی چیز تھی حضور ﷺ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو میں اس کی آنکھ میں اس کو چبھو دیتا۔ طلب اجازت کا حکم تو فقط نہ دیکھنے کے لئے ہی دیا گیا ہے (جب دیکھ لیا تو طلب اجازت بیکار ہے) رواہ البغوی۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص تمہاری اجازت کے بغیر تم کو جھانک کر دیکھے اور تم کوئی کنکری اس کے پھینک مارو اور کنکری سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تمہارا کوئی جرم نہیں۔ رواہ احمد والشیخان فی الصحیحین۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ جو تم کو حکم دیئے جاتے ہیں ان کی کس قدر تعمیل کرتے ہو اور کتنی تعمیل نہیں کرتے۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان کا بیان نقل کیا ہے کہ جب گھروں میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنے کا حکم نازل ہوا تو حضرت ابوبکر نے فرمایا یا رسول اللہ ﷺ قریش کے تاجر جو مکہ مدینہ اور شام کے درمیان آتے جاتے ہیں ان کا کیا ہو گا سر راہ ان کے (قیام اور اترنے کے) مکان مقرر ہوتے ہیں جن کے اندر کوئی رہتا نہیں ہے (صرف راستہ میں کسی جگہ ٹھہرنے کے لئے قریش کے تاجر بنا کر چھوڑ دیتے ہیں) وہاں کس سے اجازت داخلہ مانگیں گے اور کس کو سلام کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ط

(اجازت طلب نہ کرنے اور سلام نہ کرنے میں) تم پر کوئی گناہ (اس وقت تک) نہیں کہ تم غیر مسکونہ مکانوں میں داخل ہو جہاں تمہارا سامان (یعنی نفع کی چیز) ہو۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جن بیوت میں بلا اجازت داخلے کا حکم آیت مذکور میں دیا گیا ہے ان سے مراد کون سے مکان ہیں علماء کے اقوال اس میں مختلف آئے ہیں قتادہ نے کہا ان سے مراد وہ دکانیں کوٹھریاں اور مکان ہیں جو قافلوں کے لئے بنا دیئے جاتے تھے، قافلے آتے جاتے وہاں ٹھہرتے تھے اور اپنا سامان رکھتے تھے۔ ان مکانوں میں بغیر اجازت طلبی کے داخلے کو جائز کر دیا گیا۔ اس صورت میں متاع (بمعنی منفعت) یہ ہو گی کہ وہاں لوگ اترتے ہیں اور سامان رکھتے ہیں اور سردی گرمی سے بچتے ہیں۔

ابن زید نے کہا ان سے مراد وہ تجارتی کوٹھیاں اور دکانیں ہیں جو بازاروں میں ہوتی ہیں جہاں خرید فروخت کے لئے لوگ

داخل ہوتے ہیں یہی منفعت ہے۔

ابراہیم نخعی نے کہا بازار کی دکانوں میں داخل ہونے کی اجازت لینی ضروری نہیں۔ ابن سیرین جب بازار کی کسی دکان پر جاتے تو فرماتے السلام علیکم میں داخل ہو جاؤں پھر جواب کا انتظار کئے بغیر داخل ہو جاتے تھے۔ عطاء نے کہا ویران کھنڈر مراد ہیں اور متاع سے مراد ہے بول و براز کے لئے جانا۔

بعض نے کہا وہ تمام مکان مراد ہیں جہاں کوئی باشندہ نہ ہو کیونکہ اجازت طلبی کا حکم صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ کسی ننگے کھلے پر نظر نہ پڑ جائے جن مکانوں کے اندر کوئی رہتا نہ ہو ان کے اندر داخل ہونے میں کسی برہنگی پر نظر پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں اس لئے اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو۔ یہ وعید ان لوگوں کے لئے ہے جو کسی فساد کی غرض سے یا لوگوں کو برہنہ دیکھنے کے لئے گھروں میں بلا اجازت داخل ہوتے ہیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ـــــــ ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ آنکھیں نیچی رکھیں۔ یعنی جس کی طرف دیکھنا جائز نہیں اس کو دیکھنے سے آنکھیں بند رکھیں حسن کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی لعنت ہے (نامحرم کو) دیکھنے والے پر اور جس صورت کو دیکھا جائے اس پر۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

یغضوا امر کا صیغہ ہے لام محذوف ہے من ابصار میں بر قول اخفش من زائد ہے۔ اخفش کے نزدیک کلام مثبت میں بھی من کا زائد ہونا جائز ہے۔ سیبویہ کے نزدیک من تبعیضیہ ہے کیونکہ مومنوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ کسی کو نہ دیکھیں سب کی طرف سے آنکھیں بند رکھیں بلکہ جس کو دیکھنے کی اجازت نہیں اس کی طرف نظر اٹھانے کی ممانعت ہے بلکہ نامحرم کی طرف بالارادہ دوسری بار دیکھنے کی بندش ہے۔ پہلی مرتبہ جو بلا ارادہ نظر پڑ جائے اس کا گناہ نہیں۔ حضرت بریدہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا علی! پہلی (بے ساختہ) نظر کے پیچھے (دوسری بالارادہ) نظر نہ کرنا پہلی نظر تمہارے لئے جائز ہے دوسری نظر مباح نہیں رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والدارمی۔

حضرت جریر بن عبداللہ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اچانک نظر پڑ جانے کا مسئلہ دریافت کیا حضور ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ نظر پھیر لیا کروں۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان کسی (اجنبی) عورت کی خوبصورتی پہلی مرتبہ (اچانک) دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے اللہ اس کے لئے عبادت میں احساس حلاوت پیدا کر دیتا ہے۔ رواہ احمد۔

وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ط اور اپنی شرمگاہوں کی نگہداشت کریں۔ یعنی اپنی بیویوں اور باندیوں کے علاوہ دوسروں سے اپنی شرمگاہوں کو بچائے رکھیں، استثناء لفظی کی ضرورت نہیں تھی عقلاً اور نقلاً بیویاں اور باندیاں مستثنیٰ ہی ہیں۔

ابوالعالیہ نے کہا سوائے اس جگہ کے باقی جہاں بھی شرمگاہ کی حفاظت رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں زنا اور حرام سے حفاظت مراد ہے۔ صرف اس جگہ شرمگاہ کی حفاظت سے پردہ کرنا چھپائے رکھنا تاکہ کسی غیر کی نظر نہ پڑے۔ بہز بن حکیم کے دادا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اپنی شرمگاہ کو سوائے اپنی بیوی اور اپنی باندی کے اوروں سے محفوظ رکھ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آدمی تنہائی میں ہو تو کیا حکم ہے فرمایا اللہ زیادہ مستحق ہے اس بات کا کہ اس سے شرم کی جائے۔ رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ۔

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ برہنہ سے بچو تمہارے ساتھ (ہر وقت) ایسی ہستیاں رہتی ہیں جو تم سے کسی وقت الگ نہیں ہوتیں سوائے رفع حاجت کے وقت کے یا اس وقت کے جب کوئی شخص اپنی بیوی سے قربت کرتا ہے۔ لہٰذا تم ان سے شرم کرو اور ان کی عزت کرو۔

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ یہ (آنکھیں بند کرلینا اور شرم گاہوں کی حفاظت رکھنا) ان کے لئے نہایت پاکیزہ یا نہایت مفید عمل ہے اس میں زنا کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ بے شک اللہ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے بحوالہ مقاتل بیان کیا کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے فرمایا (ایک بار) حضرت اسماء بنت مرشد اپنے نخلستان میں تھیں کچھ عورتیں ان کے پاس آئیں جو ازار پہنے ہوئے نہ تھیں اس لئے جو کچھ وہ پانوؤں میں پہنے ہوئی تھیں (یعنی پازیب وغیرہ) وہ کھلا نظر آرہا تھا ان کے سینے اور گیسو بھی کھلے ہوئے تھے حضرت اسماء نے فرمایا یہ کیسی بری ہیئت ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، یعنی جس کو دیکھنا جائز نہیں اس سے آنکھیں بند رکھیں۔ یہ آیت دلالت کررہی ہے کہ عورت کے لئے اجنبی مردوں کو دیکھنا مطلقاً ناجائز ہے امام شافعیؒ کا یہی قول ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر میلان صنفی کا اندیشہ نہ ہو تو عورت اجنبی مرد کا وہ حصہ دیکھ سکتی ہے جو ایک مرد دوسرے مرد کا دیکھ سکتا ہے۔ امام شافعیؒ نے اپنے قول کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ ایک بار حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھیں۔ حضرت ابن ام مکتوم بھی آگئے (یہ واقعہ حکم حجاب نازل ہونے کے بعد کا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم دونوں پردے میں ہو جاؤ (حضرت ام سلمہ کا بیان ہے) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ نابینا نہیں ہیں۔ فرمایا کیا تم دونوں بھی نابینا ہو کیا تم اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی۔

امام ابو حنیفہؒ نے حضرت ابن عباس کی روایت مندرجہ ذیل سے استدلال کیا ہے کہ حجۃ الوداع کے سال قبیلۂ خثعم کی ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بندوں پر اللہ نے جو حج فرض کیا ہے وہ میرے بوڑھے باپ پر (بھی عائد ہوتا ہے اور) ایسے وقت میں (اس پر یہ فرض) عائد ہوا ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہے ٹھیک طرح سے سواری پر بیٹھ بھی نہیں سکتا اگر میں اس کے بدل میں حج کرلوں تو کیا اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔ فرمایا ہاں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا فضل (جو اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے) اس عورت کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عورت بھی فضل کی طرف دیکھ رہی تھی رسول اللہ ﷺ نے فضل کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔ الحدیث رواہ البخاری۔

ترمذی نے حضرت علی کی روایت سے یہ حدیث اسی طرح بیان کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت عباسؓ نے کہا آپ ﷺ نے اپنے چچا کے بیٹے کا منہ موڑ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں نے ایک جوان مرد کو (جوان عورت کی طرف) اور جوان عورت کو جوان مرد کی طرف نظر کرتے) دیکھا مجھے دونوں کے متعلق شیطان (کی مداخلت) کا اندیشہ ہوا۔ اس روایت کو ترمذی نے صحیح کہا ہے۔

ابن قطان نے اس حدیث سے استنباط کیا ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو (عورت کا مرد کی طرف) نظر کرنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو منہ چھپانے کا حکم نہیں دیا اور اگر حضرت عباس نظر کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تو سوال نہ کرتے اور جو کچھ حضرت عباس سمجھتے تھے اگر وہ درست نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس پر حضرت عباس کو قائم نہ رکھتے۔ دوسری حدیث حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت سے آئی ہے کہ جب ان کو ان کے شوہر نے طلاق دیدی اور قطعی طلاق دیدی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو حضرت ام ابن مکتوم (نابینا) کے گھر میں ایام عدت بسر کرنے کا حکم دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت اجنبی نابینا مرد کو دیکھ سکتی ہے یعنی میلان صنفی کا اندیشہ نہ ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:۔ ناف سے زانو تک عورت کو عورت نہیں دیکھ سکتی اور نہ مرد مرد کو۔ حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد مرد کے ستر کو نہ دیکھے اور نہ عورت عورت کے ستر کو مرد مرد کے ساتھ برہنہ ایک کپڑے میں نہ

لیٹے اور نہ عورت عورت کے ساتھ برہنہ ایک کپڑے میں لیٹے۔ رواہ مسلم۔

وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا اور اپنی شرمگاہوں کی نگہداشت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا رہتا ہے۔ زینت سے مراد ہیں زیور، کپڑے، سنگھار یعنی سج دھج اور سنگھار کو بھی ظاہر نہ کریں۔ زینت کے اعضاء کا ظاہر نہ کرنا تو بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔

ماظھر سے مراد ہیں وہ چیزیں جو زیور وغیرہ کو استعمال کرنے کے لئے وقت ظاہر رہتی ہی ہیں جیسے کپڑے، انگوٹھی وغیرہ کہ ان کے چھپائے رکھنے میں بڑی دشواری ہے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک زینت سے مراد ہیں اعضاء زینت یا زینت سے مراد ہیں فطری اور بناوٹی محاسن۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک چہرہ اور پہنچے تک دونوں ہاتھ حکم ستر سے مستثنیٰ ہیں۔ ترمذی نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے کہ ماظھر سے مراد ہے چہرہ اور دونوں کف (یعنی پہنچے سے نیچے نیچے ہتھیلیاں وغیرہ) عطاء کی راویت میں حضرت عائشہ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ دوسری روایت میں چہرہ اور کفین کے ساتھ قدموں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

امام شافعیؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ صرف چہرہ مستثنیٰ ہے بہرحال چاروں اماموں کے نزدیک بالاتفاق چہرہ ستر سے مستثنیٰ ہے، امام ابو حنیفہؒ، امام مالک امام احمد کے پاس ایک روایت کے بموجب کفین بھی مستثنیٰ ہیں۔ مختلفات، قاضی خان میں آیا ہے کہ کف کا بیرونی اور اندرونی حصہ پہنچے تک مستثنیٰ ہے اور ظاہر الروایت میں آیا ہے کہ ہتھیلیاں ستر نہیں ہیں مگر ہتھیلیوں کا بیرونی حصہ قابل ستر ہے۔ کذا قال ابن ہمام دونوں قدم عورت (قابل ستر) ہیں لیکن ایک روایت میں امام ابو حنیفہ کا قول اس کے خلاف آیا ہے۔

حضرت ام سلمہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اگر عورت صرف کرتہ اوڑھنی پہن کر نماز پڑھ لے ازار پہنے نہ ہو تو کیا نماز ہو جائے گی، فرمایا کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ کرتہ اتنا (لمبا) ہو کہ قدموں کو اوپر سے ڈھانک لے۔ رواہ ابوداؤد و الحاکم۔ شیخ عبدالحق نے اس روایت کو معلل قرار دیا ہے کیونکہ مالک وغیرہ نے اسکو موقوفاً نقل کیا ہے اور اس کو موقوف قرار دینا ہی صحیح ہے۔ ابن جوزی نے کہا اس حدیث کو مرفوع کہنے میں کلام ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بھی ہے جو ضعیف ہے یحییٰ نے اس کو ضعیف کہا ہے ابو حاتم رازی نے کہا اس کی روایت کردہ حدیث نا قابل استدلال ہے۔

بالائے قدم کا عورت ہونا اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے اللہ نے فرمایا ہے ولا یضربن بارجلھن لیعلم مایخفین من زینتھن اپنے پاؤں اس طرح نہ ماریں کہ جو زینت وہ چھپاتی ہیں وہ معلوم ہو جائے اس آیت سے، معلوم ہوتا ہے کہ پازیب، جھانجن وغیرہ چھپی ہوئی زینت ہیں (اور باطنی زینت کو چھپانا لازم ہے) اس لئے پازیب وغیرہ کی جگہ یعنی بالائے قدم بھی قابل ستر ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آیت میں جس ستر کا حکم ہے اس کا تعلق صرف نماز سے ہے پردہ سے نہیں ہے کیونکہ آزاد عورت کا سارا بدن واجب الستر ہے سوائے شوہر اور محرم کے عورت کے بدن کا کوئی حصہ دیکھنا کسی مرد کے لئے جائز نہیں۔ ہاں مجبوری ہو تو الگ بات ہے جیسے بیماری کا علاج یا ادائے شہادت وغیرہ حنفی فقہ کی کتابوں میں چہرے کو ستر سے مستثنیٰ کیا گیا ہے اور یہ استثناء صرف نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ہدایہ میں ہے کسی مرد کے لئے اجنبی عورت کا کوئی حصۂ بدن سوائے چہرے اور کفین کے دیکھنا جائز نہیں کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے ولا یبدین زینتھن الا ماظھر منھا (اس آیت میں ماظھر یعنی چہرے اور کفین کو مستثنیٰ کر دیا ہے) اس کے علاوہ چہرہ اور کفین کے چھپائے رکھنے میں سخت دشواری بھی ہے۔ ان کا ضرورت کے وقت کھلا رہنا ضروری ہے۔ مردوں سے لین دین میں ان کا کھلنا لازم ہے۔

اگر نفسانی میلان کے ابھار کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں سوائے خالص مجبوری کے چہرے کو دیکھنا بھی جائز نہیں۔ سخت مجبوری ہو تو خیر جیسے گواہ بننے گواہی دینے اور قاضی کے سامنے جانے کی اجازت کی مجبوری ہو لیکن اگر نفسانی میلان کے ابھار کا یقینی نہ ہو

بلکہ شبہ ہو کہ عورت کا چہرہ دیکھ کر شاید شہوانی ابھار ہو جائے یا غالب گمان نفسانیت کے ابھار کا ہو تو چہرے کو دیکھنا مباح نہیں۔

میں کہتا ہوں امام ابو حنیفہ کا مسلک یہی ہے اور اسی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابو داؤد نے مرسلاً بیان کی ہے کہ لڑکی جب بالغہ ہو جائے تو سوائے اس کے چہرے اور پہنچے تک ہاتھ کے اور کچھ دیکھنا درست نہیں۔ میں کہتا ہوں جن مردوں کو عورتوں کی حاجت نہیں ہوتی (بہت بوڑھے ہونے کی وجہ سے عورتوں کی طرف ان کا میلان خاطر باقی نہیں رہتا) ان کے سامنے عورتوں کا اپنی پوشیدہ زینت کو نمودار کرنا باجماع علماء جائز ہے اور قرآنی صراحت سے بھی ثابت ہے کیونکہ اس صورت میں فتنہ کا کوئی خوف نہیں ہوتا پس جب پوشیدہ زینت کا اظہار جائز ہے تو ناکارہ مردوں کے سامنے ظاہری زینت کو لے آنے میں بدرجۂ اولیٰ کوئی ہرج نہیں ہاں اگر اجنبی عورت کو دیکھ کر نفسانیت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہو خواہ یہ اندیشہ صرف شبہ کی حد کے اندر ہو تب بھی اس کے چہرے پر نظر کرنا ناجائز ہے۔ صاحب ہدایہ کا یہی مطلب ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے اگر اجنبی عورت کے یا امرد لڑکے کے چہرے کو دیکھ کر نفسانیت میں بیداری اور ابھار کا شبہ ہو تب بھی نہ اجنبی عورت کو دیکھنا جائز ہے اور نہ امرد لڑکے کے چہرے کو۔ جن صورتوں میں اجنبی عورت کے چہرے کو دیکھنے کی ممانعت ہے انہیں صورتوں میں عورت کے لئے اپنا چہرہ اجنبی مرد کو دکھانا بھی ناجائز ہے اگر مرد کے اندر اجنبی عورت کا چہرہ دیکھ کر نفسانی ابھار کا شک ہو رہا ہو تو عورت اس کو اپنا چہرہ دکھا نہیں سکتی اس سے فتنہ اور بگاڑ کی تخم کاری ہو گی اور چونکہ ہر اجنبی عورت کا چہرہ ہر جوان نامحرم مرد کے لئے نفسانیت میں ابھار پیدا کرنے کا احتمال رکھتا ہے جو مرد اپنے اندر عورتوں کی طرف میلان کی صلاحیت رکھتا ہے (اور پیر فرتوت کی حدود میں داخل نہیں ہوا ہے) اجنبی عورت کا چہرہ دیکھ کر اس کے نفسانی میلان میں بیداری نہ ہونا ناقابل تصور ہے اس لئے ہم کو کہنا پڑے گا کہ آزاد (جوان) عورت کے لئے اجنبی مرد سے چہرے کا پردہ رکھنا بھی لازم ہے بشرطیکہ مرد عورت کا شوہر اور محرم نہ ہو اور عورت کی طرف میلان کی اس میں صلاحیت ہو۔ حسن کا اصل سرچشمہ تو چہرہ ہی ہے چہرے کو دیکھنے سے ہی فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے عورت (سر تاپا) عورت ہے۔ (یعنی قابل ستر ہے) جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک جھانک میں رہتا ہے۔ رواہ الترمذی عن ابن مسعود۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ عورت (از سر تاپا) واجب الستر ہے ضرورتیں اس حکم سے باجماع امت مستثنیٰ ہیں۔ عورت کو بازار سے ضروری سودا سلف لانے والا نہ ملے تو یہ بھی ایک طرح کی ضرورت ہے برقعہ پہن کر وہ نکل سکتی ہے۔ راستہ دیکھنے کے لئے وہ ایک آنکھ کھلی رکھے۔ سر سے پاؤں تک چھپانے والا کپڑا نہ ملے تو جہاں تک ممکن ہو اور جو کپڑے میسر ہوں وہی کپڑے پہن کر اور بدن کو چھپا کر باہر آسکتی ہے۔ کبھی علاج معالجہ کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی گواہوں کے پاس اور کبھی عدالت میں حاکم کے سامنے جانے کی مجبوری ہوتی ہے ان سب صورتوں میں بقدر ضرورت پردے کا انکشاف درست ہے۔ ہم نے زینت کا مرادی معنی دو طرح سے بیان کیا ہے (۱) کپڑے زیور اور بناؤ سنگھار کی چیزیں بیضاوی کے نزدیک زینت سے یہی مراد ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی زینت سے مراد کپڑے لئے ہیں اور (استدلال میں آیت) خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ تلاوت فرمائی تھی (اس آیت میں زینت سے مراد کپڑے ہیں اور مسجد سے مراد نماز۔ مترجم) اس صورت میں زینت یعنی لباس اور زیور کو ظاہر کرنے کی صراحۃً ممانعت ہو گی اور مواضع زینت یعنی اعضاء کو ظاہر کرنے کی حرمت دلالت النص سے بدرجۂ اولیٰ ہو جائے گی اس وقت الا ما ظهر کا مطلب بالکل صاف ہو گا کہ جو کپڑے بیرونی ہیں اور اوپر کا لباس ہیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

اور اگر زینت سے مواضع زینت یعنی اعضاء مراد ہوں تو استثناء کا مطلب یہ ہو گا کہ جب ضروری کام کاج کے لئے یا گواہوں کو فراہم کرنے کے لئے یا ادائے شہادت کے لئے مواضع زینت یعنی اعضاء کو کھولنا پڑ جائے اور کھولنے کا ارادہ نہ ہو تو ایسی ضرورت کے وقت ان اعضاء کی بے پردگی جائز ہے۔ بہرحال چہرے اور کفین کھولنے کا استثناء صرف نماز ہی میں نہیں ہے (جیسا کہ بیضاوی کا خیال ہے بلکہ عام حالات سے اس کا تعلق ہے۔ مترجم)

چہرہ کھلا رکھنے کا عدم جواز اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ۔ الآیۃ۔ اے پیغمبر! اپنی بیبیوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں (اس آیت کی تفسیر میں) حضرت ابن عباس اور ابو عبیدہ نے کہا، مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے سروں اور چہروں کو چادر سے ڈھانک لیا کریں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں۔ صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں۔ رہا قبیلہ خثعم کی عورت کا واقعہ جس نے اپنے بوڑھے باپ کے عوض خود حج کرنے کا مسئلہ پوچھا تھا اور حضرت فضل بن عباس اس کی طرف دیکھنے لگے تھے (تو اس عام حالات میں چہرہ کھلا رکھنے کے جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا) یہ تو مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت کی وجہ سے تھا اور مجبوری کے وقت بہر حال چہرے کا پردہ نہیں رہتا۔ اسی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فضل کے چہرے کو عورت کی طرف سے پھیر دینا خود بتا رہا ہے کہ نامحرم عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنا ناجائز ہے۔

مسئلہ:۔ اس آیت کا حکم باجماع علماء آزاد عورتوں کے لئے مخصوص ہے، باندیاں خواہ کامل ہوں یا ناقص یعنی مکاتب ہوں مدبر ہوں، ام ولد ہوں یا خالص باندی، ان کے لئے سر، چہرہ، کلائیاں اور پنڈلیاں کھولنا جائز ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک۔ باندی کے لئے واجب الستر حصہ ناف سے زانو تک مردوں کی طرح ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک باندی کا پیٹ اور پشت بھی عورت (واجب الستر) ہے۔ اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ باندی کا حال بھی آزاد عورتوں کی طرح ہے، صرف سر، کلائیاں اور پنڈلیاں عورت یعنی واجب الستر نہیں ہیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت صفیہ کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ لوگوں نے حضرت صفیہ کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر حضور ﷺ ان کا پردہ کرائیں تو سمجھ لو وہ بیوی ہیں اور اگر پردہ نہ کرائیں تو سمجھ لو ام ولد ہیں۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ باندی کے پردے کا احکام آزاد عورت کے پردے کے احکام سے جدا ہیں، حضرت انس کا بیان ہے حضرت عمر کے سامنے ایک باندی مقنعہ پوش حالت میں نکلی آپ دُرّہ لے کر اس پر جا پہنچے اور فرمایا کمینی آزاد عورتوں کی شکل اختیار کر رہی ہے یہ مقنعہ اتار۔

اس کے علاوہ آیت یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ ..... ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ۔ کا آخری حصہ مفہوم کے لحاظ سے بتا رہا ہے کہ باندی کا حکم پردہ اور ہے اور آزاد عورت کا اور۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ باندی کے لئے، سر کلائیاں اور پنڈلیاں کھلی رکھنے کا جواز استثناء (الا ماظهر منها) کی وجہ سے ہے۔ پردے کی آیت کا حکم تو باندیوں کو بھی شامل تھا لیکن آقا کی خدمت کے لئے باندی کا باہر نکلنا بہر حال ضروری ہے اور بے چاری کے کام کے کپڑے چھوٹے ہونا بھی لازم ہیں اور چھوٹے کپڑوں سے کلائیاں، پنڈلیاں اور چہرے کا چھپا نہ رہنا بھی قرین عقل ہے اس لئے ضرورت کے تحت باندی کے لئے ان اعضاء کا پردہ ضروری نہیں قرار دیا گیا۔

وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لیں تاکہ ان کے بال گردن اور کان چھپے رہیں۔

ولیضربن یعنی اپنی اوڑھنیوں کا کچھ حصہ گریبانوں پر رکھ لیں۔ ضرب الید علی الحائط (دیوار پر ہاتھ رکھا) محاورہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا، سابق مہاجر عورتوں پر اللہ کی رحمت ہو جب اللہ نے آیت ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن نازل فرمائی تو انہوں نے اپنی چادریں پھاڑ کر ان کے خمار بنالئے۔

وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ یعنی وہ زینت جس کا ظاہر کرنا ممنوع ہے اس کو ظاہر نہ کریں۔

اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ مگر اپنے شوہروں کے لئے۔ زینت کا مرکزی نقطہ تو شوہر ہی ہیں اپنی بیویوں کے سارے بدن

کو دیکھنا جائز ہے، یہاں تک کہ شرمگاہوں کو بھی۔ مگر شرمگاہوں کو دیکھنا مکروہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے جو شخص اپنی بیوی سے قربت کرے تو پردہ کر لے۔ دونوں گدھوں کی طرح ننگے نہ ہوں۔ رواہ الشافعی والطبرانی والبیہقی عن ابن مسعود عن عتبہ بن عبر والنسائی عن عبداللہ بن سرجس والطبرانی ایضاً عن ابی امامتہ۔ ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کی شرم گاہ کبھی نہیں دیکھی۔

اَوْ اٰبَآئِهِنَّ یا اپنے باپوں کے لئے۔ اسی طرح دادا، نانا، پردادا، پرنانا غرض سارے اصول کا بالاجماع یہی حکم ہے۔

اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لئے۔ شوہروں کے سارے اصول کا بھی یہی حکم ہے۔

اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ یا اپنے بیٹوں کے لئے۔ پوتوں، نواسوں اور تمام فروع کا بدلالت النص اور بالاجماع یہی حکم ہے۔

اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے لئے۔ شوہروں کی ساری نسل کا یہی حکم ہے۔

اَوْ اِخْوَانِهِنَّ یا اپنے بھائیوں کے لئے۔ بھائی حقیقی ہوں یا علاقی یا اخیافی۔

اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ یا اپنے بھتیجوں کے لئے۔ بھتیجوں کے بیٹوں اور بھتیجوں کے بیٹوں کا۔ غرض بھائیوں کی ساری فروع کا یہی حکم ہے۔

اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ یا اپنے بھانجوں کے لئے۔ بہنوں کے پوتے نواسے بھی اسی حکم میں شامل ہیں۔ مذکورہ بالا سب لوگ عام طور پر اپنی بزرگ یا خورد عورتوں کے گھروں میں ہر وقت آمد و رفت رکھتے ہیں اور عموماً کسی فتنہ کا اندیشہ نہیں ہوتا، اصول و فروع سے صنفی تعلقات کو طبعاً لوگ برا سمجھتے ہیں پھر حیا اور شرم بھی دامن گیر ہوتی ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا مردوں کے سامنے مذکورہ عورتوں کا آنا اور اپنی زینت کو ظاہر کرنا اللہ نے جائز قرار دیا اور مردوں کے لئے مباح کر دیا کہ خدمت کے وقت جو حصۂ بدن کھلا رہتا ہے یا کھل جاتا ہے اس کو دیکھ سکتے ہیں یعنی سر، پنڈلیاں، بازو اور سینہ، پیٹ اور پشت کو دیکھنا روا نہیں، نہ ناف سے زانو تک کوئی حصہ دیکھنا جائز ہے عام طور پر یہ حصے کام کے وقت بھی چھپے رہتے ہیں اور ان کو چھپا رکھنے میں کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ یہ حکم ان مردوں اور عورتوں کے لئے ہے جو باہم محرم ہیں جن کے درمیان سلسلۂ نکاح ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا ہے، خواہ حرمت نسبی ہو یا دودھ کی شرکت کی وجہ سے آیت میں باپ کے بھائیوں اور ماں کے بھائیوں کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں کیا گیا کیونکہ دلالت النص سے ان کا حکم وہی معلوم ہو جاتا ہے جو بھتیجوں اور بھانجوں کا ہے اسی پر اجماع اہل علم ہے کیونکہ جب پھوپھی اپنی زینت کا اظہار اپنے بھتیجے کے سامنے کر سکتی ہے تو بھتیجی کے لئے بھی اپنے چچا کے سامنے زینت کا اظہار جائز ہوگا، دونوں رشتے برابر کے ہیں۔ اسی طرح خالہ بھانجے کے سامنے جب اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہی تو بھانجی ماموں کے سامنے بھی زینت کو ظاہر کر سکتی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ اعمام و اخوال کو صراحت کے ساتھ ذکر نہ کرنے سے اس طرف اشارہ ہو کہ چچا اور ماموں کے سامنے اظہار زینت نہ کرنا تقاضاء احتیاط ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ان کی زینت کو دیکھ کر اپنے بیٹوں کے سامنے ان عورتوں کی زینت کو بیان کر دیں۔ (حضرت مفسر کی توجیہ انتہائی رکیک ہے اصل بات یہ ہے کہ چچا اور ماموں سے رشتہ اتنا قریب اور قوی ہوتا ہے کہ باپ دادا اور نانا کے بعد اصول میں اور کسی سے اتنا قریب رشتہ نہیں ہوتا۔ جب چچا اور ماموں کے اصول کا ذکر کر دیا تو خود ان کا ذکر بدرجۂ اولیٰ ہو گیا۔ مترجم)

مسئلہ:۔ محرم عورت کے جس حصہ کو دیکھنا جائز ہے اس حصہ کو ہاتھ لگ جانا اور چھو جانا بھی جائز ہے۔ سفر میں کبھی ایسا ہو جاتا ہے اور ضرورت پڑ جاتی ہے اور حرمت نکاح دوامی ہے اس لئے فتنہ کا اندیشہ نہیں۔ ہاں اگر اس سے اپنی یا محرم عورت کی نفسانی خواہش کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں نہ محرم کی طرف دیکھنا جائز ہے نہ اس کو چھونا اور ہاتھ لگانا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں اور دونوں آنکھوں کا زنا بری نیت سے دیکھنا۔ اور دونوں ہاتھ زنا کرتے ہیں اور

ان کا زنا بری نیت سے پکڑنا ہے۔ دوسری روایت میں ہے دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں اور دونوں ہاتھ زنا کرتے ہیں اور دونوں پاؤں زنا کرتے ہیں اور شرمگاہ زنا کرتی ہے۔ رواہ احمد والطبرانی عن ابن مسعود۔ مرفوعاً

محرم عورتوں سے زنا کرنے کا جرم بہت ہی سخت ہے۔ اس لئے اگر ان کو دیکھنے یا چھونے سے نفسانیت کے بیدار ہو جانے کا کسی ایک طرف بھی خطرہ ہو تو دیکھنے سے پرہیز رکھے اور چھونے سے بھی۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ یا اپنی عورتوں کے لئے۔ یعنی ایک عورت دوسری عورت کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہے خواہ وہ عورت مومنہ ہو یا غیر مومنہ آزاد ہو یا باندی کیونکہ ہر عورت دوسری عورت کی ہم جنس ہے اور نفسانی خواہشات کی بیداری کا عام طور پر خطرہ نہیں ہوتا۔ ہاں ناف سے زانوں تک کا انکشاف ایک عورت دوسری عورت کے سامنے (باستثناء ضرورت خاص) نہیں کر سکتی۔

امام ابو حنیفہ کا ایک قول منقول ہے کہ عورت کا عورت کی طرف دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے مرد کا اپنی محرم عورت کی طرف دیکھنا۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ نساء لھن سے مراد ہے مسلمان عورتیں (اپنی عورتیں یعنی اپنی ہم مذہب بہنیں) اس تفسیر پر مسلمان عورت کے لئے کسی غیر مسلم عورت کے سامنے اپنی زینت کا اظہار جائز نہ ہوگا کیونکہ غیر مسلمہ عورت اپنی نہیں ہے غیر ہے۔ غیر مسلمہ عورت کو مردوں کے سامنے مسلم عورتوں کے احوال بیان کرنے سے کوئی باک نہیں ہوتا۔

حضرت ابن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، عورت عورت کے سامنے برہنہ نہ ہو کہ وہ جا کر اس طرح بیان کر دے کہ مرد کے سامنے وہ منظر آجائے۔

بغوی نے لکھا ہے عمر بن عبد العزیز نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو لکھ کر بھیجا تھا کہ کتابی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے ساتھ حمام میں جانے سے منع کر دیں۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ یا ان باندیوں کے سامنے جو ان کی مملوک ہیں۔

ابن جریج کا قول ہے کہ نسائھن سے مراد ہیں مسلمان آزاد عورتیں اور ماملکت ایمانھن سے مراد ہیں باندیاں خواہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں غلام مراد نہیں ہیں۔ اس تشریح کے بموجب کسی مسلمان عورت کا کسی مشرک عورت کے سامنے اپنی زینت کا انکشاف جائز نہ ہوگا۔ ہاں اگر باندی ہو خواہ مشرکہ ہی ہو اس سے زینت کا اخفا ضروری نہیں اور جب ما ملک سے اپنی باندیاں مراد ہیں تو اپنے غلام کے سامنے اظہار زینت درست نہ ہوگا نہ غلام کے لئے اپنی مالکہ کے جسم کا کوئی ایسا حصہ دیکھنا جائز ہوگا جس کو اجنبی مرد کے لئے دیکھنا حرام ہے۔

امام ابو حنیفہ اور بعض شوافع کا یہی قول ہے۔ شیخ ابو حامد شافعی نے کہا ہمارے رفقاء (شافعیہ) کا صحیح قول یہی ہے کہ غلام اپنی مالکہ کا محرم نہیں ہے۔ نووی نے لکھا ہے یہی صحیح ہے بلکہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہ فیصلہ قطعی ہے، غلام اپنی مالکہ کا محرم ہو اس کی کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ آیت کی صحیح تفسیر یہی ہے کہ ماملکت سے مراد صرف باندیاں ہیں صاحب ہدایہ نے کہا ہمارے قول کی دلیل یہ ہے کہ غلام بہر حال مرد ہے اور شوہر نہیں ہے اور نہ محرم ہے (اجنبی ہے) اور اشتہائے نفسانی کا خطرہ موجود ہے۔ آزاد ہونے کے بعد اپنی مالکہ سے وہ نکاح کر سکتا ہے اور ایسا پیش خدمت نہیں ہے کہ اس سے زینت کا اخفاء نہ کیا جا سکتا ہو۔ غلام تو باہر کا کام کرج کرتے ہیں اندرون خانہ خدمت تو باندیاں کرتی ہیں۔ پس آیت مذکورہ میں صرف باندیاں ہی مراد ہیں۔ سعید بن میتب اور حسن وغیرہ نے کہا تھا تم کو سورۂ نور کی آیت کا غلط مطلب نہ لینا چاہئے، وہ تو صرف عورتوں کے متعلق ہے مردوں کے لئے نہیں ہے۔

یہ تفسیر اسی وقت صحیح ہوگی جب نساء ھن سے مراد آزاد مسلمان عورتیں ہوں۔ عام مسلمان عورتیں مراد نہ ہوں۔ ورنہ ماملکت ایمانھن سے بے فائدہ تکرار لازم آئے گی۔ حاصل یہ کہ مسلمان عورت کے لئے کافر آزاد عورت کے

سامنے اپنی زینت کا اظہار امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز نہیں۔

امام مالک نے فرمایا ما ملکت ایمانھن کا لفظ اپنی باندیوں کو بھی شامل ہے اور اپنے غلاموں کو بھی۔ اپنا غلام بھی مثل دوسرے محارم کے ہوتا ہے جو زینت دوسرے محرم کے سامنے ظاہر کی جاسکتی ہے وہ اپنے غلام کی سامنے بھی ظاہر کی جاسکتی ہے اور عورت کا جو حصہ زینت محرم دیکھ سکتا ہے وہ اس عورت کا غلام بھی دیکھ سکتا ہے۔

امام شافعی نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور جمہور شافعیہ کے نزدیک یہی روایت زیادہ صحیح بھی ہے (ابو حامد شافعی اور نووی شافعی کی رائے اس کے خلاف اوپر گزر چکی) گھر کے غلام بغیر اجازت طلب کرنے کے اندر آتے جاتے رہتے ہی ہیں اور بغیر اجازت اندر آنے کی عام ضرورت بھی رہتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہ سے بھی ایسی ہی روایات منقول ہیں حضرت انس کی روایت کردہ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک غلام سیدہ فاطمہ کو عطا فرمایا اور غلام کو ساتھ لے کر حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے گئے اس وقت حضرت سیدہ کے پاس صرف اتنا کپڑا تھا کہ اگر سر چھپاتی تھیں تو پاؤں کھلے رہتے تھے اور ٹانگیں چھپاتی تھیں تو سر تک کپڑا نہیں پہنچتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ملاحظہ فرمائی تو ارشاد فرمایا کوئی حرج نہیں (کوئی غیر نہیں ہے) صرف تمہارا باپ اور تمہارا غلام ہے۔ رواہ ابو داؤد۔ اس حدیث کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ غلام چھوٹی عمر کا ہو۔ حدیث میں جو لفظ غلام آیا ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے (غلام کا معنی ہے لڑکا)

حضرت ام سلمہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کسی مکاتب غلام کی رقم (کتابت) پوری ادا ہو جائے تو اس کو مکاتب سے پردہ کر لینا چاہیئے۔ رواہ الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ اس حدیث سے (غلام سے کامل پردہ نہ کرنے پر) استدلال مفہوم مخالف کے اعتبار سے کیا جاسکتا ہے۔ (حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر بدل کتابت پورا ادا نہ ہو اور غلام آزادی حاصل نہ کر سکا ہو تو اس سے پردہ نہ کرنا چاہیئے)۔

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ یا ان مردوں پر جو طفیلی کے طور پر رہتے ہوں اور ان کو ذرا توجہ نہ ہو۔

غیر اولی الاربۃ یعنی جن کو عورتوں کی طرف رغبت نہ رہی ہو۔ مراد ہیں پیر فرتوت۔ بہت بوڑھے، ازکار رفتہ۔ ان کو تابعین اس لئے کہا گیا کہ یہ خود کوئی کمائی نہیں کر سکتے، گھر والوں کے تابع ہوتے ہیں تاکہ بچا کھچا کھانا ان کو مل جائے۔ حسن نے کہا غیر اولی الاربۃ وہ لوگ ہیں جن کو انتشار نہ ہو سکتا ہو، عورتوں سے قربت نہ کر سکیں اور نہ عورتوں کی رغبت ان میں باقی رہی ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا نامرد مراد ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا ناقص العقل خبطی مراد ہیں عکرمہ نے کہا ذکر بریدہ مراد ہیں بعض نے کہا مخنث مراد ہیں۔ مقاتل نے کہا پیر فرتوت ازکار رفتہ اور نامرد اور خصی اور ذکر بریدہ سب مراد ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ خصی اور ذکر بریدہ نامحرم عورت کے معاملہ میں نر کا حکم رکھتے ہیں۔ ہدایہ میں ہے خصی نر قابل جماع ہوتا ہے اور ذکر بریدہ کی بھی یہی حالت ہوتی ہے، مس کر سکتا ہے، رگڑ سکتا ہے اس کو انزال ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ زنانہ جو بدفعلیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے زنانہ بن گیا ہو وہ بھی بدچلن نر ہوتا ہے یہ سب لوگ آیت قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ کے حکم میں داخل ہیں، آیت کا حکم ذکر بریدہ خصی اور مخنث کو بھی شامل ہے اور یہ شمول قطعی ہے۔ اور آیت التابعین غیر اولی الاربۃ میں ان ذکر بریدہ خصی وغیرہ کا شامل ہونا قطعی نہیں ہے اس لئے اول آیت میں جو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ان پر لاگو ہوگا۔ صاحب کفایہ نے لکھا ہے کہ ہدایہ میں جو مخنث کے ساتھ بالروی من الافعال کی شرط لگائی گئی ہے اس کی مراد یہ ہے کہ وہ مخنث مراد ہیں جو مفعولیت میں مبتلا ہوں وہ مخنث مراد نہیں ہیں جن کے اعضا میں نرمی اور زبان میں لوچ اور لچک ہو خلقی مخنثوں کی مشابہت ان میں پائی جاتی ہے، عورتوں کی طرف نفسانی میلان نہ رکھتے ہوں اور فاسقانہ مفعولیت میں مبتلا

نہ ہوں۔ ہمارے بعض مشائخ نے ایسے لوگوں کو عورتوں کے پاس آنے جانے کی اجازت دی ہے یہ غیر اولی الاربة من الرجال میں داخل ہیں۔

میں کہتا ہوں اصلی فطری خنثیٰ جس کے پاس آلۂ مردانگی بھی ہوتا ہے اور شرمگاہ نسوانی بھی۔ اگر اس میں نسوانی علامات نمایاں ہوں، مثلاً عورتوں کی طرح پستان ہوں یا عورت کی مثل پستانوں میں دودھ اتر آئے، حیض آتا ہو یا حمل ہو، یا شرمگاہ نسوانی سے اس سے جماع کیا جاسکتا ہو تو ایسا خنثیٰ عورت کے حکم میں ہے۔ ورنہ مرد کا حکم اس پر لاگو ہوگا، عورتوں کے لئے اس کے سامنے اظہار زینت جائز نہ ہوگا۔ اور اگر خنثیٰ مشکل ہے تو محتاط طریقہ اختیار کیا جائے گا نہ وہ مردوں کے سامنے اپنا کشف کر سکے گا نہ عورتیں اس کے سامنے اپنی زینت کو نمایاں کر سکیں گی۔ واللہ اعلم۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ام سلمہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہ کے پاس موجود تھے اور گھر میں ایک مخنث بھی موجود تھا، مخنث نے حضرت ام سلمہ کے بھائی حضرت عبداللہ بن امیہ سے کہا عبداللہ! اگر کل کو اللہ تم کو طائف کی فتح عنایت فرمادے تو میں تم کو غیلان کی بیٹی کا پتہ بتاؤں گا، وہ چار کے ساتھ سامنے سے آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ پیٹھ موڑ کر جاتی ہے (یعنی اس کے حسن کا یہ عالم ہی کہ جب وہ سامنے سے آتی ہے تو پیٹ پر چار شکنیں پڑتی دکھائی دیتی ہیں اور پشت پھیر کر واپس جاتی ہے تو آٹھ شکنیں نمودار ہوتی ہیں، چار دائیں پہلو کی طرف اور چار بائیں پہلو کی طرف) حضور ﷺ نے فرمایا، یہ لوگ تمہارے پاس اندر نہ آئیں۔

بعض علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ عورتوں کے پاس مخنثوں کا آنا جائز نہیں۔ لیکن یہ استدلال کمزور ہے۔ کیونکہ جب تک اس مخنث نے بنت غیلان کے حسن کے احوال بیان نہیں کئے تھے حضور ﷺ نے اس کو گھر کے اندر برقرار رکھا تھا اور گھر میں داخل ہونے کی ممانعت نہیں فرمائی تھی پھر جب اس نے بنت غیلان کی کیفیت بیان کی تو آپ نے ممانعت فرما دی گویا بناء حکم بنت غیلان کی حالت کا بیان (اور مرد کو اس کی طرف راغب بنانا) تھا تو یہ علت وہی ہے جس کی موجودگی میں عورت کا عورت کے پاس داخلہ بھی ممنوع ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں اوپر آچکا ہے۔

اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ ۪ ایسے لڑکوں کے لئے جو عورت کے پردہ کی باتوں سے ناواقف ہیں۔ الطفل اسم جنس ہے جمع پر اس کا اطلاق کیا گیا، کیونکہ اس کی صفت بصیغۂ جمع ذکر کی گئی ہے۔ لم یظھروا الخ یعنی بالغ نہ ہوئے ہوں۔ یا جماع کی قدرت نہ رکھتے ہوں ظھر علی زید کا معنی یہ بھی آتا ہے کہ وہ زید پر قابو پا گیا قادر ہو گیا۔ یا یہ مراد ہے کہ عورتوں کے پردے کے مقامات کو انہوں نے کھولا نہ ہو یا پردہ کی باتوں کی ان کو ابھی واقفیت نہ ہوئی ہو۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ حد شہوت کو نہ پہنچے ہوں اور ان میں ابھی صلاحیت نہ پیدا ہوئی ہو۔

مجاہد نے کہا اتنے چھوٹے بچے مراد ہیں جن کو عورتوں کو چھپی اور کھلی باتوں میں کوئی تمیز ہی نہ ہو وہ جانتے ہی نہ ہوں پردہ کی چیز کیا ہوتی ہے۔ اول معنی مراد لینا زیادہ صحیح ہے کیونکہ جو بچے شعور و تمیز کو پہنچ گئے ہوں حد شہوت کو نہ پہنچے ہوں ان کے سامنے عورتیں باقی حصۂ بدن کھول سکتی ہیں صرف ناف سے زانو تک نہیں کھول سکتیں۔ آیت لِيَسۡتَاۡذِنۡكُمُ الَّذِيۡنَ مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ وَالَّذِيۡنَ لَمۡ يَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡكُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اور اگر بچہ اتنا چھوٹا ہے کہ کچھ شناخت اور تمیز نہیں رکھتا تو وہ چوپایوں درختوں اور پتھروں کی طرح ہے اس کے سامنے ہر طرح کی پردہ کشائی جائز ہے یہاں تک کہ عورت مغلظہ کی برہنگی بھی درست ہے۔ اور اگر لڑکا مراہق ہے (حد بلوغ کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے) تو وہ مردوں کے حکم میں ہے۔

ابن جریر نے حضرمی کی روایت سے بیان کیا کہ ایک عورت نے چاندی کی دو بازیبیں بنوائیں اور ان میں گھنگھرو لگائے، پھر لوگوں کے سامنے سے گزری اور پاؤں زمین پر پٹخے اور اس طرح گھنگرو پازیب سے ٹکرا کر بولے، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ اور اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ ان کا چھپا ہوا زیور (لوگوں کو) معلوم ہو جائے۔

بغوی نے لکھا ہے عورت جب چلتی تھی تو پاؤں زمین پر مارتی تھی تاکہ اس کی پازیب کی آواز لوگ سن لیں۔ اس کی ممانعت کر دی گئی، کیونکہ یہ حرکت مردوں کے دلوں میں اس عورت کی طرف میلان پیدا کرتی تھی۔

بیضاوی نے لکھا ہے زیور کو ظاہر کرنے کی ممانعت سے زیادہ زور اس بات میں ہے کہ زیور کی آواز پیدا ہونے سے ہی روک دی جائے۔ اس لئے بیضاوی نے النوازل میں صراحت کی ہے کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔ اسی پر یہ مسئلہ مبنی ہے کہ عورت کا عورت سے قرآن سیکھنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے ہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے۔ متفق علیہ۔

ابن ہمام نے لکھا ہے اسی وجہ سے اگر کہا جائے۔ کہ عورت نماز میں اگر جہری قرأت کرے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو اس کی بنیاد معقول ہے امام کو نماز میں اگر سہو ہو جائے تو اس کو متنبہ کرنے کے لئے بجائے اس کے کہ عورت آواز سے سبحان اللہ کہے رسول اللہ ﷺ نے اس کو تالی بجا دینے کا حکم دیا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا قدم بھی عورت ہے۔

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ اور اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ سے توبہ کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں کوتاہی ہر شخص سے ہوتی ہے اس لئے سب کو توبہ کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام نبی آدم خطاوار ہیں اور خطاواروں میں سب سے اچھے توبہ کرنے والے ہیں۔ رواہ الترمذی و ابن ماجہ و الدارمی۔

بعض نے کہا جاہلیت کے زمانہ میں تم جو کچھ کرتے تھے اس سے توبہ کرو، اسلام کی وجہ سے اگرچہ پچھلے دور کفر کے اعمال قابل مواخذہ نہیں رہے، لیکن جب بھی ان بداعمالیوں کی یاد آجائے ان پر ندامت تو بہر حال واجب ہی ہے اور ان کو دوبارہ اختیار نہ کرنے کا پکا ارادہ لازم ہی ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

فلاح دارین توبہ ہی سے وابستہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا، اس شخص کے لئے خوشی ہے جو اپنے اعمال نامے میں بکثرت استغفار پائے گا۔

حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے لوگو! اپنے رب کی طرف رجوع کرو۔ میں ہر روز سو بار اپنے رب کے سامنے توبہ کرتا ہوں۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم میں دن میں ستر بار سے زیادہ اپنے رب سے معافی مانگتا اور توبہ کرتا ہوں۔ رواہ البخاری۔

اعرابی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلاشبہ میرے دل پر کثافت آجاتی ہے میں دن میں سو مرتبہ اللہ سے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابن عمر کا بیان ہے ہم گنتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مجلس میں سو بار فرماتے تھے رب اغفرلی وتب علی انک انت التواب الغفور۔ رواہ الترمذی و ابن ماجۃ و ابو داؤد۔

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ جب کہ گزشتہ آیات میں اللہ نے ان باتوں کی ممانعت فرما دی جو اکثر زنا کی طرف لے جاتی ہیں تو اب اس آیت میں نکاح کا حکم دیا۔ (تاکہ فطرت انسانی کا تقاضا جائز طور پر پورا ہو سکے) نکاح نظروں کو نیچا رکھنے والا اور زنا سے بچانے والا ہے۔ انکحوا میں خطاب اولیا اور سرپرستوں کو ہے۔ ایامی اصل میں ایایم تھا، جیسے یتامی کی اصل

یتایم بھی ایم کی جمع اَیامی ہے ایم اس مرد کو بھی کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو اور اس عورت کو بھی کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو۔

وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اور اپنے غلاموں اور باندیوں میں سے ان کا بھی نکاح کر دو جو صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ امر استحبابی ہے (واجب نہیں ہے) صالحین نیک لوگ۔ صالح ہونے کی شرط نکاح کرانے کے لئے لازم نہیں غیر صالح کا نکاح کرانا بھی مستحب ہے لیکن جو باندی غلام نیک ہوں ان کے دین کی حفاظت اور ان کی پرہیزگاری کی نگہداشت کی اہمیت زیادہ ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ صالحین کا نکاح کرانے کی ہدایت کی۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ صالحین سے مراد ہیں وہ لوگ جن میں نکاح کرنے اور حقوق نکاح ادا کرنے کی صلاحیت و اہلیت ہو۔

مسئلہ :- اگر جوش صنفی غالب ہو، اور حرام میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو نکاح واجب ہے۔ صاحب نہایہ نے لکھا ہے اگر زنا میں مبتلا ہو جانے کا ڈر ہو اور بچنے پر قدرت نہ ہو تو ایسی حالت میں نکاح فرض ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے اگر ایسا قوی اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کرے گا تو اپنے پر قابو نہ پا سکے گا۔ یقیناً حرام میں مبتلا ہو جائے گا تو نکاح فرض ہے اور اگر مغلوبیت اس حد تک نہ ہو بلکہ جوش کی وجہ سے مبتلاء معصیت ہو جانے کا خطرہ ہو تو نکاح واجب ہے لیکن یہ وجوب اس وقت ہے جب حقوق نکاح ادا کرنے کا یقین ہو نکاح کے بعد حق تلفی کا اندیشہ نہ ہو، اگر لوازم نکاح ادا نہ کر سکنے کا خوف ہو تو نکاح مکروہ ہے۔ ابن ہمام نے یہ بھی لکھا ہے کہ حق تلفی کا خوف بھی تفصیل طلب ہے اگر فریضہ نکاح کے تلف ہونے کا حق یقین ہو تو نکاح حرام ہے اگر حق تلفی کا خطرہ ہو یقین نہ ہو تو نکاح مکروہ تحریمی ہے۔

بدائع میں ذکر کیا گیا ہے جوش شہوانی (کے وقت جو نکاح فرض ہو جاتا ہے اس) کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ بقدر مہر معجّل ادا کرنے اور نفقہ برداشت کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ اگر جوش شہوانی کے ساتھ یہ شرطیں بھی موجود ہوں اور نکاح نہ کرے تو گناہ گار ہو گا۔

اگر اعتدال کی حالت ہو تو داؤد اور دوسرے اہل ظاہر کہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی ہر مرد اور عورت پر نکاح فرض عین ہے۔ لیکن عمر میں ایک مرتبہ بشرطیکہ جماع پر قدرت ہو اور نفقہ برداشت کر سکتا ہو۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (یعنی یہ امر وجوب کے لئے ہے) حضرت سمرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ مجرد رہنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے عکاف سے فرمایا کیا تیری بیوی ہے عکاف نے کہا۔ نہیں فرمایا اور کوئی باندی بھی نہیں ہے۔ عکاف نے کہا، نہیں۔ فرمایا تو خوش حال مالدار بھی ہے عکاف نے کہا میں فراخ حال ہوں (مالدار ہوں) فرمایا، تب تو شیطان کے بھائیوں میں سے ہے۔

یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا، ہماری سنت (طریقہ) نکاح ہے تم میں جو لوگ مجرد ہیں وہ برے لوگ ہیں اور جو مجرد ہونے کی حالت میں مر گئے وہ بہت رذیل مردے ہیں۔ رواہ احمد۔

حضرت انس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نکاح کرنے کا حکم دیتے تھے اور مجرد رہنے کی سختی کے ساتھ ممانعت فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے اس عورت سے نکاح کرو جو شوہر سے بہت زیادہ محبت کرنے والی اور بکثرت بچے پیدا کرنے والی ہو۔ میں قیامت کے دن متقی لوگوں کے مقابلے میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی۔

سورۂ نساء کو آیت فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کی تفسیر میں اسی طرح کی حدیث گزر چکی ہے۔ بعض حنفیہ قائل ہیں کہ نکاح واجب بالکفایہ ہے یعنی سب پر واجب ہے لیکن سب کا نکاح کرنا ضروری نہیں کچھ لوگ نکاح کر لیں تو سب کی طرف سے واجب ادا ہو جائے گا۔ قانون نکاح جاری کرنے کی غرض یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں باقی رہیں ان کی نسل ختم نہ ہو جائے اور یہ غرض کچھ لوگوں کے نکاح کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

نکاح فرض عین نہیں ہے اس پر اجماع امت ہے، داؤد جیسے لوگوں کا اس کو فرض عین قرار دینا خلاف اجماع ہے، بعض علماء نے واجب بالکفایہ ہونے کے ثبوت میں آیت فانکحوا ما طاب لکم من النساء پیش کی ہے اس آیت میں جتنی عورتوں سے بیک وقت نکاح کیا جاسکتا ہے ان کی تعداد بیان کرنی مقصود ہے اور خطاب سرپرستوں کو ہے کہ اگر ایامی نکاح کرنا چاہیں تو وہ نکاح سے نہ روکیں۔ رہیں احادیث مذکورہ تو وہ آحاد ہیں اور احادیث سے آحاد سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔

بعض کے نزدیک نکاح تو سنت مؤکدہ ہے بعض کے نزدیک مستحب لیکن سنت یا مستحب ہونا صرف اس شرط کے ساتھ ہے کہ جماع پر قدرت رکھتا ہو بیوی کا خرچ اٹھا سکتا ہو اور حق تلفی کا اس کو خطرہ نہ ہو ان میں سے اگر کوئی شرط مفقود ہو تو نکاح مکروہ ہے یا حرام۔

عملی سنت ہونے کا ثبوت رسول اللہ ﷺ کے دوامی عمل سے ملتا ہے اور قولی سنت کے ثبوت کے لئے یہ حدیث کافی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، اے گروہ جوانان تم میں سے جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہے وہ نکاح کرلے اور جس میں مالی استطاعت نہ ہو وہ روزے رکھے روزہ اس کے لئے شہوت شکن ہے۔ (خصی بننے کی ضرورت نہیں، روزہ خود ایسا ہی شہوت شکن ہے جیسے خصی ہونا) متفق علیہ من حدیث ابن مسعود۔

ابن ماجہ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت پر عمل نہیں کیا وہ مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ (یعنی میری تعلیم سے اس کا تعلق نہیں) نکاح کرو۔ دوسری امتوں کے مقابلہ میں، میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ جو استطاعت رکھتا ہو اس کو نکاح کرنا چاہئے جو استطاعت نہ رکھتا ہو اس کو روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن میمون ہے اور یہ راوی ضعیف ہے۔

صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں روزے رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے (یعنی میرا نہیں ہے مجھ سے اس کا تعلق نہیں ہے)۔

ترمذی نے ایوب کی روایت سے لکھا ہے کہ پیغمبروں کی چار سنتیں ہیں، حیا، خوشبو کا استعمال، مسواک اور نکاح۔

ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص طاہر اور مطہر ہونے کی حالت میں اللہ سے ملنے کا خواستگار ہو اس کو آزاد عورتوں سے نکاح کرنا چاہئے۔

نکاح کا جو حکم ہم نے سطور بالا میں بیان کیا وہ علماء حنفیہ کے موافق ہے امام احمد کا بھی یہی قول ہے امام شافعیؒ کے نزدیک ہر حالت میں نکاح استحباب سے آگے نہیں بڑھتا اور استحباب بھی اس وقت ہوگا کہ جماع پر قدرت رکھتا ہو، خرچ برداشت کرسکتا ہو اور حق تلفی کا اس کو خطرہ نہ ہو، ان شرائط کی موجودگی میں اگرچہ نکاح مستحب ہے لیکن عبادت کے لئے یکسوئی حاصل کرنے کی غرض سے نکاح نہ کرنا افضل ہے اور اگر مذکورہ تینوں شرطوں میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو نکاح حرام یا مکروہ تحریمی ہے، ہاں اگر جوش شہوانی سے مغلوب ہو اور حرام میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو تو نکاح کا استحباب زیادہ قوی ہو جاتا ہے، اس حالت میں نفل نماز، نفل روزے، نفل حج اور نفل جہاد سے نکاح افضل ہے، امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔

فریقین کے اختلاف کا خلاصہ یہ ہے کہ

جس شخص کو حقوق ادا نہ کرسکنے کا خوف ہو یا نکاح کرنے کی وجہ کسی حرام کام میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے نکاح حرام یا مکروہ تحریمی ہے اور جو شخص جوش شہوانی سے مغلوب ہو اور خوف ہو کہ نکاح نہ کرنے کی وجہ سے زنا میں مبتلا ہو جائے گا اور حقوق نکاح ادا کرنے کی اس میں استطاعت بھی ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح واجب ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک واجب تو نہیں مگر تاکیدی مستحب ہے۔

میں کہتا ہوں زنا حرام ہے اور حرام کی ضد واجب ہی ہے پس جس شخص کو زنا میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو اس کے لئے

نکاح واجب ہی ہو گا۔ باقی اگر اعتدال کی حالت ہو مغلوب کن جوش نہ ہو اور زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور نکاح کرنے کی صورت میں حق تلفی کا خطرہ نہ ہو اور حقوق نکاح ادا کرنے پر قدرت ہو تو ایسے شخص کے لئے نکاح اگرچہ سنت مستحبہ ہے لیکن عبادت کے لئے یکسوئی حاصل کرنے کی غرض سے نکاح نہ کرنا افضل ہے یا نکاح کرنا، امام ابو حنیفہ کے نزدیک عبادت کے لئے یکسوئی حاصل کرنے سے نکاح افضل ہے اور امام شافعیؒ عبادتی یکسوئی کا حصول اور ترک نکاح کو افضل کہتے ہیں۔ امام شافعی نے اپنے قول کے ثبوت میں حضرت یحیٰی پیغمبر کی شخصیت کو پیش کیا ہے جن کی اللہ نے تعریف کی ہے، انہوں نے عورتوں سے کامل انقطاع کر لیا تھا باوجود یہ کہ ان کے اندر قدرت اور مردانگی تھی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو روکے رکھا اللہ نے ان کی تعریف میں سَیِّدًا وَّحَصُوْرًا فرمایا، حصور کا یہی معنی ہے۔ ابن ہمام نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ یہ وصف قابل ستائش حضرت یحیٰی کی شریعت میں تھا، اس لئے اللہ نے اس وصف کی وجہ سے حضرت یحیٰی کی تعریف فرمائی ہے۔ ہماری شریعت میں تو رہبانیت ناجائز ہے پھر ایک طرف حضرت یحیٰی کا یہ حال تھا کہ آپ نے کبھی کسی عورت سے نکاح نہیں کیا، دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے کہ حضور ﷺ نے متعدد عورتوں سے نکاح کئے، دونوں میں تضاد ہے ہمارے لئے ہمارے رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہی شمع راہ ہے اگر ترک نکاح افضل ہوتا تو نا ممکن تھا کہ اللہ افضل الانبیاء کو وقت وفات تک ترک افضل پر قائم رکھتا۔

شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے کہ چند صحابہ نے امہات المومنین سے اندرون خانہ پوشیدگی میں رسول اللہ ﷺ کے اعمال کے متعلق دریافت کیا معلوم ہوا کہ گھر کے اندر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اوقات غیر معمولی عبادت میں نہیں گزرتے تھے، آپ سوتے بھی تھے عبادت بھی کرتے تھے تو کہنے لگے ہم میں سے کون رسول اللہ ﷺ کی طرح ہو سکتا ہے، حضور ﷺ کی فرد گزاشتیں تو اللہ نے پہلے ہی سے معاف فرما دی ہیں ایک صاحب بولے، میں تو عورتوں سے قربت ہی چھوڑ دوں گا، دوسرے نے کہا میں گوشت نہیں کھاؤں گا، تیسرے کہنے لگے میں بستر پر نہیں سوؤں گا، اس گفتگو کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھی پہنچ گئی (دوسرے دن حضور ﷺ نے ایک تقریر کی اور خطبہ میں) حمد و ثناء کے بعد فرمایا کیا وجہ کہ کچھ لوگوں نے ایسی باتیں کیں، میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (متعلق) نہیں ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا، نکاح کرو۔ اس امت کے سب سے افضل آدمی کی بیبیاں بہت تھیں، یعنی رسول اللہ ﷺ جو سب سے افضل تھے آپ کی بیبیاں بھی بہت تھیں اور بیبیوں کی کثرت نے آپ کے مرتبہ کی عظمت کم نہیں کی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ مجرد رہنے کی حضور ﷺ نے سخت ممانعت فرمائی ہے۔

تحقیق موضوع

میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ جو شخص اپنے لئے نکاح کرنے اور اہل و عیال سے تعلق رکھنے کو تعلق باللہ رکھنے میں رکاوٹ نہیں سمجھتا اس کو اپنے اوپر اتنا قابو ہے کہ باوجود ان مشاغل کے عبادت اور ذکر اللہ کی کثرت اور تعمیر اوقات میں اس کے کوئی فرق نہیں آسکتا تو اس کے لئے نکاح افضل ہے رسول اللہ ﷺ اکثر انبیاء، صحابہ کرام اور بیشتر علمائے صالحین اسی درجہ پر فائز تھے، باوجود کثرت موانع کے ان بزرگوں کے مجاہدے میں کوئی فرق نہیں آسکتا ہے ان کا مرتبہ یقیناً "بہت اونچا تھا اور ان کا ثبات فکر و نظر نہایت پختہ تھا اور ان کا عملی جہاد نفس سب عوائق و موانع پر غالب تھا۔ لیکن جو شخص اپنے آپ کو اتنا راسخ القدم نہیں سمجھتا وہ ڈرتا ہے کہ نکاح کرنے اور اہل و عیال کی پرورش میں مشغول ہونے سے اس کے تعمیری اوقات میں فرق آجائے گا اس کے دل کی دنیا اجاڑ ہو جائے گی وہ پراگندہ خاطر ہو کر ذکر اللہ کی کثرت نہ کر سکے گا۔ اور انقطاع کلی میں رخنہ پیدا ہو جائے گا۔ اس کے لئے ترک نکاح افضل ہے لیکن یہ ترک کی افضلیت اس وقت ہے جب اس کو زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اللہ نے ذکر خدا اور تعلق باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ پر زور دیتے ہوئے تمام پرکشش اسباب دنیا اور پر فریب جذبات قرابت سے مغلوب نہ ہونے کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔

یا یھا الذین امنوا ان من ازواجکم و اولاد کم عدوا لکم۔ فاحذرو ھم۔

اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال و الاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کریں جو لوگ ایسا کریں گے وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیبیاں اور تمہارے مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے خراب ہونے کا تم کو اندیشہ ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان جو تمہارے مسکن ہیں اگر تم کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو منتظر رہو کہ اللہ اپنے امر کو لے آئے۔

اے ایمان والو! تمہاری کچھ بیبیاں اور اولاد تمہاری دشمن ہیں ان سے احتیاط رکھو۔

یہ ظاہر ہے کہ نفل عبادت بہر حال عبادت ہے اور نکاح فی نفسہ ایک جائز کام ہے اپنی اصلیت کے لحاظ سے عبادت نہیں ہے اس کو عبادت کے لئے وضع نہیں کیا گیا اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو نکاح کرنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہوتا، تمام عبادات کے لئے اسلام اولیں شرط ہے۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہو تو اس کی ہجرت (فی سبیل اللہ ہجرت نہ ہوگی بلکہ) اسی کام کے لئے ہوگی جس کے لئے اس نے وطن چھوڑا ہوگا۔ غور کرو کہ اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ترک وطن کرنے کو فی سبیل اللہ (یعنی عبادت کے لئے) ہجرت قرار دیا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی چیزوں میں سے میرے لئے عورتیں اور خوشبو مرغوب بنادی گئی ہیں اور خنکی چشم مجھے نماز میں ملتی ہے۔ رواہ النسائی والطبرانی واسنادہ حسن۔

یہ حدیث صراحۃً بتا رہی ہے کہ عورتوں سے نکاح خوشبو کی طرح دنیوی مباح امور میں سے ہے۔ حقیقت میں نکاح سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں اور جو مصالح اس سے وابستہ ہیں ان کی وجہ سے نکاح کو امر مستحب کہا جاتا ہے ورنہ امر مباح سے زائد اس کی فی نفسہ کوئی حیثیت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے نکاح اور خوشبو لگانے کو پیغمبروں کا طریقہ فرمایا ہے اور سنن انبیاء میں سے قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز سنن ہدیٰ میں سے ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ سنت زائدہ ہے سنت عادیہ ہے۔ سنت ہدیٰ تو وہ سنت ہے جس پر بطور عبادت رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ پابندی کی ہو۔

ایک شبہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (متعلق) نہیں ہے۔ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ نکاح سنت ہدیٰ ہے۔

جواب: اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نکاح سنن ہدیٰ میں سے ہے، بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس کام کو خود کیا اور پسند فرمایا اس سے کترانا اور برا سمجھنا ضرور موجب عتاب اور باعث ناراضگی ہے لیکن برا نہ سمجھنا اور انکار نہ کرنا صرف ترک کرنا تو موجب عتاب نہیں ہے۔ حدیث میں اعراض سے مراد ہے انکاری اعراض اور برا سمجھ کر ترک کرنا۔ ہاں سنت ہدیٰ کو تو ترک کرنا بھی موجب عتاب ہے اس لئے نکاح سنت ہدیٰ نہیں ہے۔

معارضہ

حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، دنیا کی تین چیزیں مجھے محبوب ہیں، (۱) خوشبو، (۲) عورتیں اور (۳) نماز نماز کو میری آنکھ کی ٹھنڈک بنادیا گیا ہے، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نکاح دنیوی امور میں سے ہے تو نماز بھی دنیوی امور میں سے ہے۔

جواب

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو مسند نہیں قرار دیا اور صراحت کی ہے کہ کسی مسند طریق سے ہم کو تین کا لفظ نہیں پہنچا۔ بلکہ اس کے خلاف وہ حدیث ہے جو مسلم نے حضرت عمرو بن العاص کی روایت سے مرفوعاً بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا دنیا متاع (فائدہ اندوزی کی چیز) ہے۔ اور دنیا کے متاع میں صالحہ عورت سب سے اچھی متاع ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح دنیاوی امور میں سے ہے۔

حاصل مدعا یہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں نکاح کے متعلق جو امر کا صیغہ آیا ہے اس سے مراد امر اباحت یا امر استحباب ہے (وجوبی امر مراد نہیں ہے)۔

رہی عکاف والی حدیث جس میں عکاف کو بیوی اور جاریہ نہ ہونے اخوان الشیاطین میں سے قرار دیا گیا ہے تو اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے جب جوش شہوانی مغلوب کن حدود میں داخل ہو گیا ہو اور فتنۂ زنا میں پڑ جانے کا خوف ہو (جیسا کہ عکاف کا واقعہ تھا) تو اس وقت بے شک یہی حکم ہوگا۔

نکاح اگرچہ امر مباح ہے عبادت نہیں ہے لیکن اگر اس کے اندر حسن نیت کا شمول ہو تو عبادت بن جاتا ہے مثلاً اپنی نظر نیچی رکھنا یا مسلمانوں کی تعداد بڑھانا مقصود ہو تو نکاح عبادت بن جاتا ہے مگر یہ بات صرف نکاح ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ کھانا، پینا، خریدنا بیچنا اور دوسرے مباح معاملات میں بھی اگر حسن نیت شامل ہو اور ثواب کے ارادہ سے کئے جائیں تو وہ بھی عبادت بن جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اللہ کے) فرض کے بعد حلال کی طلب بھی فرض ہے رواہ الطبرانی والبیہقی عن ابن مسعودؓ۔

طبرانی نے حضرت انس بن مالک کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کی ساتھ بھی بیان یہ ہے کہ حلال کی طلب ہر مسلمان پر واجب ہے۔ بقائے نسل کے لئے نکاح جس طرح فرض کفایہ ہے (تاکہ مسلمانوں کی نسل دنیا میں ختم نہ ہو) اسی طرح بقدر بقائے زندگی کھانا پینا ہر شخص پر فرض عین ہے اور تجارت زراعت وغیرہ دوسرے معاملات اور پیشے فرض کفایہ ہیں، اگر سب لوگ ان کو چھوڑ دیں گے تو معاشی انتظام درہم برہم ہو جائے گا اور دینی نظم بھی بگڑ جائے گا (اور سب گناہگار ہوں گے) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ امانت دار سچا تاجر (قیامت کے دن) انبیاء اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا، رواہ الترمذی عن ابی سعید الخدری وحسنہ، وابن ماجہ من حدیث ابن عمر۔

بغوی نے شرح السنۃ میں حضرت انس کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ لیکن (نکاح ہو یا تجارت یا زراعت یا کھانا پینا) ان تمام امور کی خوبی (یعنی عبادت ہو جانا) بالغیر ہے (حسن نیت کی وجہ سے یہ امور عبادت بن جاتے ہیں) اور ذکر خداوندی اور سب سے کٹ کر اللہ سے لو لگانا فی نفسہ عبادت ہیں ان کی خوبی ذاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ نوافل کی وجہ سے برابر میرا مقرب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، الحدیث رواہ البخاری۔ اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ میرا بندہ نکاح یا کھانے پینے سے برابر میرا قرب حاصل کرتا جاتا ہے۔ یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس وحی نہیں آئی کہ میں مال جمع کروں اور تاجروں میں سے ہو جاؤں بلکہ یہ وحی آئی ہے کہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کروں اور سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں۔ رواہ البغوی فی تفسیر سورۃ الحجر۔

حضرت یحییٰ کے مجرد رہنے کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ان کی شریعت میں مجرد رہنا افضل تھا اور ہماری شریعت میں رہبانیت منسوخ کر دی گئی ہے یہ جواب قطعاً بے کار ہے بلکہ تمام پیغمبروں کی شریعتوں میں نکاح کرنا مجرد رہنے سے افضل تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے چار چیزوں کو سنن انبیاء میں شمار کیا ہے ان چار چیزوں میں ایک نکاح کو بھی شامل کیا ہے۔ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ موسیٰؑ، ہارونؑ، ایوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، زکریاؑ وغیرہ ہم سب ہی نے نکاح کئے تھے اور یہ سب یحییٰ سے افضل تھے، شاید حضرت یحییٰ نے اپنے حق میں نکاح کرنا مناسب نہ سمجھا ہو، ان کو خوف ہو کہ نکاح سے میرے بعض اہم امور میں خلل پڑ جائے گا، پھر یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کی شریعت میں رہبانیت افضل تھی اور شریعت اسلامیہ میں منسوخ کر دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رہبانیت جو نصاریٰ نے اختیار کی تھی وہ بدعت تھی اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اللہ نے فرمایا ہے وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا حدیث میں جس رہبانیت و ترک دنیا کی ممانعت آئی ہے اس سے مراد وہی عیسائیوں والی رہبانیت ہے۔ اللہ کے ذکر کے لئے خلوت گزین ہونے اور مخلوق سے کٹ کر خالق سے لو لگائے رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔ اللہ کے ذکر اور انقطاع عن الخلق کا تو اللہ نے حکم دیا ہے، فرمایا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہیں جن کو ہنکا کر وہ پہاڑ کی چوٹی پر لے جائے (اور سب سے الگ ہو جائے) تاکہ فتنوں سے اپنے دین کو بچا کر بھاگ جائے رہبانیت سے مراد ہے ان جائز امور کو ترک کر دینا جن کو ترک کرنے کا کوئی ثواب نہیں، جیسے نکاح کا ترک کر دینا بستر پر سونا ترک کر دینا۔ گوشت ترک کر دینا، ہمیشہ چپ رہنا اور کلام کو ترک کر دینا، جیسے نصاریٰ کے راہب کیا کرتے تھے، اللہ نے فرمایا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ شریعت میں ممانعت اسی اختراعی خود ساختہ رہبانیت کی ہے۔ جائز شرعی رہبانیت کی ممانعت نہیں ہے۔ صحابہ کرام کی تعریف میں حدیث میں آیا ہے وہ رات میں راہب اور دن میں شیر تھے۔

فائدہ

امام شافعی کے مسلک کی تائید کرتے ہوئے بغوی نے لکھا ہے کہ آیت میں اللہ نے بیوہ عورتوں کے سرپرستوں کو رانڈوں کے نکاح کرا دینے کا حکم دیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے آقاؤں کو غلاموں اور باندیوں کا نکاح کرانے کا اختیار دیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیواؤں کے نکاح کرانے کا کامل اختیار ان کے سرپرستوں کو ہے۔ بغوی کا مقصد یہ ہے کہ (حسب مسلک شافعیؒ) آزاد عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح (خواہ وہ اپنی زبان سے ایجاب کرلے) ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ سورۂ بقرۃ کی آیت وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ کی تفسیر میں ہم نے اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف مفصل بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر بغوی کا اس آیت سے استدلال غلط ہے کیونکہ (ایامیٰ کا ترجمہ صرف بیوائیں غلط ہے) ایم اس مرد کو کہتے ہیں جس کی بی بی نہ ہو اور اس عورت کو بھی کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو خواہ دونوں کی شادی ہی نہ ہوئی ہو۔ ناکتخدا ہوں، یا شادی ہونے کی بعد شوہر سے اور شوہر بیوی سے محروم ہو گیا ہو۔ نابالغ اور بالغ کی بھی کوئی شرط نہیں، بڑے ہوں یا بچے بہر حال سب پر لفظ ایم کا اطلاق ہوتا ہے اور علماء امت کے نزدیک بالاتفاق مسلمہ ہے کہ بالغ مردوں کے نکاح کا اختیار سرپرستوں کو نہیں ہے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ نابالغ چھوٹی لڑکی کا کامل اختیار ولی کے ہاتھ میں ہے اس لئے ایامیٰ سے صرف عورتیں مراد لینا بے دلیل بات ہے ہاں اگر چھوٹے لڑکے اور نابالغ لڑکیاں مراد ہوں تو ٹھیک ہے (کیونکہ بالاتفاق نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کا اختیار سرپرستوں کا ہے)۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور مجاز نکاح کرا دینے سے مراد ہو نکاح سے نہ روکنا اور نکاح کرنے میں مدد کرنا گویا آیت یہ تعلیم دے رہی ہے کہ اگر غلام آقا سے بالغ عورت سرپرست سے اپنا نکاح کرانے کی درخواست کرے تو آقا اور ولی پر ان کا نکاح کرا دینا واجب ہے یہ مطلب امام شافعی کے مسلک پر ہوگا اور ان لوگوں کے نزدیک بھی آیت کا یہی مفہوم ہوگا جو عورتوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے نکاح کو جائز نہیں قرار دیتے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو آیت کا مقصد صرف یہ ہے کہ سرپرست لوگ عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں۔ یہی مفہوم آیت وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ کا ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر تمہارے پاس کوئی ایسا شخص پیام نکاح بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے (اپنی بہن، بیٹی یا عزیزہ کا) نکاح کر دو اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین پر فتنہ اور لمبا چوڑا بگاڑ پیدا ہو جائے گا (رسوائی ذلت اور زناکاری کا برا نتیجہ پیدا ہوگا) رواہ الترمذی۔

حضرت عمر بن خطابؓ اور انس بن مالک روای ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، توریت میں لکھا ہوا تھا کہ جس کی بیٹی بارہ سال کی ہو جائے اور وہ اس کا نکاح نہ کرے اس حالت میں اگر لڑکی کسی گناہ کا ارتکاب کر لے تو گناہ نکاح نہ کرنے والے پر پڑے گا۔

حضرت ابوسعید اور حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس کے لڑکا ہو وہ لڑکے کا اچھا نام رکھے اور اچھی تہذیب سکھائے، جوان ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے، اگر بالغ ہو جانے کے بعد اس کا نکاح نہیں کرے گا اور وہ کوئی گناہ کر بیٹھے گا تو اس کا گناہ باپ پر ہوگا، دونوں حدیثیں بیہقی نے شعب الایمان میں بیان کی ہیں۔

اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۲﴾

اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی بنا دے گا اور اللہ سمائی والا (اور) بخوبی جاننے والا ہے۔

نکاح سے روکنے والی چیز ناداری ہو سکتی ہے اس کے رد میں فرمایا کہ ناداری تم کو نکاح سے مانع نہ ہو کیونکہ اللہ تمام بندوں کے رزق کا ذمہ دار ہے مال تو آنے جانے والی چیز ہے (نہ اس کی ہونے پر بھروسہ نہ، نہ ہونے پر مایوسی) بعض نے کہا اس جگہ غنی بنا دینے سے مراد ہے قانع بنا دینا۔ بعض نے کہا غنا عطا کرنے سے مراد ہے، دوہرا رزق عطا کرنا۔ شوہر کا رزق اور بیوی کا رزق۔ اول الذکر تفسیر معنی زیادہ صحیح ہے۔ نکاح کرنے والے سے اللہ نے اس آیت میں وعدہ کیا ہے کہ نکاح کے بعد اس کی محتاجی اللہ دور کر دے گا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا، اس شخص پر تعجب ہے جو بغیر نکاح کے غنا کا طلب گار ہوتا ہے حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ دوسری جگہ فرمایا ہے اِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا نکاح کے سلسلہ میں اللہ کے حکم کی تعمیل کرو، اللہ نے جو تم سے غنی بنا دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اس کو پورا کرے گا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ حضرت قتادہ کا بیان ہے، حضرت عمر بن خطاب کا فرمان ہم سے نقل کیا گیا ہے۔ میں نے اس شخص کی طرح (عجیب آدمی) نہیں دیکھا جو نکاح کے ذریعہ غنا کا طلب گار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس سلسلہ میں اللہ نے وعدہ فرمایا ہے وہ فرماتا ہے نکاح کے ذریعہ سے غنا طلب کرو۔ نکاح کر کے ہی اللہ کے فضل کے خواستگار بنو۔ اس کے بعد آپ نے یہی آیۃ تلاوت فرمائی۔

بزار، خطیب اور دار قطنی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، عورتوں سے نکاح کرو، وہ خود مال لے کر آئیں گی (یعنی نکاح کے بعد اللہ تمہارے لئے فراخ دستی کے دروازے کھول دے گا) رواہ ابوداؤد فی مراسیلہ مرسلاً عن عروۃ۔

ثعلبی اور دیلمی مؤلف مسند الفردوس نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے نکاح کے ذریعہ سے رزق کی تلاش کرو۔ میں کہتا ہوں شاید یہ وعدہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نکاح کے ذریعہ سے پاک دامن رہنے کے خواستگار ہوتے ہیں اور رزق کا بھروسہ اللہ پر رکھتے ہیں۔ ذیل کی آیت سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔

وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغْنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

اور جن لوگوں کو نکاح میسر نہ ہو وہ پاک دامن رہیں، یہاں تک اللہ ان کو اپنے فضل سے صاحب مقدرت کر دے۔

نکاح سے مراد ہے نکاح کا سامان اور وہ چیزیں جن کے بغیر نکاح نہیں ہوتا، مثلاً مہر معجّل (اگر اس کی ضرورت ہو) اور خرچ۔ بیوی کا نان نفقہ۔ ناداری کی وجہ سے اس کو ڈر ہو کہ بیوی کا خرچ کہاں سے دوں گا، میری وجہ سے غریب کی حق تلفی ہوگی، ایسے شخص پر لازم ہے عفت قائم رکھنے کی کوشش کرے کم کھائے۔ زیادہ روزے رکھے۔ روزے رکھنے سے جوش شہوانی ٹوٹ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں استطاعت (یعنی نکاح کرنے کی استطاعت) نہ ہو اس پر روزے رکھنے لازم ہیں، روزہ اس کے لئے شہوت شکن ہو جائے گا۔

يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی اللہ اس کے لئے رزق میں کشائش پیدا کردے۔ فضل سے مراد ہے رزق اور غنی بنادینے سے مراد ہے رزق کو کشادہ کرنا۔

ابن السکن نے معرفت الصحابہ میں عبداللہ بن صبیح کے باپ کا بیان نقل کیا ہے۔ عبداللہ کے باپ نے کہا میں حضرت حویطب بن عبدالعزی کا غلام تھا، میں نے حویطب سے درخواست کی کہ مجھے مکاتب بنا دیجئے، انہوں نے انکار کیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ تمہارے جو مملوک (باندیاں ہوں یا غلام) مکاتب بنائے جانے کی درخواست کریں تو تم ان کو مکاتب بنادو۔

بغوی نے لکھا یہ آیت نازل ہوئی تو حویطب نے اپنے غلام کو سو دینار ادا کرنے کی شرط پر مکاتب بنادیا اور بیس دینار (تجارت وغیرہ کے لئے) اس کو خود دے دیئے، چنانچہ غلام نے کمائی کر کے سو دینار ادا کردیئے (اور آزاد ہو گیا) یہ غلام جنگ حنین میں شہید ہو گیا۔

آیت مذکور میں، جمہور علماء کے نزدیک امر استحبابی ہے (وجوبی نہیں مکاتب بنانا واجب نہیں) صاحب ہدایہ نے یہی لکھا ہے اور اسی کی صحیح قرار دیا ہے۔ صاحب ہدایہ کی مراد یہ ہے کہ ہمارے بعض اکابر جو آیت میں کَاتِبُوْهُمْ کو امر اباحت کہتے ہیں یہ غلط ہے یعنی آیت کا یہ مطلب نہیں کہ باندی غلام کو مکاتب بنانا تمہارے لئے جائز ہے بلکہ مراد ہے مکاتب بنانے کا مستحب ہونا، کیونکہ اگر امر کو اباحت کے لئے قرار دیا جائے گا۔ تو غلام کے اندر صلاحیت ہو یا نہ ہو بہر حال اس کو مکاتب بنانا جائز ہے، پھر صلاحیت کی شرط بے فائدہ ہے۔

دلیل استحباب کا رد اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ بر قول اباحت شرط صرف عادی ہو گی۔ (احترازی نہ ہو گی) قاعدہ یہی ہے کہ آقا اپنے غلام کو اسی وقت مکاتب بناتا ہے جب اس میں مکاتب ہونے کی صلاحیت پاتا ہے۔ اسی کو آیت میں بطور شرط بیان کر دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ واقعہ کا اظہار ہے۔

بعض متقدین کے نزدیک کاتبوا وجوب کے لے ہے (اگر مکاتب ہونے کی غلام درخواست کرے اور اس کے اندر اس کی صلاحیت محسوس کی جائے تو مکاتب بنانا واجب ہے) عطا اور عمرو بن دینار کا یہی قول ہے، ایک روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول آیا ہے۔ لیکن اس وجوب کی شرط یہ ہے کہ اتنے معاوضہ پر غلام مکاتب ہونے کی درخواست کرے جو واقعی بازار میں اس کی قیمت ہو سکتی ہو، یا اس سے زیادہ ادائیگی کا وعدہ کرے۔ بغوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابن سیرین نے اپنے آقا حضرت انس بن مالک سے درخواست کی کہ مجھے مکاتب بنا دیجئے۔ حضرت انس نے کچھ توقف کیا۔ ابن سیرین نے حضرت عمر سے جا کر شکایت کی۔ حضرت عمر دُرّہ لے کر حضرت انس پر چڑھ دوڑے۔ اور مکاتب بنانے کا حکم دیا۔ حضرت انس نے ابن سیرین کو مکاتب بنادیا۔

مکاتبت، عقد معاوضہ ہے اور عقد معاوضہ میں طرفین سے ایجاد و قبول ہونا ضروری ہے (ایک طرف کا ایجاب کافی نہیں ہے) کتابت کا معنی ہے ایجاب اور مکاتبت طرفین سے کتاب میں شرکت کو چاہتا ہے پس آقا کی طرف سے ایجاب اور غلام کی طرف سے قبول لازم ہے۔

مکاتبت، آزادی، بشرط ادائے مال نہیں ہے (جس کی درستی کے لئے غلام کی طرف سے قبول لازم نہیں) لہٰذا جو نابالغ

غلام خرید و فروخت کا شعور رکھتا ہو وہ عقد کتابت کو قبول بھی کر سکتا ہے۔ ہاں اگر اتنا بچہ ہو کہ اس کو خرید و فروخت کا بھی شعور نہ ہو یا دیوانہ ہو تو اس کے قبول کرنے سے عقد کتابت منعقد نہیں ہوتا۔

اگر آقا نے غلام سے کہا، میں نے تجھے اتنے مال کی شرط پر مکاتب بنایا اور غلام نے کہا، میں نے قبول کیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک معاہدہ مکمل ہو گیا، آقا کو یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر تو اتنا مال ادا کر دے تو آزاد ہے۔ امام مالک اور احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام شافعیؒ نے کہا، صرف الفاظ مذکورہ کے کہنے سے عقد مکاتبت مکمل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ بھی کہنا ہو گا کہ میں نے قسط وار اتنے مال کی ادائیگی کی شرط پر تجھے مکاتب کیا۔ اگر تو اتنا مال ادا کر دے تو آزاد ہے۔ اگر (اتنا مال ادا کر دے تو آزاد ہے کا لفظ) زبان سے نہ کہا مگر نیت یہی تھی تب بھی کافی ہو جائے گا، کذا فی المنہاج۔

مسئلہ:- امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر معاوضۂ کتابت فوری ادا کرنے کی شرط لگا دی تب بھی صحیح ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک کم سے کم ادائیگی دو قسطوں میں ہونا ضروری ہے اور قسط وار ادائیگی کی شرط لازم ہے۔ فی الفور ادائیگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ غلام کو فوراً مال کہاں سے مل سکتا ہے۔

امام اعظم نے کہا۔ عقد کتابت عقد معاوضہ ہے جیسے عقد بیع۔ بدل کتابت۔ ثمن (قیمت) کے مشابہ ہے۔ قیمت کا اقرار زبانی خرید کی صحت کے لئے کافی ہے۔ ادائیگی قیمت پر قدرت مشتری صحت عقد کے لئے لازم نہیں۔ مفلس بھی ہزاروں روپے کا مال خرید سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عقد کتابت کے وقت غلام کو کوئی شخص زکوٰۃ کی یا کسی اور قسم کی امدادی رقم دے دے اور غلام فوراً ادا کر دے۔ اگر غلام معاوضہ کتابت ادا کرنے سے قاصر رہے تو آقا دوبارہ اس کو حسب سابق بحیثیت غلام واپس لے سکتا ہے۔

مسئلہ:- عقد مکاتبت ہو چکنے کے بعد غلام پر آقا کا قبضہ نہیں رہتا، اب وہ ہر طرح کی خرید و فروخت، محنت مزدوری اور سفر کرنے کا مجاز ہو گا۔ البتہ آقا کی ملک سے باجماع علماء اس وقت تک خارج نہ ہو گا جب تک پائی پائی معاوضہ کی ادا نہ کر دے گا۔

مسئلہ:- عقد کتابت آقا کے لئے عقد لازم ہے آقا باختیار خود غلام کی رضامندی فسخ نہیں کر سکتا..... عقد کتابت کے بعد غلام کو آزادی کا استحقاق ہو جاتا ہے اور جس طرح آزاد کرنے کے بعد کو آقا فسخ نہیں کر سکتا اسی طرح غلام کے استحقاق آزادی کو بھی سلب نہیں کر سکتا۔ البتہ غلام پر اس عقد کا لزوم نہیں ہوتا اگر کمائی نہ کرے اور معاوضہ کتابت ادا نہ کر سکے تو اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی رضامندی سے عقد کتابت کو فسخ کر دیا جائے گا، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کا یہی قول ہے، ہاں اگر اس کے پاس اتنا مال موجود ہو کہ وہ مقررہ معاوضہ ادا کر سکتا ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک عقد مکاتبت فسخ نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو ادائے معاوضہ پر مجبور کیا جائے گا۔

امام مالک کے نزدیک نادار غلام کو کمائی کرنے پر مجبور کیا جائے گا، کتابت کو فسخ نہیں کیا جائے گا۔ غلام کو حق نہیں کہ وہ ناداری کی وجہ سے کتابت کو فسخ کر سکے۔

مسئلہ:- مکاتب چونکہ آقا کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتا اس لئے عقد کتابت کے بعد آقا کو اختیار ہے کہ غلام کا اس میں فائدہ ہے اس لئے بلاشبہ، بلا معاوضہ آزادی پر وہ راضی ہی ہو گا۔

مسئلہ:- مکاتب کو آقا فروخت کر سکتا ہے، دوسرا آقا پہلے آقا کے قائم مقام ہو جائے گا اور عقد مکاتبت حسب سابق قائم رہے گا فسخ نہیں ہو گا، غلام کتابت کا معاوضہ دوسرے آقا کو ادا کرے گا یہ امام احمد کا قول ہے اور شافعی کا بھی یہی اول قول تھا، امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مکاتب کو بغیر اس کی رضامندی کے فروخت نہیں کیا جا سکتا اگر مکاتب اپنی فروختگی پر راضی ہو جائے گا تو بیع صحیح ہو گی اور کتابت فسخ ہو جائے گی۔ امام شافعی کا قول جدید یہی ہے۔

امام ابو حنیفہ کے قول کی دلیل:- مکاتب اپنی آزادی کا مستحق بن جاتا ہے اور استحقاق کو آقا نہیں چھین سکتا۔ اگر کوئی شخص مکاتب کو خرید کر مالک بن جائے گا تو مکاتب کا استحقاق آزادی سلب ہو جائے گا۔

جواب :۔ خریدنے کے بعد ملکیت ضرور مشتری کی ہوگی جس طرح پہلے آقا کی بھی مکاتب کا عقد کتابت فسخ نہ ہوگا۔ مکاتب کو استحقاق باقی رہے گا۔

امام احمد کے قول کی دلیل :۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ بریرہ آئی اور اس نے کہا مجھے اپنے مکاتب ہونے کا معاوضہ دینا ہے، آپ اس معاوضہ کی ادائیگی میں میری مدد کیجئے اس وقت تک بریرہ نے بدل کتابت کا کوئی حصہ ادا نہیں کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو خرید کر آزاد کردو۔ حق ولاء آزاد کرنے والے کا ہوتا ہے۔ رواہ احمد۔

اصل حدیث صحیحین میں اس طرح ہے کہ بریرہ نے آکر حضرت عائشہؓ سے کہا ہے میں نے ۹ اوقیہ (سونے) معاوضہ پر عقد کتابت کیا ہے۔ سالانہ ایک اوقیہ دینا ہوگا آپ میری امداد کیجئے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا اگر تیرے مالک پسند کریں تو میں یکمشت ان کی پوری رقم گن دوں گی لیکن حق ولاء میرا ہوگا۔ بریرہ نے جاکر اپنے مالکوں سے یہی بات کہی انہوں نے انکار کردیا۔ بریرہ نے واپس آکر حضرت عائشہؓ سے کہا، انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا، وہ حق ولاء اپنے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ نے بھی سن لی اور دریافت فرمایا، کیا بات ہے۔ حضرت عائشہؓ نے واقعہ عرض کردیا، فرمایا، تم بریدہ کو لے کر آزاد کردو اور حق ولاء کی شرط انہیں لوگوں کے لئے کرلو۔ حق ولاء آزاد کرنے والے کا ہی ہوتا ہے (یعنی شرط کرلینے کے بعد حق ولاء تم ہی کو پہنچے گا بیچنے والوں کو نہیں) نسائی نے بھی یہ قصہ بروایت بریرہ بیان کیا ہے۔

اس حدیث میں امام احمد کے قول کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کیونکہ آئمہ میں اختلاف تو اس صورت میں ہے جب مکاتب کو اس کی رضامندی کے بغیر فروخت کیا جائے اور مکاتب رضامند ہو تو امام اعظم بھی جواز بیع کے قائل ہیں امام سے جو ظاہر روایت آئی ہے وہ صورت رضا میں جواز کی ہی ہے اور بریرہ کے قصہ سے ظاہر ہے وہ اپنی بیع پر راضی تھیں۔ اسی لئے امام بخاری نے اس حدیث کا عنوان قائم کیا ہے باب بیع المکاتب اذا رضی۔

مسئلہ :۔ پورا زر معاوضہ ادا کرنے کے بعد ہی مکاتب آزاد ہوتا ہے حضرت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مکاتب غلام ہے جب تک اس کے زر کتابت کا ایک درہم بھی باقی ہے۔ رواہ ابوداؤد والحاکم والنسائی من طرق۔ نسائی اور ابن ماجہ نے دوسری سند سے بوساطت عطاء حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں جو غلام سو اوقیہ معاوضہ کی شرط پر مکاتب بنایا گیا ہو، جب تک ایک اوقیہ بھی ادائیگی سے باقی رہے گا وہ غلام رہے گا نسائی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ ابن حزم نے کہا یہ عطاء خراسانی ہے جس نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کوئی حدیث نہیں سنی۔

ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حضرت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے اپنے غلام کو سو اوقیہ معاوضہ پر مکاتب بنایا اور غلام نے ۹۰ ادا کردیئے، صرف دس اوقیہ یا (فرمایا) دس دینار باقی رہ گئے پھر وہ ادائیگی سے عاجز ہوگیا تو وہ غلام (ہی) رہے گا۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں بوساطت نافع حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ مکاتب پر جب تک ایک درہم بھی باقی رہے گا وہ غلام رہے گا۔ ابن قانع نے دوسرے طریق سے حضرت ابن عمر کی روایت سے اس کو مرفوعاً بھی بیان کیا ہے، لیکن ابن قانع نے اس کے مرفوع ہونے کو مجروح کیا ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس مسئلہ میں صحابہ میں باہم اختلاف تھا۔ کفایہ میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت کا قول ہمارے مسلک کے موافق ہے۔ حضرت علی نے فرمایا جتنی رقم مکاتب نے ادا کردی ہو اتنی ہی اس کو آزادی مل جائے گی۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا، اگر مکاتب اپنی بازاری قیمت کے بقدر ادا کرچکا ہو تو آزاد ہو جائے گا، اس سے زیادہ اگر آقا کی طرف سے مقرر کردہ معاوضہ باقی رہ جائے گا تو دوسرے قرض خواہوں کی طرح آقا بھی ایک قرض خواہ کی حیثیت میں ہوجائے گا (مکاتب بہرحال آزاد ہوجائے گا مقروض رہے گا)

حضرت ابن عباس نے فرمایا، عقد کتابت ہوتے ہی مکاتب آزاد ہو جاتا ہے (اس کی آزادی ادائے معاوضہ پر موقوف نہیں رہتی) ہاں آقا کا قرض دار ہو جاتا ہے جیسا دوسروں کے قرض دار ویسا ہی آقا کا قرض دار۔ ہم نے حضرت زید بن ثابت کے قول کو اختیار کیا کیونکہ اس کی بناء مرفوع حدیث پر ہے۔

ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حضرت ام سلمہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے کسی کے مکاتب کے پاس اگر بقدر ادائے معاوضہ رقم ہو تو اس کو پھر اس مکاتب سے پردہ کرنا چاہیئے۔

مسئلہ:- مکاتب اگر ایک قسط مقررہ وقت پر ادا نہ کر سکے تو حاکم اس کے معاملے پر غور کرے اگر مکاتب کا کسی پر قرض ہو جس کے وصول ہونے کی قریبی امید ہو یا مال ملنے کا کوئی اور راستہ ہو تو تین روز کی اس کو مہلت دے دے اس سے زیادہ مہلت نہ دے۔ اور اگر مال آنے کی اس کے پاس کوئی سبیل نہ ہو اور آقا فسخ کتابت کرانا چاہتا ہو تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک فسخ کتابت کی ڈگری دے دے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا، جب تک دو قسطیں غلام پر نہ چڑھ جائیں حاکم غلام کو ادا سے عاجز نہ قرار دے اور فسخ کتابت کی ڈگری آقا کو نہ دے، آقا کو خود یہ اختیار نہیں کہ غلام کو عاجز عن الاداء قرار دے لے۔ حاکم کی ڈگری اور غلام کی رضامندی ضروری ہے۔

مسئلہ:- اگر مکاتب کو کہیں سے زکوٰۃ کا مال مل گیا اور اس نے بدل کتابت میں آقا کو دے دیا لیکن اس سے پوری رقم ادا نہ ہو سکی اور حاکم نے غلام کے عاجز عن الادا ہونے کا فیصلہ کر دیا تو وصول شدہ زکوٰۃ کا مال آقا کے لئے حلال ہے۔ خواہ آقا مالدار ہو یا ہاشمی ہو (جس کے لئے زکوٰۃ کا مال حلال نہیں ہوتا) کیونکہ اس صورت میں ملکیت کی حیثیت مختلف ہو جائے گی، غلام کے لئے تو وہ مال زکوٰۃ ہی ہو گا اور آقا کو معاوضہ کتابت میں ملا ہو گا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے، ام المومنین نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ گھر میں تشریف لائے، ہانڈی چڑھی ہوئی تھی اس میں گوشت جوش کے ساتھ پک رہا تھا آپ ﷺ کی خدمت میں روٹی اور گھر کا معمولی سالن پیش کیا گیا، فرمایا، کیا ہانڈی میں گوشت نہیں ہے۔ حاضرین نے عرض کیا گوشت ضرور ہے لیکن وہ صدقہ کا گوشت ہے جو بریرہ کو دیا گیا تھا اور آپ ﷺ صدقہ کی چیز نہیں کھاتے ہیں فرمایا، وہ بریرہ کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے تو ہدیہ ہے (ملک بدل گئی اور حیثیت ملک میں بھی تغیر آگیا) متفق علیہ۔ ہاں اگر (مکاتب) غلام نے وہ مال جو اس کو زکوٰۃ کا ملا ہے کسی مالدار یا ہاشمی کو کھانے کی صرف اجازت دے دی تو چونکہ ملک نہیں بدلی اور غلام ہی کی ملکیت باقی ہے اس لئے غنی اور ہاشمی کے لئے اس کا کھانا جائز نہیں۔ جیسے کسی شخص نے بعقد فاسد کوئی چیز خریدی اور کسی دوسرے شخص کو اجازت دے دی کہ تم اس کو کھا سکتے ہو تو اس کہنے سے وہ چیز اس دوسرے شخص کے لئے حلال نہیں ہو جائے گی۔ البتہ اگر (ہبہ کر دے یا دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے یعنی) اپنی ملکیت سے خارج کر دے تو دوسرے شخص کے لئے وہ چیز جائز ہو جائے گی۔

مسئلہ:- مقررہ معاوضہ ادا کرنے سے پہلے اگر مکاتب مر جائے تو امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک غلامی کی حالت میں مرے گا عقد کتابت ختم ہو جائے گا، خواہ اس نے کچھ مال چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو جیسے مبیع مشتری کے قبضہ میں پہنچنے سے پہلے بائع کے قبضہ میں ہی اگر تلف ہو جائے تو عقد بیع فسخ ہو جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے یہی قول حضرت عمر، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت، عمر بن عبد العزیز اور قتادہ کا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری، عطا، طاؤس، حسن بصری اور نخعی کا قول ہے کہ اگر مکاتب کا اتنا کہ ہو جو معاوضہ کتابت ادا کرنے کے قابل ہو تو وہ مال بطور معاوضہ آقا کو دے دیا جائے گا اور غلام کو آزادی کی حالت میں وفات یافتہ قرار دیا جائے گا اور اگر ادائے معاوضہ سے زائد مال باقی ہو گا تو اس کے آزاد وارثوں کو حسب میراث شرعی دے دیا جائے گا۔

اِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ۖ اگر تم کو ان غلاموں باندیوں کے اندر کوئی خیر (بھلائی) محسوس ہو۔

حضرت ابن عمر، امام مالک اور سفیان ثوری کے نزدیک خیر سے مراد ہے کمائی کی قوت، حسن، ضحاک اور مجاہد نے کہا مال

مراد ہے وصیت کے سلسلے میں اللہ نے فرمایا ہے ان ترک خیرا اگر اس نے مال چھوڑا ہو..... روایت میں آیا ہے کہ حضرت سلمان کے کسی غلام نے آپ سے مکاتب بنا دینے کی درخواست کی حضرت سلمان نے فرمایا، کیا تیرے پاس مال ہے۔ غلام نے کہا نہیں، حضرت سلمان نے اس کو مکاتب نہیں بنایا اور فرمایا تو مجھے لوگوں کا میل کچیل (صدقہ، خیرات کا مال) کھلائے گا۔

مجاہد وغیرہ کی تشریح غلط ہے، غلام کے پاس اپنا مال ہونے کا کوئی معنی ہی نہیں، غلام جب تک غلام ہے وہ اور اس کے پاس جو کچھ ہے سب آقا کا ہے اور ادائیگی معاوضہ مالک مال ہونے کے بعد واجب ہوتی ہے۔

زجاج نے کہا اگر خیر سے مال مراد ہوتا تو فیھم نہ ہوتا لھم ہوتا (فی ظرفیت کے لئے، اور لام تملیک کے لئے آتا ہے۔ آدمی مال کا ظرف نہیں ہوتا مالک ہوتا ہے۔ مترجم)

ابراہیم بن زید اور عبید نے خیرا کا ترجمہ کیا صدقہ اور امانت۔ اور حسب نقل بیہقی حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا سچائی اور وفائے عہد۔ امام شافعیؒ نے فرمایا، خیر کا سب سے اچھا معنی ہے کمائی اور امانت۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے خیر سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ضرر نہیں پہنچائے گا اور اگر غلام کافر ہو، مسلمانوں کو اس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو وہ کافروں کا مددگار ہو رہا ہو تو ایسے غلام کو مکاتب بنانا مکروہ ہے لیکن اگر کر دیا تو کتابت ناجائز نہیں ہے۔

ایک روایت میں عبیدہ کا قول آیا ہے کہ اس آیت میں خیر سے مراد ہے اقامت صلوٰۃ۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ خیر سے مراد ہے عاقل، بالغ ہونا۔ بچہ اور دیوانہ اہل کتابت نہیں۔

میں کہتا ہوں، اللہ نے پہلے فرمایا وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ اس کے بعد مکاتب بنانے کا حکم دیا۔ طلب مکاتبت بغیر عقل کے معتبر نہیں۔ معلوم ہوا کہ مکاتب اسی غلام کو بنانے کا حکم ہے جو طلب کتابت کا اہل ہو یعنی دیوانہ نہ ہو۔ اب اگر خیر سے مراد بھی عقل ہو تو یہ شرط بے فائدہ ہوگی۔ رہا مکاتب کا بالغ ہونا تو یہ شرط ناقابل تسلیم ہے اگر ہوشیار سمجھ دار لڑکا ہو تو وہ (خرید فروخت کی طرح) عقد کتابت کا اہل ہے مکاتب بنائے جانے کی درخواست کر سکتا ہے۔

مسئلہ:- جو غلام نکما ہو کمائی نہ کرتا ہو اس کو بھی مکاتب بنانا، امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک بلا کراہیت درست ہے۔ امام احمد کا دوسرا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ چونکہ آیت مذکورہ میں خیر سے مراد ہے کمائی کی قدرت اس لئے جو غلام کمائی کے قابل نہ ہو اس کو مکاتب بنانا مکروہ ہے۔ میرے نزدیک یہ استدلال غلط ہے، اگر فرض کر لیا جائے کہ خیر سے مراد کمائی کی قدرت ہے پھر بھی شرط کے مفقود ہونے کی صورت میں کتابت کیسے مکروہ ہو جائے گی (زائد سے زائد یہ مکاتب بنانا واجب یا مستحب نہیں رہے گا) کیونکہ بغیر کمائی کے غلام کو زکوٰۃ، صدقات کا مال بھی مل سکتا ہے۔

مسئلہ:- جو باندی ہنر مند اور کمائی کے قابل نہ ہو اس کو مکاتب بنانا باتفاق ائمہ مکروہ ہے کیونکہ بے ہنری کے باعث باندی کے لئے زر کتابت حاصل کرنا بغیر زنا کے عام طور پر ممکن نہیں، پس بہت ممکن ہے کہ وہ آزاد ہونے کے لئے زنا کی مرتکب ہو جائے۔

وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ اور اللہ کے اس مال میں سے جو اللہ نے تم کو عطا فرمایا کچھ مال ان کو (بطور امداد) دیا کرو۔

یہ خطاب عام لوگوں کو سب کو غلاموں کی آزادی میں مدد کرنے کی ترغیب دی ہے خواہ زکوٰۃ کے مال سے ہو یا عام خیرات اور غیر واجب صدقات سے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک فرض زکوٰۃ کا وہ حصہ مراد ہے جو آیت فی الرقاب میں اللہ نے ان کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ حسن بصری اور زید بن اسلم کا یہی قول ہے لیکن اس آیت میں لفظ عام ہے زکوٰۃ کے ساتھ حکم کو مخصوص قرار دینا تقاضاء امر کے خلاف ہے۔ کیونکہ غلاموں کی آزادی کے لئے زکوٰۃ کا ایک حصہ دینا تو فرض ہے اور اس جگہ امر استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں ہے، بلکہ مکاتب بنانے کا حکم ہی وجوبی نہیں استحبابی ہے۔ بعض اہل علم نے کہا خطاب آقاؤں کو ہے آقاؤں کے لئے مستحب اور بقول بعض واجب ہے کہ بدل کتابت کا کچھ حصہ مکاتب کو خود چھوڑ دیں۔

حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور تابعین وصحابہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام شافعی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

کتنا حصہ چھوڑ دے، یہ بحث اختلافی ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا جو معاوضہ مقرر ہو اس کا ایک چوتھائی معاف کر دے۔ عبدالرزاق، سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن مردویہ اور بیہقی نے ابن عبدالرحمٰن سلمی کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ بعض نے حضرت علیؓ کی روایت سے اس کو مرفوع (فرمان رسول اللہ ﷺ) بھی قرار دیا ہے۔

حضرت ابن عباس کا قول مروی ہے کہ ایک تہائی چھوڑ دے۔ بعض نے کہا کوئی مقدار مقرر نہیں جتنا چاہے معاف کر دے۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ نافع کا بیان ہے حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنے ایک غلام کو ۳۵/ ہزار درہم معاوضہ مقرر کر کے مکاتب بنایا اور (جب ۳۰/ ہزار ادا ہو چکے تو) آخر میں ۵ ہزار معاف کر دیئے۔

سعید بن جبیر نے کہا کہ حضرت ابن عمر جب کسی غلام کو مکاتب بناتے تو آخر میں جو کچھ معاف کرنا ہوتا معاف کر دیتے تھے شروع میں (پہلی دوسری یا اس سے کم وبیش رقم) معاف نہیں کرتے تھے آپ کو یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اگر یہ غلام بدل کتابت ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے پھر غلامی میں حسب سابق آگیا تو معاوضہ کتابت کا جو حصہ وہ معاف کر چکے ہوں گے وہ پھر ان کی ملک میں آجائے گا (کیونکہ غلام تو پورا کا پورا غلامی میں واپس آجائے گا اور غلام کا جو معاوضہ قرار پایا تھا مثلاً پانچ ہزار اور اس میں سے ایک ہزار معاف کر دیا تھا تو گویا ۱/۵ حصہ غلام کا ملکیت سے خارج کر دیا تھا پھر جب غلام واپس ملکیت کی طرف آگیا تو ۱/۵ حصہ جو معاف کر دیا تھا وہ بھی واپس آگیا) آخری ادائیگی کے وقت آپ کو حسب منشا معاف کر دینا زیادہ مرغوب تھا۔

میں کہتا ہوں معاف کر دینے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ غلام کو کچھ دیا گیا بلکہ معافی کا مطلب ہے اصل معاوضہ میں سے کچھ حصہ ساقط کر دینا، گرا دینا، اسقاط میں تملیک نہیں ہوتی تملیک کچھ دینے میں ہوتی ہے اسی لئے امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ آقا پر واجب نہیں ہے کہ طے شدہ معاوضہ کا کوئی حصہ معاف کر دے کیونکہ بیع کی طرح عقد کتابت بھی عقد معاوضہ ہے اور کسی عقد معاوضہ میں معاوضہ کا وجوب کیسے ہو سکتا ہے۔ عقد کتابت سے غلام پر مقررہ معاوضہ کا ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اب اگر اسی عقد معاوضہ میں آقا پر کچھ معاوضہ کا معاف کرنا بھی واجب قرار دیا جائے گا تو عقد کتابت وجوب معاوضہ کا بھی سبب قرار پائے گا اور اسقاط معاوضہ کے وجوب کا بھی۔ ایسی معافی سے فائدہ ہی کیا ہوا آسان بات تو یہ تھی کہ جب غلام کے عوض ایک ہزار روپیہ لینا ہی تھا تو تیرہ سو پہ عقد کتابت کرتا تین سو بطور وجوب ساقط کر دیتا ایک ہزار وصول کر لیتا۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اور اپنی باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی باندی سے زنا کی کمائی کراتا تھا، یہ بھی مسلم کی روایت ہے عبداللہ بن ابی کی دو باندیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ اور دوسری کا نام امیمہ تھا عبداللہ دونوں سے زنا کی کمائی کرانا چاہتا تھا، دونوں باندیوں نے خدمت گرامی میں اس کی شکایت کی اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

حاکم نے بطریق ابوالزبیر حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مسیکہ کسی انصاری کی باندی تھی اس نے شکایت کی تھی کہ میرا آقا مجھے زنا کی کمائی کرنے پور مجبور کرتا ہے اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔

بزار اور طبرانی نے صحیح سند سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی ایک جاریہ (باندی) تھی جو دور جاہلیت میں زنا کرتی تھی پھر جب اسلام میں زنا کی حرمت کر دی گئی تو اس باندی نے قسم کھالی کہ آئندہ میں زنا نہیں کروں گی۔ اس کے متعلق آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ بزار نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انس کی طرف بھی اس بیان کی نسبت کی ہے اس روایت میں اس باندی کا نام معاذہ بتایا گیا ہے۔ سعید بن منصور نے حضرت عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو باندیاں تھیں مسیکہ اور معاذہ۔ عبداللہ دونوں سے زنا کی کمائی کراتا تھا آخر دور اسلامی میں ایک نے کہا اگر یہ فعل اچھا تھا تو میں اس کو بہت کر چکی اور اگر اچھا نہ تھا تو اب اس کو ترک کر دینا ہی مناسب ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک باندی عبداللہ کے پاس زنا کی کمائی میں ایک چادر لے کر آئی اور دوسری ایک دینار لائی۔ عبداللہ نے دونوں سے کہا جاؤ ابھی کچھ اور کمائی کر کے لاؤ باندیوں نے کہا خدا کی قسم اب تو ہم ایسا نہیں کریں گے، اسلام آچکا ہے۔ اللہ نے زنا کو حرام کر دیا ہے (جب عبداللہ نے مجبور کیا تو) دونوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اپنا دکھ بیان کیا اور یہ آیت اتری۔ ثعلبی نے حسب بیان مقاتل کہا کہ عبداللہ کے پاس اس کام کے لئے چھ باندیاں تھیں۔ اور ان کے بارے میں آیت وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ نازل ہوئی۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا جب وہ پاک دامن رہنا چاہیں۔

بیضاوی نے لکھا، اس جملہ میں ان شرطیہ اکراہ کی قید نہیں ہے (یعنی قید احترازی نہیں ہے) کیونکہ مرضی کے خلاف ہونے کی صورت میں ہی جبر اور اکراہ کا تحقق ہوتا ہے (اکراہ نام ہی مرضی کے خلاف کرانے کا ہے) نہ یہ عدم اکراہ کی قید ہے کیونکہ (بر قول شافعیہ مفہوم مخالف یہ ہوگا کہ اگر وہ پاک دامن... رہنا نہ چاہیں تو اکراہ جائز ہے اور یہ مطلب غلط ہے کیونکہ) نہی کا عدم منہی عنہ کے عدم کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے یعنی پاکدامنی کا ارادہ نہ ہو تو اکراہ بھی نہیں ہوتا بلکہ بخوشی زنا کا تحقق ہوتا ہے..... میں کہتا ہوں اس جگہ ان (شرطیہ شکیہ) اذا ظرفیہ کے معنی ہے شرطیہ نہیں ہے سبب نزول کے یہی مطابق ہے (باندیوں نے پاکدامن رہنے کا ارادہ کیا ہی تھا) واقعہ کو بصورت شک اس لئے ظاہر کیا کہ (اگرچہ اس موقع پر باندیوں نے پاک دامن رہنے کا ارادہ کیا تھا لیکن) باندیوں کی طرف سے پاکدامنی کی خواہش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے اس میں آقاؤں کو زجر اور تشنیع بھی ہے کہ وہ باندیاں جو ضعیف العقل ہوتی ہیں اور نفسانی خواہشات کا ان پر غلبہ بھی ہوتا ہے، جب انہوں نے پاکدامن رہنے کا ارادہ کر لیا تو تم کیسے غیر تمند مرد ہو کہ ان کو زنا پر مجبور کرتے ہو ایسا نہ کرو تم مرد ہو غیر تمند ہو تم کو یہ دیوثی نہ کرنی چاہئے۔

حسین اور فضیل نے کہا کلام میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بیوائیں پاکدامن رہنا چاہیں تو ان کا نکاح کرادو اور اپنی باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کچھ دنیوی سامان کی طلب میں (باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو) یعنی تم ان کی کمائی چاہتے ہو اور ان کی اولاد کو فروخت کر کے مال حاصل کرنے کے خواہشمند ہو (اس لئے تم ان کو زنا کرنے پر مجبور کرتے ہو ایسا نہ کرو)۔

وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اور جو ان کو زنا پر مجبور کرے گا تو گناہ مجبور کرنے والے پر ہوگا اللہ ان کو معاف کر دینے والا بڑا مہربان ہے (جبر یہ زنا کے بعد اللہ ان کو معاف فرمادے گا) حسن جب یہ آیت پڑھتے تھے تو آخر میں کہتے تھے لہن واللّٰہ لہن یعنی بخدا اللہ ان باندیوں کو معاف کر دے گا۔ اس مطلب پر من یکرھھن مبتدا ہوگا اور خبر محذوف ہوگی بعد والے جملہ میں چونکہ رابطہ کوئی ضمیر نہیں ہے اس لئے بعد والا جملہ خبر نہیں ہو سکتا، مطلب اس طرح ہوگا کہ جو جبر کرے گا اس پر باندیوں کے زنا کرنے کا عذاب ہوگا باندیوں کو تو اس جبر کے بعد اللہ معاف کر دے گا۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جبر کرنے والوں کو اللہ معاف کر دے گا بشرطیکہ وہ آئندہ کے لئے توبہ کرلیں لیکن یہ مطلب رفتار کلام اور غرض کلام کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ کلام کا نشانہ تو جبر کرنے والوں کو عذاب کی وعید سنانا ہے امیدوار مغفرت بنانا مقصود نہیں ہے پھر عبداللہ بن ابی کے حق میں آیت کا نزول ہوا ہے اور وہ منافق تھا اور منافق کے متعلق صراحت کر دی گئی ہے اِسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (آپ ان کے لئے معافی کے طلبگار ہوں یا نہ ہوں دونوں باتیں برابر ہیں اللہ ہرگز ان کو معاف نہیں کرے گا، ایسے موقع پر تلقین توبہ کرنا اور امیدوار رحمت بنانا مناسب نہیں۔

ایک شبہ: ـ جس باندی کو زنا پر مجبور کیا گیا تو جب وہ گناہ گار ہی نہیں ہے پھر مغفرت کی کیا ضرورت۔

جواب: ـ اکراہ کے بعد ذمہ داری اور عقل کا فقدان نہیں ہو جاتا، اس لئے اہلیت فعل ساقط نہیں ہوتی اور مکرہ (جس

پر جبر کیا گیا ہے) مخاطب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو کسی کے قتل کرنے پر یا جس مرد کو زنا کرنے پر مجبور کیا گیا ہو اس کے لئے قتل کر دینا یا زنا کرنا حرام ہے امام زفر کی نزدیک تو ایسا قتل موجب قصاص ہے، امام ابو حنیفہ موجب قصاص نہیں مانتے (یہ اختلاف اپنی جگہ پر ہے) ہاں اللہ نے بعض صورتوں میں مجبور کردہ شخص سے گناہ اٹھالیا ہے اور بعض مواقع پر امر حرام کی اجازت بھی دے دی ہے جیسے کسی جابر کے جبر کرنے سے کلمہ کفر زبان سے کہہ دینا۔ بشرطیکہ دل میں ایمان قائم ہو یا نماز روزہ توڑ دینا، احرام حج کھول دینا کسی کا مال تباہ کر دینا وغیرہ۔ یہ سب صورتیں اس وقت رخصت کے تحت آئیں گی جب اکراہ کامل ہو۔ ان صورتوں میں گناہ گار نہ قرار دینا تو رحمت و مغفرت کی نشانی ہے دیکھو اللہ نے فرمایا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ جو شخص مضطر مجبور ہو بشرطیکہ دل سے طلب گار نہ ہو اور حد سے تجاوز بھی نہ کرے تو اس پر گناہ گار نہ قرار دینا تو رحمت و مغفرت کی نشانی اور نتیجہ ہے یہ بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ گناہ اس وقت قرار نہ دیا جائے گا جب جبر کرنے والا اضطرار کی حد تک مجبور کر کے وہ گناہ کرائے یعنی مجبور کو یہ اندیشہ ہو جائے اگر میں جابر کے قول پر عمل نہیں کروں گا تو مارا جاؤں گا یا میرا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا۔ اگر اس حد تک اندیشہ نہ ہو تو گناہ قائم رہتا ہے۔ اور چونکہ عبداللہ نے باندیوں کو اس حد تک مجبور نہیں کیا تھا کہ اگر وہ زنا نہ کریں گی تو ان کو قتل کر دیا جائے گا یا جسم کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا یا توڑ پھوڑ دیا جائے گا اس لئے گناہ قائم رہا وہ عورتیں زنا کرنے کے بعد بے گناہ نہیں ہوئیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اور (اے محمد ﷺ! اس سورت میں) ہم نے تم پر اتاریں۔

اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ایسی آیات جو احکام و حدود کو کھول کر بیان کرنے والی ہیں۔ یا (باب تفعیل بمعنی تفعل ہے) یہ مطلب ہے کہ کھلی کھلی واضح آیت ہم نے نازل کیں جن کی تصدیق گزشتہ آسمانی کتابوں سے بھی ہوتی ہے اور سالم عقلیں بھی ان کو مانتی ہیں۔

وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ اور جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں ان کی بعض حکایات یعنی جس طرح یوسفؑ، مریمؑ وغیرہ کے ہم نے عجیب تاریخی واقعات بیان کئے انہی کی طرح عجیب واقعہ ہم نے عائشہؓ کا بھی بیان کر دیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو حالات اور نتائج گزشتہ قوموں کے ہم نے بیان کئے انہی کی طرح اے دروغ بندی، تہمت تراشی کرنے والو تمہارا حال بھی بیان کر دیا جو نتیجہ ان کا ہوا وہی تمہارا ہوگا۔

وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۳۴ اور (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کی باتیں کیونکہ خدا سے ڈرنے والے ہی اس سے فائدہ اٹھانے والے ہیں (اس لئے یہ آیات انہی کے لئے حقیقت میں نصیحت ہیں۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک آیات سے مراد پورا قرآن ہے اور مذکورہ تینوں صفات قرآن ہی کی ہیں۔

الحمد للہ سورۂ نور کے چوتھے رکوع کا ترجمہ

۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء مطابق ۱۱ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ کو تمام ہوا۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اللہ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے۔

نور اس کیفیت کا نام ہے جس کو آنکھ سب سے پہلے ادراک کرتی ہے پھر اس کے ذریعہ سے دوسری قابل دید چیزوں کا انکشاف کرتی ہے۔ جیسے چاند سورج کی روشنی کہ (پہلے چاند سورج اس سے روشن ہوتے ہیں پھر) ان چیزوں کا اس سے انجلاء ہو جاتا ہے جو سورج و چاند کے سامنے ہوتی ہیں۔ اس تعریف کی رو سے لفظ نور کا ذات باری تعالیٰ پر حقیقی اطلاق ممکن نہیں (کیونکہ یہ نور مادی ہے اور عوارض مادیات میں سے ہے) لامحالہ تاویل کی جائے گی۔ تاویل کی چند صورتیں ہیں (۱) مضاف کو

محذوف مانا جائے یعنی اللہ زمین و آسمان کو نور عطا کرنے والا ہے۔ (۲) بطور مبالغہ مصدر کو اللہ پر محمول کیا جائے (اللہ میں اتنی زیادہ نور بخشی ہے کہ گویا خدا خود نور ہو گیا) جیسے زید کا اگر بہت زیادہ منصف ہونا ظاہر کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں زید، عدل یا اعلیٰ ترین کریم کو کرم کہہ لیتے ہیں۔ (۳) یا مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی اللہ زمینوں اور آسمانوں کو چاند سورج اور ستاروں سے اور انبیاء، ملائکہ اور مومنوں سے روشن کرنے والا ہے۔ کذا قال الضحاک۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین کو درختوں اور ہری بھری گھاس سے نورانی کر دینے والا بھی اللہ ہے۔

بعض نے کہا اللہ نور ہے یعنی تمام انوار اسی کے ہیں جیسے کہا جاتا ہے فلاں شخص ہمارے لئے رحمت ہے یعنی ہم کو جو رحمت حاصل ہوئی ہے وہ اسی سے حاصل ہوئی ہے۔

کبھی لفظ نور کا اطلاق بطور مدح بھی کیا جاتا ہے جیسے ایک شاعر کا شعر ہے۔ جب کسی رات کو عبداللہ مرو سے چلا جاتا ہے تو مرو کا نور اور حسن چلا جاتا ہے۔

بعض نے کہا نور سے مراد ہے مدبر جو سردار قوم بڑا مدبر اور منتظم ہو اس کو نور القوم کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا نور وہ کیفیت ہے جو ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والی ہو اور اصل ظہور وجود وہستی ہے جس طرح اصل خفاء عدم و نیستی ہے، پس نور السمٰوت سے مراد ہے آسمانوں کا موجود ہونا۔ اللہ بذات خود موجود ہے اور دوسری چیزوں کو موجود کرنے والا ہے۔

باصرہ (، قوت بینائی) پر بھی اس کا اطلاق اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ ادراک اشیاء اس پر موقوف ہے اور بصیرت تو، بہر حال اعلیٰ ترین مدرک ہے آنکھ اپنا ادراک نہیں کرتی بصیرت اپنا بھی ادراک ہے اور اپنی ذات کے علاوہ تمام کلیات و جزئیات کا ادراک بھی اسی پر موقوف ہے یہی حقائق پر غور کرتی اور ان کی تحلیل و ترکیب کرتی ہے اس لئے اس کو نور کہنا تو بدرجہ اولیٰ لازم ہے۔ اور چونکہ بصیرت بذات خود اور باختیار کامل نہ اپنی ذات کا ادراک کر سکتی ہے نہ دوسری چیزوں کا بلکہ اللہ کی طرف سے اس پر فیضان ادراک ہوتا ہے کبھی بلاواسطہ اور کبھی ملائکہ و انبیاء کے توسط سے اس لئے ان سب کو انوار کہا جاتا ہے۔ ملائکہ بھی نور ہیں انبیاء بھی نور ہیں اور سب سے بڑھ کر اللہ نور ہے اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کے اس تفسیری قول سے ہوتی ہے جو بغوی نے نقل کیا ہے کہ اللہ نور السمٰوت والارض کا معنی یہ ہے کہ اللہ اہل آسمان وزمین کا ہادی (راہنما) ہے۔ اسی کی رہنمائی سے سب حق کی طرف چل رہے ہیں اور گمراہی سے، حیرت سے نجات پا رہے ہیں۔ نور کی اضافت بتا رہی ہے کہ اس کا جلوہ سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے یا یہ کہ اس کی اندر تمام حسی اور عقلی نور سمائے ہوئے ہیں۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ اللہ کے نور کی صفت۔ یعنی وہ نور جو مومن کے دل میں جگمگاتا ہے جس کی پرتو اندازی کی وجہ سے مومن کا دل اللہ کی ذات وصفات کی طرف راستہ پاتا ہے، عقل انسانی جس کو پا نہیں سکتی تھی۔ اس نور کی ضیاء پاشی کی وجہ سے وہاں تک پہنچ جاتی ہے اور جس کے ذریعہ یہ عقل بشری حق کو حق اور باطل کو باطل جان لیتی ہے، اللہ نے فرمایا ہے، فھو علی نور من ربه۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن مسعود پڑھتے تھے مثل نورہ فی قلب المومن۔ بقول سعید بن جبیر حضرت ابن عباس نے فرمایا، اس نور کی حالت وصفت جو اللہ نے مومن کو عطا فرمایا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ نورہ کی ضمیر مومن کی طرف راجع ہے۔ حضرت ابی نے فرمایا، مومن کے دل کے نور کی صفت۔ یہ مومن وہ بندہ ہے، جس کے دل کے اندر اللہ نے ایمان اور سینہ کے اندر قرآن جما دیا ہے۔ حسن اور زید بن اسلم نے کہا نور سے مراد قرآن ہے، سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا نور سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک۔ بعض کے نزدیک نور سے اللہ کی طاعت مراد ہے۔ بندے کی طاعت کو اللہ نے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط جیسے ایک طاقچہ جس میں ایک چراغ ہو۔ مشکوٰۃ طاقچہ جس میں آرپار سوراخ نہ

ہو اگر آر پار سوراخ ہو تو اس کو کوہ (روشن دان کہتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک مشکوٰۃ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ مجاہد نے مشکوٰۃ کا ترجمہ قندیل کیا ہے اس وقت مضاف محذوف ہوگا، یعنی نور قندیل کی طرح جس میں چراغ موجود ہو۔ مصباح چراغ۔ یہ اسم آلہ بروزن مفعال ہے، صبح کا معنی ہے روشنی مصباح روشنی کا آلہ۔

اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ چراغ شیشہ کے فانوس میں ہو۔ زجاج نے کہا شیشے کے اندر نور اور آگ کی روشنی جھلکتی بہت زیادہ ہے، اسی لئے لفظ زجاجۃ ذکر کیا۔

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ شیشے کا فانوس ایسا معلوم ہوتا ہو۔

دری میں یا نسبتی ہے۔ در موتی۔ (یعنی موتی جیسا تارا) صفائی اور حسن میں موتی کی طرف۔

ایک شبہ

تارے کی چمک اور روشنی تو موتی سے زیادہ ہوتی ہے پھر موتی سے تارے کو تشبیہ دینے کا کیا معنی (وصف مشبہ تو مشبہ بہ میں زیادہ ہونا چاہیئے اور اس جگہ مشبہ میں زائد ہے)۔

ازالہ

مطلب یہ ہے کہ وہ تارا تمام تاروں سے زیادہ چمکیلا اور پُر نور ہے۔ جیسے موتی کا دانہ تمام دانوں سے زیادہ صاف اور چمکدار ہوتا ہے۔

بعض نے کہا پانچ ستارے جو سب سے بڑے ہیں یعنی زحل و مریخ، مشتری، زہرہ، عطارد ان میں سے کسی ایک ستارے کو کوکب دری کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں شاید زہرہ کو کہتے ہیں زہرہ کی چمک دمک اور روشنی دوسرے ستاروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایک شبہ

دوسرے ستاروں سے تشبیہ دی۔ چاند سورج سے تشبیہ کیوں نہ دی ان دونوں کی چمک اور روشنی تو دوسرے ستاروں سے زیادہ ہے۔

ازالہ

چاند سورج کو کبھی گرہن لگ جاتا ہے دوسرے ستارے گرہن میں نہیں آتے۔ میں کہتا ہوں چراغ کو سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے، اللہ نے فرمایا فَجَعَلْنَا الشَّمْسَ سِرَاجًا اسی لئے زجاجہ کو تارے سے تشبیہ دی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ فانوس کی روشنی چراغ سے کم ہے۔ اگر سورج سے تشبیہ دی جاتی تو مضمون الٹ جاتا اور فانوس کی چمک چراغ سے زیادہ ہونا سمجھا جاتا اور یہ بات مقصود کے خلاف ہو جاتی۔

یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ وہ چراغ جو برکت والے درخت یعنی زیتون (کے تیل) سے روشن ہو۔

زیتون کا درخت بڑا با برکت درخت ہوتا ہے اس سے گونا گوں فوائد حاصل ہوتے ہیں اس کا تیل چراغوں میں بھی جلایا جاتا ہے اور نہایت نفیس مفید روشنی دیتا ہے یہ بطور سالن بھی کام میں آتا ہے اور ایک قسم کی خاص لذت بھی اپنے اندر رکھتا ہے کمال یہ ہے کہ درخت سے تیل نکالنے کے لئے کسی کولھو کی ضرورت نہیں ہر شخص بآسانی خود نکال سکتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے زیتون کے تیل سے ناسور اچھا ہوتا ہے۔ چوٹی سے جڑ تک اس کے درختوں میں تیل ہی تیل ہوتا ہے۔

بغوی نے لکھا حضرت اسید بن ثابت یا حضرت اسید انصاری کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیتون کا تیل کھاؤ اور استعمال کرو یہ مبارک درخت ہے۔ رواہ الترمذی عن عمرؓ۔ واحمد والترمذی والحاکم۔ عن ابی اسید ورواہ ابن ماجۃ والحاکم عن ابی ہریرۃؓ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں زیتون کا تیل کھاؤ اور استعمال کرو یہ نفیس اور برکت والا ہوتا

ہے۔

ابو نعیم نے الطب میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیتون کا تیل کھاؤ اور لگاؤ یہ ستر بیماریوں کے لئے شفاء ہے جن میں سے ایک کوڑھ کی بیماری بھی ہے۔

لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ سدی اور ایک جماعت علماء کے نزدیک اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ نہ ایسے مقام میں ہے کہ ہر وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو اور اس کو جلا ڈالے نہ ایسی پوشیدہ جگہ میں ہے کہ سورج ہمیشہ اس سے غائب رہے کبھی اس پر دھوپ نہ پڑے اور اس کے نتیجے میں وہ کچا رہ جائے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ وہ نہ مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ صرف طلوع کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو غروب کے وقت بالکل نہ پڑتی ہو۔ نہ غرب میں اس طرح واقع ہے کہ صرف غروب کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو طلوع کے وقت نہ پڑتی ہو بلکہ وہ پہاڑ کی چوٹی یا کھلے وسیع میدان میں واقع ہے کہ ہر وقت اس پر دھوپ پڑتی ہے اسی وجہ سے اس کے پھل نہایت پختہ اور تیل بہت صاف ہوتا ہے۔

بغوی نے اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب کہتے ہیں وہ نہ کالا ہے نہ گورا، نہ میٹھا نہ کھٹا یعنی بالکل خالص سفید بھی نہیں ہے نہ بالکل سیاہ ہے بلکہ درمیانی رنگ اور معتدل مزہ رکھتا ہے، بروایت عکرمہ یہ قول حضرت ابن عباس کا ہے، کلبی اور اکثر اہل تفسیر نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔

بعض نے کہا وہ درخت نہ زمین کے مشرقی حصہ میں واقع ہے نہ مغربی حصہ میں بلکہ درمیان میں یعنی ملک شام میں واقع ہے، شام کا زیتون بہت عمدہ ہوتا ہے۔

حسن نے کہا ایسا کوئی درخت دنیا میں نہیں جو نہ شرقی ہو نہ غربی اللہ نے اپنے نور کی تشبیہ ایسے درخت زیتون سے دی ہے جو مغرب میں بھی نہ ہو اور مشرق میں بھی نہ ہو (یعنی اللہ کا نور نہ مغرب کے لئے خاص ہے نہ مشرق کے لئے) میں کہتا ہوں اس قول پر شاید درخت زیتون سے مراد جنت کا شجرۂ زیتون ہو جس سے اللہ نے اپنے نور کو تشبیہ دی ہے۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ اس کا تیل اتنا چمکیلا اور روشن ہے کہ قریب ہے وہ خود بغیر آگ کو مس کرنے کے روشن ہو جائے۔ اس آیت میں روغن زیتون کی صفائی اور چمک کا پر زور اظہار ہے۔

نُورٌ عَلَىٰ نُورٍ نور بالائے نور ہے۔ ایک تو تیل کی بجائے خود چمک پھر آگ کی وجہ سے اس کی اشتعالی روشنی۔ یہ دوہرا نور ہے۔ بلکہ چند در چند نور ہے تیل کے صاف ہونے کی وجہ سے اس کی ذاتی چمک شیشہ کے اشتعال کی چمک اور ایسے طاقچہ کی جگمگاہٹ جس میں ادھر ادھر سوراخ اور آر پار راستہ نہیں ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس تمثیل کی تشریح میں اہل علم کے اقوال مختلف ہیں بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ نور محمد کی تمثیل ہے، حضرت ابن عباس نے کعب احبار سے فرمایا تھا، آیۃ مثل نوره کمشکوٰة کے معنی کی تشریح کرو۔ کعب احبار نے کہا اللہ نے اس آیت میں اپنے نبی کی حالت بطور تمثیل بیان کی ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کا مبارک سینہ اور شیشہ سے مراد ہے آپ کا دل اور مصباح سے مراد ہے نبوت۔ اور یکاد زیتها یضیئی کا یہ مطلب ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ نہ بھی کیا ہوتا تب بھی قریب تھا کہ آپ کا نور جگمگانے لگتا اور لوگوں کے سامنے آپ کا نبی ہونا خود آ جاتا۔

کعب احبار کی تشریح میری نظر میں نہایت لطیف ہے واقعی نور محمدی کی یہی حالت تھی، بعثت نبوی ﷺ سے پہلے کے کچھ احوال ہم اس جگہ ذکر کرتے ہیں جو اس موضوع پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔

فصل: ۔ خلاصۃ السیر کے مؤلف نے رسول اللہ ﷺ کے ان معجزات کا ذکر کیا ہے جو بعثت سے پہلے ذات مبارک سے ظہور پذیر ہوئے تھے ہم ان کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی والدہ کا بیان ہے میں نے بحالت حمل خواب میں دیکھا کہ ایک نور میرے اندر سے نکلا جس کی وجہ سے شہر بصریٰ علاقۂ شام کے محلات میری نظر کے سامنے چمک اٹھے پھر پیدا ہوتے ہی آپ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا، حافظ ابن

حجر نے لکھا ہے کہ جو نہی رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے آپ کی والدہ نے ایک نور دیکھا جس سے ملک شام کے محل ان کی نظر کے سامنے چمک اٹھے، ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ابو نعیم نے دلائل میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی والدہ نے بیان کیا جب آپ پیدا ہوئے تو فرشتہ نے آپ کو تین بار پانی میں غوطہ دیا۔ پھر ایک ریشمی بٹوے کے اندر سے ایک مہر نکال کر آپ کے شانہ پر لگائی جس کی وجہ سے ایک سفید انڈے کی طرح چیز پیدا ہوگئی جو زہرہ کی طرح چمکنے لگی۔

بیہقی ابن ابی الدنیا اور ابن السکن کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کی رات کو کسریٰ کے محل میں لرزہ آگیا اس کے چودہ کنگرے گر پڑے اور کسریٰ خوف زدہ ہو گیا۔ اور فارس کی جو آگ ہزار برس سے نہیں بجھی تھی وہ بجھ گئی اور ساوت جھیل خشک ہو گئی۔

حضرت عائشہ کی روایت میں آیا ہے کہ ایک یہودی مکہ میں رہتا اور تجارت کرتا تھا، رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کی رات کو اس نے قریش سے کہا اے گروہ قریش آج رات اس امت کا نبی پیدا ہو گیا جس کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نشان ہے اور نشان میں گھوڑے کے ریال کی طرح چند بالوں کی ایک قطار ہے لوگ یہودی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی والدہ کے پاس پہنچے اور نو مولود بچے کی پشت کھول کر دیکھی یہودی کی نظر جب مسہ پر پڑی فوراً بے ہوش ہو کر گر پڑا، لوگوں نے پوچھا ارے تجھے کیا ہو گیا، یہودی کہنے لگا واللہ بنی اسرائیل سے نبوت نکل گئی۔ رواہ الحاکم۔ مواہب لدنیہ میں عیصا راہب کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔

عیصا مکہ والوں سے کہتا تھا اے اہل مکہ عنقریب تم میں ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے سارا عرب جس کا تابع ہو جائے گا اور عجم پر بھی اس کا اقتدار ہو گا یہ زمانہ اس کی پیدائش کا ہے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے دین میں میرے داخل ہونے کا ایک خاص باعث ہوا آپ کے نبی ہونے کی نشانی میں نے اسی وقت دیکھ لی تھی جب آپ جھولنے میں پڑے ہوئے چاند سے باتیں کر رہے تھے اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور جب آپ اس کی طرف اشارہ کرتے تھے وہ (کنارہ) جھک جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں اس سے باتیں کر رہا تھا اور وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا وہ مجھے رونے سے بہلاتا تھا اور جب وہ عرش کے نیچے سر بسجود ہوتا تھا تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔

حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ بات بھی شمار کی گئی ہے کہ آپ کے جھولنے کو فرشتے جھلاتے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ پیدا ہوتے ہی آپ نے کلام کیا تھا۔

ابو یعلی اور ابن حبان نے حضرت عبد اللہ بن جعفر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی انا حضرت حلیمہ نے کہا جب میں نے آپ کو اپنی گود میں لے لیا تو فوراً میری چھاتیاں بقدر ضرورت دودھ سے بھر آئیں پہلے میرا بچہ یعنی ضمرہ بھوکا رہنے کی وجہ سے سوتا نہ تھا، اب دونوں نے سیر ہو کر پی لیا اور دونوں سو گئے پہلے میری پستان میں اتنا دودھ ہی نہ تھا جو بچہ کے لئے کافی ہوتا نہ ہماری اونٹنی کے پاس دودھ تھا جو بچہ کو پلایا جا سکتا اب جو میرا شوہر اونٹنی کے پاس گیا تو دیکھتا کیا ہے کہ اونٹنی کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہیں میرے شوہر نے اس کو دوہا اور میں نے خوب سیر ہو کر پیا اور شوہر نے بھی خوب پیا اور وہ رات بڑے چین سے گزری، محمد ﷺ کو لے کر جب میں واپس آئی اور گدھی پر سوار ہوئی تو خدا کی قسم وہ تو اتنی تیز چلنے لگی کہ ساتھیوں کا کوئی گدھا اس کا مقابل نہ کر سکا ساتھ والیاں کہنے لگیں اری ابی ذویب کی بیٹی! ذرا ٹھہر تو، کیا یہ تیری وہی گدھی ہے جس پر تو آئی تھی، میں نے کہا ہاں۔ بات یہ تھی کہ کمزوری اور لاغری کی وجہ سے میری گدھی ساتھ والے قافلہ کے لئے بار ہو گئی تھی بار بار ان کو رکنا پڑتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت حلیمہ نے کہا جب میں نے رسول اللہ ﷺ نے کہا اللّٰہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا وسبحان اللّٰہ بکرۃ واصیلا یہ آپ کا سب سے پہلا کلام تھا۔ الحدیث۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے حلیمہ آپ کو دور نہیں جانے دیتی تھیں تا کہ آپ کی طرف سے ان کو بے خبری نہ رہے ایک روز آپ اپنی رضاعی بہن شیماء کے ساتھ باہر چلے گئے اور جہاں جنگل میں اونٹ تھے وہاں جا پہنچے حلیمہ تلاش میں نکلیں آپ اپنی بہن کے ساتھ کہیں مل گئے حلیمہ نے کہا اس گرمی میں تم کہاں پھر رہے ہو شیما نے کہا اماں! مجھے اپنے بھائی کے ساتھ تو گرمی محسوس ہی نہیں ہوئی، برابر ان کے اوپر ایک بدلی سایہ کئے رہی۔ جب یہ کہیں ٹھہر جاتے تھے بدلی بھی ان کے اوپر ٹھہر جاتی تھی یہ چل دیتے تھے تو بدلی بھی ان کے اوپر چل دیتی تھی۔

شمائل مجدیہ میں مذکور ہے کہ حلیمہ نے کہا جس روز سے ہم نے آپ کو لیا کبھی ہم کو چراغ کی ضرورت نہیں رہی آپ کے چہرہ کی روشنی تو چراغ سے زیادہ نورانی تھی۔ اگر ہم کو کسی جگہ چراغ کی ضرورت پڑتی تو ہم آپ کو وہاں لے جاتے آپ کی برکت سے تمام مقامات روشن ہو جاتے۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حلیمہ جب آپ کو لے کر بتوں کی طرف گئیں تو ہبل اور دوسرے بت آپ کی تعظیم میں اپنی اپنی جگہ سرنگوں ہو گئے اور سنگ اسود کے پاس لے کر گئیں تو سنگ اسود خود اپنی جگہ سے نکل کر آپ کے منہ کو چمٹ گیا۔

یہ بھی مروی ہے کہ حلیمہ جب آپ کو دودھ پلانے لگیں تو پستانوں سے اتنا دودھ بہنے لگا جو دس بلکہ اس سے بھی زیادہ بچوں کے لئے کافی ہوتا۔ جب حلیمہ آپ کو لے کر کسی خشک وادی سے گزرتیں تو وہ فوراً سرسبز ہو جاتی، حضرت حلیمہ خود سنتی اور دیکھتی تھیں کہ پتھر اور درخت آپ کو سلام کرتے تھے اور درختوں کی شاخیں آپ کی طرف جھک جاتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کا رضاعی بھائی دونوں ساتھ ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ رضاعی بھائی کا بیان ہے کہ میرا رضاعی بھائی جب کسی وادی پر جا کر کھڑا ہوتا تھا تو وہ فوراً سرسبز ہو جاتی تھی۔ اور بکریوں کو پانی پلانے کے لئے ہم کنویں پر آتے تھے تو کنویں کا پانی ابل کر کنویں کے منہ تک آ جاتا تھا، جب آپ دھوپ میں کھڑے ہوتے تھے تو بدلی آ کر سایہ کر لیتی تھی اور جنگل جانور آپ کے پاس آ کر آپ ﷺ کو چومتے تھے۔

خلاصۃ السیر میں ہے کہ آپ کی اناّ نے بیان کیا ایک بار آپ ہمارے اونٹوں کے مقام پر تھے اچانک، آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ دو سفید پوش آدمیوں نے میرے قرشی بھائی کو پکڑ کر زمین پر لٹا کر پیٹ پھاڑ دیا، حضرت حلیمہ کا بیان ہے ہم یہ بات سن کر فوراً ان کی طرف نکل کھڑے ہوئے جا کر دیکھا تو آپ منہ لپیٹے کھڑے ہوئے تھے ہم نے آپ کو چمٹا لیا اور دریافت کیا کیا واقعہ ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا دو آدمی سفید پوش آئے اور انہوں نے مجھے لٹا کر میرا پیٹ پھاڑا پھر اس کے اندر کسی چیز کو ٹٹولا مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا چیز نکالی۔ حضرت شداد بن اوس کی روایت سے ابو یعلیٰ، ابو نعیم اور ابن ابی عساکر نے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے کہ تین آدمیوں کا ایک گروہ آیا، ان کے پاس سونے کا طشت تھا جو برف سے بھرا ہوا تھا ان میں سے ایک نے مجھے زمین پر لٹایا (اور پیٹ پھاڑ کر) پھر پیٹ کے اندر کی چیزیں نکالیں، پھر ان کو برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر ان کو ان کی جگہ دوبارہ رکھ دیا پھر دوسرا کھڑا ہوا اور اس نے میرا دل نکال کر پھاڑا (اور اس کو صاف کیا) یہ سب باتیں میں دیکھ رہا تھا، پھر ایک سیاہ بوٹی اس کے اندر سے نکال کر پھینک دی پھر دائیں بائیں طرف ہاتھ گھمانے لگا معلوم ہوتا تھا کوئی چیز تلاش کر رہا ہے پھر مجھے نظر آیا کہ اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی ہے جو مجسم نور ہے اس کو دیکھنے سے نگاہ میں چکاچوند ہو رہی تھی اس انگوٹھی سے اس نے میرے دل پر مہر لگا دی مہر لگاتے ہی میرا دل نور سے بھر گیا یہ نبوت و دانش کا نور تھا پھر دل کو لوٹا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا میں اس مہر کی خنکی اپنے دل میں مدت تک محسوس کرتا رہا پھر تیسرے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا تم ہٹ جاؤ (وہ ہٹ گیا) تیسرے شخص نے سینے کی وسطی لکیر (خط ابیض) کے آغاز سے زیر ناف کے آخری حصہ تک ہاتھ پھیرا فوراً شگاف جڑ گیا۔

حضرت انس کا بیان ہے میں حضور ﷺ کے سینہ پر سلائی کا نشان دیکھتا تھا۔

ابن عساکر کی روایت میں آیا ہے کہ ایک سال کال پڑا، ابو طالب حضور ﷺ کو ساتھ لے کر بارش کی دعا کرنے کعبے کے

پاس پہنچے کعبہ کی دیوار سے اپنی پشت لگائی اور حضور ﷺ کی انگلی پکڑی اس وقت آسمان پر بادل کا ٹکڑا بھی نہ تھا، فوراً ادھر ادھر سے بادل آ گیا اور موسلادھار خوب بارش ہوئی اتنی کہ ساری وادی بہ نکلی۔ اسی واقعہ کی طرف ابو طالب نے ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے، ''ان کا رنگ گورا ہے ان کے طفیل میں بارش کی دعا کی جاتی ہے۔ وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور رانڈوں کی عصمت بچانے والی ہیں''۔

خلاصۃ السیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ملک شام کی طرف گئے۔ مقام بصریٰ میں پہنچے تو بحیرا راہب نے آپ کا حلیہ دیکھ کر پہچان لیا اور دست مبارک کو پکڑ کر کہا یہ رب العالمین کے رسول ہیں اللہ ان کو انسانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا۔ راہب سے دریافت کیا گیا تم کو اس کا کیسے علم ہوا، راہب نے کہا جب تم لوگ گھاٹی سے نکل کر آ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ہر درخت اور پتھر ان کی طرف کو جھک رہا تھا اور ایسا صرف نبی کے لئے ہی ہوتا ہے ہم نے اپنی کتابوں میں ان کے حالات پڑھے ہیں۔ پھر ابو طالب سے بحیرا نے کہا اگر تم ان کو لے کر شام کو گئے تو یہودی ان کو قتل کر دیں گے۔ چنانچہ راہب کے مشورے سے ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو بصریٰ سے ہی واپس کر دیا (یا ساتھ لے کر واپس لوٹ آئے) دوبارہ حضرت خدیجہؓ کے غلام کو ساتھ لے کر تجارت کی غرض سے آپ ﷺ ملک شام کو گئے اس وقت سن مبارک پچیس سال کا تھا اور حضرت خدیجہ سے نکاح نہیں ہو پایا تھا، شام میں پہنچ کر ایک راہب کے گرجے کے پاس اترے راہب نے اوپر سے میسرہ کی طرف جھانک کر دریافت کیا تمہارے ساتھ یہ کون شخص ہے میسرہ نے کہا باشندگان حرم میں سے ایک قریشی شخص ہے۔ راہب نے کہا اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے کبھی کوئی اور نہیں اترا۔ بعض روایت میں آیا ہے کہ راہب رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا میں ایمان لے آیا اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ وہی نبی ہیں جن کا ذکر اللہ نے توریت میں کیا ہے، پھر مہر نبوت کو دیکھ کر چوما اور کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول نبیٔ اُمّی ہاشمی عربی کی ہیں آپ ہی صاحب حوض ہیں آپ ہی شفاعت کرنے والے ہیں آپ ہی کے ہاتھ میں لواء الحمد ہو گا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ میسرہ نے بیان کیا دوپہر کا وقت ہوا اور گرمی سخت ہو گئی تو دو فرشتے اتر کر آپ پر سایہ کرنے لگے تاکہ گرمی (اور سورج کی تیزی) سے آپ کو تکلیف نہ ہو آپ اس وقت اپنے اونٹ پر سفر کر رہے تھے حضرت خدیجہ نے میسرہ کا جب بیان سنا تو آپ کے دل میں حضور ﷺ سے نکاح کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

سہیلی نے راہب مذکور کے قول کا مطلب اس طرح بیان کیا۔ راہب کی مراد یہ تھی کہ اس وقت اس درخت کے نیچے پیغمبر ہی فروکش ہوا ہے۔ سہیلی کو اس تاویل کی ضرورت اس لئے پڑی کہ انبیاء کے دور کو گزرے ایک طویل مدت (تقریباً پانچ سو سال) گزر چکے تھے اتنی طویل مدت کسی ایک درخت کا باقی رہنا بعید از عقل تھا پھر درخت بھی سر راہ تھا آنے جانے والے ضرور اس کے نیچے آرام لیتے رہے ہوں گے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لب راہ درخت کے نیچے کوئی مسافر سوائے نبی کے کبھی نہ اترا ہو۔ سہیل کی توجیہ (ٹھیک ہے لیکن یہ توجیہ) لفظ قط کے خلاف ہے قط کا تو یہ معنی ہے کہ کبھی اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے اور کوئی نہیں اترا حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے غیر معمولی حالات اللہ کی قدرت سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے اور کوئی کبھی نہ اترا ہو۔ اللہ کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں۔ (سہیلی کی توجیہ کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ درخت جس کی عمر دس بیس یا پچاس برس ہے اس مدت میں کوئی شخص کبھی اس کے نیچے نہیں نازل ہوا اس وقت صرف پیغمبر ہی فروکش ہوا اور حسب صراحت توریت اس کے نیچے پیغمبر ہی اتر سکتا تھا) واللہ اعلم۔

سالم کی روایت میں آیا ہے کہ آیت مذکورہ کی تفسیر میں حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا مشکوٰۃ سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کا مبارک سینہ اور زجاجہ سے مراد ہے آپ کا دل اور مصباح وہ نور تھا جو آپ کے دل میں روشن تھا اور شجرہ مبارک سے مراد ہیں حضرت ابراہیم اور شرقی غربی نہ ہونے سے مراد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ عیسائی اور نورٌ علیٰ نور کا یہ مطلب ہے کہ ایک نور تو حضرت ابراہیمؑ کے دل کا نور تھا اور دوسرا نور رسول اللہ ﷺ کے دل کا نور۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا مشکوٰۃ حضرت ابراہیمؑ تھے اور زجاجہ حضرت اسمٰعیلؑ اور مصباح رسول اللہ ﷺ۔ آپ ہی کی ذات کو اللہ تعالیٰ نے آیت سراجاً منیراً میں سراج فرمایا ہے۔ یہ چراغ ایک برکت والے درخت کے تیل یعنی حضرت ابراہیم کی ذات سے روشن تھا، حضرت ابراہیمؑ یقیناً بہت ہی بابرکت تھے اکثر انبیاء آپ ہی کے نسل سے ہوئے پھر آپ ایسے درخت کی طرح تھے جو نہ شرقی ہو نہ غربی یعنی آپ نہ یہودی تھے نہ عیسائی یہودی مغرب کو منہ کر کے عبادت کرتے ہیں اس لئے یہودیوں کو غربی قرار دیا اور عیسائی شرقی قرار پائے۔ یَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ وحی آنے سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کے کمالات اور محاسن ظہور پذیر ہونے والے تھے (آگ کے چھونے یعنی آنے کے لئے تو ان کا ظہور ہو ہی گیا وحی سے پہلے ہی وہ قریب الظہور تھے) نور بالائے نور کا یہ مطلب ہے کہ نور اصل نور نسل کے ساتھ شامل ہو گیا ایک تو نور ابراہیمی تھا پھر نور محمدی ﷺ اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ پس نور محمدی نور بالائے نور ہو گیا، ابو العالیہ نے حسب ذیل تفسیر کی حضرت ابی بن کعب کی طرف نسبت کی ہے کہ یہ مومن کی مثال ہے مومن کی ذات ایک مشکوٰۃ ہے زجاجہ مومن کا سینہ ہے مصباح اس کا دل ہے نور مصباح ایمان اور قرآن کی روشنی ہے جو مومن کے دل میں ہوتی ہے۔ شجرۂ مبارکہ سے یہ روشنی اخلاص للہ کے مبارک درخت سے حاصل ہوتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سرسبز شاداب درخت جو گھنے باغ میں دوسرے درختوں سے گھرا ہوا ہو کہ سورج کے طلوع و غروب کے وقت دھوپ سے محفوظ ہو مومن بھی ہر طرح کے فتنہ سے محفوظ رہتا ہے، چار اوصاف اس کے خصوصی اوصاف ہوتے ہیں اگر اللہ کی طرف سے اس کو کچھ ملتا ہے تو شکر ادا کرتا ہے نہیں ملتا تو صبر کرتا ہے فیصلہ کرتا ہے تو انصاف کا کرتا ہے بات کہتا ہے تو سچی کہتا ہے اس کا دل ایسا چراغ ہوتا ہے جو آگ کو چھو جانے کے بغیر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشن ہو جانے کے قریب ہے یعنی ظہور حق سے پہلے ہی اس کو معرفت حق حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا دل فطری طور پر حق پرست ہے، وہ نور بالائے نور ہوتا ہے اس کا قول ایک نور ہوتا ہے اس کا علم ایک نور ہوتا ہے اس کا آنا نور اور جانا نور ہوتا ہے اور قیامت کے دن وہ نور ہی کی طرف جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ اللہ کے نور کی مثال ہے جو مومن کے دل میں ہوتا ہے مومن کا دل فطرتاً ہدایت پر عمل کرتا ہے جب اس کو (شریعت کے ذریعہ سے) علم حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی ہدایت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے نور بالاء نور ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں صوفی کا دل حق بات، حق عمل اور حق اعتقاد کی وجہ سے کھل جاتا ہے، حق کو قبول کرتا ہے اور باطل کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، باطل سے اس میں انقباض ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اپنے دل سے (مشتبہ امور میں) فتویٰ طلب کرو۔ اگرچہ مفتیوں نے تم کو فتویٰ دے دیا ہو۔ رواہ البخاری فی التاریخ بسند حسن۔ جب مومن کے دل میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا علم آجاتا ہے تو اس کے اندر یقین وہدایت کا نور اور بڑھ جاتا ہے۔ نور علیٰ نور کی تشریح میں کلبی نے کہا یعنی مومن کا ایمان اور اس کا عمل، سدی نے کہا نور ایمان اور نور قرآن۔

حسن اور ابن زید نے کہا یہ قرآن کی مثال ہے مصباح قرآن ہے جس طرح چراغ سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ زجاجہ مومن کا دل ہے مشکوٰۃ اس کا منہ اور زبان ہے، مبارک درخت وحی کا درخت ہے، زیت سے مراد ہے قرآنی دلائل، تیل کے روشن ہو جانے سے مراد ہے حجت قرآن کا واضح ہو جانا خواہ اس کو پڑھا نہ گیا ہو، یعنی نزول قرآن سے پہلے اللہ نے مخلوق کی ہدایت کی نشانیاں اور دلائل قائم فرمادی تھیں، پھر جب قرآن نازل ہوا تو نور بالائے نور ہو گیا، نور فطرت میں نور قرآن کا اضافہ ہو گیا۔

بعض علماء نے کہا یہ حقیقت میں اس ہدایت کی تمثیل ہے جو واضح آیات کے مفہوم کے اندر موجود ہے اور اس ہدایت کا ظہور مشکوٰۃ ہے یا یوں کہا جائے کہ لوگوں کے اوہام و خیالات کی تاریکیاں ہدایت کو گھیرے رہتی ہیں۔ پس یہ ہدایت چراغ کی طرح ہے جس کو ہر طرف سے ظلمت محیط ہوتی ہے (اور وہ بیچ میں جگمگاتا رہتا ہے) یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ نے انسان کو پانچ

علمی ادراکی قوتیں عطا فرمائی ہیں جن سے انسانی معاش و معاد وابستہ ہے۔

(۱) حسی قوت (یعنی حس مشترک) جس کے ذریعہ سے دماغ ان چیزوں کو جان لیتا ہے جو ظاہری پانچوں حواس کے ذریعہ سے محسوس ہوتی ہے۔

(۲) خیال کی قوت یہ طاقت احساسی قوت کے معلومات کا خزانہ ہے محسوسات کی جو صورتیں حسی قوت میں آتی ہیں ان کو یہ اپنے اندر جمع رکھتی ہے تاکہ ضرورت کے وقت قوت عقلیہ کے سامنے لا سکے۔

(۳) قوت عاقلہ جو صرف کلی حقائق کا ادراک کرتی ہے (جزئی صورتوں سے حقائق کلیہ کا تجرد اور استنباط کر لیتی ہے۔

(۴) فکری قوت یعنی قوت متفکرہ جو معلومات کو ترتیب دے کر نامعلوم چیزوں کا علم حاصل کرتی ہے۔ اس کا کام دلائل کو جوڑنا اور معلومات کو ترتیب دینا ہے۔

(۵) قوت قدسیہ یہ قوت انبیاء اور اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے اسرار ملکوت اور انوار غیب کا اس کے ذریعہ سے انکشاف ہوتا ہے آیت وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ من عبادنا میں یہی قوت مراد ہے۔ آیت زیر تفسیر میں یہی پانچویں قوتیں مشکوٰۃ، زجاجہ، مصباح، شجرہ اور زیت سے مراد ہیں۔

حسی قوت، مشکوٰۃ کی طرح ہے گویا یہ ایک کھڑکی یا روشندان ہے جس کا رخ باہر کی طرف کو ہے اور صرف محسوسات خارجیہ کو جانتی ہے، اپنے پیچھے کا اس کو کچھ ادراک نہیں، اس کا معقولات کے ذریعہ سے روشن ہو جانا بالذات نہیں۔

قوت خیالیہ، اس قارورے یا شیشے کی طرح ہے جو ہر جہتی معقولات کی صورتوں کا ادراک کرتی ہے اور انوار عقلیہ کو اپنے اندر محفوظ رکھتی اور قوت عاقلہ کی ضیاء پاشی سے روشن رہتی ہے۔

قوت عاقلہ، ایک چراغ ہے جو علوم کلیہ اور معارف ربانیہ کے نور سے جگمگا رہا ہے، قوت متفکرہ، ایک مبارک درخت ہے جس کے پھل لامحدود ہیں یہ زیتون کا درخت ہے جس سے روغن پیدا ہوتا ہے اور اسی روغن سے چراغ روشن ہوتا ہے، یہ درخت نہ غربی ہے نہ شرقی کیونکہ تمام جسمانی عوارض سے پاک ہے یا یوں کہو کہ یہ درخت فکریہ صورتوں اور معانی کے درمیان واقع ہے، دونوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے اور دونوں میں تصرف کرتا ہے۔

قوت قدسیہ روغن زیتون کی طرح صاف شفاف ہے، بغیر سوچ بچار اور کسی سے سیکھنے کے خود ہی معارف و علوم کی نورانیت سے جگمگا جانے کے قریب ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت مذکورہ میں قوت عقلیہ کی تمثیل ہو، ہر شخص کی قوت عقلیہ و علمیہ ہر قسم کی صورتوں سے خالی ہوتی ہے لیکن قبول علم کی اس میں صلاحیت و استعداد ہوتی ہے اس درجہ کو آیت میں مشکوٰۃ قرار دیا ہے (قدماء فلاسفہ حسب صراحت ابہروی و شیخ ابن سینا قوت عقلیہ کے اس مرتبہ کو عقل ہیولانی کہتے ہیں) اس مرتبے سے ترقی کر کے قوت عقلیہ کا دوسرا درجہ وہ آتا ہے کہ بدیہی علوم اس کو حاصل ہو جاتے ہیں، بغیر سوچ بچار اور فکر و نظر کے بعض چیزوں کا اس کو علم ہو جاتا ہے لیکن کسی نظری چیز کا علم بالفعل نہیں، ہاں صلاحیت (قریبہ یا بعیدہ) نظری علوم کو حاصل کرنے کی موجود ہوتی ہے۔ احساس جزئیات سے حاصل شدہ بدیہی علوم کی تصویریں اس کے اندر موجود ہوتی ہیں اور ان بدیہی علوم کو ترتیب دے کر وہ نظری امور کا علم حاصل کر سکتی ہے گویا اس درجہ میں پہنچ کر وہ ایک جگمگاتا شیشہ ہوتی ہے اگر اس درجہ میں پہنچ کر قوت عقلیہ فکر و اجتہاد کے ساتھ نظری علوم حاصل کرنا چاہتی ہے تو زیتون کے درخت کے مشابہ ہے اور اگر حدس کے ذریعہ سے تحصیل علم کرتی ہے تو روغن زیتون کی طرح ہے فکر کا معنی ہے مبادی اور مقدمات کے ذریعہ سے نتائج کی جانب قوت فکریہ کی حرکت اور حدس کا معنی ہے نتائج سے مبارک کی طرف بازگشت اور اگر تحصیل کا سرچشمہ قوت قدسیہ ہے تو اس کی حالت ایسی ہے جیسے اتنا صاف و شفاف روغن کہ بغیر آگ اور دیا سلائی کو مس کئے بھی گویا مشتعل ہو جائے گا (یعنی بہت ہی قریب الاشتعال ہے) وحی اور الہام کا فرشتہ قوت عقلیہ کے لئے مرکز نور و اشتعال ہے قوت قدسیہ کا مرتبہ اتنا جلی اور نورانی ہوتا ہے کہ وحی و الہام کے ملائکہ سے اتصال و تعلق کے بغیر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود اس میں اشتعال و نورانیت کا ظہور

ہو جائے گا، اس سے آگے بڑھ کر جب قوت عقلیہ کو علوم نظریہ حاصل ہو جاتے ہیں تو دو صورتیں ہوتی ہیں۔ (۱) علوم نظریہ عقل کے سامنے ہر وقت حاضر نہیں ہوتے لیکن عقل جب ان کو حاضر کرنا چاہتی ہے حاضر کر لیتی ہے، تصویریں موجود ہیں التفات نظر کی ضرورت ہے، جب چاہا اور التفات نظر سے کام لے کر حاضر کر لیا اس مرتبہ کو ہم مصباح سے تشبیہ دے سکتے ہیں (۲) لیکن اگر تصاویر ہر وقت عقل کے سامنے حاضر ہوں تو یہ نور بالائے نور ہو جاتا ہے (یاد رکھو کہ دوسرے درجہ کو اہل فلسفہ عقل بالملکہ اور تیسرے درجہ کو عقل بالفعل اور چوتھے درجہ کو عقل مستفاد کہتے ہیں یا تیسرے درجہ کو عقل مستفاد اور چوتھے درجہ کو عقل بالفعل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی کے کشف الہامی پر مبنی آیت زیر تفسیر کی دو تاویلیں اور بھی ہیں جن کو ہم اس جگہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ (۱) اللہ نور السموت و الارض یعنی آسمان وزمین کو موجود کرنے والا اور پردۂ عدم سے میدان خارجی میں لانے والا ہے اور یہ وجود خارجی مثل ظل اور سایہ کے ہے۔

مثل نورہ۔ نور سے مراد ہے وجود۔ عظمت نور کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ذات کی طرف نور کی نسبت کی جیسے بیت اللہ (خانہ خدا) اور ناقۃ اللہ (اللہ کی براہ راست پیدا کی ہوئی متبرک اونٹنی) کہا جاتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ماہیات ممکنات پر وجود خداوندی پر تو انداز اور سایہ افگن ہے جیسے چاند اور سورج کے مقابل جو خطۂ زمین آجاتا ہے اس پر چاند اور سورج کا نور عکس ریز ہوتا ہے۔

کمشکوٰۃ یعنی جیسے مشکوٰۃ (طاقچہ، چراغ دان) کی روشنی، مضاف محذوف ہے۔

فیھا مصباح یعنی مشکوٰۃ کے اندر چراغ روشن ہے اور چراغ کی روشنی سے مشکوٰۃ پُرنور ہو رہا ہے اسی طرح اللہ کی صفات واسماء کے چراغ سے تمام ممکنات کی حقیقتیں نور وجود حاصل کر رہی ہیں۔

المصباح فی زجاجۃ یعنی چراغ کی نور پاشی بدرجۂ کمال ہے، حضرت مجدد نے فرمایا انبیاء اور اولیاء کو چھوڑ کر باقی تمام ممکنات کے مبادی تعین اللہ کی صفات نہیں بلکہ صفات کا پر تو اور ظل مبد تعین ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ اللہ اپنی صفات کمال کو بھی جانتا ہے اور ان صفات کے نقائض کو بھی یعنی وہ اپنی صفات ثبوتیہ کا بھی علم رکھتا ہے اور صفات سلبیہ تنزیہیہ کا بھی۔ جیسے موت نقیض حیات ہے جہالت نقیض علم ہے کمزوری اور عجز قدرت کی نقیض ہے۔ بہرا ہونا سننے کی نقیض ہے نابینا ہونا بینا ہونے کی نقیض گونگا ہونا کلام کی نقیض ہے، مجبور ہونا بااختیار ہونے کی نقیض ہے اور تعطل تکوین کی نقیض ہے۔

جب اللہ کی صفات ثبوتیہ اور سلبیہ مرتبۂ علم میں جمع ہو جاتی ہیں تو نقائض کی تصویریں صفات سلبیہ کے ساتھ آمیختہ ہو جاتی ہے ان مخلوقات کی حقیقت عدم ہوتی ہے اور سلب صفات ان کے عوارض ہوتے ہیں یعنی یہ صفات سلبیہ اور تنزیہیہ ہوتی ہیں۔ صوفیا کی اصطلاح میں انہی مخلوطات کو ظل صفات کہتے انہی کو اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے۔ یہی ممکنات اور حقائق ممکنات کے مبادی تعین ہوتے ہیں۔ یہی حقائق امکانیہ کی مربی (تعین کرنے والی) ہوتی ہیں، صفات کی تشبیہ روشن چراغ سے دی جاسکتی ہے اور ظلال صفات کو شیشہ کہہ سکتے ہیں اور ماہیات امکانیہ کے وجود و ظہور کو مشکوٰۃ قرار دیا جاسکتا ہے، چراغ کی روشنی سے شیشہ اور قارورہ روشن ہو جاتا ہے، مصباح کے نور سے شیشہ جگمگا جاتا ہے، پھر اس قارورہ اور شیشے کی جلوہ افگنی مشکوٰۃ پر ہوتی ہے اور مشکوٰۃ میں نورانیت اور چمک پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح فصات کا نور ظلال صفات کو منور کر دیتا ہے، صفات، ظلال پر پر تو انداز ہوتی ہیں اور ان کو روشن کر دیتی ہیں اور ظلال صفات کی عکس ریزی ماہیات امکانیہ پر ہوتی ہے اور ممکنات کو نور وجود حاصل ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ کہ مشکوٰۃ کا نور یعنی ممکنات کا وجود اور ظہور شیشہ سے یعنی ظلال صفات سے حاصل ہوتا ہے اور شیشہ کی نورانیت یعنی ظلال کی نور چینی اور نور پاشی اصل مصباح یعنی صفات کی پر تو اندازی کی ممنون کرم ہے۔

مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نور اللہ کے چہرہ کا نقاب ہے اگر وہ اس نقاب کو کھول دے تو اس کے چہرے کے چمکارے (شعاعیں) وہاں تک ساری مخلوق کو جلا کر سوختہ کر دیں جہاں تک

اس کی نظر پہنچے۔ شاید اس حدیث میں نور سے مراد مرتبۂ ظلال ہے اور انوار وجہ سے مراد ہیں صفات۔
بات یہ ہے کہ عام ممکنات کی ماہیات اپنی استعداد کی کمزوری سے براہ راست ظلال کی وساطت کے بغیر صفات سے نور وجود کو حاصل نہیں کر سکتیں، اگر ظلال صفات کا توسط نہ ہو تو عام ممکنات معدوم ہو جائیں البتہ انبیاء و اولیاء اپنی استعداد و صلاحیت کی قوت کی وجہ سے براہ راست صفات سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں، پس جس طرح ظلال، صفات سے براہ راست نور چیں ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء و اولیاء بھی براہ راست صفات سے نور اندوز ہوتے ہیں اور چونکہ ان کے اصول میں شر کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اس لئے وہ سرشتی طور پر گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ یعنی نور مصباح سے شیشہ روشن اور چمکیلا ہوتا ہے کہ شیشہ کو دیکھ کر دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہی مصباح ہے دیکھنے والے شیشہ (یعنی فانوس) اور چراغ میں امتیاز نہیں کر پاتے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

رق الزجاج ورقت الخمر فتشابها وتشاكل الامر

(شیشہ بھی شفاف ہے اور شراب بھی شفاف ہے، دونوں ہم شکل ہیں)۔

نکانما خمرو لا زجاج دکانما زجاج ولا خمر

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف شراب ہے شیشہ نہیں اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ صرف شیشہ ہے شراب نہیں ہے)
ظلال وصفات میں چونکہ اتنا اشتباہ ہے کہ دونوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے اسی لئے عارفوں کا ایک گروہ یعنی وہ صوفی جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں نظر فریب میں مبتلا ہو گئے، ظلال کو صفات سمجھ بیٹھے دونوں مرتبوں کا فرق نہ سمجھ سکے اور صفات کو عین ذات کہنے لگے اور خیال کرنے لگے کہ ممکنات کی ماہیات میں جو حقیقت جلوہ انداز ہے وہ ان ممکنات کی عین ہے نور پذیر اور نور افگن ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اسی غلط فہمی کی بنیاد پر وہ پکار اٹھے، لیس فی الکون الا اللّٰہ عالم وجود میں سوائے اللہ کے اور کچھ نہیں۔ ایک عارف نے کہا، لیس فی جبتی سوی اللّٰہ میرے جبہ کے اندر سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں، ایک وجودی شاعر کا قول ہے۔

لا ملک سلیمان ولا بلقیس ولا ادم فی الکون ولا ابلیس

شالم وجود میں نہ ملک سلیمان ہے نہ بلقیس نہ آدم نہ ابلیس۔

والکل صور وانت المعنی یا من ہو للقلوب مقناطیس

اے وہ ذات جو دلوں کے اپنی طرف کھینچنے کے لئے مقناطیس ہے حقیقت تو ہی ہے اور باقی سارا جہان محض صورتیں مورتیں ہیں۔
یہ ساری خرافات سکر اور فریفتگی عشق کا نتیجہ ہیں یہ لوگ جلوہ آفریں اور جلوہ پذیر میں فرق نہ کر سکے۔
يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ یعنی وہ چراغ زیتون کے برکت والے درخت کے تیل سے روشن ہے۔
خاص ہدایت:۔ اللہ کی صفات کا خارج میں وجود و ظہور اللہ کی ذات سے وابستہ ہے اس لئے صفات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن ہیں اور ذات خداوندی کی وجہ سے واجب (یعنی صفات فی نفسہا ممکن ہیں ممکن بالذات ہیں اور واجب بالغیر۔) پس صفات امکانی وذاتی لحاظ سے انبیاء اور ملائکہ کے تعین کا مبدء ہیں اور وجود کے لحاظ سے قدیم ہیں کیونکہ ان کا قدم ذات خداوندی سے مستفاد ہے (اور ذات خداندی قدیم ہے اس لئے صفات بھی قدیم ہیں جیسے صفات میں امکان ذاتی ہے اور وجوب بالغیر اسی طرح ان میں قدم بھی بالغیر ہے۔ مترجم) پس ذات خداوندی زیتون کے بابرکت درخت کے مشابہ ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی (اس کی کوئی جہت خاص نہیں وہ ہر جہتی ہے) اور صفات مثل چراغ کے ہیں ذات سے (حسب المفہوم) زائد ہیں۔ قرآن اور اقوال رسول اللہ ﷺ سے یہی مستفاد ہے اور اسی پر اجماع اہل سنت ہے۔
ابو الحسن اشعری کا خیال ہے کہ صفات نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات یعنی ذات سے (حسب المفہوم) زائد ہیں اس لئے

عین ذات نہیں اور ذات سے (بحسب الوجود) جدا نہیں ہیں اس لئے غیر ذات بھی نہیں ہیں فلاسفہ اور معتزلہ وجود صفات کے منکر ہیں (یعنی ذات سے زائد نہیں مانتے بلکہ ذات کو عین صفات کہتے ہیں) وہ کہتے ہیں کہ اگر ذات خداوندی کو فی نفسہا صفات سے الگ مانا جائے گا اور صفات کو ذات سے الگ قرار دیا جائے گا تو ترتب آثار کے لئے ذات کو صفات کا محتاج ماننا پڑے گا (کیونکہ متعدد صفات کی وجہ سے ہی مختلف آثار کا ذات سے ظہور ہوگا تنہا مجرد عن الصفات ذات ظہور آثار کے لئے کافی نہیں ہو سکتی)۔
متکلمین نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ ذات کی احتیاج اپنی صفات کی طرف محال نہیں صفات سے الگ کسی اور چیز کی طرف ذات کی احتیاج ممنوع ہے۔

شیخ مجدد نے فرمایا صفات ضرور ذات سے زائد ہیں اور خارج (یعنی نفس الامر) میں ان کا وجود ہے نصوص قرآنی اور صراحت احادیث سے یہ ثابت ہے لیکن ذات فی نفسہا ترتب آثار میں صفات کی محتاج نہیں ہے (یعنی تنہا ذات بغیر صفات کے اظہار آثار کے لئے کافی ہے) اگر ہم ساری صفات کا عدم فرض کرلیں تب بھی آثار کا ظہور ذات سے ضرور ہوگا۔ مثلاً اگر سننے اور دیکھنے کی صفت ذات میں نہ مانی جائے تب بھی تنہا ذات ان آثار کے اظہار کے لئے کافی ہے جو شنوائی اور بینائی کی صفات پر مرتب ہوتے ہیں۔ شنوائی کے آثار اگر (بغیر صفت سمع کے) تنہا ذات سے ظاہر ہوں تو اس وقت اس کو شان سمع کہا جائے گا اسی طرح بصارت کے آثار بغیر صفت بصارت کے ذات سے ظاہر ہو سکتے ہیں اس لئے اس کو شان بصارت کہا جائے گا پس یہی شیون ذات، صفات کے اصول ہیں اور صفات، ظلال کے اصول ہیں۔ شان گویا اعتبار، بہر حال یہ اس روغن کے مشابہ ہے جو زیتون کے مبارک درخت کے اندر ہوتا ہے۔ اس تقریر پر یکاد زیتها یضیئی ولولم تمسسه نار کے ساتھ تشبیہ کامل ہوگئی صفات نہ ہوں تب بھی شیون ذات پر آثار مرتب ہونا یقینی ہے گو صفات چراغ کی آگ کی طرح ہیں اور زیت شیون ذات ہیں۔

نور علی نور یعنی ایک تو چراغ کا نور ہے جو شیشے اور مشکوٰۃ کو روشن کر رہا ہے دوسرا درخت زیتون کے روغن کا نور ہے، جیسے ایک نور صفات ہے جس سے آثار کا ظہور ماہیات کی نور اندوزی اور ممکنات کی ایجاد وابستہ ہے دوسرا نور شیون ذات کا ہے اس طرح نور بالائے نور ہے۔

یهدی الله لنوره من یشاء یعنی جس شخص کو چاہتا ہے اللہ اپنا نور معرفت عطا فرماتا ہے اس کی معرفت کا نور خاص خاص عارف ہی حاصل کرتے ہیں۔

اس توجیہ پر اس آیت میں ایجاد اشیاء کی طرف اشارہ ہوگا وجود خارجی ظلی کے میدان میں پردۂ عدم سے نکل کر آنا مراد ہوگا اور اس بات کا ثبوت ہوگا کہ تمام موجودات سے ذات خداوندی انتہائی قریب ہے۔

سورۂ قاف کی آیت وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ کی تفسیر میں ہم نے اقربیت ذات کی مفصل تشریح کردی ہے۔

---

(۲) دوسری تاویل جو سلف سے مروی ہے حسب ذیل ہے الله نور السموت و الارض یعنی آسمان وزمین کے رہنے والوں کو اللہ اپنی معرفت کا راستہ بتانے والا ہے پس تمام اہل ارض وسماء اسی کے نور کے ذریعہ سے ذات وصفات کی معرفت کا راستہ پاتے اور مراتب قرب تک ترقی کرتے جاتے ہیں آیت قریب من المحسنین اور آیت اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ میں درپردہ اسی نور کو بیان کیا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرا قرب حاصل کرتا جاتا ہے، بالآخر میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ الحدیث۔ اسی قرب کا نام ولایت خاصہ ہے۔

مثل نوره کمشکوٰة فیها مصباح یعنی مومن کے دل میں اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے مشکوٰۃ کا نور جس کے اندر چراغ روشن ہو۔ پس مومن کا دل ایک مشکوٰۃ ہے جس کے اندر صفات الٰہی کی جلوہ پاشی ہو رہی ہے اور صفات خداوندی مثل روشن چراغ کے ہیں۔ اور یہ چراغ زیتون کے ایک بابرکت درخت (کے تیل) سے روشن ہے اور درخت بھی وہ ہے جو جس

شرقی ہے نہ غربی، یعنی صفات الٰہیہ ذات الٰہی سے پھوٹ رہی ہیں اور ذات کے اندر شیون ذاتیہ اور اعتبارات ان صفات کے لئے سرچشمہ ہیں۔

المصباح فی زجاجه الزجاجة کانها کوکب دری اس آیت میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اولیاء عموماً براہ راست صفات الٰہیہ سے پرتو اندوز نہیں ہو سکتے، ان کی نور چینی ظلال کی وساطت پر موقوف ہے ظلال کے پردے کے پیچھے صفات ہیں جو ظلال پر پرتو افگن ہیں اور ظلال کی نور پاشی اولیاء پر ہوتی ہے، انبیاء کے علاوہ دوسرے تمام لوگوں کا مبدء تعین یہی ظلال صفات ہیں صفات نہیں ہیں عام اولیاء کی براہ راست ترقی اپنے اصول یعنی ظلال تک ہوتی ہے ظلال ہی کی وساطت سے وہ انوار صفات کی خوشہ چینی کرتے ہیں انہی انوار ظلال میں اولیاء کی فنا و بقا ہوتی ہے اسی وساطت سے ان کو تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور اس تقرب کا نام ولایت ہے لیکن یہ ولایت صغریٰ کہلاتی ہے، ہاں کچھ کامل ترین اولیاء ایسے بھی ہوتے ہیں کہ صاحب شریعت کے اتباع کی وجہ سے ان کو مقام صفات تک بلکہ مرتبہ شیون تک ترقی مل جاتی ہے اور یہی مقام ان کے لئے فنا وبقاء کا مقام ہوتا ہے، مرتبہ صفات کی دو حیثیتیں ہیں (۱) ظہور۔ (۲) بطون۔ ظہور حیثیت تو یہ ہے کہ وہ ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہی ظہور صفات ولایت کبریٰ یعنی ولایت انبیاء ہے اور بطون کی حیثیت کا نام ولایت علیا یعنی ولایت ملائکہ ہے۔

انبیاء کے بعد صدیقین کا مرتبہ ہے صدیقین صحابہ کے متعلق فرمایا ہے، ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ اور صحابہ کے بعد دوسرے صدیقوں کے متعلق فرمایا، وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ صدیق مرتبۂ صفات و شیون کے حجاج کے بغیر خالص ذات ان پر جلوہ پاش ہو جاتی ہے آیت میں آخری دونوں فریقوں کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے البتہ نور علی نور سے اولیاء کے مراتب وصول کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر ایک نور دوسرے نور سے اوپر ہے درجۂ نورانیت میں بڑا تفاوت ہے۔

يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ ۚ اللہ اپنے نور کے ذریعہ سے جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اس پر اپنے نور کا کچھ حصہ (پرتو) ڈالا، پس جس شخص نے اس نور کا کچھ حصہ پا لیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس نے نور کا حصہ نہ پایا وہ گمراہ ہو گیا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم پر قلم خشک ہو گیا۔ رواہ احمد والترمذی، مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مخلوق کو جہالت و گمراہی کے حال میں پیدا کیا۔ اس جہالت کا سرچشمہ عدم ذاتی ہے اس کے بعد اپنے اس نور کا کچھ حصہ اس پر ڈالا۔ یعنی ظلال میں جو نور صفات سے آتا ہے اس نور کا کچھ حصہ مخلوق پر ڈالا جس پر اس نور کا کچھ چمکارا پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا، نہ پڑا تو گمراہ ہو گیا۔ نور پڑنے اور پہنچنے کی صورت یہ ہے کہ جس ذات گرامی کو اللہ نے رحمت عالم بنا کر بھیجا اور اس کے سینے کو کھول دیا اور اس کے دل کے اندر نور حکمت اور ایمان کو بھر دیا اس کی پیروی کی جائے اس کے چمکتے ہوئے نور کا کوئی چمکارا چن لیا جائے اپنے دل کو اس رحمت عالم کے دل کا آئینہ بنا دیا جائے، تاکہ اپنا دل بھی بقدر نور چینی روشن ہو جائے۔ آدمی تین طرح کے ہیں ایک وہ گروہ ہے جس نے صورت ایمان حاصل کر لی، دنیا میں کفر سے اور آخرت میں دوزخ سے نجات پالی، دوسرا وہ گروہ ہے جس نے حقیقت پالی حقیقت ایمان پانے والوں کے درجات مختلف ہیں۔ تیسرا وہ طبقہ ہے جس نے نور ایمان قطعاً حاصل نہیں کیا، صحیح راستہ سے محروم رہا، اور ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ یہ گروہ اہل ضلالت کا ہے۔

حضرت ابو عنبسہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، زمین والوں میں اللہ کے نور کے کچھ ظروف ہیں، یعنی اللہ کے نیک بندوں کے دل، جو دل سب سے زیادہ نرم اور بہت زیادہ پسیجنے والے ہیں، اللہ کو وہ سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ رواہ الطبرانی۔

وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ اور لوگوں کے فائدے کے لئے اللہ مثالیں بیان کرتا ہے، یعنی وہ عقلی معانی جن کو آدمی حواس کے ذریعہ سے نہیں سمجھتا ان کو سمجھانے کے لئے اللہ محسوس مثالیں دیتا ہے، تاکہ غیر محسوس امور کا انسان کو علم ہو جائے، آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے اولیاء کو عالم مثال میں ان چیزوں کی تصویریں دکھا دیتا ہے

جن کی (عالم محسوسات و معقولات میں) کوئی تصویر نہیں اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ حق بالکل نمایاں ہو کر ان کے سامنے آجائے اور وہ حقیقت کی صورت دیکھ لیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ سے بندے کا قریب ہونا تو قرآن اور حدیث سے ثابت ہے، نوافل کے ذریعہ سے بندہ اللہ کا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، لیکن یہ قرب (جسمانی نہیں، مادی نہیں) بے کیف ہے اس کی کیفیت نہیں بیان کی جاسکتی۔ نہ حواس ظاہری و باطنی سے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے نہ عقل نارسا کی علمی رسائی وہاں تک ہے، نہ علم حصولی کا اس سے تعلق ہے نہ اس کا علم، حضوری ہو سکتا ہے[1]، بلکہ عقلی اور حسی علم کے علاوہ براہ راست اللہ کی طرف سے اس کا فیضان ہوتا ہے اسی علم کو بطور کنایہ بیان کیا گیا ہے اس حدیث قدسی میں جس میں اللہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے حتی کنت سمعه الذی یسمع به (میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے) علم وجدانی کے حصول کا براہ راست فیضان کے علاوہ ایک اور ذریعہ بھی ہوتا ہے، عالم مثال میں ان تمام حقائق و معانی کی صورتیں اور جسمانی شکلیں موجود ہیں جن کی اس عالم جسمانی میں کوئی شکل نہیں (مثلاً عداوت، محبت، صداقت، علم، ایمان، جہالت وغیرہ ایسے معانی ہیں جن کی کوئی شکل اس عالم میں موجود نہیں، ہاں ان معانی کے مظاہر موجود ہیں) صوفی عالم مثال میں ظلال کا دائرہ دیکھتا ہے اور صفات کا دائرہ بھی اس کو نظر آتا ہے اور جتنا نوافل کو انابت اور رجوع الی اللہ کے زینے پر آگے بڑھاتا ہے اس کو اپنی ذات دائرہ ظلال کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آخر دائرہ ظلال میں اس کی ذات مخلوط ہو کر گم ہو جاتی ہے۔ اور دائرے کے رنگ میں ڈوب جاتی ہے اس کے آگے دائرہ صفات کی طرف اس کی سیر شروع ہوتی ہے اور جب حدود صفات تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنی انفرادی ہستی کھو دیتا ہے اور صفات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ حقیقت میں وہاں کوئی رنگ نہیں ہوتا (رنگ تو عرض کی قسم ہے اور مقولہ کیف سے ہے وہاں تو کوئی کیفیت نہیں) لیکن سمجھانے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ زبان اس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہے اس لئے رنگ کا لفظ استعمال کیا گیا، اللہ نے فرمایا سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ہم ان کو انفسی اور آفاقی نشانیاں دکھاتے ہیں تاکہ ان کو کامل انکشاف ہو جائے کہ اللہ ہی حق ہے (اور اللہ کے سوا ہر چیز باطل اور بے حقیقت)

وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝٣٥ اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے (یعنی ایسا نہیں کہ بغیر علم کے اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں۔ بلکہ بخوبی کامل علم کی حالت میں اللہ بیان فرماتا ہے۔)

فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ ان گھروں میں جن کو بنانے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

بیوت سے مراد ہیں مسجدیں۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مسجدیں زمین پر اللہ کے گھر ہیں یہ آسمان والوں کی نظر میں ایسی چمکیلی دکھائی دیتی ہیں جیسے زمین والوں کے لئے ستارے مسجدیں بلند کرنے سے مراد ہے مسجدوں کا بنایا جانا، کذا قال مجاہد۔ رفع بمعنی تعمیر آیت وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ میں بھی آیا ہے (جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے، یعنی بنا رہے تھے) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جو اللہ کے (ذکر) کے لئے مسجد بنائے گا اللہ جنت کے اندر اس کے لئے گھر بنا دے گا (متفق علیہ من حدیث عثمان)

---

[1] اگر کسی چیز کا علم اس چیز کے عکس اور صورت کے ذریعہ سے ہو تو اس کو علم حصولی کہتے ہیں علم حصولی میں مبدء انکشاف نفس شئی نہیں ہوتی نہ اصل شے قوت مدرکہ کے سامنے ہوتی ہے بلکہ اس چیز کی صورت نفس مدرکہ کے سامنے آتی ہے اور اس صورت کے ذریعہ سے اصل چیز کا علم ہو جاتا ہے۔ علم حضوری میں ذات شئ قوت مدرکہ کے سامنے ہوتی ہے اور مبدء انکشاف ذات شے ہوتی ہے جیسے ہر شخص اپنے آپ کو بعلم حضوری جانتا ہے ایسا نہیں کہ اپنی ذات کی صورت ذہن میں لائے۔ پھر اس صورت کو اپنی ذات کو جاننے کا ذریعہ بنائے، یہ دونوں قسمیں ذہنی اور دماغی علم کی ہیں خواہ علم حسی جزئی ہو یا کلی عقلی، لیکن حصول علم کا ایک تیسرا ذریعہ متکلمین اور صوفیا کے نزدیک اور بھی ہے جس کو وجدان کہا جاتا ہے وجدان کا تعلق قلب سے ہوتا ہے کشف الہام اور وحی کا موقوف علیہ وجدان ہی ہے اس علم کا فیضان براہ راست قلب پر ہوتا ہے آپ اس کو ایک غیبی نوری چمک یا اشراق قدسی کہہ سکتے ہیں۔ (مترجم)۔

حسن نے کہا آیت اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس کے گھر کی تعظیم کی جائے، یعنی اس میں بیہودہ بری باتیں نہ کی جائیں، آیت اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ میں پاک رکھنے سے مراد بھی یہی ہے کہ اس میں بری باتیں نہ کی جائیں۔ بغوی نے بروایت صالح بن حبان بریدہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ صرف چار مسجدیں ہیں جن کو پیغمبروں نے بنایا تھا کعبہ کو حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل نے بنایا بیت المقدس کو حضرت داؤد حضرت سلیمان نے بنایا مسجد مدینہ اور مسجد قبا کو رسول اللہ صلعم نے بنایا مسجد قبا وہی مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔

میں کہتا ہوں یہ مسجدیں گو بڑی فضیلت رکھتی ہیں لیکن انہی کو خاص طور پر مراد قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں۔ فی بیوت کا تعلق گزشتہ عبارت سے ہے یعنی اللہ کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے اللہ کے گھروں میں مشکوٰۃ کی روشنی میرے نزدیک یہ تفسیر کمزور ہے پچھلی عبارت ختم ہو چکی اس میں اللہ نے اپنے نور کو نور مشکوٰۃ سے تشبیہ دی اور مشکوٰۃ کی کچھ صفتیں اور قیدیں ذکر کر دیں جو نور کی شدت اور قوت پر دلالت کر رہی ہیں اور اس آیت سے نور کی چمک میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا اس لئے اس کا تعلق ماقبل سے نہیں ہے یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے کہ مسجدوں کی قندیلیں زیادہ روشن اور چمکیلی ہوتی ہیں سرمایہ داروں کے مکانوں کی قندیلیں تو مساجد کی قندیلوں سے کہیں زیادہ چمکیلی اور روشن ہوتی ہیں۔

اس لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ فی بیوت کو یہدی اللہ لنورہ سے وابستہ قرار دیا جائے اکثر ہدایت الٰہیہ مسجدوں کے اندر اعتکاف کرنے والوں اور نماز ادا کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا نماز مومن کی معراج ہے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا بندہ اپنے رب سے بہت زیادہ قریب سجدہ کی حالت ہوتا ہے لہٰذا تم (سجدہ میں) دعا بہت کیا کرو رواہ مسلم وابوداؤد والنسائی عن ابی ہریرہؓ

یہ بھی ممکن ہے کہ فی بیوت کا تعلق امر محذوف سے ہو یعنی اللہ کے گھروں میں اللہ کی پاکی بیان کرو۔

وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ ۙ اور اللہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کے اندر اللہ کا نام دیا کیا جائے۔ نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔

حضرت ابن عباسؓ نے (ذکر اسم کی تفسیر کرتے ہوئے) فرمایا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کی جائے۔

يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ﴿٣٦﴾ صبح و شام ان مسجدوں میں اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں کچھ لوگ۔

اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ صبح شام کی تسبیح سے پانچوں فرض نمازیں، مسجدوں کی تعمیر انہی نمازوں کی ادائیگی کے لئے کی جاتی ہے فجر کی نماز صبح کی تسبیح ہے اور باقی چاروں نمازیں شام (یعنی پچھلے وقت) کی نمازیں۔ آصال اصل کی جمع ہے یعنی شام (یا پچھلا دن) بعض نے کہا صرف فجر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں ان اوقات کی نمازوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے فجر کا وقت سونے کا وقت ہے اور عصر کا وقت بازاروں میں کاروبار کا وقت۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس نے دونوں ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ رواہ مسلم من حدیث ابی موسیٰ اللہ نے فرمایا ہے حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سب نمازوں کی پابندی کرو (خصوصاً) درمیانی نماز (یعنی عصر) کی۔

بغوی نے لکھا ہے ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ صبح کی تسبیح سے چاشت کی نماز مراد ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص باوضو فرض نماز کے لئے چل کر جاتا ہے اس کا ثواب محرم حاجی کی طرح ہوتا ہے اور جو چاشت کی نماز کی غرض سے چل کر جاتا ہے اور صرف چاشت کی نماز کا ارادہ ہی اس کو کھڑا کرتا ہے اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور (ایک) نماز کے پیچھے (دوسری) نماز علیین میں لکھ دی جاتی ہے۔

بغوی اور طبرانی نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے جو شخص فرض نماز کے لئے پیدل چل کر گیا تو (اس کا یہ عمل) ایسا ہے جیسے ایک حج کرنا اور جو شخص نفل نماز کے لئے پیدل چل کر گیا تو یہ نماز نفل عمرہ کی طرح ہوگی۔

رِجَالٌ مرد، عورتوں سے قطع نظر کر کے خصوصیت کے ساتھ مردوں کا تذکرہ اس لئے کیا کہ عورتوں پر مسجد کے اندر جا کر نہ جمعہ لازم ہے نہ جماعت کی نماز۔ یا یہ وجہ ہے کہ عام طور پر عورتوں پر جہالت اور غفلت چھائی رہتی ہے۔

لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ان کو اللہ کی یاد سے نہ کوئی تجارت غافل بناتی ہے نہ بیع۔

تجارت کا لفظ خرید و فروخت دونوں کو شامل ہے اس لئے لفظ تجارت کے بعد لفظ بیع کی ضرورت نہ تھی لیکن خرید سے فروخت کی زیادہ اہمیت ہے خریدنے میں تو نفع کی امید ہوتی ہے اور فروخت میں فائدہ (سامنے ہوتا ہے اس لئے) یقینی ہوتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وضع لغوی کے لحاظ سے اگرچہ تجارت میں خرید و فروخت دونوں داخل ہیں لیکن اس جگہ تجارت کے مقابلہ میں بیع کا لفظ ذکر کیا گیا ہے اس لئے تجارت سے مراد ہے خرید۔ اور اشتراء کو چھوڑ کر لفظ تجارت کو اس لئے اختیار کیا کہ اشتراء (خرید) سے تجارت کا آغاز ہوتا ہے۔

بعض اہل علم نے کہا کہ تجارت سے مفید لین دین مراد ہے اور اسکے بعد بیع کا خصوصی ذکر بیع کی اہمیت دکھانے کے لئے کیا گیا ہے۔ فراء نے کہا تجارت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو باہر سے مال لانے والے ہیں اور بیع کا تعلق دست گردان بیع سے ہے۔

ذکر اللہ سے مراد ہے نماز پڑھنے کے لئے مسجدوں میں آنا۔ بغوی نے بروایت سالم حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ میں بازار میں تھا اتنے میں نماز کی اقامت ہوئی لوگ اٹھ کر دکانیں بند کر کے مسجد میں چلے گئے انہیں کے متعلق آیت لاتلهيهم تجارة ولا بيع الخ نازل ہوئی۔

یاذکر اللہ سے مراد ہے اللہ کی عمومی یاد اور مالک سے لو لگانا اس وقت ذکر اللہ کا لفظ عام ہوگا اس کے مصداق وہ لوگ بھی ہوں گے جو سب سے کنارہ کش ہو کر سارے دنیوی دھندوں کو چھوڑ کر ہر وقت طاعت الٰہی میں ڈوبے رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی مصداق قرار پائیں گے جنہوں نے دنیوی معاملات ترک نہیں کئے لیکن تجارت وغیرہ میں مشغول رہنے کے باوجود تجارت نے ان کے دل کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں بنایا وہ باہمہ بھی ہیں اور بے ہمہ بھی۔ ظاہر میں لوگوں کے ساتھ دنیوی مشاغل میں ہیں اور باطن میں اپنے خالق کے ساتھ ساری مخلوق سے بے نیاز۔

وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ اور نماز قائم کرنے سے بغوی نے لکھا ہے کہ نماز قائم کرنے سے مراد ہے مقررہ اوقات میں نماز ادا کرنا مقررہ وقت سے نماز کو مؤخر کرنے والا نماز کو قائم کرنے والا نہیں ہوتا۔

وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ اور (فرض) زکوٰۃ ادا کرنے سے نہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب ادائے زکوٰۃ کا وقت آجاتا ہے تو وہ زکوٰۃ کو روکتے نہیں (فوراً ادا کر دیتے ہیں) بعض علماء کا قول ہے زکوۃ سے تمام اچھے اعمال مراد ہیں۔

يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ ایسے دن کی (دارو گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی۔

تتقلب یعنی مضطرب ہو جائیں گے اور ہول کی وجہ سے حالت غیر ہو جائے گی۔ بعض نے تتقلب کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ کافروں کے دل اس کفر و شرک سے پلٹ جائیں گے جس پر دنیا میں قائم تھے اور ان کی آنکھوں سے پردے ہٹ جائیں گے اور وہ چیزیں ان کو دکھائی دیں گی جو کبھی نہ دیکھی ہوں گی بلکہ خیال و گمان میں نہ آئی ہوں گی رہے مومن تو پہلے وہ (جنت کی موجود نعمتوں پر) قناعت کئے ہوئے ہیں پھر ان کے دل اور آنکھیں پلٹا کھائیں گی اور وہ اپنے رب کو چودھویں کے چاند اور چوتھی ساعت کے آفتاب کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

بعض نے کہا خوف و امید کی وجہ سے مومنوں کے دل الٹ پلٹ ہوں گے ہلاکت کا خوف ہوگا اور نجات کی امید ہوگی۔ آنکھیں گردو پیش کی طرف دیکھ کر چکرائیں گی اور ہر طرف پلٹ کر دیکھیں گی کہ کس طرف سے پکڑ ہوتی ہے دائیں جانب سے یا بائیں جانب سے اور کس رخ سے اعمال نامہ ملتا ہے سیدھی طرف سے یا الٹی طرف سے یا پیچھے سے، بعض اہل علم نے کہا خوف

کی وجہ سے دل الٹ پلٹ ہوں گے اور گلے تک آکر پھنس جائیں گے۔ نہ نیچے اتر سکیں گے نہ اوپر آکر نکل سکیں گے اور حالات کی ہولناکی دیکھ کر آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ تاکہ اللہ ان کو ثواب عطا کرے اس جملہ کا تعلق یسبح یا لاتلھیھم سے ہے اور یہ کلام سابق کی غایت وغرض ہے۔ یا اس کا تعلق یخافون سے ہے اس وقت لام عاقبت ہوگا کلام سابق کی علت وغایت بیان کرنے کے لئے نہ ہوگا کیونکہ خوف غیر اختیاری چیز ہے اور علت وغایت اختیار افعال کی ہوتی ہے۔

اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا بہترین ثواب یا اچھے اعمال کا ثواب مؤخر الذکر ترجمہ پر احسن (اسم تفصیل) بمعنی حسن (صفت مشبہ) کے ہوگا۔

وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اور ہر (عمل کے ثواب کا جتنا) اس نے وعدہ کر رکھا ہے اپنی مہربانی سے اس سے زیادہ کر دے (اتنا زیادہ کر دے) کہ ان کے خیال میں بھی نہ آیا ہو۔

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ اور اللہ بے گنتی (یعنی بے نہایت) عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔـا

اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے کسی چٹیل میدان میں چمکتا میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا (آدمی دور سے) اس کو پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچا تو اس کو (اپنے گمان کے موافق) کچھ بھی نہ پایا۔

یعنی کافروں کے اعمال (قیامت کے دن) ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے کیونکہ وہ سراب کی طرح (بے حقیقت) ہوں گے۔ سراب اس سفید ریت کو کہتے ہیں جو ریگستانی میدان میں دوپہر کے وقت دھوپ میں آب رواں کی طرح دور سے نظر آتی۔

قیعہ اور قاع (مفرد) میدان اس کی جمع قیعان آتی ہے اور قویع صیغۂ تصغیر ہے بعض کے نزدیک قیعة قاع کی جمع ہے۔ کافر قیامت کے دن سخت ناکام ہوگا اس کو تشبیہ اس پیاسے سے دی جو پانی کا سخت ضرورت مند ہو اور سراب کو آب سمجھ کر نامراد ہو جائے۔

اذا جاءه یہاں تک کہ اس ریت کے پاس جس کو پانی خیال کیا تھا پہنچ جائے یا سراب کے مقام پر پہنچ جائے۔

لم یجدہ شیئا یعنی گمان کے مطابق اس کو کچھ نہ ملے۔

وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ اور اس کے پاس اللہ کی قضا کو پایا پھر اللہ نے اس کی عمر کا حساب کتاب برابر چکا دیا۔

ووجد اللہ عندہ یعنی اس نے اللہ کا عذاب اپنے پاس پایا اور اللہ نے اس کے اعمال کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا۔

ایک شبہ

وجد کا فاعل ظمان ہے (لیکن اس صورت میں مطلب خبط ہو جاتا ہے) پیاسے کا سراب کے پاس اللہ کا عذاب پانا ایک بیکار بات ہے۔ (حقیقی مراد تو یہ ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے جا کر کافر اپنی سزا پائے گا لیکن کافر کی طرف وجد کی ضمیر راجع نہیں ہے)۔

ازالہ

میرے نزدیک اس شبہ کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔

(۱) قیامت کے دن کافر سخت پیاسا ہوگا آگ بصورت آب اس کے سامنے آئے گی وہ آگ کو پانی سمجھے گا اور اس کی

طرف دوڑے گا لیکن وہاں اس کو اللہ کا عذاب بصورت آتش ملے گا اور اپنی خیالی مراد نہیں ملے گی۔

(۲) عذاب سے مراد (آخرت کا عذاب نہیں ہے بلکہ) وہ دکھ اور نامرادی مراد ہے جو سخت پیاسے کو سراب پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہے اور اس سارے دکھ کی بنیاد اس کی بداعمالیاں ہوتی ہیں اللہ نے فرمایا ہے تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی کرتوت کے بدلہ میں پہنچتی ہے اور اللہ تمہارے بہت سے جرائم سے درگزر فرماتا ہے (ورنہ پوری بداعمالیوں کی سزا تو دنیا ہی میں اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہئے) اولیٰ یہ ہے کہ حتیٰ کہ ابتدائیہ قرار دیا جائے اور اس کا تعلق اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ سے مانا جائے اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کافر جب قیامت کے دن اپنے اعمال پر پہنچے گا اور اس کا کیا کرایا سامنے آئے گا۔ تو وہاں سوائے اللہ کے عذاب کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس وقت جاءہ میں جاء کی ضمیر کافر کی طرف راجع ہوگی ظمان کی طرف راجع نہ ہوگی اور ہ ضمیر مفعول عمل کی طرف لوٹے گی سراب کی طرف نہیں لوٹے گی۔

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اور اللہ تیزی کے ساتھ حساب لینے والا ہے ایک کے حساب میں مشغولیت اس کو دوسرے کے حساب سے نہیں روکتی۔ اس دنیا کے آدھے دن کے بقدر وقت میں وہ سب بندوں کا حساب لے لے گا۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ یا (ان کے اعمال) تاریکیوں کی طرح ہیں۔

کظلمت کا عطف کسراب پر ہے اور او تخییر کے لئے ہے یعنی مخاطب کو اختیار ہے کہ ان کی بداعمالیوں کو سراب کی طرح سمجھے یا تاریکیوں کی طرح۔ ان کے اعمال قیامت کے دن موجب حسرت اور غیر مفید ثابت ہوں گے اس لئے ان کو سراب کی مانند کہا جاسکتا ہے اور حق کی روشنی سے بالکل خالی ہیں اس لئے ان کو تہ بہ تہ تاریکیاں قرار دیا جاسکتا ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ او تنویع کے لئے ہے کیونکہ کافروں کے اعمال دو نوعیتوں کے ہیں کچھ اچھے ہیں جیسے دان خیرات عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ کچھ برے ہیں اول کو سراب سے تشبیہ دی اور دوسری قسم کے اعمال کو تاریکیوں سے یا یوں کہا جائے کہ او تقسیم کے لئے ہے اور اختلاف وقت کی وجہ سے ان کے اعمال کی تشبیہ بھی مختلف طور پر ہے دنیا میں ان کے اعمال کو اندھیریوں کی مثل قرار دیا اور آخرت میں سراب کی طرح فرمایا۔

فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ (وہ تاریکیاں) جو گہرے سمندر میں ہوں۔

لجی گہرا جہاں پانی بہت ہوتا ہے یہ لفظ لج کی طرف منسوب ہے (لج کا معنی ہے کنڈ، جہاں پانی اکٹھا ہوتا ہے) بیضاوی نے لجی کا ترجمہ کیا ہے (سمندر کا وہ حصہ جہاں) پانی بہت ہوتا ہے نہایہ اور قاموس میں بھی لجی کا معنی معظم الماء بیان کیا گیا ہے بعض نے کہا لجی کا معنی ہے موجزن لہریں مارتا ہوا سمندر۔

يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ جس میں موجوں پر موجیں چڑھی ہوئی ہوں۔

موج وہ لہر جو ہواؤں کے تلاطم سے پانی پر نمودار ہوتی ہے موج پر موج چڑھنے سے مراد ہے پے در پے لہریں چڑھنا۔

مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ (اور) اس لہر پر بادل ہوں، جو ستاروں کی روشنی نیچے نہ پہنچنے دیں۔

ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ یہ تاریکیاں ایسی ہوں کہ ایک کے اوپر دوسری چھائی ہو۔

اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ اگر (ایسی تاریکیوں میں پھنس جانے والا) اپنا ہاتھ (جو اس کے بہت قریب ہے) تاریکی میں باہر نکالے تو ہاتھ بھی اس کو سوجھائی نہ دے۔

اخرج یدہ یکدیز یہ سب فاعلی ضمیریں تاریک متواج سمندر میں سفر کرنے اور پھنس جانے والے کی طرف راجع ہیں جس کا ذکر بطور دلالت کلام موجود ہے اگرچہ صراحۃً نہیں ہے حاصل مطلب یہ ہے کہ کافر کی بداعمالیوں کی تاریکیاں اس کے دل پر تہ بہ تہ چڑھی ہوئی ہیں جو اس کو ادراک حق اور ہدایت کو قبول کرنے سے روکتی ہیں قلبی انکار حق ایک تاریک موجزن سمندر ہے جس پر گناہوں کی تہ در تہ تاریکیاں سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کی طرح چھائی ہوئی ہیں پھر دل پر گمراہی کی مہر اور چھاپ اس (کالے) بادل کی طرح ہے جو سمندر کی موجوں کے اوپر چھایا ہوا ہو۔ کافر جب واضح ترین حقیقت یعنی ایمان واسلام پر

غور کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو (دل کی تہ بر تہ تاریکیوں میں) دیکھ نہیں پاتا، تمام انبیاء کا انکار کرتا ہے باوجودیکہ ان کے معجزات واضح طور پر نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور پتھروں کو جو ساری کائنات عنصری میں پست ترین درجہ رکھتے ہیں معبود قرار دیتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ اور جس کو اللہ نے روشنی عطا نہ فرمائی ہو اس کو روشنی نہیں مل سکتی۔

یعنی ہدایت خداداد چیز ہے بلکہ اہل حق کے ساتھ منطقی لوگ جو صغریٰ کبریٰ کو ترتیب دے کر نتیجہ نکالتے ہیں وہ بھی بتوفیق خداوندی اور امر وہبی ضروری نہیں کہ مقدمات کے بعد بھی نتیجہ نکل آئے (یعنی فکر و نظر اور استدلال عقلی بھی عطیۂ خداوندی ہے خود عقل بغیر اللہ کی راہنمائی کے صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی) بہت سے وہ لوگ جو دنیوی معاملات میں بڑے بھولے اور نادان پر آخرت کے معاملات میں بہت تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں اور بکثرت آدمی دنیوی امور میں روشن عقل رکھنے والے مگر آخرت کی طرف سے غافل اور دینی امور میں بے سمجھ جانوروں کی طرح ہوتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا۔ پھر اپنا کچھ نور اس پر ڈال دیا۔ پس جس پر اس کے نور کا کوئی چھینٹا پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس پر نہ پڑا وہ گمراہ ہو گیا اسی لئے میں کہتا ہوں کہ علم خداوندی پر قلم (لکھ کر) خشک ہو گیا (آئندہ تحریر میں تغیر نہ ہو گا)

بغوی نے بحوالہ مقاتل لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول عقبہ بن ربیعہ کے حق میں مواعتبہ دور جاہلیت میں دین حق کا متلاشی تھا ٹاٹ کا لباس پہن رکھا تھا (اور حق کی جستجو میں سرگرداں تھا) لیکن جب اسلام آیا تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔

اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں دیکھا یعنی کیا وحی عقلی، استدلال اور کشف کے ذریعہ سے آپ کو ایسا علم نہیں حاصل ہوا جو یقینی و پختگی میں مشاہدۂ چشم کی طرح ہو۔

اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ کہ اللہ کی (تمام عیوب و نقائص سے) پاکی بیان کرتے ہیں یعنی اس کی پاکی کی شہادت دے رہے ہیں۔

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ (فرشتے اور اللہ کی غیبی مخلوق) جو آسمانوں میں ہے

وَالْاَرْضِ اور جو زمین میں ہے یعنی انسان جن اور دوسری مخلوق کائنات سماوی و ارضی سے مراد ہے ساری مخلوق۔

من کا لفظ جو اہل عقل کے لئے خاص ہے) اس جگہ استعمال کیا گیا، صرف اس لئے کہ اہل عقل کی شہادت غالب حیثیت رکھتی ہے۔

وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ اور پرندے بھی جب کہ وہ (ہوا میں) پر پھیلائے ہوئے ہوں۔

صافات کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا کہ جو پرندے زمین پر ہیں وہ تو من فی السموت و الارض کے ذیل میں شامل ہی تھے اگر صافات کی قید ذکر نہ کی جاتی تو والطیر کا لفظ سوائے تکرار ذکر کے اور کوئی فائدہ نہ دیتا۔

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (پاکی بیان کرنے والوں میں سے) ہر ایک اپنی دعا اور پاکی بیان کرنے سے واقف ہے (یعنی تقدیس و تسبیح و دعا کا طریقہ اس کو معلوم ہے) صلوٰۃ سے مراد ہے دعا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر پاکی بیان کرنے اور دعا کرنے والے کی تسبیح و دعا کو اللہ جانتا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور آسمانوں کا اور زمین کا ملک اللہ ہی کا ہے وہی مالک ہے وہی خالق ہے آسمان و زمین اور ان کی اندرونی کائنات خواہ ذوات (جواہر) ہوں یا صفات یا افعال سب کا پیدا کرنے والا اور مالک وہی ہے۔

وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اور اللہ ہی کی جانب ہے سب کی واپسی وہی ہر ایک کو اس کے عمل کے موافق بدلہ دے گا۔ یہاں تک کہ سینگوں والی بکری سے منڈی بکری کو بدلہ دلوائے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو ہنکاتا ہے۔

تزجیہ کسی چیز کو دھکا دینا، بضاعۃ مزجاۃ (حقیر پونجی) جس کو ہر شخص پھینک دیتا ہے (یعنی نا قابل قدر سمجھتا ہے)

ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ پھر اس کو (یعنی اس کے متفرق منتشر ٹکڑوں کو یکجا کر کے) جوڑتا ہے۔

ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا پھر اس کو تہ بر تہ بنا دیتا ہے۔

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ پھر اسکے شگافوں سے (موسلادھار) بارش تم کو نکلتی دکھائی دیتی ہے۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ اور آسمان سے یعنی آسمان میں موجود پہاڑوں سے اولے اتارتا ہے ایک ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ آسمان، سے اولوں کے (بڑے بڑے تودوں کے) پہاڑ اتارتا ہے۔ اول ترجمہ پر من السماء اور من جبال میں من ابتدائیہ ہوگا اور من برد میں من بیانیہ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ نے اس آیت میں اطلاع دی ہے کہ آسمان میں اولوں کے پہاڑ ہیں دوسرے ترجمہ کی بناء پر من جبال من برد مفعول ہوگا یعنی اولوں کے بڑے بڑے تودے جو پہاڑوں کی طرح ہوتے ہیں اللہ اوپر سے اتارتا ہے۔

فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ پھر اس کو جس (کی جان و مال) پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جس سے ہٹانا چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے۔ یعنی جس کی کھیتیاں اور مال اولوں سے تباہ کرنا چاہتا ہے تباہ کر دیتا ہے اور جس سے (اولوں کے رخ کو) پھیرنا چاہتا ہے پھیر دیتا ہے اس کو ژالہ باری سے نقصان نہیں پہنچتا۔

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ (ایسا لگتا ہے کہ) عنقریب، بادل کی بجلی کی چمک نگاہوں کو (جھپک) لے جائے گی۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اللہ رات اور دن کو الٹ پلٹ کرتا ہے، یعنی دن کے بعد رات آتی ہے اور رات کے بعد دن اور دن رات کا گھٹاؤ بڑھاؤ بھی ہوتا رہتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ گرمی، سردی، روشنی اور تاریکی کے لحاظ سے رات دن میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ نے فرمایا مجھے ابن آدم دکھ پہنچاتا ہے زمانے کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ میں ہی زمانہ (کو الٹنے پلٹنے والا) ہوں میرے ہی ہاتھ میں حکم ہے میں ہی رات دن کا ادل بدل کرتا ہوں (رواہ البخاری و مسلم فی صحیحہا)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ بلاشبہ ان (مذکورہ واقعات میں) بصیرت والوں کے لئے عبرت ہے۔

عبرت سے مراد یہ ہے کہ یہ واقعات ایک خالق قدیم کی ہستی پر دلالت کرتے ہیں جس کی قدرت ہمہ گیر علم محیط کل اور مشیت نافذ ہے وہ کسی کا محتاج نہیں (بلکہ دنیا کا ہر واقعہ اسی کا مرہون قدرت و مشیت ہے۔)

الابصار سے مراد ہے بصیرت اور صحیح فہم

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ اور اللہ ہی نے پیدا کیا ہر رینگنے پھرنے والے جانور کو پانی سے۔

پانی سے مراد ہے وہ پانی جو ہر جانور کے خمیری مادے میں داخل ہے یا نطفہ مراد ہے اس صورت میں کل جانور مراد نہ ہوں گے، کیونکہ بعض جانور بغیر نطفہ کے پیدا ہوں گے لیکن اکثریت انہی جانداروں کی ہے جن کی تخلیق نطفہ سے ہوتی ہے اس لئے بطور تغلیب لفظ کل استعمال کیا۔ ملائکہ اور جن دابہ میں شامل نہیں ہیں۔ بعض اہل علم نے کہا من ماء کا تعلق خلق سے نہیں ہے بلکہ یہ دابہ کی صفت ہے یعنی جو جانور نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں اللہ ہی ان کا خالق ہے۔

بعض علماء نے کہا تمام (عنصری) مخلوق کی اصل پانی ہی ہے۔[1] بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے اول پانی کو پیدا کیا، پھر اس

[1] ارسطو اور اس کے پیرو کہتے ہیں کہ ہر جانور کی تخلیق کے اصل ارکان و عناصر چار ہیں پانی ہوا مٹی آگ؟ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے کچھ حصہ کو ہوا بنادیا جس سے فرشتے بنے اور کچھ حصہ کو آگ میں تبدیل کر دیا جس سے جنات کی تخلیق ہوئی اور کچھ حصہ کو مٹی بنادیا گیا جس سے حضرت آدمؑ کی ساخت ہوئی اور مٹی سے ہی تمام جانور بنائے گئے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ سو کچھ جانور تو وہ ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں، جیسے سانپ گنڈار وغیرہ۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ اور کچھ دو ٹانگوں سے چلتے ہیں جیسے انسان اور پرندے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ اور کچھ وہ ہیں جو چار ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے چرندے، درندے، چار سے زیادہ پاؤں سے چلنے والے جانوروں کی بھی کچھ قسمیں ہیں جیسے مکڑی کیکڑا وغیرہ ان کا تذکرہ آیت میں اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کی رفتار کی صورت بھی وہی ہوتی ہے جو چوپایوں کی رفتار کی ہوتی ہے (یعنی چلنے میں ان کی گردن اور منہ اوپر کو اٹھا ہوا نہیں ہوتا)

يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

یعنی بسائط ہوں یا مرکبات[1] اللہ نے مختلف شکلوں، مزاجوں، طبیعتوں، ہیئتوں کے بنائے ہیں مادہ سب کا ایک ہے لیکن اللہ کی مشیت و مصلحت کے زیر اثر طبیعت، صورت، مزاج اور افعال و حرکات کا تخلیقی اختلاف ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ بلاشک اللہ کے قابو میں سب کچھ ہے اس لئے جو کچھ وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ بیشک ہم (حق کو) واضح کر دینے والی آیات (قرآن میں) اتار چکے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس عالم وجود میں جو وجود حقیقی کے سایہ اور پرتو کی طرح ہے ایسی دلائل کھول کر ہم نے ظاہر کر دی ہیں جو خالق علیم و حکیم کی ہستی کی شہادت دے رہی ہیں اور حق کو واضح کر رہی ہیں۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾ اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستہ پر چلاتا ہے یعنی اسلام کے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور یہی راستہ اس کو دوزخ سے بچا کر جنت اور مقام قرب تک پہنچا دیتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایمان ایک خداداد وہبی چیز ہے بغیر اللہ کی توفیق اور ہدایت کے محض غور و فکر کرنے اور عقلی گھوڑے دوڑانے سے حاصل نہیں ہوتی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان کسی زمین کے متعلق جھگڑا تھا، یہودی چاہتا تھا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے کرائے (کیونکہ اس کو یقین تھا کہ محمد ظلم اور حق تلفی نہیں کریں گے) منافق نے کہا اس کا تصفیہ کعب بن اشرف یہودی سے کراؤ محمد ہماری حق تلفی کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

اور وہ کہتے ہیں ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے اور (دونوں کے) فرماں بردار ہو گئے پھر اس (قول) کے بعد ان میں کا ایک فریق (قبول حق سے جب کہ اس کے خلاف فیصلہ ہو جائے) پھر جاتا ہے۔

---

[1] حکماء یونان کی اصطلاح میں بسیط اس جسم کو کہتے ہیں جس کے ہر جز کا نام اور حقیقت وہی ہو جو دوسرے اجزاء اور اجزاء کے مجموعہ کی ہے جیسے پانی کا ہر قطرہ پانی ہی ہے نہ نام بدلتا ہے نہ حقیقت الگ ہے۔ مرکب وہ جسم ہے جس کے اجزاء کی طبیعتیں الگ الگ ہوں اور ہر جز کا نام بھی جدا ہو جیسے انسان اور دوسرے حیوان آگ پانی مٹی ہوا کا خمیر رکھتے ہیں۔ یہی ان کے اجزاء ہیں اور ہر جز کی حقیقت و ماہیت جدا ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ[1]) (ارسطو اور شیخ ابن سیناء نے انہی کو اسطقسات بھی کہا ہے بعض یونانیوں کا خیال ہے کہ اجزاء تخلیقی دو ہیں۔ بعض نے کہا صرف گیس ہر تخلیق کی بنیاد ہے، پانی مٹی وغیرہ اسی کے روپ ہیں۔
لیکن بعض علمائے اسلام قائل ہیں کہ سنگ بنیاد پانی ہے، پانی جم کر پتھر بنا۔ پانی تحلیل و تبخیر کے ذریعہ ہوا بن گیا۔ پھر ہوا آگ ہو گئی۔ سب حیوانوں کا اصل خمیر پانی ہی ہے اور پانی ہی بنیاد ہے۔

یقولون یعنی بشر اور اس جیسے دوسرے منافق کہتے ہیں۔
فریق یعنی وہ فریق جو حق پر نہ تھا۔
وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ اور یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔
اولئک سے تمام منافقوں کی طرف اشارہ ہے اس جملہ میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ منافق اگرچہ زبانوں سے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کے دل مومن نہیں ہیں۔
یا اولئک سے اسی گروہ کی طرف اشارہ ہے جو فیصلہ سے سرتابی کرتا تھا۔
المومنین کے الف لام (عہدی) سے ان مومنوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کی سچائی اور خلوص سے اللہ واقف تھا اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کو مخلص صادق مومن جانتے تھے مطلب یہ ہے کہ یہ منافق سچے پرخلوص مومن نہیں ہیں۔
ابن ابی حاتم نے حسن (بصری) کی مرسل روایت بیان کی ہے کہ بعض (منافق) لوگوں کا اگر کسی سے کچھ نزاع ہوتا تھا اور اس کو رسول اللہ ﷺ سے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ اگر حق پر ہوتا اور اس کو بجائے خود یہ یقین ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ بہر حال حق فیصلہ کریں گے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جانے اور مقدمہ پیش کرنے پر راضی ہو جاتا تھا لیکن اگر وہ حق پر نہ ہوتا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس معاملہ لے جانے کی اس کو دعوت دی جاتی تو کتراجاتا اور کہتا رسول اللہ ﷺ کے پاس نہیں) فلاں شخص سے چل کر فیصلہ کراؤ۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔
وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اور جب ان کو اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف بلایا جاتا ہے۔
بعض علمائے تفسیر نے اس طرح ترجمہ کیا ہے جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف بلایا جاتا ہے۔ اس صورت میں و رسولہ کا عطف اللہ پر عطف تفسیری ہو گا جیسے محاورہ میں بولا جاتا ہے۔ اعجبنی وکرمہ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ تاکہ اللہ کے رسول (حکم خدا کے مطابق) ان کے درمیان فیصلہ کردیں۔
اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ تو ان میں کا ایک فریق (جو ناحق پر ہوتا ہے رسول خدا کی طرف آنے سے) کتراتا ہے۔
وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ اور ان کا (واقعی) حق ہوتا ہے تو رسول ﷺ کی طرف (دوڑے ہوئے) آتے ہیں۔
مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ حکم کے مطیع ہو کر کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گا۔
اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کیا ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے یعنی کفر اور حق تلفی کی طرف میلان قلبی ہے۔
اَمِ ارْتَابُوْٓا یا شک میں پڑگئے ہیں یعنی آپ کی طرف سے کوئی بات شک آفریں انہوں نے دیکھ لی ہے جس کی وجہ سے آپ پر ان کا یقین جاتا رہا ہے۔ اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ط
یا ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کی حق تلفی کرے گا۔ (اور غلط فیصلہ کرے گا)
بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ بلکہ (مؤخر الذکر دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں۔ کھوٹ انہی کے دلوں کے اندر ہے) وہی ظالم ہیں۔ اپنی جانوں پر بھی ظلم کرتے ہیں کہ دل سے ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کو نہیں مانتے اور دوسرے لوگوں پر بھی ظلم کرتے ہیں کہ بغیر استحقاق کے لوگوں کا مال ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے رسول کے فیصلہ سے باز رہنے کی تین وجوہ آیت مذکورہ میں بیان کیں پھر آخری دونوں وجہوں کی نفی کر کے اول وجہ کو ثابت کر دیا۔ لفظ بل میں آخری دونوں شقوں سے اعراض اور اول شق کا اثبات ہے۔ بات یہ ہے کہ منافقوں کا رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کرانے پر راضی نہ ہونا تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی بناء پر ہو سکتا تھا۔ (۱) یا تو کوئی خرابی خود انہی کے اندر ہو (۲) یا حکم میں کوئی نقص ہو (۳) حاکم کے اندر عیب ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یقینی نقص۔ اور دوسرا اندیشہ حق تلفی۔ پیغمبر کی

عظمت، نبوت اور عدل و امانت کا تقاضا یہ ہے کہ نہ آپ کی ذات قابل شک اور نہ فیصلہ محل تہمت اس لئے دونوں آخری شقوں کی نفی یقینی ہے اور صرف اول ہی شق کا ثبوت محقق ہے آخری دونوں صورتوں کی نفی کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب ان کا حق واقعی ہوتا ہے تو (انصاف ملنے کا یقین رکھتے ہوئے) اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے ہیں قرآن کا اسلوب بیان اور طریقۂ تعبیر یہ ہے کہ منافقوں اور کافروں کے پہلو بہ پہلو مخلص مومنوں کے حالات کا بھی اظہار کرتا ہے اسی لئے اگلی آیت میں مخلص مومنوں کا ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ مسلمانوں کا قول اس وقت جب ان کو (کسی معاملہ میں) اللہ اور اسکے رسول کی طرف فیصلہ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ بس یہ ہوتا ہے کہ وہ (خوشی خوشی) کہہ دیتے ہیں ہم نے سن لیا اور اس کو (تہ دل سے) مان لیا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔

المومنین سے مراد مخلص مومن ہیں اولئک یعنی جو لوگ ان اوصاف کے حامل ہیں وہ سب۔ ھم المفلحون وہی بامراد ہوں گے ان کے علاوہ دوسرے فلاح یاب نہ ہوں گے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا حضرت ابن عباس نے فرمایا خواہ اس فرماں برداری میں اس کو دکھ پہنچے یا خوشی حاصل ہو۔

وَيَخْشَ اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرتا ہے گا یعنی اپنے کئے ہوئے گناہوں کی پکڑ کا اور اللہ کے حکم کے خلاف کرنے کا اس کو ڈر لگا رہے گا۔

وَيَتَّقْهِ اور اللہ (کے عذاب) سے خوف رکھے گا۔ یعنی اللہ کے احکام و حدود کی پابندی کرے گا تعمیل اوامر کرے گا اور ممنوعات سے بچتا رہے گا۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ سو ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے دوامی سکھ اور اللہ کی خوشنودی ان کو ملے گی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر آپ ہم کو (جہاد کے لئے یا گھر بار اور مال متاع چھوڑ کر) نکلنے کا حکم دیں گے تو ہم ضرور ضرور نکل کھڑے ہوں گے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ منافق، رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ آپ جہاں ہوں گے ہم آپ کے ساتھ ہوں گے اگر آپ (غزوات یا جہاد کے لئے) نکلیں گے تو ہم آپ کے ساتھ نکلیں گے، اگر آپ (کہیں) قیام کریں گے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ٹھہر جائیں گے (آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے) اگر آپ ہم کو جہاد کا حکم دیں گے تو ہم جہاد کریں گے۔

قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ (جھوٹی) قسمیں نہ کھاؤ تمہاری فرماں برداری (کی حقیقت) معلوم ہے۔

مجاہد نے کہا طاعت معروفہ سے مراد ہے کہ تمہاری اطاعت محض زبانی ہے دلی اعتقاد کے ساتھ نہیں ہے تمہاری اس طاعت کی حقیقت معلوم ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور ایسی بات کہتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے۔ بعض اہل تفسیر نے طاعۃ معروفۃ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کھلی ہوئی خالص اطاعت زبانی خلاف ورزی سے بہتر اور افضل ہے۔

مقاتل نے یہ تاویل کی کہ تمہاری طرف سے اچھی طاعت ہونی چاہئے (یعنی فصل محذوف ہے) بعض نے کہا آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ تم سے اطاعت کرنے کی قسمیں مطلوب نہیں بلکہ طاعت معروفہ مطلوب ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے

تمہاری چھپی ہوئی باتیں بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

قُلْ آپ کہہ دیجئے خطاب کی تکرار مفید تاکید ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ اب اگر تم روگردانی کرو گے تو رسول پر وہ (فرض) لازم ہے جس کا بار اس پر ڈالا گیا ہے (یعنی تبلیغ احکام) اور تم پر وہ (فرض) لازم ہے جس کا بار تم پر ڈالا گیا ہے یعنی تعمیل حکم۔

فانما شرط محذوف کی جزا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ اگر تم نہ مانو گے اور روگردانی کرو گے تو خود نقصان اٹھاؤ گے۔ رسول کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ رسول کے ذمے جو فرض عائد کیا گیا ہے اس کو تو انہوں نے ادا کر دیا اور تم پر جو فریضہ لازم کیا گیا ہے تم نے اس کو ادا نہیں کیا اس لئے نقصان تمہارا ہی ہوگا۔

وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ اور اگر تم رسول کے حکم پر چلو گے تو ہدایت پاؤ گے حق کا راستہ تم کو مل جائے گا اور جنت تک پہنچ جاؤ گے۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۵۴﴾ اور رسول کے ذمہ صرف (ان احکام کو) واضح طور پر کھول کر پہنچا دینا ہے جن کا تم کو مکلّف کیا گیا ہے۔

البلاغ (مصدر متعدی) پہنچانا۔ المبین واضح کر دینے والا یعنی احکام تکلیفیہ کو کھول کر بیان کرنے والا۔

طبرانی اور حاکم نے حضرت ابی بن کعب کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام (یعنی مہاجرین) مدینہ میں تشریف لے آئے اور انصار نے ان کو ٹھہرنے کا ٹھکانہ دے دیا تو سارا عرب ان کا دشمن ہو گیا (ہر طرف سے ان کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا) بغیر اسلحہ کے نہ ان کی رات گزرتی تھی نہ صبح ہوتی تھی ان کو ہوک اٹھتی تھی کہ کاش (کبھی) ایسی زندگی بھی ہم کو میسر ہو جائے کہ امن و چین کے ساتھ ہماری راتیں گزریں اور سوائے اللہ کے ہم کو کسی کا خوف نہ ہو اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اللہ نے (ان کے متعلق) وعدہ کر لیا ہے کہ زمین پر ان کو خلیفہ (جانشین یعنی حاکم اور بادشاہ) ضرور بنائے گا۔

مومنوں سے مراد ہیں وہ مدینہ والے مومن جو نزول آیت کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے عام مومن مراد نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے پختہ وعدہ کر لیا ہے کہ ان نیکوکار مومنوں میں سے بعض کو عرب و عجم کی زمین کا مالک بنائے گا اور ان کو واجب الطاعت بادشاہ اور حاکم ضرور کر دے گا۔

یا یہ مطلب ہے کہ ان سب کو زمین پر ایسا تصرف عنایت کرے گا جیسا بادشاہوں کو اپنے غلاموں پر ہوتا ہے۔

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ جیسے ان سے پہلے (نیکوکار ایمان دار) لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا تھا (مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمان وغیرہ)

قتادہ نے آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے بنی اسرائیل کو جیسے اللہ نے خلافت عطا کی۔ مصر اور شام میں بڑے بڑے بادشاہوں اور ان کو فتح عنایت کی اور ان کے ملک و مال کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا اور موسیٰ سے اللہ نے توریت میں ملک شام کی فتح کا وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا لیکن حضرت موسیٰ کی زندگی میں وہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ بلکہ چالیس سال تک بنی اسرائیل اپنی سرتابی اور نافرمانی کی وجہ سے معتوب رہے) اللہ نے فرمایا ہے اِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ بلکہ حضرت یوشع بن نون کے ہاتھوں اس فتح کی تکمیل ہوئی اور حضرت موسیٰ کی وصیت کے موافق

حضرت یوشع نے ہی بنی اسرائیل کو ملک تقسیم کیا۔ اسی طرح اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے بھی وعدہ فرمایا کہ دین اسلام کو ہر مذہب پر غلبہ عنایت فرمائے گا اور ملک شام کی حکومت عطا فرمائے گا۔ آیت غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ کی قرأت مشہورہ تو وہی ہے جو قرآن میں پڑھی جاتی ہے لیکن ایک اور قرأت میں غلبت الروم اور سیغلبون آیا ہے اس قرأت کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ قریب زمین پر رومی غالب آگئے اور فارس میں غالب آنے کے بعد چند سال ہی میں یہ مغلوب ہو جائیں گے اور مسلمان ان پر غالب آجائیں گے۔ یہ فتح رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں تو حاصل نہیں ہوئی (جیسے حضرت موسیٰ کی زندگی میں بنی اسرائیل کو شام کی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی) لیکن حضور گرامی ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے بنی حنیفہ (یعنی مسیلمہ کے لشکر) سے اور عرب مرتدوں سے جہاد کیا اور غلبۂ روم سے نو سال بعد حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اللہ نے فتح شام مرحمت فرمائی۔ حدیبیہ کے سال ۶ھ میں رومی غالب آئے تھے اس کے نو سال بعد مسلمانوں نے ملک شام ان سے چھین لیا اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے عراق پر لشکر کشی کرنے کا مشورہ کیا حضرت علیؓ نے اسی آیت کو ثبوت میں پیش کرتے ہوئے جہاد کا مشورہ دیا۔ حضرت علیؓ کا یہ مشورہ اہل سنت کی متعدد کتابوں میں منقول ہے اور شیعی کتب میں سے نہج البلاغۃ میں بھی حضرت علی کا اسی آیت سے یہ استنباط مذکور ہے بروایت نہج البلاغۃ حضرت علیؓ نے فرمایا اس کام (دین) کی کامیابی یا ناکامی تعداد کی قلت و کثرت پر موقوف نہیں ہے یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے غالب بنایا ہے اور (یہ) اللہ کا لشکر ہے جس کو اس نے غلبہ عنایت کیا ہے اور مدد فرمائی ہے یہاں تک کہ جہاں سے نکلا نکلا اور جہاں پہنچا پہنچا۔ اللہ نے خود فرمادیا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ الخ پس اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور اپنے لشکر کو ضرور فتح یاب بنائے گا۔

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ اور جس دین کو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ضرور ضرور جما و عطا کرے گا۔ حضرت ابن عباس نے اس کی تشریح میں فرمایا ان کو ملکی وسعت عطا کرے گا۔ دوسرے ممالک پر ان کا قبضہ ہو جائے گا اور اپنے دین کو تمام مذاہب پر غالب کرے گا۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ اور خوف کے بعد بجائے خوف کے ان کو امن عنایت کرے گا۔

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۭ وہ میری عبادت کریں گے کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

یعبد وننی امنوا کی ضمیر سے حال ہے کیونکہ اللہ کا وعدہ استخلاف توحید پر قائم رہنے کے ساتھ مشروط ہے یا علیحدہ جملہ ہے جس میں استحقاق خلافت کی علت بیان کی گئی ہے۔

ابو العالیہ نے کہا اللہ نے اپنے نبی کو جزیرۃ العرب پر اقتدار عطا فرمادیا۔ سب عربوں نے ہتھیار رکھ دیئے اور مسلمان ہو گئے۔ وفات رسول اللہ ﷺ تک مسلمان اسی چین سے رہے پھر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے دور میں بھی امن و چین کی یہی حالت قائم رہی اور حضرت عثمانؓ کا دور خلافت بھی اسی طرح گزر گیا آخر جس (خانہ جنگی کی مصیبت) میں پھنسنا تھا پھنس گئے اور اللہ کی نعمت کے شکر گزار نہ رہے۔

ابو العالیہ کا بیان ہے کہ نزول وحی کے بعد رسول اللہ ﷺ مکہ میں صحابہ کے ساتھ رہے صحابہ کو حکم تھا کہ کافروں کی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں پر صبر رکھیں۔ پھر مدینے کو ہجرت کر جانے کا حکم ہو گیا اور لڑنے کا بھی حکم مل گیا لیکن (ہر طرف سے خوف کی یہ حالت تھی کہ) کوئی ہتھیار اپنے بدن سے الگ نہ کرتا تھا آخر ایک شخص نے کہا کیا ہمارے لئے کوئی دن بھی ایسا نہ آئے گا کہ ہم امن سے رہیں اور ہتھیار کھول دیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ حضرت براء نے فرمایا یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی تھی ہم سخت خوف کی حالت میں تھے

پھر اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور خوف کی بجائے امن عطا کیا اور زمین پر ان کو پھیلا دیا (یعنی ملکی فتوحات عطا فرما دیں)۔
اس آیت میں آئندہ واقعہ کے متعلق پیش گوئی ہے (جو صحیح ثابت ہوئی) اس لئے یہ صداقت نبوت کی دلیل ہے۔ اور خلفائے راشدین کی خلافت کی حجت پر بھی یہ آیت دلالت کر رہی ہے اگر خلفائے راشدین کی خلافت مراد نہ ہو تو وعدۂ الٰہی میں کذب لازم آئے گا کیونکہ سوائے خلافت راشدہ کے زمانہ کے موعود (فتوحات ملکیہ) اور موعود لہم (مومنین صالحین) یکجا جمع نہ ہوئے اس سے اہلسنت کے مسلک کی صداقت واضح ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے اور رافضیوں کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ آئمہ آج تک خوف کی حالت میں رہے ہیں یہاں تک کہ دشمنوں کے خوف سے امام مہدی بھی پوشیدہ ہیں۔
لفظ منکم (میں خطاب صحابہ کو ہے اس لئے اس لفظ) سے یہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ امام مہدی کے ظہور کے بعد اللہ اپنا وعدہ پورا کرے گا (ابھی تک اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا) دین کا ظہور کب اور کیسے ہوگا جب کہ کچھ اوپر گیارہ سو برس تک نہیں ہوا ایسا خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔
رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت سفینہ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ میرے بعد خلافت تیس سال ہے پھر ملوکیت ہو جائے گی۔ حضرت سفینہ نے کہا دو سال حضرت ابو بکرؓ خلافت کو تھامے رہے۔ پھر حضرت عمرؓ کی خلافت دس سال رہی پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت بارہ سال رہی پھر حضرت علیؓ چھ سال خلیفہ رہے۔
حضرت عدی بن حاتم نے فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور اس نے فاقہ کی شکایت کی اور دوسرے آدمی نے آکر راستہ لوٹا جانے کا شکوہ کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عدی کیا تم نے حیرہ دیکھا ہے، میں نے عرض کیا میں نے خود نہیں دیکھا البتہ اس کے متعلق سنا ضرور ہے فرمایا اگر تمہاری عمر (کچھ) لمبی ہوئی تو دیکھ لوگے کہ (تنہا) عورت حیرہ سے سفر کرتی ہوئی آئے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو سوائے خدا کے کسی سے خوف نہ ہوگا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اس وقت بنی طے کے غارت گر کہاں ہوں گے جنہوں نے ملک میں آگ لگا دی ہے۔ (حضورؐ نے فرمایا) اگر تیری عمر (کچھ) دراز ہوئی تو کسریٰ کے خزانے تم لوگ فتح کر لوگے۔ میں نے کہا کیا کسریٰ بن ہرمز کے فرمایا کسری بن ہرمز کے (پھر فرمایا) اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو دیکھ لوگے کہ آدمی مٹھی بھر بھر چاندی یا سونا قبول کرنے والے کی تلاش میں لئے پھرے گا (اور کوئی لینے والا نہ ملے گا) اور جس روز آدمی اپنے رب کے سامنے جائے گا اور بندے کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا کہ اللہ کا مطلب بندے کو سمجھائے (بلکہ اللہ براہ راست بندہ سے خطاب کرے گا) اور فرمائے گا کیا اپنے احکام پہنچانے کے لئے میں نے تیرے پاس اپنا رسول نہیں بھیجا تھا۔ بندہ کہے گا کیوں نہیں (یقیناً بھیجا تھا) اللہ فرمائے گا کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا اور تجھ پر اپنی مہربانی نہیں کی تھی بندہ عرض کرے گا کیوں نہیں (یہ سب کچھ ہوا تھا) اس وقت آدمی اپنی دائیں جانب دیکھے گا تو جہنم کے سوا اس کو کچھ نہیں دکھائی دے گا اور بائیں طرف دیکھے گا تب بھی جہنم ہی دکھائی دے گا (غرض جہنم میں پھینک دیا جائے گا) حضور ﷺ اقدس نے فرمایا دوزخ سے بچو، خواہ چھوارے کا ایک ٹکڑا ہی خیرات کر کے (یعنی چھوارے کا ایک ٹکڑا غریب کو دینا دوزخ سے بچنے کا سبب بن جائے گا) اگر چھوارے کا ایک ٹکڑا بھی میسر نہ ہو تو (سائل سے) میٹھی بات کہہ کر ہی (دوزخ سے اپنی حفاظت کرو) حضرت عدی نے (اپنے شاگرد سے) فرمایا میں نے تو یہ دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے کعبہ کا طواف کرنے کے لئے چلتی یہاں تک کہ طواف کر لیتی ہے اور (راستہ میں اس کو کسی لٹیرے بد معاش کا اندیشہ نہیں ہوتا) اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہوتا اور کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کرنے میں تو میں خود شریک تھا۔ آئندہ اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو بھی صحیح پالو گے کہ مٹھی بھر (سونا چاندی) آدمی لے کر قبول کرنے والے کی تلاش میں نکلے گا اور قبول کرنے والا اس کو نہیں ملے گا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ اور اس کے بعد جو لوگ کفر کریں گے یعنی مومنوں کے صاحب اقتدار اور خلیفۂ ارض

ہونے اور اللہ کے پسندیدہ دین کے استحکام و تائید کے بعد جو لوگ مرتد ہو جائیں گے یا اللہ کی نعمت کی ناشکری کریں گے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ سو یہی لوگ (ایمان یا دائرہ اطاعت سے) خارج ہوں گے۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ سب سے پہلے خداداد نعمت کی ناشکری کرنے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ کو انہوں نے شہید کر دیا تو اللہ نے وہ نعمت بھی بدل ڈالی جو ان کو عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ خوف ان پر طاری ہو گیا اور (دینی) بھائی بھائی ہونے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگا۔

بغوی نے حمید بن ہلال کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے حضرت عثمانؓ کی بابت فرمایا جب سے رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اس وقت سے آج تک (اللہ کے حفاظتی) فرشتے تمہارے اس شہر کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں اب اگر تم عثمانؓ کو قتل کر دو گے تو خدا کی قسم فرشتے چلے جائیں گے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ جو شخص عثمان کو شہید کرے گا خدا کی قسم جب وہ اللہ کے سامنے جائے گا تو کوڑھی ہو کر جائے گا اللہ کی تلوار نیام کے اندر ہے اگر اللہ نے نیام سے اس کو نکال دیا تو خدا کی قسم پھر تم سے (ہٹا کر) وہ (کبھی یا روز قیامت تک) نیام میں داخل نہیں کرے گا کیونکہ جب بھی کوئی نبی شہید کیا گیا (اس کے انتقام میں) ستر ہزار آدمی مارے گئے اور جب بھی کوئی خلیفہ شہید کیا گیا (اس کے بدلہ میں) پینتیس ہزار آدمی قتل کیے گئے۔

میں کہتا ہوں اللہ نے جو مسلمانوں کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا اور خلافت عطا فرمائی رافضیوں اور خارجیوں کے مختلف گروہوں نے اس کی ناشکری کی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ میں یزید بن معاویہ کی طرف اشارہ ہو یزید نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے کو اور آپ کے ساتھیوں کو شہید کیا یہ ساتھی خاندان نبوت کے ارکان تھے عزت رسول کی بے عزتی کی اور اس پر فخر کیا اور کہنے لگا آج بدر کے دن کا انتقام ہو گیا اسی نے مدینۃ الرسول پر لشکر کشی اور حرہ کے واقعہ میں مدینہ کو غارت کیا اور وہ مسجد میں جس کی بناء تقویٰ پر قائم کی گئی تھی اور جس کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ کہا گیا ہے اس کی بے حرمتی کی اسی نے بیت اللہ پر سنگباری کے لئے منجنیقیں نصب کرائیں اور اسی نے اول خلیفہ رسول اللہ یعنی حضرت ابوبکرؓ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کرایا اور ایسی ایسی نازیبا حرکتیں کیں کہ آخر اللہ کے دین کا منکر ہو گیا اور اللہ کی حرام کی ہوئی) شراب کو حلال کر دیا۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رسول ﷺ کی (ان تمام امور میں) اطاعت کرو (جن کا وہ تم کو حکم دیں) تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اطاعت رسول کے حکم کی تکرار مفید تاکید ہے اور اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ رحمت خداوندی اطاعت رسول کے ساتھ وابستہ ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ یہ مت خیال کرنا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ زمین پر (اللہ کو ان کی گرفت یا ان کو ہلاک کرنے سے) عاجز کر دیں گے۔

وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۖ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۵۷﴾ اور کوئی شک نہیں کہ دوزخ برا ٹھکانہ ہے۔

ع ۱۲

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت مرثد کا ایک غلام تھا جو اکثر حضرت اسماء کے پاس ایسے وقت میں (بلا اجازت) آجاتا تھا کہ اس وقت غلام کا آنا حضرت اسماء کو ناگوار گزرتا تھا حضرت اسماء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے خادم اور غلام ایسے وقت ہمارے پاس آجاتے ہیں کہ اس وقت ان کا آنا ہم کو ناگوار ہوتا ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ
اے اہل ایمان تمہارے مملوک (یعنی باندی غلام) اور تمہارے وہ لڑکے بالے جو جوانی کو نہیں پہنچے تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس داخل ہوا کریں۔

اس آیت میں احکام سابقہ کی تکمیل کی طرف پھر بیان کو لوٹایا گیا ہے کم (اگرچہ ضمیر خطاب مذکر ہے لیکن اس) سے مراد مرد و عورت دونوں ہیں تغلیباً مذکر کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری غلام کو دوپہر کے وقت حضرت عمر کو بلانے کے لئے بھیجا غلام حضرت عمر کے پاس (گھر کے اندر) پہنچا تو ایسی حالت میں دیکھا کہ حضرت عمر کو اس حالت میں دیکھا جانا ناگوار گزرا، اس پر آیت وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ نازل ہوئی۔

جوانی کو نہ پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ جوانی کے قریب بھی نہ پہنچے ہوں (مراہق بھی نہ ہوں) جو لڑکے بالغ ہونے کے قریب پہنچ گئے ہوں وہ بالغ کے حکم میں ہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ جب تم نے عورتوں کو طلاق دیدی ہو اور وہ اپنی مقررہ مدت (یعنی خاتمہ عدت) کے قریب پہنچ گئی ہوں۔ پھر ان لڑکوں سے مراد آزاد لڑکے ہیں (غلاموں کا ذکر اوپر کے جملہ میں کر دیا گیا ہے)۔

ثلث مرت تین بار یعنی تین اوقات میں

مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ فجر کی نماز سے پہلے کیونکہ یہ وقت سو کر اٹھنے کا ہوتا ہے جبکہ آدمی لباس خواب اتار دیتا ہے اور بیداری کے کپڑے پہن لیتا ہے۔

وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ اور دوپہر کے وقت (قیلولہ کرنے کے لئے بیداری کے) کپڑے تم اتار لیتے ہو۔

وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۛ اور عشاء کی نماز کے بعد کیونکہ یہ وقت لباس اتار دینے اور چادر وغیرہ اوڑھنے کا ہوتا ہے۔

ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ یہ تین اوقات تمہارے پردے کے اوقات ہیں۔

بعض اہل علم نے کہا اصل کلام میں مضاف محذوف ہے مطلب یہ ہے کہ پردہ کے اعضاء کھلنے کے یہ تین اوقات ہیں۔ عورت وہ حصۂ بدن ہے جس کا کھلنا برا ہے۔ بیضاوی نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے۔ یہ تین اوقات ہیں جن میں (تمہارے) پردہ پوش ہونے کا خیال کیا جاسکتا ہے عورت کا اصل معنی ہے شگاف (رخنہ خرابی) بعض نے کہا عورت عار سے بنایا گیا ہے انسان کے جن حصوں کا کھلا رہنا برا سمجھا جاتا ہے وہ عورت ہیں۔ اسی مناسبت سے عورتوں کو عورت کہا جاتا ہے (کہ ان کا بے پردہ ہونا مذموم ہے باعث عار ہے) بری بات کو اور کپڑے کے شگاف کو اور مکان کی دیواروں کے شکستہ ہونے کو بھی عورت کہتے ہیں ایک آیت میں آیا ہے اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ہمارے مکان شکستہ ہیں۔

مذکورہ اوقات کو بھی عورت کہنے کی یہی وجہ ہے کہ ان اوقات میں ننگا کھلا دیکھا جانا آدمی کے لئے برا اور باعث عار ہوتا ہے۔

قاموس میں ہے عورت کا معنی ہے سرحد وغیرہ کے نظم کا اختلال ہر قابل ستر چیز، انسان کے اعضاء کریہہ (جو قابل ستر ہیں) وہ وقت جس میں ان اعضاء کو برہنہ کیا جاتا ہے ایسے وقت تین ہیں فجر سے پہلے دوپہر، عشاء، کے بعد ہر ایسی بات جس (کے ذکر) سے حیا کی جائے۔ پہاڑوں کے درّے وغیرہ کو عورت کہا جاتا ہے۔

مسئلہ:۔ آیت مذکورہ کا اقتضاء ہے کہ مذکورہ تینوں اوقات میں غلام کا اپنے آقا کے پاس بلا اجازت (تنہائی میں) جا پہنچنا ممنوع ہے خواہ غلام چھوٹی عمر کا ہی ہو لیکن ہو باشعور۔ اور باندی (اوقات مذکورہ میں بلا اجازت) اپنی مالکہ کے پاس نہیں جاسکتی

ہاں باندی اپنے آقا اور مالک کے پاس ہر وقت بلا اجازت داخل ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو بیوی کی طرح ہے (جو ننگے کھلے سے واقف ہوتی ہے) بالغ یا قریب البلوغ غلام اپنی مالکہ کے پاس کسی وقت داخل نہیں ہو سکتا (شرعاً مالکہ کو اس سے پردہ کرنا چاہئے) اللہ نے فرمایا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ الخ اس آیت میں جن مملوک لوگوں کا استثناء کیا گیا ہے ان سے مراد باندیاں ہیں غلام نہیں ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے یہ مضمون بیان کر دیا ہے۔

جو لڑکا باشعور ہے وہ بغیر اجازت لئے ہر سہ اوقات مذکورہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور ان تین اوقات کے علاوہ ہر وقت بغیر اجازت حاصل کئے داخل ہو سکتا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ ان تین اوقات کے علاوہ (اور کسی وقت بغیر اجازت کے ان غلاموں باندیوں اور خدمتی لڑکوں کے داخل ہونے میں) نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر۔

طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ وہ (یعنی خدمتی لڑکے اور غلام، تمہارے ارد گرد گھومتے ہی رہتے ہیں۔ آتے ہیں جاتے ہیں (ہر بار اجازت لینے میں بڑی دشواری ہے اس لئے اوقات ممنوعہ کے علاوہ وہ بلا اجازت آسکتے ہیں)

بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ تم میں سے بعض بعض کے پاس گھومتے ہی رہتے ہیں۔ اللہ نے اس آیت میں غلاموں اور بچوں کو خطاب میں شریک کر دیا کیونکہ خلط ملط کی کثرت کی وجہ سے گویا سب ایک ہی ہو گئے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ؀ اسی طرح اللہ تمہارے لئے آیات (احکام) کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ (تمہارے حالات کو) خوب جاننے والا اور قوانین شرعی کو نافذ کرنے میں) بڑی حکمت والا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے یا منسوخ ہو گیا علماء کے اقوال اس میں مختلف ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (اس زمانہ میں) لوگوں کے گھروں پر نہ پردے تھے نہ حجاب بچے بالے اور خادم یوں ہی اندر آجاتے تھے اور گھر والوں کو ایسے حال پر دیکھ لیتے تھے جو گھر والوں کے لئے ناگواری کا سبب ہوتا تھا (گھر والوں کو پسند نہ تھا کہ کوئی ان کو ان کے اندرونی احوال دیکھے) اس وجہ سے اللہ نے داخلہ کی اجازت طلب کرنے کا حکم دیا پھر اللہ نے مسلمانوں کے لئے مالی وسعت کر دی اور انہوں نے دروازوں کے پردے بنالئے اب طلب اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔

کچھ علماء کا خیال ہے کہ آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے سفیان نے موسیٰ بن عائشہ کا بیان نقل کیا ہے موسیٰ نے کہا میں نے شعبی سے دریافت کیا کیا یہ آیت منسوخ ہے شعبی نے کہا نہیں خدا کی قسم میں نے کہا لوگ تو اس پر عمل نہیں کرتے شعبی نے کہا اللہ المستعان۔

سعید بن جبیر نے کہا لوگ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہو گئی، خدا کی قسم یہ منسوخ نہیں ہوئی بلکہ لوگوں نے اس کے موافق عمل کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا۔ (یعنی اس آیت کے حکم کو زیادہ اہمیت نہیں دی) صحیح یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ طلب اجازت کے حکم کی علت یہ ہے کہ اوقات مذکورہ میں پردہ پوشی (لباس وغیرہ) کا اہتمام نہیں رہتا آیت ثلث عورات اسی مفہوم کو ظاہر کر رہی ہے دوسرے اوقات اور مذکورہ بالا تینوں اوقات میں یہی فرق ہے پس علت حکم موجود نہ ہونے کی وجہ سے حکم کا باقی نہ رہنا نسخ نہیں ہے (یعنی اس زمانہ میں علت حکم موجود نہیں ہے اب دروازے پردہ پوش ہیں اور اوقات ثلثہ مذکورہ میں لوگ ننگے کھلے بھی نہیں رہتے اس لئے حکم باقی نہیں رہا) حضرت ابن عباس نے جو اس آیت کا منسوخ ہونا فرمایا ہے آپ کا یہ کلام مجازی ہے (یعنی منسوخ اصطلاحی نہیں بلکہ عدم بقاء علت کی وجہ سے حکم کا باقی نہ رہنا مراد ہے حضرت ابن عباس نے عدم بقاء حکم کو مجازاً نسخ فرما دیا) اس سے معلوم ہو گیا کہ جب اس زمانہ میں اوقات ثلثہ میں بھی ستر اور پردہ پوشی کا رواج اور نظام قائم ہے تو پھر اجازت طلبی کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
اور جب تم میں سے بچے جوانی کے (حدود کے) قریب پہنچ جائیں تو وہ بھی (ہمہ اوقات داخلہ کی) ویسے ہی اجازت لیا کریں جیسے اجازت ان سے پہلے والے (یعنی بالغ) لیا کرتے تھے ہر وقت کا خلط ملط اور آنا جانا ہی باعث تھا کہ ان کو بغیر طلب اجازت کے داخل ہونے کا حکم جواز مل گیا تھا جب وہ صورت جاتی رہی اور جوانی آگئی تو بلا اجازت داخلہ کا حکم بھی جاتا رہا اس حکم کے عوم میں سب لوگ داخل ہیں مرد ہوں، محرم عورتیں ہوں، نامحرم عورتیں ہوں (بغیر اجازت ملنے کے ہر شخص کے پاس داخلہ ممنوع ہے خواہ کسی وقت ہو) اس کی تائید حضرت ابو سعید خدری کی مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے حضرت ابو سعید نے فرمایا میرے پاس ابو موسیٰ آئے اور بیان کیا کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو بھیج کر مجھے طلب کیا میں فوراً حضرت عمر کے دروازے پر جا پہنچا اور تین بار سلام علیک کی لیکن (اندر سے) حضرت عمرؓ نے کوئی جواب نہیں دیا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمادیا تھا کہ اگر کوئی (کسی کے گھر جائے اور) تین مرتبہ سلام علیک کرنے کے بعد بھی اس کو داخلہ کی اجازت نہ ملے تو اس کو لوٹ آنا چاہئے۔ اس لئے میں لوٹ آیا۔ حضرت عمر نے مجھے بلوایا اور واپسی کی وجہ دریافت کی میں نے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کردیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس حدیث کا گواہ پیش کرو۔ (چنانچہ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ اگر یہ حدیث آپ نے بھی سنی تھی تو میرے ساتھ چل کر شہادت دیدیجئے) میں ابو موسیٰ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت عمر کے پاس جاکر شہادت دیدی۔ متفق علیہ۔

عطاء بن یسار کی روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر سوال کیا کیا میں اپنی ماں کے پاس داخل ہوں تب بھی (داخلہ کی) اجازت طلب کروں فرمایا ہاں۔ اس شخص نے عرض کیا میں تو اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں فرمایا (داخلہ کی اجازت) ضرور لے لیا کرو۔ اس شخص نے عرض کیا میں تو اس کا خادم ہوں (ہر وقت اس کی خدمت میں لگا رہتا ہوں) فرمایا (پھر بھی) داخلہ کی اجازت لے لیا کرو۔ کیا تم اپنی ماں کو برہنہ دیکھنا پسند کرو گے اس شخص نے کہا نہیں۔ فرمایا تو پھر اس کے پاس داخل ہونے کی اجازت لے لیا کرو۔ رواہ مالک مرسلاً۔

بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن مسیب کہتے تھے آدمی کو اپنی ماں کے پاس بھی داخلہ کی اجازت لے کر جانا چاہئے۔ اس آیت کا نزول اسی سلسلہ میں ہوا تھا۔

میں کہتا ہوں شاید اس آیت میں طلب اجازت کا حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں ہے اس لئے اگر کوئی شخص اپنے گھر کے اندر داخل ہونا چاہے اور گھر کے اندر ایسی عورتیں بھی ہوں جن کا پردہ ضروری ہو تو مستحب یہی ہے کہ اجازت لے کر اندر داخل ہو تاکہ نامحرم بے پردہ عورت پر نظر نہ پڑسکے لیکن غیر عورت کا غیر گھر میں برہنہ ہونے کا احتمال چونکہ ضعیف ہے اس لئے بلا اجازت لئے داخلہ مکروہ تنزیہی ہے۔ (حرام نہیں ہے) ہاں دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت داخلہ حرام ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا۔

اسی طرح جس گھر میں اجنبی عورتیں ہوں تو ان کے پاس بھی بغیر حصول اجازت کے داخلہ ممنوع ہے اللہ نے فرمایا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔

بیضاوی نے لکھا ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ بالغ غلام اگر اپنی مالکہ کے پاس جائے تو داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کرنا واجب ہے وہ اس آیت سے اپنے مسلک پر استدلال کرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں وہ مراہق لڑکے مراد ہیں جو غلام نہ ہوں کیونکہ آیت اول الذکر میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کو اَلَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ کا مدمقابل قرار دیا گیا ہے اس لئے اس آیت کے اندر ممالیک کا اندراج نہیں ہوگا۔ بیضاوی کے مندرجہ بالا کلام سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ عبد بالغ کا اپنی مالکہ کے پاس داخل ہونا یا نہ ہونا مختلف فیہ ہے اور اس مسئلہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ غلام اپنی مالکہ کے لئے محرم ہے یا نہیں امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک محرم ہے امام

ابو حنیفہ کے نزدیک محرم نہیں ہے اول الذکر قول پر اپنی مالکہ کے پاس بالغ غلام کا داخل ہونا طلب اذن کو مستحب قرار دیتا ہے جیسے دوسری نامحرم عورتوں کے پاس داخلہ کے لئے اذن طلبی مستحب ہے اور مؤخر الذکر قول پر طلب اجازت واجب ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام بیان فرماتا ہے اور اللہ بخوبی جاننے والا (اور) بڑی حکمت والا ہے۔

تکرار آیت محض تاکید اور طلب اذن پر زور دینے کے لئے ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ اور بڑی بوڑھی عورتیں جن کو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی کچھ امید نہ رہی ہو ان کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے اتار رکھیں بشرطیکہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں۔

القواعد القاعد کی جمع ہے وہ عورتیں مراد ہیں جو حاملہ ہونے اور حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہوں چونکہ حمل اور حیض سے انقطاع کی صفت عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہے مردوں سے اشتباہ بھی نہیں ہے اس لئے حامل اور حائض کی طرح عورت کے لئے لفظ قاعد (بجائے قاعدۃ کے) عربی میں مستعمل ہے۔

اَلّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا یعنی وہ عورتیں جو بڑی بوڑھی ہونے کی وجہ سے اس قابل نہ رہی ہوں کہ نکاح کی کوئی توقع کر سکیں ربیعہ نے کہا اس سے مراد وہ بوڑھی عورتیں ہیں جن سے مرد نفرت کرتے ہیں بڑھاپے کی وجہ سے کوئی ان کی طرف رغبت نہیں کرتا۔ جو عمر رسیدہ عورت ایسی ہو کہ اس کے اندر کچھ رعنائی باقی ہو وہ اس آیت سے خارج ہے۔

کپڑے اتار دینے سے مراد ہے کچھ کپڑے اتار دینا حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں من ثیابھن آیا ہے (من تبعیضیہ ہے یعنی کچھ کپڑے) اس قرأت سے اصل مراد واضح ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی (آزاد) بوڑھی عورت کے لئے بھی اجنبی مردوں کے سامنے پشت یا پیٹ اور ناف سے نیچے کا بدن کھولنا جائز نہیں۔ سر چہرہ اور دونوں بانہیں کھول سکتی ہے۔

غیر متبرجت برج کا لغوی مفہوم ہے ظہور، قلعہ، مضبوط عمارت، آسمانی ستاروں کا جھمگھٹ اسی مناسبت سے برج کہلاتا ہے۔

تبرج پوشیدہ چیز کو بناوٹ کے ساتھ ظاہر کرنا سفینہ بارجۃ وہ کشتی جس پر پردہ نہ ہو برج آنکھوں کی ایسی کشادگی کی سیاہی کے گرداگرد پوری سفیدی نمایاں ہو کوئی حصہ اوجھل نہ رہے لفظ تبرج کا خصوصی استعمال عورتوں کے بے پردہ بن ٹھن کر مردوں کے سامنے آنے کے لئے ہوتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دس باتوں کو برا سمجھتے تھے ان میں سے ایک بات یہ (حضور کو پسند نہ) تھی کہ عورت سنگھار کر کے غیر مقام میں نمودار ہو۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ تبرج کا معنی ہے غیر مردوں کے سامنے عورتوں کا اظہار زینت، ایسا اظہار زینت شرعاً مذموم ہے ہاں شوہر کے سامنے اظہار زینت مذموم نہیں ہے حدیث میں لغیر محلھا سے یہ ہی مذموم اظہار زینت ہے۔

ان تضعن ثیابھن کے بعد غیر متبرجت کی قید کا اضافہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ کچھ کپڑے اتار کر غیر مردوں کے سامنے بوڑھی عورتوں کا آنا اس وقت قابل گناہ نہیں قرار دیا جائے گا جب کچھ کپڑے اتارنے سے ان عورتوں کا مقصد اظہار زینت نہ ہو اگر کپڑے اتارنے کا مقصد اندرونی زینت اور لباس کی نمائش ہو تو بہرحال گناہ اور حرام ہے۔

وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ اور (غیر مردوں کے سامنے کپڑے اتارنے سے بالکل) اجتناب رکھنا ان کے لئے بہتر ہے۔

یستعففن عفت کی طلبگار ہوں عفت کا معنی ہے ناجائز کام سے اپنے نفس کو روکنا کذا فی القاموس۔ اس جگہ غیر مردوں کے سامنے کپڑے اتارنے سے پرہیز رکھنا مراد ہے۔ یعنی کپڑے (اتارنا اگرچہ جائز ہے لیکن) اتارنے سے نہ اتارنا بہتر ہے لباس اتار دینے سے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور لباس پہنے رہنے میں اس کا احتمال نہیں۔

وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝۶۰ (عورتیں جو مردوں سے باتیں کرتی ہیں ان کی باتوں کو) اللہ خوب سننے والا (اور کپڑے اتار دینے سے ان کی جو غرض ہوتی ہے اللہ اس کو) خوب جاننے والا ہے۔

لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ

اندھے پر کوئی تنگی نہیں ہے۔ نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

بغوی نے سعید بن جبیر اور ضحاک وغیرہ کا بیان نقل کیا ہے کہ لنگڑے اندھے اور بیمار لوگ تندرست لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے سے خود گریز کرتے تھے کیونکہ تندرست لوگ ان سے نفرت کرتے اور ان کے ساتھ کھانے کو برا سمجھتے تھے۔

اندھا کہتا تھا ممکن ہے میں زیادہ کھا جاؤں (اور دوسروں کے واسطے کھانا کم ہو جائے) لنگڑا کہتا تھا۔ مجھے بیٹھنے کے لئے دو آدمیوں کی جگہ گھیرنا پڑے گی (اس سے دوسروں کو تنگی ہو گی) اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔

مطلب یہ کہ اگر یہ معذور لوگ تندرست لوگوں کے ساتھ کھانا کھائیں تو ان کے لئے کوئی تنگی (گناہ، بندش) نہیں ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اسی طرح ابن جریر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ نازل ہوئی تو بیماروں، لنگڑوں اور اندھوں کے ساتھ کھانے سے مسلمانوں پر دشواری آپڑی۔ مسلمانوں نے کہا، کھانا تو ہر مال سے اونچا درجہ رکھتا ہے اور اللہ نے خلاف حق کھانے سے منع کیا ہے۔ نابینا آدمی تو عمدہ کھانے کو دیکھ ہی نہیں سکتا اور لنگڑا ٹھیک طور پر بیٹھ نہیں سکتا اور (کھانے میں اگر لوگوں کے ہاتھ پڑ رہے ہوں یا کھانے کے لئے لوگ گھس رہے ہوں تو) مزاحمت نہیں کر سکتا اور بیمار تو کھانا اٹھانے سے ویسے ہی کمزور ہوتا ہے (تو ہم اب ان کے ساتھ کس طرح کھا سکتے ہیں) اس پر یہ آیت مفاتحہ تک نازل ہوئی۔ اس تشریح کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ مسلمانو! اندھوں وغیرہ کے ساتھ کھانے سے تم پر کوئی تنگی نہیں ہے۔

سعید بن میبّ کا بیان ہے کہ مسلمان جب جہاد کو جاتے تھے تو اپنے پیچھے کچھ اپاہج لوگوں کو چھوڑ کر اپنے گھروں کی کنجیاں ان کو دے جاتے تھے اور کہہ دیتے تھے تم کو ہماری طرف سے اجازت ہے کہ ہمارے گھروں کے اندر جو کچھ ہے تم اس میں سے کھا سکتے ہو۔ لیکن ان لوگوں کو دشواری پیش آتی تھی۔

وہ کہتے تھے گھر والے جب یہاں موجود نہیں ہیں تو ہم ان کے گھروں کے اندر داخل نہیں ہوں گے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اجازت عطا کر دی۔

حسن نے کہا اس آیت کا نزول جہاد سے رہ جانے یعنی جہاد میں مذکورہ بالا معذوروں کے نہ جانے کی اجازت کے لئے ہوا اور پھر ختم ہو گیا۔ آئندہ کلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

وَّلَا عَلٰۤى اَنۡفُسِكُمۡ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا مِنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ اور نہ تم پر کوئی تنگی ہے کہ اپنے گھروں میں (رکھی ہوئی چیزوں میں) سے کھا لو۔

اپنے گھروں سے مراد ہیں وہ گھر جن میں بیوی بچے ہوں اس میں اولاد کے گھر بھی شامل ہیں، اپنی اولاد کا گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے اخرجہ اصحاب السنۃ وابن ماجہ والحاکم عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت سے ابوداؤد دارمی، ترمذی نسائی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پاکیزہ ترین مال وہ ہے جو آدمی اپنی کمائی سے کمائے اور آدمی کی اولاد بھی اسی کی کمائی سے ہے مطلب یہ ہے کہ بیویوں کا اور اپنی اولاد کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کذا قال ابن قتیبہ۔

اَوۡ بُيُوۡتِ اٰبَآئِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اُمَّهٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اِخۡوَانِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَخَوٰتِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ اَعۡمَامِكُمۡ اَوۡ بُيُوۡتِ عَمّٰتِكُمۡ

اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ

یا اپنے باپوں کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اس مال میں سے جس کی کنجیوں کے تم مالک (بنادیئے گئے) ہو۔

مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ سے مراد حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک وکیل (یعنی نمائندہ ایجنٹ) اور منتظم ہے جو زمین اور جانوروں کی دیکھ بھال کا مختار بنادیا گیا ہو۔ ایسا شخص اپنی زیر انتظام زمین کی پیداوار کھا سکتا ہے اور زیر نگہداشت جانوروں کا دودھ پی سکتا ہے البتہ بوجھ نہیں لاد سکتا نہ غلہ اور پیداوار کا ذخیرہ بنا کر رکھ سکتا ہے۔

ضحاک نے کہا اپنے غلاموں باندیوں کے گھر مراد ہیں آقا اپنے غلام کے گھر کا مالک ہوتا ہے۔

مفاتح خزانے۔ اللہ نے فرمایا وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ اور اسی کے پاس غیب کے خزانے ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مفاتح سے کھولنے کے آلے یعنی کنجیاں مراد ہوں۔

عکرمہ نے کہا جب آدمی کنجی کا مالک (یعنی متصرف) ہو جاتا ہے تو وہ اس مال کا خزانچی بن جاتا ہے اس لئے اگر کچھ اس میں سے کھالے تو کوئی حرج نہیں۔

سدی نے کہا اگر کوئی شخص کسی کو اپنے غلّہ وغیرہ کا نگراں متصرف بنادے تو اگر یہ نگراں اس میں سے کچھ کھالے تو کوئی حرج نہیں۔ بزار نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب ہو کر جہاد کو نکلنے کے بڑے خواہشمند ہوتے تھے۔ چنانچہ جہاد کو جاتے وقت (گھروں کی) کنجیاں ان لوگوں کو دے جاتے تھے جو اپاہج (لنگڑے، لولے، اندھے، بیمار وغیرہ) ہوتے تھے۔ اور کہہ دیتے تھے کہ جتنا تم پسند کرو ہمارے گھروں سے لے کر کھا سکتے ہو، ہماری طرف سے اجازت ہے لیکن جن لوگوں کو اجازت دی جاتی تھی وہ کہتے تھے اس میں سے کچھ کھانا ہمارے لئے جائز نہیں ان لوگوں نے بے دلی کے ساتھ (مجبور ہو کر) اجازت دی ہے اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔

ابن جریر کا بیان ہے کہ زہری سے آیت لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى الخ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اندھے، لنگڑے اور بیمار کا ذکر اس آیت میں کیوں کیا گیا (اس کا پس منظر کیا ہے۔) زہری نے کہا مجھ سے عبید اللہ بن عبد اللہ نے بیان کیا تھا کہ مسلمان جب جہاد کو جاتے تھے تو اپنے پیچھے ان اپاہجوں کو چھوڑ جاتے تھے اور ان کو اپنے گھروں کی کنجیاں سپرد کر جاتے تھے اور یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ ہمارے گھروں کے اندر جو کچھ ہے اس میں سے کھانے کی تم کو ہماری طرف سے اجازت ہے، لیکن وہ لوگ بڑی دشواری میں پڑ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب گھر والے موجود نہیں تو ہم ان کے گھروں کے اندر نہیں جائیں گے۔ (اور گھروں میں داخلے کے بغیر گھروں کے اندر موجود چیز کو کس طرح کھا سکتے ہیں) اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اجازت عطا فرمادی گئی۔

بعض لوگوں نے کہا مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ سے مراد یہ ہے کہ جو کھانے پینے کی چیزیں تم نے جمع کر رکھی ہیں ان کو کھا سکتے ہو۔

مجاہد وقتادہ نے یہ مطلب بیان کیا تم نے اپنے گھروں کے اندر جو کھانے کی چیزیں رکھ چھوڑی ہیں جن کے تم مالک ہو، ان کو کھانا تمہارے لئے ممنوع نہیں۔

اَوْ صَدِيْقِكُمْ ط یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔

خلیط کے لفظ کی طرح لفظ صدیق ایک کے لئے بھی آتا ہے اور چند کے لئے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سچے دوستوں کے مکان سے بھی تم (ان کی غیبت میں) کھا سکتے ہو۔ کیونکہ تمہاری یہ بے تکلفی دوستوں کے لئے خوش کن اور پسندیدہ ہو گی۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول حارث بن عمرو کے حق میں ہوا تھا۔ حارث رسول اللہ

ﷺ کے ساتھ کسی جہاد پر جانے لگے تو اپنی بجائے گھر کی نگرانی مالک بن زید کے سپرد کر دی، جب واپس آئے تو مالک کو بہت دبلا اور کمزور پایا، وجہ دریافت کی تو مالک نے کہا میں نے آپ کے گھر میں موجود غلہ کھانا، جبکہ آپ کی اجازت بھی نہیں تھی اپنے لئے برا (اور باعث گناہ) سمجھا۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس کی یہ روایت نقل کی ہے لیکن مالک بن زید کی جگہ خالد بن زید کا لفظ اس روایت میں آیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حسن اور قتادہ اسی آیت کی بناء پر قائل تھے کہ دوست کے گھر میں داخل ہو کر اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے کوئی چیز کھالینا جائز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص (یعنی اقرباء اور اعزاء) کے گھروں میں جا کر ان کی موجودگی کے بغیر کچھ کھالینا جائز ہے۔ کھا سکتے ہو لیکن بطور توشہ ذخیرہ کرنا اور اٹھا کر لے آنا جائز نہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے یہ حکم شروع اسلام میں تھا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حکم اب بھی باقی ہے لیکن اس کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ گھر والے نے صریح اجازت دے دی ہو یا قرینہ سے اس کی اجازت معلوم ہو گئی ہو یہی وجہ ہے کہ آیت میں ذکر ایسے ہی لوگوں کا کیا گیا جن سے عام طور پر بے تکلفی ہوتی ہے۔ (اور آپس میں کھانے پینے کا کوئی پرہیز یا تکلف نہیں ہوتا) ان لوگوں کا آیت میں تذکرہ صرف عادت و رواج کے پیش نظر ہے (حصہ کے لئے نہیں ہے) اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ بالکل اجنبی اور غیر آدمی کے گھر پہنچ کر اس کی صریحی یا غیر صریحی اجازت کے بغیر کچھ کھالینا بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ گھر والے کی رضامندی کا کسی طور پر علم ہو گیا ہو۔

مسئلہ:۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ عام طور پر قریبی محرم رشتہ داروں میں چونکہ بے تکلفی اور (کھانے پینے سے) انبساط خاطر ہوتا ہے اس لئے حنفیہ کہتے ہیں کہ محرم قرابت دار کے مکان کے اندر سے اگر کوئی شخص اس قرابت دار کا یا کسی غیر کا مال چرالے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، لیکن اگر کسی غیر کے مکان سے کچھ مال چرالیا خواہ چرانے والے کے قریبی محرم ہی کا ہو تب بھی ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ اول صورت میں مال محرز نہ تھا اور دوسری صورت میں محرز تھا (محرز بمعنی محفوظ یعنی اول صورت میں مال ایسی جگہ نہیں رکھا ہوا تھا جو چرانے والے کے لئے محفوظ مقام سمجھا جائے اور دوسری صورت میں اس چور کے لئے غیر کا گھر ممنوع ہے۔ اور محفوظ مقام ہے)۔

شبہ

اگر یہ بات ہے تو اسی آیت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ دوست کے مکان کے اندر سے چوری کرنے پر بھی چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

ازالہ

دوستی عارضی چیز ہے (توڑنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جوڑنے سے جڑ جاتی ہے) قرابت کا درجہ اس سے جدا ہے (وہ تخلیقی اور فطری ہے توڑنے سے ٹوٹتی نہیں) دوست کے گھر سے مال چرا کر تو چور دوستی کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے (یہ عمل دوستی شکن ہے) اس فعل کی وجہ سے دوستی ہی باقی نہیں رہتی (لیکن قرابت قریبہ ہر صورت میں باقی رہتی ہے)

بغوی نے لکھا ہے اندھے، لنگڑے اور بیمار کھانا مانگنے کے لئے بعض مسلمانوں کے گھر جاتے تھے صاحب خانہ کے پاس کھلانے کے لئے کچھ موجود نہ ہوتا تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر ان کو لے جاتا یا ان لوگوں میں سے کسی کے گھر لے جاتا جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے ایسا کھانا کھانے میں ان معذوروں کو پس و پیش ہوتا اور وہ کہتے یہ ہم کو دوسروں کے گھر لئے پھرتا ہے اور وہاں سے بغیر اجازت کے لے کر ہم کو کھلاتا ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ تشریح کے بموجب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ اندھوں، لنگڑوں، بیماروں کے لئے کوئی ممانعت ہے نہ تمہارے لئے کوئی گناہ ہے کہ ان معذوروں کے ساتھ مل کر تم اپنے گھروں سے اپنی اولاد، اہل و عیال، آباؤ امہات، اخوان و اخوات، اعمام و عمات اخوال و خالات وغیرہ وغیرہ کے گھروں سے لے کر

کچھ کھاؤ۔

بغوی نے بحوالہ عطاء خراسانی حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ مال دار لوگ غریب قرابت داروں یا دوستوں کے گھر جاتے تھے اور وہ کھانا پیش کرتے تھے تو مال دار لوگ کہتے تھے بخدا ہم یہ گناہ نہیں کریں گے کہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں ہم مالدار ہیں اور تم نادار ہو اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ط تم پر کوئی گناہ نہیں اکٹھے ہو کر کھاؤ یا الگ الگ۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول بنی لیث بن بکر کنانی کے متعلق ہوا اس قبیلہ کا ایک شخص تنہا بغیر مہمان کے نہیں کھاتا تھا مہمان ساتھ کھانے کے لئے مل جاتا تو کھانا کھا لیتا ورنہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ صبح سے بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی اور کھانا سامنے رکھا رہا مگر اس شخص نے نہیں کھایا اونٹنیوں کے تھنوں میں دودھ بھرا رہتا مگر وہ تنہا نہ پیتا (اس لئے دودھ دوہتا ہی نہ تھا) جب کوئی مہمان ہم مشرب ہونے کے لئے آجاتا تو پی لیتا۔ دن بھر مہمان کے نہ ملنے اور تنہا نہ کھانے کی وجہ سے بھوکا پیاسا رہتا۔ آخر جب شام ہو جاتی تو کچھ کھا لیتا۔ یہ بیان قتادہ ضحاک اور ابن جریج کا ہے۔

ابن جریر اور بغوی نے اس سلسلہ میں عکرمہ اور ابو صالح کا بیان اس طرح نقل کیا ہے کہ انصار کا دستور تھا کہ جب ان کا کوئی مہمان ہوتا تو اس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک مہمان کھانے میں ان کے ساتھ شریک نہ ہو جاتا۔ اس آیت میں ان کو اجازت دیدی گئی کہ جس طرح چاہیں کھائیں۔ (مہمان کے ساتھ) اکٹھے ہو کر کھائیں یا الگ الگ کھائیں۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ پھر جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنوں کو سلام کرو۔

اپنے گھر ہوں یا غیر کے علی انفسکم سے مراد یہ ہے کہ آپس میں سلام کیا کرو۔ النفس کا اطلاق اس جماعت پر بھی ہوتا ہے جو ایک مذہب کے ہوں یا قرابت دار ہوں۔ اللہ نے فرمایا ہے لَا تُخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب تم گھروں کے اندر داخل ہو اور وہاں کوئی نہ ہو تو خود اپنے آپ کو سلام کیا کرو۔ یعنی یوں کہا کرو۔ السلام علینا وعلی عباداللہ الصالحین ایسی صورت میں ملائکہ سلام کا جواب دیتے ہیں۔

تَحِيَّةً بطور دعا۔ تحیۃ کے معنی ہی سلام کرنا ہیں۔ اس لئے لفظ تحیۃ سلموا کا مفعول مطلق ہے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو اپنی (قائم کردہ) صورت میں پیدا کیا۔ آدمؑ کے قد کی لمبائی ساٹھ ہاتھ تھی۔ بنا چکنے (اور روح پھونکنے) کے بعد فرمایا کہ جاؤ فرشتوں کی یہ جماعت جو بیٹھی ہوئی ہے اس کو سلام کرو۔ اور سنو وہ تم کو کیا جواب دیتے ہیں۔ وہ جو جواب دیں گے وہی تمہارا اور تمہاری نسل کا جواب (سلام) ہوگا۔ آدمؑ نے جا کر السلام علیکم کہا۔ فرشتوں نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ الخ۔

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ کی طرف سے۔ یعنی یہ سلام اللہ کی طرف سے شروع ہوا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من عنداللہ کا تعلق تحیۃ سے ہو۔ کیونکہ تحیۃ کا معنی دعائے زندگی اور زندگی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔

مُبٰرَكَةً برکت والی یعنی جس کے ساتھ برکت ہو۔ برکت کا معنی ہے بھلائی کی زیادتی سو سلام علیک کے جواب میں کہئے علیکم السلام والبرکۃ تم پر سلام ہو اور بھلائیوں کی زیادتی۔

بعض اہل علم نے کہا سلام کے جواب کو برکت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے خیر میں زیادتی اور ثواب کی امید کی جاتی ہے۔

طَيِّبَةً ط پاک۔ یعنی نفاق اور ریاکاری سے پاک، صاف دل سے نکلی ہوئی۔

بعض کے نزدیک طیبہ کا یہ مطلب ہے کہ اس سے سننے والے کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا مبرکۃ طیبۃ سے مراد ہے اچھی خوبصورت، حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا جب تم میرے کسی امتی سے ملو تو اس کو سلام کرو۔ اس سے تمہاری عمر لمبی ہو گی اور جب اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔ اس سے تمہارے گھر کی خیر بڑھے گی اور چاشت کی نماز پڑھا کرو۔ یہ صلوٰۃ اوّابین (اللہ کی طرف لوٹنے والوں کی نماز) ہے۔ اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان والثعلبی وحمزہ بن یوسف الجرجانی فی تاریخ جرجان اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں اور جو لوگ گھر کے اندر موجود ہوں ان کو یہ شخص سلام کرے۔ جابر طاؤس، زہری قتادہ اور عمرو بن دینار کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ نے کہا اگر تم اپنے گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو۔ وہ تمہارے سلام کے زیادہ مستحق ہیں اور اگر خالی گھر میں داخل ہو جہاں کوئی نہ ہو تب (بھی سلام کرو اور) یوں کہو السلام علینا و علی عباداللہ صالحین ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ سلام کا جواب دیتے ہیں۔

بیہقی نے شعب الایمان میں قتادہ کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم باہر جاؤ تو اپنے گھر والوں کو سلام کے ساتھ رخصت کرو۔

ترمذی نے حضرت انس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا بیٹے جب تو گھر والوں کے پاس (گھر کے اندر) داخل ہو تو ان کو سلام کیا کر تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے برکت ہو گی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اگر گھر کے اندر کوئی نہ ہو تو یوں کہے السلام علینا من ربنا السلام علینا وعلی عباداللہ الصلحین السلام علی اھل البیت ورحمتہ اللہ ہم پر ہمارے رب کی طرف سے سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلامتی ہو، گھر والوں پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔

اس آیت کی توضیح میں عمرو بن دینار نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب تو مسجد میں داخل ہو تو یوں کہہ السلام علینا و علی عباداللہ صالحین۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اسلام (میں) کونسا (عمل) سب سے اچھا ہے۔ فرمایا یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور (ہر شخص کو) سلام کرو۔ خواہ اس کو جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں اگر کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔ اگر وہ مر جائے تو اس کے جنازے میں یہ حاضر ہو۔ اگر وہ دعوت کرے تو یہ دعوت کو قبول کرے۔ ملاقات ہو تو سلام کرے۔ اس کو چھینک آئے تو یرحمک اللہ کہے اور وہ سامنے موجود ہو یا نہ ہو بہر حال اس کی خیر خواہی کرے۔ رواہ النسائی ترمذی اور بزار نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جب تک مومن نہ ہو گے جنت میں نہ جاؤ گے اور جب تک آپس میں محبت نہ کرو گے مومن نہ ہو گے۔ کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتادوں کہ اگر تم اس کو کرو گے تو آپس میں محبت کرنے لگو گے۔ سلام (کے رواج) کو پھیلاؤ۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے سوار پیدل کو سلام کرے اور پیدل بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے (آدمی) بہت (آدمیوں) کو متفق علیہ

بخاری نے حضرت ابوہریرہ کی دوسری روایت نقل کی ہے اس میں (اتنا زائد) ہے چھوٹا بڑے کو (سلام کرے) حضرت عمران بن حصین راوی ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔ السلام علیکم حضور ﷺ نے سلام کا جواب ویسا ہی دے دیا۔ وہ شخص بیٹھ گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دس نیکیاں ہوئیں یا دس ثواب لکھے گئے) کچھ دیر کے بعد ایک اور شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ حضور ﷺ نے اسکو بھی ویسا ہی جواب دے دیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا اور حضور ﷺ نے فرمایا بیس۔ پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ حضور ﷺ نے اس کو بھی (ایسا ہی) جواب دے دیا۔ وہ بھی

بیٹھ گیا حضور ﷺ نے فرمایا تیس[1] رواہ الترمذی وابو داؤد۔ ابو داؤد نے حضرت معاذ بن انس کی راویت سے بھی اسی کے ہم معنی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ، حضور نے فرمایا چالیس اور فضائل اسی طرح ہوتے ہیں۔

حضرت ابو امامہ کی مرفوع روایت ہے کہ سب سے زیادہ اللہ سے قرب رکھنے والا وہ شخص ہے جو سلام کی ابتدا کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع روایت ہے جو شخص کسی جلسہ میں پہنچے تو سلام کرے پھر اس کا دل بیٹھنے کو چاہے تو بیٹھ جائے۔ پھر (واپسی کے وقت) جب اٹھے تو سلام کرے پہلا اسلام دوسرے سلام سے زیادہ مستحق (ثواب) نہیں ہے۔ رواہ الترمذی وابو داؤد۔

حضرت علی نے فرمایا اگر جماعت گزرے تو ان میں سے ایک کا سلام کرنا سب کی طرف سے کافی ہے اور بیٹھنے والوں میں سے بھی ایک کا جواب دے دینا کافی ہے۔ بغوی نے مصابیح میں اس کو حضرت علی کا قول قرار دیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد کہا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۶۱ اسی طرح اللہ کھول کھول کر تمہارے لئے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

یہ تیسری تاکیدی آیت ہے جو علاوہ تاکید کے آخری احکام کی عظمت شان کو بھی ظاہر کر رہی ہے۔ نمبر اول اور نمبر دوم آیات کے خاتمہ پر واللہ علیم حکیم فرمایا تھا۔ اور اس آیت کا خاتمہ لعلکم تعقلون پر فرمایا۔ اول ودوم احکام کے خاتمہ پر اصل علت احکام بیان کر دی یعنی اللہ کے علم وحکمت کا تقاضا یہی ہے اور اس آیت کے خاتمہ پر مقصد حکم کو ظاہر فرمادیا کہ حق کو سمجھنا اور جو کام بہتر ہے اس کو جان لینا ان آیات کا اصل مقصد ہے۔

دلائل میں بیہقی نے اور ابن اسحاق نے عروہ اور محمد بن کعب قرظی کے حوالہ سے بیان کیا کہ جنگ احزاب کے سال (جب قریش اور غطفان کے قبائل وغیرہ مدینہ پر چڑھ کر آئے تو) قریش نے مدینہ میں چاہ رومہ کے مجمع الاسیال کے مقام پر اپنا پڑاؤ کیا ان کا کمانڈر ابو سفیان تھا اور غطفان (کے قبائل) نے آکر احد کے ایک طرف نقبین میں قیام کیا رسول اللہ ﷺ کو اطلاع مل چکی تھی آپ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوادی تھی خود بھی حضور خندق کھودنے میں مصروف عمل تھے اور مسلمان بھی کام میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن منافقوں میں سے کچھ لوگ سستی کر رہے تھے، جھوٹ موٹ کام میں شریک تھے اور موقع پاتے ہی رسول اللہ ﷺ کے علم واجازت کے بغیر گھروں کو چپکے سے سرک لیتے تھے پھر کسی مسلمان کو کوئی حادثہ در پیش ہو جاتا جس سے وہ مجبور ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کر دیتا اور اجازت لے کر جاتا تھا۔ اجازت ملنے پر ضرورت پوری کر کے فوراً واپس آجاتا تھا اس پر آیات ذیل آخر سورۃ تک نازل ہوئیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مومن حقیقت میں صرف وہی ہیں جو (سچے دل سے) اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے ہیں۔ یعنی وہ لوگ حقیقت میں مومن نہیں ہیں جو زبان سے تو مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کے دل مومن نہیں ہیں۔

وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ اور جب رسول ﷺ کے ساتھ کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لئے مجتمع کیا گیا ہے تو جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں نہیں جاتے (اے رسول ﷺ) جو لوگ آپ سے (ایسے موقع پر) اجازت لیتے ہیں پس وہی اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔

امر جامع اجتماعی کام ایسا کام جس کو انجام دینے کے لئے جمعیت ضروری ہے جیسے خندق کھودنا اجتماعی مشورہ، جہاد، جمعہ اور عیدین کی نمازیں وغیرہ۔

[1] یعنی تیس نیکیاں ہوئیں۔

لم یذھبوا یعنی اس کام کو چھوڑ کر بچھڑ نہیں جاتے اور جس مقصد سے جمع ہوئے ہیں اس سے روگرداں نہیں ہو جاتے۔

حتی یستاذنوہ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت کے خواستگار ہوتے ہیں اور آپ ان کو جانے کی اجازت دیدیتے ہیں (یعنی بغیر اجازت حاصل کئے نہیں جاتے۔ صرف طلب اجازت کو کافی نہیں سمجھتے)

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مومنوں سے مراد کامل ایمان والے مومن ہیں یعنی جن مومنوں کی حالت کو بیان کیا گیا ہے وہ اس وقت موجود ہی تھے اور سب کامل الایمان تھے۔ منافقوں سے ان کی حالت ہی جدا تھی۔

ان الذین یستا ذنونک سختی اور مصیبت کے وقت رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑنا اور مدد کرتے رہنا ان لوگوں کے ایمان کی کھلی ہوئی شہادت تھی۔ اس لئے بلیغ اسلوب بیان کے ساتھ پختہ طریقے سے ان کے مومن ہونے کو اس آیت میں دوبارہ ظاہر فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ جو اجازت لینے کے بعد جاتے ہیں وہ قطعی مومن ہیں بلا اجازت لئے چلے جانے والے مومن نہیں ہیں۔

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ سو اگر وہ اپنے کسی کام کے لئے (جانے کی) آپ سے اجازت طلب کریں تو آپ (کو اختیار ہے آپ) جس کو چاہیں اجازت دیدیں۔

لبعض شانھم یعنی ہر کام کے لئے اجازت لے کر چلے جانا مومن کی شان کے خلاف ہے ہاں اگر کوئی ضروری کام آپڑے جس کو انجام دیئے بغیر چارہ نہ ہو اور واپس جانا لازم ہو تو اس کے لئے اجازت لی جاسکتی ہے۔

لمن شئت یعنی ہر طلب گار اذن کو اجازت دے دینا رسول پر لازم نہیں ورنہ اجازت طلب کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے اجازت کی درخواست ہر ایک کر سکتا تھا۔ لمن شئت کی قید سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ بعض احکام اللہ کے رسول ﷺ کی رائے پر موقوف ہیں اور اسی طرح خلیفۂ وقت (کے امتیازی اختیار) کو ان میں دخل ہے۔

بعض لوگ اس اختیار تمیزی کے قائل نہیں تو ان کے نزدیک لمن شئت کا یہ مطلب ہے کہ طلب گاران اذن میں سے جس کی سچائی کو تم جانتے ہو اور سمجھتے ہو کہ واقعی اس کو عذر ہے یا اجتماعی امر یعنی جس کام کے لئے مسلمانوں کا اجتماع کیا گیا ہے وہ کام زیادہ اجتماع کا مقتضی نہیں ہے یا اجازت لے کر جانے والے کی غیر حاضری سے اس کام میں خرابی نہیں آئے گی تو اجازت دیدو۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو، بلاشبہ اللہ بڑا معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے (ان کے اس قصور کو معاف فرمادیگا) یعنی اجازت لینے کے بعد بھی اجتماعی کام کو چھوڑ کر جانا بھی قصور ہے۔ امر دین پر دنیوی کام کو ترجیح دینا یقیناً ایک قسم کی کوتاہی ہے لیکن اللہ بلاشبہ بندوں کی فروگذاشتوں اور خطاؤں کو معاف کرنے والا اور ان کے لئے اپنی مہربانی سے سہولت پیدا کرنے والا ہے۔ (اس لئے معاف فرمادے گا)

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر نے اس آیت کے شان نزول میں کہا ہے کہ جمعہ کے روز جب رسول اللہ ﷺ (خطبہ دینے کے لئے) منبر پر پہنچ جاتے تھے اور اس وقت کسی شخص کو مسجد سے باہر جانے کا کوئی عذر پیش آجاتا تھا تو وہ مسجد سے باہر نہیں نکلتا تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ حضور ﷺ پہچان جاتے تھے کہ یہ جانے کی اجازت کا خواستگار ہے۔ آپ ایسے لوگوں میں سے جس کو چاہتے تھے اجازت دیدیتے تھے۔

مجاہد نے کہا جمعہ کے دن (خطبہ کے وقت) امام کی طرف سے ہاتھ سے اشارہ کر دینا ہی اذن ہے اہل علم کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہر اجتماعی کام کا یہی حکم ہے۔ جب امام کے ساتھ لوگ کسی اجتماعی کام کے لئے جمع ہوں تو بغیر اجازت امام کے اجتماع کو چھوڑ کر نہ جائیں اور امام کو اختیار ہے کہ جب کوئی جانے کے لئے اجازت مانگے تو جس کو چاہے اجازت دیدے نہ چاہے نہ دے۔ اجازت طلب کرنے اور اجازت دینے نہ دینے کی تفصیل اس وقت ہے جب ٹھہرے رہنے سے کوئی اضطراری سبب مانع نہ

ہو۔ اگر اضطراری سبب پیدا ہو گیا تو اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً مسجد میں کسی عورت کو حیض شروع ہو گیا یا کوئی جنب ہو گیا یا کسی کو کوئی (شدید) مرض لاحق ہو گیا۔ ایسے حالات میں اجازت طلب کرنا لازم نہیں۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ رسول کے بلانے کو آپس میں تم ایسا نہ قرار دو جیسا تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

دعاء الرسول میں فاعل کی طرف اضافت ہے اور مفعول محذوف ہے مطلب یہ کہ کسی امر جامع (اجتماعی امر) کے موقع پر رسول اللہ ﷺ تم کو بلائیں تو تم فوراً حکم کی تعمیل کرو اور یہ نہ سمجھو کہ رسول کا بلاوا بھی ایسا ہی ہے جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو کہ جس کو بلایا جاتا ہے اس کا دل چاہا گیا دل نہ چاہا نہ گیا۔ اور چلا بھی گیا تو جب ارادہ ہوا بغیر اجازت لئے اٹھ کر چلا آیا۔ رسول کی دعوت پر لبیک کہنی فرض ہے اور بلا اجازت لئے یونہی چھوڑ کر چلا آنا حرام ہے اس تفسیر پر اس آیت کا مطلب ویسا ہی ہو گا جیسا دوسری آیت میں فرمایا ہے یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔

مجاہد نے کہا دعاء الرسول (میں اضافت مفعول کی طرف ہے) یعنی جب تم رسول کو بلاؤ یا پکارو تو اس طرح نہ بلاؤ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو بلاتا اور پکارتا ہے بلکہ تعظیم و تکریم کے ساتھ بلاؤ۔ اللہ کے رسول ﷺ کو ان کا نام لے کر نہ پکارو۔

ابو نعیم نے الدلائل میں ضحاک کی سند سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ (دیہاتی اعرابی لوگ) یا محمد یا ابا القاسم کہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس حکم کے بعد وہ لوگ یا نبی اللہ یا رسول اللہ کہہ کر خطاب کرنے لگے۔ یہ تشریح آیت کے سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے کیونکہ پچھلا کلام تو اجازت طلب کرنے نہ کرنے کے سلسلہ میں تھا (اور یہاں رسول کو پکارنے اور بلانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دونوں کلاموں میں کوئی ربط نہیں) اس کے علاوہ نفس عبارت بھی اس مطلب سے انکار کرتی ہے کیونکہ دعاء بعضکم بعضا مشبہ بہ ہے اور اس میں لفظ بعض (اول) فاعل ہے دعا کی اس کی طرف اضافت ہے۔ کیونکہ بعضاً منصوب ہے اس لئے یقینی طور پر مفعول ہے پس عبارت کا تقاضا ہے کہ دعاء الرسول (مشبہ) میں بھی دعا کی اضافت فاعل کی طرف ہو۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباس نے آیت کا (تشریحی) معنی اس طرح بیان کیا (تم اللہ کے رسول کو ناراض نہ کرو) تم کو ان کی بددعا سے ڈرتے رہنا چاہئے ان کی بددعا موجب (عذاب) ہے دوسروں کی بددعا کی طرح نہیں ہے)

بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ یہودی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور کہا السام علیک (تم پر ہلاکت ہو تم کو موت آجائے) حضور ﷺ نے فرمایا و علیکم (اور تم پر بھی) حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ السام علیکم ولعنۃ اللہ و غضب علیکم (تم کو موت آئے تم پر اللہ کی لعنت ہو اور غضب ٹوٹے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ عائشہ! نرمی کرو۔ نرم کلام اختیار کرو سخت کلامی اور بیہودہ بات کہنے سے پرہیز رکھو۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کیا آپ نے نہیں سنا کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ فرمایا کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے ان کو کیا جواب (لوٹا کر) دیا تھا میری دعا ان کے بارے میں قبول ہو جائے گی اور ان کی دعا میرے بارے میں قبول نہ ہو گی۔

میں کہتا ہوں اس مطلب پر علیکم کا لفظ محذوف قرار دیا جائے گا اور اصل کلام اس طرح ہو گا لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ علیکم كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (مادۂ دعا کے بعد اگر علی آتا ہے تو بددعا کا معنی ہوتا ہے اور اگر اس کے بعد لام آئے مثلاً لہم لک لہ لی وغیرہ تو اچھی دعا کا معنی ہو گا اور کوئی صلہ یعنی رابط اور حرف جر نہ ہو تو پکارنے بلانے اور اچھی بری دعا کرنے کا معنی ہو گا۔ مترجم)۔

مگر اس تفسیر پر یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم میں سے چھوٹے بڑوں کو پکارتے ہیں اور بڑے کبھی ان کو پکار کر قبول کرتے ہیں کبھی ان کی درخواست رد کر دیتے ہیں۔ تم ان کی طرح رسول کی دعا کو نہ سمجھو رسول جب اپنے رب سے کوئی دعا کرتے ہیں تو ان کی دعا رد نہیں کی جاتی ضرور قبول ہوتی ہے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ تم میں سے جو لوگ (دوسروں کی) آڑ لے کر چپکے سے سرک جاتے ہیں اللہ ان سے واقف ہے۔

سل چپکے سے کسی چیز کو کسی چیز میں سے کھینچ لینا اور پوشیدہ طور پر نکال لینا۔ پوشیدہ چوری پر اس کا اطلاق اسی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ سل البعیر فی جوف اللیل رات میں اونٹ چپکے سے پوشیدہ طور پر نکل کر چلا گیا۔ انسل اور استل بھی اس کا ہم معنی ہے کذافی القاموس۔

لواذا۔ لواذ باب مفاعلۃ کا مصدر ہے لاوذیلا وذلواذا۔ مجرد کا مصدر لیاذا آتا ہے اس لئے ثلاثی مجرد کا مصدر نہیں ہے۔ لیاذ کا معنی ہے دوسرے کی پناہ پکڑنا دوسرے سے چمٹ جانا دوسرے کے ساتھ مل جانا ایک منقول دعا میں آیا ہے اللھم الوذبک اے اللہ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں لواذ (باب مفاعلت سے مشارکت کو چاہتا ہے) کا معنی یہ ہے کہ ایک دوسرے کی اور دوسرا پہلے کی پناہ میں چلا جائے (باہم ایک دوسرے کی آڑ پکڑ لیں) آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ چھپ کر نکل جاتے ہیں ایک دوسرے کی آڑ لے کر سرک جاتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جن لوگوں کو جانے کی اجازت مل جاتی ہے ان کی آڑ لے کر انکے ساتھ یہ بھی نکل جاتے ہیں۔

قاموس میں ہے لوذ، لواذ کی طرح کسی چیز کے ذریعہ سے چھپ جانا آڑ پکڑ لینا۔

خندق کی کھدائی کے وقت منافقوں کی بھی یہی حالت تھی جیسا کہ ابن اسحاق اور بیہقی نے عروہ اور محمد بن کعب قرظی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ منافق پوشیدہ طور پر رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے جاتے تھے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا جمعہ کے دن مسجد میں ٹھہرنا اور رسول اللہ ﷺ کا خطبہ سننا گوارا نہ تھا اس لئے بعض صحابہ کی آڑ لے کر مسجد سے پوشیدہ طور پر نکل جاتے تھے۔

قدیعلم اللہ اللہ جانتا ہے یعنی اللہ سزا دے گا سزا علم کے بعد ہوتی ہے (اس لئے علم کا لفظ بول کر سزا مراد لی)

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۶۳

پس جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ ان پر (دنیا میں) کوئی آفت (نہ) آن پڑے یا (آخرت میں) ان پر کوئی دردناک عذاب (نہ) آجائے۔

عن امرہ میں بعض کے نزدیک عن زائد ہے (کیونکہ یخالفون کا باب بغیر وساطت کے خود متعدی ہے اس کا صلہ عن نہیں آتا) مطلب یہ ہے کہ مخالف سمت کو چلتے ہیں۔

بعض علماء نے کہا مخالفت کے اندر اعراض کا مفہوم داخل ہے لفظ عن اسی اعراض پر دلالت کر رہا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی طرف سے کتراتے ہیں۔ خالفہ عن الامر اس سے اعراض کیا کترا لیا۔ اس صورت میں مفعول محذوف ہوگا۔ عن امرہ کی ضمیر یا اللہ کی طرف راجع ہے یا رسول کی طرف۔

فتنۃ بر قول مجاہد فتنہ سے مراد ہے دنیوی مصیبت اور دکھ اور عذاب الیم سے مراد ہے آخرت کا عذاب۔

یعنی جو لوگ اللہ کے امر کے خلاف راہ اختیار کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان پر کوئی دنیوی آفت و مصیبت آپڑے یا عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں۔

کچھ علماء قائل ہیں کہ اگر امر کے واجب ہونے یا مستحب ہونے وغیرہ کا کوئی قرینہ نہ ہو (اور قرینہ سے کسی معنی کی تعیین نہ ہوتی ہو) تو (اصل لغت کے لحاظ سے) امر وجوب کے لئے ہوتا ہے مطلق امر مشترک نہیں ہے نہ وجوب و استحباب کے درمیان جیسا کہ امام شافعی کہتے ہیں نہ وجوب استحباب اور اباحت کے درمیان نہ وجوب استحباب اباحت اور تہدید کے درمیان جیسا کہ شیعہ قائل ہیں (خلاصہ یہ کہ صیغۂ امر کی وضع حقیقی وجوب کے لئے ہے دوسرے معانی میں استعمال مجازی ہے جو قرینہ پر موقوف ہے لفظ امر مشترک بین المعانی نہیں ہے) شیعہ کے قول کے مطابق ہی ابن شریح کا قول بھی روایت میں آیا ہے۔

مطلق امر کو جو لوگ وجوب کے لئے کہتے ہیں ان کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے کیونکہ آیت میں مخالفت امر کی صورت میں دنیوی مصیبت اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ خوف مصیبت اور عذاب کا ڈر ترک واجب یا ارتکاب حرام کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ خوب سن لو کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ در حقیقت اللہ ہی کا ہے یعنی اللہ ہی اس کا خالق و مالک ہے۔

قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِؕ تم جس حالت پر ہو وہی اس کو جانتا ہے یعنی ایمان ہو یا نفاق موافقت امر ہو یا مخالفت۔ یہ تمام مکلفین کو خطاب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف منافقوں کو خطاب ہو اور قد یعلم سے سابق مضمون کی تاکید مقصود ہو کیونکہ جو ذات ساری کائنات کی خالق اور مالک ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ تمام مخلوقات و مملوکات کے احوال سے واقف بھی ہو گی۔

وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْاؕ اور جس روز لوگ اللہ کی طرف لوٹا کر لائے جائیں گے (اس روز) اللہ ان کو ان کے کئے ہوئے اعمال سے آگاہ کر دے گا۔ یعنی اچھے برے عمل کی جزا و سزا پوری پوری دے گا۔

فینبئهم میں ف زائد ہے اور یوم یرجعون ینبئهم کا ظرف (مفعول فیہ) ہے۔ جیسے آیت لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ میں (لایلاف کا تعلق لیعبدوا سے ہے اور فلیعبدوا میں ف زائد ہے)۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠ اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے یعنی کوئی چھپی چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

بغوی نے حضرت عائشہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کو بالاخانوں پر نہ رکھو اور ان کو لکھنا نہ سکھاؤ (بلکہ) ان کو چرخہ کی اور سورت نور کی تعلیم دو۔ اللہ نے اللہ کے رسول ﷺ نے اور صحابہ کرام نے سچ فرمایا۔

الحمد للہ، سورت نور کی تفسیر ۲۶ رمضان ۱۲۰۴ھ کو ختم ہوئی اس کے بعد انشاء اللہ سورۂ فرقان کی تفسیر آرہی ہے۔

بعون اللہ و حمدہ سورۂ نور کی تفسیر کا ترجمہ ۲۵ رجمادی الثانیہ ۱۳۹۰ھ کو ختم ہوا۔

فالحمد قبل له والحمد بعدله والصلوٰة علی رسوله محمد و اتباعه

سورۃ الفرقان

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۷۷ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تَبٰرَكَ بڑی خیر والا ہے۔[1]

تبارک (باب تفاعل کا ماضی ہے لیکن اس) کی صرفی گردان نہیں آتی اس کا استعمال صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے یہ لفظ برکت سے بنایا گیا ہے برکت کا معنی ہے کثرت خیر یعنی اس کی خیر کثیر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی ہر خیر اسی کی طرف سے آئی ہے کذا قال حسن بعض علماء نے تبارک کا ترجمہ کیا وہ ہر چیز سے بڑھ چڑھ کر ہے اور اپنی صفات وافعال میں سب سے اعلیٰ وبالا ہے برکت کے معنی کے اندر زیادتی کا مفہوم داخل ہے اسی لئے ضحاک نے اس لفظ کا ترجمہ کیا وہ عظمت والا ہے۔

الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ وہ جس نے قرآن اپنے بندے (یعنی محمد ﷺ) پر تھوڑا تھوڑا (تدریجاً) اتارا۔

فرقان مصدر ہے فرق بین الشیئین دو چیزوں کو الگ الگ کر دیا۔ قرآن کو فرقان کہنے کی یہ وجہ ہے کہ یہ اپنے بیان سے حق وباطل کو الگ الگ کر دیتا ہے اور اپنے اعجاز سے اہل حق واہل باطل میں فرق کر دیتا ہے یا فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ (پورے قرآن کا نزول یکدم نہیں ہوا بلکہ) تھوڑا تھوڑا الگ الگ مختلف اوقات ومقامات میں نازل ہوا۔

چونکہ قرآن کے اندر خیر کثیر ہے اور اللہ کا برتر واعلیٰ ہونا اس سے ثابت ہے اس لئے قرآن نازل کرنے والے کو خیر کثیر کا مالک قرار دیا۔ اور تبارک فرمایا۔

---

[1] امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عمرؓ بن خطاب کا بیان نقل کیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا اور کان لگا کر سنا تو محسوس کیا کہ ہشام ان کثیر الفاظ پر سورۂ فرقان پڑھ رہے ہیں جن پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھایا تھا (کثیر الفاظ سے غالباً مراد الفاظ کے ادا کرنے کی کیفیت ہے جیسے امالہ اشمام وغیرہ۔ حروف کثیرہ کے مفہوم کی تشریح میں علماء کے ۲۱ را قوال آئے ہیں اس فقیر کی نظر میں کیفیت ادا مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ واللہ اعلم۔ مترجم) قریب تھا کہ نماز ہی میں میں ان پر جا کودوں لیکن میں رکا رہا۔ جب انہوں نے سلام پھیر دیا تو فوراً جا کر ان کا گریبان پکڑ لیا اور دریافت کیا۔ یہ سورت جو تم پڑھ رہے تھے تم کو کس نے پڑھائی تھی۔ ہشام نے کہا رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ میں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو مجھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس قرأت کے خلاف پڑھائی تھی جو تم نے پڑھی۔ غرض میں ہشام کو کھینچتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گیا اور عرض کیا میں نے ان کو سورۂ فرقان ان طریقوں سے پڑھتے سنا جن کے مطابق حضور ﷺ نے مجھے یہ سورۃ پڑھائی تھی۔ حضور ﷺ نے ہشام سے فرمایا ہشام پڑھو ہشام نے جس طریقے سے پہلے پڑھا تھا اسی طریقے سے پڑھ کر سنا دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسی طرح ہے یونہی نازل کی گئی پھر مجھ سے فرمایا تم پڑھو۔ حسب الحکم میں نے اس طریقے سے یہ سورت پڑھی جس طریقہ سے حضور ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔ فرمایا یہ اسی طرح نازل ہوئی یہ قرآن سات حرفوں (لہجوں یا طرق ادا وغیرہ) پر نازل ہوا ہے تم کو جو طریقہ سہل معلوم ہو اس طریقہ سے پڑھو۔ (مؤلف)

لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝۱ تاکہ وہ (یعنی عبد یا فرقان سارے) جہانوں کے لئے (یعنی تمام جن و انس کو مخالفت اور اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والا ہو۔

عالمین سے مراد ہیں جنات اور انسان کیونکہ خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رسالت جنات اور انسانوں کے لئے عام تھی۔ نذیر بمعنی منذر (ڈرانے والا) یا بمعنی انذار (مصدر ڈرانا) جیسے نکیر بمعنی انکار آتا ہے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہ اللہ کہ اسی کا اقتدار آسمانوں اور زمین میں ہے۔

وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا اور اس نے (اپنے لئے) کوئی بیٹا نہیں اختیار کیا (جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا تھا)۔

وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ اور نہ حکومت میں کوئی اس کا ساجھی ہے جیسا کہ مجوسی اور ثنویہ فرقہ والے کہتے ہیں (مجوسی اور ثنویہ فرقہ والے دو خالق مانتے ہیں۔ ایک خیر اور بھلائی کا خالق، دوسرا شر اور برائی کا خالق، مجوسی اول خالق کو یزداں اور دوسرے کو اہر من کہتے ہیں)۔ اس آیت میں اللہ نے اپنے لئے اقتدار مطلق ہونے کا اظہار فرمایا اور اس کی دلیل پر آئندہ آیت میں تنبیہ فرمائی۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ اور اسی نے ہر چیز پیدا کی۔ یعنی ایک خاص اندازے کے ماتحت ہر چیز کو نیستی سے ہستی میں لایا۔ مثلاً انسان کو خاص مادہ سے مخصوص معین شکل دے کر پیدا کیا۔

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝۲ پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا۔

یعنی اس کو ٹھیک بنایا جو خواص و افعال اس میں پیدا کرنا مقصود تھا اسکے مطابق اس چیز میں تخلیقی صلاحیت پیدا کر دی۔ جیسے انسان میں فہم، ادراک غور و فکر، تدبیر، نوع در نوع صنعتوں کے اختراع اور گوناگوں افعال و اعمال پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔

یا یہ مطلب ہے کہ معین و مقرر وقت تک باقی رکھنا اس کے لئے مقدر کر دیا۔ کبھی لفظ خلق کے مفہوم اشتقاقی سے قطع نظر کر کے صرف ایجاد کے معنی میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ اللہ ہر چیز کو عدم سے وجود میں لایا پھر اس کی ایجاد میں ایک قدر خاص کا لحاظ رکھا تاکہ تفاوت نہ ہونے پائے۔

بعض علماء نے قدر کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے لئے مدت زندگی عمل اور رزق پہلے سے ہی مقدر کر دیا۔ اب (اس دنیا میں آکر) یہ تینوں چیزیں تخلیق کے مطابق ہوتی ہیں۔ (اللہ کے اندازہ تخلیقی کے خلاف نہیں ہو سکتیں) چونکہ توحید و نبوت کے اثبات کا مفہوم (زیر ذکر) کلام کے اندر تھا اس لئے جو لوگ ان دونوں کے منکر تھے ان کے عقائد و اقوال کی ذیل کی آیت میں تردید فرمائی (اول) باطل معبودوں کا نقص ظاہر فرمایا (پھر نبوت پر ان کو جو بیہودہ اعتراض اور شبہ تھا اس کا ازالہ کیا)

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ

اور بنا رکھے ہیں انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود ان کو پیدا کیا جاتا ہے۔

اتخذوا یعنی کفار مکہ نے بنا رکھے ہیں۔

من دونہ اللہ کے سوا۔

لا یخلقون شیئا جو نہ کسی جوہر کو پیدا کرتے نہ عرض کو نہ عمل و فعل کو نہ حالت کو۔[1]

وھم یخلقون اور وہ پیدا کئے جاتے ہیں وہ مخلوق ہیں اللہ سب کا خالق ہے۔ عبارت کے الفاظ و معانی میں عموم ہے تمام

[1] جو ممکن خود مستقل بالذات ہوا اپنے وجود خارجی میں دوسرے کا محتاج نہ ہو اس کو جوہر کہتے ہیں جیسے تمام اجسام اور وجود خارجی میں اگر دوسرے کا محتاج ہو تو اس کو عرض کہتے ہیں جیسے سیاہی، سرخی جسم کی محتاج ہے۔

باطل معبودوں کو یہ لفظ شامل ہے لیکن مراد صرف بت ہیں۔ اس لئے یخلقون کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ پجاری خود اپنے بتوں کو تراشتے اور صورتیں بناتے ہیں۔

وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا اور وہ خود نہ اپنے ضرر پر قابو رکھتے ہیں نہ نفع پر۔ یعنی اگر اللہ ان کو دکھ پہنچانا چاہے تو وہ دکھ کو دفع نہیں کر سکتے۔ اگر مکھی ان سے کوئی چیز اڑا کر لے جائے تو وہ چھڑا نہیں سکتے اور نہ فائدہ حاصل کرنے کی ان میں قدرت ہے۔

نفع و نقصان پر قادر نہ ہونا صرف بتوں ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ عالی مرتبہ پیغمبر جیسے حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر اور تمام فرشتے بھی عاجز ہیں اللہ نے فرمایا ہے قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ۔

وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا ۝ اور نہ وہ قابو رکھتے ہیں موت پر نہ زندگی پر نہ (دوبارہ) اٹھنے پر یعنی ان میں قدرت نہیں کہ کسی پر موت کو مسلط کر سکیں یا کسی کو (ابتداء) زندگی دے سکیں یا (مرنے کے بعد) دوبارہ زندہ کر کے اٹھا سکیں۔ اور یہ تمام امور الوہیت کے لوازم ہیں جس کے اندر یہ لوازم نہیں وہ الہ نہیں ہو سکتا۔ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ الہ کے لئے ضروری ہے کہ دوبارہ زندہ کر کے سزا و جزا دے سکے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا اور کافروں نے کہا۔

صراحت کے ساتھ کفروا کہنے میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ انکار توحید کی طرح انکار نبوت بھی کفر ہے۔ کیونکہ (خالص) توحید تک پہنچنے کے لئے تنہا عقل کافی نہیں ہے بلکہ حقیقی توحید وہ ہے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے۔ فلاسفہ اور متبعین نے الٰہیات (یعنی مافوق الطبیعیات مسائل) میں بہت سے غوطے کھائے ہیں راہ حقیقت سے واقف نہ تھے اس لئے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس کی روایت سے قبیلہ عبدالقیس کے وفد کے قصہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ کے ماننے کے معنی کیا ہیں۔ اہل وفد نے کہا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بخوبی واقف ہے فرمایا (اللہ کی توحید کو) ماننا یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دو۔

إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ کہ یہ تو کچھ بھی نہیں نرا جھوٹ ہے۔

ھذا یعنی قرآن جو محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں۔

افک جھوٹ کا رخ (حق و صداقت کی سمت سے) پھیر دیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ محمد نے خود گھڑ لیا ہے (یہ محمد ﷺ کا خود تراشیدہ ہے)۔

وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ اور اس کام میں کچھ دوسرے لوگوں نے ان کی مدد کی ہے۔

مجاہد نے کہا قوم اخرون سے ان کی مراد تھی یہودیوں کی ایک جماعت۔ حسن نے کہا ایک حبشی (غلام) مراد تھا جس کا نام عبید بن الحصر تھا۔ یہ کاہن تھا۔ بعض نے کہا مکہ میں کچھ غلام تھے جن کے نام تھے، جبر، یسار، عداس۔ یہ لوگ کتابی تھے، قوم آخرون سے یہی لوگ مراد تھے۔

مشرکوں کا خیال تھا کہ محمد ان سے ہی قرآن سیکھ لیتے ہیں۔

فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ۝ پس بلاشبہ انہوں نے بہت ہی بے جابات کی اور جھوٹ (کہا)۔

ظلم (بے جا حرکت) یہ کہ اللہ کے کلام کو یہودیوں سے سیکھا ہوا من گھڑت کلام قرار دیا اور زور (جھوٹ) یہ بنایا کہ ایسے شخص کو تہمت تراش اور دروغ باف قرار دیا جو قطعاً ان کے الزامات سے پاک تھا۔

بیضاوی نے لکھا، لفظ جاء، یا اتی کا استعمال فعل (کیا) کے معنی میں بھی ہوتا ہے اس وقت یہ فعل متعدی بنفسہٖ ہو جاتے

ہیں۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اور (کافر) کہتے ہیں کہ یہ تو بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں۔

یعنی ان میں سے بعض نے جیسے نضر بن حارث نے کہا کہ قرآن اللہ کا بھیجا ہوا نہیں ہے بلکہ پچھلے گزرے ہوئے لوگوں کی لکھی ہوئی داستانیں ہیں۔ جیسے رستم واسفندیار کے قصے ہیں۔

اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۝ (محمد ﷺ نے) یہ لکھوالی ہیں، پس صبح و شام ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

یعنی جبر، یسار، عداس وغیرہ سے رسول اللہ ﷺ نے لکھوالی ہیں، خود اُمّی ہیں لکھ پڑھ نہیں سکتے صبح و شام پڑھوا کر سن لیتے ہیں تاکہ یاد رکھ سکیں۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ آپ (ان کے قول کی تردید میں) کہہ دیجئے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ) اس کو اس خدا نے اتارا ہے جو آسمانوں کی اور زمین کی چھپی باتوں کو جانتا ہے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے مقابل بڑے بڑے زبان آور اہل ادب عاجز ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کلام کے اندر ایسے علوم ہیں جن سے وہی ذات واقف ہو سکتی جو ہر پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والی ہو (اور چونکہ کوئی گزشتہ موجودہ انسانی ہستی ایسی نہیں جو ان علوم سے واقف ہو) اس لئے یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝ بلاشبہ وہ بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے اسی لئے باوجود کامل قدرت کے تم کو اس نے اب تک عذاب نہیں دیا حالانکہ تم مستحق عذاب ہو۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ اور ان (کافر) لوگوں نے کہا یہ کیسا رسول ہے کہ (ہماری طرح) کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

یعنی یہ رسول ہوتا تو اس کی دوسرے انسانوں سے کوئی امتیازی حیثیت ہوتی (کھانے پینے کی اس کو ضرورت نہ ہوتی۔ اور بازاروں میں کبھی نہ گھومتا اور جب اس کی یہ امتیازی حیثیت نہیں ہے تو یہ رسول بھی نہیں ہے)۔

بغوی نے لکھا ہے کافر کہتے تھے تم فرشتہ نہیں ہو۔ فرشتہ کھاتا پیتا نہیں اور تم کھاتے پیتے ہو۔ اور تم بادشاہ بھی نہیں ہو بادشاہ بازاروں میں نہیں گھومتا پھرتا اور تم گھومتے پھرتے ہو۔

میں کہتا ہوں یہ بات غلط ہے رسول اللہ نے تو نہ کبھی فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور نہ بادشاہ ہونے کا (پھر کافر اس کی تردید ہی کیوں کرتے) بلکہ آپ نے تو فرمایا تھا اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ میں تم جیسا انسان ہوں (مگر) میرے پاس وحی آتی ہے۔ آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور نبوت کا دعویٰ کھانا کھانے اور بازاروں میں چلنے پھرنے کے منافی نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مقتضائے بشریت ہیں اور بشریت نبوت کے لئے لازم ہے افادہ اور استفادہ کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہے اللہ نے فرمایا اگر زمین پر ملائکہ (آباد) ہوتے، اطمینان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ ہی رسول اتارتے (انسانوں کے لئے انسان ہی پیغمبر ہونا چاہئے)

لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا۝ اس کے پاس فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا۔

یعنی یہ کیسا رسول ہے کہ نہ تو یہ فرشتہ ہے کہ اس کو اپنی ذاتی قوت حاصل ہوتی نہ اس کے ساتھ کوئی تائید کرنے والا فرشتہ بھیجا گیا ہے کہ فرشتہ کی تصدیق سے ہم اس کی سچائی جان لیتے۔

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ یا (آسمان سے) اس کی طرف کوئی خزانہ

ڈال دیا جاتا (کہ وہ خرچ کرتا رہتا اور معاش کی طلب میں بازاروں میں گھومنے پھرنے کا محتاج نہ رہتا) یا اس کا کوئی باغ ہی ہوتا جس کے پھل وہ کھالیا کرتا (اور روزی پیدا کرنے کا ضرورت مند نہ رہتا)

مذکورہ بالا عبارت میں کافروں نے تین اقوال کا ذکر کیا اور تنزلی ترتیب کے ساتھ کیا۔ اول یہ کہ رسول فرشتہ کیوں نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ فرشتہ نہیں بھی ہوتا تو کم از کم کوئی فرشتہ تصدیق کرنے والا اس کے ساتھ ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر ایسا بھی نہیں ہوا تو کم از کم اس کی روزی کا کوئی انتظام ہی ہوتا۔ (جس کی دو صورتیں تھیں ایک غیبی اور دوسری ظاہری غیبی تو یہ کہ) اس کے پاس آسمان سے کوئی خزانہ آجاتا اور (ظاہری یہ کہ) یا اس کے پاس کھانے اور روزی حاصل کرنے کے لئے کوئی باغ ہوتا۔ جیسے زمین داروں اور مالدار لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ⑧ اور ظالموں نے (یہ بھی) کہا کہ تم لوگ محض جادوزدہ آدمی کا ساتھ دے رہے ہو جادو کی وجہ سے اس کی عقل ماری گئی ہے۔ (پاگل ہو گیا ہے)

کافروں کی طرف سے یہ خطاب مسلمانوں کو تھا۔ بعض علماء نے مسحور کا ترجمہ کیا ہے فریب خوردہ بعض نے ترجمہ کیا حق سے پھرا ہوا بعض نے کہا اسم مفعول بمعنی فاعل ہے۔ یعنی جادوگر۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ (اے محمد ﷺ) آپ دیکھیے یہ آپ کے لئے کیسی عجیب عجیب باتیں بیان کررہے ہیں۔

امثال بمعنی اشباہ، یعنی انہوں نے آپ کو جھوٹے افتراپردازوں اور بیہودہ قصہ بیان کرنے والوں کی طرح قرار دے رکھا ہے یہی تو وجہ ہے کہ وہ آپ کو مفتری اور دوسروں سے افسانے لکھوانے والا کہتے ہیں۔ اور (کبھی) سحر زدہ لوگوں کی طرح (بدحواس پاگل) کہتے ہیں اور (کبھی) فرشتہ ہونے یا بادشاہ ہونے کے مدعی کی طرح قرار دیتے ہیں اور (یہ مان کر کہ آپ کو اپنے فرشتہ ہونے اور بادشاہ ہونے کا دعویٰ ہے) کہنے لگتے ہیں کہ فرشتہ کا کھانا کھانا اور بازاروں میں گھومنا ناممکن ہے اور بادشاہ نیز دولت مندوں کے پاس خزانے اور باغات ہونے چاہئیں اس لئے آپ کا دعویٰ ملوکیت غلط ہے۔

فَضَلُّوْا پس (دیکھو یہ کس طرح) گمراہ ہو گئے حق تک پہنچانے والا راستہ اور آپ کی نبوت کو پہچاننے کا طریقہ تو یہ تھا کہ انبیاء کی خصوصیات کو پہچانتے کہ وہ بھی انسان ہوتے ہیں غلطیوں سے معصوم ہوتے ہیں ان کے پاس رب کی طرف سے وحی آتی ہے ان کو معجزات دیئے جاتے ہیں جن سے جھوٹے مدعیان نبوت اور سچے انبیاء میں امتیاز ہو جاتا ہے۔

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ⑨ اب ان کو (ہدایت کا) راستہ نہیں مل سکتا یا یہ مطلب ہے کہ جب ان کی تمثیلات و تشبیہات میں خود تناقص اور تضاد ہے تو پھر آپ کی نبوت پر جرح و قدح کرنے کا ان کو کوئی راستہ نہیں مل سکتا کیونکہ جو کلام خود ہی متناقض ہو وہ ساقط الاعتبار ہوتا ہے۔

ع ۱ ۹ ۱۶

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے نیز ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت خثیمہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ (اللہ کی طرف سے) رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو زمین کے خزانے اور خزانوں کی کنجیاں عطا کردیں اور اس سے آپ کے اس اجر میں کمی نہ ہوگی جو قیامت کے دن ہمارے پاس سے آپ کو ملے گا اور اگر آپ چاہیں تو اس (نعمت) کو بھی ہم آخرت (کی نعمتوں) کے ساتھ جمع کردیں حضور ﷺ نے جواب دیا نہیں (میں یہاں لینا نہیں چاہتا) میرے لئے آخرت میں دونوں (نعمتوں) کو جمع کرلیا جائے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑩

بڑی برکت والا ہے وہ اللہ کہ اگر وہ چاہے تو آپ کے لئے اس سے بہتر (دنیا ہی میں) نعمتیں عطا فرمادے۔ (یعنی) ایسے باغ جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہوں (آپ کو دیدے) اور آپ کے لئے محلات (تیار) کردے۔

یعنی خزانوں اور باغوں سے بہتر نعمتیں دنیا میں ہی اگر اللہ دینا چاہے تو وہ دیدے لیکن اس نے یہ چیزیں آپ کے لئے آخرت میں مقرر کردی ہیں۔

بغوی نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس سے یعنی بازاروں میں گھومنے اور معاش کی تلاش میں پھرنے سے بہتر عنایت کردے۔

قصورا مضبوط مکان عرب ہر پختہ مکان کو قصر کہتے ہیں۔

امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے وادیٔ مکہ کو میرے لئے سونا بنادینے کی مجھ سے پیش کش کی میں نے عرض کیا نہیں میرے رب میں تو ایک دن سیر شکم ہوں اور ایک دن بھوکا رہوں (یہی مجھے پسند ہے) جب میں بھوکا ہوں تو تیرے سامنے زاری کروں اور سیر شکم ہوں تو تیری تعریف اور شکر کروں۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں چاہتا تو میرے ساتھ سونے کے پہاڑ چلتے۔ ایک فرشتہ جس کی کمر کعبے کے برابر تھی میرے پاس آیا اور اس نے کہا آپ کا رب آپ کو سلام فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو نبی اور) بندہ (غلام) رہیں اور اگر چاہیں تو نبی اور بادشاہ ہو جائیں میں نے جبرئیلؑ کی طرف دیکھا۔ جبرئیلؑ نے اشارہ کیا کہ اپنے آپ کو نچلا رکھو۔ میں نے کہہ دیا میں نبی اور بندہ (غلام) رہنا چاہتا ہوں۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ تکیہ لگائے کھانا نہیں کھاتے تھے اور فرماتے تھے میں غلاموں کی طرح کھاتا ہوں اور غلاموں کی طرح بیٹھتا ہوں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ بلکہ انہوں نے قیامت کی تکذیب کی۔

(یعنی وقوع قیامت کا یقین نہیں کیا) اس جملہ کا عطف قالوا پر ہے (اور بل کا استعمال ترقی کے لئے) مطلب یہ ہے کہ (انہوں نے صرف اول الذکر بات ہی نہیں کہی) بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات کہی، یا اس آیت کا تعلق گزشتہ متصل آیت سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ آپ کو مفلسی کا طعن دے کر اور دوسرے بیہودہ طنز کر کے صرف آپ ہی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ان کی نظریں محض حقیر سامان دنیا سے آگے نہیں بڑھتیں ان کا خیال ہے عزت کی چیز صرف مال ہے یا یہ معنی ہے کہ یہ قیامت کو ہی نہیں مانتے پھر اس جواب کی طرف التفات ہی کیسے کریں گے اور آخرت میں اللہ نے جن نعمتوں کے دینے کا آپ سے وعدہ کیا ہے اس کو سچا کیسے جانیں گے یا یہ معنی ہے کہ آپ اس پر تعجب نہ کریں کہ وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ تعجب انگیز یہ بات ہے کہ وہ وجود قیامت کی تکذیب کرتے ہیں۔

وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾ اور ہم نے تیار کر رکھی ہے تکذیب کرنے والوں کے لئے سخت بھڑکتی آگ۔

بعض علماء نے کہا سعیر ایک دوزخ کا نام ہے۔

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ جب وہ آگ ان کو دور کے مقام سے دیکھے گی۔

بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ آگ کی طرف دیکھنے کی نسبت حقیقی ہے (واقع میں آگ دیکھے گی) بغوی نے لکھا ہے، ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر جو کوئی شخص قصداً دروغ بندی کرے اس کو اپنی جگہ آگ کی دونوں آنکھوں کے درمیان بنا لینی چاہئے۔ صحابہ نے عرض کیا کیا آگ کی بھی آنکھیں ہوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ نے فرمایا ہے اذا راتهم من مكان بعيد۔

بعض علماء نے کہا آگ کی طرف دیکھنے کی نسبت مجازی ہے یعنی دوزخ کے فرشتے دیکھیں گے یا یہ مطلب ہے کہ آگ اتنی دوری پر ہوگی کہ دیکھی جاسکے گی۔ ایک حدیث میں آیا ہے ان دونوں کے آپس میں اتنی مسافت ہوگی کہ دکھائی نہیں پڑے

گی۔ یعنی دونوں میں اتنا فاصلہ نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ (بلکہ فاصلہ بہت ہوگا)۔
مکان م بعید کی تشریح میں کلبی نے کہا سو سال کی راہ۔
بعض نے کہا پانچ سو برس راہ کی مسافت۔

سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيرًا ﴿۱۲﴾ تو وہ (کافر) سنیں گے اس آگ کے غضبناک ہونے کی آواز اور غراہٹ

تغیظ جوش مارنے کی آواز جو غضبناک آدمی کی غصیلی آواز کی طرح ہو۔
زفیر پیٹ کے اندر کی گڑگڑاہٹ، غراہٹ

وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ﴿۱۳﴾

اور جب ان کو دوزخ کے تنگ مقام میں باندھ کر جکڑ کر ڈالا جائے گا تو وہاں وہ ہلاکت (یعنی موت) کو پکاریں گے۔
تنگ مقام میں ڈالے جانے کی غرض ہوگی عذاب کی شدت تنگی میں بے چینی اور وسعت مکان میں کچھ راحت ہوتی ہی ہے۔ ابن ابی حاتم نے یحییٰ بن اسید کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان کو دوزخ میں اس طرح ٹھونسا جائے گا جیسے دیوار میں میخ۔
حضرت ابن عمر کی روایت میں آیا ہے جیسے برچھے بوری میں۔
ابن مبارک نے بطریق قتادہ بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے کافروں پر دوزخ کی ایسی تنگی ہوگی جیسے نیزے بوری میں۔
ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ جب ان لوگوں کو جن کو ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے دوزخ میں ڈالا جائے گا (یعنی ڈالے جانے کا حکم ہوگا) تو اول ان کو لوہے کے صندوقوں میں بند کر کے لوہے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں گی پھر ان صندوقوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر دیا جائے گا۔ پھر جہنم کی تہ میں ان کو پھینک دیا جائے گا پس کوئی بھی سوا اپنے کسی دوسرے کو عذاب میں مبتلا دیکھ نہ سکے گا۔
سوید بن غفلہ کی روایت سے بھی ابو نعیم اور بیہقی نے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔
مقربین یعنی گردن سے ہاتھ بندھے ہوئے زنجیروں سے جکڑے ہوئے بعض نے کہا شیطانوں کے ساتھ باندھے گئے۔ شیطانوں کی جٹ میں بندھے ہوئے۔
ثبور (بمعنی ہلاکت یہ ترجمہ ضحاک نے کیا حضرت ابن عباس نے فرمایا ثبورا یعنی ویلا (ویل بمعنی ہلاکت)۔
احمد بزار ابن ابی حاتم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے ابلیس کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا وہ اس لباس کو اپنی دونوں بھنوؤں پر رکھ کر کھینچے گا اور یا ثبور پکارے گا (ہائے میری ہلاکت) اس کی ذریات اس کے پیچھے (اسی طرح کا لباس پہنے) یا ثبور پکارتی ہوگی، آخر سب دوزخ پر جا کر ٹھہریں گے اس وقت ان سے کہا جائے گا۔

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَّاحِدًا وَّادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ﴿۱۴﴾ آج ایک (طرح کی) ہلاکت کو نہ

پکارو بلکہ (طرح طرح کی) بہت ہلاکتوں کو پکارو یعنی تمہاری ایک ہی ہلاکت نہیں بلکہ بہت ہلاکتیں ہیں عذاب کو گونا گوں قسمیں ہیں اور ہر قسم کا عذاب بجائے خود ایک ہلاکت ہے یا یہ وجہ ہے کہ نو بہ نو (بار بار ایک ہی طرح کا) عذاب ہوگا (پس بہت سی ہلاکتیں ہو جائیں گی) اللہ نے فرمایا ہے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ جتنی مرتبہ ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کی (جلی ہوئی) کھالیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔
یا ثبور کثیر کا یہ معنی ہے کہ کسی وقت ہلاکت منقطع نہ ہوگی۔

قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ آپ کہیے کیا یہ بہتر ہے یا دوامی

جنت بہتر ہے جس کا وعدہ مومنوں سے کیا گیا ہے۔
قل اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے
اذلک کیا یہ دوزخ جس کی حالت مذکورہ عبادت میں بیان کی گئی اور دوزخ والے یا ذلک سے اشارہ دنیوی خزانہ اور یہاں کے باغات کی طرف ہے۔
یہ استفہام تقریری ہے جس کے اندر استہزاء اور سرزنش شامل ہے۔
المتقون سے مراد ہیں شرک اور تکذیب سے بچنے والے (یعنی تمام مومن) کیونکہ متقیوں کے مقابلہ میں کفار کا ذکر کیا گیا ہے۔ مومن مراد لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جنت ہر مومن کو ملے گی۔
جنته الخلد میں اس بات پر دلالت ہے کہ جنت ہمیشہ رہے گی۔
كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيرًا ﴿۱۵﴾ ان کے لئے جنت (ان کے اعمال کی) جزا تھی اور (عظیم الشان) لوٹنے کی جگہ۔
یعنی اللہ کے علم میں یا لوح محفوظ میں جنت مومنوں کے اعمال کی جزا تھی یا یوں کہا جائے کہ اللہ کا وعدہ ایسا ہی یقینی الوقوع ہے جیسے کہ واقع ہو گیا۔ (اس کے لئے کانت ماضی کا صیغہ استعمال کیا)۔
جزاء یعنی ثواب اعمال مصیرا لوٹنے کی جگہ جہاں پلٹ کر جائیں گے۔ مصیر امیں تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے۔
لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُونَ خٰلِدِينَ ؕ جو کچھ وہ چاہیں گے جنت میں ان کو ملے گا (یا ان کے لئے موجود ہے) ہمیشہ (وہاں) رہیں گے۔
یعنی اپنے مرتبے کے لائق مومن جنت کے اندر جو کچھ چاہے گا وہ اس کو ملے گا۔ ظاہر ہے کہ ناقص کو وہ نعمت نہیں ملے گی جو کامل کو ملے گی۔ آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ تمام ارمان تو صرف جنت میں ہی پورے ہوں گے (دنیا میں پورے نہیں ہو سکتے)
كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ﴿۱۶﴾ اے پیغمبر یہ ایک وعدہ ہے جو آپ کے رب کے ذمے ہے اور قابل درخواست ہے۔
علی ربک یعنی آپ کے رب پر لازم ہے اور واجب ہے کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا ہے اور وعدۂ خداوندی کے خلاف ہونا ممکن نہیں (یعنی اللہ پر کوئی بات فی نفسہ واجب نہیں وجوب مجبور عاجز پر ہوتا ہے اور خدا ہر عجز سے پاک ہے لیکن اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے وعدہ فرما لیا ہے اس لئے وعدے کو پورا کرنا اس پر لازم ہے پس یہ وجوب اضافی ہے خود اسی کا اختیار کردہ ہے) پہلے ارادے کے ساتھ اس نے وعدہ کیا پھر وعدے کے مطابق ایفاء کو اس نے اپنے اوپر واجب کیا (اس لئے اگر ایفاء وعدہ اس پر واجب ہوا تو اس کے اختیار کے ماتحت ہوا)
مسئولا یعنی وہ مستحق ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور طلب و دعا کی جائے۔ یا اس کے مسئول ہونے کا یہ مطلب ہے کہ لوگ اس سے سوال کرتے ہیں اور مانگتے ہیں اور امید رکھتے ہیں۔ رَبَّنَا اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ اے ہمارے رب ہم کو وہ جنت عطا فرمانا جس کا وعدہ اپنے پیغمبروں کی زبانی ہم سے کیا ہے۔
محمد بن کعب قرظی نے کہا فرشتے ایفاء وعدہ کی اس سے درخواست کریں گے اور کہیں گے رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ۔
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾
اور جس روز اللہ ان کو اور اللہ کے سوا جن کو یہ پوجتے تھے ان کو سب کو اکٹھا کرے گا پھر ان (معبودوں) سے فرمائے گا کیا تم نے میرے بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود ہی راہ حق سے گمراہ ہو گئے

تھے۔

مایعبدون سے مراد ہیں تمام باطل معبود (عقل والے ہوں یا عقل سے محروم کیونکہ زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ لفظ ما دونوں کو شامل ہوا ہے اہل عقل کو اور بے عقل چیزوں کو مجاہد نے سوال وجواب کے قرینہ کا لحاظ کرتے ہوئے کہا کہ اس جگہ ملائکہ، جنات، حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر مراد ہیں۔ عکرمہ ضحاک اور کلبی کے نزدیک صرف اصنام (بت) مراد ہیں کیونکہ (اہل نحو کا مشہور قول یہ ہے کہ) ما کا استعمال بے عقل چیزوں کے لئے ہوتا ہے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے دن اللہ ان بتوں کو زندہ کردے گا اور بولنے پر قدرت عطا کردے گا جس طرح انسان کے ہاتھ پاؤں اور مقامات (گناہ) گویا بنا دیئے جائیں گے۔

اصللتم کیا تم نے گمراہ کیا تھا، یعنی کیا تم نے ان کو اپنی پوجا کی دعوت دی تھی۔

ام ھم صلوا السبیل یا وہ خود معرفت حق کا راستہ کھو بیٹھے تھے۔ انہوں نے خود صحیح غور و فکر نہیں کیا اور ہادیٔ برحق کی نصیحت سے گریز کیا۔ اس سوال کی غرض معبودان باطل کے پرستاروں کو سرزنش اور زجر ہوگی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ

وہ کہیں گے تو پاک ہے ہمارے لئے تو تیرے سوا دوسروں کو کارساز قرار دینا جائز ہی نہ تھا۔ قالوا صیغۂ ماضی بمعنی مستقبل ہے کیونکہ مستقبل میں ان کا یہ بات کہنا یقینی ہے۔

سبحنک یعنی بطور تعجب وہ یہ لفظ کہیں گے کیونکہ معبودان باطل اگر ملائکہ یا انبیاء ہوں گے تو اس سوال پر ان کا تعجب ظاہر ہی ہے۔ اللہ نے ان کو معصوم بنایا تھا ان سے ایسا جرم کیسے سرزد ہو سکتا تھا اور اگر مخاطب، جمادات اور پتھروں وغیرہ کو مانا جائے تب بھی ان کا تعجب صحیح ہے ان کو اللہ کی طرف سے تخلیقاً قدرت ہی نہیں دی گئی۔ پھر وہ کیسے گمراہ کر سکتے تھے ان سے ایسا سوال تعجب انگیز تھا۔

یا ان کو اس بات پر تعجب اس وجہ سے ہوا کہ ہمارے متعلق تو فرمادیا گیا کہ ہم اللہ کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے ہیں اللہ نے فرمادیا ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ پھر ہم کس طرح گمراہ کر سکتے ہیں اور کیونکر شرک کی تعلیم دے سکتے ہیں۔

ماکان ینبغی لنا ہمارے لئے تو یہ بھی جائز نہیں یعنی اللہ نے ہم کو معصوم بنایا ہے یا قدرت ہی نہیں دی اس لئے کسی دوسرے کو اللہ کے سوا ہم اپنا کارساز قرار دیں یہ ہمارے لئے درست ہی نہیں ہے دوسروں کو بہکانے یا گمراہ کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

یہ جواب انبیاء، ملائکہ اور جمادات کی طرف سے ہوگا لیکن جو لوگ خود معبود اور رب بن بیٹھے ہیں خواہ وہ انسان ہوں یا جنات ان کی طرف سے یہ جواب نہ ہوگا بلکہ وہ اس طرح کے جواب دیں گے واللّٰہ ربنا ماکنا مشرکین قسم اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم مشرک نہیں تھے۔ شیطان کہے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا وہ سچا وعدہ تھا اللہ نے وہ پورا کیا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا میرا تم پر کوئی جبر نہ تھا۔ الآیۃ۔

وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾

(لیکن تو نے تو ان کو اور ان کے بڑوں کو آسودگی دی کہ وہ تیری یاد کو بھلا بیٹھے اور یہ لوگ خود ہی برباد ہوئے۔

متعتھم یعنی تو نے ان کو عمر صحت اور طرح طرح کی نعمتوں سے اتنا نوازا کہ وہ خواہشات میں ڈوب گئے اور تیری یاد سے غافل ہو گئے۔ تیری نعمتوں کی یاد ان کو نہ رہی تیری آیات میں غور کرنے سے انہوں نے اعراض کیا اور بھول گئے کہ وہ تیرے محتاج ہیں۔ یاد کر کو بھول جانے کا یہ مطلب ہے کہ نصیحت کو اور قرآن پر ایمان لانے کو انہوں نے ترک کر دیا (انسان کے

لئے ترک لازم ہے ملزوم بول کر لازم مراد لیا۔)

(معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے گناہوں کے پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی جاسکتی چنانچہ گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے کی نسبت اس آیت میں بندوں کی طرف کی گئی ہے اس کا جواب مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا کہ) ضلالت کی نسبت بندوں کی طرف اس لئے کی گئی کہ انسان کاسب گمراہی اور مرتکب گناہ ہے اور اللہ کی طرف ضلالت کی نسبت اس لئے کی گئی کہ اللہ گمراہی کا خالق ہے اور گمراہی کی تخلیق گمراہ ہونے پر آمادہ کرتی ہے اس صورت میں یہ آیت اہل سنت کے مسلک کی تائید کرتی ہے اور معتزلہ کے قول کی تردید۔

وکانوا یعنی تیرے ازلی فیصلے میں ہی یہ لوگ ہلاک ہونے والے تھے۔

بورا مصدر ہے واحد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔ بعض کے نزدیک بورا بائر کی جمع ہے جیسے عوذ عائذ کی جمع ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ پس تمہارے معبود ہی (قیامت کے دن) تمہارے قول کی تکذیب کریں گے۔

یہ خطاب دنیا میں مشرکوں کو ہے۔ یعنی آخرت میں تمہارے معبود تمہارے قول کی تکذیب کریں گے چونکہ قیامت میں ہونے والا واقعہ یقینی تھا۔ اس لئے مستقبل کی تعبیر بصیغۂ ماضی کی جیسے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ میں۔

یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم قیامت کے دن مشرکوں سے کہیں گے کہ تمہارے معبود ہی تم کو جھوٹا قرار دے رہے ہیں۔ بما تقولون یعنی یہ بات جو تم کہتے تھے کہ یہ ہمارے معبود ہیں یا کہتے ہو کہ ہمارے ان معبودوں نے ہم کو گمراہ کیا اس بات کی تکذیب معبودوں نے ہی کر دی۔

فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ سو اب تم نہ (عذاب کو) لوٹانے کی طاقت رکھتے ہو نہ مدد کی۔ یعنی تمہارے معبود نہ عذاب کو پھیرنے کی طاقت رکھتے ہیں نہ تمہاری مدد کرنے کی یا یہ مطلب ہے کہ تم عذاب کو پھیرنے کی طاقت رکھتے ہو نہ اپنی مدد کرنے کی۔ بعض نے کہا صرف کا معنی ہے حیلہ تدبیر، عرب کہتے فلان یتصرف فلاں شخص کچھ حیلہ کرے گا مطلب یہ ہے کہ اب تم نہ کوئی حیلہ کر سکتے ہو نہ مدد۔

وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ اور (اے انسانو) تم میں سے جو کوئی ظلم (یعنی شرک) کرے گا ہم اس کو بڑے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ اس ترجمہ پر ظلم سے مراد ہو گا شرک، اس صورت میں شرک کی سزا یعنی عذاب باتفاق علماء لازم ہے اور اگر ظلم کے اندر فسق کو بھی شامل قرار دیا جائے تو پھر سزا کا لزوم عمومی نہ ہو گا بلکہ عدم مانع کے ساتھ مشروط ہو گا۔ یعنی گناہ کبیرہ کی سزا ضروری نہیں قرار پائے گی توبہ اور طاعت کے بعد بالاتفاق ساقط کر دی جائے گی اور (بغیر توبہ کے بھی) ہمارے نزدیک (برحمت خداوندی یا شفاعت) معاف ہو سکتی ہے۔ واحدی نے بطریق جویبر اور بغوی نے بطریق ضحاک اور ابن جریر نے بروایت سعید و عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ پر مفلس و نادار ہونے کا طنز کیا اور کہا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ تو حضور کو اس سے رنج ہوا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ

اور ہم نے آپ سے پہلے پیغمبر نہیں بھیجے مگر ایسے ہی پیغمبر بھیجے جو یقیناً کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ (یعنی آپ سے پہلے ہم نے اپنے پیغمبر بھیجے وہ کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے) اس میں رسول اللہ ﷺ کے رنج کو دور کرنا اور تسلی دینا مقصود ہے۔

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے مصیبت بنا دیا ہے۔

مال دار کو نادار کے لئے مصیبت بنادیا فقیر کہتا ہے میں اس مال دار کی طرح کیوں نہیں ہوا تندرست بیمار کے لئے مصیبت ہے اور شریف رذیل کے لئے حضرت ابن عباس نے (فتنہ کا معنی آزمائش (بیان کیا اور) فرمایا ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش بنادیا ہے تا کہ جو لوگ تمہارے مخالف ہیں اور تمہاری مخالفت میں باتیں کرتے ہیں اور تم ان کی باتوں کو سنتے اور ان کی مخالفتوں کو دیکھتے ہو تم ان کی اس اذیت رسانی پر صبر کرو اور اپنے سیدھے راستے پر چلتے رہو۔

بعض اہل روایت نے کہا اس آیت کا نزول صرف اونچے اور نیچے کے طبقوں کے سلسلہ میں ہوا اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص مسلمان ہونا چاہتا اور اس سے پہلے کوئی زیریں طبقے کا شخص مسلمان ہو چکا ہوتا تو اس بالا طبقہ کے آدمی کو خیال ہوتا کہ اب اگر میں مسلمان ہوا تو اس ذلیل رذیل مسلمان کو مجھ پر برتری حاصل رہے گی اور مجھے اس کے پیچھے رہنا پڑے گا یہ سوچ کر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا اور مسلمان نہ ہوتا۔ بعض کے بعض کے لئے آزمائش بنائے جانے کا یہی مطلب ہے یہ بیان کلبی کا ہے۔ مقاتل نے کہا اس آیت کا نزول ابو جہل، ولید بن عتبہ عاص بن وائل اور نضر بن حارث کے حق میں ہوا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ حضرت ابوذرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت عامر بن فہیرہؓ مسلمان ہو چکے ہیں کہنے لگے اب اگر ہم مسلمان ہوئے تو ان کے برابر ہونا پڑے گا۔

قتادہ نے کہا قریش مومنوں کا مذاق بناتے تھے او کہتے تھے ذرا محمد کے ساتھیوں کو تو دیکھو جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہے وہ تو ہمارے غلام ہیں کمینے ہیں ذلیل طبقے کے ہیں اللہ نے ان مومنوں کو خطاب کر کے فرمایا۔

أَتَصْبِرُونَ ۚ کیا اس فقر و مصیبت اور کافروں کی طرف سے اذیت پہنچنے پر تم صبر رکھو گے۔ یا صبر نہ رکھو گے، صبر رکھو گے تو اجر پاؤ گے۔ صبر نہ رکھو گے تو غم والوں میں مزید مبتلا ہو گے مطلب یہ کہ صبر رکھو۔

وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ﴿۲۰﴾ ع اور آپ کا رب (صبر رکھنے والوں اور صبر نہ رکھنے ولوں کو) خوب دیکھ رہا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مال اور جسم کے لحاظ سے اپنے سے اونچے کو دیکھے تو اپنے سے نیچے کو بھی دیکھے (یعنی اپنے سے اونچے کو مت دیکھو کہ حسرت ہو نیچے کو دیکھو کہ تسلی ہو اور شکر کی توفیق ہو) رواہ الشیخان فی الصحیحین واحمد۔

ع ۲ / ۱۷

اٹھارہواں پارہ ختم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وقال الذین

انیسواں پارہ شروع

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید ہی نہیں رکھتے (کیونکہ وہ دوبارہ زندگی کے منکر ہیں) وہ کہتے ہیں چونکہ دوسری زندگی کے وہ قائل نہیں اس لئے اللہ سے مل کر ان کو کسی بھلائی کی امید بھی نہیں اور نہ کسی برائی کا خوف ہے۔ رجاء کا بمعنیٔ خوف مجازی استعمال ہے یا (یوں کہا جائے کہ) تہامہ والوں کی زبان میں رجاء امید و خوف دونوں معانی میں مستعمل ہے فراء نے یہی کہا ہے اللہ نے ایک اور آیت میں فرمایا ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا تم اللہ کی عظمت سے کیوں نہیں ڈرتے۔ لغت میں کسی چیز تک پہنچنے کو لقاء کہا جاتا ہے (ملاقات کرنے یعنی) کسی کے دیکھنے کو بھی لقا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کسی کو دیکھنے کا معنی ہے اس شخص تک پہنچنا۔ آیت میں سزا تک پہنچنا مراد ہے۔

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے جو محمد ﷺ کے سچا ہونے کی ہم کو اطلاع دیتے۔ یا اللہ کی طرف سے ہمارے پاس قاصد بن کر آتے۔

اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ یا ہم اپنے رب کو (خود) دیکھتے اور وہ ہم کو محمد کا اتباع کرنے کا حکم دیتا۔

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور حد انسانیت سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

یعنی انہوں نے اپنے کو بہت بڑا سمجھا کہ ایسی بات کی طلب کی جو انبیاء کرام کو کبھی کبھی بعض خاص حالات و اوقات میں حاصل ہوتی ہے۔

وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا اور کفر میں حد سے آگے بڑھ گئے، انتہائی درجہ کفر تک پہنچ گئے مجاہد نے کہا عتو یعنی انتہائی سرکش ہو گئے۔ مقاتل نے کہا مغرور ہو گئے بغوی نے لکھا ہے عتو کا معنی ہے شدید ترین کفر اور بہت ہی بڑا ظلم۔ عتو کبیر سے مراد ہے کہ (غرور کی) انتہا کو پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ خدا کو دیکھنے کے طلب گار ہو گئے۔

بعض علماء نے کہا عتو کبیر یہ تھا کہ انہوں نے کھلے ہوئے واضح معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور پھر انکو نہ مانا اور ایسی چیز کے خواستگار بن گئے جس کا حصول بڑے بڑے طالبین کاملین کو بھی نہیں ہو سکا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ جس روز وہ فرشتوں کو دیکھیں گے یعنی مرنے کے وقت یا قیامت کے دن جب کافر ملائکہ کو دیکھیں گے۔

لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ اس روز مجرموں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہ ہو گی۔

یہ جملہ معترضہ ہے یا یہ مطلب ہے کہ اس روز فرشتے کہیں گے کافروں کے لئے آج کوئی خوشی کی خبر نہیں۔ عطیہ نے کہا قیامت کے دن ملائکہ مومنوں کو بشارت دیں گے اور کافروں سے کہیں گے (آج) تمہارے لئے کوئی خوشی کی خبر نہیں۔

بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ جس روز وہ فرشتوں کو دیکھیں گے (یعنی مرنے کے وقت یا قیامت کے دن) اس روز فرشتے ان کو بشارت نہیں دیں گے۔ مومنوں کو جنت کی بشارت دیں گے۔

للمجرمین رفتار کلام چاہتی تھی کہ لھم کہا جاتا لیکن ضمیر کی جگہ صراحت کے ساتھ مجرمین کہنا ان کے مجرم ہونے پر دلالت کر رہا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ مانع بشارت ان کا مجرم ہونا ہو گا۔

وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿۲۲﴾ اور کہیں گے پناہ ہے پناہ ہے۔

بغوی نے بحوالہ عطاء حضرت ابن عباس کا قول اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ فرشتے کہیں گے حرام ہے حرام کر دیا گیا ہے کہ جنت میں سوائے ان لوگوں کے جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل تھے کوئی اور داخل ہو۔

مقاتل نے کہا جب کافروں کو قبروں سے نکالا جائے گا تو اس وقت ملائکہ ان سے کہیں گے حرام ہے تمہارے لئے جنت حرام کر دی گئی ہے۔ بعض علماء نے کہا جب مجرموں کو قبروں سے نکالا جائے گا اور وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو مجرم خود ہی یہ الفاظ کہیں گے۔ بغوی نے بحوالہ ابن جریج لکھا ہے کہ عربوں پر جب کوئی مصیبت آتی ہے اور کسی ناخوشگوار امر میں مبتلا ہوتے ہیں تو حجراً محجوراً کہتے ہیں چنانچہ مجرم فرشتوں کو دیکھنے کے بعد یہ الفاظ کہیں گے۔

بعض نے اس لفظ کا ترجمہ کیا پناہ خدا کی پناہ۔ مجاہد نے کہا جب کافر ملائکہ کو دیکھیں گے تو اس روز فرشتوں سے (اللہ کی پناہ) مانگیں گے اور حجراً محجوراً کہیں گے یعنی اللہ سے درخواست کریں گے کہ فرشتوں سے ان کو بچالے۔

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا ﴿۲۳﴾ اور ہم ان کے ان (نیک) اعمال کی طرف جو وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا کر دیں گے جیسے پریشان غبار۔

من عمل یعنی کافروں کے اچھے اعمال جیسے مہمان نوازی، کنبہ پروری، رشتہ داروں سے حسن سلوک، مصیبت زدہ کی مدد وغیرہ

هَبَاءً مَّنثُورًا یعنی بے کار، رائیگاں جس کا آخرت میں کوئی ثواب نہ ہو گا کیونکہ ثواب کی شرط ہے ایمان اور محض اللہ کے لئے نیکی کرنا اور یہ دونوں شرطیں کافروں کے اعمال میں مفقود ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ہباء ان ذروں کو کہتے ہیں جو روشن دانوں (اور کواڑوں) کے شگافوں سے سورج کی روشنی پر غبار کی طرح نظر آتے ہیں مگر ہاتھ سے ان کو چھوا نہیں جا سکتا اور نہ وہ سایہ میں نظر آتے ہیں حسن، مجاہد اور عکرمہ نے بھی اس لفظ کی یہی تشریح کی منثور کا معنی ہے پراگندہ۔

حضرت ابن عباس قتادہ اور سعید بن جبیر نے فرمایا ہباء اس دھول کو کہتے ہیں جس کو ہوا اڑاتی ہے اور بکھیرتی ہے۔ مقاتل نے کہا ہباء وہ غبار ہے جو گھوڑوں کی ٹاپوں سے دوڑنے کے وقت اڑتا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہبا منثور وہ ذرات ہوتے ہیں جو روشن دانوں کے سوراخوں سے سورج کی کرنوں پر نظر آتے ہیں اور ہباء منبث وہ دھول ہوتی ہے جو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھتی اور اس کو اڑاتی ہے۔

کافروں کے اچھے اعمال آخرت میں ناکارہ ثابت ہوں گے ان کی کوئی حقیقت نہ ہو گی اس حقارت اور عدم افادیت کو ہباء سے تشبیہ دی۔ پھر منثور فرمایا منثور کی کوئی تنظیم نہیں۔ کفار کے اعمال کی بھی تنظیم نہ ہو گی (کسی ضابطۂ ایمان کے زیر اثر منظم نہ ہوں گے) یا ہباء منثور کی طرح منتشر ہو جائیں گے۔

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا ﴿۲۴﴾ اہل جنت اس روز قیام گاہوں کے اعتبار سے بھی اچھے اور آرام گاہوں کے اعتبار سے بھی بہتر ہوں گے۔

مستقر قرارگاہ جہاں بیشتر اوقات میں آدمی ٹھہرتا ہے۔

مقیلا ٹھکانا جس کی طرف آرام لینے اور بیویوں سے تمتع اندوز ہونے کے لئے آدمی رجوع کرتا ہے یا مقیل سے مراد

ہے قیلولہ کا مقام جنت میں خواب تو ہو گا ہی نہیں اس لئے (حقیقی معنی مراد نہیں ہو سکتے) مجازی معنی بطور تشبیہ مراد ہیں۔
ازہری نے کہا قیلولہ اور مقیل دوپہر کے وقت آرام لینے کو کہتے ہیں۔ خواہ نیند نہ ہو کیونکہ اللہ نے وَاَحْسَنُ مَقِيْلًا فرمایا ہے اور جنت میں نیند نہیں ہو گی۔
لفظ احسن کے اندر اشارہ خفی ہے اس امر کی طرف کہ اہل جنت کی قرارگاہیں طرح طرح کی خوبصورت تصویروں اور حسین سامان آرائش سے سجی ہوئی ہوں گی۔
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مستقر اور مقیل مصدر ہوں یا ظرف زمان یعنی ان کی قرارگاہیں اور اوقات استراحت اتنے خوش گوار اور اعلیٰ ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، یا یوں کہو کہ دنیا میں (آرام و آسائش کے جو مکان یا اوقات) عیش پرستوں اور خوش حال لوگوں کے لئے ہوتے ہیں ان سے بہتر زمان و مکان اہل جنت کے لئے ہوں گے۔
کتاب الزہد میں ابن مبارکؒ نے نیز عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور حاکم نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح بھی کہا ہے کہ قیامت کا دن آدھا نہ ہونے پائے گا کہ یہ (اہل جنت) اور وہ (دوزخی) اپنی قرارگاہوں میں جا کر ٹھہر جائیں گے۔ بغوی کی روایت میں حضرت ابن مسعود کا بیان ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے قیامت کا دن آدھا نہ ہونے پائے گا کہ اہل جنت، جنت میں اور اہل نار دوزخ میں جا کر ٹھہر جائیں گے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی ثُمَّ اِنَّ مَقِيْلَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں یہ آیت اسی طرح آئی ہے ابن جریر ابن المنذر اور ابو نعیم نے الحلیہ میں ابراہیم نخعی کا قول نقل کیا ہے لوگ خیال کرتے تھے کہ قیامت کے دن آدھے دن میں لوگوں کا حساب ختم ہو جائے گا پھر جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں قیلولہ کریں گے (دوپہر بسر کریں گے) بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے اس روز حساب شروع دن میں ہی ہو جائے گا اور جب لوگ قیلولہ کریں گے تو جنت میں پہنچ کر اپنی اپنی فرودگاہوں میں قیلولہ کریں گے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ مومنوں کے لئے قیامت کا دن چھوٹا کر دیا جاتا ہے جیسے عصر سے غروب آفتاب تک ہوتا ہے۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝۲۵ اور جس روز (طلوع) غمام کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے۔ یقیناً

اس غمام سے وہی غمام مراد ہے جس کا ذکر آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ میں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اس کا بیان گزر چکا ہے غمام ایک سفید باریک بادل کہر کی طرح ہو گا جو صرف بنی اسرائیل کے لئے (اس دنیا میں) وادیٔ تیہ کے اندر اللہ نے نازل فرمایا تھا۔
بغوی نے لکھا ہے ب بمعنی عن آتا ہے عرب کہتے ہیں رمیت انسہم بالقوس میں نے کمان سے تیر پھینکا بالغمام میں بھی ب بمعنی عن ہے یعنی غمام پھٹ کر آسمان نکل آئے گا۔
ابن ابی الدنیا نے کتاب الاہوال میں نیز حاکم اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایک میدان میں ساری مخلوق کو جمع کرے گا جن وانس کو چوپایوں کو درندوں کو پرندوں کو غرض سب مخلوق کو اکٹھا کرے گا۔ پھر یہ آسمان دنیا (نچلا آسمان) پھٹ جائے گا اور اس کے باشندے اتنے اتر پڑیں گے کہ سارے جنات اور انسانوں سے اور کل مخلوق ارضی سے زائد ہوں گے اور اترتے ہی سب کو گھیرے میں لے لیں گے زمین والے پوچھیں گے کیا تمہارے اندر ہمارا رب بھی ہے وہ جواب دیں گے نہیں پھر دوسرے آسمان والے اتریں گے جو کل زمین والوں اور پہلے آسمان والوں سے زیادہ ہوں گے۔ لوگ ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے اندر ہمارا رب ہے وہ جواب دیں گے نہیں اور کل جن وانس اور ملائکہ کو گھیر لیں گے پھر تیسرے آسمان والے اتریں گے۔ زمین والوں سے اور پہلے دوسرے آسمان والوں کے آسمان کے مجموعہ سے ان کی گنتی زائد ہے ان سے لوگ دریافت کریں گے کیا تمہارے اندر ہمارا رب ہے وہ جواب دیں گے نہیں۔ پھر چوتھے آسمان والے

اتریں گے ان کی تعداد تینوں آسمان والوں اور زمین والوں کے مجموعہ سے زیادہ ہو گی۔ لوگ ان سے دریافت کریں گے کیا تمہارے اندر ہمارا رب ہے وہ کہیں گے نہیں۔ پھر پانچویں آسمان والے نازل ہوں گے اور ان کی تعداد تمام پہلے والوں سے زیادہ ہو گی پھر چھٹے آسمان والے بھی اسی طرح اتریں گے پھر ساتویں آسمان والے بھی اتریں گے اور ان کی گنتی سب کے مجموعہ سے زائد ہو گی۔ ان سے دریافت کیا جائے گا کیا تمہارے اندر ہمارا رب ہے وہ جواب دیں گے نہیں۔ پھر ہمارا عرش غمام کے سائبانوں میں (اس شان کے ساتھ) اترے گا کہ اس کے گرد کروبی ہوں گے کروبیوں کی تعداد ساتوں آسمان والوں اور زمین والوں سے زائد ہو گی اور حاملین عرش بھی ہوں گے عرش کو اٹھانے والے ملائکہ کے سینگ ہوں گے ایسے جیسے بانس کی گانٹھیں ان کے ایک ایک قدم کا فاصلہ اتنا اتنا (یعنی نا قابل اندازہ) ہو گا۔ ان کے پاؤں کے تلوے سے ٹخنے تک کا فاصلہ پانسو برس کی راہ کے برابر ہو گا اور ٹخنے سے زانو تک کا فاصلہ بھی پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہو گا اور کولھے کی نوک سے ہنسلی تک کا فاصلہ بھی پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہو گا اور ہنسلی سے کان کی لو تک کا فاصلہ بھی پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہو گا۔

یہ حدیث مع اس کی تاویلات کے سورۂ بقرۃ کی آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ (یہ حدیث منکر ہے سلسلۂ روایت میں بعض راوی نا قابل اعتبار ہیں)

ابن جریر اور ابن مبارک نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ کے حکم سے آسمان اپنے باشندوں سمیت پھٹ پڑے گا اس حکم کے وقت ملائکہ آسمان کے کناروں پر ہوں گے اور نیچے اتر کر ساری زمین اور زمین والوں کو گھیر لیں گے پھر دوسرے تیسرے چوتھے پانچویں چھٹے اور ساتویں آسمان کا بھی یہی حال ہو گا پھر سب فرشتے صف بستہ ہو جائیں گے ایک قطار کے بعد دوسری قطار (ترتیب وار) ہو جائے گی پھر ایک فرشتہ اترے گا جس کے بائیں جانب جہنم ہو گا زمین والے جہنم کو دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ پڑیں گے مگر زمین کے جس کنارے پر پہنچیں گے وہاں ملائکہ کی سات صفیں گھیرے ہوئے ملیں گی مجبوراً اسی جگہ جہاں سے بھاگے تھے لوٹ آئیں گے۔ آیات ذیل میں اسی کا بیان ہے اللہ نے فرمایا ہے اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ۔ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا۔

لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سنائی دے گی اور لوگ حساب (فہمی) کے لئے چل دیں گے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ اس روز (حقیقی) حکومت رحمٰن ہی کی ہو گی۔ یعنی اس روز حق اور واقعی لازوال حکومت رحمٰن کی ہی ہو گی کسی دوسرے کی (ظاہری اور مجازی طور پر بھی) نہیں ہو گی۔

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ اور وہ دن کافروں کے لئے سخت دشوار دن ہو گا۔

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار برس کے برابر ہو گی (اور عرض کیا گیا) کیسا لمبا دن ہو گا (اور اتنا لمبا وقت کیسے کٹے گا) حضور نے فرمایا قسم ہے اسکی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مومن کے لئے وہ بہت ہلکا ہو گا یہاں تک کہ فرض نماز کے (ایک) وقت سے بھی اس کے لئے زیادہ آسان (اور چھوٹا) ہو گا۔

بغویؒ نے لکھا ہے عقبہ بن ابی معیط کا دستور تھا کہ جب سفر سے واپس آتا تھا تو کھانا تیار کراتا اور اپنی قوم کے بڑے بڑے لوگوں کی دعوت کرتا تھا۔ یہ شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس زیادہ بیٹھتا تھا ایک روز سفر سے واپس آکر کھانا تیار کرایا اور لوگوں کی دعوت کی رسول اللہ ﷺ کو بھی کھانے کے لئے بلایا (آپ تشریف لے گئے) جب عقبہ نے کھانا لا کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھا تو حضور ﷺ نے فرمایا میں اس وقت تک تمہارا کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک تم لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت نہ دو گے۔ عقبہ نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا اور حضور ﷺ نے اس کا کھانا کھا لیا عقبہ ابی بن خلف کا دوست تھا (اور ابی سخت کافر

تھا) ابی کو عقبہ کے کلمۂ شہادت پڑھنے کی اطلاع ملی تو اس نے عقبہ سے کہا عقبہ تم بے دین ہو گئے عقبہ نے کہا نہیں تو خدا کی قسم میں تو بے دین نہیں ہوا۔ بات صرف یہ تھی کہ میرے گھر ایک آدمی آیا اور بغیر کلمہ شہادت پڑھوائے میرا کھانا کھانے سے اس نے انکار کر دیا میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ میرے گھر سے بغیر کھانا کھائے چلا جائے اس لئے میں نے شہادت دیدی اور اس نے کھانا کھا لیا ابی نے کہا میں اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہوں گا جب تک تم جا کر اس کے منہ پر تھوک نہ دو گے عقبہ نے جا کر ایسا کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں نے بھی اگر مکہ کے باہر تجھے پالیا تو تیرے سر پر تلوار ماروں گا (یعنی تجھے قتل کردوں گا۔) چنانچہ عقبہ کو بدر کے دن بند ھوا کر قتل کر دیا گیا۔ رہا ابی تو اس کو احد کے دن رسول اللہ نے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ ابن جریر نے یہ روایت مرسل بھی نقل کی ہے اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔ ابی نے عقبہ سے کہا میں تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک تم اس کی گردن کو پاؤں سے روند نہ دو گے۔ اور اس کے منہ پر تھوک نہ دو گے چنانچہ عقبہ نے جب دار الندوہ میں حضور کو سجدے کی حالت میں پایا تو وہ ایسا کر گزرا۔ حضور نے فرمایا جب میں مکہ کے باہر تجھ کو پاؤں گا تو تیرے سر پر تلوار ماروں گا بدر کے دن عقبہ قید کر لیا گیا۔ حضور نے حضرت علیؓ کو عقبہ کے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ اور مقابلہ کے وقت ابی کے بھالا مارا پھر ابی مکہ کو لوٹ گیا اور مر گیا۔ عقبہ اور ابی کے متعلق آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿۲۷﴾

اور جس روز کہ ظالم (افسوس سے) اپنے دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹے گا (اور) کہے گا کاش میں رسول کے ساتھ (ان کی) راہ پکڑ لیتا۔

الظالم سے مراد ہے عقبہ بن ابی معیط ابن جریر نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ ابی بن خلف رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ عقبہ بن ابی معیط نے اسکو سرزنش کی اس پر یہ آیت خذولا تک نازل ہوئی شعبی اور مقسم سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے دانتوں سے ہاتھ کاٹنا۔ انگلیوں کے پورے کھانا۔ دانت پیسنا یہ سب کنائی الفاظ ہیں ان سے مراد ہوتا ہے انتہائی غصہ اور حسرت۔

ضحاک نے کہا جب عقبہ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر تھوک پھینکا تو اس کا تھوک لوٹ کر اسی کے رخساروں پر آپڑا۔ جس سے دونوں رخسار جل گئے اور مرتے دم تک جلنے کا نشان نہیں گیا شعبی کا بیان ہے کہ عقبہ بن ابی معیط امیہ بن خلف کا دوست تھا۔ عقبہ مسلمان ہو گیا۔ امیہ نے کہا چونکہ تو نے محمد کی بیعت کر لی ہے اس لئے میرا چہرہ تیرے لئے اور تیرا چہرہ میرے لئے دیکھنا حرام ہے عقبہ نے اسلام کا انکار کر دیا اور مرتد ہو گیا اس پر اللہ نے اس کے بارے میں آیت یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ نازل فرمائی الظالم سے مراد ہے عقبہ بن ابی معیط بن امیہ بن عبد الشمس بن عبد مناف۔ ہاتھ کاٹنے سے مراد ہے ندامت و افسوس کہ وہ دوست جس نے اس کو اللہ کے راستہ سے روکا اس نے اس کا کہا مان لیا اور گناہ و کفر کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو خود تباہ کر دیا۔ عطاء نے کہا وہ (قیامت کے دن) اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک کھا جائے گا پھر ہاتھ اگ آئیں گے وہ حسرت و افسوس کرتے ہوئے ان کو پھر کھا جائے گا اور یوں ہی ہاتھ اگتے رہیں گے اور وہ حسرت کے ساتھ کھاتا رہے گا۔

یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا یعنی کاش میں محمد کا اتباع کر لیتا اور ان کی معیت میں ہدایت کا راستہ اختیار کر لیتا جو ایک ہی ہے اور مجھے گمراہی کی طرف نہیں لے جاتا۔

يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿۲۸﴾ ہائے افسوس کاش میں فلاں (یعنی ابی بن خلف) کو دوست نہ بناتا۔

لَّقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي اس نے قطعاً مجھے ذکر (خداوندی) کی طرف سے گمراہ کر دیا بعد اس کے کہ ذکر میرے پاس آچکا تھا۔

ذکر سے مراد ہے اللہ کی یاد یا قرآن مجید یا رسول اللہ ﷺ کی نصیحت یا کلمہ شہادت۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ اور شیطان انسان کو بے مدد چھوڑنے والا ہے۔

الشیطن سے مراد ہے گمراہ کرنے والا دوست۔ ہر سرکش سرتاب اور ہر راہ خدا سے روکنے والا انسان ہو یا جن شیطان ہے۔ خذلان کا معنی ہے بے مدد چھوڑ دینا۔ (ضرورت کے وقت) مدد نہ کرنا مطلب یہ ہے کہ شیطان کسی کا دوست نہیں ہلاکت کے غار تک پہنچا کر ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

ان آیات کا مورد اگرچہ خاص ہے لیکن عموم عبارت کے زیر اثر حکم عام ہے جو دو دوست گناہ پر دوستی کو قائم رکھے ہوں ان کو آیت کا حکم شامل ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیک اور بد ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کے پاس تو مشک ہے اور دوسرا لوہار کی بھٹی دھونک رہا ہے مشک اپنے پاس رکھنے والا یا تو تم کو (کچھ مشک مفت) دیدے گا یا تم اسے خرید لو گے یا (کم از کم) عمدہ خوشبو ہی تم کو (اس کی طرف سے) مل جائے گی۔ اور بھٹی دھونکنے والا یا تمہارے کپڑوں کو جلا دے گا یا (کم از کم) بدبو تم کو اس کی طرف سے پہنچے گی۔ (رواہ البخاری)۔

حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا سوائے مومن کے کسی کے ساتھ نہ رہو اور سوائے پرہیز گاروں کے تمہارا کھانا اور کوئی نہ کھائے (یعنی صرف نیک لوگوں کی دعوت کرو) رواہ احمد والترمذی وابن حبان والحاکم

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (عام طور پر) آدمی اپنے دوست کے مسلک پر ہوتا ہے اس لئے اس کو (پہلے سے) دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے (رواہ البغوی)

امام احمد اور اصحاب سنن نے اور شیخین نے صحیحین میں حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے نیز صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے بھی آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا۔ (یا ہوتا ہے) جس سے اس کو محبت ہوگی۔ (یا محبت ہے)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ اور (اس روز) رسول اللہ ﷺ (یعنی محمد ﷺ) کہیں گے اے میرے رب میری قوم (یعنی قریش) نے اس قرآن کو متروک کر رکھا تھا۔ یعنی قرآن سے روگرداں ہو گئے تھے اس پر ایمان نہیں لائے تھے اور اس کے احکام پر عمل نہیں کیا تھا۔

بعض نے کہا مہجور ہجر سے مشتق ہے ہجر کا معنی ہے بیہودہ کلام بکواس۔ مطلب یہ ہے کہ میری قوم نے اس قرآن کو بیہودہ بکواس قرار دے رکھا تھا کوئی شاعری کہتا تھا، کوئی کہانت، کوئی جادو نخعی اور مجاہد نے یہی تشریح کی ہے۔

بعض لوگوں نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ رسول ﷺ نے (دنیا میں) کہا اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو متروک بنا دیا اس قول کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کی سرکشی اور بیہودہ کلامی کا اللہ سے شکوہ کیا اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو تسلی دینے کے لئے فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ط اور اسی طرح ہم نے مشرکوں میں سے ہر پیغمبر کے دشمن بنا دیئے تھے اس لئے آپ بھی ویسے ہی صبر کریں جیسا گزشتہ پیغمبروں نے کیا میں یقیناً آپ کی مدد کرنے والا اور راستہ بتانے والا ہوں۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ اور آپ کا رب آپ کو (دشمنوں پر) راستہ بتانے اور آپ کی مدد کرنے کے لئے کافی ہے۔

ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور المختار میں ضیاء نے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ مشرکوں نے کہا کہ اگر محمد اپنے دعوئے نبوت میں سچے ہیں تو پھر ان کا رب ان کو دکھ کیوں دیتا ہے (اور کیوں بار بار تھوڑی تھوڑی آیات بھیجتا ہے) یکدم پورا قرآن ان پر کیوں نہیں اتار دیتا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

ع
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور کافروں نے کہا کہ محمد پر پورا قرآن نازل نہیں کیا گیا (جیسے موسیٰ پر توریت عیسیٰ پر انجیل اور داؤد پر زبور نازل کی گئی تھی) ہم نے اس کو اسی طرح نازل کیا ہے تاکہ آپ کے دل کو مضبوط رکھیں اور ہم نے اس کو واضح طور پر کھول کر بیان کیا ہے۔

نزل بمعنی انزل ہے (یعنی تدریجاً نزول مراد نہیں ہے) کیونکہ آگے جملة واحدة کا لفظ آیا ہے جس سے مراد ہے یکدم پورا قرآن۔

بیضاوی نے کہا کافروں کا یہ اعتراض بے کار تھا۔ کیونکہ قرآن یکدم نازل کیا جاتا یا تھوڑا تھوڑا بہر حال اس کے اعجاز میں تو کوئی فرق نہیں آسکتا تھا پھر تدریجی نزول میں بہت سے فوائد بھی تھے جن کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

کذلک کاف کا تعلق فعل محذوف سے ہے۔ یعنی ہم نے اس کو اس طرح تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ تاکہ اس سے آپ کے دل کو جماؤ عطا کریں آپ کو سمجھنے اور یاد رکھنے میں دشواری نہ ہو۔ پھر واقعات اور حالات کے موافق نازل کرنے میں معنوی بصیرت بھی اس سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب تھوڑا تھوڑا نازل کیا گیا اور ہر ٹکڑے کو چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا اور کفار ہر ٹکڑے کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوئے تو اس سے اللہ کے رسول ﷺ کے دل کو قوت حاصل ہوئی۔ تدریجی نزول کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہر مرتبہ جبرئیلؑ نے آکر آپ ﷺ کے دل کو قوی کیا۔ تدریجی نزول سے ناسخ و منسوخ کی پہچان بھی ہو گئی۔ دلالت لفظیہ کے ساتھ قرائن حالیہ نے مل کر بلاغت کلام کو مزید اجاگر کیا۔

رتلنہ ترتیلا حضرت ابن عباس نے اس کا ترجمہ کیا ہم نے قرآن کو واضح طور پر بیان کر دیا۔ ترتیل کا معنی ہے ترسل یعنی ٹھہر ٹھہر کر (الگ الگ صاف صاف) پڑھنا۔ سدی نے ترجمہ کیا ہم نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے الگ الگ کر دیا۔ مجاہد نے کہا ہم اس کے ایک حصہ کو دوسرے کے بعد لائے نخعی اور حسن نے کہا ہم نے اس کو جدا جدا ٹکڑوں میں بانٹ دیا (تمام اقوال کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے مترجم) ترتیل کا اصلی استعمال دانتوں کی جھریاں بتانے کے لئے ہوتا ہے (اگر ہر دانت دوسرے دانت کے ساتھ ہموار ہو اور دونوں کے درمیان جھری نما ایک لکیر ہو تو دانتوں کی اس حالت کو ترتیل اسنان کہا جاتا ہے۔

وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اور وہ کوئی عجیب سوال آپ کے سامنے نہیں لاتے۔ مثل سے مراد ہے عجیب سوال گویا ان کا سوال مثالی ہوتا ہے جس سے وہ آپ کی نبوت کو مجروح کرنا چاہتے ہیں۔

اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ مگر ہم آپ کو اس کا صحیح جواب عطا کر دیتے ہیں جس سے ان کے سوال کی صحیح تردید ہو جاتی ہے۔

وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اور بہترین تشریح کے ساتھ (جواب دیتے ہیں جس سے ان کا اعتراض دور ہو جاتا ہے) یا مثل سے مراد ہے عجیب حالت یعنی وہ جب آپ کی کوئی (گزشتہ) عجیب حالت بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس کا یہ حال تھا تو ہم آپ کو اپنی حکمت کے موافق حالت عطا کر دیتے ہیں جس سے آپ کی نبوت کی غرض کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

فسر کا معنی ہے ظاہر کر دینا کسی ڈھانکی ہوئی چیز کا پردہ ہٹا دینا کذا فی القاموس۔

ع ۳ / ۱
اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

جن لوگوں کو منہ کے بل جہنم کی طرف ہنکا کر لے جایا جائے گا وہ رہنے کے مقام کے لحاظ سے بھی بدتر ہوں گے اور طریقہ میں بھی بہت گمراہ ہوں گے۔

اضل کا مفضل علیہ محذوف ہے یعنی رسول۔ اس آیت کا اسلوب ویسا ہی ہے جیسے آیت هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ۔

گویا آیت کا مطلب یوں ہوا کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے راستے کو گمراہی کا راستہ جانتے ہیں اور آپ کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے حال سے واقف نہیں کہ وہ کس قدر برے مقام میں ہیں اور رسول سے (جو بقول ان کے گمراہ ہیں) کتنے زیادہ گمراہ ہیں۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک اس آیت کا اتصال آیت اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا سے ہے۔ اس تفسیر پر مفضل علیہ عام ہوگا۔ یعنی وہ لوگ سب سے زیادہ برے مقام والے ہوں گے اور ہر گمراہ سے زیادہ گمراہ ہوں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تین طور پر لوگوں کو چلایا جائے گا کچھ سوار کچھ پیدل کچھ منہ کے بل چلنے والے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا منہ کے بل چلیں گے فرمایا جس نے پاؤں سے چلایا ہے وہ منہ کے بل چلانے کی بھی قدرت رکھتا ہے رواہ ابوداؤد والبیہقی۔

حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کیا قیامت کے دن کافر کو منہ کے بل چلایا جائے گا۔ فرمایا جس نے دنیا میں قدموں سے چلایا ہے کیا وہ قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر قادر نہ ہوگا۔ متفق علیہ

حضرت معاویہ بن حیدہ کی روایت ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے تمہارا حشر (تین حالات میں) ہوگا کچھ پیدل ہو گئے کچھ سوار کچھ منہ کے بل چلائے جاؤ گے رواہ الترمذی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔

حضرت ابوذر کا بیان ہے مجھ سے سچے (نبی) نے جن کی تصدیق (اللہ کی طرف سے) ہوئی تھی۔ فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ تین جماعتوں کی صورت میں چلائے جائیں گے ایک گروہ سیر شکم، لباس پوش اور سوار ہوگا ایک گروہ پیدل رواں دواں ہوگا اور ایک گروہ کو فرشتے منہ کے بل گھسیٹیں گے۔ رواہ النسائی والحاکم والبیہقی۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا ﴿۳۵﴾ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت) دی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو مددگار بنا دیا۔ یعنی دعوت اسلام اور اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے ہارون کو موسیٰ کا مددگار بنا دیا۔ وزیر (مددگار) کہنے سے نبوت کی نفی لازم نہیں آتی کیونکہ کسی کام میں اگر دو آدمی شریک ہوں (اور مقصد ایک ہو) تو ہر ایک دوسرے کا مددگار ہوتا ہے۔

فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَی الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اور ہم نے کہہ دیا کہ تم دونوں اس قوم (کی ہدایت کے لئے اس) کے پاس جاؤ جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہے یعنی اللہ کی بنائی ہوئی آیات فطرت جو اللہ کی ذاتی و صفاتی توحید پر دلالت کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ اللہ اپنی ذات و صفات میں ایک ہے ان آیات کا وہ لوگ انکار کرتے ہیں جو (دہریہ ہیں) صانع اور خالق کے منکر ہیں یا مشرک ہیں دوسروں کو خدا کا ساجھی قرار دیتے ہیں اور بتوں کو پوجتے ہیں تم دونوں جا کر ان کو اللہ کی ذات و صفات کو ماننے اور اللہ کو ایک سمجھنے کی دعوت دو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیات سے مراد حضرت موسیٰ کے معجزات ہوں۔ اس مطلب پر الذین کذبوا بایتنا کا یہ مطلب ہوگا کہ نزول قرآن کے وقت میں جو لوگ موسیٰؑ کے معجزات کے منکر تھے ان کی ہدایت کے لئے ہم نے موسیٰ و ہارونؑ کو مامور کیا۔ آیات سے توریت کی آیات مراد نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ توریت کا نزول تو فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد ہوا تھا (فرعون کے پاس توریت دے کر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کو نہیں بھیجا گیا تھا)

فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ﴿۳۶﴾ پھر ہم نے اس قوم کو کامل طور پر تباہ کر دیا۔

اس عبارت میں کچھ ایجاز اور اختصار ہے مفصل کلام اس طرح تھا۔ حسب الحکم موسیٰ اور ہارونؑ اس قوم کے پاس گئے ان کو ایمان کی دعوت دی لیکن انہوں نے دونوں کو جھوٹا قرار دیا آخر ہم نے ان لوگوں کو تباہ کر دیا۔ کلام میں اختصار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو اصل مقصود تھا اس کی صراحت کر دی۔ یعنی پیغمبر بھیج کر حجت پوری کر دی اور تکذیب کی وجہ سے لوگ تباہ ہونے کے مستحق ہو گئے بس اس جگہ اتنا ہی بیان کر دینا کافی تھا (تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت ثابت ہو جائے۔ اور نبوت کی غرض ظاہر

ہو جائے۔ مترجم)

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ اور قوم نوحؑ (کا بھی تذکرہ کرو) جب اس قوم نے پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا تو ہم نے ان کو غرق کر دیا۔

تکذیب رسل سے مراد ہے حضرت نوحؑ کی اور آپ سے پہلے گزرے ہوئے پیغمبروں کی تکذیب یا یوں کہا جائے کہ صرف حضرت نوحؑ کی تکذیب ہی مراد ہے لیکن ایک پیغمبر کی تکذیب حقیقت میں سب پیغمبروں کی تکذیب ہے (کیونکہ ہر پیغمبر دوسرے تمام پیغمبروں کی تصدیق کرتا ہے اس ایک کو جھوٹا جاننا حقیقت میں تمام پیغمبروں کو دروغ گو قرار دینا ہوتا ہے) اس لئے تکذیب نوح کو تکذیب رسل قرار دیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں کی بعثت کی (سرے ہی سے) انہوں نے تکذیب کی (یعنی انہوں نے کہا کہ کوئی پیغمبر ہی اللہ کی طرف سے نہیں بھیجا جاتا۔ کسی پیغمبر کی بعثت کی ضرورت نہیں۔ ہدایت کے لئے اہل دانش کی عقل کافی ہے۔ مترجم)

وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ اور ان کو (یعنی ان کے غرق کرنے کو یا ان کے قصہ کو) لوگوں کے لئے عبرت بنا دیا۔

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ اور (جن لوگوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا ایسے) ظالموں کے لئے ہم نے دکھ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ اور عاد و ثمود اور رس والوں (کا ذکر کرو کہ ان) کو ہم نے ہلاک کیا۔

عاد و ثمود کے واقعات کا تذکرہ سورۂ اعراف وغیرہ میں آچکا ہے۔

اصحب الرس قاموس میں ہے رس کسی چیز کی ابتداء۔ وہ کنواں جس کے گرداگرد من بنادی گئی ہو۔ درست کرنا بگاڑنا، کھودنا، مردہ کو دفن کرنا۔ آذر بیجان کی ایک وادی کا نام رس الحمی ورسیس الحمی بخار کا آغاز۔

اصحاب الرس جس قوم کو کہا گیا اس کی وجہ تسمیہ یا یہ ہے کہ وہ شراء کفر کی ابتداء کرنے والی تھی یا کنویں والی تھی (کنویں کے گرداگرد آباد ہو گئی تھی) یا اس وادی کی رہنے والی تھی جس کا نام رس تھا۔ یا یہ وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی (غالباً حضرت حنظلہ صنعانی مترجم) کو شہید کر کے دفن کر دیا تھا اس جگہ اصحاب الرس سے مراد ہے حضرت شعیبؑ کی قوم جس نے ایک کنویں پر اپنی آبادی کر لی تھی۔ یہ لوگ جانور پالتے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے ایک وقت جب وہ سب کنویں کے گرداگرد اپنے گھروں میں موجود تھے وہاں کی زمین دھنس گئی، وہ کنواں اور آبادی اور ساری زمین اندر گھس گئی اور سب مر گئے ان کے یکدم ہلاک ہو جانے کی اصلی علت یہ تھی کہ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے حضرت شعیبؑ پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو اسلام کی دعوت دی لیکن ان کی سرکشی اور بڑھتی گئی اور حضرت شعیبؑ کو طرح طرح سے ایذا پہنچانے لگے۔ آخر ہلاک کر دیئے گئے زمین سب کو کھا گئی کنویں کو بھی ان کو بھی اور ان کے گھروں کو بھی۔ یہ تفصیل وہب بن منبہ نے بیان کی ابن جریر اور ابن عساکر نے قتادہ کی طرف بھی اس بیان کی نسبت کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور کلبی نے کہا رس علاقۂ یمامہ میں ایک کنواں تھا وہاں کے باشندوں نے اپنے نبی کو شہید کر دیا تھا اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔

بعض اہل روایت کا قول ہے کہ ثمود یعنی قوم صالح میں سے جو لوگ (ایمان لے آئے تھے اور) بچ گئے تھے۔ اصحاب الرس وہی لوگ تھے۔ یہ اس کنویں کے پاس رہتے تھے جس کا تذکرہ اللہ نے آیت وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ میں کیا ہے۔

عبد بن حمید ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس بیان کی نسبت قتادہ کی طرف کی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر نے بیان کیا کہ اصحاب الرس کا ایک پیغمبر تھا جس کا نام حنظلہ بن صفوان تھا۔ رس والوں نے اپنے پیغمبر کو شہید کر دیا۔ اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی طرف سے ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ ایک دراز گردن، عظیم الجثہ پرندہ کوہ فتح پر

رہتا تھا۔ پرندہ کو لمبی گردن ہونے کی وجہ سے عنقاء کہا جاتا تھا۔ عنقاء اس قوم کے بچوں پر آپڑتا تھا اور اچک کر لے جاتا تھا۔ حنظلہ نے عنقاء کو بددعا دی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بجلی اس پر ٹوٹ پڑی لیکن کچھ مدت کے بعد قوم والوں نے حنظلہ کو شہید کر دیا اور (اس جرم کی سزا میں) ان کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کعب مقاتل اور سدی کا بیان ہے رس انطاکیہ میں ایک کنواں تھا لوگوں نے حبیب بن نجار کو قتل کر کے اس کنویں میں ڈال دیا حبیب بن نجار اور ان کی قوم کا تذکرہ سورۂ یٰسین میں آیا ہے۔

بعض نے کہا اصحاب الرس ہی اصحاب الاخدود تھے۔ انہوں نے (مومنوں کو جلانے کے لئے) ایک خندق کھودی تھی (اور اس میں آگ بھر دی تھی) عکرمہ نے کہا اصحاب الرس نے اپنے نبی کو کنویں میں پاٹ دیا تھا یعنی دفن کر دیا تھا۔ بعض نے کہا رس معدن کو کہتے ہیں (معدن والے) رس کی جمع رساس آتی ہے۔

وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝ اور اس کے (یعنی عاد، ثمود اصحاب الرس اور قوم موسیٰ کے) درمیان کے ہم نے بہت قرنوں (قوموں) کو ہلاک کر دیا۔

قرون، قرن کی جمع کثرت ہے قرن ہم عصر لوگوں کو کہتے ہیں اگر قرن کی اضافت کسی معین شخص یا معین جماعت کی طرف کی جاتی ہے تو اس سے مراد ہوتے ہیں وہ لوگ جو اس شخص سے یا اس جماعت کے اکثر افراد سے یا ایک ہی فرد سے ملے ہوں۔ قرون ثلثہ جن کے قرون خیر ہونے کی شہادت حدیث میں آئی ہے اسی استعمال کے مطابق ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم رسول اللہ ﷺ کے قرن تو صحابہ تھے جنہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تھا اور دوسرا قرن وہ لوگ تھے جنہوں نے اکثر صحابہ کو یا کسی ایک صحابی ہی کو دیکھا تھا اور تیسرا قرن وہ لوگ تھے جنہوں نے تابعین ہی میں سے کسی ایک کو دیکھا تھا۔

اگر قرن مضاف نہ ہو تو مراد ہوتے ہیں ہم عصر لوگ اور یہ حقیقت ناقابل شک ہے کہ ہر زمانہ میں بچے بوڑھوں کے ہم عصر ہوتے ہیں پھر وہ بچے بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کے ایام پیری کے زمانہ کے بچے ان کے ہم عصر ہوتے ہیں اور سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اس لئے (بطور مجاز) لفظ قرن کا اطلاق ایک مدت معینہ پر کیا جانے لگا مدت کی حد بندی میں اختلاف ہے، کسی کے نزدیک چالیس سال کی مدت ایک قرن ہے۔ کسی نے دس سال یا بیس یا تیس یا پچاس یا ساٹھ یا ستر یا نوے سال کو ایک قرن قرار دیا۔ کسی نے ایک قرن کی مدت ایک سو بیس سال بتائی ہے۔ سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ قرن ایک صدی کو کہتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکے کو دعا دی تھی اور فرمایا تھا ایک قرن جیو۔ چنانچہ اس کی عمر سو سال ہوئی۔ جب قرن بمعنی مدت لیا جائے گا تو آیت کا مطلب اس طرح ہوگا۔ ہم نے بہت زمانوں والوں کو جو کافر تھے ہلاک کر دیا۔

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝ اور ہم نے اقوام مذکورہ میں سے ہر ایک کی ہدایت کے لئے عجیب عجیب مضامین بیان کئے اور ہم نے سب کو برباد کر دیا۔

ضربنا له الامثال یعنی گزشتہ اقوام کے عجیب عجیب واقعات کا ہم نے بیان کیا ہے تاکہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں۔

وکلا تبرنا اور جب انہوں نے عبرت حاصل نہیں کی اور پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔ اخفش نے تبرنا کا ترجمہ کیا ہے ہم نے ان کو توڑ دیا۔ زجاج نے کہا کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کو تتبیر کہتے ہیں سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کو اسی لئے تبر کہا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اور بلاشبہ وہ (مکہ والے) اس بستی کی طرف گزرے ہیں جن پر بری بارش کر دی گئی تھی۔

یعنی بہت سے مکہ کے باشندے ملک شام کو جاتے آتے ہیں اس بستی پر سے گزرے ہیں جس پر بری بارش کی گئی تھی۔

القریۃ سے مراد ہے سدوم کا شہر اور اس سے تعلق رکھنے والی دوسری بستیاں جہاں قوم لوط رہتی تھی اور امرد پرستی جیسی خبیث حرکتوں میں مبتلا تھی۔ اللہ نے ان پر پتھروں کی بارش کر کے تاخت و تاراج کر دیا۔ سب اہل مکہ تو نہیں گئے تھے لیکن بعض کے فعل کو (جبکہ دوسرے سب لوگ اس فعل پر راضی ہوں) سب کا فعل کہہ دیا جاتا ہے جیسے آیت فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا میں اونٹنی کو قتل کرنے کی نسبت پوری قوم ثمود کی طرف کی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے قوم لوط کی بستیاں پانچ ہیں اللہ نے ان میں سے چار کو تباہ کر دیا اور ایک بستی جو چھوٹی سی تھی بچ گئی اس بستی کے رہنے والے خبیث حرکات میں مبتلا نہ تھے ملک شام کو جاتے ہوئے یہ بستیاں سر راہ پڑتی تھیں۔

اَفَلَمْ یَكُوْنُوْا یَرَوْنَهَا　کیا یہ اس بستی کو نہیں دیکھا کرتے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس بستی کو دیکھا کرتے ہیں۔ پھر اس سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔

بَلْ كَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾　بلکہ ان کو (دوبارہ جی) اٹھنے کی امید بھی نہیں ہے یعنی ان کے نصیحت پذیر اور عبرت اندوز نہ ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ انہوں نے اس تباہ شدہ بستی کو آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل نابینا ہیں دوبارہ جی اٹھنے کی ان کو توقع ہی نہیں ہے ان کو انجام آخرت کی امید ہی نہیں ہے اور مومنوں کو ثواب کی امید ہے۔

یا آیت میں رجاء بر لغت تہامہ، بمعنی خوف ہے یعنی دوبارہ جی اٹھنے کا ان کو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا　اور جب (کفار قریش) آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کو مذاق بنا لیتے ہیں۔

ھزوا مصدر ہے بمعنی اسم مفعول یعنی آپ کو مسخرہ بنا لیتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے یہ آیت ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کی بابت نازل ہوئی۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرے اور بطور استہزاء کہنے لگے۔

اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾　کیا یہ (محمد) وہی ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

استفہام انکاری تعجبی ہے۔ اور ھذا کا لفظ تحقیر کے لئے استعمال کیا گیا ہے (یعنی یہ رسول نہیں رسول ہونے کے قابل نہیں، ایک حقیر آدمی کو رسول بنا کر بھیجنا بڑی عجیب بات ہے)

اِنْ كَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا　قریب تھا کہ یہ ہم کو ہمارے معبودوں کی طرف سے بہکا لیتا۔ یعنی ہمارے معبودوں کی پرستش سے ہم کو پھیر دیتا۔ مقصد یہ کہ اس طرز سے توحید کی طرف بلاتا۔ اور ایسی دلیلیں پیش کرتا ہے جن کی وجہ سے دماغوں میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ جو کچھ یہ پیش کر رہا ہے وہ اس کے معجزات ہیں۔

ان (ان کا) مخفف ہے۔ آیت میں دلیل ہے اس بات کی کہ رسول اللہ ﷺ دعوت اسلام میں انتہائی کوشاں تھے اور بکثرت معجزات بھی آپ ﷺ نے پیش کئے تھے اتنے اور اس ڈھنگ سے کہ قریب تھا کہ وہ ضدی کافر بھی اپنے ٹیڑھے راستے کو چھوڑ کر اسلام کے سیدھے راستے پر آجاتے لیکن ان کی اڑ اور بت پرستی پر ہٹ نے ان کو اسلام سے محروم رکھا۔ اور جو شخص اتنے کثیر واضح معجزات دیکھ کر بھی نصیحت پذیر نہ ہو اس سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ تباہ شدہ بستیوں کو دیکھ کر عبرت اندوز ہو سکے۔

لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا　اگر ہم ان معبودوں (کی پوجا) پر جمے نہ رہتے۔ لولا کی خبر محذوف ہے اوپر والا جملہ اس کی تعیین پر دلالت کر رہا ہے یعنی اگر ہم اپنے معبودوں کی پرستش پر جمے نہ رہتے تو محمد نے بس ہم کو بہکا ہی لیا تھا۔

کافروں کا یہ کلام غمازی کر رہا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے ساتھیوں کو گمراہ قرار دیتے تھے اسی خیال کی تردید ذیل کی آیت میں اللہ نے فرما دی۔

وَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾　جب آئندہ عذاب (ان کے

سامنے آئے گا اور) ان کو دکھائی دے گا اس وقت ان کو معلوم ہو گا کہ کون (فریق) بڑا گمراہ تھا۔ کافر یا مومن اس فقرے میں عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ ان کو یوں ہی (بغیر عذاب دیئے) نہیں چھوڑے گا۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ　اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے یعنی اپنی خواہشات کا تابع ہو گیا خواہشات پر ہی اس نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔ (خواہشات نفس کا پرستار ہو گیا) نہ کسی دلیل کو سنتا ہے نہ دیکھتا ہے بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباس نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا۔ کیا آپ اس شخص کو دیکھ رہے ہیں۔ جس نے اس اللہ کی عبادت تو ترک کر دی جو اس کا خالق ہے اور پتھروں کی طرف جھک گیا ان کی پوجا کرنے لگا۔

اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾　تو کیا آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے یعنی کیا آپ اس کے ذمہ دار ہیں کہ پتھروں کی پوجا سے اس کو روک دیں۔

وکیل ذمہ دار مانع سابق جملہ میں تعجب آگیں استفہام تقریری ہے اور اس جملہ میں استفہام انکاری ہے یعنی آپ اس کے شرک کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

کلبی نے کہا آیت قتال سے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ　کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ (کلام اللہ کو) سنتے یا (اس کے مطلب اور غرض کو) سمجھتے ہیں۔ استفہام انکاری ہے اور ام بمعنی بل کے ہے منقطعہ ہے یعنی حقیقت میں یہ لوگ نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے سننے سے مراد ہے دل کا سننا۔ دل کے کانوں سے سننا چونکہ دل کے کانوں سے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے اس لئے نہ کسی نصیحت سے ان کو فائدہ پہنچتا ہے نہ دلیل سے۔ آیت بتا رہی ہے کہ ہر دلیل صحیح مفید علم ہوتی ہے دلیل سے نتیجہ کا علم ہو جاتا ہے لیکن (خود بالذات دلیل سے نتیجہ دماغ میں نہیں بیٹھتا بلکہ) اللہ کی مشیت سے وابستہ ہے۔ اکثر کا لفظ اس لئے ذکر کیا سب ایسے نہ تھے کچھ لوگ انہی میں سے ایمان بھی لے آئے تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی کہ انہوں نے حقانیت و صداقت کو سمجھ لیا لیکن غرور کی وجہ سے یا اپنی سرداری فوت ہونے کے اندیشہ سے گمراہی میں پڑے رہے اور حق کو قبول نہ کر سکے۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾　وہ نہیں ہیں مگر چوپایوں کی طرح (جانوروں کی طرح سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں) بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔

یعنی کانوں سے چوپایوں کی طرح سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں اس لئے نصیحت سے فائدہ اندوز نہیں ہوتے اور دلائل و معجزات کو آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود غور نہیں کرتے اس لئے چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ جانوروں سے زیادہ گمراہ ہیں کیونکہ یہ جانور اگر حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں جانتے تو (اس لئے کہ حق و باطل کو سمجھنے والی عقل ان کو نہیں دی گئی اس لئے معذور ہیں (یہ بات بھی نہیں ہے کہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھتے ہوں، جانوروں کی نادانی سادہ ہے اور کافر جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ (حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں جانتے بلکہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہم حق کو حق اور باطل کو باطل جانتے ہیں) اور ظاہر ہے کہ جہل مرکب (نداند وبداند کو بداند) جہل بسیط (نداند وبداند کہ نہ داند) سے زیادہ برا ہے۔ چوپایوں کو تو حق و باطل کی تمیز ہی نہیں اور ان کافروں (کے اندر قوت تمیز و فیصلہ ہے پھر بھی ان) کو تمیز نہیں شرک کو حق سمجھتے ہیں اور باوجودیکہ پتھروں کی پوجا کا بطلان ظاہر ہے پھر بھی بلا دلیل ان کو پوجتے ہیں اور دلائل و معجزات کی کھلی ہوئی شہادت رسالت کے باوجود پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں، بعض علماء نے جانوروں سے زیادہ گمراہ ہونے کی یہ صورت بیان کی کہ چوپائے تو اپنے مالک اور نگراں کے حکم کو مانتے ہیں جو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اس کو پہچانتے ہیں اپنے (غذائی) فائدے کو طلب کرتے اور ضرر رساں دشمن سے بھاگتے ہیں لیکن کفار اپنے رب کے حکم کو نہیں مانتے اور اس کے احسان کو نہیں پہچانتے۔

منزل ۴

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جانور اپنے خالق کو جانتے اور اس کے حکم کی اطاعت کرتے اور تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں اگرچہ ان کی قوت فہم کو عام لوگ نہیں سمجھتے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص ایک بیل کو ہنکا کرلے جارہا تھا (چلتے چلتے جب) تھک گیا تو بیل پر سوار ہو گیا۔ بیل نے کہا ہم کو اس کام کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ ہم کو کھیت جوتنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے لوگوں نے (حضور کا یہ فرمان سن کر) کہا سبحان اللہ بیل بھی (کہیں) بولتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا تو اس پر ایمان ہے اور ابوبکر و عمر کا بھی۔ اس وقت یہ دونوں حضرات وہاں موجود بھی نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایک شخص اپنی بکریوں کے ساتھ تھا۔ اچانک ایک بھیڑیئے نے ایک بکری پر حملہ کر دیا اور پکڑ لیا بکریوں کا مالک جا پہنچا اور بکری کو چھڑا لیا۔ بھیڑیئے نے کہا قیامت کے دن اس کی حمایت کون کرے گا جب کہ سوائے میرے اور کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہوگا لوگوں نے کہا سبحان اللہ (کیا) بھیڑیا بھی باتیں کرتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا میں تو اس پر ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکر و عمر بھی۔ یہ دونوں حضرات وہاں موجود بھی نہیں تھے۔

فائدہ: ملائکہ میں روح اور عقل ہوتی ہے۔ اور چوپایوں میں نفس و خواہشات آدمی سب کا مجموعہ ہے پس اگر آدمی کی نفسانیت اور خواہشات کا روحانیت و عقل پر غلبہ ہو جاتا ہے تو آدمی چوپایوں سے بھی زیادہ گمراہ ہو جاتا ہے اور اگر روحانیت کا نفس و خواہشات پر تسلط ہو جاتا ہے تو آدمی ملائکہ سے افضل ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ کیا آپ نے (اللہ کی صنعت کی طرف) نہیں دیکھا کہ اس نے سایہ کو کیسے پھیلایا ہے یا یہ معنی ہے کیا آپ نے سایہ کو نہیں دیکھا آپ کے رب نے اس کو کیسے پھیلایا ہے۔

اول ترجمہ عقلی طور پر دلالت کر رہا ہے کہ سایہ کا پیدا ہونا اور مفید ترین اسباب ممکنہ کے ساتھ گھومنا چلنا صانع حکیم کی ہستی کو بتا رہا ہے اور چونکہ یہ استدلال بالکل واضح ہے اس لئے اسلوب کلام کو بدل دیا (مخلوق کا خالق پر اور مصنوع کا صانع کے وجود پر دلالت کرنا بالکل واضح ہے اور عقلی تائید اس کو حاصل ہے!) اور یوں فرمایا کہ کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا۔ یعنی اللہ کا رب ہونا اور سایہ کے پھیلاؤ کا فاعل حقیقی ہونا تو ایک محسوس بات ہے آنکھوں سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔

طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک کا وقت ظل کہلاتا ہے اللہ نے اس کو پھیلایا ہے اس کی تخلیق تعجب آگیں ہے کہ ظل ہے اور اس کے ساتھ آفتاب نہیں ہے (بغیر آفتاب کے سایہ ہے) جیسا کہ جنت والے سایہ کے متعلق وظل ممدود فرمایا ہے یا ظل سے مراد ہے وہ سایہ جو طلوع آفتاب کے بعد دیواروں اور درختوں وغیرہ کا ہوتا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا جو سایہ سورج سے زائل ہو جاتا ہے اس کو ظل کہتے ہیں اور جس سایہ سے دھوپ زائل ہو جاتی ہے اس کو فے کہتے ہیں گویا زوال آفتاب سے پہلے ظل ہوتا ہے اور زوال کے بعد فئے آتا ہے۔ (فیئ مونثا) زوال کے بعد سایہ بھی مشرق سے مغرب کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ظل (آخر) شب کی اس تاریخ کو کہا جاتا ہے جو سورج کے نکلنے سے زائل ہو جاتی ہے۔

وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اور اگر اللہ چاہتا تو سایہ کو ٹھہرا ہوا (یعنی غیر متحرک) بنا دیتا۔ مطلب یہ کہ سورج نکلتا ہی نہیں قیامت تک رات ہی رات رہتی۔ اس مطلب پر ساکن سکن سے مشتق ہوگا سکن کا معنی ہے ٹھہر گیا۔ یا ساکن کا معنی ہے نہ سکڑنے والا اس ترجمہ پر لفظ ساکن سکون سے مشتق ہوگا۔ یعنی سورج کو ایک ہی وضع پر قائم رکھتا۔

ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ پھر سورج کو ہم نے سایہ کی دلیل (یعنی راہنما) بنا دیا۔

اگر سورج نہ ہوتا تو سایہ کو سایہ کون جانے روشنی نہ ہو تو تاریکی کی پہچان کیسے ہو چیزوں کی شناخت ان کی ضدوں کو جاننے سے ہوتی ہے اس کے علاوہ سایہ کی کمی بیشی بھی سورج کی مرہون منت ہے۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ پھر ہم نے اس کو آسانی کے ساتھ (یا تھوڑا تھوڑا کر کے

تدریجاً) اپنی طرف سمیٹ لیا یعنی سورج کے نکلنے اٹھنے اور کرنوں کے پھیلنے سے سایہ جاتا رہتا ہے اور سایہ کی جگہ آفتاب کی شعاعیں لے لیتی ہیں اول تاریکی دھیرے دھیرے جاتی رہتی ہے یہاں تک کہ کامل اجالا ہو جاتا ہے پھر سورج نکل آتا ہے اور سورج کی شعاعیں ان مقامات پر پڑتی ہیں جہاں پہلے تاریکی ہوتی ہے۔

میرے نزدیک ان آیات کی تاویل دوسرے رنگ سے بھی کی جاسکتی ہے ظل سے مراد عالم امکان ہے عالم امکان کا وجود خارجی ظلی ہے امکان مرتبۂ وجوب کا ظل ہے شمس سے مراد ہیں اللہ کی صفات و اسماء کے مراتب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح عالم امکان کو ایجاد کیا اور اس کے وجود کو وجود واجب کا ظل ہے کس طرح ماہیات ممکنہ کی مختلف صورتوں پر پھیلا دیا اگر اللہ چاہتا تو سارے عالم امکان کے وجود کو ساکن مستقر اور ایک ہی حالت پر کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا بلکہ اس کو محل حوادث اور تغیرات و فناء کی آماجگاہ بنا دیا تاکہ وہ ذات واجب الوجود حقیقی کا محتاج رہے اور اس کی امکانی احتیاج نمودار ہو پھر ہم نے آفتاب کو اس کے لئے راہنما بنایا۔ یعنی جب اللہ کی صفات و اسماء کا جلوہ صوفی کے دل پر پڑتا ہے اور قلبی بصیرت کے ذریعہ اس کو وجود حق تعالیٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے تو اس وقت اس پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ تمام عالم امکان وجود حق تعالیٰ کا ظل ہے تجلیات و مشاہدات سے پہلے وہ خیال کرتا ہے کہ عالم امکان کا بجائے خود کوئی وجود ہے لیکن صفاتی اور اسمائی نور پاشی کے بعد اس کا یہ خیال دور ہو جاتا ہے۔

پھر ہم اس کو دھیرے دھیرے سمیٹ لیتے ہیں یعنی صوفی کو رفتہ رفتہ اپنا مقرب بنا لیتے ہیں اور ہماری صفات و ذات کی بے کیف قربت اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا فرمان نقل کیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ نوافل کے ذریعہ میرا بندہ برابر میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ الحدیث

صوفیاء کا قول ہے جس کے دونوں دن برابر (ایک جیسے) ہوں وہ گھاٹے میں رہتا ہے (یعنی جو دوسرے دن پہلے دن سے زیادہ عروج حاصل نہ کرے وہ خسارے میں ہے)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا اور وہی رب تو ہے جس نے تمہارے لئے رات کو لباس بنایا۔

تاریکی شب لباس کی طرح پردہ پوش ہے اس لئے رات کو لباس سے تشبیہ دی۔

وَالنَّوْمَ سُبَاتًا اور نیند کو بدنوں کے لئے راحت بنایا (کہ مشاغل بیداری نیند میں منقطع ہو جاتے ہیں) سبت کا لغوی معنی ہے کاٹنا (نیند مشاغل بیداری کو کاٹ دیتی ہے) یا سباتا کا ترجمہ ہے موت (اللہ نے دوسری آیت میں نیند کو وفات سے تعبیر کیا ہے اور) فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ اس معنی کے لحاظ سے مسبوت مردہ کو کہتے ہیں۔

وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ اور دن کو اٹھ بیٹھنے کا وقت بنا دیا دینی اور دنیوی کاموں کے لئے لوگ عام طور پر دن کو اٹھ جاتے اور پھیل جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ اور وہ رب وہی تو ہے جو اپنی رحمت (بارش نازل کرنے) سے پہلے ہواؤں کو بشارت دینے والیاں (بنا کر) بھیجتا ہے۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ اور ہم نے اوپر سے بالکل پاک پانی اتارا۔

طہور وہ چیز جس سے پاکی حاصل ہوتی ہے جیسے سحور سحری کا کھانا۔ فطور افطار کی چیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پاک مٹی مسلمان کو طاہر بنانے کی چیز ہے جب تک پانی نہ پائے خواہ دس سال گزر جائیں۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی عن ابی ذر ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا ساری زمین ہمارے لئے مسجد بنا دی گئی ہے اور زمین کی مٹی کو طہور (پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ) بنا دیا گیا ہے۔

یا طہور قبول کی طرح مصدر ہے مسلم و ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کے برتن میں اگر کتا منہ ڈال دے تو اس برتن کی پاکی یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھوڈالے جن میں پہلی مرتبہ مٹی سے (مانجھے) اس صورت میں پانی کو طہور کہنا بطور مبالغہ کے ہوگا۔ یا طہور خود مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی پاک ہونے میں کامل جیسے صبور بڑا صابر شکور بڑا شکر گزار قطوع بہت کاٹنے والا۔ ضحواک بہت ہنسنے والا۔

بغوی نے لکھا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ طہور اس چیز کو کہتے ہیں جو بار بار (مسلسل) پاک کرے جیسے صبور وہ چیز جس کے ذریعہ سے بار بار صبر کا ظہور ہو اور شکور وہ چیز جس کے ذریعہ بار شکر حاصل ہو اسی قول کی بنیاد پر امام مالک کے نزدیک اس پانی سے جس کو وضو میں ایک بار استعمال کر لیا گیا ہو وضو کرنا جائز ہے۔

میں کہتا ہوں یہ فضول بات ہے (پاک ہونا اور پاک کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے) فعول کے وزن کو تفصیل میں کوئی دخل نہیں پس طہور کو تطہیر سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ مزید یہ کہ وزن فعول مبالغہ (یعنی شدت و قوت فعل) پر دلالت کرتا ہے تکرار فعل یعنی کثرت) پر نہیں دلالت کرتا، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ طہور کا معنی ہے کامل الطہارت اور کامل الطہارت ہونے کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ خود بھی پاک ہو اور دوسری ناپاکی کو پاک کرنے والا ہے۔

شرعی نصوص اور متواتر روایات اور اجماع امت سے پانی کے اندر ان اوصاف کا ہونا ثابت ہے۔ پانی خود بھی پاک ہوتا ہے اور ناپاک کو بھی پاک کردینے والی چیز ہے دوسرا کامل الطہارت ہونے کا معنی یہ ہے کہ پانی اتنا پاک ہے کہ اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں بناتی۔ امام مالک کا یہی قول ہے امام مالک نے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے کہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں بناتی۔

یہ حدیث امام احمد اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کی ہے سنن اربعہ کی روایت میں ان الماء لایخبث (پانی گندہ نہیں ہوتا) آیا ہے۔ دار قطنی نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

طبرانی نے الاوسط میں اور ابو یعلی، بزار، ابو علی بن سکن نے حضرت شریک کی روایت سے اور احمد و ترمذی و ابوداؤد و نسائی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے مندرجہ ذیل حدیث بیان کی ہے کہ خدمت گرامی میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم چاہ بضاعہ (کے پانی) سے وضو کر سکتے ہیں (یہ کنواں گندہ کنواں تھا) اس میں حیض کے کپڑے، مرے ہوئے کتے اور سڑی ہوئی بودار چیزیں (جاہلیت کے زمانہ میں) ڈالی جاتی تھیں فرمایا پانی طہور (پاک یا پاک کن) ہے اس کو کوئی چیز نجس نہیں بناتی۔

ابن ماجہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا جن تالابوں میں اتر کر درندے کتے اور گدھے پانی پیتے ہیں (ان کے پانی کا حکم رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا تو) حضور ﷺ نے ان تالابوں کے متعلق فرمایا۔ ان (جانوروں) کے لئے اتنا پانی ہے جتنا انہوں نے اپنے پیٹوں میں اٹھالیا اور جو بچ رہا ہے وہ ہمارے لئے پاک ہے۔

ایک شبہ

باجماع علماء یہ احادیث متروک ہیں یہاں تک کہ امام مالک نے فرمایا جب پانی کا کوئی وصف (رنگ، مزہ، بو) نجس چیز پڑنے سے بدل جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے ہم کہتے ہیں جب پانی کا کوئی وصف بدل گیا تو وہ آب مطلق (سادہ پانی) نہیں رہا اور ہمارا کلام آب مطلق کی نجاست و طہارت کے متعلق ہے۔

ازالہ

حدیث میں (پانی سے غیر معین پانی مراد نہیں ہے بلکہ) خاص پانی مراد ہے یعنی کثیر پانی جو تالابوں میں رکا ہوا ہو اور چاہ بضاعہ وغیرہ میں (موجود) تھا۔ اس توجیہ سے احادیث کا باہمی اختلاف دور ہو جائے گا کیونکہ دوسری احادیث میں آیا ہے کہ اگر نجاست پانی میں گر جائے خواہ پانی کا کوئی وصف تبدیل نہ ہوا ہو تب بھی پانی نجس ہو جاتا ہے۔

مسلم ابوداؤد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کتا کسی کے برتن میں منہ ڈالے تو اس کی طہارت کی یہ

صورت ہے کہ اس کو سات بار دھویا جائے اول بار مٹی سے (مانجھا جائے)
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایسا نہ کرے کہ رکے ہوئے پانی میں جو جاری نہ ہو پیشاب کر کے پھر اسی سے وضو کرے۔ متفق علیہ۔
امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام بخاری امام مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ابوداؤد کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو جائے تو بغیر تین مرتبہ دھوئے اپنا ہاتھ برتن میں ہرگز نہ ڈالے کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا ہاتھ رات کو سوتے میں کہاں رہا۔ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی آئی ہے ہم نے پانی کے نجس ہو جانے یا نجس نہ ہو جانے کے سلسلہ میں احادیث متعارضہ کے تعارض کو دور کرنے کے لئے یہ قول اختیار کیا کہ اگر آب کثیر ہو تو وہ نجاست سے نجس نہیں ہوتا اور آب قلیل ہو تو نجس ہو جاتا ہے اب رہا پانی کی قلت و کثرت کا معیار تو اس کے متعلق آئمہ میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک دو مٹکے پانی آب کثیر ہے۔ (یعنی وزن میں پانچ سو عراقی رطل، پیمائش میں سوا گز (شرعی فقہی گہرا سوا گز لمبا۔ سوا گز چوڑا) اتنا پانی نجاست پڑنے سے نجس نہیں ہوتا۔ ہاں اگر نجاست سے پانی کا رنگ یا مزا یا بو بدل جائے تو کثیر پانی بھی نجس ہو جاتا ہے۔ تھوڑا پانی بہر حال نجاست پڑنے سے نجس ہو جاتا ہے (خواہ بو مزہ کوئی وصف نہ بدلے)۔
امام ابوحنیفہؒ نے کہا جو شخص آب کثیر استعمال کر رہا ہے اگر اس کے غالب خیال میں پانی اتنا ہے کہ ایک طرف کی نجاست (کا اثر) دوسرے کنارے تک پہنچنے سے قاصر ہے تو ایسا پانی کثیر ہے ورنہ قلیل ہے بعد کے کچھ علماء نے کثیر کا ایک اندازہ مقرر کر دیا کسی نے کہا دس گز چوڑا دس گز لمبا کسی نے پندرہ گز چوڑا پندرہ گز لمبا۔ کسی نے بارہ گز چوڑا بارہ گز لمبا کسی نے آٹھ آٹھ اور کسی نے سات سات گز لمبا چوڑا مقرر کیا گز سے مراد ہے کپڑے کا گز۔ اور کپڑے کا گز سات مٹھی ہوتا ہے اور ایک مٹھی سے مراد ہے چار انگل۔
امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ امام محمد کسی کے قول میں بھی آب کثیر کی کوئی متعین مقدار منقول نہیں کیونکہ شارع کی طرف سے اس کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی دو مٹکوں والی حدیث ضعیف ہے (نا قابل استدلال) اس لئے مقدار کی تعین کو اسی شخص کے غالب رائے کے سپرد کر دینا مناسب ہے جو پانی کو استعمال کر رہا ہو۔
امام شافعی اور امام احمد نے قلتین (دو مٹکوں) والی حدیث کو اپنے قول کے ثبوت میں پیش کیا ہے حق بات یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے عبداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے امام شافعی، امام احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، دار قطنی، بیہقی اور اصحاب السنن الاربعہ نے اس کو بیان کیا ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جس پانی میں درندے اور چوپائے آتے جاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے فرمایا اگر پانی دو مٹکے ہو تو گندگی کو نہیں اٹھاتا یعنی گندہ نہیں ہوتا حاکم کی روایت پر حدیث کے یہ الفاظ ہیں جب پانی دو مٹکے ہوں تو اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں بناتی۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے نجس نہیں ہو جاتا۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور بر شرط شیخین قرار دیا ہے ابن مندہ نے کہا اس حدیث کی اسناد بہ شرط مسلم ہے طحاوی نے بھی اس حدیث کی صحت کا اقرار کیا ہے۔

ایک شبہ

اس حدیث کا مدار (متفق علیہ مرکزی راوی) ولید بن کثیر ہے ولید سے آگے کبھی محمد بن جعفر بن زبیر کو راوی قرار دیا جاتا ہے کبھی محمد بن عباد بن جعفر کو اور اس سے بھی اوپر کبھی عبداللہ بن عبداللہ بن عمر کو منقول عنہ کہا گیا ہے کبھی عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر کو اس طرح یہ حدیث مضطرب ہو گئی۔
حافظ ابن حجر نے کہا اس طرح کا اضطراب حدیث کی صحت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ کیونکہ سب راویوں کو اگر معتمد مان لیا جائے تو یہ انتقال ثقہ سے ثقہ کی جانب ہو گا (جس میں کوئی حرج نہیں) پھر تحقیقی بات یہ ہے کہ ولید بن کثیر کے راوی دو ہیں

عبید اللہ بن عبد اللہ اور عبد اللہ بن عبد اللہ۔

ایک جماعت نے دونوں طریقوں سے روایت کی ہے ان دو طریقوں کے علاوہ کوئی طریقہ محض توہم پر مبنی ہے۔

دار قطنی نے کہا یہ دونوں قول صحیح ہیں اسامہ نے بروایت ولید دونوں طریقوں سے روایت کی ہے ایک تیسرا طریقۂ روایت اور بھی ہے جس کو ابن معین نے جید طریقہ کہا ہے وہ سلسلہ یہ ہے کہ حماد بن سلمہ از عاصم بن منذر از عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر۔

ایک سوال

ایک روایت میں آیا ہے لم یحمل خبثا دوسری روایت میں ہے لم ینجسہ شئی تیسری روایت میں لاتتنجس یہ اضطراب تو متن حدیث میں ہو گیا۔

جواب

یہ روایت بالمعنی ہے (معنی تینوں روایتوں کے ایک ہی ہیں کوئی تعارض نہیں) اور متن حدیث میں اضطراب اس وقت مانا جاتا ہے جب الفاظ کے اختلاف سے معانی میں تعارض پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا شبہ

حدیث میں قلتین کا لفظ مشکوک ہے کیونکہ اذا بلغ الماء قلتین اوثلا ثا آیا ہے اور لفظ او شک پیدا کر رہا ہے امام احمد نے بروایت وکیع اور دار قطنی نے بروایت یزید بن ہارون پھر اس سے آگے وکیع اور یزید نے بروایت عاصم بن منذر از عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر مرفوعاً یہ حدیث الفاظ مندرجہ بالا کے ساتھ بیان کی ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے حماد سے نیچے راویوں کی روایت میں اختلاف ہے ابراہیم بن حجاج اور کامل بن طلحہ نے بروایت حماد انہی الفاظ مذکورہ کے ساتھ حدیث بیان کی ہے لیکن عفان اور یعقوب بن اسحاق حضرمی اور بشر بن سری اور علاء بن عبد الجبار اور موسیٰ بن اسماعیل اور عبید اللہ بن موسیٰ عیسٰی نے بروایت حماد بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اذا کان الماء قلتین اس سے آگے ثلاثا کا لفظ نہیں ہے صرف قلتین کا لفظ ہے۔

اسی طرح ابن سباح نے بروایت یزید بن ہارون جو حدیث نقل کی ہے اس میں لفظ او شکیہ ہے لیکن حضرت ابن مسعود کی روایت میں شک کا کوئی لفظ نہیں (یعنی اوثلاثا نہیں ہے) للذا عمل اس روایت پر واجب ہے جس میں حرف شک نہیں ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ او شک کے لئے نہیں بلکہ تردید یا تخییر کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ دونوں مقداروں میں سے کسی مقدار کو پانی پہنچ جائے وقوع نجاست سے نجس نہیں ہوتا خواہ دو مٹکوں کے بقدر ہو جائے یا تین مٹکوں کے بقدر۔

اگر شبہ کیا جائے کہ بعض روایتوں میں چالیس مٹکوں کا لفظ آیا ہے دار قطنی ابن عدی اور عقیلی نے بروایت قاسم بن عبد اللہ العمری از محمد بن منکدر بیان کیا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا حضور کا ارشاد گرامی ہے جب پانی چالیس مٹکوں تک پہنچ جائے (یعنی جب پانی بقدر چالیس مٹکوں کے ہو جائے) تو گندگی کا حامل نہیں رہتا (یعنی گندہ ناپاک نہیں ہوتا)

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہا امام احمد یحیٰی بن معین ابوزرعہ اور ابو حاتم رازی نے قاسم بن عبد اللہ کے متعلق کہا یہ دروغ گو خود حدیثیں بناتا تھا۔ اس لئے قاسم کی روایت سے آئی ہوئی حدیث سے صحیح حدیث کو مضطرب نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اگر شبہ کیا جائے تو دار قطنی نے صحیح سند کے ساتھ حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اذا بلغ الماء اربعین قلتہ لم یتنجس یہ حدیث بطریق روح بن قاسم از روایت ابن منکدر از ابن عمر آئی ہے البتہ مرفوع نہیں ہے موقوف ہے وکیع بن سفیان ثوری اور معمر نے بھی ابن منکدر کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے اور اگر اپنی روایت کے خلاف راوی کا قول ہو تو حدیث کو مطعون کر دیتا ہے اس لئے ابن عمر کی قلتین والی مرفوع روایت مجروح ہے۔

ہم کہتے ہیں امام ابو حنیفہ کے نزدیک تو مطلقاً کسی حالت میں بھی شرط کا مفہوم حجت نہیں ہوتا اور امام شافعی کے نزدیک اگر سوال کے جواب میں شرط لگائی گئی تو اس کا مفہوم حجت نہیں ہوتا (اس لئے اذا بلغ الماء اربعین قلۃ کا یہ مطلب نہیں

ہو سکتا کہ اگر پانی چالیس مٹکوں سے کم ہو تو وقوع نجاست سے نجس ہو جاتا ہے کیونکہ شرط علت حکم نہیں ہے)
دوسری بات یہ ہے کہ لفظ قلتہ مشترک ہے کوزہ لوٹا اور گھڑا اسکو قلتہ کہا جاتا ہے چھوٹا ہو یا بڑا لہذا تعارض احادیث دور کرنے کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ قلتین والی حدیث میں دو بڑے مٹکے مراد ہیں اور چالیس مٹکوں والی حدیث میں قلتہ سے مراد ہوگا ایک لوٹا اتنا کہ بیس لوٹے ایک بڑے مٹکے کے برابر ہو جائیں اس طرح دو مٹکے چالیس لوٹوں کے برابر ہو جائیں گے۔

مزید شبہ

اگر قلتہ کا لفظ مشترک ہے گھڑا، مشک، ڈول اور پہاڑ کی چوٹی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ صاحب قاموس نے اس لفظ کی تشریح میں لکھا ہے سر کی چوٹی، کوہان، پہاڑ کی چوٹی، بڑا کنواں، بڑا گھڑا، معمولی گھڑا، پیالہ، لوٹا وغیرہ تو پھر قلتہ کے معنی کی تعیین خود ساختہ ہے اور ہجر کے مٹکوں کی تعین کسی صحیح مرفوع حدیث میں مذکور نہیں ہاں ابن عدی نے حضرت ابن عمر کی حدیث ضرور نقل کی ہے اذا بلغ الماء قلتین من قلال هجرلم ینجسه شئی اس حدیث میں ضرور ہجر کے مٹکوں کا ذکر آیا ہے لیکن اس کی سند میں مغیرہ بن صقلان ایک راوی ہے جو منکر الحدیث ہے۔

لہٰذا لفظ قلہ سے کیا مراد ہے اس کی تعیین خود نہیں کی جاسکتی اور اس حدیث پر عمل ترک کر دیا جائے گا مجمل کا یہی حکم ہے۔

ہم کہتے ہیں پہاڑ کی چوٹی، یا کوہان، یا سر کی چوٹی تو باجماع علماء مراد نہیں ہے (اور عقل اور روایت کے بھی خلاف ہے) دو پہاڑوں کی چوٹی تک پانی کا پہنچ جانا سوائے سمندری پانی کے اور کسی پانی کے لئے ممکن نہیں اسی طرح کوہان شتر یا سر کی چندیا تک پانی کا پہنچ جانا بھی ناقابل تصور ہے پھر (باتفاق علماء) اس مقدار سے کم پانی بھی آب کثیر ہوتا ہے لہٰذا لفظ قلہ سے ظرف کی طرف انتقال ذہنی ہونا حدیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے اور ظروف مختلف ہیں سب پر لفظ قلہ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہجر کے مٹکوں کی تعین قابل ترجیح ہے کیونکہ عرب نے اپنے اشعار میں لفظ قلہ کا استعمال اس معنی میں کیا ہے۔ کذا قال ابو عبیدہ فی کتاب الطہور بیہقی نے کہا ہجر کے مٹکے عرب میں مشہور تھے یہی وجہ ہے کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا فاذا ورقها مثل آذان الفيله واذا نبقها مثل قلال هجر میں نے دیکھا کہ اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی مثل اور اس کے بیر (پھل) ہجر کے مٹکوں کے برابر تھے۔

تعیین کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ازہری کے قول کے مطابق ہجر کے مٹکے سب سے بڑے مٹکے ہوتے تھے اور جب شارع نے پانی کی مقدار تعداد سے بیان کی تو عدد سے مراد سب سے بڑا عدد ہی ہونا چاہئے جب ایک بڑا برتن دو چھوٹے برتنوں کے برابر ہو تو ایک کو چھوڑ کر دو چھوٹے برتنوں کا ذکر کرنا بے سود ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب دو چھوٹے مٹکوں کے بقدر پانی میں نجاست گرنے سے پانی نجس نہیں ہوتا تو دو بڑے مٹکوں کے بقدر پانی میں نجاست گرنے سے پانی کا نجس نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ضروری ہو جاتا ہے اس لئے احتیاطاً بڑے مٹکوں کی تعین کر دی چھوٹے مٹکوں کے برابر پانی تو بڑے مٹکوں میں آہی جاتا ہے۔

ایک قوی معارضہ

قلتین والی حدیث کو حافظ ابن عبدالبر، عاصی اسماعیل بن اسحاق اور ابو بکر بن ولی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ یہ تینوں حضرات مالکیہ مسلک کے تھے ابن عبدالبر نے کہا شافعی کا قول درایت کے اعتبار سے بھی کمزور ہے اور نقل کے لحاظ سے بھی ثابت نہیں ہے یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے صحیح ہونے میں علماء کی ایک جماعت کو کلام ہے پھر کسی صحیح حدیث میں قلتین کی مقدار کی تعیین بھی منقول نہیں نہ اجماع سے ثابت ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں گزشتہ سوالات مجمل طور پر علماء کے اقوال میں آئے ہیں لیکن اس حدیث کے کسی راوی کو کسی نے ضعیف نہیں کہا کیونکہ اس کے سارے راوی وہ ہیں جو صحیحین کے رواۃ ہیں۔ سوالات کے ترتیب وار جواب دیئے

گئے ہیں اس لئے ان حضرات کا قول قابل رد ہے۔

مسئلہ:- وضو اور غسل پانی کے علاوہ کسی اور سیال چیز سے بالاتفاق ناجائز ہے اللہ نے فرمایا فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا یعنی پانی نہ ملنے کی صورت میں پاک مٹی سے تیمم کرنے کا حکم دیا دوسرے سیال کا ذکر نہیں فرمایا لیکن کیا نجاست حقیقیہ کو بھی پانی کے علاوہ دوسری سیال چیزوں سے پاک کرنا جائز ہے۔ جمہور نے کہا ناجائز ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا جائز ہے بغوی نے جمہور کی طرف ہے اسی آیت کو بطور استدلال پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ آیت میں طہور بمعنی مطہر (پاک کرنے والا) ہے کیونکہ دوسری آیت میں بارش کے پانی کو مطہر فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ اس سے معلوم ہوا کہ پاک کرنے کا وصف صرف پانی میں ہوتا ہے اگر نجاست کا ازالہ دوسری سیال چیزوں سے جائز قرار دیا جائے گا تو بے وضو ہونے اور جنابت کی ناپاکی کا ازالہ بھی دوسری سیال چیزوں سے جائز ماننا پڑے گا۔ بغوی کا یہ استدلال صحیح نہیں اگر پانی کو (مطہر پاک کرنے والا) کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی دوسرا سیال مطہر ہو نہیں سکتا جیسا کہ پانی کا ظاہر ہونا موجب حصر نہیں کہ پانی ہی پاک ہو اور کوئی دوسرا سیال پاک نہ ہو۔

امام ابو حنیفہ نے کہا حدث (بے وضو ہونے یا جنابت کی ناپاکی) اور نجاست حقیقیہ میں فرق ہے حدث تو حکمی نجاست ہے (شارع نے اس کو نجاست قرار دیا ہے) ورنہ آنکھوں سے دیکھی جانے والی نجاست نہیں۔ اس نجاست کا ازالہ صرف پانی سے بنص قرآن و باجماع امت ہوتا ہے کسی دوسرے سیال سے حدث کا ازالہ نہ کتاب اللہ سے ثابت ہے نہ اجماع سے اور چونکہ (نجاست حکمی اور طہارت حکمی کا) یہ مسئلہ خلاف قیاس ہے۔ اس لئے ازالۂ حدث کے لئے پانی پر دوسرے سیالوں کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن نجاست حقیقیہ تو آنکھوں سے دیکھی جانے والی ہے پانی سے اس کا ازالہ عقل کے موافق ہے اس لئے دوسرے پاک سیالوں کو اس جگہ پانی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں (امام ابو حنیفہ کی حدث و نجاست میں یہ تفریق درست ہے) لیکن اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ پاک پانی کو جب کسی نجس میں ڈالا جاتا ہے تو نجس کے ساتھ ملتے ہی پانی نجس ہو جاتا ہے، اب تین مرتبہ یا سات مرتبہ دھونے کے بعد نجس (کپڑے وغیرہ) کا پاک ہونا (غیر عقلی اور) محض تعبدی ہے (شریعت نے نجس کو پاک کرنے کا یہی طریقہ بتایا ہے) اور نچوڑنے کے بعد بھی سارا نجس پانی نکل نہیں جاتا۔ کچھ باقی ہی رہتا ہے لہذا قیاس کا تقاضا تھا کہ نجس کپڑا وغیرہ دھونے سے پاک ہی نہ ہو اسی لئے گزشتہ شریعتوں میں کپڑے کو پاک کرنے کا صرف یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ نجس حصہ کاٹ دیا جائے اسلام میں ناپاک کپڑے وغیرہ کو پاک کرنے کا طریقہ صرف دھونے کو قرار دیا گیا اور یہ سراسر قیاس کے خلاف ہے (اور جو شرعی حکم خلاف قیاس ہو اس پر کسی دوسرے مسئلہ کو قیاس نہیں کیا جاسکتا) اس لئے دوسرے سیالوں کو پانی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

مسئلہ:- پانی میں نجاست پڑنے سے جس طرح پانی ناپاک ہو جاتا ہے اسی طرح پانی اگر نجاست پر پڑ جائے تو ناپاک ہو جاتا ہے کیونکہ نجس بنانے والا صرف اختلاط ہے پانی میں نجاست کا اختلاط ہو یا نجس چیز کے ساتھ) پانی کا اختلاط۔ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ابن جوزی نے امام احمد کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ نجاست کا دھوون طہارت کا مقام (بدن یا کپڑا وغیرہ) کے بعد جب مقام سے الگ ہو جائے اور اس میں کوئی تغیر نہ آیا ہو (یعنی بو رنگ مزہ وغیرہ میں فرق نہ آیا ہو) تو وہ پاک ہے اسی طرح پیشاب اگر زمین وغیرہ پر گر جائے اور جتنا پانی اس پر بہایا جائے اس سے پیشاب کی مقدار کم اور مغلوب ہو اور پانی میں کوئی تغیر آیا ہو تو یہ پانی پاک ہے اور وہ مقام بھی پاک ہو جائے گا۔ یہی قول امام مالک اور امام شافعی کا ہے اس کی دلیل حضرت انس بن مالک کی یہ حدیث ہے کہ (ایک بار) رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے ایک اعرابی آیا اور اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ حضور ﷺ نے حاضرین میں سے ایک شخص سے فرمایا تم اٹھ کر ایک ڈول پانی لے آؤ اور اس پر بہا دو۔ رواہ احمد والبخاری و مسلم فی الصحیحین۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث قیاس صحیح کے خلاف ہے اس لئے اس کا مطلب یہ قرار دیا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے اس

جگہ کی مٹی ہٹوا دینے کا اور پھر اس پر پانی بہانے کا حکم دیا ہوگا اور یہ بات بعض احادیث میں آئی بھی ہے دار قطنی نے عبد الجبار کے طریق سے بروایت ابن عینیہ از یحیی بن سعید بیان کیا کہ حضرت انس ؓ نے فرمایا ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا حضور گرامی نے فرمایا اس جگہ کو کھود دو (اور مٹی نکال کر) پھر اس جگہ ایک ڈول پانی بہا دو۔ حافظ ابن حجر نے کہا اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں اگر شبہ کیا جائے کہ اس روایت میں دار قطنی نے کہا ہے کہ عبد الجبار کو ابن عینیہ کے متعلق وہم ہو گیا کیونکہ ابن عینیہ کے ساتھیوں نے جو حافظ الحدیث کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ابن عینیہ کی وساطت سے بروایت یحیی بن سعید یہ حدیث بیان کی ہے اور اس میں کھودنے کا حکم دینے کا ذکر نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں عبد الجبار ثقہ ہے اور ثقہ کی روایت میں اگر کچھ زیادتی ہو تو وہ قابل قبول ہوتی ہے۔

دار قطنی نے حضرت ابن مسعود وغیرہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے لیکن اس کی سند کمزور ہے مگر سند میں کوئی راوی ایسا نہیں کہ کسی نے اس کو متہم بالکذب کیا ہو۔

دار قطنی اور ابو داؤد نے عبد اللہ بن مغفل بن مقرن مزنی کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے اور دار قطنی نے یہ بھی کہا ہے کہ عبد اللہ بن مغفل تابعی تھے اور ان کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر اس کے رواۃ کے سلسلہ میں ایک شخص جریر بن حازم بھی ہے جس کے متعلق ذہبی نے لکھا ہے کہ جریر ثقہ ہے امام ہے مگر اس کی دماغی حالت مرنے سے (کچھ) پہلے بگڑ گئی تھی اسی لئے اس کے بیٹے وہب نے اس کو بیان حدیث سے روک دیا تھا اور مرتے دم تک پھر اس نے کوئی حدیث نہیں بیان کی۔ ابن معین نے کہا جریر بن حازم نے جب قتادہ کے سلسلہ سے حدیث بیان کی تو وہ ضعیف ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث بسلسلۂ قتادہ نہیں ہے بلکہ عبد اللہ بن عمیر کے سلسلہ سے منقول ہے اور عبد اللہ بن عمیر ثقہ (قابل بھروسہ) ہے۔ صحیحین کا راوی ہے۔

امام احمد نے اس حدیث کو منکر کہا ہے لیکن یہ جرح اجمالی ہے اور اجمالی جرح (بغیر کسی تفصیلی دلیل کے) قابل قبول نہیں۔ امام احمد نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مشہور حدیث میں کھودنے کا ذکر نہیں آیا ہے لیکن یہ کوئی جرح نہیں غیر مشہور حدیث میں اگر ثقہ راوی نے کوئی لفظ زیادہ نقل کیا ہو تو قابل قبول ہوتا ہے۔

طحاوی نے بطریق ابن عینیہ از عمرو بن دینار از طاؤس بیان کیا اسی طرح سعید بن منصور نے بروایت ابن عینیہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس مقام کو کھود دو (پھر اس پر پانی بہا دو) یہ حدیث بھی مرسل ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک مرسل مسند سے زیادہ قوی ہوتی ہے امام مالک اور امام احمد کے نزدیک مسند کا مرتبہ مرسل سے اونچا ہے لیکن مرسل کے حجت ہونے میں کلام نہیں امام شافعی کے نزدیک مرسل حدیث اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتی جب تک اس کے اندر پانچ شرطوں میں سے ایک شرط متحقق نہ ہو۔ کسی دوسرے راوی نے اس کو مسند کیا ہو یا مرسل ہی کیا ہو مگر شیوخ مختلف ہوں یا کسی صحابی کا قول یا اکثر اہل علم کا قول اس کا موئد ہو یا یہ معلوم ہو کہ اس شخص نے بغیر مروی عنہ کا نام لئے جو یہ حدیث بیان کی ہے تو اس کا قاعدہ اور عادت ہی یہ ہے کہ یہ شخص جب کوئی حدیث مرسلاً بیان کرتا ہے تو عادل شخص ہی اس کا مروی عنہ ہوتا ہے۔

اس جگہ مرسل طاؤس صحیح ہے کیونکہ اس کی تائید مرسل عبد اللہ بن مغفل سے ہو رہی ہے اور یہ سلسلہ حسن بھی ہے اور مسند انس صحیح ہے یا حسن ہے البتہ مسند ابن مسعود ضعیف ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت تمام روایات سے زیادہ قوی اور زیادہ قابل ترجیح ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ صحیحین کی حدیث سند کے اعتبار سے ضرور صحیح ہے لیکن معنی کے لحاظ سے کمزور ہے کیونکہ اس کا تصادم ان احادیث سے ہو رہا ہے جو تقریباً متواتر ہیں اور نجاست کے اختلاط سے پانی کے نجس ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ ترجیح کی تلاش تعارض کے وقت ہوتی ہے اور اس جگہ احادیث میں تعارض نہیں ہے بلکہ احادیث مذکورۃ الصدر میں مٹی کھودنے کا ذکر ہے اور حضرت انس کی حدیث مٹی کھودنے کے ذکر سے خاموش ہے اس لئے عمل کسی

حدیث پر ترک نہیں کیا جائے گا۔
مسئلہ:- ازالۂ حدث کے لئے پانی کا استعمال کیا گیا ہو یا صرف حصول ثواب کے لئے وضو کیا گیا ہو بہر حال ایسا مستعمل پانی جمہور کے نزدیک پاک ہے حسن کی روایت میں امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ایسا پانی نجس ہے نجاست غلیظہ امام ابو یوسف کی روایت میں ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ایسے پانی کی نجاست خفیف ہے کیونکہ نجس ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام محمد کی روایت ہے کہ آب مستعمل کے متعلق امام ابو حنیفہ کا قول جمہور کے مسلک کے مطابق ہے یعنی آب مستعمل پاک ہے عام حنفیہ جو آب مستعمل کو نجس کہتے ہیں ان کی دلیل حدیث بھی ہے اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے حدیث حضرت ابوہریرہ کی روایت سے صحیح مسلم میں آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی جنابت والا رکے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے۔ ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں تم میں سے کوئی رکے ہوئے پانی میں ہر گز پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں غسل جنابت کرے اور یہ ممانعت تحریمی نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ جنابت والے کے بدن کا کوئی حصہ منی سے آلودہ ہو (اور یہ نجاست پانی میں گھل کر پانی کو ناپاک بنا دے اس صورت میں تو بالاتفاق پانی نجس ہوگا، اختلاف تو نجاست حکمیہ کے متعلق تھا) یہ ممانعت ایسی ہی ہے جیسے بیدار ہونے والے کو بغیر ہاتھ دھوئے برتن میں ہاتھ ڈالنے کی ممانعت کی گئی تھی کیونکہ احتمال تھا کہ شاید رات میں ہاتھ نجاست حقیقیہ سے آلودہ ہو گیا ہو حضور ﷺ نے خود بطور اشارہ فرما دیا تھا فانہ لا یدری این باتت یدہ رہا قیاس سے استدلال تو وہ ظاہر ہے کہ نجاست حقیقیہ جس پانی کو استعمال کر کے دور کی جاسکتی ہے وہ نجس ہو جاتا ہے پس اسی پر قیاس ہم اس پانی کے استعمال کو کریں گے جو ازالۂ حدث کے لئے یا حصول ثواب کے لئے استعمال کیا گیا ہو علت مشترکہ استعمال ہے۔
ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ قیاس غلط ہے مقیس اور مقیس علیہ میں وجہ تفریق موجود ہے نجاست حقیقیہ جس پانی کو استعمال کر کے دور کی جاتی ہے وہ نجس تو اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں نجاست کے اجزاء مخلوط ہو جاتے ہیں اور نجاست حکمیہ کو دور کرنے والے پانی میں نجاست حکمیہ کے اجزاء شامل نہیں ہوتے کیونکہ حدث (خواہ اصغر ہو یا اکبر بہر حال) ایک امر حکمی ہے اور ایسی نجاست کے اجزاء نہیں ہوتے نہ ایسی نجاست کو زائل کرنے کے اجزاء ہوتے ہیں اگر پانی سے کوئی ایک عضو دھو لیا جائے تو کیا طہارت ہو جائے گی ایسا ہر گز نہیں ہوتا بلکہ جنابت والا جب تک کل بدن نہ دھوئے اور وضو کرنے والا جب تک چاروں اعضاء نہ دھوئے طہارت نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ وضو کے پانی کا ایک ایک جز پاک ہے (کیونکہ اس نے نجاست حکمیہ کو دور نہیں کیا) لہٰذا پورا آب مستعمل بھی پاک ہے کیونکہ پاک قطرہ جب پاک قطرہ سے ملے گا تو مجموعہ ناپاک نہیں ہو سکتا۔
اگر صرف حصول ثواب کے لئے (وضو پر) وضو کیا جائے تو حنفیہ اس مستعمل پانی کو نجس کہتے ہیں اور ثبوت میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وضو کرتا ہے اور اچھی طرح کرتا ہے اس کی خطائیں اس کے جسم سے نکل جاتی ہیں یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں متفق علیہ عن عثمان و مسلم عن ابی ہریرۃ نحوہ۔
یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ گناہ بدن سے پانی کے ساتھ نکل جاتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ گناہ گندگی ہیں جس طرح دوسری گندگیوں کے مخلوط ہو جانے سے پانی نجس ہو جاتا ہے اسی طرح گناہوں کی گندگی ملنے سے بھی نجس ہو جانا ضروری ہے۔
حنفیہ کا یہ استدلال بالکل غلط ہے کیونکہ گناہوں کی کوئی جسامت نہیں نہ وہ عوارض ہیں کہ پانی کے ساتھ مخلوط ہو جائیں۔ گناہ نجاست حقیقیہ کی طرح نہیں ان کا بدن سے خارج ہونا نجاست حقیقیہ کے خارج ہونے کی طرح نہیں کہ جس کے مخلوط ہونے سے پانی نجس ہو جائے بلکہ گناہوں کے خارج ہونے کا معنی ہے معاف ہو جانا بخشا جانا۔ اگر گناہ دوسری گندگیوں کی طرح ہوتے تو گناہ گار مومنوں کی نماز (گناہوں سے آلودہ ہونے اور پاک نہ ہونے کی حالت میں) جائز ہی نہ ہوتی حالانکہ گناہ گار مومن کی نماز تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ رسول اللہ ﷺ کا بھی ارشاد گرامی ہے۔ کہ پانچویں نمازیں (درمیانی اوقات کے گناہوں کے لئے) اور جمعہ کی نماز آئندہ جمعہ تک (کے گناہوں) کے لئے اور رمضان (آئندہ) رمضان تک (کے گناہوں) کے لئے کفارہ ہیں درمیانی (اوقات و ایام کے) گناہوں کو اتار دینے والے

ہیں بشرطیکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچار ہے رواہ مسلم عن ابی ہریرہ۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا اظہار کر دیا اس پر آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ الی آخرہ نازل ہوئی۔ متفق علیہ۔

آب مستعمل کو جو لوگ پاک کہتے ہیں ان کے قول کی تائید متعدد احادیث سے ہوتی ہے۔ حضرت جابر کا بیان ہے میں بیمار تھا۔ بیہوش پڑا تھا۔ رسول اللہ ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے آکر وضو کیا اور وضو کا پانی میرے اوپر ڈالا مجھے فوراً ہوش آگیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے وارث نہ میرے ماں باپ ہیں نہ اولاد، اس پر آیت فرائض نازل ہوئی۔ متفق علیہ۔

حضرت سائب بن یزید کا بیان ہے مجھے میری خالہ رسول اللہ کی خدمت میں لے گئیں اور عرض کیا یہ میری بہن کا لڑکا دکھی ہے حضور ﷺ نے برکت کی دعا کی پھر وضو کیا اور حضور ﷺ کے وضو کا پانی میں نے پیا متفق علیہ۔

حضرت مسور بن مخرمہ کی حدیث صلح حدیبیہ کے تذکرے کے ذیل میں آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب کوئی تھوک تھوکا تو خدا کی قسم وہ (زمین پر گرنے کے بجائے) کسی آدمی کے ہاتھ پر لگا اور اس نے اس لعاب کو اپنے بدن اور چہرے پر مل لیا۔ حضور جب وضو کرتے تھے لوگ وضو کے پانی کو لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وضو کے پانی پر لڑ پڑیں گے۔ رواہ البخاری۔

مسئلہ:- ازالۂ حدث یا حصول ثواب کی خاطر جس پانی کو (غسل یا وضو کی شکل میں) استعمال کر لیا گیا ہو کیا اس سے نجاست حقیقیہ کو دور کیا جا سکتا ہے بالاتفاق علماء اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ ہاں جن لوگوں کے نزدیک ایسا پانی نجس ہوتا ہے ان کے نزدیک اس پانی سے نجاست حقیقیہ کو پاک نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا اس پانی سے (دوبارہ) غسل اور وضو کیا جا سکتا ہے اس میں ائمہ کا اختلاف ہے امام محمد کے نزدیک جس پانی کو حصول ثواب کے لئے (بصورت وضو بالا وضو) استعمال کر لیا گیا ہو اس سے دوبارہ غسل یا وضو نہیں ہو سکتا۔ ایسا پانی پاک تو ہے لیکن پاک کن نہیں ہے امام زفر اور امام شافعی کے نزدیک ازالۂ حدث کے لئے جس پانی کو استعمال کر لیا گیا ہو اس سے غسل اور وضو جائز نہیں وہ طاہر ہے مطہر (پاک کرنے والا) نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ کا قول ہے جس پانی کا استعمال کر لیا گیا ہو خواہ ازالۂ حدث کے لئے یا حصول ثواب کے لئے بہر صورت وہ پاک تو ہے پاک کرنے والا نہیں ہے غیر مطہر ہونے پر حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے اور قیاس سے بھی۔ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی رکے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے۔ اس حدیث میں رکے ہوئے پانی میں غسل کرنے کی ممانعت فرمائی گئی اور اس ممانعت کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے یا یہ وجہ ہے کہ وہ مطہر نہیں رہتا استعمال کے بعد پانی کا نجس ہو جانا تو نا قابل تصور ہے صرف دوسری ہی شق باقی رہی یعنی وہ طاہر تو ہے مطہر نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں ممانعت تحریمی نہیں تنزیہی ہے اور احتمال ہے کہ نجاست حقیقیہ ہو لیکن احتمال نجاست کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ پانی نجس ہو گیا طہارت یقینی احتمال و شک سے نجاست میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مطہر ہونا مطلق پانی کا لازمی وصف ہے۔

ازالۂ حدث یا حصول ثواب کے لئے استعمال کردہ پانی کو غیر مطہر قرار دینے والے اس پانی کو زکوٰۃ پر قیاس کرتے ہیں۔ علت مشترکہ جامعہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے اسقاط فرض بھی ہوتا ہے اور حصول ثواب بھی اس کی تفصیل و توضیح یہ ہے کہ اسقاط فرض اور عبادت مقصودہ (یعنی اقامت قربت) سے درمیانی ذریعہ میں کثافت اور کسی قدر گندہ پن ضرور آ جاتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ نجس ہو جائے اسی لئے مال زکوٰۃ اپنی کثافت اور گندہ پن کی وجہ سے ہاشمیوں کے لئے ضرور حرام کر دیا لیکن اس کو نجس نہیں قرار دیا گیا۔ پس اسی طرح ازالۂ حدث یا حصول ثواب کے لئے پانی کا استعمال ایک حد تک پانی کو کثیف ضرور بنا دیتا ہے مطہر ہونے کی صفت ضرور جاتی رہتی ہے لیکن نجاست کی حد تک کثافت نہیں پہنچتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ اسقاط فرض یا اقامت قربت سے (درمیانی ذریعہ میں) کثافت اور گندہ

پن آجاتا ہے۔ ہاشمیوں کے لئے مال زکوٰۃ کی حرمت تو صرف امر تعبدی ہے (غیر عقلی) مقام غور ہے کہ بدن اور لباس کے ذریعہ سے بھی تو نماز ادا کی جاتی ہے ان کو استعمال کرنے سے اسقاط فرض بھی ہوتا ہے اور حصول ثواب بھی لیکن ان دونوں میں سے کسی میں بھی اسقاط فرض یا اقامت قربت سے نہ کثافت آتی ہے نہ گندہ پن۔

اسی طرح قربانی کرنے سے اداء واجب ہو جاتا ہے اور اس سے قربانی کے گوشت میں نہ کثافت آتی ہے نہ گندہ پن رسول اللہ ﷺ نے قربانی کا گوشت تناول فرمایا تھا۔

اس کے علاوہ مطلق پاک پانی کا مطہر ہونا پانی کی لازمی صفت ہے (جب پاک ہوگا تو پاک بھی کرے گا) کیونکہ اللہ نے فرمایا فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا مطلق پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کا حکم دیا گیا ہے اور آب مستعمل بہر حال مطلق پانی کے ذیل میں آتا ہے اس لئے مستعمل پانی کی موجودگی میں تیمم جائز نہ ہوگا بلکہ اسی پانی سے وضو واجب ہوگا۔

اگر شبہ کیا جائے کہ مستعمل پانی مطلق پانی کے ذیل میں نہیں آتا۔ مطلق پانی تو وہی ہوگا جس میں کوئی کثافت نہ ہو ایسے پانی سے تو بہر حال نماز کے لئے وضو جائز ہے مطلق پانی کہنے سے آب مقید، آب نجس اور کثافت والا گندہ پانی خارج ہو گیا۔

ہم کہتے ہیں کہ اول تو یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کہ آب مستعمل میں کوئی ایسی چیز شامل ہو جاتی ہے (جو آب مطلق کی فہرست سے اس کو خارج کر دیتی ہے اور) جس کی موجودگی کی وجہ سے اس پانی سے وضو نا جائز ہو جاتا ہے یہ تو مصادرہ ہے (جو دلیل ہے وہی دعویٰ ہے دلیل دعویٰ پر موقوف ہے) دوئم یہ کہ مطلق پانی لغوی اعتبار سے وہی ہوتا ہے جس پر لفظ آب کا اطلاق بلا قید ہوتا ہو اور اس میں شک نہیں کہ مطلق پانی کہنے میں پاک پانی نجس پانی جس کا کوئی وصف نہ بدلا ہو (نہ رنگ، نہ مزہ نہ بو) نیز مستعمل پانی خواہ اس کا استعمال حصول ثواب کے لئے کیا گیا ہو یا صرف گرمی دور کرنے کے لئے سب ہی داخل ہیں۔ اسی لئے زہری کا قول ہے کہ کتا جب کسی کے برتن میں منہ ڈال دے اور دوسرا پانی وضو کرنے کے لئے موجود نہ ہو تو اسی سے وضو کرلے (تیمم نہ کرے) سفیان ثوری نے کہا بعینہ یہی فقہی مفہوم ہے آیت فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا کا (یعنی مطلق پانی نہ ملے تو تیمم کرلو) بخاری نے اس کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو استعمال نجاست سے منع کر دیا ہے اور ان سے پرہیز رکھنے کی ہدایت فرمادی ہے صریح آیت ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور آیت وضو میں فرمایا ہے وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے مسلم نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو (برتن میں جو کچھ پانی ہو) اس کو بہادے پھر برتن کو سات مرتبہ دھوڈالے دوسری حدیث میں آیا ہے ان گندگیوں (اور نجاستوں) میں سے کسی گندگی میں اگر کسی کو مبتلا ہونا پڑ جائے تو بندش خدا کے مطابق بچارہے۔

ایک اور آیت میں اللہ نے فرمایا ہے يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اب اگر کسی کو نجس پانی مل جائے تو حقیقت میں اس کو شرعی پانی نہیں ملا کیونکہ شریعت نے نجس پانی کے استعمال کی ممانعت فرمادی ہے جیسے کوئی کنویں کے کنارہ پر بیٹھا ہو اور ڈول (رسی) نہ ہو تو ظاہر ہے کہ فطری قدرتی طور پر پانی کو استعمال کرنا اس کے لئے ممنوع ہو گیا طبعاً وہ خود کنویں میں گر نہیں سکتا اسی طرح بیمار کے پاس پانی ہو اور (شدت مرض کے خوف سے) اس کے لئے شرعاً اور طبعاً استعمال سے روک حاصل ہو گئی ہے ممنوع شرعی کا حکم ممنوع طبعی کی طرح ہے رہا مستعمل پانی تو چونکہ وہ پاک ہے اس لئے اس کا استعمال ممنوع شرعی نہیں۔ اب جس کو آب مستعمل مل جائے تو اس کے لئے حقیقت میں بھی پانی مل گیا اور شرعی اعتبار سے بھی اس کے لئے ممانعت نہیں ہے اس لئے اس کی موجودگی میں تیمم جائز نہیں ہو سکتا اسی کو استعمال کرنا چاہئے وہ یقیناً (ظاہر ہونے کے علاوہ) مطہر بھی ہوگا۔

مسئلہ :- پانی میں اگر کوئی پاک چیز گر جائے اور (پانی کے تینوں اوصاف میں سے) کوئی وصف نہ بدلا اور پانی کے قوام میں بھی کوئی اضافہ نہ ہوا ہو تو اس سے باتفاق علماء وضو جائز ہے لیکن اگر کوئی ایک یا ایک سے زیادہ وصف میں تغیر آ گیا ہو اور اس سے

اجتناب دشوار ہو جیسے برسات کے موسم میں مٹی یا پتوں کے ملنے سے پانی کے بعض اوصاف بدل جاتے ہیں تو اس سے بھی بالاتفاق وضو جائز ہے بشرطیکہ پانی کی طبعی حالت یعنی رقت باقی ہو اس میں تغیر نہ آیا ہو جیسے ایک جگہ پڑا رہنے سے پانی کی حالت ہو جاتی ہے لیکن اگر اس سے اجتناب دشوار نہ ہو جیسے سرکہ یا زعفران ملا ہوا پانی یا اشنان کا آمیختہ ایسی حالت میں اگر پانی کا کوئی ایک وصف بدل گیا ہو تو امام شافعی کے نزدیک اس سے وضو جائز نہیں کیونکہ ایسا پانی اب مطلق نہیں رہا آپ مقید ہو گیا (یعنی عرق ہو گیا) اور آب مطلق نہ ہو تو تیمم کا حکم ہے (لہٰذا تیمم کیا جائے)

امام ابو حنیفہ نے فرمایا اس سے وضو جائز ہے ہاں اگر کوئی جامد چیز آمیختہ ہو جائے جس سے پانی میں گاڑھا پن آ گیا یا پانی کے بیشتر اوصاف بدل گئے جیسے نبیذ کی حالت ہوتی ہے (نبیذ جیسا نیدہ پانی میں کوئی چیز بھگوئی ہوئی یا حد خاص تک پکائی ہوئی) یا کوئی سیال چیز ہی زیادہ مقدار میں پانی میں مل گئی ہو کہ اس کی مقدار کے مقابلے میں پانی کے اجزاء کم ہوں یا پانی کے اکثر اوصاف بدل گئے ہوں یا اس کو پانی میں پکایا گیا ہو جس کی وجہ سے پانی کی طبعیت ہی بدل گئی ہو جیسے شوربہ یا آب باقلی تو اس سے وضو جائز نہیں لیکن اگر آمیزش سے مقصود ہو پانی کا ستھرا پن بڑھانا جیسے آس اور بیری کے پتے اور اشنان تو اس سے وضو درست ہے۔ اگر پاک چیز کی آمیزش سے پانی میں تھوڑا سا تغیر آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ ابن خزیمہ اور نسائی نے حضرت ام ہانی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت میمونہ نے ایک بڑے لگن سے غسل کیا جس میں گوندھے ہوئے آٹے کے آثار موجود تھے۔

بخاری نے حضرت ام عطیہ انصاریہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کی وفات ہوئی تو حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو فرمایا اس کو تین بار یا پانچ بار یا اس سے زیادہ بار جتنا مناسب سمجھو پانی اور بیری کے پتوں سے (یعنی بیری کے پتوں کے ساتھ گرم کئے ہوئے پانی سے) غسل دینا اور آخری بار کچھ کافور شامل کر دینا یا فرمایا کافور شامل کر دینا۔

بزار نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ثمامہ بن اثال مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کر لیں قیس بن عاصم کی حدیث میں بھی یہی آیا ہے کہ وہ مسلمان ہونے لگے تو حضور ﷺ نے ان کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرنے کا حکم دیا۔

لِّنُحْیِۦَ بِهِۦ بَلْدَةً مَّیْتًا　　تاکہ ہم اس پانی سے مردہ بستی کو زندہ کر دیں۔

بلدہ بمعنی بلد ہے اسی لئے اس کی صفت میتاً (بصیغۂ مذکر) ذکر کی۔

وَنُسْقِیَهُۥ مِمَّا خَلَقْنَآ أَنْعَـٰمًا وَأَنَاسِیَّ كَثِیرًا ﴿٤٩﴾　　اور اپنی مخلوق میں سے چوپایوں کو اور بہت سے انسانوں کو وہ پانی پلا کر سیراب کریں۔

اناسی سے مراد ہیں صحرا نشین خانہ بدوش بدو کیونکہ انہی کی زندگی بارش کے پانی سے وابستہ ہے شہروں والے اور دیہات کے باشندے تو دریاؤں کنوؤں اور چشموں کے پاس آباد ہوتے ہی ہیں ان کو بارش کے پانی سے سیراب ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی ان کے جانور بھی دریاؤں اور چشموں کے پانی سے سیراب ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے انسانوں پر اپنی کی ہوئی نعمتوں کو شمار کرایا ہے۔ انسانوں کے عام منافع اور بیشتر اسباب معیشت کا حصول چوپایوں سے وابستہ ہے اسی لئے انسانوں سے پہلے جانوروں کو سیراب کرنے کا ذکر کیا اور جانوروں کے ذکر سے بھی پہلے زمین کا ذکر کیا کیونکہ سب سے پہلے بارش سے زمین ہی زندہ ہوتی ہے اور زمین کی حیات چوپایوں کی زندگی کا ذریعہ ہے۔

اناسی انسی کی جمع ہے یا انسان کی جیسے ظرابی ظربان کی جمع ہے۔ انسان کی جمع قرار دی جائے گی تو کہا جائے گا کہ لفظ اناسی اصل میں اناسین تھا۔ جیسے بساتین بستان کی جمع ہے پھر نون کو یاء سے بدل دیا گیا اور یاء کو یاء میں ادغام کر دیا گیا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَـٰهُ بَیْنَهُمْ　　اور ہم نے پانی کو انسانوں میں گھمایا پھرایا۔ کبھی ایک شہر میں کبھی دوسری بستی میں بارش کی بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ کوئی سال ایسا نہیں ہوتا کہ دوسرے سال سے اس میں بارش زیادہ ہو بلکہ اللہ بارش کو زمین پر گھماتا رہتا ہے پھر آپ نے یہی آیت پڑھی ایک مرفوع روایت میں آیا ہے کہ کوئی ساعت ایسی نہیں ہوتی نہ رات

میں نہ دن میں کہ ابر سے بارش نہ ہوتی ہو اللہ بارش کا رخ جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے ابن اسحاق ابن جرع اور مقاتل نے حضرت ابن مسعود تک اس قول کو پہنچایا ہے اور حضرت ابن مسعود نے اس کو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد فرمایا ہے کہ کسی ایک سال دوسرے سال سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ لیکن اللہ نے رزق کی تقسیم کردی ہے نچلے آسمان (یعنی بادل) میں مینہ (کا خزانہ) رکھ دیا ہے اور مخصوص ناپ تول کے ساتھ نیچے اتارتا ہے جب کوئی قوم گناہ کرتی ہے تو اللہ اس کی طرف سے بارش کا رخ موڑ کر دوسروں کی طرف کر دیتا ہے اور جب سب نافرمان ہو جاتے ہیں تو پھر بیابانوں اور دریاؤں کی طرف بارش کو موڑ دیا جاتا ہے۔

بعض کے نزدیک تصریف المطر سے یہ مراد ہے کہ کبھی بارش بڑی بڑی بوندوں کی شکل میں موسلا دھار ہوتی ہے کبھی خفیف اور شبنم کے رنگ میں۔

بعض نے کہا تصریف سے یہ مراد ہے کہ دریاؤں اور چشموں کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

بعض نے کہا صرفنہ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے یہ بات قرآن اور تمام دوسری کتابوں میں بار بار بیان کردی ہے۔

لِيَذَّكَّرُوْا ۖ تاکہ لوگ غور کریں۔ یعنی غور کر کے کمال قدرت اور حق نعمت کو پہچانیں اور پھر شکر ادا کریں۔ یا لیذکروا کا ترجمہ ہے تاکہ وہ عبرت حاصل کریں، نصیحت پکڑیں کہ بارش کا رخ کبھی ان کی طرف ہوتا ہے کبھی ان کی طرف سے دوسروں کی طرف۔

فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۵۰ لیکن اکثر لوگ بے ناشکری کئے نہیں رہے۔ یعنی جب اللہ نے بارش کی تو اکثر لوگوں نے ناشکری کی اور کہنے لگے یہ بارش تو فلاں ستارہ کی تاثیر سے ہوئی ہے حضرت زید بن خالد جہنی راوی ہیں کہ حدیبیہ میں رات کو بارش ہوئی جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد لوگوں کی طرف رخ پھیرا اور فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا، صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی جانے حضور ﷺ نے ارشاد کیا اللہ نے فرمایا صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مجھ پر ایمان رکھنے والے ہوئے کچھ کافر (ہوئے) جن لوگوں نے کہا ہم پر اللہ کے فضل و رحمت سے بارش ہوگئی وہ مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور ستاروں کے منکر اور جن لوگوں نے کہا فلاں ستارہ کی تاثیر سے ہم پر بارش ہوئی وہ میرے منکر ہو گئے اور ستاروں کی تاثیر پر یقین رکھنے والے۔ متفق علیہ۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا ۝۵۱ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ یعنی اس طرح آپ کے اوپر سے تبلیغ کا بار ہلکا ہو جاتا لیکن آپ کو عظمت عطا کرنے اور آپ کی شان بلند کرنے کے لئے ہم نے سب لوگوں کے لئے تنہا آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور تمام پیغمبروں پر آپ کو فضیلت عطا کی۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ۝۵۲ سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے اور قرآن سے بڑے زور و شور سے ان کا مقابلہ کیجئے۔

یعنی کافر جس طرف آپ کو بلاتے ہیں آپ ان کا کہنا مانیں ان کی موافقت نہ کریں نہ اس چیز میں ان سے رواداری کا سلوک کریں بلکہ ہماری نعمت کا شکر ادا کریں کہ ہم نے سب لوگوں کے لئے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے آپ اپنی دعوت اور اظہار حق پر ثابت قدم رہیں اور اللہ کی مدد توفیق یا قرآن کے ذریعہ سے یا کافروں کی مخالفت کر کے۔ ان سے جہاد عظیم کریں دل سے بھی اور زبان سے بھی اور تلوار سے بھی (جیسا موقع ہو ویسا جہاد کیجئے) مراد یہ ہے کہ کافر ابطال حق کی کوشش کرتے ہیں آپ ان کے مقابلہ میں ہر طرح اظہار حق اور حمایت حق کی کوشش کریں۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝۵۳ اور اللہ وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملایا (اور متصل کیا) یہ میٹھا ہے پیاس کو بجھانے والا اور یہ نمکین ہے کڑوا اور دونوں کے درمیان ایک پردہ بنا دیا ہے اور ایک مضبوط بندش کردی ہے۔

مرج البحرین یعنی ایک سمندر کو دوسرے سمندر سے متصل اور چسپاں کر کے آزاد چھوڑ دیا (کہ اگر ہو سکے تو ایک

دوسرے کے ساتھ مخلوط اور یکذات ہو جائیں لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ہر سمندر باوجودیکہ دوسرے سے ملا ہوا اور متصل ہے مگر اپنی حد میں رہتا ہے، مترجم) مرج الدابة اور امرج الدابة جانور کو چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیا کہ جہاں چاہے چرتا پھرے۔

فرات پیاس کو توڑ دینے والا، بجھانے والا، انتہائی شیرینی کی وجہ سے پیاس کو زائل کر دینے والا، اجاج، شدید نمکین۔ انتہائی شوریت کی وجہ سے تلخ، نمکین پانی پیاس کو بڑھاتا اور بھڑکاتا ہے۔ فاجج النار آگ بھڑ گئی۔

برزخ پردہ، دونوں کو مخلوط ہو جانے سے روکنے والا۔

حجرا محجورا پردہ سخت روک، کہ کوئی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتا، اور نمکین سمندر، میٹھے سمندر کو بگاڑ نہیں سکتا۔ بیضاوی نے لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے کسی چیز نے داخل ہو کر سمندر کو بیچ سے پھاڑ دیا ہے اور اس طرح یہ دخیل (دھارا) میلوں تک گھستا چلا جاتا ہے اور اس کے مزے میں فرق نہیں آتا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ میٹھے سمندر سے مراد بڑے دریا ہیں جیسے نیل فرات وغیرہ اور شور سمندر سے یہی بڑا سمندر مراد ہے جو نمکین اور تلخ ہے اور برزخ سے مراد وہ خطہ ارضی ہے جو سمندر اور بڑے دریاؤں کے وسط میں واقع اور حائل ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ اور اللہ وہی تو ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو بنایا نسب (یعنی مرد) اور سسرال (یعنی عورت) مطلب یہ ہے کہ انسان کی دو صنفیں کر دیں۔ (۱) نسب والا یعنی مرد بنایا، مرد کی طرف نسب لوٹتا ہے (۲) سسرال والا یعنی عورت، اس تشریح پر اس آیت کا مطلب وہی ہے جو آیت جَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ کا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک نسب سے مراد ہے نسب والا جس سے عورت و مرد کے نسب کا جوڑ ملتا ہے یعنی باپ دادا، اور صہر سے مراد ہے مرد و عورت کا سسرالی رشتہ۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿۵۴﴾ اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے جیسے اس کی مشیت ہو ویسا ہی پیدا کرتا ہے ایک مادہ سے انسان کو بنایا پھر اعضاء کی ساخت مختلف کر دی اور طبائع میں تفریق کر دی۔ ایک ہی نطفہ سے نر کو بنایا مادہ کو بنایا اور جڑواں بھی کسی کو پیدا کر دیا۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ اور اللہ کے سوا وہ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ ان کو فائدہ پہنچاتی ہیں نہ ضرر۔ یعنی اگر ان چیزوں کو پوجا جائے تو وہ پوجنے والوں کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتیں اور ان کی پوجا نہ کی جائے تو نہ پوجنے والوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔

وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿۵۵﴾ اور کافر اپنے رب کے خلاف (گناہ کر کے شیطان کا) مددگار ہو جاتا ہے۔

بعض علماء نے ظہیر کا ترجمہ کیا ہے ذلیل، کمین، جعلنی ظہیرا اس نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ظہرت الشئی میں نے اس چیز کو پس پشت پھینک دیا یعنی نا قابل توجہ کر دیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿۵۶﴾ اور ہم نے آپ کو (قادر مطلق یا ذمہ دار بنا کر بھیجا بلکہ) صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی مومنوں کو جنت کی خوش خبری سنانے والا اور کافروں کو دوزخ سے ڈرانے والا۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ آپ کہہ دیجئے میں اس (تبلیغ) کی کوئی اجرت تم سے طلب نہیں کرتا۔

من اجر یعنی کوئی ایسا معاوضہ نہیں مانگتا جو تم کو میرے اتباع سے روکے اور تم اس کو اپنے اوپر تاوان سمجھو۔

إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿۵۷﴾ مگر (اس شخص کا عمل اور ایمان چاہتا ہوں)

جو اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرے۔ یعنی جو اللہ کا قرب اور قرب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرتا ہے بس مجھے ایسے ہی شخص کی طلب ہے۔

اللہ کے اوامر و نواہی کی تعمیل کے لئے اللہ کے رسول کی اطاعت کو اجر رسالت قرار دیا کیونکہ رسالت کا اصل مقصد ہی یہ ہے اس کے علاوہ ہر اجر تبلیغ کی نفی کر دی تاکہ کسی کو شبہ کرنے کا موقع ہی باقی نہ رہے (شاید کوئی سر پھرا یہ خیال کرنے لگتا کہ اللہ کی طرف احکام کو منسوب کر کے یہ اپنی اطاعت تحصیل زر و مال کے لئے کرانا چاہتے ہیں اور ہم سے معاوضہ مالی کے طلب گار ہیں، ہر قسم کے معاوضہ مال کی طلب کی ممانعت کر کے اس وہم کی بیخ کنی کر دی۔ مترجم) پھر اس طرز ادا میں انتہائی شفقت کا اظہار بھی ہے کافروں کے لئے جو بات فائدہ رساں تھی اس کو اپنے لئے سود مند ظاہر کیا اور بتا دیا کہ تم لوگوں کا اس راستہ پر چلنا ہی میری خدمت رسالت کا پورا پورا معاوضہ ہے اس طریق بیان سے اس امر پر تنبیہ بھی ہو گئی کہ امت کی اطاعت کا فائدہ مال کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹے گا چونکہ رسول کی راہنمائی سے امت ہدایت یاب ہوئی ہے اس لئے (رہنمائی کا اور) ہدایت یاب ہونے کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو ملے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا نیکی کا راستہ بتانے والا بھی نیکی کرنے والے کی طرح ہے یہ حدیث بزار نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت سہل بن سعد اور حضرت ابو مسعود کی روایت سے اور امام احمد نیز صحاح ستہ کے مؤلفین نے اور ضیاء نے کچھ زیادتی کے ساتھ حضرت بریدہ کی روایت سے اور ابن ابی الدنیا نے قضاء الحوائج میں حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے۔ ضیاء نے اتنا ٹکڑا حدیث کا اور نقل کیا ہے کہ اللہ مصیبت زدہ کی فریاد رسی کو پسند فرماتا ہے۔ مسلم نے حضرت جریر کی روایت سے ایک طویل حدیث کے ذیل میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اس کو اس طریقے پر چلنے کا ثواب ملے گا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی ثواب ملے گا جو اس طریقہ پر چلیں گے مگر اس سے ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ آیت الا من شاء میں استثناء منقطع ہے یعنی جو شخص اپنا مال راہ خدا میں اللہ کے قرب تک پہنچنے کیلئے خرچ کرنا چاہتا ہو وہ ایسا کرے۔ میں اپنے لئے کچھ طلب نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے لئے تو کچھ مانگتا نہیں، ہاں اس بات سے بھی نہیں روکتا کہ راہ خدا میں کوئی اپنا مال صرف کرے اور اللہ کی خوشنودی کا طلب گار ہو اور اس کا راستہ اختیار کرے۔

زکوۃ اور صدقات کا قانون جاری کرنے سے مخالفوں کو شبہ کرنے کا موقع ملتا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ قانون طلب زر کے لئے جاری کیا ہے اسی لئے اللہ نے اپنے نبی کے اہل بیت کے لئے زکوۃ و صدقات (واجبہ) کا کھانا جائز نہیں کیا۔

مسئلہ:- اس آیت سے استنباط کیا گیا ہے کہ کسی طاعت کو اجرت طلب کرنا جائز نہیں نہ تعلیم قرآن (حدیث و فقہ) کی، نہ اذان کی نہ امامت کی نہ اسی طرح کے دوسرے کاموں کی (جیسے وعظ تبلیغ وغیرہ)

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ اور اس ذات پر بھروسہ کیجئے جو زندہ ہے کبھی نہیں مرے گی۔ جو ہستیاں زندہ ہیں لیکن موت کا نشانہ ہیں کبھی ان کو موت ضرور آئے گی ایسی ہستیوں پر بھروسہ، بھروسہ کرنے والوں کو بے مدد چھوڑ دیتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتے ہیں مگر اللہ (کی حیات پر کبھی موت طاری ہونے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا اس لئے) اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر مخالفوں کے شر سے محفوظ رہنے اور لوگوں کی طرف سے مالی معاوضہ سے بے نیاز رہنے کے سلسلے میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے پس آپ ان لوگوں کے شر اور ان کے مال سے بے نیاز رہنے میں اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ﴿٥٨﴾ اور اسکی تسبیح وتحمید میں لگے رہئے

سبح یعنی تمام صفات نقص (وعیب) سے اس کی پاکی کا اعتراف کرو۔

بحمدہ اس کی صفات کمالیہ کی ثناء اور تعریف کرو۔ اور مزید انعام کے اس سے طالب ہو۔ بعض علماء نے سبح کا ترجمہ کیا ہے صل نماز پڑھو اور بحمدہ کا مطلب ہے نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔ یعنی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے نماز پڑھو۔

وکفی بہ۔ یعنی اللہ بندوں کے گناہوں سے پورے طور پر باخبر اور باعلم ہے وہ گناہوں کی سزا دے گا۔

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ

وہ ذات جس نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان دونوں کی درمیانی کائنات کو (ایک اندازے کے ساتھ) پیدا کیا چھ دن (کی مقدار) میں پھر تخت (الوہیت) پر قائم ہوا۔

یہ آیت سابق آیت کے مضمون کو ثابت کر رہی ہے مطلب یہ ہے کہ جب اللہ ہی سب کا خالق اور متصرف کل ہے تو اسی پر بھروسہ رکھا جائے۔ آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آدمی تمام امور میں تدریج اور آہستگی اختیار کرے، کیونکہ وہ اللہ جس کی قدرت محیط کل ہے اور اس کا حکم انتہائی سریع النفوذ ہے اس نے تخلیق کائنات میں تدریج اور آہستگی اختیار فرمائی (اور یکدم سب کو پیدا نہیں کر دیا۔

اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِیْرًا ﴿۵۹﴾ وہی رحمٰن ہے سو تم اس کو کسی باخبر (یعنی عالم) سے پوچھ دیکھو (وہ اس کی حقیقت تم کو بتادے گا)

بہ یعنی اس تخلیق کائنات اور استوی علی العرش کے متعلق کسی عالم کو پوچھ دیکھو۔ کذا قال الکلبی۔

خبیر سے مراد ہے اللہ، یا جبرئیل یا وہ علماء جنہوں نے سابق آسمانی کتابوں میں یہ باتیں پڑھی ہیں۔ بعض کے نزدیک بہ کی ضمیر الرحمٰن کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ پر لفظ رحمٰن کے اطلاق کا انکار کرتے ہیں تو تم علماء اہل کتاب سے پوچھ دیکھو، وہ تم کو بتادیں گے کہ رحمٰن کا ہم معنی لفظ اللہ کے لئے ان کی کتابوں میں مذکور ہے اگر کسی چیز کے متعلق پوچھنا ہو تو عربی میں سأل عنه بھی آتا ہے اور سأل بہ بھی۔ بعض علماء نے کہا (کہ فسئل کا مخاطب عام انسان ہے یعنی) اے انسان تو رحمٰن کے متعلق باخبر لوگوں سے پوچھ لے وہ تجھے رحمٰن کے اوصاف بتادیں گے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا

اور جب ان سے کہا گیا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو، کہنے لگے رحمٰن کیا چیز ہے (ہر) اس چیز کو ہم سجدہ کرنے لگیں جن کو سجدہ کرنے کا تم ہم کو حکم دو۔

مشرکین لفظ رحمٰن کا اطلاق اللہ پر نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سوائے رحمٰن یمامہ (یعنی مسیلمہ کذاب متنبی) کے اور کسی رحمٰن کو ہم نہیں جانتے۔ مشرکین مسیلمہ کو رحمٰن یمامہ کہتے تھے۔

وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ اور (رحمٰن کو سجدہ کرنے کے حکم نے) ان کے اندر (ایمان سے) اور نفرت بڑھادی۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾

بڑی خیر والا ہے وہ اللہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور سورج اور روشنی دینے والا چاند بنایا۔

حسن قتادہ اور مجاہد نے کہا بروج بڑے بڑے ستارے (برج ظاہر ہونے کو کہتے ہیں) بڑے بڑے ستارے ظہور کی وجہ سے بروج کہلاتے ہیں۔ عطیہ عوفی، بروج سے مراد وہ اونچے محل ہیں جن میں چوکیدار اور محافظ موجود ہیں۔

سرٰجا (چراغ روشن) یعنی سورج۔ دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔

کسائی اور حمزہ کی قرأت میں سرجا بصیغۂ جمع آیا ہے۔ اس وقت سرج سے مراد ہوں گے سورج اور دوسرے ستارے۔ چاند مراد نہ ہوگا کیونکہ چاند چراغ نہیں ہے اس کی اپنی کوئی روشنی نہیں۔ اس کو ساری روشنی سورج سے پہنچتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب یہ پورا پورا سورج کے سامنے ہو جاتا ہے تو پورا روشن ہو جاتا ہے اور سورج سے جتنے حصہ کا تقابل نہیں ہوتا۔ اتنا ہی حصہ تاریک رہتا۔ پھر قمرا کا سرجا پر عطف بھی کیا گیا ہے (اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

اور وہ ایسا ہے کہ اس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا اور یہ سب کچھ اس شخص کے سمجھنے کے لئے ہے جو سمجھنا یا شکر کرنا چاہے۔

خلفۃ یعنی رات اور دن میں سے ہر ایک دوسرے کا قائم مقام ہو جاتا ہے، اسی لئے اگر کسی سے دن یا رات کا کوئی عمل فوت ہو گیا ہو تو دن کے عمل کو رات میں اور رات کے عمل کو دن میں ادا کر سکتا ہے۔ [1]

بغوی نے لکھا ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا آج میری رات کی نماز فوت ہو گئی حضرت عمرؓ نے فرمایا، رات کو جو نماز فوت ہو گئی اس کو دن میں پورا کر لو۔ اللہ نے فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ

مجاہد نے خلفۃ کا ترجمہ کیا ہے مخالف۔ رات اور دن باہم مخالف بنائے گئے ہیں ایک سیاہ ہے ایک سفید۔

ان یذکر یعنی اس شخص کے لئے جو اللہ کی نعمتوں پر غور کرنے اور اس کی بنائی چیزوں کی حکمت کو سمجھے اور پھر جان لے کر یقیناً اس کو بنانے والا کوئی پر حکمت خالق ہے جو واجب لذاتہ ہے اور بندوں پر مہربان ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ جو کار خیر اس سے رات میں یا دن میں فوت ہو گیا ہے اس کو یاد کر لے اور دن کا فوت شدہ کام رات کو اور رات کا فوت شدہ کام دن کو پورا کر لے۔

او اراد شکورا یا اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہئے، یعنی رات کی تاریکی، دن کی روشنی اور (ان کا تبادل) جو کچھ ان کے اندر منافع رکھے ہیں سب کی تخلیق اس غرض سے ہے کہ ذکر نے اور عبرت حاصل کرنے والے اللہ کا ذکر کریں اور سبق لیں اور شکر کرنے والے ان نعمتوں کا شکر ادا کریں اگر بغیر ذکر و فکر اور شکر کے یونہی کسی کا وقت گزر جائے تو حقیقت میں اس کی زندگی بیکار ہو گئی اور اصلی سرمایۂ زندگی تباہ ہو گیا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا اور رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں [2] عباد الرحمٰن میں اضافت سے مقصود ہے عباد کی عزت افزائی اور ان کی فضیلت کا اظہار یا یہ مقصود ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو رحمٰن کی عبادت میں ڈوبے ہوئے ہیں (گویا حقیقت میں یہ ہی اللہ کی بندگی کرنے والے ہیں) اس صورت میں عباد عابد کی جمع ہے جیسے تجار تاجر کی جمع ہے۔ اللہ کے دوسرے نام اس جگہ ذکر نہیں کئے صرف الرحمٰن کا ذکر کیا اس میں اشارہ ہے کہ اللہ نے ان سے اپنی رحمت کاملہ کا وعدہ کر لیا ہے اور یہ بھی مخلوق خدا پر کامل طور پر مہربان ہیں (جب رحمان کے پرستار ہیں تو خود بھی ان کا رحیم ہونا ضروری ہے)

یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھونا یعنی تواضع اور فروتنی کے ساتھ پُروقار پُرسکون چال سے چلتے ہیں ان کی چال میں نہ غرور ہے، نہ اترانا، لغت میں ہون کا معنی ہے نرمی، صاحب قاموس نے ہون کا معنی لکھا ہے وقار (سنجیدگی) یہی معنی مراد ہیں اس قول رسول میں جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا، مومن نرم رفتار اور پُروقار ہوتا ہے اتنا کہ انتہائی نرمی کی وجہ سے تم اس کو احمق خیال کرنے لگتے ہو۔ رواہ البیہقی بسند ضعیف عن ابی ہریرہؓ۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ﴿٦٣﴾ اور جب بے وقوف لوگ کوئی ناگوار غیر مناسب بات کہہ کر ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام۔

مجاہد نے مقاتل بن حبان نے سلام کا ترجمہ کیا سداد یعنی سیدھی بات جس سے ایذا سے بھی سلامت رہیں اور گناہ سے

---

[1] حسن راوی ہیں کہ ایک بار حضرت عمر نے چاشت کی نماز بہت طویل کر دی کسی نے دریافت کیا آج آپ نے وہ بات کی جو اس سے پہلے آپ نہیں کرتے تھے فرمایا میرا رات کا کچھ وظیفہ آج رہ گیا تھا میں اس کو پورا کرنا چاہتا تھا یا فرمایا، میں نے اس کو ادا کرنا چاہا۔ اس کے بعد آپ نے آیت وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً تلاوت فرمائی۔

[2] حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو اکڑ کر چلتے دیکھا فرمایا جس چال میں غرور ہو وہ بری ہے سوائے جہاد کے (جب دشمنوں کا مقابلہ ہو) اللہ نے کچھ لوگوں کی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ --- عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا تک پس۔ تو اپنی چال میں درمیانی صورت اختیار کر (نہ زیادہ جھک کر چل نہ اکڑ کر)

بھی۔ حسن نے کہا اگر کوئی جاہل ان سے جہالت کرتا ہے تو وہ برداشت کر لیتے ہیں (جہالت کے جواب میں) جہالت نہیں کرتے، حسن نے سلام کہنے کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں تم پر سلام۔ کیونکہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ابو العالیہ نے کہا یہ حکم جہاد سے پہلے تھا جب آیت جہاد آگئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

حق بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے کیونکہ جہاد کا حکم تو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے دیا گیا ہے اگر لوگ لا الہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں یا جزیہ ادا کرنے لگیں تو قتال اور لڑنے کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، مجھے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے کہ لوگ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہو جائیں۔ متفق علیہ عن ابن عمر۔

اللہ نے فرمایا جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ دینے لگیں۔

رہی یہ آیت (تو اس کا موضوع اور مضمون ہی دوسرا ہے) اس میں بے وقوف جاہلوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے اور ان بے وقوفوں کی طرف توجہ نہ کرنے اور اپنی ذات کے لئے انتقام نہ لینے کی تعلیم دی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا، میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان سے میل رکھنا چاہتا ہوں مگر وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں میں ان کی طرف سے زیادتی برداشت کرتا ہوں وہ مجھ سے جہالت (بدکلامی، بدمعاملگی، بدخوئی) کرتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا اگر تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے کہا تو پھر ان کو خاک پھنکواتا ہے اور جب تک تو اس حالت پر قائم رہے گا اللہ کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ برابر رہے گا۔ رواہ مسلم

مروی ہے کہ حسن بصری نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا یہ تو ان کی دن کی حالت ہوتی ہے (اور رات میں حالت یہ ہوتی ہے جو آئندہ آیت میں بیان کی گئی ہے)

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴ اور وہ لوگ جو رات کو اپنے رب کے سامنے سجدے کرتے اور کھڑے رہتے ہیں۔

حسن نے فرمایا، یہ حالت ان کی رات کو ہوتی ہے، عبادت کے لئے رات کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا کہ رات کی عبادت زیادہ دشوار ہوتی ہے، ریاکاری کا بھی اس میں شائبہ نہیں ہوتا خضوع قلب اور زبان سے دل کی موافقت خوب ہوتی ہے اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دن دوسری قسم کی عبادتوں کے لئے مخصوص ہے (جو عام طور پر رات کو ادا نہیں کی جا سکتیں) مثلاً اللہ کی راہ میں جہاد اور کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہ کرنا تعلیم و تعلم اور ہدایت پانے کے لئے نیک لوگوں اور بزرگوں کی صحبت وغیرہ

سجدا ساجد کی جمع ہے اور قیاما قائم کی قیام مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، نماز شب (کی فضیلت) کے متعلق حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت کے سردار حاملین قرآن اور نماز شب ادا کرنے والے ہیں۔ رواہ البیہقی فی شب الایمان۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات میں پڑھی جانے والی نماز ہے۔ رواہ احمد۔

حضرت ابو امامہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیام شب کا التزام کرو یہ گزشتہ صلحاء کی عادت جاریہ ہے رب سے قربت حاصل کرنے گناہوں کو ساقط کرنے اور (آئندہ) گناہ سے روکنے کا ذریعہ ہے۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تین چیزیں ہیں جن کی طرف دیکھ کر اللہ ہنستا ہے (یعنی پسندیدگی فرماتا ہے۔ (۱) اس آدمی کو دیکھ کو جو رات میں اٹھ کر نماز پڑتا ہے (۲) ان لوگوں کو دیکھ کر جو نماز میں صف بند ہوتے

ہیں۔ (۳) ان لوگوں کو دیکھ کر جو دشمن کے مقابلے میں لڑنے کے لئے صفیں قائم رکھتے ہیں۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا جس نے عشاء کی نماز کے بعد دو رکعتیں یا اس سے زیادہ پڑھ لیں تو گویا اس نے رات بھر اللہ کے سامنے سجدہ اور قیام میں گذاری۔ حضرت عثمان بن عفان راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لی تو ایسا ہو گیا جیسے اس نے آدھی رات قیام کیا۔ رواہ مسلم واحمد۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہماری طرف سے عذاب جہنم کا (رخ) پھیر دے بلاشبہ جہنم کا عذاب بڑا سخت ہے۔

یعنی وہ اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں، مخلوق سے معاشرتی، سماجی اور اخلاقی تعلقات بھی مبنی بر انصاف رکھتے ہیں اس کے باوجود وہ اللہ کے عذاب سے خوف زدہ رہتے ہیں اللہ کے سامنے زاری کرتے ہیں کہ وہ اپنا عذاب ان کی طرف سے پھیر دے کیونکہ ان کو اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں ہوتا نہ وہ اپنی حالت پر اعتماد رکھتے ہیں۔

حضرت علی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی (یعنی حضرت داؤدؑ) کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی امت کے اطاعت گذار بندوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں کیونکہ قیامت کے دن حساب فہمی کے وقت میں جس بندے کو کھڑا کروں گا اور اس کو عذاب دینا چاہوں گا تو (بتقاضاء عدل) اس کو عذاب دوں گا اور میرے نافرمان بندوں سے کہہ دو کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالیں (یعنی مغفرت سے ناامید نہ ہوں) کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ (اگر چاہوں گا تو اپنی رحمت سے) بخش دوں گا اور مجھے پروا نہیں ہے (نہ کسی کو عذاب دینے نہ بخش دینے کی) رواہ ابو نعیم۔

غرام کے معنی ہیں لازم (دور نہ ہونے والا) قرضدار کو قرض خواہ چمٹا رہتا ہے اسی لئے قرضدار کو غریم کہتے ہیں بغوی نے لکھا ہے غرام کا معنی ہے بہت سخت چمٹنے والا۔ بعض نے کہا غرام کا معنی ہے ہلاکت۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سخت شدید مصیبت انسان پر پڑتی ہے اس کو غرام کہتے ہیں۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا اللہ نے کافروں کو حکم دیا کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں لیکن انہوں نے شکر ادا نہیں کیا اس لئے اللہ نے ان پر سخت (لازم، ناقابل زوال) مصیبت ڈال دی اور وہ (ہمیشہ) دوزخ میں رہیں گے حسن نے کہا ہر غریم اپنے غریم سے جدا ہوتا ہے لیکن جہنم جدا نہ ہوگا۔

إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾ بے شک دوزخ بری قرار گاہ اور جائے قیام ہے۔ یعنی دوزخ میں ٹھہرنا اور رہنا برا ہے (مطلب یہ کہ مستقر اور مقام بمعنی مصدری ہیں)

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا اور وہ لوگ جو خرچ کرتے وقت نہ اسراف کرتے ہیں نہ کنجوسی۔ اسراف گناہ کے راستہ میں خرچ کرنا خواہ کتنی ہی قلیل مقدار ہو اقتار اللہ کے حق کو روکنا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد قتادہ اور ابن جریج کا یہی قول ہے حسن نے اس کی تائید میں آیت کا معنی اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی میں خرچ نہیں کرتے۔ اور نہ اللہ کے قائم کئے ہوئے حقوق کو ادا کرنے میں بخل کرتے ہیں بعض لوگوں نے کہا اسراف کے معنی حد سے بڑھ کر فضول خرچی جو حد تبذیر (مال بکھیرنے) تک پہنچادے اور اقتار کا معنی ہے انتہائی ضرورت کے موقع پر بھی خرچ نہ کرنا۔ ابراہیمؒ کے اس قول کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ نہ لوگوں کو ننگا بھوکا رکھتے ہیں نہ اتنا خرچ کرتے ہیں کہ لوگ کہنے لگیں کہ انہوں نے یہ خرچ فضول کیا۔

میں کہتا ہوں یہ قول پہلے ہی قول کی طرف راجع ہے بلکہ اس سے زیادہ خاص ہے کیونکہ جائز خرچ میں بھی حد شرعی سے تجاوز کر جانا کہ حد تبذیر تک پہنچ جائے گناہ اور حرام ہے اللہ نے فرمایا إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔ اور جن کے لئے خرچ کرنا واجب ہے کہ ان کو ننگا بھوکا نہ رہنے دے اور اللہ کے مقرر کردہ مالی حق کو ادا کرنا اور اس میں کنجوسی نہ

کرنا لازم ہے۔

وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ اور ان کا خرچ کرنا (افراط و تفریط کے) درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

قوام درمیانی۔ دو برائیوں کے درمیان بھلائی۔[1] وسط کو قوام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وسط کے دونوں طرف متوازن ہوتے ہیں اور چونکہ دونوں جانب مساوی بھی ہوتے ہیں اس لئے وسط کو سواء بھی کہا جاتا ہے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن مسعود کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابن مسعود نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، سب سے بڑا گناہ کون سا ہے۔ فرمایا، اللہ کی مثل دوسرے کو قرار دینا حالانکہ اللہ نے ہی تم کو پیدا کیا ہے، میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے، فرمایا اس خوف سے اپنی اولاد کو قتل کر دینا کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گی، میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا (گناہ سب سے بڑا ہے) فرمایا، اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنا، اس کی تصدیق میں اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ

اور وہ لوگ جو کسی دوسرے معبود کو اللہ کے ساتھ نہیں پکارتے اور نہ بغیر حق کے کسی ایسے شخص کو قتل کرتے ہیں جس کو قتل کرنے کی اللہ نے ممانعت فرما دی ہے اور نہ زنا کرتے ہیں۔

بالحق یعنی حق پر قتل کرتے ہیں مثلاً قصاص میں قتل کرتے ہیں (یا محصن کو) زنا کی سزا میں سنگسار کرتے ہیں وغیرہ ان آیات میں بنیادی گناہوں کی نفی کی گئی ہے اس سے اوپر اصول طاعات کا اثبات کیا گیا تھا اس نفی و اثبات سے مقصود ہے مومنوں کے کمال ایمانی کا اظہار اور اس بات پر تنبیہ کو جس اجر کا وعدہ کیا گیا ہے وہ انہی مسلمانوں سے کیا گیا ہے جو اصول طاعت کے ساتھ متصف اور امہات معاصی سے مجتنب رہتے ہیں، در پردہ اس میں کافروں پر تعریض بھی ہے کہ وہ معاصی سے اجتناب نہیں کرتے اور اصول طاعت کو ادا نہیں کرتے اور ان کے اوصاف مومنوں کے اوصاف کے بالکل برعکس ہیں اسی لئے آئندہ آیت میں مرتکب معصیت کے عذاب میں مبتلا ہونے کی وعید بیان فرما دی، اور ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ گناہوں کی سزا پائے گا حضرت ابن عباس نے فرمایا گناہ سے مراد ہے گناہ کی سزا۔ ابو عبیدہ نے کہا اثام کا معنی ہے سزا۔ مجاہد نے کہا اثام جہنم کے اندر ایک وادی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے حدیث میں آیا ہے کہ غی اور اثام (جہنم کے اندر) دو کنوئیں ہیں جن کے اندر دوزخیوں کا لہو، پیپ بہ کر جاتا ہے

میں کہتا ہوں ابن ابی حاتم نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ اثام جہنم میں ایک وادی ہے ہناد نے سفیان کا بھی یہی قول بیان کیا ہے۔

ابن جریر، طبرانی اور بیہقی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی پتھر جس کا وزن دس اوقیہ ہو جہنم کے کنارہ سے (اندر کی طرف) پھینکا جائے تو ستر برس میں غی و اثام تک پہنچے گا راوی کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا غی اور اثام کیا ہیں فرمایا جہنم کی تلی میں دو نہریں ہیں جن کے اندر دوزخیوں کا کچ، لہو بہ کر جاتا ہے انہیں دونوں کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور فرمایا ہے، فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن اس پر دوہرا عذاب ہوگا کفر کا اور گناہ کا۔

---

[1] وہ لوگ یعنی صحابہ کرام مزے اور لذت کے لئے کھانا نہیں کھاتے تھے نہ آرائش و زیبائش کے لئے لباس پہنتے تھے بلکہ کھانا کھانے سے ان کا مقصد تھا بھوک کو دور کرنا اور عبادت کے لئے قوت حاصل کرنا اسی طرح لباس سے ان کی غرض تھی قابل ستر حصۂ بدن کو چھپانا اور سردی گرمی سے جسم کی حفاظت کرنی۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا یہ بھی اسراف ہے کہ آدمی کو جو چیز پسند آئے وہ خریدے۔ (از مفسر رحمہ اللہ)

وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اور وہ عذاب میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔

شیخین نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مشرکوں میں سے کچھ لوگوں نے بکثرت قتل کئے اور قتل کے ساتھ جرم زنا کے بھی مرتکب ہوئے، پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ جو کچھ فرماتے ہیں اور جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہ ہے تو اچھی، مگر یہ بتائیے کہ ہمارے گناہ کا اتار کس طرح ہوگا اس پر آیت والذین لا یدعون مع اللہ سے یخلد فیہ مھانا الا من تاب و امن و عمل عملا صالحا تک نازل ہوئی۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا یعنی وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنہوں نے (شرک سے) توبہ کرلی اور ایمان لے آئے اور نیک اعمال کئے۔

حضرت ابن عباس کے نزدیک توبہ کرنے سے مراد ہے گناہ سے توبہ کرنا اور ایمان لانے سے مراد ہے اپنے رب پر ایمان لانا۔

اسی قصے کے متعلق آیت قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بھی نازل ہوئی۔

بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب سورت الفرقان میں اللہ نے آیات وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ نازل فرمائی تو مکہ کے مشرکوں نے کہا ہم نے تو ناحق قتل بھی کئے ہیں اور اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کی بھی عبادت کی ہے اور بے حیائی کے کاموں (یعنی زنا) کا ارتکاب بھی کیا ہے ہم اگر مسلمان ہو گئے، تو ہمارا کیا ہوگا) اس پر آیت الا من تاب نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے ہم کو حضرت ابن عباس کا یہ قول پہنچا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم دو سال تک آیت وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (مھانا تک) پڑھا کرتے تھے، پھر (دو سال کے بعد) نازل ہوا۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ اس آیت کے نازل ہونے سے اور آیت اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کے نازل ہونے سے، جیسا خوش رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ایسا خوش میں نے حضور ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ایک شبہ

مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ کے ساتھ ہی ہونا ضروری ہے دونوں کے درمیان فصل زمانہ ناجائز ہے پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ الا من تاب و امن کا نزول والذین لا یدعون مع اللہ الھا اخر کے نزول کے دو سال بعد ہوا۔

ازالہ

ہم کہتے ہیں کہ پہلے آیت مذکورہ بغیر استثناء کے (صرف مھانا تک) نازل ہوئی تھی پھر پوری آیت والذین لا یدعون سے آخر تک یعنی غفورا رحیما تک نازل ہوئی (گویا مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ دونوں کا نزول ایک ہی وقت میں ہوا) پس یہ آیت پہلی آیت کو مقدار استثناء کے لحاظ سے منسوخ کر رہی ہے۔

مزید شبہ

اصول فقہ کا یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ حکم منسوخ ہوتا ہے خبر منسوخ نہیں کی جاسکتی اور یہ آیت جملۂ خبریہ ہے کہ اس کے منسوخ کئے جانے کے کیا معنی۔

ازالہ

خبر منسوخ نہیں ہوتی ہے بے شک یہ بات صحیح ہے ورنہ پہلی خبر کا جھوٹ ہونا لازم آئے گا اور خدا کی دی ہوئی خبر کذب کا احتمال بھی نہیں رکھتی۔ لیکن آیت وعید (خواہ خبری شکل میں ہو) منسوخ ہو سکتی ہے کیونکہ وعید کے خلاف واقع ہونا جائز ہے۔ اہل سنۃ کا یہی مسلک ہے اگرچہ معتزلہ کا قول اس کے خلاف ہے (مترجم)۔ اللہ اپنی رحمت و فضل سے اپنی دی ہوئی وعید کے خلاف کر سکتا ہے حقیقت میں وعید خبر نہیں ہوتی انشاء ہوتی ہے (کیونکہ خبر کے لئے مخبر عنہ کا پہلے ہونا ضروری ہے اور وعید کا ظہور آئندہ ہوگا اس لئے آیت وعید گو بصورت خبر ہوتی ہے مگر حقیقت میں انشاء ہوتی ہے اور انشاء یعنی حکم کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ مترجم)

یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ اثبات سے استثناء نفی اور نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے (یعنی مستثنیٰ حکم مسکوت عنہ میں نہیں ہوتا جیسا کہ احناف کا خیال ہے مترجم) آیت میں استثناء کا مفرغ ہونا اسی کو بتا رہا ہے ایسا نہیں ہے کہ استثناء کے بعد جو مستثنیٰ منہ باقی رہتا ہے اس کا حکم تو منطوق ہوتا ہے اور مستثنیٰ کی طرف سے سکوت ہوتا ہے یعنی اس کا حکم معلوم نہیں ہوتا۔ ورنہ لازم آئے گا کہ منطوق حکم کو مسکوت عنہ حکم سے منسوخ کر دیا گیا اور یہ درست نہیں۔

فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ انہی (نیکوکار مومنوں) کی برائیوں کو اللہ نیکیوں میں تبدیل کر دے گا۔

ایک جماعت نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ توبہ کے بعد ان کے گزشتہ گناہوں کو مٹا دے گا اور ان کی جگہ آئندہ ہونے والی نیکیوں کو قائم کر دے گا، یا یہ مطلب ہے کہ گناہوں کے ارتکاب کی جو قوت ان کے نفوس میں تھی دنیا ہی میں ان کی اس قوت معصیت کو قوت طاعت سے تبدیل کر دے گا اور گزشتہ معاصی کے خلاف طاعت کی توفیق عنایت کر دے گا یہی مطلب ہے حضرت ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک اور سدی کے اس تشریحی قول کا کہ حالت شرک میں کئے ہوئے برے اعمال کی جگہ حال اسلام میں کئے ہوئے اچھے اعمال کو اللہ دے دے گا شرک کو توحید سے مومنوں کے قتل کو حربی مشرکوں کے قتل سے اور زنا کو عفت و پاکدامنی میں بدل دے گا۔

کچھ علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ اپنی مہربانی سے اسلام میں کئے ہوئے برے اعمال کو قیامت کے دن نیکیوں میں تبدیل کر دے گا یہی قول سعید بن مسیب، مکحول، ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کا مروی ہے اس کی تائید حضرت ابوذرؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن ایک آدمی کو (حساب کے لئے) لایا جائے گا اور حکم ہوگا اس کے چھوٹے گناہ اس کے سامنے لاؤ حسب الحکم چھوٹے گناہ اس کے سامنے لائیں گے اور اس کے بڑے گناہ پوشیدہ رکھے جائیں گے وہ چھوٹے گناہوں کا اقرار کرے گا انکار نہیں کرے گا اور بڑے گناہوں کی پیشی کا اندیشہ کرتا رہے گا حکم ہوگا ہر گناہ کی جگہ اس کو ایک نیکی دے دو وہ کہے گا میرے گناہ تو اور بھی ہیں جو مجھے یہاں دکھائی نہیں دیتے۔ راوی کا بیان ہے یہ فرماتے وقت رسول اللہ ﷺ اتنے ہنس پڑے کہ کچلیاں نظر آنے لگیں۔ رواہ مسلم۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سلمان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن ایک شخص کو اس کا اعمالنامہ دیا جائے گا جونہی وہ اعمالنامہ کا بالائی حصہ پڑھے گا تو اس کے خیالات برے ہونے لگیں گے (لیکن) وہ یکدم اعمالنامہ کے نیچے کے اندراجات کو دیکھے گا تو اس میں اس کو اپنی نیکیاں دکھائی دیں گی پھر جو بالائی حصہ کو دیکھے گا تو اس میں مندرجہ برائیاں نیکیوں سے تبدیل ہو چکی ہوں گی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کچھ ایسے لوگوں کو بھی اللہ

(موقف) میں لائے گا جو دل سے خواہش مند ہوں گے کہ انہوں نے (کاش) گناہ بہت کئے ہوتے۔ دریافت کیا گیا یہ کون لوگ ہوں گے فرمایا جن کی برائیاں نیکیوں میں تبدیل کر دی گئی ہوں گی۔

ایک شبہ

گناہ تو اللہ کو پسند نہیں، ایک ناگوار امر ہے اور نیکی اللہ کو پسند ہے اور اللہ اپنے بندوں سے کفر اور معصیت کو پسند نہیں کرتا پھر بدی نیکی کیسے ہو جائے گی اور کس طرح گناہ قابل ثواب بن جائے گا ناپسندیدہ، پسندیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ازالہ

اس شبہ کو دو طرح سے دور کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اللہ کے نیک بندوں سے اگر بتقدیر الٰہی کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو ان کو انتہائی پشیمانی ہوتی ہے اتنی کہ خود ان کو اپنی جان ذلیل معلوم ہونے لگتی ہے، فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں زاری کرتے ہیں اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، معافی کے طلب گار ہوتے ہیں آخر رحمت الٰہی کی ان پر اتنی اور ایسی بارش ہونے لگتی ہے کہ اگر وہ گناہ نہ کرتے تو اس رحمت کا نزول ان پر نہ ہوتا اور اس مرتبے پر نہ پہنچتے، حاصل یہ ہے کہ گناہ جو موجب عذاب تھا، ندامت واستغفار کے بعد سبب ثواب بن جاتا ہے اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ اگر تم نے گناہ نہ کیے تو اللہ تم کو لے جائے گا اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو گناہ کریں گے پھر اللہ سے معافی کے طلب گار ہوں گے اور اللہ ان کو معاف کر دے گا۔ رواہ مسلم من حدیث ابی ہریرہ۔

یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ماعز بن مالک کے لئے دعائے مغفرت کرو۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ایک گروہ کو تقسیم کر دی جائے تو سب کو اپنے اندر سمالے (سب کی مغفرت کے لئے کافی ہو جائے۔ حضرت ماعز ایک مخلص صحابی تھے حسب تقدیر ان سے زنا کا صدور ہو گیا اور خود حاضر ہو کر انہوں نے اقرار و اظہار کرنے کے بعد حد زنا جاری کرنے کی درخواست کی حضور ﷺ نے ہر چند اشارات کئے کہ وہ زنا کے اقرار سے پھر جائیں لیکن انہوں نے اصرار کے ساتھ چار مرتبہ اقرار کیا اور سزا کے امیدوار ہوئے آخر حضور ﷺ نے ان کو سنگسار کرا دیا۔ مترجم)

(ایک عورت قبیلہ، غامد میں کی تھی اس سے فعل زنا سرزد ہو گیا اس نے بھی حاضر ہو کر سزائے زنا جاری کرنے کی درخواست کی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے پاک کر دیجئے۔ اس کو بھی حضور ﷺ نے ہر چند ٹالنا چاہا مگر وہ نہ مانی آخر اس کو بھی حضور ﷺ نے سنگسار کرا دیا) حضرت خالد بن ولید نے اس غامدیہ عورت کے متعلق ناشائستہ الفاظ کہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، خالد زبان روک قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ مکس والا بھی کرلے تو اس کی بھی مغفرت ہو جائے (مکس وہ ٹیکس جو عشر کے بہانہ سے سرکاری آدمی سوداگروں سے وصول کر لیتے تھے یہ ٹیکس بیرونی سوداگروں سے دھوکہ دے کر لیا جاتا تھا۔ مجمع البحار) رواہ مسلم فی قصہ ماعز والغامدیۃ عن بریدہ۔

یہی روح ہے اس قول کی جس گناہ کا آغاز غفلت اور انجام ندامت و توبہ ہو وہ اس طاعت سے بہتر ہے جس کا آغاز فخر اور انجام ریاکاری ہو۔

(۲) بحر محبت میں ڈوبنے والوں سے کبھی کبھی کوئی ایسا عمل یا قول سرزد ہو جاتا ہے جو معیار شریعت سے گرا ہوا ہوتا ہے جیسے رہبانیت (ترک لذائذ، ترک تعلقات ترک کل) سماع، وجد اور شطحیات (غیر شرعی کلمات) چونکہ ان امور کا ان سے صدور خالص محبت و عشق کے زیر اثر ہوتا ہے اس لئے ان کی ان ظاہری لغزشوں کو اللہ نیکیوں سے تبدیل کر دے گا۔ عارف رومی نے فرمایا ہے۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود | کفر گیرد کاملے ملت شود
کار پاکان را قیاس از خود گیر | گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
او بدل گشت و بدل شد کار او | لطف گشت و نور شد ہر نار او

شاید حضرت ابوذر کی حدیث میں جو آیا ہے کہ (قیامت کے دن بعض لوگوں کے متعلق حکم ہوگا کہ) اس کے چھوٹے گناہ اس کے سامنے لاؤ حسب الحکم چھوٹے گناہ اس کے سامنے لائے جائیں اور پوشیدہ گناہوں کو پوشیدہ رکھا جائے گا۔ اس سے اشارہ ہمارے مذکورہ بالا قول کی طرف ہے کیونکہ کاملوں سے جو ان امور کا صدور ہوتا ہے وہ غلبۂ محبت کے زیر اثر ہوتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے انکو چھوٹے گناہ کہا جاسکتا ہے کبیرہ گناہ نہیں قرار دیا جاسکتا چونکہ ان صغیرہ گناہوں کا اصل سرچشمہ (ارادۂ معصیت نہیں بلکہ) غلبۂ محبت ہوتا ہے اس لئے اللہ ان کو نیکیاں بنادے گا رہے کبیرہ گناہ جو بقضاء خداوندی کبھی کبھی ان سے سرزد ہوگئے ہوں گے ان کو پوشیدہ رکھا جائے گا اور معاف کر دیا جائے گا ذکر بھی نہیں کیا جائے گا جیسا کہ آئندہ آیت اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ اور اللہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ چھوٹے بڑے سب گناہوں کو بخش دے گا توبہ کے بعد بھی اور بغیر توبہ کے بھی۔

میں کہتا ہوں آیت وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ سے شاید فناء قلب کی طرف اشارہ ہے۔ فناء قلب کے بعد آدمی سوائے خدا کے کسی چیز کا قصد نہیں کرتا اللہ کے سوا اس کو نہ کسی سے کوئی امید رہتی ہے نہ خوف، اللہ ہی اس کا مقصود ہو جاتا ہے اور جو مقصود ہوتا ہے وہی معبود ہوتا ہے بلکہ اس کو اللہ کے سوا کوئی چیز موجود ہی نہیں دکھائی دیتی کیونکہ حقیقی وجود اللہ کا ہے دوسری چیزوں کا حقیقی وجود نہیں (بلکہ وجود حقیقی کا ایک پرتو اور سایہ ہے) صرف اللہ ہی کا اصل وجود ہے، ذات الٰہی کا تقاضا ہے وجود۔

……ایک شبہ……

کیا عام اہل ایمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ ہی کا وجود حقیقی اور اصلی ہے اور دوسرے کا وجود ایسا نہیں ہے (بلکہ ظلی اور غیر حقیقی ہے) پھر فناء قلب کے درجہ تک پہنچنے والوں کی کیا خصوصیت ہے۔

……ازالہ……

میں کہتا ہوں عقیدہ تو سب مومنوں کا یہی ہے لیکن ان کا یہ عقیدہ استدلالی ہے شہودی نہیں، معاینہ پر مبنی نہیں۔ بداہت وجدان اس پر شاہد ہے دیکھو عام مومنوں کو (بظاہر) طمع اور خوف اللہ کے سوا دوسروں سے ہوتا ہے اس سے آگے وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ سے شاید فناء نفس کی طرف اشارہ ہے نفس امارہ بالسوء (گناہ کا حکم دینے والا نفس) جب فناء ہو جاتا ہے اور اللہ کی مرضی پر اس کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو سارے جذبات معصیت اس سے الگ ہو جاتے ہیں ہماری اس توجیہ کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے اللہ نے ان کے صفات کمالیہ کا ذکر کیا اور فرمایا وعباد الرحمن الذین یمشون اس کے بعد اوصاف مذکورہ بالا (عدم قتل و عدم زنا وغیرہ) کا ذکر کیا اگر اس سے مجازی عرفی توحید اور ظاہری تقویٰ مراد ہوتا تو پھر آیت وعباد الرحمن سے پہلے اس کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔

وَمَنْ تَابَ اور جس نے توبہ کی۔ یعنی شرک و معاصی سے توبہ کی۔ شرک اور گناہ کو چھوڑ دیا اور ندامت کے ساتھ معافی کا طلب گار ہوا۔

وَعَمِلَ صَالِحًا اور نیک عمل کئے یعنی گزشتہ عمل بد کی تلافی نیک اعمال سے کی یا یہ مطلب ہے کہ شرک و

معصیت کو چھوڑ کر دائرہ طاعت میں داخل ہو گیا۔

فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ تو (وہ بھی عذاب سے بچا رہے گا کیونکہ) حقیقت میں وہ اللہ کی طرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہے۔

پس اللہ کا (عطا کیا ہوا) حق ہے کہ اللہ اس کو ثواب دے اور اس کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے۔

متابا کی تنوین بعض اہل تفسیر کے نزدیک تعظیم کے لئے اور توبہ کی ترغیب کے لئے ہے مطلب یہ کہ وہ اللہ کی طرف ایسا عظیم الشان رجوع کرتے ہیں جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہے عذاب کو مٹا دینے والا اور حصول ثواب کا ذریعہ ہے بعض علماء نے کہا اللہ کی طرف لوٹنے سے مراد ہے اللہ کے ثواب کی طرف لوٹنا اور یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ بغوی نے لکھا ہے بعض اہل علم کا قول ہے کہ جن گناہوں سے اجتناب کرنے کی سابق آیت میں صراحت کی گئی ہے اس آیت میں ان گناہوں سے توبہ مقصود نہیں ہے دوسری قسم کی توبہ اور رجوع مقصود ہے۔ یعنی جن لوگوں نے شرک سے توبہ کی اور فرائض کو ادا کیا اور قتل وزنا کا ارتکاب نہیں کیا اس کا رجوع مرنے کے بعد اللہ کی طرف بحسن وخوبی ہو گا۔ قتل وزنا کا ارتکاب کرنے والوں سے قتل وزنا نہ کرنے والوں کا رجوع بہتر حالت میں ہو گا۔ اس صورت میں پہلی توبہ جس کا ذکر من تاب میں کیا گیا ہے جزا ہو گی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیت تمام گناہوں سے توبہ کے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ جو شخص توبہ کرنے کا ارادہ کرے اور عزم کر چکا ہو تو اس کی لوجہ اللہ توبہ کرنا چاہئے فانه يتوب اگرچہ خبر ہے لیکن بمعنی امر ہے بعض نے کہا (یتوب میں توبہ بمعنی رجوع ہے) مطلب یہ ہے کہ آخر اللہ کی طرف لوٹنا اور منتقل ہونا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر آیت يبدل الله سياتهم حسنت میں وہ تائب مراد ہوں جن سے غلبۂ حال اور سکر و محبت کے زیر اثر کچھ ایسی لغزشیں ہو گئی ہوں جو غیر شرعی ہوں معیار شرع پر پوری نہ اترتی ہوں پھر اس محبت کے غلبہ کی وجہ سے اللہ ان کی لغزشوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا تو اس آیت میں وہ نیک بندے مراد ہو سکتے ہیں جن سے کوئی غیر شرعی حرکت سر زد نہیں ہوئی نہ سکر اور غلبۂ حال کی وجہ سے نہ حالت صحو میں بلکہ ان بندوں نے تمام مکروہات و ممنوعات شرعیہ سے رجوع کر لیا اور کبھی کوئی گناہ کا کام نہیں کیا، ان اصحاب صحو کا رجوع اللہ کی طرف اصحاب سکر سے بہتر ہو گا جیسے نقشبندیہ ہیں جو بالکل صحابہؓ کرام کا نمونہ ہیں اور صحابہ کی طرح سنت کے پیرو ہیں۔

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ اور وہ جو جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔

بغوی نے لکھا ہے ضحاک اور اکثر مفسرین کے نزدیک زور سے مراد ہے شرک۔

میں کہتا ہوں اس تفسیر پر نفی شرک کی تکرار ہو جائے گی۔ کیونکہ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ میں شرک کی نفی ہے علی بن طلحہ کے نزدیک شہادت زور سے مراد ہے لوگوں کے خلاف جھوٹی شہادت دینی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا، جھوٹے گواہ کے چالیس تسمے (کوڑے) مارے جائیں اور منہ کالا کر کے بازار میں گھمایا جائے۔

ابن ابی شیبہ نے بروایت ابو خالد بحوالہ، حجاج بوساطت مکحول ولید کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے اپنے عاملوں کو جو شام میں مامور تھے لکھ بھیجا تھا کہ جھوٹے گواہ کے چالیس کوڑے مارے جائیں اور منہ کالا کیا جائے اور سر منڈوا دیا جائے اور طویل مدت تک قید رکھا جائے عبد الرزاق نے مصنف میں مکحول کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر نے جھوٹے گواہ کے چالیس کوڑے لگوائے تھے۔ یہ بھی عبد الرزاق نے لکھا ہے کہ مجھ سے یحییٰ بن علاء نے اور یحییٰ سے احوص بن حکیم نے بیان کیا اور احوص نے اپنے باپ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے جھوٹے گواہ کے متعلق حکم دیا کہ اس کا منہ کالا کیا جائے اور اس کی پگڑی گردن میں ڈال کر قبائل میں گھمایا جائے۔

حضرت عمر کے انہی احکام کی روشنی میں امام مالک، امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد نے فرمایا جھوٹے گواہ کو

(کوڑے) مارنے کی تعزیری سزا دی جائے اور اس کی قوم کے سامنے لے جاکر اس کو کھڑا کیا جائے تاکہ وہ بھی پہچان جائیں کہ وہ جھوٹا گواہ ہے۔

امام مالک نے اتنا زائد فرمایا کہ مسجدوں اور بازاروں میں اس کو حاضر کیا جائے۔

مذکورہ بالا ائمہ نے فرمایا کہ جھوٹی شہادت گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ رسول اللہ کا فرمان حضرت انس کی روایت سے شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ سب سے بڑے کبیرہ گناہ کون سے ہیں صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور فرمائیے، فرمایا! اللہ کا ساجھی قرار دینا، ماں باپ سے سرکشی کرنا، حضور ﷺ اس وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے فوراً اٹھ بیٹھے اور فرمایا سنو اور جھوٹی بات کہنی، جھوٹی شہادت دینی، حضور ﷺ نے اس لفظ کو بار بار اتنی مرتبہ فرمایا کہ ہم نے (اپنے دل میں) کہا اب حضور ﷺ خاموش ہو جاتے تو بہتر تھا۔

اللہ نے شرک اور جھوٹی شہادت سے پرہیز رکھنے کا یکجائی حکم ملا کر دیا ہے اور فرمایا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ جب شہادت زور کبیرہ گناہ قرار پائی اور اس کی کوئی شرعی سزا مقرر نہیں ہے بلکہ اس میں تعزیر ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تعزیری سزا کے لئے صرف تشہیر کافی ہے مارنا اور قید کرنا جائز نہیں کیونکہ تعزیر کا مقصد ہے (مجرم کو) باز داشت اور یہ باز داشت تشہیر سے حاصل ہو جاتی ہے مارنے اور قید کرنے زجر و باز داشت کی شدت ہے لیکن ایسی سخت سزا کا تصور مجرم کو اپنی شہادت کے جھوٹے ہونے کے اقرار اور شہادت سے لوٹ جانے سے روکتا ہے اور شہادت کا جھوٹ ہونا بغیر اس کے ثابت نہیں ہوتا کہ مجرم خود ہی اپنی شہادت کے کاذب ہونے کا اقرار کرے اور دی ہوئی شہادت سے لوٹ جائے لہٰذا جھوٹی شہادت کی سزا میں تخفیف ہونی چاہئے (تاکہ مجرم اپنی شہادت کے جھوٹے ہونے کے اقرار کی جرأت کر سکے) رہا حضرت عمر کا اثر تو وہ محض سیاسی تھا (آئینی نہ تھا آرڈیننس تھا جس کا امیر وقت کو اختیار ہے)

امام ابو حنیفہؒ کے قول کی طرح قاضی شریح کا قول بھی روایت میں آیا ہے امام محمد نے کتاب الآثار میں بیان کیا ہے کہ شریح جب کسی جھوٹے گواہ کو پکڑ لیتے تھے اور مجرم بازاری شخص ہوتا تو شریح اپنے قاصد کو حکم دیتے کہ جاکر بازار والوں کو کہہ دو کہ شریح تم کو سلام کہتا ہے اور سلام کے بعد اس نے کہا ہے کہ ہم نے اس شخص کو جھوٹا شاہد پایا تم لوگ اس سے پرہیز رکھو اور اگر مجرم (بازاری نہ ہوتا بلکہ) عرب کے قبیلہ میں سے ہوتا تو اس قبیلہ کی مسجد میں قاصد کو بھیج کر مذکورہ پیام کہلا بھیجتے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی شریح کا یہی فیصلہ نقل کیا ہے ابن جریج کے نزدیک شہادت زور سے ہر جھوٹ مراد ہے صرف شرک ہی مراد نہیں ہے۔

بعض علماء نے لا یشھدون الزور کا مطلب یہ بیان کیا کہ وہ جھوٹ کی محفلوں میں شرکت نہیں کرتے (یعنی الزور سے پہلے مضاف محذوف ہے) کیونکہ بے ہودہ جلسوں میں موجود ہونا بھی شرکت کا حکم رکھتا ہے۔ اس تفسیر پر بے ہودہ قصوں یا شاعری کی مجلسوں میں شرکت کرنا ناجائز قرار پائے گا مجاہد کا یہی قول ہے۔ مراد یہ ہے کہ مشرکوں کے تہواروں اور میلوں میں وہ شریک نہیں ہوتے۔

بعض نے الزور سے نوحہ کی مجلس مراد لی ہے قتادہ نے عدم شہادت زور کا یہ مطلب بیان کیا کہ بے ہودہ، باطل باتوں کی تائید اور اعانت نہیں کرتے۔

محمد بن حنیفہؒ نے فرمایا لغو اور گانے کے موقع پر حاضر نہیں ہوتے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا گانا دلوں میں نفاق کو اس طرح اگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو۔

بغوی نے لکھا ہے زور کا اصل معنی ہے کسی چیز کو خوب صورت بنا دینا اور اصل حالت کے خلاف دوسری حالت پر دکھانا، پس (اس جگہ) زور کے معنی ہوئے باطل پر ایسا ملمع کرنا کہ وہ حق معلوم ہونے لگے میں کہتا ہوں لغت میں زور کا معنی ہے موڑ دینا، پھیر دینا اللہ نے فرمایا ہے تزاور عن کھفھم سورج ان کے غار سے مڑ جاتا ہے اس کا استعمال کذب کے لئے بھی ہوتا ہے کیونکہ جھوٹ میں حق سے باطل کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے اسی طرح ہر لغویات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے زور۔ بالضم جھوٹ اور شرک اور یہود و نصاریٰ کے تہوار (میلے) اور سرور اور گانے کی مجلس اور گانے کے سوا دوسرے (باطل) معبود اور قوت۔ میں کہتا ہوں صاحب قاموس نے جو معانی بیان کئے ہیں ان میں سے رئیس اور قوت کے علاوہ آیت میں ہر معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ اور اگر (اتفاقاً) بے ہودہ مشغلوں کے پاس ہو کر گزریں تو سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

اس کا عطف آیت لایشھدون الزور پر ہے زور سے مراد بھی معاصی ہیں اور لغو سے مراد بھی معاصی ہیں اور شہود سے مراد ہے حاضر ہونا حسن اور کلبی کا یہی قول ہے مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنے ارادہ سے گناہوں کی مجلسوں میں نہیں جاتے لیکن اتفاقاً اگر کسی گناہ کی محفل کی طرف سے ان کا گذر ہو جاتا ہے تو منہ پھیر کر تیزی کے ساتھ وہاں سے گذر جاتے ہیں عربی محاورہ ہے کرم فلان عما یشینه فلاں شخص ایسی باتوں سے پاک ہے جو اس کو عیب دار بناتی ہے اکرم نفسہ عنہ اس نے اپنے نفس کو عیب دار بنانے والی باتوں سے پاک رکھا۔

مقاتل نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ جب کافروں سے وہ برا بھلا اور دکھ پہنچانے والی باتیں سنتے ہیں تو در گذر کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں ابن جریج کی روایت میں مجاہد کا بھی یہی قول آیا ہے یہی مفہوم ہے آیت وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ کا۔

سدی نے کہا آیت مذکورہ بالا آیت جہاد سے منسوخ ہے۔

میں کہتا ہوں (اس آیت میں اور جہاد کی آیت میں کوئی تعارض نہیں ہے مترجم) حکم جہاد و قتال اداء جزیہ (کی شرط ماننے) پر ختم ہو جاتا ہے برا بھلا کہنے اور دکھ پہنچانے پر تو قتال کا حکم نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ اور وہ ایسے ہیں کہ جب اللہ کے احکام کے ذریعہ سے انکو نصیحت کی جاتی ہے۔

یعنی وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اور آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں یا یہ مراد یہ ہے کہ (آیات سے مراد ہیں نفسی اور آفاقی دلائل توحید) جب انکو دلائل توحید و تنزیہ پیش کر کے نصیحت کی جاتی ہے۔

لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ تو ان احکام پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے یعنی بغیر گوش ہوش سے سننے اور بغیر چشم حقیقت بین سے دیکھنے کے اندھوں بہروں کی طرح نہیں اٹھ کھڑے ہوتے بلکہ گوش قبول سے سنتے اور سمجھتے ہیں اور چشم بصیرت سے حق کو دیکھتے اور اس پر چلتے ہیں۔

آیت میں نفی حالت مراد ہے نفی فعل مراد نہیں ہے یعنی ان کی حالت اندھوں بہروں کی طرح نہیں ہوتی جیسے کہا جاتا ہے لا یلقانی زیدرا کبا زید سوار ہونے کی حالت میں مجھ سے نہیں ملتا۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ

اور وہ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اعین بصیغۂ جمع قلت ذکر کیا (عیون نہیں فرمایا) کیونکہ آنکھ سے مراد ہیں متقیوں کی آنکھیں اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم ہی ہے۔ من ازواجنا میں من ابتدائیہ ہے یعنی ہمارے اہل و عیال کو صالح بنا کر ان سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

قرطبی نے لکھا ہے مومن کی آنکھ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی ٹھنڈک نہیں کہ وہ اپنی بیوی اور اولاد کو اللہ کا فرماں بردار دیکھے۔

حسن نے کہا قرۃ مصدر ہے اسی لئے اس کو بصیغہ مفرد ذکر کیا قرۃ کا اصل معنی ہے ٹھنڈک، خنکی، حرارت کی ضد۔ عرب

(گرم ملک کی سکونت کی وجہ سے) گرمی سے تکلیف اور ٹھنڈک سے چین محسوس کرتے ہیں خوشی کے وقت قرۃ العین (خنکی چشم) اور غم کے وقت سخنۃ العین (گرمی چشم) کہتے ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں۔ ازہری نے کہا قرۃ العین کا یہ معنی ہے کہ دل کو اپنا پسندیدہ محبوب مل جائے اور آنکھ دوسروں سے ہٹ کر اپنے محبوب ہی کو دیکھے۔

وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اور ہم کو متقیوں کا پیشوا بنا۔

جب اہل وعیال متقی ہو جائیں گے تو لامحالہ وہ مومن متقیوں کے امام (پیشوا) قرار پائیں گے۔

لفظ امام مفرد ہے جنس پر دلالت کر رہا ہے (اور اجعلنا میں ضمیر مفعول جمع ہے اور جماعت مومنوں کی ہی یہ دعا ہے) لیکن غیر مقصود کا اشتباہ نہیں ہے اسی لئے بصیغۂ مفرد ذکر کیا جیسے دوسری آیت میں عدو اور طفل بصیغہ مفرد جماعت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے ثم یخرجکم طفلا نھم عدو لی الا رب العالمین۔

بعض علماء نے کہا امام ام کا مصدر ہے جیسے صیام اور قیام۔ یا یوں کہا جائے کہ واجعلنا یعنی واجعل کل واحد منا ہم میں سے ہر ایک کو امام بنا دے جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے کہ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّكَ (بجائے رسل کے رسول کا لفظ ذکر کیا) بعض اہل علم نے کہا امام آم بروزن عام خاص کی جمع ہے جیسے صائم کی جگہ صیام۔ اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ ہم کو متقیوں کے راستہ پر چلنے والا اور ان کی پیروی کا قصد کرنے والا بنا دے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ ان لوگوں کو (جن کے اوصاف اوپر ذکر کر دیئے گئے) ثواب میں جنت کے اعلیٰ مقامات دیئے جائیں گے۔

شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت اپنے سے اوپر بالائی منزلوں والوں کو آپس کے تفاوت مراتب کی وجہ سے اس طرح دیکھیں گے جیسے تم لوگ ابر آلود آسمان میں مشرقی یا مغربی افق سے ستارے کو دیکھتے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو انبیاء کے مکان ہوں گے دوسرا کوئی وہاں نہیں پہنچے گا فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبروں کو سچا جانا (وہ انسان ان مراتب تک پہنچ سکتے ہیں) حضرت سہل بن سعد کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔

احمد، حاکم، اور بیہقی نے حضرت ابن عمر کی روایت سے اور ترمذی و بیہقی نے حضرت علیؓ کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت ابو مالک اشعری کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے اندر کچھ بالاخانے ایسے ہیں جن کے اندر کی حالت باہر سے اور باہر کی حالت اندر سے دکھائی دے گی۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ بالاخانے کن لوگوں کے لئے ہوں گے فرمایا ان لوگوں کے لئے جو پاکیزہ کلام کرتے ہیں (غریبوں کو) کھانا کھلاتے ہیں اور جب دوسرے لوگ سوتے ہیں تو وہ رات کو (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت کے لحاظ سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے، ان لوگوں کے لئے ہیں جو پاکیزہ کلام کرتے ہیں اسلام پھیلاتے ہیں کھانا کھلاتے ہیں اور رات میں ایسے وقت نماز پڑھتے ہیں کہ اور لوگ سوتے ہوتے ہیں۔

حضرت ابو مالک کی روایت کے یہ الفاظ ہیں، ان لوگوں کے لئے جو کھانا کھلاتے ہیں نرم کلام کرتے ہیں متواتر روزے رکھتے ہیں اور رات میں نماز پڑھتے ہیں جبکہ اور لوگ سوتے ہوتے ہیں۔

بیہقی اور ابو نعیم نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو جنت کے بالاخانوں کے متعلق نہ بتاؤں، صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ (فرمایئے) ارشاد فرمایا، جنت کے اندر

یقیناً کچھ بالاخانے قسم قسم کے جواہرات کے ایسے (شفاف) ہیں کہ ان کے باہر سے اندر کی نعمتیں لذتیں اور عزت بخشیاں دکھائی دیں گی اور اندر سے باہر کی راحت لذت اور عزت دکھائی دے گی یہ نعمت لذت اور عزت ایسی ہوگی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی اور نہ کسی کان نے سنی ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ بالاخانے کن لوگوں کے لئے ہوں گے فرمایا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اسلام کو پھیلایا، کھانا کھلایا ہمیشہ روزے رکھے اور رات میں ایسے وقت نماز پڑھی جبکہ (اور) لوگ سوتے ہوں۔ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ایسا کرنے کی کس میں طاقت ہے، فرمایا میری امت اس کی طاقت رکھتی ہے میں اس کی تفصیل تم کو بتاتا ہوں جو اپنے بھائی (مسلمان) سے ملا اور اس کو سلام کیا اور سلام کا جواب دیا۔ اس نے سلام کو پھیلایا اور جس نے اپنے اہل و عیال کو پیٹ بھر کھانا کھلایا تو اس نے (ضروری) کھانا کھلا دیا اور جس نے رمضان کے علاوہ ہر مہینے تین دن کے (یعنی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخوں کے) روزے رکھے اس نے (گویا) ہمیشہ روزے رکھے اور جس نے عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی تو بے شک اس نے رات ایسے وقت نماز پڑھی کہ یہودی عیسائی اور مجوسی اس وقت خواب میں ہوتے ہیں اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

ابن عدی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شک نہیں کہ جنت کے اندر کچھ بالاخانے ایسے ہیں کہ ان کے اندر رہنے والا اگر ان کے اندر ہوگا تو بالاخانہ سے پیچھے والی چیزیں اس سے پوشیدہ نہ ہوں گی اور اگر بالاخانوں پیچھے سے (باہر) ہوگا تو اندر کی چیزیں اس سے مخفی نہ ہوں گی۔ عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول یہ بالاخانے کن کے لئے ہوں گے فرمایا ان کے لئے جنہوں نے پاکیزہ کلام کیا۔ مسلسل روزے رکھے، سلام کو پھیلایا اور رات میں ایسے وقت نماز پڑھی کہ لوگ سوتے ہوں عرض کیا گیا کلام کی پاکیزگی سے کیا مراد ہے فرمایا، سبحان اللہ والحمد اللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر قیامت کے دن جب ان کا قائل (محشر کے میدان میں) آئے گا تو یہ کلمات آگے پیچھے ہوں گے اور نجات دلانے والے ہوں گے عرض کیا گیا مسلسل روزے رکھنے کا کیا مطلب ہے فرمایا، جس نے رمضان کے روزے رکھے اس نے بلاشبہ (ہمیشہ کے) مسلسل روزے رکھے عرض کیا گیا کھلانے سے کیا مراد ہے فرمایا جس نے اپنے عیال کو کھانا دیا۔ عرض کیا گیا سلام کو پھیلانے سے کیا مراد ہے، فرمایا اپنے (مسلمان) بھائی کی مصاحبت اور اس کو سلام کرنا عرض کیا گیا لوگوں کے سونے کی حالت میں نماز کا کیا مطلب، فرمایا عشاء کی نماز۔

حکیم، ترمذی نے حضرت سہل بن سعد کی مرفوع روایت سے اس آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ بالاخانہ سرخ یاقوت، سبز زبرجد اور سفید موتی کا ہوگا جس میں نہ کوئی شگاف ہوگا نہ کوئی عیب۔

بِمَا صَبَرُوْا ان کے صبر کرنے کی وجہ سے۔

یعنی انہوں نے چونکہ دنیا میں نفسانی خواہشات کو ترک کیا مجاہدات کی تکلیفیں اٹھائی تھیں کافروں کی طرف سے پہنچنے والی اذیتیں برداشت کی تھیں اور طاعت و عبادت کی وجہ سے پہنچنے والے دکھ پر ثابت قدم رہے تھے اس لئے ان کو مذکورہ بالا مراتب ملیں گے۔

ابو نعیم نے ابو جعفر کا قول نقل کیا ہے کہ صبر کرنے سے مراد ہے دنیا میں ناداری پر صبر کرنا۔

وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝۷۵ اور ان کو اس بہشت میں فرشتوں کی طرف سے بقاء کی دعا اور سلام ملے گا۔

یعنی بالاخانوں کے اندر فرشتے تحیۃ و سلام کے ساتھ استقبال کریں گے، مراد یہ ہے کہ ان کے لئے اللہ سے سلامتی و عافیت کی دعا کریں گے یا یہ مراد ہے کہ ان کو ہر آفت سے سالم رہنے اور ہمیشہ باقی رہنے کی بشارت دیں گے۔ کلبی نے کہا مراد یہ ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو سلام کریں گے اور اللہ کی طرف سے ان کو سلام بھیجا جائے گا۔ احمد، بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کی مخلوق میں سے جنت کے اندر وہ فقراء مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعہ سے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور انہی کی وجہ سے مکروہات سے (مسلمانوں کا) بچاؤ ہوتا ہے (لیکن ان کی

خود یہ حالت ہوتی ہے) کہ وہ اپنی ضروریات کو اپنے سینے میں لے کر مر جاتے ہیں اور زندگی بھر ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ اللہ اپنے فرشتوں میں سے جن کو چاہے گا حکم دے گا کہ جاؤ ان کو سلام کرو۔ (انکا استقبال کرو) ملائکہ عرض کریں گے۔ اے ہمارے رب ہم تیرے آسمان کے باشندے ہیں اور تیری مخلوق میں سے تیرے برگزیدہ بنائے ہوئے ہیں۔ پھر تو ہی ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ہم انکے پاس جائیں اور ان کو سلام کریں۔ اللہ فرمائے گا یہ وہ لوگ ہیں جو میری (ہی) عبادت کرتے تھے میرا ساجھی کسی کو نہیں بناتے تھے انہی کے ذریعہ سے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی تھی اور انہی کی وجہ سے مکروہات سے بچاؤ ہوتا تھا لیکن وہ ایسی حالت میں مر جاتے تھے کہ ان کی ضروریات ان کے سینوں کے اندر ہوتی تھی اور وہ ضروریات کو پورا نہ کر سکے تھے۔ حسب الحکم ملائکہ ان کے پاس جائیں گے اور ہر دروازے سے داخل ہو کر کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ بعض لوگوں نے کہا آیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کو تحیت یعنی بقائے دوامی اور سلام یعنی ہر آفت سے سلامتی کی پیش کش کی جائے گی۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ان بالاخانوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ وہ بالاخانے (ان کے لئے) اچھی قرارگاہ اور قیام کی جگہ ہوں گے۔

مسلم نے حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایک منادی نداء کرے گا تمہارے لئے بلاشک دوامی تندرستی ہے، کبھی بیمار نہ ہو گے تمہارے لئے دوامی زندگی ہے کبھی نہیں مرو گے، تمہارے لئے ہمیشہ جوان رہنا ہے کبھی بوڑھے نہ ہو گے، تمہارے لئے ہمیشہ راحت میں رہنا ہے کبھی دکھی نہ ہو گے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں کرے گا اگر تم عبادت نہ کرو گے)

یعبو ماخوذ ہے عبات الجیش عبوا سے میں نے فوج کو مرتب کر دیا، تیار کر دیا، کذا فی النہایہ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے استغفار نہ کرو تو کون چیز تم کو جنت میں داخل ہونے کے لئے تیار کر سکتی ہے بعض اہل تفسیر نے دعاء کا ترجمہ کیا ہے عبادت یا ایمان۔ بعض علماء نے آیت کا یہ مطلب ہے کہ اگر اللہ تم کو اسلام کی دعوت نہ دیتا تو جنت میں کیسے داخل ہوتے۔ اب چونکہ تم ایمان لے آئے تو اللہ نے تم کو جنت میں داخل ہونے کے لئے تیار کر دیا۔ بعض علماء نے کہا یعبو، عبا سے مشتق ہے اور عبا کا معنی ہے بوجھ، وزن، مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری طرف سے طاعت و عبادت نہ ہو تو اللہ کی نظر میں تمہارا کیا وزن اور کیا قدر ہو گی۔ اللہ کو تمہاری پرواہ نہ ہو گی کیونکہ انسان کی بزرگی اور برتری صرف معرفت اور طاعت کی وجہ سے ہے ورنہ انسان چوپایوں کی طرح ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے یا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ تم کو دعوت اسلام نہ دیتا اور تم ایمان نہ لاتے تو اللہ کی نظر میں تمہاری قدر نہ ہوتی اب جبکہ اس نے تم کو اسلام کی دعوت دے دی ہے اور) تم ایمان لے آئے تو اللہ کے نزدیک تمہاری قدر نمایاں ہو گئی۔

بعض نے کہا، مایعبو بکم کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کو تم کو پیدا کرنے کی کیا پرواہ ہوتی اگر تمہاری عبادت اور طاعت (مقصود) نہ ہوتی۔ یعنی اس نے اپنی عبادت کے لئے تم کو پیدا کیا ہے اسی کے متعلق فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ بغوی نے لکھا ہے یہی قول حضرت ابن عباس اور مجاہد کا ہے۔

بعض نے مایعبو بکم کا ترجمہ کیا ہے مایبالی بکم یعنی اللہ کو تمہاری مغفرت کی کیا پرواہ۔ اگر تم اس کے ساتھ دوسرے معبودوں کو نہ پکارو اور اگر تم شرک نہ کرو تو وہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اسی مفہوم کی تائید ہو رہی ہے آیت مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ سے۔ بعض نے کہا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تمہارے عذاب کی کیا پرواہ کرتا ہے اگر مصائب و شدائد میں تم اس کو نہ پکارو۔ اسی پر دلالت کر رہی ہے آیت فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے اپنی کسی غرض کے لئے تم کو نہیں پیدا کیا اور نہ اللہ کے نزدیک تمہاری کوئی قدر ہے بغیر اس کے کہ تم اس کے مغفرت کے خواستگار ہو اگر تم اس سے سوال کرو اور اس سے سوال کرو گے اور مغفرت

کے لئے دعا کرو گے تو وہ تم کو دے گا اور گناہ معاف کر دے گا اس مطلب پر مایعبؤ میں مانافیہ ہوگا۔

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ۝ سو تم احکام خداوندی کو جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب یہ (جھوٹا سمجھنا) تمہارے لئے وبال جان ہو جائے گا یہ کفار مکہ کو خطاب ہے۔

یعنی اللہ نے رسول کے ذریعہ سے تم کو اپنی توحید و عبادت کی دعوت دی لیکن تم نے رسول ﷺ کی تکذیب کی اور دعوت کو قبول نہیں کیا تو اب جنت میں داخل کرنے کا سر و سامان اللہ تم کو کس طرح دے گا یا یہ مطلب ہے کہ اس کے نزدیک تمہارا وزن و مرتبہ کیسے ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ تم کو عذاب دینے کی اس کو کیا پرواہو گی۔ نتیجہ یہ کہ تمہاری یہ تکذیب تم سے جدا نہ ہوگی تم کو چمٹی رہے گی تم کو توبہ کی توفیق نہیں دی جائے گی اور تمہارے اعمال کی پاداش تم کو ملے گی۔

یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری اس تکذیب کی سزا تم کو چمٹی رہے گی تم کو گھیرے رہے گی یا اس تکذیب کا اثر تمہارے ساتھ چسپاں رہے گا یہاں تک کہ یہ تکذیب تم کو اوندھے منہ دوزخ میں گرا دے گا۔

حضرت ابن عباس نے لزاما کا ترجمہ کیا ہے موت اور ابو عبیدہ نے ترجمہ کیا ہلاکت ابن زید نے قتال اور ابن جریر نے کہا ہمیشہ رہنے والا کبھی نہ ختم ہونے والا عذاب اور ایسی تباہ کن فنا آگیں ہلاکت جو ایک کو دوسرے کے ہاتھوں پہنچے گی۔ بغوی نے لکھا ہے لزاما سے مراد کیا ہے۔ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں حضرت ابن مسعود حضرت ابی بن کعب اور مجاہد نے فرمایا، اس سے مراد یوم بدر ہے جس میں ستّر کفار مارے گئے یعنی بدر کی لڑائی میں کافر مارے گئے اور قتل ہوتے ہی عذاب آخرت ان سے چمٹ گیا۔ بخاری نے صحیح میں حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا آپ نے فرمایا پانچ چیزیں تو ہو چکیں دخان (جو آسمان پر نظر آچکا) چاند (جو پھٹ چکا) روم جن کو ایرانیوں پر غلبہ مل چکا بطعہ (سخت پکڑ) اور لزام (بدر کی لڑائی میں کفار کا قتل) بعض نے کہا لزام سے مراد عذاب آخرت ہے واللہ اعلم۔

الحمد اللّٰہ رب العالمین وصلّی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقه محمد واله و اصحابه اجمعین۔

اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے سورت فرقان کی تفسیر چھ صفر ۱۲۰۵ھ کو ختم ہوئی تفسیر سورۃ الفرقان کا ترجمہ ۲۱ر شعبان ۱۳۹۰ھ کو پورا ہوا۔

☆

سورۃ الشعراء

سورۃ الشعرا مکی ہے صرف آخر کی چار آیات وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے آخر تک مکی نہیں ہے اس سورۃ کی کل ۲۲۷ آیات ہیں۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت معقل بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طٰہٰ اور طٰس والی سورتیں اور حٰمٓ والی سورتیں مجھے الواح موسیٰ سے عطا کی گئیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰسٓمٓ ① بغوی نے بروایت عکرمہ بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا طٰسٓمٓ کی تفسیر سے علماء عاجز ہیں۔ علی بن طلحہ والبی کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ قسم ہے اور اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے (یعنی اللہ نے اپنے اس نام کی قسم کھائی ہے) قتادہ نے کہا قرآن کے ناموں میں سے ایک نام طٰسٓمٓ ہے۔ مجاہد نے کہا ایک عورت کا نام ہے محمد بن کعب قرظی نے کہا اللہ نے قسم کھائی اپنے طول (یعنی قدرت کی) اور سنا (یعنی نور کی) اور مجد (یعنی بزرگی) کی (قرظی کی مراد یہ ہے کہ ط سے طول کی طرف اور س سے سنا کی طرف اور میم سے مجد کی طرف اشارہ ہے) حق بات یہ ہے کہ یہ (دوسرے مقطعات کی طرح۔ مترجم) اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہے۔

تِلْكَ یہ۔ سورت یا قرآن۔

اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② کھلی یا کھول دینے والی کتاب کی آیات ہیں۔ یعنی اس کتاب کی آیات ہیں جس کا معجزہ ہونا ظاہر ہے یا جو اللہ کے احکام اور ہدایت کا راستہ کھول دینے والی ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ شاید آپ اپنی جان کھو دیں گے۔

بخع نفسہ اس نے غم میں اپنی جان ہلاک کر دی۔

بخاع پشت میں ایک رگ ہوتی ہے جو گردن میں بھی آتی ہے یہ رگ حسب زعم زمخشری نخاع (حرام مغز) کے علاوہ ہوتی ہے اور بخع کا اصل معنی ہے ذبح کرتے وقت چھری کو بخاع تک پہنچا دینا پھر اس کا استعمال ہر مبالغہ کے لئے ہونے لگا۔

اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③ اس وجہ سے کہ وہ مومن نہیں ہوتے (ایمان نہیں لاتے) اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی اور آپ کو یہ بات بہت شاق ہوئی کیونکہ حضور کو بہت زیادہ تمنا اور رغبت تھی کہ اہل مکہ مسلمان ہو جائیں یہ بھی ممکن ہے کہ حضور کو اہل مکہ کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اس بات کا غم ہو کہ کہیں خدا تعالیٰ مجھ سے اس کی باز پرس نہ کرے اس صورت میں یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسلی ہے۔ لعل کلمۂ امید ہے لیکن اس جگہ رحم کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی اپنی جان پر آپ رحم کریں اور غم میں نہ پڑیں آپ اگر غم کریں گے تو شاید آپ غم کی وجہ سے اپنی جان ہلاک کر دیں۔ درحقیقت ہم ہی ان کا مومن ہونا نہیں چاہتے۔

اِنْ نَّشَاْ اگر ہم (ان کا مومن ہو جانا) چاہیں۔

نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۤءِ اٰيَةً تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی نازل کر دیں کہ وہ اس کو دیکھ کر ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔ یا (آیۃ سے مراد ہے مصیبت یعنی) کوئی ایسی مصیبت نازل کر دیں جو ان کو ایمان لانے پر مجبور کر دے۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ پھر ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں یعنی یہ فرماں بردار ہو جائیں۔

قتادہ نے کہا۔ اگر اللہ چاہتا تو کوئی ایسی نشانی نازل کر دیتا کہ پھر کوئی بھی نافرمانی سے گردن نہ موڑتا ابن جریج نے کہا آیت کا یہ معنی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو کوئی ایسا امر نازل کر دیتا کہ پھر ان میں سے کوئی شخص بھی نافرمانی نہ کر سکتا۔

......ایک شبہ......

اعناق، عنق کی جمع ہے اور عنق مؤنث ہے، اس لئے اعناق کے ساتھ خاضعۃ ہونا چاہئے۔ خاضعین بصیغہ جمع مذکر کیوں کہا گیا۔

ازالہ:۔ (۱) دوسری متصل آیات کے مقاطع کی لفظی رعایت سے ایسا کیا گیا۔

(۲) اصل کلام فَظَلُّوْا لَهَا خٰضِعِيْنَ تھا اور یہ صحیح تھا لیکن عضو خضوع اور مقام خضوع کو بیان کرنے کے لئے لفظ اعناق بڑھا دیا گیا جو زائد ہے۔

(۳) مضاف محذوف ہے، اصل میں اصحاب الاعناق تھا مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا، کیونکہ گردنیں جب خاضع ہو جائیں گی تو گردنوں والے خود ہی فرماں بردار عاجز ہو جائیں گے (جواب نمبر دوم مجاز فی الاسناد تھا اور نمبر سوئم میں مجاز بالحذف۔ مترجم)

(۴) اخفش نے کہا، خاضعین کا تعلق اعناقھم کی ضمیر جمع مذکر (یعنی ہم) سے ہے اعناق سے نہیں ہے۔

(۵) خضوع اہل عقل کی صفت ہے اور اعناق کو عقلاء کے قائم مقام قرار دے کر خاضعین کو بصیغہ جمع مذکر ذکر کر دیا۔

(۶) عرب کا قاعدہ ہے کہ جب مؤنث کی اضافت مذکر کی طرف کرتے ہیں تو مؤنث کو بھی مذکر مان لیتے ہیں اور مذکر کی اضافت مؤنث کی طرف کرتے ہیں تو اس مذکر کو بھی مؤنث قرار دے لیتے ہیں اس جگہ شق اول کی موافقت ہے۔

(۷) عنق سے پورا جسم مراد ہے (جز اعظم بول کر کل مراد لینا جائز ہے۔ مترجم) ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ (ہاتھوں سے مراد پوری شخصیت ہے) اَلْزَمْنٰهُ طٰۤىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (عنق سے مراد وہ شخص ہے)

(۸) مجاہد نے کہا (اعناق کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ) اعناق سے مراد ہیں بڑے بڑے سردار، یعنی بڑے بڑے سردار اس آیت کے سامنے تابع دار ہو جاتے ہیں۔

(۹) اعناق سے جماعتیں مراد ہیں عرب کہتے ہیں جاء القوم عنقا عنقا وہ لوگ جوق در جوق ٹکڑیاں بنا کر آئے۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿۵﴾

اور کوئی جدید (تازہ وارد) نصیحت ان کے پاس رحمٰن کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔

ذکر یعنی نصیحت یعنی قرآن کا کوئی حصہ جس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے من ذکر میں من زائد ہے اور من الرحمٰن میں من ابتدائیہ ہے محدث سے مراد ہے جدید نازل شدہ خواہ وجود کے لحاظ سے وہ قدیمی ہو (حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیام بھی نازل ہوا ہے وہ کسی زمانے میں نازل ہوا ہو، اصول کے لحاظ سے ایک ہی تعلیم دیتا ہے اللہ کی ذاتی و صفاتی توحید، وجود ملائکہ، نبوت و وحی کی صداقت، قانون خیر و شر اور قیامت کے دن اعمال کی جزا و سزا یہ بنیادی تعلیم ہر کتاب اور ہر صحیفے میں دی گئی ہے اس میں زمانہ کا فرق اثر انداز نہیں۔ البتہ قدیم و جدید کا فرق نزول میں ہے کوئی کتاب پہلے نازل ہوئی جیسے صحف نوحؑ کوئی سب سے آخر میں نازل ہوئی جیسے قرآن مجید۔

فَقَدْ كَذَّبُوا پھر یقیناً انہوں نے تکذیب کی۔ یعنی ذکر کی طرف سے روگرداں ہونے کے بعد انہوں نے ذکر کو جھوٹا قرار دیا۔ اور تکذیب میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ ذکر کا مذاق بنانے لگے۔ فقد کذبوا کے اندر استہزا کا مفہوم ضمنی طور پر آ گیا آئندہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے۔

فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبَٰٓؤُا۟ مَا كَانُوا۟ بِهِۦ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦﴾ (بدر کے دن یا قیامت کے دن) آئندہ ان کو اس (ذکر) کی اطلاعات مل جائیں گی جس ذکر کا وہ مذاق اڑا رہے تھے۔ یعنی یہ بات سامنے آجائے گی کہ وہ ذکر جس کا وہ مذاق بناتے تھے حق تھا یا باطل اور تصدیق و تعظیم کا مستحق تھا یا تکذیب و تحقیر و استہزا کے لائق۔

أَوَلَمْ يَرَوْا۟ إِلَى ٱلْأَرْضِ كَمْ أَنۢبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿٧﴾

کیا انہوں نے زمین کی طرف (نظر اٹھا کر) نہیں دیکھا ہم نے کس قدر عمدہ اچھا سبزہ ہر طرح کا اس میں اگایا ہے۔

یعنی اللہ کے رسول سے اللہ کی توحید اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھائے جانے کی دلیلیں انہوں نے طلب کیں اور زمین کی طرف نہیں دیکھا۔

مطلب یہ ہے کہ جب یہ زمین کو اور اس کی روئیدگی کو دیکھ رہے ہیں (اور توحید الٰہی اور قیامت کے وقوع کی نشانیاں ان کے سامنے ہیں) تو مزید آیات کی طلب نہ کرنی چاہئے۔ آیت میں استفہام انکاری ہے اور انکار نفی اثبات ہوتا ہے۔

کم انبتنا میں کم خبریہ ہے کہ جو کثرت کو ظاہر کر رہا ہے۔

زوج بمعنی صنف نبات۔ ہر طرح کا سبزہ، درخت۔

کریم عمدہ، اچھا، آدمیوں اور جانوروں کے لئے مفید ترین غذا اور کثیر المنفعت دوا۔ خواہ مفرد شکل میں ہو یا مرکب بنا کر۔ (دوا کبھی مفرد مفید ہوتی ہے کبھی معجون جوارش اور دوسرے طرح طرح کے مرکبات کی شکل میں) زمین کے ہر سبزہ کی روئیدگی و بالیدگی کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی ہمہ گیر قدرت پر دلالت کر رہی ہے عدم کے بعد دوبارہ پیدا کرنے کو ثابت کر رہی ہے اور اللہ کی کامل صفات کا اظہار کر رہی ہے۔

لفظ کل احاطۂ افراد کے لئے اور لفظ کم کثرت اصناف کو ظاہر کر رہا ہے۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً ۖ اس میں بلاشبہ (بڑی) نشانی ہے۔ یعنی طرح طرح کا سبزہ پیدا کرنے میں یا (ان میں سے ہر ایک کے اندر ایسی عظیم الشان نشانی موجود ہے جو واجب بالذات کامل القدرت تام الحکمۃ وسیع النعمت بسیط الرحمۃ اللہ کی ہستی پر دلالت کر رہی ہے۔

وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٨﴾ اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے، یعنی اللہ کے علم اور قضائے خداوندی میں (پہلے سے ہی) یہ بات موجود تھی کہ ان میں سے اکثر ایمان والے نہیں ہیں۔ اسی لئے عظیم الشان آیات قدرت نے بھی ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ سیبویہ نے کہا اس جگہ کان زائد ہے یعنی آیات عظیمہ کو دیکھنے کے بعد بھی ان میں سے اکثر مومن نہیں ہیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٩﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ بلا شک و شبہ آپ کا رب ہی غالب مہربان ہے۔ یعنی کافروں سے انتقام لینے پر قادر ہے لیکن مہربان بھی ہے۔

یعنی کافروں سے انتقام لینے پر قادر ہے لیکن مہربان بھی ہے اپنی مہربانی سے اس نے مہلت دے رکھی ہے یا یہ مطلب ہے کہ کافروں سے انتقام لینے پر قادر ہے اور توبہ کرنے والے مومنوں پر مہربان ہے۔

وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰٓ أَنِ ٱئْتِ ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٠﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۚ أَلَا يَتَّقُونَ ﴿١١﴾

اور جب آپ کے رب نے موسیٰؑ کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالموں یعنی فرعون کی قوم والوں کے پاس جاؤ (اور دیکھو کہ) کیا وہ ہمارے غضب سے نہیں ڈرتے۔

یعنی اس واقعہ کو یاد کرو جب آپ کے رب نے موسیٰؑ کو پکارا تھا موسیٰ نے درخت کو اور (درخت سے اٹھتی ہوئی) آگ کو دیکھا اس وقت اللہ نے ان کو ندا دی تھی۔

اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسکین ہے کہ آپ کافروں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنی جان کا نقصان نہ کریں اور اس وقت کو یاد کریں جب اللہ نے موسیٰ کو ندا دی تھی اور قوم فرعون کے پاس جا کر ہدایت کرنے کا حکم دیا تھا۔

الظالمین ظلم کرنے والے یعنی کفر کرنے والے یعنی اسرائیل کو غلام بنانے والے، اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دینے والے، یہاں تک کہ ان کے نوزائیدہ بچوں کو قتل کر دینے والے، قوم فرعون فرعون تو ان کا فرماں روا تھا۔ سب کام اسی کے حکم سے ہوتے تھے اس لئے فرعون کا ذکر نہیں کیا صرف قوم فرعون کا ذکر کیا۔ الا یتقون استفہام انکاری توبیخی ہے جس سے مراد ہے امر یعنی اللہ کی اطاعت و عبادت کر کے ان کو اللہ کے عذاب سے اپنی جانوں کو محفوظ کرنا چاہئے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اصل کلام الا یاقوم اتقون ہو۔ قوم کو حذف کر دیا (منادی کبھی محذوف کر دیا جاتا ہے) جیسے الا یسجدوا کی اصل الا یا قوم اسجدوا تھی (پھر یا کو اتقون سے ملا دیا اور امر کی ہمزہ کو حذف کر دیا) مطلب یہ ہوگا کہ قوم فرعون کے پاس جاؤ اور کہو اے میری قوم اللہ سے ڈرو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ موسیٰ نے کہا اے میرے رب مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تکذیب کریں گے۔

وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ اور میرا سینہ تنگ ہو جائے گا (یعنی دل بھچے گا) اور میری زبان نہیں چلے گی۔

مطلب یہ ہے کہ میری زبان میں گرہ ہے اس لئے زبان سے چونکہ تکذیب کو دور کرنے والی کوئی دلیل میں روانی سے نہ کہہ سکوں گا اور زبان و دل کی مدد نہ کرے گی۔ اس لئے میرا دل بھچے گا۔ بغوی نے لکھا ہے یضیق صدری کا یہ مطلب ہے کہ ان کی تکذیب سے میرا سینہ تنگ ہوگا۔

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ پس ہارونؑ کے پاس (وحی یا جبرئیل کو وحی دے کر) بھیج دے۔ بیضاوی نے لکھا ہے حضرت موسیٰ کی طرف سے یہ حیلۂ بہانہ اور تعمیل حکم میں ٹال مٹول نہ تھی بلکہ اپنے ساتھ ملانے اور تبلیغ رسالت میں شریک بنانے کی درخواست تین وجوہ کی بناء پر کی۔

(۱) تکذیب کا اندیشہ۔

(۲) تکذیب سے متاثر ہو کر دل کی تنگی۔

(۳) تنگیٔ قلب کی وجہ سے روح کا دل کے اندر گھٹ جانا اور زبان کی بندش بڑھ جانا۔ جب یہ تینوں امور جمع ہو جائیں تو لامحالہ کسی مددگار کی ضرورت پڑنا ظاہر ہے تاکہ وہ دل کو قوی کرے اور زبان کے کنگ ڈانے کے وقت ترجمانی کر سکے۔ پس موسیٰ کی درخواست کا مقصد یہ تھا کہ تعمیل حکم کے لئے ہارون کو میرا مددگار بنا دے (تاکہ امتثال حکم پورے طور پر ہو سکے)

وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ اور ان کا مجھ پر ایک جرم بھی عائد ہوتا ہے اس لئے مجھے ڈر ہے وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

علی ذنب اس جگہ مضاف محذوف ہے یعنی اس کی طرف سے مجھ پر ارتکاب جرم کا دعویٰ بھی ہے ایک قبطی میرے ہاتھ سے مارا گیا تھا، حضرت موسیٰ نے قبطی کے قتل کو فرعونیوں کے خیال کے بموجب جزا قرار دیا ورنہ واقع میں قبطی کو قتل کرنا جائز تھا۔ وہ کافر تھا معصوم الدم نہ تھا۔ یہ ایک طویل قصہ کا مختصر حصہ ہے دوسری جگہ اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

فاخاف ان یقتلون یعنی اداء رسالت سے وہ مجھے قتل کر دیں گے اس کا مجھے اندیشہ ہے، حضرت موسیٰ کا اظہار خوف قتل بھی عدم تعمیل حکم کا بہانہ نہ تھا بلکہ ایک طرح کی دعا تھی کہ اللہ اس مصیبت کو دفع کر دے جس کے واقع ہو جانے کا قوی

اندیشہ ہے کہ پیام پہنچانے سے پہلے ہی وہ قتل کر دیں اور تبلیغ رسالت نہ ہو سکے۔

قَالَ كَلَّا ۚ اللہ نے فرمایا ہرگز نہیں (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا وہ تم کو قتل نہیں کر سکتے۔

فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ سو اب تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ ہم (اپنی نصرت و امداد کے ساتھ) تمہارے ساتھ ہیں (اور تمہارے کلام کو) سنتے ہیں۔

حضرت ہارون موجود نہ تھے بطور تغلیب حاضر علی الغائب تشنیہ مخاطب کا صیغہ استعمال کیا گیا اور دونوں کو جانے کا حکم دیا۔
حضرت موسیٰ کی دونوں درخواستیں قبول کر لی گئیں۔

کلا کے لفظ سے تو قتل سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا گیا اور فاذھبا (بصیغہ تشنیہ) سے حضرت ہارون کو بطور مددگار شریک بنا دیا گیا۔ گویا یوں فرمایا، موسیٰ تم کو اپنے قتل ہو جانے کا وہم نہ کرو اور جس کو اپنے ساتھ ملانے کی تم نے درخواست کی ہے اس کو ساتھ لے کر جاؤ۔ انا معکم ہم تم سب کے ساتھ ہیں۔ یعنی تمہارے اور ہارون کے اور جو تمہارے ساتھ جائے اس کے ساتھ ہماری مدد ہے یا تم دونوں کے اور تمہارے دشمنوں کے ساتھ ہمارا علم ہے (کوئی بھی ہمارے علم سے باہر نہیں ہے مستمعون تم سب کی گفتگو کو ہم سننے والے ہیں ہم تم دونوں کو ان پر غالب کریں گے۔

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ سو تم دونوں فرعون کے پاس جا کر اس سے کہو کہ ہم رب العالمین کے قاصد ہیں۔

رسول کا لفظ مفرد ہے اس جگہ بمعنی رسالت ہے۔ لفظ رسول بمعنیٔ مرسل (بھیجا ہوا) بھی ہے اور بمعنی رسالت (پیامبری) بھی۔ بیضاوی نے لکھا ہے اسی وجہ سے لفظ رسول کو کبھی بصورت تشنیہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی بصیغہ مفرد۔ یعنی اگر رسول بمعنیٔ مرسل ہو تشنیہ لایا جائیگا اور اگر بمعنیٔ رسالت ہو تو مفرد مستعمل ہوگا۔ اگر بمعنی ٔ رسالت ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ ہم رب العالمین کی طرف سے رسالت والے پیام رساں ہیں (یعنی رسول سے پہلے لفظ ذو محذوف ہوگا) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وزن فعول کا استعمال واحد جمع دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ انا رسل رب العالمین نہیں فرمایا چونکہ وزن فعول و فعیل میں مذکر، مؤنث اور واحد، جمع سب برابر ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا رسول کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے اور زیادہ پر بھی، عرب بولتے ہیں ھذا رسولی ووکیلی ھذا ان (یہ دونوں) رسولی ووکیلی اللہ نے فعول کو جمع کے لئے بھی استعمال کیا ہے فرمایا وھم لکم عدو بعض نے کہا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون اخوت (بھائی ہونے) میں متحد تھے اس لئے لفظ رسول بصیغہ مفرد استعمال کیا۔

بعض نے کہا پیام ایک تھا اس لئے دو پیامبروں کو ایک ہی قرار دیا یا انا رسول کا مطلب ہے ان کل واحد منا ہم میں سے ہر ایک اللہ کا رسول ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ (ہم کو یہ پیام دیکر بھیجا گیا ہے۔) ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو چھوڑ دے تاکہ وہ شام کو چلے جائیں تو ان کو غلام بنائے نہ رکھ۔

بغوی نے لکھا ہے فرعون نے بنی اسرائیل کو چار سو برس غلام بنائے رکھا، اس زمانہ میں بنی اسرائیل کی تعداد چھ سو اسی ہزار تھی (یعنی چھ لاکھ اسی ہزار) غرض موسیٰ مصر کی طرف چلے ہارون وہاں موجود ہی تھے موسیٰ نے ہارون کو حکم الٰہی سے مطلع کیا۔ قصہ کی تفصیل میں آیا ہے کہ موسیٰ جب مصر کو لوٹ کر آئے تو اس وقت اونی چوغہ پہنے ہاتھ میں لاٹھی لئے لاٹھ کے سرے میں توبڑا لٹکا ہوا (جس کے اندر کھانے پینے کا سامان تھا) اس ہیئت سے مصر میں داخل ہوئے۔ مصر میں آکر اپنے گھر میں داخل ہوئے اور ہارون کو اطلاع دی کہ اللہ نے مجھے فرعون اور تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تمہارے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ ہم دونوں جا کر فرعون کو دعوت دیں۔ یہ سن کر موسیٰ و ہارون کی ماں آگئی اور چیخ پڑی کہنے لگی فرعون تو تجھے قتل کرنے کے لئے تیری تلاش میں ہے اگر تم لوگ اس کے پاس جاؤ گے تو وہ تم کو مروا ڈالے گا۔ حضرت موسیٰ نے اس کی ایک نہ مانی اور رات کو دونوں فرعون کے

دروازہ پر جا پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ دربان ہکے بکے ہو گئے اور گھبرا کر انہوں نے پوچھا، دروازے پر کون ہے۔
ایک روایت میں آیا ہے کہ دربانوں نے اوپر سے جھانک سے دیکھا اور پوچھا تم دونوں کون ہو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا میں رب العالمین کا قاصد ہوں فوراً دربان نے فرعون سے جا کر کہا، ایک پاگل دروازے پر کھڑا کہہ رہا ہے میں رب العالمین کا قاصد ہوں۔ فرعون نے صبح تک یونہی چھوڑے رکھا۔ صبح ہوئی تو دونوں کو طلب کیا گیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ دونوں فرعون کی طرف گئے لیکن سال بھر تک فرعون نے اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دی پھر دربان نے جا کر فرعون سے کہا یہاں ایک آدمی ہے جو کہہ رہا ہے کہ میں رب العالمین کا قاصد ہوں، فرعون نے کہا اندر آنے دو۔ ہم اس سے کچھ دل لگی ہی کریں گے۔ دونوں فرعون کے پاس پہنچے اور اللہ کا پیام پہنچایا۔ فرعون حضرت موسیٰؑ کو پہچان گیا کیونکہ آپ نے اسی کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا کہنے لگا کیا ہم نے اسوقت اپنے گھروں میں نہیں پالا تھا۔ جبکہ تو (نوزائیدہ) بچہ تھا۔
ولید سے مراد ہے بچہ، قرب ولادت کی وجہ سے ولید کہا (ورنہ حضرت موسیٰ فرعون کے گھر کے اندر پیدا نہیں ہوئے تھے)

وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ ﴿۱۸﴾ اور تو ہمارے اندر برسوں رہا۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے پاس تیس سال کی عمر تک رہے پھر مدین کو چلے گئے وہاں دس سال رہے پھر مصر کو لوٹے اور فرعونیوں کو تیس سال تک اللہ کی طرف بلاتے رہے پھر فرعون کے ڈوبنے کے بعد پچاس برس زندہ رہے۔ (آپ کی کل عمر ۱۲۰ برس ہوئی)۔

وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِىۡ فَعَلۡتَ وَاَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾ اور تو نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی اور تو بڑا ناشکرا ہے۔
یعنی تو نے قبطی کو قتل کر دیا اور میرے احسان کی ایسی ناشکری کی کہ میرے خاص لوگوں کو قتل کرنے لگا۔ کذا روی العوفی عن ابن عباس و ہو قول اکثر المفسرین۔ (یعنی کفر سے مراد ہے کفران نعمت اور احسان فراموشی) کیونکہ فرعون کفر باللہ سے تو واقف ہی نہ تھا۔ حسن اور سدی نے کہا اَنۡتَ من الکافرین یعنی اپنے جس معبود کی طرف تو ہم کو بلا رہا ہے اس کا منکر تو پہلے تو خود تھا ہمارے ساتھ مذہب پر رہتا تھا یا یہ مراد ہے کہ تو میرا منکر یا احسان فراموش ہے کہ لوٹ کر آیا تو میری مخالفت کرتا آیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ تو کافروں میں سے ہے یعنی ان لوگوں میں سے ہے جن کو فرعون والے اپنے مذہب میں کافر قرار دیتے تھے۔

قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۲۰﴾ حضرت موسیٰؑ نے کہا میں نے وہ حرکت اس وقت کی تھی جبکہ میں گم کردہ راہ تھا یعنی ناواقفوں میں سے تھا اس وقت اللہ کے پاس سے میرے پاس کوئی ہدایت نہیں آئی تھی۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں اس وقت نہیں جانتا تھا کہ میرے اس فعل سے وہ مر جائے گا۔ مارنے سے میرا مقصد قتل کرنا نہ تھا یا یہ مطلب ہے کہ بغیر قصد و ارادہ کے میں اس وقت صحیح راستہ سے بھٹک گیا تھا یعنی نازیبا حرکت تو مجھ سے ضرور صادر ہوئی لیکن بلا ارادہ۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو جاہلانہ کام کر بیٹھتے ہیں۔
بعض نے کہا ضلالت سے مراد ہے بھول جانا یعنی بھولے سے مجھ سے یہ حرکت ہو گئی۔ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰهُمَا الۡاُخۡرٰى میں ان تضل کا ترجمہ ان تنسی کیا گیا ہے کہ ایک عورت بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلائے۔

فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ لَمَّا خِفۡتُكُمۡ تو جب مجھے تم سے ڈر لگا تو میں تم سے بھاگ گیا یعنی مدین کو بھاگ گیا۔

فَوَهَبَ لِىۡ رَبِّىۡ حُكۡمًا وَّجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۲۱﴾ پھر میرے رب نے مجھے حکم (یعنی حکمت و علم) عطا فرمایا اور مجھے پیغمبروں سے بنا دیا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿۲۲﴾ اور یہ کوئی نعمت ہے

جس کا تو مجھ پر احسان رکھ رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔

تلک سے اشارہ تربیت کی طرف ہے یا بری خصلت کی طرف اشارہ ہے۔

عبدت سے تو نے غلام بنا رکھا اعبدت استعبدت اور تعبدت (یعنی تفصیل افعال استفعال اور تفعل سب ہم معنی ہیں) مفسرین نے اس آیت کا مطلب مختلف طور پر لکھا ہے۔

(۱) حضرت موسیٰ کی طرف سے یہ اقرار احسان ہے کہ تو نے مجھے زندہ چھوڑ دیا اور پالا اور دوسرے اسرائیلی بچوں کی طرح قتل نہیں کرایا۔ گویا حضرت موسیٰ نے فرمایا بے شک یہ تیرا احسان ہے جو تو مجھے جتلا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کو تو نے غلام بنائے رکھا اور مجھے چھوڑ دیا۔ غلام نہیں بنایا۔

(۲) بظاہر یہ اقرار نعمت ہے اور حقیقت میں انکار ہے، حضرت موسیٰ نے اول فرعونکی تردید توبیخ کی اور پھر اس نعمت تربیت کی طرف کلام کا رخ کیا جس کا فرعون نے ذکر کیا تھا لیکن اس کا صراحۃً انکار نہیں کیا۔ کیونکہ فرعون نے واقع میں پالا ہی تھا بلکہ اس بات پر تنبیہ کی کہ یہ نعمت حقیقت میں احسان نہ تھی لیکن ظلم کے مقابلے میں یا ظلم کے نتیجہ میں یہ نعمت تھی مجھ پر تیرا احسان نتیجہ تھا اس بات کا کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا ان کے لڑکوں کو تو قتل کراتا تھا اسی وجہ سے میں تیرے ہاتھ لگا اور تیرے پاس مجھے پہنچایا گیا اور تو نے میری پرورش و کفالت کی۔ اگر تو بنی اسرائیل کو حد سے زیادہ ذلیل نہ کرتا اور ان کے لڑکوں کو قتل نہ کراتا تو میرے گھر والے میری پرورش کرتے اور دریا میں مجھے نہ پھینکتے اور میں تیرے مکان میں نہ لایا جاتا۔

(۳) یہ استفہام انکاری ہے ہمزہ استفہام محذوف ہے یعنی یہ احسان جس کا تو نے ذکر کیا ہے کیا کوئی احسان ہے جبکہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کی صورت میں یہ تربیت کوئی احسان نہیں۔ میری قوم کو تو نے غلام بنائے رکھا اور میری تربیت کی یہ کوئی احسان ہوا۔

جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے طنز کو سن لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ موسیٰ اپنی دعوت پر اڑے ہوئے ہیں تو دعوت پر اعتراض کرنے لگا اور سب سے پہلے بھیجنے والے رب کی حقیقت دریافت کی۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿۲۳﴾ (بطور تحقیق) کہنے لگا رب العلمین کیا چیز ہوتی ہے بعض فرعون نے رب العلمین کی حقیقت دریافت کی اور ظاہر ہے کہ اللہ کی ذات مرکب نہیں ہے کہ اس کے اجزاء ذاتیہ حضرت موسیٰ بتا دیتے اور فرد کے صرف خصوصیات ہی بتائے جا سکتے ہیں (یعنی صرف تعریف بالخاصہ ہی ہو سکتی ہے) اس لئے حضرت موسیٰ نے جواب میں اللہ کے خصوصی افعال اور آثار کا ذکر کیا اور۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ موسیٰ نے کہا وہ

آسمانوں کا اور زمین اور ان کی درمیان کائنات کا رب ہے اگر (ان آثار قدرت و حکمت کے ذریعہ سے) تم اس کو ماننے والے ہو (تو ایمان لے آؤ اور مان لو) یعنی اگر حقائق اشیاء کے وجود کو مانتے ہو تو پھر ان مصنوعات و مخلوقات سے ان کے خالق کے وجود وحدانیت پر استدلال کرو۔ یہ تمام اجسام محسوسہ ممکن ہیں کیونکہ مرکب ہیں۔ ان میں تعدد ہے انکے احوال تغیر پذیر ہیں ان کا ایک مبداء اور مؤثر ہونا لازم ہے جو واجب بالذات ہو۔ ممکن ممکن کی علت تامہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر ممکن اپنے وجود میں اپنی علت کا محتاج ہے پس یا تو علت کی جانب تسلسل غیر متناہی ہو گا جو محال ہے یا واجب بالذات علت پر یہ تسلسل ختم ہو جائے گا یہی صحیح ہے (اس سے معلوم ہوا کہ مبداء اول کا واجب بالذات اور ضروری الوجود ہونا لازم ہے۔ مترجم) اور یہی مبداء تمام محسوس اور غیر محسوس ممکنات کا مبداء ہو گا ورنہ یا واجب کا تعدد لازم آئے گا یا بعض ممکنات کا علت سے استغنا اور محتاج ہونا لازم آئے گا۔

واجبوں کا تعدد تو ناممکن ہے ورنہ متعدد واجبوں کے اندر کچھ اجزاء مشترکہ ہوں گے اور کچھ ممیزہ اس طرح ہر واجب کی

حقیقت مشترکہ اور ممیزہ اجزاء سے مرکب ہو جائے گی اور مرکب ہونا حدوث کی دلیل ہے اس صورت میں واجب واجب نہ رہے گا حادث ہو جائے گا۔ رہی استغناء کی شق تو استغنا امکان کی ضد ہے ممکن ہو اور علت سے مستغنی ہو ایسا ہو نہیں سکتا۔
اب ظاہر ہے کہ واجب تعالیٰ کو اس کے بیرونی خصوصی احوال سے پہچاننا ممکن ہو سکتا ہے۔ ذات کے اجزاء سے نہیں۔ نہ ذات کی تعریف خود ذات سے کی جاسکتی ہے نہ ذاتیات اور اجزاء سے (جب اجزاء ہی نہیں ہیں تو اجزاء کے ذریعہ سے ذات کی تعریف کیسے ہو سکتی ہے خلاصہ یہ کہ اللہ کے وجود وحدانیت کو اگر پہچانا جاسکتا ہے تو ان ہی موجودات و کائنات کے ذریعہ سے جو اللہ کی وحدت ذاتہ کے خصوصی نشانات و آثار ہیں۔ مترجم)
چونکہ فرعون احمق (یادانستہ نادان بننے والا) تھا حضرت موسیٰ کے جواب کی خوبی کو نہیں سمجھا اور
قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے فرعون (بطور تعجب) کہنے لگا کیا تم سن رہے ہو۔ یعنی موسیٰ کا جواب تم نے سنا میں نے اس سے اس کے رب العالمین کی حقیقت پوچھی اور اس کے افعال و آثار کا ذکر کرنے لگا یا یہ مطلب ہے کہ آسمان تو قدیم بالذات ہیں اور یہ کہہ رہا ہے کہ ان کا رب خالق ہے شاید فرعون دہریہ کا خیال تھا (جو عالم کو قدیم اور خود کو فنا جانتے ہیں مترجم)
یا یہ مطلب ہے کہ آسمان کسی مؤثر فاعل کے محتاج نہیں ہیں اور یہ ان کو رب مانتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ آسمان وزمین کی تخلیق وحدوث تو ان لوگوں کے سامنے نہیں اس لئے یہ آسمانوں کو قدیم خیال کرنے لگے ایسی دلیل پیش کرنا چاہئے اور ایسی مخلوق کا رب ہونا ظاہر کرنا چاہئے جس کے قدیم ہونے کا ان کو تو ہم بھی نہ ہو اور جس کی احتیاج کسی مصور حکیم کی جانب بالکل نمایاں ہو اس لئے موسیٰ نے کہا۔
قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ کہا وہ تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے سابق باپ دادا کا بھی۔
قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ فرعون کہنے لگا تمہارا یہ رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے بلاشک وشبہ پاگل ہے کہ میں اس سے اس کے رب کی حقیقت پوچھتا ہوں اور یہ دوسرے جواب دیتا ہے فرعون نے حضرت موسیٰ کو رسول بطور مذاق کہا تھا۔
قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ موسیٰ نے کہا وہی مشرق و مغرب کا اور ان دونوں کے درمیانی کائنات کا رب ہے۔ یعنی روزانہ دیکھتے ہو کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور گزشتہ دن کے محور کے علاوہ دوسرے محور پر چلاتا ہے یہاں تک کہ مغرب تک ایسے طریقہ سے پہنچا دیتا ہے جو انتظام کائنات کے لئے انتہائی مفید ہے۔
اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ اگر تم عقل رکھتے ہو تو سمجھ گئے ہو گے کہ جو جواب میں نے دیا ہے اس سے اعلیٰ جواب (اعلیٰ کے بارے میں) ممکن نہیں ہے۔
حضرت موسیٰ نے پہلے گفتگو میں نرمی کی تھی لیکن جب ان لوگوں کی طرف سے شدت محسوس کی تو ان ہی کے قول کی طرح اپنے کلام میں بھی درشتی اختیار کر لی۔
مغلوب جاہلوں کی عادت ہے کہ جب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں فرعون نے بھی ایسا ہی کیا جب لاجواب ہو گیا تو۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾
بولا اگر میرے سوا تو نے کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔
المسجونین میں الف لام عہدی ہے یعنی ان قیدیوں میں شامل کر دوں گا جن کی حالت میرے قید خانے میں تجھے معلوم ہے، کلبی نے کہا فرعون کی قید کی حالت قتل سے بھی زیادہ سخت تھی، قیدی کو تنہا اندھیری کوٹھری میں پھینک دیتا تھا قیدی کو وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا اور لڑھکتا ہوا زمین کے اندر چلا جاتا تھا۔ فرعون کو سخت عذاب دینے کی قدرت حاصل تھی اس سے اس نے اپنے رب ہونے پر استدلال کیا اور صانع عالم کا انکار کرنے لگا اس نے بطور تعجب الا تستمعون کہا تھا کہ میرے سوا کسی

دوسرے الہ کا ہونا عجیب بات ہے۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾ موسیٰ نے (فرعون کی دھمکی کے جواب میں) کہا (تو مجھے ایسی حالت میں بھی قید کر سکے گا) جبکہ میں نے تیرے سامنے (اپنی سچائی اور تیری غلطی کی) کوئی واضح چیز (یعنی نشانی) لے آؤں۔ اس جملہ میں استفہام انکاریہ تنبیہ ہے اور واؤ حالیہ ہے۔

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ فرعون بولا (وہ واضح چیز کیا ہے) اس کو پیش کر اگر تو (اپنی رسالت کے دعویٰ میں) سچا ہے۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿۳۲﴾ پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی تو وہ یکدم کھلم کھلا اژدہا بن گئی یا ایسا اژدہا بن گئی جو موسیٰ کے دعویٰ کی سچائی کو ظاہر کرنے والا تھا۔ فرعون نے مزید معجزہ طلب کیا تو۔

وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۳۳﴾ موسیٰ نے (اپنے گریبان کے اندر سے) اپنا ہاتھ نکالا تو یکدم وہ دیکھنے والوں (کی نظروں) کے لئے گورا (شعاع پاش نظروں کو خیرہ کر دینے والا) ہو گیا۔ جس کی کرنیں افق پر چھا گئیں فرعون ہکا بکا ہو گیا اور لاچار ہو کر۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۴﴾ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اپنے گرد جمع شدہ سرداروں سے کہنے لگا یہ بڑا جاننے والا جادوگر ہے تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے نکال دینا چاہتا ہے اب تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو۔

کہاں تو ربوبیت کے دعویٰ کی وہ زور ازوری تھی اور اب جب موسیٰ کے معجزہ سامنے اپنی کمزوری محسوس کی تو نیچے اتر آیا اور لگا ساتھیوں سے مشورہ کرنے گویا ان کو اپنا حاکم مان لیا۔ اس کو خوف تھا کہ موسیٰ غالب آجائے گا اور اس کے ملک پر تسلط جما لے گا۔ اس لئے مصاحبین کو موسیٰ کی طرف سے نفرت دلانے کے لئے مذکورہ بالا الفاظ کہے۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۳۶﴾ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ﴿۳۷﴾ مصاحبین نے کہا (اس وقت تو) موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو ٹال دیجیے اور شہروں میں (جادوگروں کو) جمع کرنے والوں کو بھیج دیجئے۔ تاکہ وہ تمام بڑے بڑے جاننے والے جادوگروں کو لے آئیں۔

ارجہ ان دونوں کے معاملے کو مؤخر کر دیجئے (اس وقت ملتوی کر دیجئے ان کو ٹال دیجئے)۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ چنانچہ ایک مقررہ تاریخ کو معین وقت پر جادوگر اکٹھے کر دیئے گئے۔ اس جگہ کچھ جملے حذف کر دیئے گئے ہیں اور کلام کو مختصر کر دیا گیا ہے پورا کلام یوں تھا کہ فرعون نے کچھ لوگوں کو جادوگروں کو جمع کرنے کے لئے شہروں میں بھیجا وہ گئے اور معین تاریخ پر جادوگروں کو جمع کر لائے وقت دن چڑھے کا تھا اور دن تہوار کا۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اتفاق سے وہ دن نوروز کا تھا اور شنبہ کا دن تھا۔

وَّقِیْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ اور لوگوں سے کہہ دیا گیا کیا تم بھی جمع ہو جاؤ گے۔ یہ استفہام بمعنی امر ہے۔ فرعون نے لوگوں کو جمع ہو جانے کی ترغیب دی اور حکم دیا کہ تم سب بھی اکٹھے ہو جانا شاید فرعون کو یہ خیال ہو گیا کہ لوگ جمع ہونے میں سستی کریں گے۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۰﴾ تاکہ جادوگر اگر غالب ہو جائیں تو ہم ان کی راہ پر رہیں۔

جادوگروں سے مراد ہیں وہ جادوگر جن کو فرعون نے موسیٰ کے مقابلے کے لئے بلوایا تھا۔

لعل امید ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور امید کا لفظ اسی کی تائید کر رہا ہے کہ جادوگروں سے مراد ہیں فرعون کے جمع کئے ہوئے جادوگر۔ (حضرت مؤلف نے کہا) جادوگروں سے مراد ہیں موسیٰ ہارون اور ان کی قوم والے اتباع سے مراد ہے اتباع

دینی۔ اس وقت امید کا (حقیقی اصلی معنی مراد نہ ہوگا بلکہ) مطلب یہ ہوگا کہ اگر موسیٰ اور ہارون غالب ہو گئے تو شاید ہم ان کے دین پر چلنے لگیں، یعنی ہم ان کے دین پر نہیں چلیں گے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

اس کے بعد جب جادوگر (فرعون کے پاس) آگئے تو انہوں نے فرعون سے کہا اگر ہم غالب آگئے تو کیا ہم کو کچھ اس کا بدلہ بھی یقینی طور پر ملے گا۔ یہ استفہام تقریری ہے (یعنی ضرور ملنا چاہئے)

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ فرعون نے کہا ہاں تم اس وقت (جبکہ غالب آجاؤ گے شاہی) مقرب ہو جاؤ گے۔

جادوگروں نے بصورت غلبہ معاوضہ کی طلب ظاہر کی تھی فرعون نے ان کی طلب سے زیادہ اپنا مقرب بنانے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد جادوگروں نے حضرت موسیٰ سے کہا آپ جو کچھ پھینکنا چاہتے ہیں پہلے پھینکئے یا ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم پہلے (اپنا جادو) پھینکیں سورۂ اعراف میں یہ ٹکڑا گزر چکا ہے کہ جادوگروں نے موسیٰ سے کہا، اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ موسیٰ نے ان سے کہا (پہلے) تم ہی پھینکو جو کچھ پھینکنے والے ہو۔

اس آیت سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جادو کرنا تو حرام ہے حضرت موسیٰ نے ان کو جادو کرنے کا کیوں حکم دیا۔ کیونکہ اس جگہ حکم دینا مراد ہی نہیں ہے بلکہ صرف اجازت مقصود ہے اور اجازت بھی پہلے کر چکنے کی۔ تاکہ موسیٰ کو اپنا معجزہ ظاہر کرنے کا موقع مل جائے یا یوں کہا جائے کہ امر اس جگہ بمعنی تحقیر ہے۔ حضرت موسیٰ نے معجزے کے مقابلے میں ان کے جادو کو حقیر قرار دیا اور اس تحقیر کو ظاہر کرنے کے لئے فرمالیا۔ جو کرنے والے ہو کرو۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

پس جادوگروں نے اپنی رسّیاں اور گنڈے (زمین پر) پھینکے اور (بطور تبرک فرعون کا نام لیا اور) کہا فرعون کی عزت کے وسیلہ سے ہم ہی بلاشبہ غالب رہیں گے۔

چونکہ فرعون پر جادوگروں کو اعتقاد تھا اس لئے عزت فرعون کا ذکر انہوں نے بطور تبرک لیا۔ یا (ب) قسمیہ ہے یعنی عزت فرعون کی قسم ہم غالب رہیں گے۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ پھر موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) پھینکی تو وہ یکدم جادوگروں کو شعبدہ گری سے بنائی ہوئی چیزوں کو نگلنے لگی۔

ما یافکون میں ما موصولہ ہے یعنی جادوگروں نے اپنی شعبدہ بازی سے جو کچھ بنایا تھا۔ ان کی رسّیاں اور ڈنڈے سانپوں کی طرح رینگتے دوڑتے لوگوں کے خیال میں نظر آنے لگے تھے اور لوگوں کی انہوں نے نظر بندی کر دی تھی۔ مترجم) ان سب کو موسیٰ کی لاٹھی کا سانپ نگلنے لگا۔ یا ما مصدریہ ہے یعنی ان کے جھوٹے شعبدے کو لاٹھی نگلنے لگی۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اس کے بعد (بے اختیار) جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے کہنے لگے ہم رب العلمین پر ایمان لے آئے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کا رب ہے۔

یعنی جب جادوگروں نے پیش نظر منظر دیکھ لیا اور سمجھ گئے کہ جادو سے ایسا ہونا ممکن نہیں تو اپنے پر قابو نہ رکھ سکے اور بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑے، اللہ نے ان کو توبہ کی توفیق عنایت کر دی اور (ایک غیبی ہاتھ نے) ان کو سجدے میں گرا دیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ جادو نام ہے صرف شعبدہ گری طمع کاری اور خیال کو متاثر کرنے کا اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے (کچھ علماء نے

کہا جادو حق ہے یعنی واقعی ایک حقیقت مؤثرہ ہے)
حضرت مفسرؒ نے اس قول کی تردید کے لئے فرمایا کہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جادو کی کوئی واقعی حقیقت نہیں اگر اس کی کچھ حقیقت ہے تو صرف اتنی کہ یہ ایک طرح شعبدہ گری، فریب کو بصورت واقعیت دکھا دینا اور لوگوں کے خیال پر اثر انداز ہونا ہے، دوسری آیت میں یُخَیَّلُ اِلَیْهِمْ کا لفظ آیا ہے یعنی لوگوں کے خیال میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سانپ دوڑ رہے ہیں۔
مترجم) رب العالمین کے بعد رب موسیٰ وہارون کہنے سے وضاحت کرنا اور وہم کو دفع کرنا مقصود ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ہمارے ایمان کا سبب وہ معجزہ ہے جو موسیٰ کے ہاتھ سے ظاہر ہوا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ

فرعون نے کہا میری اجازت کے بغیر ہی تم نے اس کی بات (یعنی معجزہ) کا یقین کر لیا (حقیقت میں یہ تمہاری سب کی سازش ہے) موسیٰ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔
یعنی فرعون کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ جادوگروں کے ایمان لانے سے بہک جائیں گے اور خیال کرنے لگیں گے کہ جادوگروں کے سامنے حق کا ظہور ہو گیا اس لئے وہ ایمان لے آئے پس قوم کو دھوکہ دینے اور حقیقت کو مشتبہ بنانے کے لئے اس نے کہا کہ میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ (کی اس کرشمہ سازی) کا یقین کر لیا۔
اٰمَنْتُمْ میں ہمزہ استفہام انکاری محذوف ہے۔
عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ یعنی اسی نے تم کو جادو سکھایا ہے، کچھ سکھایا ہے کچھ نہیں سکھایا اسی لئے تم پر غالب آگیا یا یہ مطلب ہے کہ تم نے باہم سازش کر لی اور ایک دوسرے سے اندرونی طور پر مل گئے۔

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ اب کچھ دیر میں ہی تم کو معلوم ہو جائے گا یہ سزا دینے کی مبہم دھمکی ہے جس کی توضیح اگلی آیت میں ہے۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۹﴾ میں ضرور تم سب کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا اور سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

قَالُوْا لَا ضَیْرَ ز جادوگروں نے کہا (اس میں ہمارا) کوئی ضرر نہیں۔ جادوگروں نے ایسا اس لئے کہا اس قتل اور سخت عذاب سے تو ان کو مرتبۂ شہادت اور اجر جزیل حاصل ہونے والا تھا جس کے مقابلہ میں دنیوی دکھ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ ہم تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہی ہیں۔
تیرے ہاتھوں سے یا کسی اور سبب سے ہم تو مرنے والے ہیں اگر تو قتل کر دے گا تو ہمارے لئے سب سے زیادہ مفید ہوگا۔

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۱﴾ؑ ہم کو تو خواہش ہی یہ ہے کہ ہمارا رب ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اس وجہ سے کہ (فرعون کے ساتھیوں میں یا اس میلہ میں) ہم سب سے اول ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔

ع ۱۸

میں کہتا ہوں بظاہر آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم اول مومن ہیں اور اول مومن وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی تقلید دوسرے لوگ بعد کو کریں۔

وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ اور ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو رات کو نکال لے جا کیونکہ (دن میں) تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔
یعنی رات کو نکال لے جانے کی علت یہ ہے کہ (دن کو) فرعون اور اس کی قوم والے تمہارا تعاقب کریں گے تاکہ تم کو مصر سے نکلنے سے روکیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ نے حضرت موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ بنی اسرائیل کے ہر چار گھر والوں کو ایک گھر میں جمع کرو پھر بھیڑ کے بچوں کو ذبح کر کے ان کا خون گھروں کے دروازوں پر لگادو میں فرشتوں کو حکم دوں گا جس گھر پر خون کا نشان ہوگا اس میں داخل نہ ہوں گے پھر میں فرشتوں کو حکم دوں گا وہ قوم فرعون کے بچوں کو مار ڈالیں گے اور ان کو مالی نقصان پہنچائیں پھر تم چپاتیاں پکانا (یعنی چپاتیاں پکا کر ساتھ لے لینا) پھر راتوں رات میرے بندوں کو لے کر سمندر پر پہنچ جانا وہاں تم کو میرا (جدید) حکم ملے گا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے فرعون سے کہا یہ حرکت موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی ہے انہوں نے ہمارے بچے مار ڈالے اور مال بھی لے گئے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ کے پیچھے پندرہ لاکھ سردار جن میں سے ہر ایک کی کمانڈ میں ایک ہزار آدمی تھے روانہ کر دیئے اور خود بھی اپنی عظیم کرسی پر بیٹھ کر نکل کھڑا ہوا میں کہتا ہوں (یہ سب داستان بکواس ہے) فرعون کے لشکر کی اتنی تعداد بعید از عقل بھی ہے اور کوئی قابل اعتبار روایت بھی ایسی نہیں آئی۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ پھر فرعون نے شہروں میں (لشکر کو) جمع کرنے والے بھیج دیئے یعنی کچھ سپاہی بھیج دیئے تا کہ وہ فوج میں لوگوں کو بھرتی کریں میں کہتا ہوں شاید فرعون نے قریب کے شہروں میں کچھ لوگوں کو اس لئے بھیج دیا کہ وہ اسی رات کو صبح تک مصر کی (راجدھانی) میں اکٹھا کر لیں اور فرعون نے یہ بھی کہلوا دیا کہ۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ یہ (بنی اسرائیل) تھوڑے سے ہیں شر ذمۃ آدمیوں کی قلیل تعداد اسی کی تائید اگلے فقرہ۔

قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ سے کر دی۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ وہ روایت جس میں بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار بتائی گئی ہے غلط ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو قلیل التعداد اپنے لشکر کے مقابلے میں قرار دیا بعض روایات میں فرعون کے لشکر کے مقدمہ (اگلے حصہ) کی تعداد سات لاکھ بیان کی گئی ہے اسی پر ساقہ (پچھلا حصہ) اور دونوں بازوؤں (یمین و یسار) اور قلب (وسط) کو قیاس کر لیا جائے لیکن یہ تعداد بھی خلاف عقل و روایت ہے مصر کا ملک ہی کتنا تھا بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کی فوج کی تعداد بھی اتنی نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں شاید شر ذمہ کہہ کر بنی اسرائیل کی تعداد کی قلت، فرعون نے اپنی فوج کے مقابلہ میں ظاہر کی ہو اور قلیلون کہہ کر واقعی ان کی تعداد کی کمی بیان کی ہو۔

وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ اور بلاشک وشبہ وہ ہم کو غصہ دلا رہے ہیں۔ یا یہ ترجمہ کیا جائے بلا شبہ وہ ہم سے بغض وعداوت رکھنے والے ہیں۔

غائظون یعنی غیظ وعداوت والے۔ دشمن ہم سے بغض رکھنے والے۔ یا ہمارے ساتھ ایسی حرکت کرنے والے ہیں جو ہم کو غضب آلود کر دے۔

وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اور ہم سب ایک مسلم جماعت (اور باقاعدہ فوج) ہیں فراء نے کہا حاذر وہ شخص جو تم کو اس وقت ڈرا رہا ہے اور حذر وہ شخص جو خوفناک ہے (یعنی حاذر فعل کے تجدد و حدوث کے لئے آتا ہے اور حذر ثبات کے لئے)

بعض نے حاذرون کا ترجمہ کیا قوت والے یعنی تیار۔ اور حذرون کا معنی ہے محتاط، بیدار کذا قال الزجاج۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾

پھر ہم ان کو نکال کر لے آئے باغوں اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ قیام گاہوں سے۔

یعنی فرعون کے ساتھی جمع ہو گئے اور سب کا اتفاق ہو گیا کہ بنی اسرائیل کا پیچھا کیا جائے چنانچہ سب ہماری مشیت کے مطابق نکل کھڑے ہوئے باغات بھی چھوڑے دریا اور نہروں کو بھی چھوڑا سونے چاندی کے خزانوں کو خیر باد کہا اور

خوبصورت عمدہ مکانات اور امیرانہ ٹھاٹ کی بیٹھکیں سب کچھ چھوڑ کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چڑھ دوڑے۔ اور اس طرح سب اپنے شہروں سے نکل آئے۔

كَذٰلِكَ ط واقعہ یونہی ہوا۔ بات ایسی ہی ہوئی۔

وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ اور بنی اسرائیل کو ہم نے ان چیزوں کا وارث بنادیا۔ کیونکہ جب فرعون اور اس کا سارا لشکر ڈوب گیا تو بنی اسرائیل مصر کو لوٹ گئے اور فرعونیوں کے چھوڑے ہوئے مال متاع اور جائیداد و باغات پر قابض ہوگئے (یہ خیال حضرت مفسر کا ہے اہل تاریخ کا قوی قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت لوٹ کر نہیں آئے بلکہ صحرائے سینا میں گھس پڑے۔ اور اسی بیابان میں پھنس گئے۔ من و سلویٰ کا نزول بھی یہیں ہوا اور حضرت موسیٰ کو توریت بھی ملی اور بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی بھی یہیں کی۔ آخر حضرت موسیٰ اور حضرت موسیٰ نے پہلے حضرت ہارون کی وفات بھی اسی صحرائے میں ہوئی پھر حضرت یوشع کو نبوت بھی یہیں عطا ہوئی اور چالیس برس سے زیادہ اس وادی میں سرگرداں رہنے کے بعد قصور معاف ہوا اور نجات ملی اور حدود فلسطین و شام میں داخل ہوئے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ شام میں حکومت قائم کرنے کے بعد پھر بنی اسرائیل مصر کی طرف لوٹے ہوں لیکن یہ بھی خیال ہے ورنہ حضرت یوسف سے پہلے بنی اسرائیل کی کوئی آبادی یا حکومت مصر میں نہیں ہوئی۔ تاریخ سے اسرائیل کا مصر پر اقتدار ثابت نہیں۔ مترجم)

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ غرض (ایک روز) سورج کے نکلنے کے وقت پیچھے سے ان کو جالیا۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ جب دونوں جماعتیں باہم دکھائی دینے لگیں تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا ہم تک بلاشبہ پہنچ جائیں گے۔ (یعنی ہم کو یہ پکڑ لیں گے اور ہم میں مدافعت کی طاقت ہے نہیں)۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ موسیٰ نے (اللہ کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوئے) کہا ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب موجود ہے (یعنی اس کی مدد موجود ہے) وہی مجھ کو عنقریب (نجات کا) راستہ بتادے گا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی دریا میں (یعنی نیل میں) مارو۔ (موسیٰ نے لاٹھی پانی میں ماری) فوراً دریا پھٹ گیا (اور خشک راستہ نکل آیا)۔

فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ اور (پانی کا) ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح ہوگیا (یعنی اپنی جگہ پر رک گیا، پھر بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں میں سے ہر خاندان اپنے راستہ میں داخل ہو کر پار ہوگیا)

وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ اور ہم دوسروں کو (یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں کو اس جگہ کے) قریب لے آئے۔

وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اور ہم نے موسیٰ کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے سب کو بچالیا پھر ان دوسروں کو (یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں کو) غرق کر دیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ بلاشبہ اس میں (یعنی موسیٰ کو ساتھیوں سمیت بچالینے اور فرعون کو ساتھیوں سمیت غرق کر دینے میں) کھلی ہوئی دلیل ہے (موسیٰ کی سچائی کی) اور ان میں (یعنی فرعون کے ساتھیوں میں) اکثر لوگ مومن نہ تھے۔ روایت میں آیا ہے کہ فرعون کے ساتھیوں میں صرف یہ لوگ ایمان لائے تھے آسیہ فرعون کی بی بی، ایک وہ شخص جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوا تھا یعنی حزقیل اور اس کی بی بی اور مریم بنت ناموسیا۔ یہ مریم وہی عورت تھی جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کی نشاندہی کی تھی۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾ع اور یقیناً آپ کا رب (دشمنوں سے انتقام لینے میں) غالب اور (دوستوں کے لئے) مہربان ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَٰهِيمَ ﴿٦٩﴾ اور ان (اہل مکہ) کو ابراہیم کی خبر (یعنی واقعہ) پڑھ کر سناؤ اس جملہ کا عطف وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ پر ہے کیونکہ اذنادی سے پہلے لفظ اذکر محذوف ہے (اس لئے فعل کا عطف فعل پر ہو گیا)۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٧٠﴾ جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ سے اور قوم والوں سے کہا تم لوگ کس چیز کی پوجا کرتے ہو۔ حضرت ابراہیم نے یہ سوال (طلب علم کے لئے نہیں کیا تھا آپکو تو معلوم ہی تھا کہ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں بلکہ یہ سوال) اس لئے کیا تا کہ ان کو بتا سکیں کہ جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ مستحق عبادت نہیں ان کی پوجا ناروا ہے۔

قَالُوا۟ نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَٰكِفِينَ ﴿٧١﴾ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ہمیشہ ان ہی پر جمے رہتے ہیں (حضرت ابراہیم کا سوال مختصر تھا لیکن) فخر کے طور پر انہوں نے جواب کو طول دے دیا نظل (کا لغوی ترجمہ ہے ہم دن کو ہوتے ہیں لیکن یہ ترجمہ یہاں مناسب نہیں ہے اس لئے اس جگہ اس کا معنی ہے ہم ہمیشہ رہتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے وہ لوگ دن میں بتوں کی پوجا کرتے تھے رات کو نہیں کرتے تھے (اس صورت میں نظل اپنے لغوی معنی پر ہوگا۔ مترجم)

قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٧٢﴾ أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿٧٣﴾ ابراہیم نے کہا کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انکو پکارتے ہو یا تم کو فائدہ پہنچاتے ہیں یا تم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ھل یسمعون یعنی کیا وہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا کیا وہ تمہارے لئے (یعنی تمہاری بات) سنتے ہیں۔

اوینفعو نکم یعنی اگر تم ان کی پوجا کرو تو کیا وہ تم کو نفع دیتے ہیں۔

او یضرون یا اگر ان کی پوجا نہ کرو تو کیا وہ تم کو ضرر پہنچا سکتے ہیں۔

قَالُوا۟ بَلْ وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٧٤﴾ کہنے لگے (ان باتوں میں سے تو وہ کچھ بھی نہیں کرتے ان وجوہ کی وجہ سے ہم ان کو نہیں پوجتے) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے (اس لئے ہم بھی کرتے ہیں)۔

قَالَ أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ ٱلْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾

ابراہیم نے کہا تم نے (غور کیا اور) دیکھا کہ تم خود اور تمہارے اگلے باپ دادا کس چیز کو پوجتے ہیں۔

ہمزہ استفہام تقریری ہے یعنی اقرار کرو کہ تم کتنی بیکار چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ ضرر نہ کچھ سنتے ہیں۔ اقدمون کا لفظ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ پرانا اور اگلے زمانہ میں ہونا صحیح ہونے کی دلیل نہیں تقدم زمانی کی وجہ سے باطل حق نہیں بن جاتا۔

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّىٓ پس بے شک وہ میرے دشمن ہیں۔

اپنا دشمن کہنے سے در پردہ یہ مراد ہے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں تم کو ان کی پوجا کرنے سے ایسا ضرر پہنچے گا جو کسی شخص کو اپنے دشمن سے نہیں پہنچتا۔ مہربان واعظ کی نصیحت کرنے کا یہ مؤثر طریقہ ہی ہے کہ پہلے وہ اپنی ذات کو مخاطب کرتا ہے اور مقصد ہوتا ہے دوسروں کو نصیحت کرنا۔ اسی قسم کا استعمال دوسری آیت میں آیا ہے فرمایا ہے وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ یعنی کیا وجہ کہ تم اپنے خالق کی عبادت نہ کرو۔

جمادات کی طرف دشمن ہونے کی نسبت مجازی ہے یا تو اس وجہ سے کہ وہ ضرر پہنچنے کا ذریعہ ہیں یا اس وجہ سے کہ قیامت کے دن وہ دشمن بن جائیں گے اللہ نے فرمایا ہے سَیَکْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَیَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا۔

عدو بروزن فعول اصل میں مصدر ہے جیسے قبول اسی لئے اس کو بصیغۂ مفرد ذکر کیا یا ہم سے مراد ہے کل معبود لکم تمہارا ہر معبود میرا دشمن ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عدو اور صدیق صفت کے صیغے بروزن فعول و فعیل ہیں ان کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی رجل عدو بھی کہا جاتا ہے اور قوم عدو بھی۔ اللہ نے فرمایا ہے فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ دوسری آیت میں آیا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔

اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾ مگر رب العالمین۔ یہ استثناء منقطع ہے۔ (یعنی اِلّا کا معنی ہے لیکن) گویا یوں فرمایا کہ وہ سب میرے دشمن ہیں مگر رب العالمین کہ وہ میرا دوست ہے۔ بعض اہل علم نے کہا قوم ابراہیم بتوں کے ساتھ اللہ کی بھی عبادت کرتے تھے حضرت ابراہیم نے فرمایا تمہارے سارے معبود سوائے رب العالمین کے میرے دشمن ہیں یا یوں کہا جائے کہ ان کے آباؤ اجداد میں کچھ لوگ اللہ کو مانتے اور اس کی عبادت کرتے تھے (ان دونوں صورتوں میں استثناء متصل ہوگا)

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وہ جس نے مجھے پیدا کیا وہی مجھے ہدایت کرے گا ہر مخلوق کو زندگی کا دنیوی واخروی راستہ وہی بتاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ابتداء ایجاد سے انتہا، موت تک پوری زندگی اللہ تخلیقی تدریجی رہنمائی فرماتا رہتا ہے تاکہ انسان مفید حیات چیزوں کو حاصل کرتا اور ضرر رساں چیزوں سے بچتا رہے۔ رحم کے اندر بچہ ماں کا فضول خون ناف کے ذریعہ سے چوسنا شروع کرتا ہے اور اس سفر کی انتہا داخلۂ جنت ہے یہ ساری رہنمائی اللہ ہی کرتا ہے۔

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾ اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے (کھانے پینے کو دیتا ہے)

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ ہی مجھے شفا عنایت کرتا ہے۔ بیماری اور شفا دونوں کا خالق اللہ ہی ہے لیکن بلحاظ ادب مریض کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی۔ حضرت خضر کے قول کو نقل کیا ہے اور فرمایا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا میں نے ارادہ کیا کہ اس کشتی کو عیب دار کردوں۔ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا آپ کے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی بھرپور طاقت کو پہنچ جائیں (اول آیت میں ارادۂ عیب کی نسبت حضرت خضر نے اپنی طرف کی تقاضاء ادب یہی تھا اور دوسری آیت میں ارادہ کی نسبت اللہ کی طرف کی تقاضاء معرفت یہی تھا مترجم)

حضرت ابراہیم نے بیمار ہونے کو اپنا فعل اس لحاظ سے بھی قرار دیا کہ (گو بیماری اللہ پیدا کرتا ہے مگر) ہر مصیبت جو انسان پر آتی ہے وہ اسی کے کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو بیان کرنا چاہتے تھے (اور بیمار کرنا نعمت نہیں اس لئے بیمار کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی) لیکن آئندہ آیت میں موت دینے کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے گو بظاہر موت بھی سخت تکلیف کا نام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ موت میں کوئی ضرر نہیں ہوتا وہ تو ایک غیر محسوس چیز ہے مرنے سے پہلے جو عوارض واسباب عارض ہوتے ہیں دکھ دینے والے تو وہ ہوتے ہیں ان کے بعد موت کا غیر محسوس درد ہوتا ہے ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ اہل کمال کے لئے موت تو دنیوی مصائب و آلام سے چھوٹنے اور لازوال راحت و نعمت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے مشہور مقولہ ہے کہ موت ایک پل ہے جو حبیب کو حبیب کے پاس پہنچا دیتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اچانک موت مومن کے لئے راحت اور کافر کے لئے مواخذہ ہے۔ رواہ احمد البیہقی عن عائشہؓ مرفوعاً۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ہر مسلم کے لئے موت (گناہوں کا) کفارہ ہے رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ والبیہقی بسند ضعیف عن انسؓ۔

پھر ایک عقلی بات یہ بھی ہے کہ موت عموماً کھانے پینے کی چیزوں میں انتہائی کمی (یا بیشی) کی وجہ سے ہوتی ہے یوں بھی اخلاط (سوداصفراء، بلغم، خون) اور عناصر (آگ مٹی پانی ہوا) کے درمیان انتہائی تضاد اور کیفیات کا اختلاف ہے ان کے باہمی اختلاط کے بعد اعتدال مزاجی اور معتدل کیفیت کا ظہور تو جبراً اللہ کی قدرت سے ہو جاتا ہے۔

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۱﴾ اور وہ جو مجھے موت دے گا پھر (آخرت میں) مجھے زندہ کرے گا۔

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۸۲﴾ اور جس سے مجھے یہ امید ہے کہ میری غلط کاری کو وہ قیامت کے دن معاف کر دے گا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی خطا کا اقرار بطور انکسار نفس کیا (کیونکہ پیغمبر

معصوم ہوتے ہیں ان سے خطاء کا یعنی گناہ کبیرہ کا صدور نہیں ہوتا مترجم) یا اس سے مقصود تھا اپنی امت کو تعلیم دینا کہ گناہوں سے بچتے رہیں اور جو گناہ ان سے صادر ہو جائے اس کی معافی کی درخواست کریں یا یوں کہا جائے کہ حضرت ابراہیم نے رخصت پر عمل کیا (ناجائز کام تو نہیں کیا) لیکن عزیمت کو ترک کر دیا (یعنی بلندی مرتبہ جس کام کا تقاضا کرتی تھی وہ نہیں کیا) اور عزیمت کو ترک کرنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ امت پر بار نہ پڑ جائے جس کا اٹھانا لوگوں کے لئے دشوار ہو اس لئے آپ نے رخصت پر عمل کیا تاکہ امت کو عمل میں سہولت ہو اور اسی ترک عزیمت کے لئے استغفار کیا (چونکہ ترک عزیمت آپ کے علو مرتبہ کے خلاف تھا)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم کی خطا وہی تین الفاظ تھے جو انہوں نے کہے تھے قوم والوں سے کہا تھا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (حالانکہ بیمار نہ تھے) اور کہا تھا بَلْ فَعَلَہٗ کبیرھم یہ حرکت بڑے بت نے کی ہے (حالانکہ یہ بات غلط تھی) اور حضرت

امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ (حضرت ابراہیم کا انکسار نفس کی بناء پر اپنی خطا کا اقرار، یا امت کو تعلیم یا اپنے قصور کا اعتراف اور پھر استغفار تھا) ضعیف ہے کیونکہ تواضع اور انکسار نفس کی بناء پر انہوں نے اپنی خطا کا جو اقرار کیا تو کیا واقعی وہ خطا کار تھے یا غلط طور پر انہوں نے اپنے خاطی ہونے کا اظہار کیا اور خلاف واقعہ بات کہی اول صورت میں وہ معصوم نہ ہوئے حالانکہ انبیاء کو معصوم ہونا چاہئے اور دوسری صورت میں ان کی دروغ گوئی ثابت ہوئی (اور یہ بھی منافی عصمت ہے) تعلیم امت کے لئے آپ سے جھوٹ کا صدور اور غلط اقرار نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں امام رازی کا یہ قول خود کمزور ہے جھوٹ اور معصیت کا لزوم تو اس وقت ہوتا جب کہ وہ اپنے آپ کو معصوم اور ہر گناہ سے پاک سمجھتے ہوئے زبان سے کہتے کہ میں گناہ گار، خطاوار ہوں مگر وہ تو گناہوں سے پاک جانتے ہی نہ تھے (گو پاک تھے) واقعہ یہ ہے کہ صوفی جب مقام فقر و فناء کی تکمیل کر لیتا ہے تو وہ اپنی ہستی اور اپنے سارے کمالات کو حق تعالیٰ کی طرف سے عاریت سمجھتا ہے اور اپنے نفس کو معدوم محض تصور کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میرا نفس تو تمام شرور کا مبدء ہے اللہ نے فرمایا ہے مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ تم کو جو بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس کی طرف سے پہنچتی ہے اس حالت میں اگر صوفی اپنے کو گناہ گار کہتا ہے تو اس کو جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک بار ظہر کی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو سہو ہو گیا (آپ ﷺ نے خیال کیا میں پوری نماز پڑھ چکا اس لئے سلام پھیر دیا) ذوالیدین (ایک صحابی تھے) نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا نماز میں قصر کر دیا گیا یا حضور ﷺ بھول گئے فرمایا اس میں سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ ذوالیدین نے عرض کیا (حضور ﷺ) کچھ تو ہوا پس رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا اس میں سے کوئی بات نہیں ہوئی حضور کی یہ بات ہرگز ہرگز نہ جھوٹ ہو سکتی ہے نا گناہ ہاں نسیان ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی دعا کی تھی رب اغفرلی خطیئتی اے میرے رب میرے قصور کو معاف فرما دے اس دعا کی بنیاد بھی انکسار نفس ہے اور چونکہ یہ امر ہے اور امر انشاء کی قسم ہے اس لئے اس میں کذب کا احتمال بھی نہیں ہے (حضرت مفسر کے تحقیقی جواب سے تو جمہور اہل بلاغت کے خلاف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صدق کا معنی ہے اعتقاد کے موافق ہونا اور کذب کے معنی میں اعتقاد کے مخالف ہونا اور حضرت ابراہیم چونکہ اپنے آپ کو گناہ سے پاک نہیں جانتے تھے اگرچہ واقع میں معصوم تھے اس لئے ان کا قول سچا تھا اعتقاد کے موافق تھا ان کا گناہ کا ان کے سمجھنے کے مطابق تھا صدق و کذب کی یہ تعریف جمہور کے مسلک کے خلاف ہے۔ اس فقیر کی نظر میں اصل اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر اپنی حقیر لغزشوں کو بھی گناہ جانتے ہیں اور لغزشوں سے کوئی نبی معصوم نہیں حضرت ابراہیم کی درخواست مغفرت ہو یا رسول اللہ ﷺ کی طلب معافی دونوں میں یہی بات ملحوظ ہے کہ کون اللہ کا پورا حق ادا کر سکتا ہے اور کون جلیل القدر رسول لغزش سے محفوظ ہو سکتا ہے بات صرف یہ ہے کہ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے حسنات الابرار سیات للمقربین نیکوں کی نیکیاں اہل قربت کے لئے گناہ ہیں مترجم) حضرت مفسر نے یہ بھی فرمایا کہ انہضام نفس اور انکسار نفس سے مراد تواضع نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہے جلال رب کے سامنے نفس کا شکستہ ہو جانا حضرت ابراہیم کا نفس منکسر ہو چکا تھا اس شکستگی نفس کی بناء پر انہوں نے اپنے گناہ کی معافی کی امید کی۔ اگر تواضع مراد ہو تو امام رازی کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ باوجود گناہ گار نہ ہونے کے انہوں نے اپنے گناہ گار ہونے کا جھوٹا اظہار کیا اور دروغ گو ہوئے ہم اس بحث کا کچھ حصہ سورت محمد کی آیت استغفر لذنبک کی تفسیر کے ذیل میں انشاء اللہ لکھیں گے۔ از مفسر رحمہ اللہ

سارہ کے متعلق بادشاہ سے کہا تھا ھذا اختی یہ میری بہن ہے (حالانکہ سارہ آپ کی بہن نہ تھیں بلکہ بی بی تھیں) مجاہد نے اس کو تیسری خطا حضرت ابراہیمؑ کی قرار دیا ہے لیکن جس نے حضرت ابراہیمؑ کے قول ہذا ربی کو خطا قرار دیا ہے اس طرح خطائیں تین سے زیادہ ہو جائیں گی۔ حضرت مفسر نے فرمایا ان الفاظ کو خطا کہنا کمزور بات ہے یہ الفاظ تو توریہ کے تھے (ذو معنی تھے حضرت ابراہیمؑ کی مراد کچھ اور تھی اور مخاطب کچھ اور سمجھ گیا) اور توریہ کو خطا نہیں کہا جاسکتا۔ بغوی نے بوساطت مسروق حضرت عائشہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں میں نے عرض کیا ابن جدعان دور جاہلیت میں کنبہ پروری کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا کیا اس کا اس کو کچھ نفع ملے گا فرمایا اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا اگر اس نے کسی دن بھی رب اغفرلی خطیتی یوما الذین نہیں کہا ہوگا۔

حضرت ابراہیم نے قوم کے سامنے جو کچھ تفصیل سے بیان کیا وہ سب بطور استدلال تھا اور یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ جس معبود میں ایسا کرنے (یعنی پیدا کرنے، کھلانے، پلانے، شفا دینے، اور مارنے جلانے) کی طاقت نہ ہو وہ معبود ہونے کا حق نہیں رکھتا نہ اس کی پوجا جائز ہے)

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ﴿۸۳﴾ اے میرے رب مجھے حکم عطا فرمادے اور مجھے نیکیوں کے ساتھ ملادے۔ حکم سے مراد علم و عمل کا کمال ہے اور صالحین سے مراد ہیں انبیاء معصومین جن کے اندر کسی کدورت علمی و عملی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے علمی و عملی کمال عطا فرمائے تاکہ میں انبیاء کے مسلک میں منسلک ہو سکوں اور اللہ کی صحیح خلافت اور خلق خدا کی قیادت کی اور میرے اندر استعداد پیدا ہو جائے۔

وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ﴿۸۴﴾ اور میرا تذکرۂ خیر آنے والے لوگوں میں کردے۔ یعنی میری اچھی تعریف اور بھلائی کا ذکر قبول عام آئندہ لوگوں کی زبانوں پر کردے (کہ سب مجھے اچھا کہیں کوئی برائی کے ساتھ میرا ذکر نہ کرے) یا یہ مطلب ہے کہ آنے والی امتیں اگر میری ثنا کریں تو وہ سچی ہو (میری غیر واقعی اور غلط تعریف نہ کریں)

وَاجْعَلْنِي مِن وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ﴿۸۵﴾ اور مجھے جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر۔

وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ﴿۸۶﴾ اور میرے باپ کو معاف کردے وہ بلا شبہ (حق کے راستہ سے) بھٹکا ہوا ہے حضرت ابراہیم نے باپ کے لئے یہ دعاء مغفرت اس وقت کی تھی جب کہ آپ کو معلوم نہ تھا کہ یہ اللہ کا قطعی دشمن ہے اس کے مقدر میں ایمان کی ہدایت نہیں ہے لیکن جب آپ کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو پھر اس سے اظہار بیزاری کیا۔ اللہ نے فرمایا وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے دعاء مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی جو اس نے باپ سے کر لیا تھا لیکن جب ابراہیم پر واضح ہو گیا کہ اس کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ جب حضرت ابراہیم نے باپ کے لئے دعاء مغفرت کی تھی اس وقت تک کافروں کے لئے دعا مغفرت کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿۸۷﴾ اور جس روز لوگ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے اس روز مجھے رسوا نہ کرنا یا ذلیل نہ کرنا اول ترجمہ پر لاتخزنی کا مصدر خزایۃ ہوگا اور دوسرے ترجمہ پر خزی۔

شیخین نے صحیحین میں خود حضرت ابن عمر کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا مجھ سے دریافت کیا گیا کہ (قیامت کے دن اللہ جو بعض بندوں سے کچھ چپکے چپکے فرمائے گا جس کی دوسروں کو اطلاع نہ ہوگی اس) سرگوشی کے متعلق آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا ہے۔ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ تم میں سے بعض لوگ اپنے رب کے قریب ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ ان پر اپنا پردہ ڈال دے گا اور فرمائے گا کیا تو نے ایسا ایسا کیا تھا بندہ عرض کرے گا جی ہاں جی ہاں اللہ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرے اس عمل پر پردہ ڈالے رکھا تھا اور آج معاف کرتا ہوں پھر اس کی نیکیوں کی تحریر سیدھے ہاتھ میں دے دی

جائے گی البتہ کافروں اور منافقوں کو سب کے سامنے علی الاعلان پکارا جائے گا۔ هٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر دروغ تراشی کی تھی۔ آگاہ ہو جاؤ کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۹﴾ اس دن جب کہ (نجات کے لئے) نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد ہاں (اس کی نجات ہو گی) جو اللہ کے پاس کفر و شرک سے پاک دل سے کر آئے گا۔

سلیم سے مراد شرک اور شک سے پاک دل ہے گناہوں سے پاک ہونا مراد نہیں ہے کیونکہ کوئی شخص بھی (لغزش یا چھوٹے بڑے ہر قسم کے) گناہ سے پاک نہیں ہے بغوی نے لکھا ہے یہی قول اکثر اہل تفسیر کا ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا سلیم (تندرست، صحت مند) دل مومن کا ہے اور بیمار دل کافر اور منافق کا (اس قول پر آیت میں ہر مومن مراد ہو گا) ابو عثمان نیشاپوری نے کہا سلیم (سالم خالی) دل اس کا ہے جو ہر بدعت سے خالی ہو اور سنت پر قائم ہو یعنی آیت میں اہل السنّت والجماعت مراد ہیں۔

آیت کا تفسیری مطلب یہ ہے کہ اس روز مال اور اولاد کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گی۔ ہاں مومن کو فائدہ پہنچے گی۔ اس صورت میں مستثنیٰ مفرغ ہو گا یا یہ مطلب ہے کہ کسی کا مال و اولاد مفید نہ ہو گی ہاں مومن کا مال اور اولاد کام آئے گا خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ کافر خواہ اپنے قرابت داروں کے لئے کتنا ہی مال صرف کر دے اور کتنے ہی مسکینوں کو کھانا کھلائے کچھ بھی اس کے کام نہ آئے گا۔ نہ اولاد اس کے کام آئے گی خواہ اس کی اولاد صلحاء اور انبیاء ہی ہوں مگر کافر کی کوئی شفاعت نہیں کرے گا نہ اس کے لئے معافی کا طلب گار ہو گا اللہ نے فرما دیا ہے۔ مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰى نہ نبی کے لئے جائز ہے نہ (دوسرے) مسلمانوں کے لئے کہ وہ مشرکوں کے لئے دعاء مغفرت کریں خواہ وہ مشرک ان کے قرابتدار ہی ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ابراہیم اپنے باپ آذر کو اس حالت میں پائیں گے کہ اس کا چہرہ بدرونق غبار آلود ہو گا۔ آپ اس سے فرمائیں گے کہ کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ میرے قول کے خلاف نہ چل۔ باپ کہے گا آج میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا۔ ابراہیم (دعا کریں گے اور) عرض کریں گے اے میرے رب تو نے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کے دن مجھے رسوا نہیں کرے گا۔ میرے باپ کی انتہائی رسوائی سے بڑھ کر اور کون سی (میری) رسوائی ہو گی۔ اللہ فرمائے گا میں نے جنت کافروں کے لئے حرام کر دی ہے پھر حکم ہو گا ابراہیم اپنے دونوں قدموں کے نیچے دیکھو۔ حضرت ابراہیم (اپنے قدموں کی طرف) دیکھیں گے تو بڑے بڑے بالوں کا ایک بجو دکھائی دے گا جو (گندگی میں لتھڑا ہوا ہو گا) پھر اس کی ٹانگیں پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا اور ابراہیم اس روز اس سے بیزاری کا اظہار کریں گے مومن نے جو مال اطاعت خداوندی میں خرچ کیا ہو گا اس سے قیامت کے دن اس کو فائدہ پہنچے گا۔ اسی طرح اس کی اولاد بھی شفاعت و استغفار کر کے اس کو فائدہ پہنچائے گی۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۹۰﴾ اور قریب کر دی جائے گی جنت متقیوں کے۔ یعنی موقف سے وہ جنت کو دیکھ لیں گے اور اپنے حشر سے خوش ہوں گے۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ﴿۹۱﴾ اور ظاہر کر دی جائے گی دوزخ کج راہوں کے لئے۔ وہ اپنے سامنے دوزخ کو کھلا ہوا دیکھیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ ہم کو ہنکا کر اس کے اندر لے جایا جائے گا بیضاوی نے کہا ہے دونوں آیتوں میں الفاظ کا اختلاف ہے (اول آیت میں ازلفت اور دوسری آیت میں برزت ہے) اس میں وعدہ کے پہلو کو ترجیح ہے۔

وَقِیْلَ لَهُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اور ان سے کہا جائے گا کہ اللہ کے سوا تم جن کی پوجا کرتے تھے (اور جن کی شفاعت کے امیدوار تھے آج) وہ کہاں ہیں۔

هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ کیا (آج) وہ تمہاری مدد کریں گے اور اللہ کے عذاب سے تم کو بچالیں گے۔ استفہام

انکاری اور توبیخی ہے (یعنی عذاب سے بچا نہیں سکتے)

اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ یا خود محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اپنے اوپر سے عذاب کو دفع کر سکتے ہیں (یعنی ایسا بھی نہیں کر سکتے) بلکہ وہ کافر اور اللہ کے سوا جن کی وہ پوجا کرتے تھے سب کے سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا پھر اوندھے منہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے کبکبوا کا ترجمہ کیا دوزخ میں ان کو اکٹھا کر دیا جائے گا۔ مجاہد نے ترجمہ کیا اوندھے منہ گرا دیا جائے گا۔ مقاتل نے کہا پھینک دیا جائے گا زجاج نے کہا ایک کو دوسرے پر ڈال دیا جائے گا قتیبی نے کہا سر کے بل ڈال دیئے جائیں گے قاموس میں ہے کبہ اس کو الٹ دیا جیسے اکب اور کبکبہ فاکب اس کو الٹ دیا پھر وہ الٹ گیا اس مثال میں اکب لازم ہے یعنی کب اور کبکب کا ایک معنی ہے بیضاوی نے کہا کبکب میں کاف کی تکرار تکرار معنی کے لئے ہے گویا مطلب یہ ہوگا کہ جس کو آگے میں ڈال دیا جائے گا وہ لڑھکتا ہوا تہ میں پہنچ جائے گا۔

هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ ان (باطل معبودوں) کو بھی اور کجراہوں (کافروں) کو بھی یعنی پجاریوں کو بھی۔

وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ اور ابلیس کے سارے جتھوں کو یعنی جنات اور انسانوں میں سے اس کے تمام متبعین کو بعض کے نزدیک جنود ابلیس سے مراد ہے۔ ابلیس کی ذریت (نسل)

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ دوزخ کے اندر وہ جھگڑتے ہوئے کہیں گے ہم کو ضمیر پجاریوں اور بتوں سب کی طرف لوٹ رہی ہے اللہ بتوں کو بھی اس وقت گویا بنا دے گا اور وہ اپنے پجاریوں سے جھگڑیں گے (اور قالوا کا فاعل صرف پجاری ہیں یعنی جھگڑیں گے تو سب مگر اس قول کے قائل صرف پجاری ہوں گے۔ مترجم)

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ خدا کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے۔ ان ان کا مخفف ہے۔ اور جملہ مقولہ ہے۔

اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ جب کہ (اے باطل معبودو) ہم تم کو (عبادت میں) رب العالمین کے برابر قرار دیتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ضمیر قالوا کی ضمیر کی طرح صرف پجاریوں کی طرف راجع ہو کیونکہ بتوں میں جھگڑنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے (بت بے جان ہیں بولنے کی ان میں اہلیت نہیں ہے) لیکن جب بت بے جان ہوں گے تو ان کو خطاب کرنے کا فائدہ سوائے اپنے افسوس و حسرت کے اظہار اور ندامت کے اور کچھ نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ان کافروں کا جھگڑا ان بتوں سے ہوگا جو مبدء ضلالت تھے اور وہ خود اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے اور اظہار حسرت کریں گے۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا۔ مقاتل نے کہا المجرمون سے مراد ہیں شیاطین۔ کلبی نے کہا گمراہ اسلاف مراد ہیں جن کی تقلید ان کافروں نے کی تھی۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ اب ہمارا کوئی سفارشی نہیں ہے۔ یعنی مومنوں کے سفارشی تو انبیاء ملائکہ اور نیک مومن ہیں۔ ہمارا کوئی سفارشی نہیں۔

وَلَا صَدِيْقٍ اور نہ کوئی سچا دوست ہے۔

شافعین کو جمع اور صدیق کو مفرد ذکر کرنے کی چند وجوہ ہو سکتی ہیں۔ (۱) عام طور پر سفارشی تو بہت ہو جاتے ہیں اور سچا دوست کم ہی ملتا ہے۔ (۲) جتنی کوشش متعدد سفارشی کرتے ہیں ان سب سے زیادہ لگن کے ساتھ ایک دوست کوشش کرتا ہے۔ (۳) صدیق کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وزن فعول و فعیل کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور متعدد پر بھی (۴) صدیق اصل میں حنین اور صہیل کی طرح مصدر ہے (بطور صفت استعمال کر لیا گیا ہے اور مصدر میں واحد کا کوئی امتیاز نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مصادر کی جمع نہیں آتی۔ مترجم)۔

حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ قریب قاموس میں ہے حمیم بروزن امیر بمعنی قریب۔ اس کی جمع احماء ہے کبھی حمیم کا استعمال جمع اور

مؤنث کے لئے بھی ہوتا ہے کافروں کے کلام کا مطلب یہ ہوگا کہ آج نہ ہمارا کوئی سچا دوست ہے نہ قرابتدار جو ہماری سفارش کردے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ اس روز گہرے دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے ہاں متقی (باہم دشمن نہ ہوں گے) بغوی نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت جابر نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ آدمی جنت کے اندر کہے گا میرا فلاں دوست کیا ہوا (کہاں گیا) اس وقت اس جنتی کا دوست جہنم میں ہوگا اللہ حکم دے گا اس کے دوست کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جاؤ اس کے بعد جو لوگ دوزخ میں رہ جائیں گے وہ کہیں گے فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ حسن نے فرمایا اپنے مومن دوستوں کی تعداد زیادہ کرو کیونکہ قیامت کے دن وہ شفاعت کریں گے۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ پس کاش ہم کو ایک بار (دنیا میں) لوٹا مل جاتا تو ہم (بھی) مومنوں (کے گروہ) میں سے ہوجاتے۔

اس آیت میں لو بمعنی لیت (کاش) کے ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ اس (یعنی ابراہیمؑ کے قصہ) میں بلاشبہ عظیم الشان نشانی (کھلی ہوئی دلیل) ہے۔ جو شخص بصیرت اندوز نظر رکھتا ہے اور درس عبرت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں (توحید، الوہیت وربوبیت کی) واضح دلیل موجود ہے قصہ کو بیان کرنے میں کیسی عمدہ ہے ترتیب کلام اور کتنا حسین ہے اسلوب تقریر۔ کلام اور اسلوب تقریر۔ اصول علوم دینیہ کی طرف کیسے لطیف اشارات ہیں اور ان اشارات کے اندر کتنا علمی خزانہ مخفی ہے حضرت ابراہیمؑ نے قوم کو کیسی خوبصورتی کے ساتھ دعوت دی۔ مخالفت بھی کی تو کتنی خوبصورتی کے ساتھ۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم پر کس قدر مہربان تھے۔ بیان قرآنی میں اس کی کیسی اعلیٰ تصویر پیش کی ہے اور نفس واقعہ کی کیسی تصویر کشی کی ہے وعدہ وعید کو بھی بطور نقل بیان کیا ہے لیکن درپردہ تاکہ سننے والے گوش قبول سے اس کو سنیں اور نفرت نہ کریں پھر اس بیان میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی بھی واضح دلیل اور کھلا ہوا ثبوت موجود ہے (کہ آپ باوجود امی ہونے کے ہزاروں سال پرانا واقعہ کس قدر خوبصورتی اور صداقت کے ساتھ بیان کر رہے ہیں اگر یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بیان کردہ نہیں ہے تو اور کیا ہے)۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ اور ان کی (قوم) میں سے اکثر آدمی (ان پر) ایمان لانے والے نہیں تھے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ اور حقیقت یہی ہے کہ آپ کا رب ہی غالب (اور) مہربان کریم ہے یعنی انتقام پر قادر ہے مگر اس نے اپنی رحمت سے کافروں کو ڈھیل دی تاکہ وہ یا ان کی اولاد میں سے کوئی ایمان لے آئے اور اسی نے اپنی رحمت سے اہل ایمان کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا۔

ع ۵ / ۲۶ / ۹

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ﹰالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ قوم نوح نے پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا۔ قوم مؤنث ہے اسی لئے تصغیر کی صورت میں (تاء تانیث کا اظہار کردیا جاتا ہے اور) قوویمہ کہا جاتا ہے المرسلین اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر اس سے مراد جنس مرسل ہے جیسے عربی محاورہ ہے فلان یرکب الخیل فلاں شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے خواہ وہ ایک ہی گھوڑے پر سوار ہوتا ہو تب بھی یرکب الخیل کہا جاتا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قوم نوح سارے پیغمبروں کا (یعنی نفس رسالت کا) ہی انکار کرتی ہو بعض روایات میں آیا ہے کہ حسن بصری سے دریافت کیا گیا ابوسعید یہ تو بتائیے کہ اللہ نے كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ﹰالْمُرْسَلِیْنَ، كَذَّبَتْ عَادُ ﹰالْمُرْسَلِیْنَ۔ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ فرمایا ہے باوجودیکہ ان میں سے ہر قوم نے صرف اپنے ایک پیغمبر کی تکذیب کی کیونکہ ان کی ہدایت کے لئے ایک ہی پیغمبر کو بھیجا گیا تھا۔ حسن بصری نے فرمایا ہر دوسرا پیغمبر انہی (عقائد و اعمال) کی تعلیم لے کر آیا جس کے لئے پہلا پیغمبر آیا اور جب انہوں نے ایک پیغمبر کی تکذیب کی تو حقیقت میں سب کی تکذیب کی۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا۔ بھائی سے مراد ہے نسبی بھائی۔

دینی بھائی مراد نہیں ہے۔

اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے کہ دوسروں کی پوجا چھوڑ دو۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ میں بلاشبہ تمہاری ہدایت کے لئے امانتدار پیغمبر ہوں۔ یعنی اللہ کا قاصد ہوں اور جو وحی اللہ کی طرف سے میرے پاس آتی ہے اس کا امانتدار ہوں اور تم لوگوں میں بھی میری امانت داری اور سچائی مشہور ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ سے ڈرو یعنی اس کے عذاب سے بچو۔

وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اور میرا کہا مانو یعنی توحید خدا اور صرف اللہ کی عبادت کرنے کا جو میں تم کو حکم دے رہا ہوں اس کو مانو۔

وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اور میں اس (دعوت و نصیحت) کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ کہ تم مجھ پر طلب زر کی کوئی تہمت رکھ سکو۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾ میرا ثواب تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے تم اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔

تکرار آیت تاکید کے لئے ہے اس تکرار سے یہ بات ظاہر کرنا بھی ہے کہ امانت دار ہونے کا تقاضا ہے کہ نوح کی بات مانی جائے اور ان کی دعوت قبول کی جائے نیز طلب گار اجرت نہ ہونا اور روپیہ کا لالچ نہ ہونا بھی موجب اطاعت ہے۔ ان دونوں اوصاف میں سے ہر وصف مستقل طور پر موجب اطاعت ہے اور حضرت نوح کے اندر تو دونوں اوصاف موجود تھے اس لئے آپ کی اطاعت کا وجوب بدرجۂ اولیٰ ہو رہا ہے۔

قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ کہنے لگے کیا ایسی صورت میں ہم تم پر ایمان لا سکتے ہیں جب کہ کمینے لوگ تمہارے متبع ہیں۔

ارذل (بروزن اعور) کی جمع سالم ارذلون ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے ارذل کمینہ۔ کم عزت بیضاوی نے لکھا ہے جس کی عزت کم ہو اور مال بھی کم ہو وہ ارذل ہے۔ بغوی نے ترجمہ کیا ہے نچلے طبقہ والے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا سنار۔ عکرمہ نے کہا کپڑا بننے والے اور موچی۔ قوم نوح کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ بہت سخیف العقل احمق تھے ان کے پیش نظر صرف حقیر متاع دنیا تھا وہ نادار مومنوں کے متعلق یہی رائے رکھتے تھے کہ صرف مال لالچ اور کچھ اونچا اٹھنے کے لئے وہ ایمان لائے ہیں۔ غور و خوض اور فکر و بصیرت کے بعد مسلمان نہیں ہوئے ان لوگوں کا تمہاری دعوت قبول کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری دعوت و نصیحت غلط اور باطل ہے ایسے کمینوں کے ساتھ ہم کیسے ایمان لا سکتے ہیں۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ نوح نے کہا مجھے کیا معلوم کہ وہ کس غرض سے (میری نصیحت کے مطابق) عمل کرتے ہیں یعنی میں نہیں جانتا کہ ان کی طرف سے میری اتباع کرنا کس وجہ سے ہے خالص اللہ کے لئے ہے یا دنیاوی لالچ کے لئے۔ میرا ذمہ تو صرف ظاہر کا اعتبار کرنا ہے۔

اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ (رہی ان کے باطن کی حالت تو) ان کی حساب فہمی کا اللہ ذمہ دار ہے وہی باطن احوال سے واقف ہے۔

لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اگر تم کو شعور ہوتا (تو اس بات کو سمجھ جاتے) مگر اللہ نے تو تمہارے حواس اور اک حق سے معطل کر دیئے ہیں تمہارا نور بصیرت نابینا ہو گیا۔

فراء نے یہ مطلب بیان کیا اگر تم ذی علم ہوتے تو پیشوں کی وجہ سے ان کو ذلیل نہ سمجھتے۔ زجاج نے کہا پیشوں سے دینداری کو ضرر نہیں پہنچتا۔

وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ اور میں تو مومنوں کو (اپنے پاس سے) نکالنے والا نہیں

کافروں کے قول سے یہ امر مترشح ہوتا تھا کہ وہ غریب مسلمانوں کو نوح کے پاس سے نکلوانے کے خواستگار ہیں اس کے جواب میں حضرت نوح نے یہ جملہ فرمایا:

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ میں تو صرف واضح طور پر (اللہ کی نافرمانی اور عذاب سے) ڈرانے والا ہوں۔ یہ کلام گویا غریب مسلمانوں کو اپنے پاس سے نہ نکالنے کی علت کی طرح ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مجھے تو سب لوگوں کو۔ خواہ عزت والے ہوں یا رذیل نچلے طبقہ والے۔ کفر و معصیت سے منع کرنے عذاب خدا سے ڈرانے اور اللہ کی طرف بلانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ دولت مندوں کو ساتھ لینے کے لئے غریبوں کو اپنے پاس سے ہنکا دینا میرے لئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے میرا فریضہ تو سب کو کھول کر ڈرانا ہے۔ ضحاک نے مبین کی تشریح میں کہا واضح دلیل کے ساتھ میں عذاب خدا سے ڈرانے والا ہوں تم لوگوں کو راضی کرنے کے لئے غریبوں کو نکال دینا میرے لئے جائز نہیں۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قوم والوں نے کہا نوح اگر تو (اپنے قول سے) باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے (مقاتل وکلبی) ضحاک نے مرجومین کا ترجمہ کیا ہے مشترمین یعنی ہم تجھے گالیاں دیں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

نوحؑ نے کہا اے میرے رب میری قوم نے مجھے جھوٹا قرار دیا اب میرا اور ان کا قطعی (اور آخری) فیصلہ کر دے اور مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو (ان کے ارادوں سے یا ان کی بداعمالی کی نحوست سے) بچا لے۔ حضرت نوح نے یہ دعا کافروں کے خلاف اس لئے کی کہ انہوں نے تکذیب حق کی تھی اس وجہ سے نہیں کی تھی کہ کافروں نے آپ کو ڈرایا دھمکایا تھا آپ کی بے عزتی کی تھی۔ یعنی آپ نے بددعا کا سبب ظاہر کر دیا کہ تکذیب حق کی وجہ سے میں کافروں کے خلاف دعا کر رہا ہوں۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ پھر ہم نے نوح کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں تھے بچا لیا اس کے بعد جتنے باقی رہ گئے ان کو ڈبو دیا۔ کشتی سے باہر رہ جانے والے سب کافر تھے اس لئے الباقین سے مراد ہیں سب کافر۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بے شک اس قصہ میں عظیم الشان نشانی ہے (جو دنیا میں بطور تواتر مشہور ہے)

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اور قوم نوح میں اکثر مومن نہیں تھے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ اور آپ کا رب یقیناً غالب اور بڑا مہربان ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ (قوم) عاد نے پیغمبروں کو جھوٹا مانا۔ عاد، قوم عاد کے مورث اعلیٰ کا نام تھا لیکن اس جگہ قبیلہ مراد ہے اس لئے کذبت مؤنث کا صیغہ ذکر کیا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ جب ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا بھائی سے مراد ہے نسبی (اور قومی) بھائی دینی بھائی مراد نہیں ہے۔

اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ کیا تم (اللہ کے عذاب سے) نہیں ڈرتے۔ کہ اس کی توحید کا اقرار کرو اور شرک کو چھوڑ دو۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں یعنی اس رسالت میں خائن نہیں ہوں (اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا) کلبی نے کہا میں رسالت کے دعوے سے پہلے بھی تم لوگوں میں امانت دار سچا مانا جاتا تھا مجھے تم جھوٹا نہیں جانتے تھے پھر اب کیوں تم دروغ گوئی کی تہمت مجھ پر رکھتے ہو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

پس اللہ سے ڈرو اور میرے کہے پر چلو میں تم سے اس (تبلیغ و ہدایت) کا کوئی

معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا ثواب تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے۔
مسئلہ طاعت کی اجرت لینا جائز نہیں ورنہ وہ ادا ء رسالت اللہ کی طاعت ہے اس لئے اس کا ثواب بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے
طاعت اللہ کی طاعت نہ ہو گی اور اللہ کے نزدیک مستحق اجر نہ ہو گی۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ کیا تم ہر اونچے مقام پر یادگار کے طور پر ایک عمارت بناتے ہو جس کو محض فضول (بلا ضرورت) بناتے ہو اور بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہو۔

استفہام، زجری یا تقریری ہے۔ کل ریع میں استغراق حقیقی نہیں (کیونکہ ہر اونچی جگہ میں قوم عاد نہ قصر بناتی تھی نہ ایسا ممکن تھا) اور کثرت اضافی بھی مراد نہیں ہے (کیونکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے) بلکہ فی نفسہ کثرت مراد ہے یعنی بہت سے مقامات میں تم یادگاریں تعمیر کرتے ہو۔ والبی نے کہا کہ حضرت ابن عباس نے ریع کا ترجمہ کیا اونچا مقام، بلند جگہ، ضحاک اور مقاتل نے ترجمہ کیا ہر راستہ میں۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔ مجاہد نے کہا دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ۔ مجاہد کا دوسرا قول مروی ہے کہ ریع کا معنی ہے منظر۔ قاموس میں ہے ریع کسرہ اور فتحہ کے ساتھ زمین کا اونچا حصہ۔ یا پہاڑ کے اندر شگافی راستہ یا اونچا پہاڑ یا ہر اونچے مقام کی وادی کی سیلان گاہ۔ ریع بالکسر یہودیوں کا گرجا، خانقاہ اور کبوتروں کا برج۔

آیت یعنی یادگار۔ بانی کو یاد دلانے والی عمارت۔

تعبثون یعنی فضول کام کرتے ہو آخرت میں ان کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ دنیا میں بھی بیکار ہیں۔

یا آیت سے مراد ہے مسافروں کے لئے بنائے جانے والے نشان چونکہ قوم عاد والے ستاروں کو دیکھ کر اپنی سفری راہیں پہچان لیتے تھے اس لئے فرمایا کہ تم یہ بیکار کام کرتے ہو۔

بعض اہل تفسیر نے کہا عاد کی قوم والے اونچے مقامات پر عمارتیں بناتے تھے تاکہ اوپر چڑھ کر آنے جانے والے راہ گیروں کو دیکھیں اور ان سے ہنسی مذاق کریں۔

سعید بن جبیر نے کہا قوم عاد والے کبوتر بازی کرتے تھے کبوتروں کے لئے انہوں نے برج بنا رکھے تھے حضرت ہود نے ان کے اس فعل کو پسند نہیں کیا اور ان برجوں کے بنانے کو لغو قرار دیا اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں تعبثون آیا ہے یعنی تم لوگ ان سے کھیلتے ہو۔

میں کہتا ہوں کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ یادگار قائم رکھنے کے لئے ٹیلات، اونچی عمارتیں اور قلعے تعمیر کرتے تھے دنیا پرستوں کا شیوہ ہی یہی ہے اس کی غرض یہ ہوتی تھی کہ ہمیشہ ان عمارتوں کو بنانے والوں کی یادگار باقی رہے۔ اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے رب نے بڑی بڑی لاٹیں بنانے والی عاد ارم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ چونکہ یہ عمل فضول اور بے نتیجہ تھا اس لئے حضرت ہود نے اس کو پسند نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ تعمیری عمل پسند نہیں تھا اسی لئے حضور اقدس نے ارشاد فرمایا جب اللہ کسی بندہ کی برائی چاہتا ہے، تو کچی اینٹوں اور گارے میں اس کی ہمت کو محصور کر دیتا ہے کہ وہ عمارتیں بنانے لگتا ہے رواہ الطبرانی بسند جید من حدیث جابر طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابو البشر انصاریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ جب کسی بندہ کی ذلت چاہتا ہے تو وہ بندہ اپنا مال عمارت بنانے میں خرچ کرتا ہے۔ حضرت واثلہ بن اسقع کی روایت سے طبرانی نے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہر عمارت اپنے مالک کے لئے وبال ہے سوائے اس کے جو ایسی ہو حضور ﷺ نے یہ فرماتے وقت اپنی ہتھیلی سے اشارہ کیا تھا۔

حضرت انس راوی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ باہر نکلے (یعنی بازار کو گئے) ایک گول اونچے گنبد نما مکان کو دیکھ کر فرمایا یہ کیا ہے صحابہ نے عرض کیا یہ فلاں انصاری کا ہے حضور خاموش ہو گئے مگر یہ بات اپنے دل میں لئے رہے جب اس کا مالک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اس وقت لوگوں کے مجمع میں تشریف فرما تھے اس شخص نے سلام کیا آپ نے منہ پھیر لیا ایسا کئی مرتبہ ہوا وہ شخص سمجھ گیا کہ حضور ﷺ مجھ سے ناراض ہیں اس لئے بے رخی برت رہے ہیں (لیکن ناراضگی کی

وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی) صحابہ سے پوچھا رسول اللہ ﷺ کا رخ مجھے غیر غیر دکھائی دیتا ہے کیا وجہ ہے صحابہ نے کہا باہر تشریف لے گئے تھے اور تمہارے بنائے ہوئے گنبد کو دیکھا تھا یہ سنتے ہی وہ شخص فوراً لوٹ پڑا اور جا کر گنبد کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ایک روز پھر باہر تشریف لے گئے اور گنبد دکھائی نہ دیا تو فرمایا وہ گنبد کیا ہوا صحابہ نے عرض کیا اسکے مالک نے حضور ﷺ کی بے رخی کا ہم سے شکوہ کیا تھا ہم نے اس کو بات بتادی اس نے جا کر گنبد کو ڈھا دیا۔ فرمایا سنو ہر عمارت اپنے مالک کے لئے وبال ہو گی سوائے اس کے جو ضروری ہو جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر عمارت قیامت کے دن اپنے مالک کے لئے وبال ہو گی سوائے مسجد اور (سکونت) کے گھر کے۔

مصانع حوض، تالاب، مضبوط اونچے محل، قلعے

لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿۱۲۹﴾ اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے۔ مضبوط عمارتیں بناتے ہو۔

مسئلہ :- لمبی لمبی آرزوئیں کرنی مکروہ ہے آرزو کی کمی مستحب ہے حضرت ابن عمر کا بیان ہے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے میرے جسم کے کسی حصہ کو پکڑ کر فرمایا دنیا میں اس طرح رہنا جیسے تو پردیسی ہے، یا راہ گیر ہے اور اپنے آپ کو مردوں کی فہرست میں شمار کرنا۔ رواہ البخاری۔

یہ بھی حضرت عمر کی روایت ہے کہ ایک بار ہماری طرف رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا میں اور میری ماں کچھ مٹی سے کر رہے تھے (یعنی مٹی کی لسائی یا لپائی کر رہے تھے) فرمایا عبداللہ یہ کیا ہے میں نے کہا ہم کچھ درستی (مرمت) کر رہے ہیں فرمایا امر (یعنی تقدیری حکم) اس سے بھی پہلے پہنچنے والا ہے (یعنی موت سر پر کھڑی ہے معلوم نہیں اس کی درستی سے پہلے آجائے) رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا یا رسول اللہ ﷺ (بچے ہوئے) پانی کو بہا دیا کرتے تھے (آگے بڑھ کر سفر میں جب پانی کی ضرورت ہوتی اور پانی موجود نہ ہوتا تو) تیمم کر لیتے تھے میں عرض کرتا یا رسول اللہ ﷺ پانی قریب ہی ہے حضور ﷺ فرماتے مجھے کیا معلوم شاید میں پانی تک نہ پہنچ سکوں۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ وابن الجوزی فی کتاب الوفاء۔

وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿۱۳۰﴾ اور جب کسی پر دارو گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر (اور ظالم) بن کر دارو گیر کرتے ہو۔ یعنی جب سختی کے ساتھ عذاب دینے کے لئے پکڑتے ہو۔

جبارین بغیر رحم کے ناحق قتل کرنے والے۔ قاموس میں ہے جبار، متکبر آدمی اور وہ دل جس میں رحم نہ آئے اور ناحق بہت زیادہ قتل کرنے والا۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ پس اللہ سے ڈرو (یعنی ان حرکت کو چھوڑ دو)

وَأَطِيعُونِ ﴿۱۳۱﴾ اور میرا کہا مانو یعنی جس چیز کی طرف آنے کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں اس کو مان لو تمہارے لئے بہت زیادہ فائدہ رساں ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۳۲﴾ اور ڈرو اس سے جس نے تم کو وہ نعمتیں بطور امداد عطا فرمائیں جن سے تم واقف ہو۔

اس آیت میں دوبارہ تقویٰ کا حکم دیا اور جو خداداد نعمتیں ان کو معلوم تھیں ان کی عطاء کو حکم تقویٰ کی علت قرار دیا اور اس بات پر تنبیہ بھی کی کہ اگر تقویٰ رکھو گے تو امداد ہمیشہ جاری رہے گی اور تقویٰ چھوڑ دو گے تو امداد بھی منقطع کر دی جائے گی۔

الا تتقون میں کافروں کے جرم پر اجمالی دلالت تھی اور بما تعلمون میں خداداد نعمتوں کا مجمل اظہار تھا اس کے بعد انعامات کی تفصیل بیان کر دی تاکہ نصیحت اندوزی اور ترغیب تقویٰ مبالغہ کے ساتھ ہو جائے چنانچہ فرمایا۔

أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۱۳۴﴾ اس نے چوپائے اور اولاد اور باغات اور

چشمے تم کو عطا فرمائے یہ مذکورہ بالا امدکم سے بدل ہے (یعنی سابق الذکر امداد سے یہی مؤخر الذکر امداد مقصود ہے) اس کے بعد عذاب کی وعید سنائی اور فرمایا۔

اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳۵﴾ (اگر تم میرے کہنے پر نہ چلو گے تو) مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یوم عظیم کا عذاب تم پر آجائے گا (کذا فسرہ ابن عباس) یوم عظیم کا عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں کیونکہ جو خدا عطاء نعمت پر قادر ہے وہ انتقام پر بھی قادر ہے۔ یہ جملہ حکم سابق کی علت کو ظاہر کر رہا ہے۔

قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَکُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾ قوم ہود نے (جواب میں) کہا ہمارے لئے (دونوں) برابر ہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو۔ یعنی تمہارے وعظ کی وجہ سے اپنے طریقہ کو جس پر ہم چل رہے ہیں ترک نہیں کریں گے۔ وعظ اس کلام کو کہتے ہیں جو وعد و وعید (ترغیب و ترہیب) کے ذکر کی وجہ سے دلوں میں نرمی پیدا کر دے۔ (یعنی وعظ کے اندر ترغیب و ترہیب ضروری ہے تاکہ دلوں کی سختی دور ہو)۔

اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۳۷﴾ یہ تو پہلے لوگوں کی عادت ہی ہے (کہ وہ اسی طرح کی جھوٹی باتیں بنایا کرتے تھے) یا یہ مطلب ہے کہ ہمارا جو مذہب اور دین ہے یہی دین ہمارے اسلاف کا تھا اور ہم ان کے پیرو ہیں یا یہ مطلب ہے کہ زندگی اور موت کی یہ رفتار پہلے زمانے سے یوں ہی چلی آئی ہے سب لوگ پیدا ہوتے اور مرتے رہے ہیں۔

کسائی۔ ابو جعفر اور ابو عمرو کی قرأت میں لفظ خلق کی بجائے خلق بسکون لام آیا ہے اس صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ تم ہم کو جو وعظ نصیحت کر رہے ہو یہ تو پہلے لوگوں کی من گھڑت اور دروغ بافی ہے۔ اور خلق کا معنی ہے خود کسی بات کو گھڑنا۔ آیت میں آیا ہے وتخلقون افکا تم خود جھوٹ گھڑتے ہو یا یہ مطلب ہے کہ پہلے لوگوں سے یہ طریقہ چلا آیا ہے وہ پیدا ہوتے اور مرتے رہے ہیں ہم بھی پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ نہ وہ مر کر اٹھے نہ ان کا حساب ہوا نہ ہم مر کر دوبارہ اٹھیں گے۔ نہ ہمارے اعمال کا حساب ہو گا۔

وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۱۳۸﴾ اور (جس طریقہ پر ہم چل رہے ہیں اس پر) ہم کو عذاب نہیں ہو گا۔

فَکَذَّبُوۡهُ فَاَهۡلَکۡنٰهُمۡ ؕ غرض قوم ہود نے ہود کو جھٹلایا ان کی بات صحیح نہ مانا آخر ہم نے ان کو (تیز آندھی بھیج) کر ہلاک کر دیا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳۹﴾ اس قصہ میں (اللہ کی قدرت اور نبی کی صداقت کی) بڑی دلیل ہے اور ان میں سے اکثر لوگ مومن نہ تھے۔

اس آخری جملہ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اگر قوم عاد کا بیشتر یا نصف حصہ مومن ہو جاتا تو ان پر عذاب نہ آتا اور قریش جو ایسے عذاب سے محفوظ ہیں وہ مومنوں کی برکت سے ہے۔ اللہ نے فرمایا وَلَوۡلَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُوۡنَ وَنِسَآءٌ مُّؤۡمِنٰتٌ لَعَذَّبۡنَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں تو ہم ان کافروں کو دردناک عذاب یقیناً دیتے۔

وَاِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۴۰﴾ اور بلا شبہ آپ کا رب ہی غالب اور بڑا مہربان ہے۔

کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾

(قوم) ثمود نے پیغمبروں کو جھوٹا بتایا جب ان کے نسبی بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تم (اللہ کے عذاب اور گرفت سے) نہیں ڈرتے میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں سو تم اللہ کے عذاب سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو میں تم سے (اس تبلیغ و ہدایت کا) کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا میرا سارا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

اَتُتۡرَكُوۡنَ فِیۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوۡعٍ وَّ نَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِیۡمٌ ﴿۱۴۸﴾

کیا تم کو انہی چیزوں میں جو یہاں موجود ہیں یعنی باغات اور چشمے اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گوندھے ہوئے ہیں یونہی بے فکری کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا۔

استفہام انکاری ہے یعنی دنیا کی ان نعمتوں میں تم کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا یا استفہام انکاری نہیں بلکہ یاد دہانی ہے ان نعمتوں کی جو اللہ نے خالص طور پر ان کو عطا فرمائی تھیں۔

طلعہا طلع سے مراد ہیں پھل۔ ھضیم ایک روایت کے اعتبار سے حضرت ابن عباس نے اس کا ترجمہ کیا لطیف۔ اس معنی میں ھضیم الکشح یعنی لطیف الکشح آتا ہے۔ دوسری روایت ابو العالیہ کی ہے جس میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس کا ترجمہ مفید، پختہ کیا۔ عکرمہ نے کہا نرم حسن نے کہا لٹکتا ہوا۔ مجاہد نے کہا خوشۂ کھجور جب خشک ہو جاتا ہے تو اس کو ہشیم کہتے ہیں اور جب تر و تازہ ہوتا ہے تو وہ ھضیم ہے ضحاک اور مقاتل نے کہا تہ برتہ قطار پر چڑھی ہوئی مراد ہے کثیر اہل لغت کہتے ہیں کہ ھضیم وہ گچھا ہے جو بر آمد ہونے سے پہلے اندر ہی اندر باہم چسپاں ہوتا ہے ازہری نے کہا بعض بعض کے اندر گھسا ہوا بعض نے کہا ھضیم بمعنی ہاضم ہے کھانے کو ہضم کرنے والا ہے بہر حال ان تمام معانی کا مجموعہ لفظ لطافت کے اندر ہے (اسی لئے حضرت ابن عباس نے اس کا ترجمہ لطیف کیا)

وَ تَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا فٰرِهِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾ اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (فخر کرتے) ہوئے مکان بناتے ہو۔

فرھین یعنی پتھر تراشنے میں ماہر فرہ الرجل فراھۃ وہ آدمی ماہر ہو گیا۔ عکرمہ نے اس کا ترجمہ کیا خوش عیش، آرام میں۔ قتادہ نے کہا اپنی صنعت کاری پر مغرور سدی نے کہا متحیر اخفش نے ترجمہ کیا خوش۔ عرب حاء کو ہاء سے بدل دیتے ہیں جیسے مدحتہ کی جگہ مدھتہ کہنے لگتے ہیں یہ بھی کہا گیا کہ فارہین سے مراد ہے حریص ابو عبیدہ نے کہا (اپنی صنعت پر) اترانے والے۔ ممکن مراد یہ ہے کہ اس نعمت پر اترانے والے ہو۔ ممکن ہو اور غرور کی وجہ سے قبول حق سے سر تابی کرنے والے ہو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۵۰﴾ پس اللہ سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو۔

وَ لَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِیۡنَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا یُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾

اور ان حدود (بندگی) سے نکل جانے والوں کا کہنا مت مانو جو سر زمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور اصلاح (کی بات) نہیں کرتے حضرت ابن عباس نے مسرفین کی تفسیر کی مشرکین۔ مقاتل نے کہا وہ نو آدمی تھے جنہوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا۔ [زمین میں فساد کرتے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانیوں سے ملک میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور اللہ کی فرمانبرداری کر کے سنوار نہیں پیدا کرتے۔

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾ (قوم ثمود نے) کہا تم خالص جادو زدہ لوگوں میں سے ہو۔

(یعنی تم پر جادو کر دیا گیا ہے کہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو) یہ ترجمہ مجاہد اور قتادہ کا ہے۔ لیکن کلبی نے بروایت ابو صالح بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اسکا ترجمہ معللین بہلائے ہوئے عرب کہتے ہیں سحرہ اسکو کھانا پانی دے کر بہلا دیا اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ تم کھانا کھاتے ہو پانی پیتے ہو فرشتے نہیں ہو بلکہ،

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۚۖ (بالکل) ہماری طرح آدمی ہو اس کے سوا کچھ نہیں ہو۔ اس لئے نبی نہیں ہو۔

فَاۡتِ بِاٰیَةٍ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۵۴﴾ اگر (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (اپنے قول کے سچا ہونے کی) کوئی دلیل پیش کرو جب قوم نے دلیل نبوت طلب کی تو حضرت ہود کی دعا سے اللہ نے پتھر کی چٹان کے اندر سے ایک اونٹنی بر آمد کر دی۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ صالح نے (پھر قوم سے) کہا یہ ایک اونٹنی ہے (جو پتھر سے بر آمد ہوئی ہے یہ میری

سچائی کی نشانی ہے)

لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿۱۵۵﴾ ایک روز اس کے لئے پانی کا حصہ (مقرر) ہے اور ایک معین دن تمہارے لئے پانی کا حصہ ہے۔

پس تم لوگ اپنے حصہ پر اکتفا کرنا اور اس کے حصہ میں مداخلت نہ کرنا۔

وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ اور برائی (اذیت رسانی) کے ساتھ اس کو ہاتھ نہ لگانا۔

فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۵۶﴾ ورنہ تم کو یوم عظیم کا عذاب آپکڑے گا یعنی ایک دن عذاب عظیم میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

فَعَقَرُوهَا پھر انہوں نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔ چونکہ سب اونٹنی کو قتل کرنے پر راضی تھے اس لئے قتل کو نسبت سب کی طرف کر دی گئی اور اسی وجہ سے سب عذاب میں پکڑے گئے۔

فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿۱۵۷﴾ قتل کے بعد پشیمان ہوئے یہ پشیمانی توبہ نہ تھی بلکہ نزول عذاب کے ڈر سے تھی یا اس وقت ہوئی تھی جب عذاب آتا دیکھ لیا تھا لیکن اس وقت پشیمانی کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ آخر عذاب نے ان کو آپکڑا یعنی اس عذاب نے جس کی ان کو دھمکی دی گئی تھی۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۵۸﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۵۹﴾

بے شک اس میں بڑی نشانی (واضح دلیل) ہے اور ان میں سے اکثر لوگ مومن نہیں تھے (اس لئے ان پر عذاب آیا) اور بلاشک وشبہ آپ کا رب ہی غالب اور بڑا مہربان ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۶۰﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۶۱﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۴﴾

قوم لوط نے پیغمبروں کو جھوٹا جانا جب ان سے ان کے بھائی نے کہا کیا تم (اللہ کے عذاب سے) نہیں ڈرتے۔ میں بلاشبہ تمہاری ہدایت کے لئے (اللہ کی طرف سے) بھیجا گیا ہوں اور فرض رسالت ادا کرنے میں) امانت دار ہوں پس تم اللہ سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو اور میں اسکا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

(اس آیت میں بھائی سے مراد وطنی بھائی یا ساتھی ہے حضرت لوط نہ نسب میں ان لوگوں کے ساتھ شریک تھے نہ مذہب میں اس لئے نہ اخوت نسبی مراد ہے نہ دینی برادری۔ مترجم)

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۵﴾ کیا تمام دنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مردوں سے فعل بد کرتے ہو یعنی سارے جہان سے ہٹ کر سب کے خلاف تم مردوں سے لواطت کرتے ہو دنیا میں کوئی مخلوق بھی اس عمل میں تمہاری شریک نہیں ہے کوئی بھی یہ حرکت نہیں کرتا اس مطلب پر عالمین سے مراد ہوگا ہر جماع کرنے والا (خواہ آدمی ہو یا کوئی اور) یا یہ مطلب ہے کہ آدمیوں میں سے تم ہی مردوں سے لواطت کرتے ہو اور کوئی آدمی ایسا نہیں کرتا اس مطلب پر العالمین سے مراد آدمی ہوں گے۔

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم اور جو بیبیاں اللہ نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں ان کو چھوڑے رہتے ہو اس ترجمہ پر من ازواجکم میں من بیانیہ ہوگا۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری بیبیوں کا جو مقام اللہ نے تمہارے لئے بنایا ہے تم اس کو چھوڑے رکھتے ہو (یعنی عورتوں سے صنفی مجامعت نہیں کرتے بلکہ ان سے بھی لواطت کرتے ہو) وہ لوگ عورتوں سے بھی لواطت کرتے تھے جیسے رافضی کرتے ہیں اس وقت من تبعیضیہ ہوگا یعنی تمہاری بیبیوں کا جو حصہ جسم اللہ نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے اس کو چھوڑے رکھتے ہو۔ اس مطلب پر آیت سے عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے

کی حرکت پر استدلال کیا جا سکتا ہے بیویاں ہوں یا باندیاں۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ بلکہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہی لوگ ہو۔ یعنی شہوت رانی میں حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرتے ہو شہوت کو پورا کرنے میں تم تمام لوگوں کی حدبندیوں سے آگے بڑھنے والے بلکہ جانوروں سے بھی اس معاملہ میں بڑھ کر ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ گناہوں میں تم حد سے بڑھے ہوئے ہو یا یہ مطلب ہے کہ اس نالائق حرکت کرنے کی وجہ سے تم اس بات کے مستحق ہو کہ تم کو حد سے تجاوز کرنے والا کہا جائے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ کہنے لگے لوط اگر تو (اپنے دعویٰ سے اور ہم کو بازداشت کرنے سے) باز نہ آیا تو خارج کردہ لوگوں میں سے ہو جائے گا یعنی اپنی بستی سے ہم تجھے نکال دیں گے۔

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾ لوط نے کہا میں تمہارے (عمل سے سخت نفرت کرنے والا ہوں یا) عمل کا سخت دشمن ہوں قالی بغض رکھنے والا یعنی تمہارے عمل سے مجھے سخت نفرت ہے اسی لئے مجھے بستی سے نکالے جانے کی دھمکی کی پروا نہیں ہے من القالین کہنے میں قالی کہنے سے زیادہ زور ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے عمل سے نفرت کرنے والی جماعت میں میں شامل ہوں اور اس گروہ میں مشہور ہوں۔

حضرت لوط کو جب معلوم ہو گیا کہ میری نصیحت و دعوت کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا (آئندہ ان کے ساتھ رہنا بیکار ہے) تو آپ نے دعا کی کہ مجھے ان سے الگ کر دیا جائے تاکہ ان پر آنے والے عذاب سے میں محفوظ رہوں۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ اے میرے رب مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے عمل (کے برے نتیجے اور عذاب) سے بچا لے۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾ سو ہم نے لوط کو اور اس کے گھر والوں کو یعنی دین میں جو ان کے ساتھی تھی۔ سب کو بچا لیا پہلے سے ہی ان کو بستی سے باہر نکال دیا اور عذاب سے محفوظ رکھا۔

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ سوائے ایک بوڑھی عورت کے جو (عذاب اور ہلاکت میں) باقی رہ جانے والوں کے اندر شامل رہی یعنی مقرر ہو چکا تھا کہ وہ کافروں میں رہے گی یہ عورت یعنی حضرت لوط کی بیوی حضرت کے پیچھے پیچھے چلی تو تھی لیکن اپنی قوم کی طرف راغب اور ان کے عمل کو پسند کرتی تھی اس لئے ایک پتھر راستہ میں اس کے بھی لگ گیا اور وہ مر گئی بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ حضرت لوط کے ساتھ بستی سے باہر نکلی ہی نہ تھی جو لوگ بستی میں باقی تھے انہیں میں وہ بھی شامل تھی۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾ پھر (جب لوط اپنے ساتھیوں کو لے کر باہر نکل گئے تو) ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ اور ان پر (کنکریوں کی یا پتھروں کی) خوب بارش کر دی۔ وہب بن منبہ نے کہا ان پر گندھک اور آگ کی بارش کی گئی۔

فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۳﴾ یا بر امینہ تھا ان لوگوں کا جن کو عذاب سے ڈرایا گیا تھا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۷۵﴾ اس میں بلاشبہ (اللہ کی قدرت اور پیغمبروں کی صداقت کی) دلیل ہے اور ان میں اکثر لوگ مومن نہیں تھے اور آپ کا رب بلاشبہ غالب (اور) بڑا مہربان ہے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۶﴾ بن والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا (جھوٹا قرار دیا)

ایکہ درختوں کی گھنی جھاڑی۔ بن مدین کے قریب ایک گھنا جنگل تھا جس میں کچھ لوگ رہتے تھے یہ گروہ مدین والوں سے الگ تھا۔ اللہ نے حضرت شعیب کو جس طرح مدین والوں کی ہدایت پر مامور کیا تھا اسی طرح اس جنگل کے باشندوں کی ہدایت کے لئے بھی مقرر کیا تھا حضرت شعیب اہل مدین میں سے تھے اصحاب ایکہ میں سے نہیں تھے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

جب کہ شعیب نے کہا کیا تم (اللہ کے عذاب سے) نہیں ڈرتے میں تمہارے لئے (اللہ کا) امانت دار فرستادہ ہوں اللہ سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو اور میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے۔ اللہ نے تمام انبیاء کی تبلیغ اور طرز تبلیغ کو ایک ہی عبارت میں نقل کیا کیونکہ سب نے ہی اللہ سے ڈرنے اس کی اطاعت کرنے اور اس کی عبادت میں شرک نہ کرنے کا حکم دیا سب ہی نے تبلیغ رسالت کا معاوضہ طلب نہ کرنے کا اظہار کیا اور سب نے ہی اپنی دعوت کا ثواب اللہ کے ذمہ قرار دیا۔ اسی لئے اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰي نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (یعنی وحی کے ذریعہ سے ہم نے جس طرح اور جو احکام نوح کو اور نوح کے بعد دوسرے انبیاء کو بھیجے تھے وہی آپ کو بھی وحی کے ذریعہ سے بھیجے مطلب یہ کہ طریق وحی سب کا ایک جیسا ہے اور جو اوامر ونواہی اجزاء وحی تھے وہ سب کے برابر تھے۔ مترجم)

دوسری آیت میں حکم دیا ہے اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ دین کو قائم کرو اور اس میں تفریق نہ کرو۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ پورا ناپ دیا کرو (یہ تقویٰ کی تفصیل ہے)

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ اور (پیمانہ بھر دینے میں) کمی نہ کرو یعنی لوگوں کا حق دینے میں کمی نہ کرو۔

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ اور (تول کر دینے کی چیزوں کو) صحیح ترازو سے تول کر دیا کرو۔

قسطاس کو اگر عربی لفظ قرار دیا جائے تو اس کا اشتقاق قسط سے ہوگا اور قسط کا معنی ہے عدل۔ المستقیم ٹھیک صحیح جس میں کوئی کمی نہ ہو۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اور لوگوں کو ان کی چیزیں (ناپ تول میں) کم نہ کیا کرو۔

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ اور زمین پر فساد نہ مچاؤ یعنی لوٹ مار قتل وغارت اور رہزنی وغیرہ نہ کرو۔

مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ دانستہ تباہی لاتے ہوئے مطلب یہ ہے کہ قصداً بگاڑ نہ پیدا کرو تباہی نہ پھیلاؤ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نیت اصلاح کی ہو اور خرابی پیدا ہو جائے تو اس کو فساد فی الارض نہیں کیا جائے گا اور اس کا کوئی مواخذہ نہیں کسی نے کافر کے تیر مار اکافر نے مسلمان قیدی کو اپنے سامنے ڈھال کی طرح کر دیا اور مسلمان مارا گیا یا زخمی ہو گیا تو نہ دیت ہوگی، نہ قصاص، نہ کوئی تاوان۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ اور ڈرو اس (خدا) سے جس نے تم کو پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو بھی یعنی تم سے پہلے دوسرے لوگوں کو بھی۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ کہنے لگے تم تو بالکل سحر زدہ ہو۔

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اور تم تو ہم جیسے انسان ہی ہو یعنی آدمی ہو اور ہم جیسے آدمی اول تو رسول کو آدمی نہ ہونا چاہئے اور تم آدمی ہو پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت حاصل نہیں (نہ بادشاہ ہو نہ شوکت وسطوت والے دولت مند

سردار) اس لئے تم رسول نہیں ہو سکتے۔

وَاِنۡ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۱۸۶﴾ اور ہم بلاشبہ تم کو جھوٹا خیال کرتے ہیں تم نبوت کے دعوے میں جھوٹے ہو۔

فَاَسۡقِطۡ عَلَيۡنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۸۷﴾ اگر سچ ہونے کا دعویٰ ہے اور سچے ہو تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرادو۔

قَالَ رَبِّىۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾ شعیب نے کہا جو کچھ تم کرتے ہو میرا رب اس سے بخوبی واقف ہے یعنی تم کو جو کم تولتے ناپتے، لوٹتے، قتل کرتے اور راہزنی کرتے ہو اس سے میرا رب خوف واقف ہے وہی اگر چاہے گا تو اس کی سزا تم کو جب چاہے گا دے گا عذاب لانے کا اختیار مجھے نہیں ہے میری ذمہ داری تو صرف تبلیغ ودعوت کی ہے۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَاَخَذَهُمۡ عَذَابُ يَوۡمِ الظُّلَّةِ ؕ غرض ایکہ والوں نے شعیب کی تکذیب کی اس لئے یوم الظلہ (سائبان کے دن) کے عذاب نے ان کو آپکڑا اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایکہ والوں کے جنگل میں سخت گرمی پڑی، لوگ بے تاب ہو کر تہ خانوں میں گھس گئے اندر پہنچے تو وہاں اور بھی شدید گرمی محسوس ہوئی مجبور ہو کر باہر آگئے اس وقت آسمان پر ایک بدلی آئی اور بدلی کے سایہ میں سب جمع ہو گئے اسی بدلی کو ظلہ (سائبان) کہا گیا ہے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بادل سے آگ برسنے لگی اور سب جل بھن گئے یہ قصہ سورت ہود میں گزر چکا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۸۹﴾ بیشک یہ یوم عظیم کا عذاب تھا (یعنی عذاب عظیم تھا جو اس روز واقعہ ہوا)

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۹۱﴾

اس قصہ میں درحقیقت (عبرت اندوزی) کی بڑی نشانی تھی اور ان میں سے اکثر لوگ مومن تھے (اس لئے ان پر عذاب نازل کیا گیا) اور یہ قطعی بات ہے کہ آپ کا رب ہی غالب اور بڑا مہربان ہے۔

مذکورہ ساتوں قصے مختصر طور پر رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لئے بیان کئے گئے تاکہ آپ صبر کریں اور سمجھ لیں کہ ہر پیغمبر کی قوم والوں کی طرف سے تکذیب ہوئی ہے اور سب پیغمبروں نے استقامت قائم رکھی آخر پیغمبروں کے منکر ہلاک کر دیئے گئے اور پیغمبر اپنے ساتھیوں سمیت غالب رہے۔ مترجم) اس میں رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنے والوں کے لئے عذاب کی دھمکی بھی ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۹۲﴾ اور بے شک قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔

تنزیل (مصدر) بمعنی منزل (اسم مفعول) کے ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلۡبِكَ روح الامین (یعنی جبرئیلؑ) اس کو لے کر اترا ہے اور تمہارے دل پر اس نے نازل کیا ہے پھر آپ نے اس کو یاد کر لیا ہے قلب سے مراد ہے یہی صنوبری قلب جو سینہ کے اندر ہے وہ لامکانی لطیفہ ربانی مراد نہیں ہے جس کا مقام عرش کے اوپر ہے اور اس کا ظہور اسی صنوبری دل پر لطیفۂ ربانی تو عالم امر سے ہے یہ نہ وحی کا بار اٹھا سکتا ہے نہ نبوت کا یہ بوجھ اٹھانے والا تو قلب صنوبری ہی ہے جو عناصر کا مجموعہ کا نقوش کا محل اور عالم امر کے ظہور کا مقام ہے اسی لئے ہمیشہ وحی کا صدور جسمانی ساخت کی تکمیل یعنی چالیس سال کی عمر کے بعد ہوا۔ جبرئیل امین وحی الٰہی ہیں اس لئے ان کو امین کہا جاتا ہے۔

لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ تاکہ آپ (اللہ کی نافرمانی اور عذاب سے) ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ یعنی فہرست انبیاء میں آپ شامل ہو جائیں۔ مترجم)

بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾ واضح عربی زبان میں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے قریش کی زبان

مراد ہے تاکہ قریش کو یہ عذر نہ ہو کہ ہم وحی کی زبان کو نہیں سمجھتے۔
اس آیت کا بعض اہل تفسیر نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ روح الامین نے یہ قرآن آپ کے دل پر عربی زبان میں اتارا ہے اگر کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو آپ کے کانوں پر نازل ہوتا دل پر نازل نہ ہو سکتا کیونکہ غیر عربی الفاظ کے معنی آپ سمجھ نہ پاتے۔ آدمی کبھی چند زبانوں سے واقف ہوتا ہے اگر کوئی اس کی مادری زبان میں بات کرے تو فوراً اس کا مطلب ذہن کی طرف متوجہ ہوتا ہے الفاظ کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور اگر مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری سیکھی ہوئی زبان میں اس سے کلام کرتا ہے تو اول اس کا ذہن الفاظ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر الفاظ سے معانی کی طرف انتقال ذہنی ہوتا ہے۔
وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ اور اس (قرآن) کا ذکر پہلی امتوں کی آسمانی کتابوں میں بھی ہے۔
اکثر اہل تفسیر نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ نزول قرآن کا ذکر کتب سابقہ میں کر دیا گیا ہے مقاتل نے کہا محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر گزشتہ کتابوں میں کر دیا گیا ہے بعض کے نزدیک قرآن کی طرف ضمیر راجع ہے۔ زبر کتابیں۔
مؤخر الذکر تفسیری قول ہی کی بناء پر بعض احناف کے نزدیک قرآن صرف معانی کا نام ہے کیونکہ معانی ہی کا اندراج کتب سابقہ میں تھا عربی الفاظ ان کتابوں میں نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فارسی میں نماز کی قرأت کو جائز قرار دیا ہے (لیکن امام ابو حنیفہ کے قول کی بنیاد اس بات کو قرار دینا کہ قرآن صرف معنی کا نام ہے غلط ہے امام اعظم نے تو ان علماء بلاغت و اعجاز کے لئے فارسی میں صرف نماز کے اندر قرأت کو جائز قرار دیا تھا جو تلاوت قرآن کے وقت قرآن کی بلاغت میں ڈوب جاتے ہیں اور ان کا ادبی ذوق حلاوت و طلاوت عبارت کی کیفیت میں اتنا سرشار و بدمست ہو جاتا ہے کہ پھر ان کی کامل توجہ معبود کے سامنے حاضر ہونے کی طرف نہیں رہتی عوام کے لئے تو امام صاحب نے فارسی میں قرأت کو جائز نہیں قرار دیا اگر امام صاحب کے نزدیک قرآن صرف معنی کا نام ہوتا تو وہ ترجمۂ قرآن کو ہر مقام پر قرآن کا حکم دیتے یہاں تک کہ جنب اور حائضہ اور نفساء کے لئے بھی ترجمہ کو پڑھنا اور چھونا ممنوع قرار دیتے حالانکہ ایسا نہیں ہے مترجم۔
حضرت مفسر نے فرمایا احناف کا یہ قول غلط ہے قرآن عبارت اور معانی دونوں کا نام ہے اللہ نے اس کو قرآنا عربیا فرمایا ہے اور عربی عبارت کی صفت ہوتی ہے (معنی تو عربی عبارتوں کے بھی ہوتے ہیں اور دوسری زبانوں کی عبارتوں کے بھی) مزید یہ کہ قرآن معجز ہے اور اعجاز عبارت کی خصوصیت ہے اسی لئے جنبی کے لئے فارسی میں قرآن پڑھنا جائز ہے امام ابو حنیفہؒ نے صرف نماز میں اجازت دی تھی کہ عربی کی جگہ دوسری زبان کی عبارت (جو معانی پر دلالت کر رہی ہو) پڑھنی جائز ہے اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ امام صاحب کے نزدیک قرآن کی عبارت کا پڑھنا نماز کا رکن نہیں ہے اور قرآن کی عبارت خضوع سے (بعض لوگوں کے لئے) مانع ہو جاتی ہے پھر اپنے اس قول سے امام صاحب نے رجوع بھی کر لیا تھا اور صاحبینؒ کی طرح نماز کی قرأت فارسی میں ناجائز قرار دے دی تھی احناف کا اسی پر فتویٰ بھی ہے اور اکثر ائمہ کا بھی یہی قول ہے۔
اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۷﴾ (کیا یہ لوگ رسول کو نہیں پہچانتے) اور کیا ان کے لئے (رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی یہ) دلیل کافی نہیں ہے کہ علماء بنی اسرائیل رسول اللہ ﷺ کو (ان کی صفات و احوال خصوصی کو توریت سے پڑھ کر) جانتے ہیں۔
یعلمه کی ضمیر مفعول رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے اور قرآن کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے یعنی قرآن کا اللہ کی طرف سے نازل ہونا علماء بنی اسرائیل کے علم میں ہے وہ اس سے ناواقف ہیں۔
علماء بنی اسرائیل سے مراد بر قول عطیہ پانچ علماء تھے عبداللہ بن سلام، ابن یامین، ثعلبہ، اسد، اسید حضرت ابن عباس نے فرمایا اہل مکہ نے مدینہ میں یہودیوں سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق دریافت کرلیا یہودیوں نے کہا ان کی (یعنی پیغمبر آخر الزماں کی) بعثت کا زمانہ یہی ہے اور ہم توریت میں ان کے اوصاف و خصوصی احوال پاتے ہیں۔
وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

اور اگر ہم کسی عجمی پر اس قرآن کو اتار دیتے اور وہ ان کو پڑھ کر سناتا تو یہ اس پر ایمان لانے والے نہ ہوتے۔ اعجمین اعجم کی جمع ہے اعجم اس شخص کو کہتے ہیں جو فصیح عربی اچھی طرح نہ بول سکے خواہ نسباً عربی ہی ہو اور عجمی کی نسبت عجم کی طرف ہے عجمی اس شخص کو کہتے ہیں جو نسباً غیر عربی ہو خواہ عربی فصیح بولتا ہو۔ اس تشریح لغوی کی بناء پر آیت کا یہ معنی ہوگا کہ اگر ہم یہ قرآن کسی ایسے شخص پر نازل کرتے جس کی عربی زبان فصیح نہ ہوتی۔

بیضاوی نے لکھا ہے اعجمین اعجمی کی جمع ہے اسی لئے اس کو بصیغۂ جمع سالم ذکر کیا ہے یعنی اگر اعجم کی جمع ہوتی تو پھر اس کی جمع سالم نہ آتی کیونکہ اس کا مؤنث عجماء آتا ہے اور جس وزن افعل مؤنث بروزن فعلاء آتا ہے اس کی جمع سالم نہیں آتی اس کی نظیر اشعرون ہے جو اشعری کی جمع ہے۔ اصل میں اشعریون تھا تخفیفاً اشعرون کر لیا گیا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر ہم قرآن کو عربی میں ہی یا عربی زبان میں کسی ایسے شخص پر نازل کرتے جو فصیح عربی سے واقف نہ ہوتا تب بھی یہ اہل مکہ ایمان نہ لاتے ان کا ذاتی عناد اور غرور اعجمی کے اتباع سے نفرت ان کو ایمان سے روکتی یا نہ سمجھنے کی وجہ سے ایمان نہ لاتے اور صاف کہہ دیتے کہ ہم سمجھتے ہی نہیں تم کہتے کیا ہو اسی مضمون کو دوسری آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۞ اسی طرح ہم نے اس (شرک و تکذیب) کو مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیا ہے کذا قال الحسن و مجاہد۔ آیت کے اس تشریحی ترجمہ سے معلوم ہو گیا کہ شرک کا شرک کا خالق بھی اللہ ہی ہے بعض اہل تفسیر نے کہا سلکناہ میں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے یعنی ہم نے اس قرآن کو ان مجرموں کے دلوں میں داخل کر دیا انہوں نے قرآن کے اعجاز کو خوب پہچان لیا ہے اس کے باوجود محض عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہ قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس آیت میں اللہ نے اس شخص کی حالت بیان فرمائی ہے جس کا شرک پر مرنا اللہ کے علم میں ہے۔

حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۞ یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں جس کی وجہ سے ایمان پر مجبور ہو جائیں اور یہ عذاب مرنے کے بعد قبروں میں ہوگا (اور اس وقت ایمان مفید نہ ہوگا۔)

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۞ پھر ان پر عذاب اچانک آجائے گا اور ان کو احساس بھی نہ ہو پائے گا۔

فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۞ (اس وقت حسرت و افسوس کے ساتھ) کہیں گے کاش ہم کو مہلت دے دی جاتی۔ یہ استفہام اظہار تمنا کے لئے ہوگا وہ دنیا میں لوٹ کر جانے کی تمنا کریں گے مقاتل نے بیان کیا جب اللہ نے اپنے رسول کی زبانی کافروں کو عذاب سے ڈرایا تو کہنے لگے۔ کب تک عذاب سے ڈراتے رہو گے آخر عذاب کب آئے گا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۞ کیا وہ ہمارے عذاب کے جلد آپہنچنے کے خواستگار ہیں یعنی نزول عذاب کے وقت تو یہ مہلت ملنے کے طلب گار ہوں گے اور اب فوری عذاب کے خواستگار ہیں۔

بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ یہ آیت کافروں کے ان اقوال کی طرف اشارہ ہے جن میں بعض کافروں نے کہا تھا اَنْزِلْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اور یوں بھی کہا تھا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا۔

حقیقت میں کافروں کا عقیدہ تھا کہ عذاب ہرگز نہیں آئے گا اور ہم امن چین اور سلامتی کے ساتھ طویل مدتوں تک چلیں گے اور مزے اڑاتے رہیں گے اسی لئے وہ عذاب آنے کی جلدی مچاتے تھے اور فوری عذاب کے خواستگار بنتے تھے اللہ نے ان کے عجلت پسندی کی تردید کر دی۔ پھر بالغرض تسلیم کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم ان کو برسوں زندگی کے مزے اڑانے دیں

اور ان پر عذاب موعود آجائے تو کیا درازی عمر اور تمتع اندوزی عذاب کو دفع کرنے میں کوئی کام آسکے گی۔ چنانچہ فرمایا:

أَفَرَءَيْتَ إِن مَّتَّعْنَٰهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُم مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾

بھلا دیکھو تو اگر ہم برسہا برس ان کو مزے اڑانے دیں پھر مدت کے بعد ان پر وہ عذاب آجائے جس سے ان کو ڈرایا جاتا رہا تھا تو ان کا یہ تمتع اندوز ہونا ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا (عذاب کو ان سے دفع نہیں کر سکے گا)

آیات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب عذاب الیم ان پر نا گہاں آپڑے گا اور یہ عذاب کو اپنے سامنے دیکھ لیں گے تو کہیں گے کاش ہم کو کچھ مہلت دے دی جاتی لیکن ان کو مہلت نہیں دی جائے گی اور بالفرض اگر مہلت دے بھی دی جائے تو آپ غور کیجئے کہ اس مہلت دینے سے ان کو کیا فائدہ پہنچے گا اگر ہم ان کو برسوں مزے اڑانے دیں پھر ان پر وہی موعود عذاب آجائے تو اس مہلت سے وہ عذاب دفع نہ ہو گا اور درازیٔ مہلت نہ ان کو دفع عذاب کا فائدہ دے سکے گی نہ تخفیف عذاب کا بلکہ یہ ساری تمتع اندوزی اور عیش سب کچھ بھول جائیں گے ایسا معلوم ہو گا کہ کبھی آسائش میں تھے ہی نہیں۔

وَمَآ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ ﴿٢٠٨﴾ اور (منکرین کی) جتنی بستیاں ہم نے (عذاب سے) ہلاک کیں سب میں ڈرانے والے پیغمبر آئے منذرون سے مراد ہیں پیغمبر جنہوں نے اللہ کے عذاب سے ڈرایا مگر وہ باز نہ آئے۔

ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَٰلِمِينَ ﴿٢٠٩﴾ نصیحت کے لئے۔ اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

ذکری یادداشت یہ منذروں کی علت (مفعول لہ) ہے کیونکہ ذکری بمعنی انذار ہے یا ذکری کا تعلق پہلے کلام سے نہیں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ہم ان پیغمبروں کو مجسم نصیحت بنا دیتے ہیں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ ٱلشَّيَٰطِينُ ﴿٢١٠﴾ اور اس قرآن کو شیاطین لے کر نہیں اترے۔ یعنی مشرکوں کا یہ قول غلط ہے کہ شیاطین محمد پر قرآن کا القاء کرتے ہیں۔

وَمَا يَنۢبَغِى لَهُمْ اور شیاطین کے لئے ایسا کرنا جائز بھی نہیں ہے (کیونکہ قرآن ہدایت ہے اور شیاطین گمراہی کی طرف بلانے والے ہیں)

وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٢١١﴾ اور وہ ایسا کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ قرآن میں غیب کی خبریں دی گئی ہیں شیطان غیبی خبریں (کیا جانیں اور) کیسے القاء کر سکتے ہیں۔

إِنَّهُمْ عَنِ ٱلسَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ﴿٢١٢﴾ شیاطین کو تو قطعاً (وحی اور کلام ملائکہ کو) سننے سے دور رکھا جاتا ہے (یعنی آسمان تک جا کر ملائکہ کا کلام نہیں سن سکتے)

معزولون روکے گئے، انگارے سے مارے گئے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ فَتَكُونَ مِنَ ٱلْمُعَذَّبِينَ ﴿٢١٣﴾ سو اللہ کی موجودگی میں تم کسی اور معبود کو نہ پکارو کہیں تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہو جاؤ جن کو عذاب دیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا (بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں) اس سے دوسروں کو ڈرانا مقصود ہے گویا یوں فرمایا کہ آپ تمام مخلوق میں میرے نزدیک زیادہ معزز ہیں لیکن اگر آپ بھی میرے سوا کسی دوسرے کو معبود بنائیں گے تو آپ کو بھی عذاب دوں گا۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾ اور (سب سے پہلے) آپ اپنے قریب ترین کنبہ والوں کو ڈرائیے۔ یعنی سب سے پہلے اس کو جو آپ کا زیادہ قرابت دار ہو پھر اس سے کم قرابت رکھنے والے کو پھر اس سے کم قرابت دار کو کیونکہ جس کی قرابت زیادہ ہے وہ پہلے ہدایت کا مستحق ہے مزید یہ کہ اس طریقۂ ہدایت سے دوسروں کو بدگمانی کا بھی موقع مل سکتا کیونکہ عام

طور پر لوگ اپنے قریب ترین عزیزوں سے چشم پوشی کیا کرتے ہیں (اور جب آپ قریب ترین عزیزوں کو بھی اللہ کے عذاب سے ڈرائیں گے تو کسی کو یہ گمان کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا کہ آپ اپنے عزیزوں کی طرف سے چشم پوشی کررہے ہیں) یا اس لئے عزیز ترین قرابت داروں کو ڈرانے کا حکم دیا گیا کہ دوسرے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے عذاب کو دفع کرنے والا کوئی نہیں (پیغمبر بھی اپنے قرابت داروں کو عذاب سے بچا نہ سکیں گے) نجات کا راستہ یہی ہے کہ ان کی بات مانی جائے اور ان کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ محمد بن اسحٰق نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت علی نے فرمایا جب یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر اتری تو آپ ﷺ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے قریب ترین عزیزوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں میں یہ حکم سن کر سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کروں مجھے معلوم تھا کہ اگر میں ان لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں گا اور اس کام کے لئے پکاروں گا تو ان کی طرف سے میرے سامنے ایسا عمل آئے گا جو مجھے ناگوار ہوگا یہ سوچ کر میں خاموش ہو رہا لیکن اب جبرئیل نے مجھ سے آکر کہا کہ محمد اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اللہ تم کو عذاب دے گا لہٰذا علی تم جا کر ایک صاع (آٹے) کی روٹی بنواؤ اور بکری کی ایک ٹانگ (پکا کر بطور سالن کے) اس کے ساتھ رکھ دو اور ایک بڑے پیالہ میں دودھ بھر کرلے آؤ پھر اولاد عبد المطلب کو اکٹھا کرو تاکہ جس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے میں وہ بات ان کو پہنچادوں حضرت علیؓ نے فرمایا میں نے حکم کی تعمیل کی ہے پھر سب کی دعوت کر دی ہے وہ لوگ آئے جن میں رسول اللہ ﷺ کے تائے (چچے) ابو طالب، حمزہ، عباس اور ابولہب بھی تھے سب کم و بیش چالیس آدمی تھے جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے وہ کھانا منگولیا جو میں نے تیار کیا تھا میں نے لاکر رکھ دیا آپ نے اس میں سے ایک ٹکڑا گوشت کا لے کر اپنے دانتوں سے اس کو کاٹا پھر اس کو پیالہ میں رکھ دیا پھر فرمایا بسم اللہ کھائیے سب نے کھایا یہاں تک کہ سب سیر ہو گئے خدا کی قسم جتنا کھانا میں نے سب کے لئے رکھا تھا اتنا تو ان میں کا ایک آدمی کھالیتا (مگر کھانے میں اتنی برکت ہوئی کہ سب کے پیٹ بھر گئے اور کسی کو مزید ضرورت نہیں رہی) پھر فرمایا ان کو (دودھ) پلاؤ میں ان کے سامنے وہی (دودھ بھرا) پیالہ لے آیا خدا کی قسم دودھ اتنا تھا کہ اتنا تو ایک آدمی پی جاتا لیکن سب پی کر سیر ہو گئے اب رسول اللہ ﷺ نے کچھ بات کرنے کا موقع پایا لیکن حضور ﷺ کے کچھ کہنے سے پہلے ابولہب بول اٹھا اور کہنے لگا تمہارے ساتھی نے تم پر جادو کر دیا یہ سنتے ہی لوگ منتشر ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ ان سے بات نہ کر سکے دوسرے دن حضور ﷺ نے فرمایا علی تم کو معلوم ہے کہ یہ شخص پہلے بول اٹھا اور میرے بات کرنے سے پہلے ہی لوگ منتشر ہو گئے اب پھر ویسا ہی کھانا تیار کرو (جیسا کل) کیا تھا اور لوگوں کو پھر جمع کرو میں نے حکم کی تعمیل کی پھر سب کو جمع کیا حضور نے کھانا منگولیا میں نے سامنے لاکر رکھ دیا آپ نے وہی عمل کیا جو گزشتہ دن کیا تھا اس کے بعد سب نے کھایا پیا کھا چکنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کلام شروع کیا اور فرمایا اے اولاد عبد المطلب میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم کو بھی اس کی دعوت دوں تم میں سے کون شخص ہے جو اس کام میں مدد کرے اور میرا بھائی اور وصی اور نائب ہو جائے لوگ یہ سن کر سب کے سب جھجکے میں سب سے کم عمر تھا میں نے کہا یا نبی اللہ میں اس کام میں آپ کا مددگار ہوں گا یہ سن کر آپ نے میری گردن پکڑی اور فرمایا یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا نائب ہے تم اس کی بات سنو اور اس کا کہا مانو لوگ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اس نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم علی کی بات سنیں اور اسکی اطاعت کریں۔

صحیحین میں سعید بن جبیر کی وساطت سے حضرت ابن عباس کا بیان آیا ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو حضور نے کوہ صفا پر چڑھ کر مختلف بطون قریش کو پکارنا شروع کیا اے اولاد فہر، اے بنی عدی آواز سن کر سب لوگ جمع ہو گئے جو خود نہ آسکا اس نے اپنا قاصد بھیج دیا تاکہ وہ جا کر دیکھے کہ واقعہ کیا ہوا ابولہب بھی آگیا اور دوسرے قریش والے بھی۔ آپ نے فرمایا بھلا بتاؤ اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ وادی کے اندر (اس وقت) کچھ سوار موجود ہیں جو تم پر تاخت کرنا چاہتے ہیں تو کیا تم میری تصدیق کرو گے سب نے کہا جی ہاں ہم نے اپنے تجربہ میں آپ کا کبھی کوئی جھوٹ نہیں پایا حضور ﷺ نے فرمایا تو عذاب شدید آنے سے پہلے میں تم کو اس سے ڈرا رہا ہوں (عذاب شدید میرے سامنے ہے جو آنے والا

ہے) ابولہب بولا تو ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو جائے کیا اسی لئے تو نے ہم کو جمع کیا تھا اس پر سورت تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ آخر تک نازل ہوئی۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے آیا ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ اتری تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے گروہ قریش (راوی کا بیان ہے کہ یہ لفظ فرمایا یا اسی طرح کا کوئی دوسر الفظ) اپنی جانوں کو خود خرید لو (یعنی آنے والے عذاب سے بچالو) میں اللہ کے عذاب سے تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا اے اولاد عبد مناف میں اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب میں اللہ (کے عذاب) سے بچانے کے لئے بالکل تمہارے کام نہیں آسکتا اے رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی صفیہ تم کو بھی میں اللہ سے نہیں بچا سکتا اے محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ میرے مال میں تو جو کچھ مانگنا چاہتی ہے مجھ سے مانگ لے اللہ کے مقابل میں تیرے کوئی کام نہیں آؤں گا۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ بستی سے نکل کر کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور وہاں سے اونچی آواز سے پکارا یا صباط (اے لوگو ہشیار ہو جاؤ دشمن آخر رات میں حملہ کرنے والا ہے) لوگوں نے آواز سن کر کہا یہ کون ہے سب آپ کے پاس جمع ہو گئے حضور نے فرمایا بھلا بتاؤ تو اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ کچھ سوار اس پہاڑ کے دامن سے بر آمد ہو رہے ہیں (جو تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں) تو کیا تم مجھے سچا جانو گے لوگوں نے کہا ہم نے تجربہ میں آپ کی کوئی بات جھوٹی نہیں پائی فرمایا تو میں عذاب شدید آنے سے پہلے تم کو (اس کی آمد سے ڈرا رہا ہوں (عذاب شدید میرے سامنے ہے) ابولہب بولا تجھے ہلاکت ہو کیا اسی لئے تو نے ہم کو اکٹھا کیا تھا یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا اس پر اسی روز تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ قدتب (اعمش کی قرأت میں اسی طرح آیا ہے) نازل ہوئی۔

بغوی نے حضرت عبداللہ بن حمار مجاشعی کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو علم اس نے مجھے عطا فرمایا ہے اور تم اس سے واقف نہیں آج تم کو اس کے کچھ حصہ سے واقف کر دوں اس نے فرمایا ہے کہ جو مال میں نے اپنے بندوں کو (بطور حلال) عطا کر دیا وہ ان کے لئے حلال ہے میں نے اپنے بندوں کو موحد پیدا کیا پھر شیطانوں نے پہنچ کر ان کو ان کے دین سے بہکایا اور جو چیز میں نے ان کے لئے حلال کر دی تھی شیطانوں نے وہ چیز ان کے لئے حرام قرار دی تھی میں نے ان کو حکم دیا تھا کہ جس چیز کی معبودیت کی میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری اس کو میرا ساجھی نہ قرار دیں۔ اللہ نے تمام زمین والوں کو دیکھا اور سب سے نفرت کی عرب ہوں یا عجمی ہاں۔ اہل کتاب میں سے جو (اصلی دین پر) باقی رہ گئے تھے (ان سے نفرت نہیں کی) اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں (اللہ کی نافرمانی اور عذاب سے) قریش کو ڈراؤں میں نے عرض کیا اے رب وہ تو میرا سر توڑ ڈالیں گے اور میرے سر کو کچل کر روٹی بنا دیں گے اللہ نے فرمایا میں نے تجھے اسی لئے بھیجا ہے کہ تیری بھی جانچ کروں اور تیرے ذریعہ سے دوسروں کو بھی۔ میں نے تیرے اوپر ایک کتاب اتاری ہے جس کو پانی نہیں دھو سکتا تو اس کو سوتے جاگتے پڑھا کر۔ تو ان سے جہاد کر کامیاب ہو گیا تو (اللہ کے بندوں پر) خرچ کر (اللہ کی طرف سے) تجھ پر خرچ کیا جائے گا تو ایک لشکر (کافروں کے مقابلے کے لئے) تیار کر میں اس سے پانچ گنا لشکر تیری مدد کے لئے بھیج دوں گا۔ اور اپنے فرمانبرداروں کو ساتھ لے کر نافرمانوں سے جنگ کر پھر فرمایا۔ اہل جنت تین ہیں۔ (۱) منصف حاکم (۲) ہر قرابت دار اور مسلم پر مہربانی کرنے والا نرم دل آدمی (۳) دولت مند پاک دامن آدمی جو خود پاکدامن رہتا ہے اور دوسروں کو خیرات دیتا ہے اور دوزخی پانچ ہے وہ کمزور بے عقل جس میں برائیوں سے روکنے والی سمجھ نہ ہو محض دوسروں کے پیچھے لگ جانے والا ہو اور وہ شخص کہ جب صبح کو اٹھتا ہے تو تم کو تمہارے مال و عیال کے معاملہ میں فریب دیتا اٹھتا ہے اور وہ شخص کہ اس کا ہر لالچ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو اس کو (اپنے ساتھ) لے جاتا ہے اور وہ شخص جو بد اخلاق اور فحاش ہے۔ حضور نے بخل اور کذب کا بھی ذکر کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے بحوالہ ابن جریج بیان کیا ہے کہ جب آیت وانذر عشیرتک الاقربین نازل ہوئی تو حضور نے تبلیغ کی ابتدا اپنے گھر والوں سے کی مسلمانوں پر یہ امر شاق گزرا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۱۵﴾ اور ان لوگوں کے ساتھ (مشفقانہ) فروتنی سے پیش آؤ جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں۔

اخفض یعنی نرم رویہ اختیار کرو۔ پرندہ جب نیچے اترنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو نیچے جھکا لیتا ہے یہاں بطور استعارہ سلوک کی نرمی اور خوش اخلاقی مراد ہے۔

من المومنین میں من بیانیہ ہے یا تبعیضیہ اگر اتباع سے عام اتباع مراد ہو خواہ اتباع کامل ہو یا ناقص تو من بیانیہ ہو جائے گا اور اگر کامل اتباع مراد ہو تو من تبعیضیہ ہو جائے گا کیونکہ مومنین کا لفظ عام ہے کامل اتباع کرنے والے مومن ہوں یا ناقص اتباع کرنے والے گناہ گار مؤمن۔ مؤخر الذکر کی تائید آئندہ جملہ سے ہوتی ہے کیونکہ اس میں گناہ گار مؤمن مراد ہیں۔

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۱۶﴾ پھر اگر وہ مومن (بعض امور میں) تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ میں تمہارے ان (گناہوں کے) اعمال سے بری ہوں اس آیت میں گناہوں سے الگ ہونے کے اظہار کا حکم دیا گیا ہے گناہ گاروں سے الگ ہونے کے اظہار کا حکم نہیں دیا گیا۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۲۱۷﴾ اور اللہ غالب مہربان پر بھروسہ کرو۔

توکل کا معنی ہے اپنا کام (مکمل طور پر) دوسرے کے سپرد کر دینا اور ایسا کرنا نہ عقلاً جائز ہے نہ نقلاً صحیح۔ ہاں اگر جس کی سپردگی میں کام دیا ہو وہ نفع پہنچانے اور ضرر کو دفع کرنے پر کامل قدرت رکھتا ہوں بھروسہ کرنے کے اقوال کو سنت اور تمام احوال کو دیکھتا ہو اور انجام سے باخبر ہو اور بھروسہ کرنے والے کا ہر وقت نگراں ہو تو اس کی سپردگی میں اپنے کام دیئے جاسکتے ہیں اسی لئے فرمایا علی العزیز یعنی اس اللہ پر اعتماد رکھو جو اپنے دشمنوں پر غالب ان کو مقہور کرنے والا اور اپنے دوستوں کی مدد کرنے والا ہے الرحیم جو رحیم ہے تمہارے اوپر بھی اور تمہاری پیروی کرنے والوں پر بھی۔

الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۲۱۸﴾ جو تم کو دیکھتا ہے جس وقت تم کھڑے ہوتے ہو یعنی لوگوں کو توحید کی طرف بلانے کے لئے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہو یا جس وقت تم نماز کے لئے اٹھتے ہو۔ کذا قال المفسرون۔

وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ﴿۲۱۹﴾ اور (نماز شروع ہونے کے بعد) نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست برخاست کو بھی دیکھتا ہے۔

تقلبک، یعنی نماز کے اندر قیام اور رکوع اور سجود کی طرف تمہارے منتقل ہونے کو۔ فی الساجدین یعنی فی المصلین۔

حسب روایت عطیہ وعکرمہ حضرت ابن عباس کا یہی تفسیری قول ہے مقاتل نے کہا فی المصلین یعنی مع المصلین مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو اس وقت بھی دیکھتا ہے جب تم تنہا نماز پڑھتے ہو اور اس وقت بھی دیکھتا ہے جب نمازیوں کے ساتھ جماعت کی نماز پڑھتے ہو۔ مجاہد نے کہا مطلب ہے کہ تم جو نمازیوں کی طرف نظر گھماتے پھراتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے اسی طرح پشت کے پیچھے کی چیز کو بھی دیکھتے تھے (تو نماز کے اندر نظر نبوت سے مقتدیوں کے حال کا بھی مشاہدہ کر لیتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میرا رخ یہاں (یعنی سامنے کی طرف) دیکھتے ہو واللہ تمہارے خضوع کی حالت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہوتی میں تمہیں بلاشبہ اپنی پشت کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں رواہ البغوی۔ حسن نے کہا تقلب سے مراد ہے تصرف یعنی مومنوں میں تمہاری آمد و رفت کو اللہ دیکھتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ساجدین سے مراد ہیں انبیاء یعنی جیسے انبیاء کے حالات تھے وہ چلتے پھرتے اور مختلف احوال رکھتے تھے اسی طرح مختلف احوال میں تمہارے تصرف کو بھی خدا دیکھتا ہے۔ بعض اہل علم نے یہ بیان کیا کہ تہجد گزاروں کے احوال کو تلاش کرنے کے لئے جو تم آتے جاتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ جب شب کی نماز کی فرضیت

منسوخ کردی گئی تو اسی رات کو رسول اللہ ﷺ اپنے مکان سے بر آمد ہو کر صحابہ کے مکانوں کی طرف تشریف لے گئے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ صحابہ رات کو گھروں کے اندر کیا کرتے ہیں کیونکہ آپ کو صحابہ کا عبادت میں مشغول ہونا بہت زیادہ مرغوب تھا۔ صحابہ کو ذکر خدا اور تلاوت میں مشغول پایا ان کی آوازوں کی بھن بھناہٹ بھڑوں (یا شہد کی مکھیوں) کی بھن بھناہٹ کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے احوال خاص بہت تھے یہاں صرف آپ کے تقلب فی الصحابہ کا ذکر اس لئے کیا کہ آپ کا یہ عمل رحمت کا سبب تھا۔

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس کا ایک قول آیا ہے کہ تقلب سے مراد ہے آباؤ اجداد کی پشتوں میں منتقل ہونا یعنی ایک نبی سے نور محمدی کا دوسرے نبی کی پشت میں منتقل ہو کر آنا۔ لیکن اس تفسیر پر رسول اللہ ﷺ کی کوئی خاص مدح نہ ہو گی کیونکہ آباؤ اجداد میں ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا تو صرف رسول اللہ ﷺ ہی کے لئے مخصوص نہ تھا تمام قریش بلکہ تمام انسان یونہی پشت در پشت منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ تقلب سے مراد ہو پاک عبادت گزار مردوں کی پشت سے مقدس پاک دامن عورتوں کے رحموں میں آپ کا منتقل ہوتے رہنا۔ یعنی موحد، مومن مردوں کی پشتوں سے مومن، موحد عورتوں کے رحموں کی طرف انتقام۔ اس تفسیر سے آیت پر استدلال کیا جاسکے گا اس امر پر کہ حضور ﷺ کے سارے آباؤ اجداد مومن تھے۔ کذا قال السیوطی۔

حافظ شمس الدین بن ناصر الدین دمشقی کے شعر ہیں۔

وینقل احد نورا عظیما تلا لافی وجوہ الساجدین

تقلب فیھم قرنا فقرنا الی ان جاء خیر المرسلین

ہر ایک نور عظیم منتقل کرتا رہا جو موحدوں کے چہروں پر جگمگاتا رہا وہ نور ہر زمانہ میں منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ سید المرسلین پیدا ہو گئے۔

اس تفسیر کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے قرن در قرن (منتقل کر کے) نبی آدم کے بہترین قرن میں بھیجا گیا یہاں تک کہ میری بعثت اس زمانہ میں ہو گئی۔ جس میں میں ہوں۔ مسلم نے حضرت واثلہ بن اسقع کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے اولاد ابراہیمؑ میں سے اسماعیل کا انتخاب کر لیا اور اولاد اسماعیل میں سے بنی کنانہ کا اور بنی کنانہ میں سے قریش کا اور قریش میں سے بنی ہاشم کا اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا۔ بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت انس کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جب بھی اللہ نے آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین فرقہ میں سے کر دیا آخر مجھے میرے والدین سے پیدا کر دیا گیا کہ دور جاہلیت کی کوئی خرابی مجھے نہیں پہنچی آدم سے لے کر اپنے والدین تک میں نکاح سے پیدا ہوا زنا سے نہیں پس میں ذاتی حیثیت میں بھی تم سے بہتر ہوں اور نسبی اعتبار سے بھی افضل ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے آباء واجداد کے مومن ہونے کے موضوع پر مجمل اور مفصل ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں مثبت و منفی ہر طرح کی بحث کی ہے میں نے اس کا خلاصہ ایک رسالہ کی شکل میں لکھ دیا ہے اس موضوع کی تنقیح کے لئے اس رسالہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ بلاشبہ وہی سننے والا اور جاننے والا ہے اقوال کو سنتا اور افعال کو نیتوں کو اور تمام امور کے انجام کو جانتا ہے لہٰذا اسی پر توکل کرنا مناسب ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ کیا میں تم کو بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ یہ جواب ہے کافروں کے اسی قول کا کہ اس شخص پر شیاطین کا نزول ہوتا ہے۔

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ شیاطین اترتے ہیں ہر بڑے دروغ گو پکے گناہ گار پر۔
اور محمد ﷺ نہ شریر دروغ گو ہیں۔ نہ گناہ گار اللہ کے نافرمان اس لئے شیاطین کا نزول ان پر نہیں ہو سکتا تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے میں (عملی و قولی) مناسبت و موافقت ضروری ہے۔

يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ (دروغ گو گناہ گار لوگ شیطانوں کی طرف) کانوں کو لگاتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھ پاتے ہیں مگر اس میں اپنے خیالات کا کثیر حصہ شامل کر دیتے ہیں جو غلط۔ اور واقع کے خلاف ہوتا ہے ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور محمد ﷺ ایسے نہیں ہیں آپ نہ شیطانوں کی بات سنتے ہیں نہ دروغ بافی کرتے ہیں بلکہ بکثرت غیب کی اطلاعات دیتے ہیں جن میں سے کوئی بھی واقع کے خلاف نہیں ہوتی)

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کاہنوں کے متعلق دریافت کیا حضور نے فرمایا وہ (یعنی کاہن) ہیچ ہیں عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ بسا اوقات ایسی باتیں کہتے ہیں جو صحیح ثابت ہوتی ہیں فرمایا کوئی ایک صحیح بات کوئی جن (فرشتوں کی گفتگو سے) جھپٹ کر بھاگتا ہے اور لا کر اپنے دوست کے کان میں مرغی کے کٹکٹانے کی طرح کٹ کٹ کر دیتا ہے کاہن اس ایک صحیح بات میں سو سے بھی زیادہ جھوٹ ملا کر بیان کر دیتے ہیں۔ متفق علیہ۔

حضرت عائشہ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ فرشتے عنان یعنی ابر میں اترتے ہیں اور ان میں باہم اس امر کا تذکرہ ہوتا ہے کہ جس کا فیصلہ آسمان پر ہو چکا ہے شیاطین (بادلوں تک پہنچ کر) اس بات کو چوری سے سن پاتے ہیں اور کاہنوں کے دلوں میں لا کر ڈال دیتے ہیں کاہن اس کے ساتھ سو جھوٹ اپنی طرف سے شامل کر دیتے ہیں رواہ البخاری۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ جب کسی امر کا فیصلہ آسمان پر کر دیتا ہے تو فرشتے عاجزی سے اور اطاعت کے اظہار کے لئے اپنے بازو پھٹ پھٹاتے ہیں جیسے کسی چٹان پر زنجیر مارنے سے آواز پیدا ہوتی ہے جب گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو (باہم) پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا دوسرے جواب میں کہتے ہیں جو کچھ فرمایا وہ حق ہے وہی بزرگ، برتر عالی قدر ہے۔ اس بات کو کچھ چوری سے سننے والے (شیاطین) سن پاتے ہیں وہ نیچے والے چوری سے سننے والے سے کہہ دیتے ہیں اور اسی طرح ایک کے بعد ایک ترتیب وار سن لیتا ہے (سفیان راوی نے اپنی انگلیاں کھول کر ہاتھ کو ترچھا کر کے دکھایا۔ یعنی چاروں انگلیوں کو اس طرح ترتیب دے کر بتایا کہ ایک انگلی دوسری کے اوپر اور دوسری تیسری کے اوپر تیسری چوتھی کے اوپر کر کے دکھائی۔ مترجم) نیچے والا سن کر اپنے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اور وہ اپنے سے نیچے والے کو۔ یہاں تک کہ سب سے نچلا شیطان ساحر یا کاہن کو بتا دیتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اوپر والا نیچے والے کو بتانے بھی نہیں پاتا کہ پہلے ہی ایک انگارہ ٹوٹنے والا ستارہ اس پر آ گرتا ہے (اور اس کو جلا دیتا ہے) اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انگارہ پڑنے سے پہلے وہ اپنے نیچے والے کو بتا چکتا ہے کاہن اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتا ہے (اور لوگوں سے کہہ دیتا ہے) اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ کیا فلاں فلاں دن کاہن نے ایسا نہیں کہا تھا غرض اسی آسمان والی بات کی وجہ سے کاہن کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عباس نے کسی انصاری کا مقولہ نقل کیا انصاری نے کہا ہم ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک تارہ ٹوٹا اور اس کی روشنی ہوئی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جاہلیت کے زمانہ میں اس طرح (تارہ) پھینکا جاتا تھا تو تم لوگ کیا کہتے تھے حاضرین نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خود جانتے ہیں ہم کہا کرتے تھے کہ آج رات کوئی بڑا آدمی پیدا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ (تارے) نہ کسی کے مرنے کی وجہ سے پھینکے جاتے ہیں نہ کسی کی زندگی کی وجہ سے پھینکے جاتے ہیں بلکہ ہمارا رب بزرگ و برتر جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو حاملین عرش تسبیح پڑھتے ہیں پھر ان سے متصل آسمان والے یہاں تک کہ تسبیح کی (آواز) اس نچلے قریبی آسمان والوں کو پہنچ جاتی ہے پھر حاملین عرش سے متصل آسمان والے حاملین عرش سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا وہ بتاتے ہیں کہ اللہ نے یہ فرمایا پھر (ترتیب وار) ایک آسمان والے دوسرے آسمان والوں سے پوچھتے چلے آتے ہیں یہاں تک کہ وہ بات اس دنیوی آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور جن جھپٹ کر اس کو سن کر لے بھاگتا ہے اس

طرح شیاطین اپنے دوستوں کی طرف لا کر دے مارتے ہیں (کاہن لوگ) جب اس بات کو اسی طرح بیان کرتے ہیں جیسی وہ ہوتی ہے تو وہ حق ہوتی ہے لیکن وہ تو اس میں بڑھا دیتے ہیں۔ رواہ مسلم۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو آدمیوں نے (یعنی دو شاعروں نے باہم ہجو کا مقابلہ کیا ایک انصاری تھا دوسرا کسی اور قبیلہ کا۔ ہم ایک کے ساتھ اس کی قوم کے کچھ غاوی (گمراہ یعنی اشعار کو نقل کرنے اور یاد رکھنے والے) بھی تھے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں بغوی نے ضحاک کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے عطیہ کی ایک روایت بھی ابن عباس سے یہی ہے حضرت ابن عباس کا قول عطیہ نے بھی یہی نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے بھی بروایت عکرمہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ آیت میں وہ شعراء امراء مراد ہیں جو کافروں کی حمایت میں رسول اللہ ﷺ کی ہجاء کرتے تھے مقاتل نے ان کے نام اس طرح نقل کئے ہیں عبد اللہ بن زبیر سہمی۔ ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی۔ شافع بن عبد مناف۔ ابو عزہ عبد اللہ بن عمر جمحی۔ امیہ بن صلت ثقفی۔

یہ شعراء جھوٹی غلط سلط باتیں کہتے اور دعویٰ کرتے تھے کہ جیسا محمد کہتے ہیں ویسا ہم بھی کہتے ہیں یہ لوگ اشعار سناتے اور ان کی قوم کے کچھ گمراہ لوگ جمع ہو جاتے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے متعلق ان شاعروں کے ہجائیہ اشعار سنتے اور پھر نقل کرتے تھے یہی وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے غاودن فرمایا یعنی وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق کہے ہوئے ہجائیہ اشعار نقل کرتے تھے۔

قتادہ اور مجاہد نے کہا الغاودن سے مراد ہیں شیاطین۔ یہ جملہ الگ ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کے شاعر ہونے کے خیال کو باطل کیا گیا ہے۔ اسی ابطال کی تائید آئندہ آیت کر رہی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِىْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾

(اے مخاطب) کیا تجھے معلوم نہیں کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

وادی سے کلام کی ایک نوع جیسے مدح، ذم، فخر، یا محبت، اظہار بغض وغیرہ کہا جاتا ہے۔ انانی فی واد و انت فے واد اخر میں ایک وادی میں ہوں (ایک قسم کی بات کر رہا ہوں) اور تو دوسری وادی میں ہے (دوسری قسم کی بات کر رہا ہے)

ھائم سرگرداں۔ اپنے رخ پر بغیر کسی حد پر رکے چلا جانے والا۔ یعنی شعراء کلام میں انتہائی مبالغہ کرتے ہیں جھوٹ کی پروا بھی نہیں کرتے ان کے بیشتر کلامی مقدمات محض خیالی بے حقیقت ہوتے ہیں۔

قتادہ نے کہا شعراء تعریف بھی جھوٹی کرتے ہیں اور ہجا مہ بھی غیر واقعی۔ بعض نے فِىْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حروف تہجی کے حساب سے ہر حرف پر اشعار کے قافیے بناتے ہیں۔

عمل کے خلاف کہنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اشعار میں بہت دروغ گوئی کرتے ہیں۔

قرآن کے اعجاز کے دو رخ ہیں اول ترتیبی یعنی اسلوب ادا اور دوسرا معنوی۔ قرآن کی معنویت پر تو وہ لوگ یہ جرح کرتے تھے کہ یہ شیاطین لے کر اترتے ہیں اور اعجاز لفظی کے سلسلہ میں کہتے تھے یہ شاعری ہے اس لئے اللہ نے کاہنوں اور شاعروں کی حالت بیان کر کے رسول اللہ ﷺ کی حالت کا ان کی حالتوں سے فرق ظاہر کر دیا۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی کے پیٹ میں لہو، پیپ بھرا ہو کہ اس کی صحت غارت کر دے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے اندر شعر بھرے ہوں۔ رواہ البخاری و مسلم واحمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ۔

حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب (کوہ) عرج پر چل رہے تھے اچانک ایک شاعر گاتا ہوا

سامنے آیا حضور نے فرمایا شیطان کو پکڑ لو یا تھام لو فرمایا فرمایا اگر کسی کے جوف کے اندر پیپ، لہو بھرا ہو تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے اندر شعر بھرے ہیں۔

حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کلام میں انتہائی مبالغہ کرنے والے غارت ہو گئے حضور ﷺ نے یہ بات تین بار فرمائی۔

حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ پیارے اور قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے مقرب تم میں سے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور میرے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت اور قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ دور تم میں سے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق سب سے برے ہوں فضول بکواس کرنے والے ہوں بنا بنا کر خلاف حقیقت کثیر کلام کرنے والے ہوں حلق پھاڑ کر بغیر احتیاط کے کام کو پھیلانے والے ہوں۔ میں کہتا ہوں شعراء کی یہی حالت ہوتی ہے۔ ترمذی نے حضرت جابر کی روایت سے بھی حدیث اسی طرح نقل کی ہے ایک روائیت میں آیا ہے۔ کہ صحابہ نے عرض کیا ہم ثرثاروں (بکواسی۔ کثیر گو) اور متشدقون (باچھیں پھاڑ کر بنا کر کلام کرنے والے) کو تو جانتے ہیں متفیھقون کے کیا معنی فرمایا۔ تکبر کرنے والے۔

حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے معراج میں لے جایا گیا تو میرا گذر کچھ لوگوں کی طرف سے ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے پوچھا جبرئیل یہ کون لوگ ہیں جبرئیل نے کہا یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جو ایسی باتیں (تقریر میں) کہتے تھے جو خود نہیں کرتے تھے۔ رواہ الترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

ابن ابی حاتم نے عروہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آیت وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ مَالَا يَفْعَلُوْنَ تک نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا اللہ کو علم ہے کہ میں ان ہی شعراء میں ہوں اس پر آیت والشعرا یتبعھم آخر سورت تک نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم اور ابن جریر اور حاکم نے ابوالحسن براء کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آیت وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الخ نازل ہوئی تو عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن مالک اور حسان بن ثابت خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ نے یہ آیت نازل کی ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہم شاعر ہیں اب ہم تو غارت ہو گئے اس پر اللہ نے آیت الا الذین امنوا نازل فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو طلب فرمایا اور یہ آیات پڑھ کر سنا دیں۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا وَّانْتَصَرُوا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ط

مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور مظلوم ہونے کے بعد انہوں نے انتقام لیا۔

ذکروا اللّٰہ کثیرا یعنی ان کی شاعری ان کے لئے اللہ کے ذکر کی کثرت سے مانع نہ ہو اور اپنے بشتر اشعار میں وہ اللہ کے ذکر، توحید، اللہ کی حمد و ثناء اور اس کی اطاعت کی ترغیب بیان کرتے ہیں۔

ابو یزید نے کہا ذکر کی کثرت تعداد کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ حضور قلب سے ہوتی ہے۔

وانتصروا یعنی مسلمانوں کی ہجا جن لوگوں نے کی ہو ان مومن شاعروں نے اس کے مقابلے میں ان کی ہجا کی ہو اور اس طرح کافروں کے ظلم کا انتقام لیا ہو۔

بغوی نے شرح السنۃ اور معالم میں لکھا ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا نبی اللہ شاعری کے متعلق اللہ نے جو کچھ نازل فرمایا وہ معلوم ہی ہے (پھر ہمارا کیا ہوگا) فرمایا مومن اپنی تلوار (سے بھی جہاد کرتا ہے) اور زبان سے بھی جہاد کرتا ہے قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم جو (اپنی زبانوں سے) ان کے تیر مارتے

ہو وہ گویا کمانوں سے تیر مارنے کی طرح ہیں۔
استیعاب میں عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔
بغوی نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عمرۃ القضاء کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے ابن رواحہ حضور کے آگے آگے چل رہے تھے اور حرم کے اندر شعر پڑھ رہے تھے حضور ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا عمر اس کو پڑھنے دے یہ اشعار کمانوں کے تیروں سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔
صحیحین میں حضرت براء بن عازب کی روایت سے آیا ہے کہ غزوۂ بنی قریظہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت سے فرمایا مشرکوں کی ہجو کرو جبرئیل (مدد کے لئے) تمہارے ساتھ ہیں یہ بھی رسول اللہ ﷺ حضرت حسان سے فرمار ہے تھے میری طرف سے ان کو جواب دو۔ اے اللہ روح القدس کے ذریعہ سے اس کی مدد کر۔
مسلم نے حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریش کی ہجو کرو تمہاری طرف سے یہ ہجو قریش کے لئے تیر لگنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔
یہ بھی حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور کو حسان سے یہ فرماتے ہوئے سنا روح القدس برابر تیری مدد پر رہے گا جب تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے دفاع کرے گا۔
حضرت عائشہ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرمار ہے تھے حسان نے ان کی ہجا کی پس شفادی اور شفادینے والی چیز بیان کر دی۔
بخاری نے حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حسان کے لئے مسجد کے اندر منبر رکھوا دیتے تھے جس پر وہ کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف فخریہ یا دفاعیہ کلام پڑھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے اللہ روح القدس سے حسان کی مدد کرتا ہے جب تک رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حسان دفاع کرتا ہے۔
بغوی نے حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریش کی ہجو کرو یہ ان کے لئے تیر لگنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ پھر ابن رواحہ کے پاس آدمی بھیجا اور انکو حکم دیا ان کی ہجا کرو اور ان سے ہجو میں مقابلہ کرو۔ (لیکن خود) حضور ﷺ کی خوشی کے مطابق ہجو نہ کر سکے پھر کعب بن مالک کو بلوایا پھر حسان بن ثابت کو بلوایا جب حسان آئے تو فرمایا اب وقت آگیا کہ تم اس شیر کی طرف تیر بھیجو جو دم پٹک رہا ہے (یعنی حملہ کے لئے تیار ہے) پھر حضرت حسان نے اپنی زبان منہ سے باہر نکالتے ہوئے اسے ہلا کر کہا۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اپنی زبان ان کو چمڑے کی طرح چیر ڈالوں گا حضور نے فرمایا جلدی نہ کرو ابو بکر قریش کے نسبوں سے بخوبی واقف ہیں میرا نسب بھی قریش کے اندر ہی ہے ابو بکر میرے نسب کو ان کے اندر سے الگ چھانٹ دیں گے حسان حضرت ابو بکر کے پاس گئے پھر لوٹ کر آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ابو بکر نے آپ کے نسب کو چھانٹ دیا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں آپ کو ان کے اندر سے اس طرح کھینچ نکالوں گا جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ حسان نے یہ شعر کہے۔

هجوت محمد افاجبت عنه   وعند الله فی ذاک الجزاء

تو نے محمد کی ہجو کی میں نے ان کی طرف سے جواب دیا اللہ کے ہاں اس کا بدلہ ہے۔

هجوت محمد ابرا تقیا   رسول الله شیمة الوفاء

تو نے مقدس پرہیزگار محمد کی ہجو کی جو اللہ کے رسول ہیں اور ان کی خصلت وفاء عہد ہے۔

فان ابی ووالدتی و عرضی   لعرض محمد منکم وقاء

میرے ماں باپ اور میری آبرو۔ محمد کی آبرو کو تم سے بچانے والی ہے یعنی محمد کی آبرو پر سب قربان۔

امن یھجو رسول اللہ منکم　　ویمدحہ وینصرہ سواء

تم میں سے جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی مدح اور امداد کرتا ہے کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

و جبرئیل رسول اللہ فینا　　وروح القدس لیس لہ کفاء

اللہ کے رسول جبرئیل اور روح القدس ہمارے اندر ہیں جن کا کوئی ہمسر نہیں۔

ابن سیرین کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب بن مالک سے فرمایا لاؤ حضرت کعب نے آپ کو (قصیدہ) سنایا حضور نے فرمایا یہ ان قریش کے لئے تیر پڑنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

فائدہ

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر شعر جھوٹ اور دوسری ناجائز باتوں سے پاک ہو تو ایسی شاعری میں کوئی حرج نہیں دار قطنی نے حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس شعر کے جواز و عدم جواز کا ذکر کیا گیا فرمایا یہ بھی ایک کلام ہے اچھا بھی ہوتا ہے برا بھی ہوتا ہے اچھے کو لے لو برے کو چھوڑ دو۔

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے اچھا کلام جو کسی شاعر نے کہا ہو وہ لبید کا یہ کلام ہے الا کل شئی ما خلا اللہ باطل خوب سن لو اللہ کے سوا ہر چیز بے حقیقت ہے متفق علیہ۔

عمرو بن شدید نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا عمرو کے باپ نے کہا میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے پیچھے حضور کے ساتھ سوار تھا فرمایا کیا امیہ بن صلت کا کوئی شعر تمہیں یاد ہے میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا لاؤ میں نے ایک شعر سنا دیا فرمایا اور لاؤ میں نے ایک شعر اور سنا دیا فرمایا اور پڑھو یہاں تک کہ میں نے حضور کو سو شعر پڑھ کر سنائے۔ رواہ مسلم۔

حضرت جندب راوی ہیں کہ کسی معرکہ میں حضور کی ایک انگلی زخمی (یا خون آلود) ہو گئی آپ نے فرمایا ھل انت الا اصبع دمیت وفی سبیل اللہ مالقیت تو صرف ایک انگلی ہے جو زخمی ہو گئی اور جو کچھ تو نے دکھ پایا اللہ کی راہ میں پایا۔ متفق علیہ۔

شعبی کا بیان ہے کہ ابو بکر بھی شعر کہتے تھے اور عمر بھی شعر کہتے تھے اور علی بھی شعر کہتے تھے تینوں شعر کہتے تھے روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباس مسجد کے اندر خود بھی شعر پڑھتے تھے اور پڑھواتے بھی تھے ایک بار عمرو بن ربیع کو طلب فرما کر اس سے اس کا قصیدہ سنا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

امن آل لغمی انت غادر مبکر　　غداۃ غدام رائح فمھجر

ابن ربیعہ نے آپ کو پورا قصیدہ آخر تک سنا دیا جو تقریباً ستّر شعر کا تھا۔ حضرت ابن عباس نے دوبارہ لوٹ کر سنا دیا کیونکہ آپ پورا قصیدہ ایک بار سن کر یاد کر لیا کرتے تھے۔

فائدہ

اگر شعروں میں اللہ کا ذکر ہو یا علم دین ہو یا مسلمانوں کو وعظ و نصیحت ہو تو ایسی شاعری عبادت ہے۔

حضرت ابی بن کعب راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بعض شعر حکمت ہوتے ہیں۔ رواہ البخاری۔

صخر بن عبد اللہ بن بریدہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے بعض بیان جادو ہوتے ہیں اور بعض علم جہالت اور بعض شعر حکمت اور بعض قول عیال۔ رواہ ابو داؤد۔

حضرت ابن عباس کی روایت ہے بعض بیان جادو ہوتے ہیں اور بعض علم جہالت اور بعض شعر جہالت اور بعض شعر

حکمت اور بعض قول وعیال ۔رواہ ابوداؤد

حضرت ابن عباس کی روایت ہے بعض بیان جادو ہوتے ہیں اور بعض شعر حکمتیں رواہ ابوداؤد۔ واحمد۔

ایک حدیث اوپر درج کی جاچکی ہے کہ مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ ابوداؤد نسائی دارمی نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرکوں سے جہاد کرو اپنے مالوں سے اپنی جانوں سے اور اپنی زبانوں سے۔

اوپر کی آیت میں جب اللہ نے مسلم شعراء اور مشرک شعراء کا ذکر کر دیا تو آئندہ آیت میں مشرک شعراء کو وعید سنائی اور فرمایا:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴿۲۲۷﴾ اور عنقریب ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کر رکھا ہے معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کیسی بری جگہ لوٹ کر جانا ہے۔

الذین ظلموا یعنی جن لوگوں نے شرک کیا یا رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی۔

ای منقلب مقلب مصدر ہے بمعنی رجوع یا ظرف ہے بمعنی جائے رجوع استفہام (سوالیہ نہیں) تہدیدی ہے۔

ینقلبون لوٹیں گے یعنی مرنے کے بعد لوٹیں گے حضرت ابن عباس نے کہا جہنم اور آتش سوزاں کی طرف لوٹیں گے۔

بیضاوی نے لکھا ہے یہ سخت تہدید ہے۔ سیعلم کے اندر وعید بلیغ ہے اور الذین ظلموا میں عموم واطلاق ہے اور ای منقلب میں ایہام کے ساتھ عظیم ہولناکی کا اظہار ہے مطلب یہ ہے کہ ظالم امید رکھتے ہیں کہ عذاب سے (ان کو چھوٹ مل جائے اور وہ لوٹ جائیں گے مگر (مرنے کے بعد) ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ عذاب سے لوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا میرے والد نے اپنے وصیت نامہ میں دو سطریں لکھیں (اور وصیت نامہ اس طرح تحریر کیا) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وصیت وہ ہے جو ابوبکر بن ابو قحافہ نے دنیا سے نکلتے وقت لکھا تھا (یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ) اس وقت کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور بدکار بھی نیک ہو جاتا ہے اور جھوٹا بھی سچ کہتا ہے میں نے تم پر عمر بن خطاب کو اپنا جانشین بنایا اگر وہ انصاف کریں تو ان کے متعلق میرا یہی خیال اور امید ہے اور اگر وہ ظلم کریں اور (مذہبی احکام کو بدل ڈالیں) تو میں (معذور ہوں) غیب داں نہیں ہوں۔ (آئندہ کا مجھے علم نہیں) وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ۔

الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ و اصحبہ اجمعین۔

تفسیر سورت شعراء سے فراغت ۱۲۰۵ھ میں ۴/ رجب کو پنجشنبہ کے دن ہوئی

اس کے بعد سورۂ نمل کی تفسیر انشاء اللہ آئے گی۔

اللہ کی توفیق ومدد سے سورت شعراء کی تفسیر کے ترجمہ سے

فراغت ۱۲/ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ کو جمعہ کے روز ہوئی۔ فالحمد للہ۔

تمت